ترجمان السُّنّة

عربی - اردو

سوئم

اُستاذ المحدثین، زبدۃ الفقہاء، فخر العلماء

حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی قدس سرہ

مکتبہ رحمانیہ

MAKTABA-E-REHMANIA

اقراء سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

ترجمان السنۃ

عربی - اردو

جلد سوئم

جدید دور کی ضرورت کے مطابق جدید عنوانات اور
مباحث کے ساتھ احادیثِ مبارکہ کا مستند، جامع اور خوبصورت مجموعہ

اُستاذ المحدثین، زبدۃ الفقہاء، فخر العلماء

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی قدس سرہٗ

مکتبہ رحمانیہ ◎ اقرأ سنٹر
غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

M.A.Hifz

کتاب کی تخریج وکتابت کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب .... ترجمان السنة
مؤلف .... حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی
طابع .... مقبول الرحمٰن
ناشر .... مکتبہ رحمانیہ
مطبع .... لٹل سٹار

ملنے کے پتے

⇦ مکتبۃ العلم نمبر ۱۸ اُردو بازار لاہور
⇦ خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ مکتبہ سید احمد شہید الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

فہرست مضامین ترجمان السنہ جلد سوم

مضامین	صفحہ
دیباچہ	۱۱
اعتراف واعتذار	۱۷
القضاءوقدر اور اس پر ایک لمحہ فکریہ	۲۰
مسئلہ قضاءوقدر علمی نظر میں	۳۱
قضاءوقدر اور اکتشافاتِ عصریہ کا اس پر اثر	۳۱
قضاءوقدر اور انسانی جدوجہد سے اس کا تعلق	۳۱
قضاءوقدر کی حقیقت اور شرعی نظر میں اس کی اہمیت	۳۳
مسئلہ مذکورہ میں زمانہ قدیم کے چیدہ خیالات اور مذہب اہل حق کی توضیح وتحقیق	۳۴
مسئلہ تقدیر کے لانحل ہونے کا راز	۳۸
ناتمام اختیار کا فائدہ	۴۱
فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ اور ان کے کفر کی ضروری تنقیح	۴۳
قضاءوقدر کے مسئلہ میں امام تریدی کے مسلک کی اہم توضیح	۴۷
قضاوقدر پر ایمان لانا اسلام کا ایک رکن ہیں	۵۲
منکرین تقدیر کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید کلمات	۵۵
قضاءوقدر لکھی جاچکی ہے	۵۷
قضاء و قدر کی کتابت عالم کی پیدائش سے کتنی قبل ہوئی	۶۰
قضاءوقدر میں بحث ومباحثہ سے گریز کرنا چاہئے	۶۱
قضاءوقدر میں گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے	۶۲
قضاوقدر کے فیصلہ پر رضامندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے	۶۳
یہ اعتقاد رکھنا کہ فرمانبرداروں کو دوزخ میں ڈال دینا یا نافرمانوں کو جنت بخش دینا مختارِ کل کی بارگاہ میں دونوں باتیں انصاف ہیں مسئلہ قدر کی جان ہیں	۶۶
بندے اپنے افعال میں مختار ہیں ان کے اس اختیار سے کرایا وہی جاتا ہے جو پہلے مقدر ہو چکا ہے اس لئے وہ مجبور بھی ہیں	۶۹
حکم عدولی کے لئے تقدیر کا عذر تراشا روا نہیں	۷۲
مصیبت میں تقدیر کا سہارا لینا حضرت آدم علیہ والسلام کی سنت ہے	۷۳
قضاءوقدر کے احاطہ سے کوئی شے باہر نہیں	۷۶
کائنات کا ذرّہ ذرّہ قضاءوقدر کے فولادی پنجہ میں کسا ہوا ہے	۸۱
حق تعالیٰ کے علم ازلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قضاء و قدر کے تحتانی مراتب میں تبدیلی بھی ہوجاتی ہے	۹۳
دنیا میں لوگوں کی جو کچھ بھی جدوجہد نظر آرہی ہے درحقیقت یہ تقدیر ہی کی خفیہ کارفرمائیاں ہیں	۹۸
دنیا کے واقعات کے ساتھ ان کے اسباب بھی قضاء و قدر کے تحت ہی ہوتے ہیں-	۹۹
قضاءوقدر کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر ٹکرائی نہیں	۱۰۳
قضاء وقدر کا اعتقاد اسباب کے ارتکاب سے نہیں روکتا بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے	۱۰۷
قوتِ ارادیہ کے استحکام میں قضاء وقدر پر اعتقاد کا	

عجب اثر ہوتا ہے۔ ۱۱۲

حضرت انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کا مختصر تذکرہ احادیث اور تاریخ کی روشنی میں ۱۱۷

انبیاء علیہم السلام کا مقام ابن سینا کی نظر میں ۱۱۷

فلاسفہ کے نزدیک نبوت کیوں کسبی چیز تھی ۱۱۷

اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا صرف استعمال کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی اس حقیقت کا اعتراف بھی نہ ہو جو اسلام نے بیان کیا ہے ۱۱۸

حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں نبوت کی حقیقت اور اس کے ارکانِ ثلاثہ یعنی ملوکیت و سیاست، علم و حکمت اور رشد و ہدایت کی فطری اور غیر معمولی استعداد ۱۱۹

تعلیماتِ نبوت کے متعلق ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ ۱۲۰

نبوت کے ارکانِ ثلاثہ کی مزید تشریح ۱۲۲

مقدمہ ہر شے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت مگر اعتبار کا ہی اور کمال مجموعہ میں ہے ۱۲۲

ملوکیت کی صورت اور اس کی حقیقت ۱۲۲

ملوکیت نبوت کی صورت و حقیقت ۱۲۳

ملوکیت نبوت کا اہم رکن عالم غیب سے اُس کا رشتہ ہے ۱۲۵

ملوکیت نبوت کی حقیقت خلافت ہے ۱۲۷

نبوت کے لئے قدرت جن نفوس کا انتخاب کرتی ہے ان میں اعلیٰ قابلیتیں بھی ودیعت فرما دیتی ہے ۱۲۸

آدم علیہ السلام کی سرگزشت میں اسی حقیقت پر ایک اہم تنبیہ ۱۲۸

آدم علیہ السلام اور ملائکہ اللہ میں مقابلہ کا امتحان اور اس کا نتیجہ ۱۲۹

نبوت کا رکن ثانی یعنی علم و حکمت ۱۳۰

علوم نبوت کی پہلی خصوصیت حقوقِ انسانیت کا تحفظ اور مصالح عام کی رعایت ہے ۱۳۰

حلال و حرام کا صحیح مفہوم ۱۳۲

علوم نبوت کی دوسری خصوصیت حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے ۱۳۲

علوم نبوت کی تیسری خصوصیت جزم وقطعیت ہے ۱۳۲

انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت اور جمیع کمالات کی نوع علیحدہ ہوتی ہے ۱۳۳

نبی کی عام صفات کی حقیقت بھی مخلوق کی عام صفات سے علیحدہ ہوتی ہے ۱۳۴

قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک خاص امتیاز ۱۳۶

حافظ ابن تیمیہؒ کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا طریقہ بھی دوسرے انواعِ انسانی کی طرح ان کے امتیازات و خواص ہیں ۱۳۷

نبوت و رسالت کی حقیقت دریافت کرنی گو مشکل ہے مگر نبی کی معرفت بدیہی ہے ۱۳۸

انبیاء علیہم السلام جب کبھی دنیا میں تشریف لائے ہیں تو اپنے کامل تعارف کے ساتھ آئے ہیں ۱۴۰

مشرکین عرب نے آپ کو ساحر و مجنون کیوں ٹھہرایا ۱۴۱

نبوت کے صدق و صفا کا بلند مقام ۱۴۲

قرآن کریم کا مشرکین کے مقابلہ میں اعلان کہ آپ ہرگز کاہن نہیں ۱۴۳

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ شاعر بھی نہیں ۱۴۴

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ کو ساحر و مجنون کہنا بھی انتہا درجہ ظلم اور سفاہت ہے ۱۴۵

حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کہ نبی و ساحر میں فرق بدیہی ہے ۱۴۶

مشرکین کے لیے حقیقت اعتراض کی طرف قرآن کریم کے التفات فرمانے کی حقیقت ۱۴۷

آپ کی صفاتِ حمیدہ کے مشاہدہ کر لینے کے باوجود ابتداء میں مشرکین عرب نے آپ کو کیوں نبی نہیں مانا؟ ۱۴۹
ضرورت نبوت ورسالت ۱۵۱
رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ورق حق پسند انسانوں کے غور وفکر کے لئے ۱۵۸
جن کو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی خصوصیات کا ذرا بھی علم تھا وہ ان کو دیکھ کر یا ان کے مختصر حالات زندگی سن کر فوراً ان کو پہچان لیتے تھے ۱۶۱
انبیاء علیہم السلام میں وہ اخوت نبوت ہوتی ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لئے ہمہ تن احترام ہوتا ہے اور ان میں کہیں اختلاف کا نام ونشان نہیں ملتا ۲۱۵
انبیاء علیہم السلام سب بشر تھے اور سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت نوعِ بشر کے لئے ٹھہر چکی ہے وہ ہمیشہ ان پر بھی جاری ہوتی چلی آئی ہے ۲۲۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت اسی طرح پیش آئی جیسا عام بشر کو کبھی پیش آ جاتی ہے ۲۳۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے ایک بار کاٹا اور آپ نے اس پر اسی طرح دم فرمایا جیسا بشر کو دم کرنا چاہئے ۲۳۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا اور آپ پر بھی اسی طرح چل گیا جیسا عام بشر پر چل جاتا ہے ۲۳۴
ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلایا گیا اور اس کے اثرات سے آپ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی جیسی بشر کو ہونی چاہئے ۲۳۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار زخمی ہوئے حتی کہ آپ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے آپ نے اس کا علاج اسی طرح کیا جیسا بشر کرتے ہیں ۲۳۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان امور کی فکر لاحق ہوتی تھی جن کی فکر بشر کو فطرۃً لاحق ہوتی چاہئے ۲۳۸
بشری سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت ۲۳۹
حضرات انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام نوع بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں ۲۴۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی امتیازی خصوصیت ۲۴۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ذائقہ کی امتیازی خصوصیت ۲۴۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کا ایک کرشمہ ۲۴۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی امتیازی خصوصیت ۲۴۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کی امتیازی خصوصیت ۲۴۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لعابِ دہن کی امتیازی خصوصیت ۲۴۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی خصوصیت ۲۴۸
وفات سے قبل انبیاء علیہم السلام کی اپنی حیات وموت میں اختیار ملنے کی خصوصیت ۲۴۹
وفات کے وقت انبیاء علیہم السلام کو پھر اختیار ملنے کی خصوصیت ۲۵۰
بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی خصوصیت ۲۵۲
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نمازِ جنازہ کی ایک امتیازی خصوصیت ۲۵۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کی غیبی تعزیت کی خصوصیت	۲۵۴
انبیاء علیہم السلام کے دفن میں امتیازی خصوصیت	۲۵۵
انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں امتیازی خصوصیت	۲۵۶
فرشتوں کے ساتھ آپ کی ہم کلامی کی خصوصیت	۲۵۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ و روزہ کی ایک خصوصیت	۲۵۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ کے تمثل کی خصوصیت	۲۵۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت و دوزخ کے مشاہدہ فرمانے کی خصوصیت	۲۶۱
انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز خصوصیت وحی نبوت ہے اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے	۲۶۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب سے تعارف کی ابتداء	۲۶۶
وحی کی اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید تر وحی اور وحی کی آواز	۲۶۸
فرشتہ کا غیبی طور پر قلب میں کوئی بات ڈالنا	۲۷۲
الرؤیا (خواب)	۲۷۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر	۲۷۵
وحی اور اس کا وزن آپ کے صحابہ پر	۲۷۸
نزول وحی کے وقت آپ کی اور اونٹنی کی بے چینی	۲۷۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ پر وحی آرہی ہے	۲۸۰
انبیاء علیہم السلام کو اپنی صفات میں اہل جنت کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے ان کے جسم تغیر سے محفوظ رہتے ہیں	۲۸۱
اہل جنت سے دوسری مشابہت ان کی دائمی حیات اور دائمی عبادت ہے	۲۸۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی فضلات میں اہل جنت سے مشابہت	۲۹۳
بحالت جنابت آپ کے لئے مسجد میں قیام کی اجازت اور اس میں اہل جنت کی ایک مشابہت	۳۰۱
کثرت ازواج میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت سے مشابہت	۳۰۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں قدرت کے بعض تکوینی اسرار	۳۰۷
انبیاء علیہم السلام میں اہل جنت کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں	۳۱۵
مسئلہ عصمت میں اختلاف کا سبب	۳۱۵
عصمت کی حقیقت امام ماتریدی کی نظر میں	۳۱۵
مؤلف کے نزدیک مسئلہ عصمت میں غور و خوض کے لئے سب سے اہم نقطہ انبیاء علیہم السلام کی صفات و ملکات سے بحث ہے	۳۱۶
انبیاء علیہم السلام کا جوہر فطرت	۳۱۹
انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں	۳۲۰
انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر نفس مطمئنہ رکھتے ہیں اور ضلالت کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہیں	۳۲۰
انبیاء علیہم السلام کی برکات اور صحابہ اور ماحول پر	۳۲۲
انبیاء علیہم السلام کے خصائل و عادات کا اثر ان کی امتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا والد کا اس کی اولاد پر بلکہ اس سے بڑھ کر	۳۲۳

عصمت کے ارکانِ اربعہ	۳۲۴
یہاں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کا اپنی عصمتوں کے متعلق نظریہ کیا ہے	۳۲۵
مسئلہ عصمت کی بحث میں ایک فروگذاشت	۳۲۵
حضرت آدم علیہ السلام کی ذلت قرآن کریم کی نظر میں	۳۲۶
مقام عصمت کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شانِ رفیع میں کسی ناشایاں عمل کی صورت بھی حقیقت کی برابر شمار ہو	۳۲۷
انبیاء علیہم السلام کی شان استغفار عصمت کے خلاف نہیں	۳۳۰
انبیاء علیہم السلام اور ملائکۃ اللہ کی عصمتوں میں فرق	۳۳۲
مکتوب حضرت مولانا نانوتویؒ اور معصومیت انبیاء علیہم السلام وہم تحقیق حقیقت کل طبعی	۳۳۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ طفولیت	۳۴۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ شباب	۳۵۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عصمت کا رعب و دبدبہ اور گمراہی کی طاقتوں کا اس کے سامنے سپر ڈالنا	۳۵۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شکل بننے سے شیطان کا عاجز رہنا	۳۶۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کا شیطانوں پر خوف اور ڈر	۳۶۴
آپ کے خاص محل بعثت میں شیطانوں کی مایوسی	۳۶۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیمہ کی پاکیزگی۔	۳۶۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر الٰہی سطوت وجبروت کا استیلاء	۳۶۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم آخرت کا استحضار اور اس کا یقین	۳۷۰
نبیؐ کی مبارک نظر میں متاعِ دنیا کی حقیقت	۳۷۱
حرف گناہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نفرت و بیداری	۳۷۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جزم و یقین کہ آخرت میں آپ سے کوئی مواخذہ نہیں	۳۷۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نمونہ تھے	۳۸۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہر عمل میں لازم ہے	۳۸۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل میں اتباع کرنے میں پس وپیش کرنا آپ کے غصہ کا موجب ہے	۳۸۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر خاموشی بھی شریعت میں اس کے جواز کے قطعی دلیل ہے	۳۹۲
رسول اگر معصوم نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ روئے زمین کے حق میں اس پر کیسے اعتماد کرسکتا ہے؟	۳۹۴
اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں (والعیاذ باللہ) تو ان کی امتیں گمراہ ہوکر رہ جائیں	۳۹۶
آپ کی عصمت کے خلاف قلب میں وسوسہ بھی ایسی خطرناک بات ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے	۳۹۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تشریع میں	۳۹۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی عصمت	۴۰۲
انبیاء علیہم السلام سے بددعائیہ کلمات کا برمحل صدور بھی صرف بشریت کی بناء پر ہوتا ہے	۴۱۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استغنٰی	۴۱۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبادت	۴۱۶
حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعداد	۴۱۷

نبی کے معنی ۴۱۸
نبی اور رسول کا فرق ۴۱۹
علماء امتی کانبیاء بنی اسرئیل کا مقصد ۴۲۰
وحی کا عام اطلاق ۴۲۰
رسالت کے عام معنی ۴۲۱
بعثت کے دوسرے معنی ۴۲۱
سیدنا و سید ولد آدم الرسول الاعظم محمد النبی الامّی المطلبی الهاشمی اولهم خلقاً و آخر هم بعثاً صلوات الله و سلامه علیه. ۴۲۳
ابوالبشر سیدنا آدم علیہ والسلام اولی نبی الله فی الارض ۴۳۶
سیدنا ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام ۴۴۸
سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام ۴۵۰
اول آنحضرت الی الارض ۴۵۰
سیدنا ہود علیہ والسلام ۴۵۴
سیدنا صالح علیہ والسلام ۴۵۶
سیدنا ابراہیم علیہ والصلوٰۃ والسلام خلیل اللہ وجد سیدنا حبیب اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ۴۶۱
سیدنا اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ذبیح اللہ ۴۶۸
حضرت موسیٰ کلیم اللہ ۴۷۴
حضرت داؤد علیہ السلام ۴۸۳
حضرت سلیمان علیہ السلام ۴۸۴
سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کی ایک اہم سرگزشت کے متعلق چند جدید علمی اور منصفانہ نکات ۴۸۵
قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں ۴۸۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی بڑی علامت ہے اس لئے اس کو عالم کے تعمیری نظم ونسق کے بجائے تخریبِ عالم کے نظم ونسق پر قیاس کرنا چاہئے ۴۸۵
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام کی جزئی معاملات کی اہمیت ۴۸۸
مسئلہ نزول کی حیثیت احادیث میں ۴۸۹
مسئلہ نزول کی حیثیت انجیل میں ۴۸۹
مسئلہ نزول کی حیثیت قرآن کریم میں ۴۹۱
مسئلہ نزول کی اہمیت اور اصول دین سے اس کا تعلق ۴۹۱
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام کی اہمیت تاریخی نظر میں ۴۹۲
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام کی وفات اہمیت تاریخ کی نظر میں ۴۹۳
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام کی وفات ہوچکی تھی تو نصاریٰ اور اہل اسلام خاص طور پر ان ہی کی حیات کے قائل کیوں ہیں؟ ۴۹۳
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام اگر وفات پا چکے ہیں تو ان کے متعلق حدیث وقرآن میں کہیں موت کا صاف لفظ کیوں نہیں؟ ۴۹۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ عام انسانوں کی موت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ۴۹۵
حیات وموت کا مسئلہ دنیا کے عام واقعات میں شامل ہے پھر قرآن وحدیث میں اس کی اہمیت کیوں ہے؟ ۴۹۵
خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ نزول کی اہمیت ۴۹۶
غیر موقت پیشین گوئیوں کا انکار یا تاویل دونوں خطرناک اقدام ہیں ۴۹۷
قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا؟ ۴۹۸
قرآن کریم کے رفع جسمانی اور حدیث کے نزول جسمانی کے اہتمام فرمانے کی حکمت ۴۹۹

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جتنی تفصیلات ثابت ہو چکیں کیا اس کے بعد بھی یہاں تاویل کرنا معقول ہے ۵۰۱
حضرت عیسیٰ علیہ والسلام کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم لفظ رفع کا ہے توفی کا لفظ قرآن کریم کی نظر میں اتنا اہم نہیں ۵۰۲
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آ چکا ہے یہاں ان کے معاملہ میں ایک ایک لفظ پر علیحدہ بحث معقول نہیں ۵۰۲
اسلام صرف علمی حدیث نہیں بلکہ سلف صالحین سے اس کی عملی صورت منقول چلی آتی ہے، لہٰذا محض کتب لغت کی حدود سے اس کی کوئی اور شکل بنالینا درست نہیں ۵۰۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ آیات پر غور کرنے سے قبل یہاں ان کے مقدمہ کی پوری وہ روئداد جو قرآن کریم نے نقل فرمائی ہے اور فریقین کے بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۵۰۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور ان کے عزت سے مرجانے کی جدید داستان ۵۰۶
صلیبی موت کا لعنتی ہونا اور اس کے مقابلہ میں عزت کی موت کا افسانہ اسلام میں بالکل بے اصل بلکہ معقول ہے ۵۰۹
رفع کا لفظ قرآن کریم میں ایک جگہ بھی لعنتی موت کی تردید کے لیے مستعمل نہیں ۵۱۰
رفع کے معنی قرآن اور لغت میں ۵۱۰
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا قرآن کریم سے اور اس کی تردید ۵۱۱
لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں ۵۱۲
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ میں لفظ مکر کا استعمال بھی ہوا ہے- ہر دو مقامات پر تدبیر الٰہی اور اس کا موازنہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ برتری کا اس میں ظہور ۵۱۲
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب و رفع کی تحقیق قرآنی روشنی میں ۵۱۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لانے کے بعد جملہ اہل اسلام کے نزدیک بھی وفات پائیں گے زیر اختلاف ان کی گزشتہ موت ہے ۵۱۶
حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تحقیق ۵۱۷
امام بخاری کی کتاب التفسیر میں حل لغات کا حصہ خود ان کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ امام ابوعبیدہ کا ترتیب دادہ ہے ۵۱۷
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں صلیب شکنی کا نکتہ ۵۱۹
قرآنِ کریم کی شان اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام کے خوف سے حقائق کے بیان کرتے میں ادنیٰ پس وپیش بھی اختیار کرے ۵۱۹
شبہات اور وساوس کا اثر عقائد کی ترمیم کرنا غلط ہے خود ان کا جواب دینا چاہیے ۵۲۰
کتاب اللہ میں، حدیثوں میں دیگر موجودہ کتب ساویہ کا مقابلہ میں مجازات اور استعارہ کا استعمال بہت کم ہے اور یہ اسلام کا ایک طغریٰ امتیاز بھی ہے- ۵۲۲
صریح حدیثوں میں تاویل کا خطرناک نتیجہ ۵۲۴
سیدنا روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت ۵۲۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی ہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قسم کھا کر ذکر فرمایا ہے ۵۲۵

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اب تک وفات نہیں ہوئی ان کو تشریف لانا ہے اس کے بعد ان کی وفات ہونی ہے	۵۲۷
حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریںگے اور زمین کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوں گے	۵۳۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ آئندہ تشریف لانے والے وہی عیسیٰ ہوں گے جن کی پیدائش بغیر والد کے ہوئی ہے' چنانچہ اس کی وضاحت کے لے آپ نے ان کے نام' ان کے نسب اور ان کی شکل وصورت بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے اسی کے ساتھ ان کی خدماتِ مفوضہ' ان کا منصب ان کے زمانہ میں امنِ عام کی کیفیت' رزق کی فراوانی اور دیگر تفصیلات بھی فرمادی ہیں	۵۳۳
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے شہر کا نام اور اس شہر میں خاص اس محل نزول کے وقت ان کا مکمل نقشہ اور ان کے زمانہ کی برکات	۵۳۵
شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تذکرہ کرنا کہ قیامت کی آمد کا صحیح وقت ان کو بھی معلوم نہیں مگر صرف یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے ان کو دجال کو قتل کرنا ہے- اس ضمن میں انہوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کا ایک حرف بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ خدمت دراصل خود اس امت ہی کے ایک شخص کے متعلق ہوگی اس کے بعد پھر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منتقل ہوجائے گی	۵۴۰
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں سب سے نمایاں تر خدمت دجال کو قتل کرنا ہے	۵۴۱
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ظہورِ برتری	۵۴۳
انما ینزل عیسیٰ علیه السلام من بین سائر النبیاء علیهم الصلوٰة والسلام خاصةً لانه اولی الناس یانبی صلی الله علیه وسلم وحجة و ایتانه علی قبر النبی صلی الله علیه وسلم و سلامه درود علیه علیهما الصلوة و اسلام	۵۴۶
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کے بعد شادی کرنا پھر ولادت ہونی اس کے بعد آپ کی وفات اور مقام دفن کا ذکر	۵۴۷
نبی امی ومطلبی الہاشمی سیدنا محمد بن عبداللہ جو سب سے برتر رسول ہیں بلحاظِ بعثت سب سے آخر اور بلحاظ پیدائش سب سے اوّل ان پر خدا کے بے شمار درود وسلام	۵۴۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر حلیہ جس کو پڑھ کر آپ کی نبوت اور آپ کی شانِ بزرگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے	۵۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پھر جمع کر رہا ہوں جگرِ لخت لخت کو   مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

بے شک ترجمان السنۃ کی یہ پیش کردہ جلد غیر معمولی وقفہ کے بعد آپ کے سامنے آ رہی ہے لیکن جب آپ کو درمیانی واقعات و حالات کی نامساعدت اور اس پر اس جلد کے مضامین کی اہمیت کا علم ہوگا تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تاخیر بھی کوئی تاخیر نہیں' صرف اس ایک جلد کے لئے ہزار ہا ہزار صفحات کی ورق گردانی کی گئی ہے' پھر اس پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں جو دماغی کاوش کی گئی ہے' اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا' اگر اس کو بیان کیا جائے تو کون ہے جو اس کو باور کرے گا۔

واقعات یہ ہیں کہ دوسری جلد کی تالیف سے جب مؤلف کا قلم فارغ ہوا تو وقت کے بعض اہم تقاضوں سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تیسری جلد میں سلسلہ وار کی بجائے ''اسلامی اقتصادیات'' پر قلم اٹھایا جائے' لیکن اس کے لئے ضرورت تھی کہ پہلے فن اقتصادیات پر جدید نظریہ کے تحت ہلکی سی نظر ڈال لی جائے' تاکہ عنوانات اور تشریحی نوٹ اسی روشنی میں پیش کئے جا سکیں اور احادیث کا ذخیرہ بھی اسی نظریہ کے ماتحت مرتب کیا جا سکے' چنانچہ اس کا بہت سا مواد جمع کر لیا گیا تھا' لیکن یہ سب مواد دماغ ہی کے اندر بکھرا پڑا تھا' ہنوز اس کے ضبط و قید کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک دوسری دینی خدمت مؤلف کے سامنے آ گئی جو اس تالیفی خدمت سے کہیں زیادہ اہم تھی اور اس کا وقت اب اتنا آخر ہو چکا تھا کہ اگر کہیں اور زیادہ تاخیر کی جاتی تو پھر اس میں سعی کرنا بعد از وقت ہو جاتی اس لئے اپنے اس محبوب ترین شغل کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا' پوری کوشش کی کہ اس جدید مصروفیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا قلم بھی متحرک رہ سکے' مگر میرے جیسے بے بضاعت انسان کے لئے بیک وقت ان دو مختلف کاموں کا جمع کرنا ناممکن ہو گیا' بالآخر کچھ مدت کے لئے تالیف سے یک قلم دست کش ہو جانا پڑا' پورے ایک سال کے بعد جب اس جدید خدمت کی طرف سے کچھ اطمینان میسر ہوا تو قسمت سے مؤلف کو سفر حجاز نصیب ہو گیا۔

اب بلاشبہ مقام تو ایسا تھا جہاں حدیث کی خدمت صحیح معنی میں قضیۂ زمین برسر زمین کا مصداق تھی' لیکن تصنیف و تالیف کی نزاکت جن حالات کی متقاضی تھی وہ یہاں پھر سازگار نہ تھے' ادھر حسب الاتفاق مؤلف کی آنکھوں میں کچھ ایسی تکلیف پیدا ہو گئی کہ چند منٹ کتاب دیکھنا بھی مشکل ہو گیا' سوچئے کہ جس کام کے لئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ درکار ہو' وہ اب چلتا تو کیونکر چلتا' اس لئے رضاء بقضا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا پڑا' تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جب مرض میں ذرا خفت محسوس ہوئی تو صحت کا انتظار کئے بغیر پھر قلم ہاتھ میں اٹھا لیا' لیکن اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ جدید ترتیب کے لئے جو مواد جمع کیا گیا تھا اس کی سب کڑیاں بکھر چکی ہیں اگر از سر نو ان کو پھر جوڑا جاتا تو تصنیف میں اور تعویق در تعویق ہوتی' اس لئے مجبوراً پہلی ترتیب کی طرف لوٹ جانا پڑا۔

ابھی رکے ہوئے کام کو شروع کئے کچھ عرصہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ ناگہانی طور پر احقر کا دست راست شدید زخمی ہو گیا' حتیٰ کہ انگشت شہادت کا ایک حصہ قطع کرنا پڑا' اور اب ضعف بصارت کے ساتھ کتابت کا یہ دوسرا آلہ بھی معطل ہو گیا' والحمدللہ علی کل حال و اعوذ باللہ من حال اھل النار' مقصود مقدرات کا شکوہ کرنا نہیں ہے اور کیسے کیا جا سکتا ہے' جبکہ سامانِ تعطل سب جمع تھے مگر تعطل کسی ایک جانب میں نہ تھا' قدرت نے ہر کام کے لئے دوسرے راستے کھول دیئے تھے' مقصد اس غیر متوقع

تاخیر کی معذرت ہے' الحمدللہ کہ ان معذوریوں پر بھی ترجمان السنۃ کی تالیف سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی' البتہ اب صورتِ تالیف بدل دینی پڑی یعنی خود کتابت کی بجائے صورت املاء یعنی دوسرے شخص کی مدد سے کتابت اختیار کرنی پڑی' گو مؤلف کے دماغ اور اس کے ہاتھ کے مابین قدرت نے مضامین کی آمد میں جو کشش رکھا ہے اس کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے مضامین میں نقصان واقع ہونا لازمی تھا مگر جبراً وقہراً اس پر راضی ہو جانا پڑا اور اللہ تعالیٰ کی مدد و فضل سے قدیم ترتیب پر کام شروع کر دیا گیا' اس لحاظ سے کتاب کا جو پہلا حصہ سامنے آیا وہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کے تذکرے تھے۔[1] بظاہر یہ موضوع سب سے آسان موضوع تھا' اکثر کتبِ احادیث میں اس پر مستقل ایک باب قائم کیا گیا ہے اور اس سلسلے کی حدیثیں ایک ہی جگہ مرتب کر دی گئی ہیں' اس لئے اس سلسلہ کی حدیثیں جمع کرنے میں بظاہر کوئی دشواری نہ تھی اور اس طریق پر ان کے ترجمے اور نوٹس میں بھی کوئی دقت نہ تھی' لیکن جب اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ترجمان السنۃ کی تالیف کے مقاصد کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس باب کو بھی موجودہ ضروریات کے تقاضوں کے مناسب مرتب کیا جائے اب دیکھا تو یہی موضوع کتاب کے موضوعات میں سب سے مشکل بن گیا کیونکہ مذہب کی بنیاد اسی مقدس جماعت کے ذریعے قائم ہوئی ہے اور ان ہی کی حیثیت سمجھنے میں عقلاء اور خود اہل مذہب کو بہت غلطیاں لگی ہیں' خالق اور صانع کا وجود کسی نہ کسی پہلو سے سب تسلیم کرتے ہیں کم از کم ایک (Creator) کی حیثیت ہی سے سہی اور اس کے مباحث بھی دروس اور کتابوں میں ہمیشہ ذکر ہوتے رہتے ہیں' لیکن انبیاء علیہم السلام اور مسائل نبوت ہمیشہ سے زیر بحث رہے ہیں اور متاخرین نے جو بحثیں کی ہیں وہ اور الجھاؤ کا موجب بن گئی ہیں' یہاں فلاسفہ قدیم جن کو الہیات سے کسی حد تک روشناس کہا جا سکتا ہے جب اس مسئلہ پر گذرے تو حقیقت تک رسائی تو درکنار وہ بالکل دوسری مخالف سمت میں جا نکلے' رہے ہمارے دور کے عقلاء تو وہ اس موضوع ہی سے روشناس نہ تھے' وہ بھلا اس موضوع میں کوئی صحیح بات لکھتے تو کیا لکھتے' ادھر خود اہل مذہب بھی اس افراط و تفریط میں پھنسے ہوئے نظر آئے کہ ایک فریق نے انبیاء علیہم السلام کی پراسرار ہستیوں اور ان کے معجزات کو دیکھا تو ان کی بشریت ہی کا صاف انکار کر دیا اور ان کو یہ بتانا ہی مشکل ہو گیا کہ جب وہ بشر نہ تھے تو پھر اور کس نوع میں داخل تھے' آخر انھوں نے توجیہ کرتے کرتے اسلام کے اس نکھرے ہوئے مسئلہ کو ٹھیک نصرانیت کی سرحد سے جا ملایا' دوسری جماعت نے اگر ان کی محسوس بشریت کا یقین کیا تو ان کے خصائص و کمالات کا انکار کرتے کرتے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا - اب وہ طبقہ جو مذہب کا تو عقیدت مند تھا لیکن مذہبی تعلیم سے نابلد تھا' ان اختلافات کو دیکھ کر انبیاء علیہم السلام کے صحیح مقام معلوم کرنے سے قاصر ہو گیا اور اس کے لئے ان کا اصل مقام سمجھنا ہی ایک بھول بھلیاں بن کر رہ گیا' اس لئے انھوں نے اپنی فہم اور اپنے اندازِ فکر کے مطابق جو مقام ان کے ذہن میں آیا وہ ان کے لیے تجویز کر لیا اور اس طرح یہ مسئلہ جو دین کا اساسی مسئلہ تھا تاریکی در تاریکی میں پڑ گیا اس لیے مؤلف کے لئے ضروری ہو گیا کہ اس باب کو اس طرح مرتب کیا جائے جس کے مطالعہ کے بعد اس میں تمام غلط خیالات کی تصحیح ہو جائے اور ان بزرگ ہستیوں کا شرعاً جو صحیح صحیح مقام ہے وہ ان کے حالات کے ضمن میں کسی تکلف کے بغیر خود بخود

---

[1] انبیاء علیہم السلام کے حالات کے متعلق ''ندوۃ المصنفین'' نے ''قصص القرآن'' مستقل ایک محققانہ تصنیف شائع کی ہے لیکن اس کا خاص موضوع وہ قصص ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں' اس لئے وہ بھی ہمارے لئے کارآمد نہ ہو سکی' لہٰذا اس باب کی ترتیب میں کتب الاحادیث کے علاوہ ''البدایہ و النہایۃ'' اور الدر المنثور سے ہم کو زیادہ مدد ملی ہے'

واضح ہوتا چلا جائے' اس غور وخوض میں یہ محسوس ہوا کہ جس طرح نبوت تمام دین کی اساس ہے اسی طرح وحی نبوت کی اساس ہے اس لحاظ سے وحی[1] کی حدیثیں اور اس پر مختلف عنوانات بھی قائم کرنے اہم نظر آئے غالبًا اسی لئے امام بخاری علیہ الرحمہ نے بھی عام محدثین کی ترتیب کے خلاف اسی باب سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے' اس سے امام موصوف کی وقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے' اس عنوان کے تحت اگر چہ خود امام بخاری کی کتاب میں چند حدیثیں جمع کی گئی ہیں' لیکن ''ترجمان السنۃ'' کے مقاصد وعنوانات کے پیش نظر وہ کافی نہیں تھیں' اس لئے اس کے لئے دور دور سے مختلف ابواب سے حدیثیں تلاش کرنی پڑیں' مثلاً کتاب الحج' کتاب الدعوات' کتاب التفسیر' باب التوکل' اب ذرا اندازہ فرمائیے کہ ان ابواب کی وحی کے ساتھ کیا مناسبت ہے' اس لئے کس جانفشانی کے ساتھ یہ احادیث ان ابواب سے منتخب کی گئی ہوں گی' پھر جب آپ ''ترجمان السنۃ'' ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان عنوانات کے لئے ان احادیث کا انتخاب کتنا اہم تھا-

انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے سلسلہ میں انکی بشریت اور ان کی بشریت کی خصوصیات' پھر عام بشریت سے اس کے امتیازات پر متعدد ابواب بھی قائم کئے گئے ہیں تا کہ اگر ایک طرف ان کی بشریت ثابت ہوتی رہے تو دوسری طرف عام بشریت سے ان کی برتری بھی واضح ہوتی رہے اور اس طرح یہ مسئلہ پورے توازن اور اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ ذہن نشین ہوتا چلا جائے' نیز یہ بھی واضح ہو جائے کہ جن انسانوں کو اللہ تعالیٰ ہم کلامی کا شرف بخشتا ہے' انکی صفات کیا ہوتی ہیں' پھر یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے صفت عصمت ہونا کیوں ضروری ہے' اس کے بعد وحی اور انبیاء علیہم السلام کی[2] معصومیت پر خاص طور پر نظر ڈالی گئی ہے، کیونکہ ان کے تعارف کے لئے سب سے زیادہ اہم یہی دو صفتیں ہیں' اس کے بعد پھر جن انبیاء علیہم السلام کے اسماء گرامی اور ان کی حیات طیبہ کے کچھ حالات جو حدیثوں میں آ چکے تھے' چونکہ ''ترجمان السنۃ'' جلد اول میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلحاظ خلقت سب سے پہلے اور بلحاظ بعثت سب سے آخری رسول ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس باب کو ہم آپ ہی کے اسم مبارک سے شروع کریں اور آپ ہی کے اسم مبارک پر ختم کر دیں تا کہ آپ ؐ کی اوّلیت وآخریت کا نقشہ ہماری تصنیف میں بھی آنکھوں سے نظر آ جائے-

یہاں بھی حسب دستور سابق نبوت کے متعلق پہلے ایک بسیط مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس باب کے تشریحی نوٹ پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتے' اسی طرح عصمت انبیاء علیہم السلام کی حدیثوں سے پہلے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ لکھا گیا ہے' حدیثوں سے تشریحی نوٹ دیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ کرنا بھی انتہائی اہم ہے' اس جگہ ضروری ہے کہ جلد اوّل ص ۱۳۸ تا ص ۱۴۴ اور ص ۴۵۵ تا ص ۴۶۴ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے کیونکہ اس مسئلہ کے بہت سے اہم پہلو ان صفحات میں صاف

---

[1] اس موضوع پر بھی ندوۃ المصنفین کی مشہور کتاب ''وحی الٰہی'' مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے' افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہمارے سامنے نہ تھی اس لیے استفادہ نہ ہو سکا' مناسب ہے کہ تفصیلی مباحث کے لئے کتاب مذکورہ کا مطالعہ کیا جائے-

[2] اس موضوع پر امام رازی نے اپنی مشہور تفسیر کی جلد اول وثالث وخامس میں تقریباً دس مقامات پر کلام فرمایا ہے' ہم نے ان تمام مقامات کے علاوہ بھی تفسیر مذکورہ کی ورق گردانی کی مگر کوئی ایسی بات دستیاب نہ ہو سکی جو موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہوتی' اس لئے اس باب کی ترتیب میں حافظ ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور دیگر کتب محققین سے مدد لی گئی ہے-

کئے جا چکے ہیں' اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ آپ کو سب سے زیادہ طویل نظر آئے گا اور اس کا راز یہ ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق امت محمدیہ کے ساتھ آئندہ زمانہ میں بھی ثابت ہوتا ہو صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہستی ایسی ہے جن کے متعلق حدیثوں میں باصرار وتکرار یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بحیثیت ایک حکم (جسٹس) کے تشریف لاکر اہل کتاب اور اہل اسلام کے مابین مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ فرمائیں گے اور قیامت سے قبل اتحادِ ملل کی اہم خدمت انجام دیں گے' اس لئے ضروری تھا کہ وہ رسول ایسا ہی ہو جس کی شخصیت فریقین کے نزدیک مسلّم ہو۔

ظاہر ہے کہ ہنگامۂ قیامت اگر حق ہے تو ان کی تشریف آوری اس سے کچھ عجیب تر نہیں ہے' جس دور میں اولین وآخرین کا قبروں سے زندہ ہوکر ایک میدان میں جمع ہونا ادیانِ سماویہ کا متفقہ عقیدہ ہو اس کے قرب میں صرف ایک انسان کا اور وہ بھی ایسا انسان جو زندہ ہو آسمان سے زمین پر آجانا کیا تعجب کی بات ہے صحیح مسلم جو امام بخاری کی کتاب سے بلحاظ صحت گو دوسرے نمبر پر خیال کی گئی ہے لیکن از روئے حسن ترتیب اس کو امام موصوف کی کتاب پر بھی ترجیح دی گئی ہے' ہم نے بارہا دیکھی مگر اس مقام پر جس باریک بینی سے امام موصوف نے کام لیا ہے اس کی طرف کبھی ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوا یعنی انھوں نے جب کتاب الایمان پر عنوانات رکھے تو عام محدثین کے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرتے کرتے یہاں ایک جدت بھی کر گئے کہ مسئلہ نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور معراج جیسے مسائل کی اہمیت کے پیش نظر ان کو کتاب الایمان کا جزو بنا گئے' حالانکہ ان کے دور میں یہ مسائل کسی اختلاف کے بغیر امت مسلمہ میں بالاتفاق ایمان کا ایک جزو ہی سمجھے جاتے تھے' چنانچہ کتب عقائد میں مسئلہ نزولِ مسیح علیہ السلام کو بالاتفاق عقائد ہی کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے' جب ترجمان السنۃ کی ترتیب کا زمانہ آیا تو اس وقت ہم کو امام موصوف کی اس دور بینی کی قدر ہوئی اور امام موصوف کی وجہ سے اس مسئلہ کو کتاب الایمان کا جزو بنانے میں ہم کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور اب ذہن اس طرف متوجہ ہوگیا کہ اس مسئلہ کی حیثیت دیگر عام پیش گوئی کی سی نہیں ہے بلکہ ان عقائد کی سی ہے جو تواتر سے ثابت شدہ ہیں' ہماری خوش نصیبی سے حضرت استاذ مرحوم اس مسئلہ کی احادیث اپنی حیات میں بشکل رسالہ جمع فرما گئے تھے اس لیے ہم نے اس مجموعہ کا بقدر ضرورت انتخاب یہاں درج کردیا ہے البتہ عنوانات اپنی جانب سے لگادیئے ہیں' مگر ان عنوانات کی وجہ سے احادیث میں صحت وحسن کی ترتیب قائم رکھی نہیں جاسکی' اگر ان عنوانات کے ساتھ آپ نبوت ورسالت پر جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں ان کو بھی شمار کرلیں تو صرف اس ایک مسئلہ پر تقریباً سو عنوانات ہوں گے۔

ترتیب کے لحاظ سے اسکے بعد قضاوقدر کا مسئلہ تھا لیکن چونکہ وہ مرتب کر کے پہلے ارسال کیا جاچکا تھا اس لئے اس کی کتابت پہلے ہوگئی اور اب وہ اس جلد کے شروع میں آپ کو ملے گا' یہ مسئلہ خود اہل سنت والجماعت کے درمیان ابھی تک کوئی آخری فیصلہ نہیں پا سکا چنانچہ آج تک امت مسلمہ کے دو مشہور امام شیخ ابوالحسن اشعریؒ اور امام ماتریدیؒ کا اختلاف کتب کلام میں منقول ہوتا چلا آرہا ہے اگرچہ اکثر علماء کی رائے امام ماتریدیؒ کے مسلک کی طرف ہے لیکن صرف اس رجحان سے مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں ہوتا' اس لئے ہم نے یہاں دو مقالے الگ الگ اپنے مقدارِ علم کے مطابق پیش کردیئے ہیں' مگر دونوں مذہبوں کے مابین اختلاف کی زیادہ تشریح نہیں کی اور نہ ہر موقع پر اس کی تنبیہ ضروری سمجھی ہے' کیونکہ یہ ایک فنی دائرہ کی چیز تھی' قارئین کو اس میں الجھانا مناسب نہ تھا' لیکن اہل علم حضرات اس کا بھی اندازہ فرماسکیں گے' افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں اردو اور فارسی کتب کا کوئی ذخیرہ یہاں ہمارے

پاس موجود نہ تھا اور نہ اہل قلم کے وہ مضامین جو اس موضوع کے متعلق منتشر طور پر شائع ہو چکے تھے پیش نظر تھے' اس لئے ان سے استفادہ کا قطعاً موقع نہیں مل سکا حالانکہ بہت اہم تھا کہ اپنے قریبی دور کے علماء کے شائع شدہ مقالات کا مطالعہ کرلیا جاتا تاکہ جو پہلو ان میں صاف ہو چکے تھے ان کو بھی اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر دیا جاتا' مگر اس قسم کا ذخیرہ یہاں کلیتہً مفقود تھا اور یہ امر تو جلد ثانی کے مقدمہ میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ یہاں جو کاوش خود مؤلف نے پہلے ایک بار کی تھی قسمت سے وہ دور فتن کے نذر ہو چکی' اس لئے اب اس فرصت میں جو ممکن تھا وہی پیش کیا جا رہا ہے' بایں ہمہ اس موضوع میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کو آپ بار بار ملاحظہ فرمائیں گے تو یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ مسئلہ ایک پہلو سے جتنا نظری ہے دوسرے پہلو سے اتنا ہی بدیہی بھی ہے اور غالب کا یہ مشہور شعر غالباً اسی مسئلہ کے لئے زیادہ مناسب ہے ؎

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

ساری مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ناقص ادراکات کو کامل اور قلیل علم کو کثیر سمجھتا ہے اور اس لئے اپنے دائرہ محسوسات سے خارج اشیاء کو نہ سمجھتا ہے اور نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ان کو بھی اپنے مشاہدات ہی کی حدود میں لانا چاہتا ہے مسئلہ قضاء وقدر کا ایک پہلو تو خالق سے متعلق ہے جو اس کے تصور سے بھی وراء الوراء ہے اور دوسرا خود اسی کے باطن سے متعلق ہے' انسان نہ اتنی دور بینی کی طاقت رکھتا ہے اور نہ اتنے قریب تر دیکھنے کی اس کی بصارت کے لئے بھی قرب و بعد کے مابین ایک محدود مسافت شرط ہے کہ اگر اس چیز کو اس سے زیادہ نزدیک لے آؤ تو پھر وہ دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور اگر ذرا دور لے جاؤ تو پھر اس کے ادراک سے عاجز ہو جاتا ہے' اسی طرح اس کی بصیرت کا معاملہ ہے' یہاں بھی زیادہ دور اور بہت زیادہ نزدیک شئے کے ادراک سے اس کی عقل عاجز رہتی ہے' اس لئے نہ الٰہیات کا وہ پورا ادراک کر سکتا ہے اور نہ اپنے نفس کے اختیار کی حدود کی پوری پوری تشخیص کر سکتا ہے' مگر مشکل یہ ہے کہ اس عجز و قصور کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا' تاہم ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ مسئلہ کو جتنا قریب الی الفہم کیا جا سکے کر دیا جائے' اس لئے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر پہلے ان اوراق کا مطالعہ فرمالیں اور بار بار فرمائیں اور سمجھنے سے پہلے اس میں اعتراضات پیدا کرنے کی الجھن میں نہ پڑیں' امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سکون و اطمینان کی روشنی سے مستفیض ہو سکیں گے' اس سلسلہ میں منتشر کتب کے علاوہ جن کتابوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے' وہ درج ذیل ہیں۔

(١) شرح الموقف للدوانی ؒ (٢) شرح العقائد للنسفیؒ (٣) حاشیه الکنبوی (٤) حاشیه احرجانی (٥) کتاب السنة للامام احمدؒ (٦) شرع العقیده الطحاویة (٧) حجة الله البالغة (٨) الروضة البهیه (٩) شفاء العلیل لابن القیم (١٠) منهاج السنه لابن تیمیه (١١) شرح الفقه الاکبر (١٢) المسامره لابن الهامؒ (١٣) الاستبصار للکوثری (١٤) موقف البشر المصطفی البصری۔

ان میں سے آخر کی دو کتابیں ہمارے ہی دور کے علماء کی تالیف کردہ ہیں جن میں علامہ کوثریؒ' امام ماتریدیؒ کے مسلک کی تائید میں ہیں اور مصطفیٰ صبری' شیخ اشعریؒ کے مسلک کے۔ مصطفیٰ صبری کی کتاب کا ہم نے پورے غور و خوص کے ساتھ بار بار مطالعہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی مساعی قابل داد ہیں علامہ کوثری نے ان کے جواب کی پوری سعی کی ہے اب یہ فیصلہ ناظرین کے سپرد ہے کہ علامہ مصطفیٰ اور علامہ کوثری میں یہاں کس کا پلہ بھاری ہے؟ ہم نفس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تو

در کناران علماء کے مابین فیصلہ کرنا بھی اپنی مقدارِ علم سے بالاتر بات سمجھتے - وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْم۔

جلد ثالث کی ترتیب میں مؤلف کے سامنے ایک جدید مشکل یہ بھی درپیش رہی کہ اب بحمدہٖ تعالیٰ کتاب میں احادیث کا ذخیرہ ایک ہزار سے تجاوز کر چکا ہے چونکہ احادیث بالکل جدید ترتیب سے جمع کی جا رہی ہیں اس لئے اتنے طویل ذخیرہ میں پورے طور پر یہ استحضار رہنا بہت مشکل ہے کہ کس مناسبت سے یہ حدیث کس عنوان کے تحت پہلے گذر چکی ہے' بسا اوقات بڑی تلاش وتتبع کے بعد تیسری جلد کے عنوان کے لئے ایک حدیث منتخب کی گئی لیکن جب زیادہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ حدیث ایک بار پہلے بھی گذر چکی تھی اس لئے نہ صرف سعی بیکار رہی بلکہ اس کے لئے اب دوسری حدیث کا انتخاب کرنا ایک جدید محنت کا محتاج ہو گیا اب اس دور میں نہ اتنا حفظ قوی ہے نہ اتنا تنقیط کہ جو احادیث قلم سے ایک بار نکل جائیں پھر جب کہیں وہ مکرر آئیں تو یہ یاد آ جائے کہ اس مناسبت سے ایک بار پہلے وہ فلاں عنوان میں گزر چکی ہے' اس لئے ہوسکتا ہے کہ پوری جانفشانی کے باوجود کوئی حدیث آپ کو مکرر بھی نظر پڑے' آپ اس کو مؤلف کے قصورِ حفظ پر محمول کر کے ساتھ تا امکان ہم نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ جہاں کوئی مضمون کے مناسب حدیث گزر چکی ہے اس کا حوالہ دے دیا جائے اور اگر گذشتہ کسی مضمون کا مطالعہ اس جلد کے لئے ضروری ہو تو اس کا حوالہ بھی دے دیا جائے اب اتنی محنت قارئین کے ذمہ ہے کہ وہ اس حوالہ کی مراجعت کر کے اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔

ترجمان السنۃ نے جس خدمت کا ارادہ کیا ہے اس کی تشریح کسی حد تک جلد اوّل وثانی کے مقدمہ میں کر دی گئی ہے' لیکن اب اس کی جلد ثالث سامنے آ جانے کے بعد اس امر کی وضاحت کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ ''ترجمان السنۃ'' نے حدیث کی خدمت کے ساتھ ساتھ مسائل کلامیہ کی حدیثی روشنی میں دیکھنے اور شرعی پہلو سے ان کے سلجھانے میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے اور اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح کسی وقت علم کلام پورا کا پورا احادیث کے تحت کھینچ لیا جائے تو اس کے مستقل فن بن جانے کی وجہ سے جو موشگافیاں پیدا ہو چکی ہیں وہ ایک حد تک ختم ہو جائیں اور یہ فن مضر ہونے کی بجائے بڑی حد تک مفید بن جائے یہ امر بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ جب یہ کام شروع کیا گیا تھا تو اس وقت یہ تصور بھی نہ تھا کہ یہ کام اتنا پھیل جائے گا' اور خیال یہ تھا کہ کتاب الایمان صرف پہلی جلد میں سما جائے گی اور اگر بالفرض جدید عنوانات کے پیش نظر پہلی جلد ناکافی رہی تو زیادہ سے زیادہ دوسری جلد کے لئے یقیناً کافی ہو جائے گی' لیکن جب تیسری جلد کا وقت آیا تو ایسے اہم مباحث سامنے آ گئے کہ اب یہ جلد بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ بحث غالباً اب چوتھی جلد میں تمام ہو گی اور بہت ممکن ہے کو جو ترتیب مؤلف کے سامنے ہے اس کے لحاظ سے پانچویں جلد تک بھی پھیل جائے گی' یہ ظاہر ہے کہ اس طرح اضافہ صرف ابواب وعنوانات ہی میں ہو رہا ہے' یعنی جو احادیث کتب مدونہ میں دوسرے ابواب وعنوانات کے تحت پھیلی ہوئی تھیں وہ ہمارے یہاں کتاب الایمان میں سمٹتی آ رہی ہیں اور اس طرح اگر کتاب ایک طرف طویل ہو رہی ہے تو دوسری طرف مختصر بھی ہوتی جا رہی ہے' اس لئے کتاب کی طوالت سے اضطراب وگھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ہر چند می رود سخن دوست خوشتر است

اعتراف واعتذار

ہم کواس امر کا پورااعتراف ہے کہ اس جلد میں چند حدیثیں ایسی بھی آ گئی ہیں جو محدثین کے نزدیک زیادہ ضعیف ہیں، مگر یہ ان ہی مقامات میں آئی ہیں جہاں نہ تو کسی عقیدہ کی بحث ہے اور نہ عمل کی، پھر اس موضوع میں اس سے زیادہ نکھری ہوئی حدیثیں ہماری نظر سے کسی کتاب میں نہیں گذریں، نیز اسی کے ساتھ ان کے خلاف بھی کوئی حدیث خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو نظر سے نہیں گذری، غالباً ان ہی وجوہات کی بناء پر اخبار وفضائل کی حدیثیں جمع کرنے والے محدثین نے اس قسم کی حدیثیں بھی اپنی مؤلفات میں شامل کر لی ہیں اور اس علم کے ساتھ شامل کی ہیں کہ ان کی اسنادی حیثیت کیا ہے، اس لئے یہاں منکرین حدیث کے لئے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

ہمیں اس جلد میں یہ مزید تنبیہ کرنی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آپ ؐ کی سیرت کے حصے کے لئے بھی عقائد و اعمال کی حدیثوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی اسنادوں کی شرط لگانی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ تشدد بے جا تشدد ہے، بلکہ سیرت کے ایک بیش قیمت حصہ کا عظیم الشان نقصان ہے، آخر آج ہمارے سامنے دنیا کی دیگر تاریخیں بھی موجود ہیں جن کو اعتبار ہی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر کیا ان کو اسنادی لحاظ سے یہ مقام بھی حاصل ہے یا وہ محض معاصرین کے بے سند بیانات یا چند قدیم کتبوں اور محض افواہوں کی بناء پر مرتب ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں اصولِ درایت کو سامنے رکھے بغیر ان کو اعتبار کا کوئی مرتبہ حاصل نہیں اسی عادت کے پیش نظر بعض سیرت نگاروں نے اعداء اسلام کے محض متعصبانہ اعتراضات سے خائف ہو کر یہ ضرورت محسوس کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی دوبارہ نظر ڈالی جائے اور مافوق العادۃ اور غیبی عجائبات سے خالی کر کے جہاں تک اس کو مادی عقول کے قریب لایا جاسکتا ہے قریب کر دیا جائے، ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جن مصنفین نے سیرت کے صرف اتنے حصہ کو جمع کیا ہے جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہے یہ بھی ایک مستحسن سعی ہے، لیکن سیرت کے اس حصہ کو جو دوسرے یا تیسرے نمبر کی حدیثوں سے ثابت ہے، بالکل نظر انداز کر دینا یہ طریقہ مستحسن نہیں ہے، جب یہ تشدد احکام کی حدیثوں میں قائم نہیں رکھا جاسکا اور صحیحین کی شرائط سے کم تر دوسرے اور تیسرے نمبر کی احادیث بھی جمع کی گئیں بلکہ معاجم اور مسانید میں اور ہلکے سے ہلکے معیار کی حدیثیں بھی لے لی گئیں تو پھر سیرت کے عام حصوں کے لئے اس معیار کو معیوب کیوں سمجھا جائے، جب دینی مسائل کی تفصیلات کے لئے اعلیٰ معیار سے اترنا پڑا ہے تو پھر سیرت کے حصے کی پوری تفصیلات صرف اعلیٰ معیار کی حدیثوں سے کیونکر سامنے آ سکتی ہیں ہمیں یہاں نہ تو محض حسن عقیدت سے آپ ؐ کی سیرت میں کوئی بات اضافہ کرنی چاہئے اور نہ صرف اعداء اسلام کی خاطر آپ ؐ کی سیرت میں قطع برید کرنی چاہیے۔ نیز ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے سامنے آپ ؐ کا کونسا حصہ ہے ظاہر ہے کہ واقعات و حالات کی نوعیت کے ساتھ ان کے ثبوت کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے بعض کی واقعات محض قرائن سے تصدیق کر لی جاتی ہے اور ان کے لیے اسناد کا مطالبہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا مثلاً ایک قدیم بیمار کے متعلق شہرت ہوتی ہے کہ اس کی وفات ہوگئی، یا کسی گھر میں اُمید کا سال معلوم ہوتا ہے اور خبر اڑتی ہے کہ فلاں گھر میں ولادت ہوگئی تو فوراً اس کا یقین پیدا ہو جاتا ہے، کون ہے جو یہاں ان خبروں

2 پر یقین کر کے فوراً ان کے مناسب انتظامات کرنے میں مشغول نہ ہو جاتا ہو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر خبر کے اعتماد کا دارو مدار صرف اسناد پر قرار دے دینا عام دستور بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے' پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ان حصوں کے لیے بھی جن کا تعلق آپ کے ابتدائی حالاتِ زندگی کے ساتھ ہے' اعلیٰ درجہ کی اسانید کا مطالبہ کرنا انصاف کا مطالبہ نہیں' کیا کوئی سلیم الفطرت انسان یہ حکم لگا سکتا ہے کہ ایک ایسی ہستی کے ابتدائی واقعات کے لیے جن کے متعلق کسی کے ذہن میں ابھی یہ نہ گزرا ہو کہ قدرت ان کو کل کس منصبِ جلیل سے نوازنے والی ہے شروع سے پورا پورا اہتمام کیا گیا ہوگا بالخصوص ایک امی ماحول میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ چند در چند وجوہات کی بناء پر ان واقعات کے قانونِ روایت و درایت کے تحت باضابطہ لانے میں کچھ امور مانع آگئے ہوں مثلاً اس وقت ان کے زیر مشاہدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تحفظ کی اہمیت ذہنوں میں نہ آئی ہو اور آئندہ دور میں چل کر شغل جہاد کی وجہ سے ان کے اعلیٰ معیار پر جمع کرنے کا اہتمام نہ ہو سکا ہو یا ان کے عقائد و اعمال کے مسائل نہ ہونے کی وجہ سے ان سے عام طور پر بحث ہی نہ کی گئی ہو' یا قدرت کے عجائبات کے خوگر دماغوں نے ان کو خلافِ عقول امور کی فہرست میں داخل ہی نہ کیا ہو' ظاہر ہے کہ جہاں نبوت' ملائکہ' وحی الٰہی اور متواتر معجزات کا شب و روز سماں بندھا ہو وہاں ان چند واقعات کی اہمیت کیا ہوگی جو اوّل تو نبوت سے پہلی زندگی کے ہیں پھر ان میں ایک واقعہ بھی ان واقعات سے عجیب تر نہ ہو جو روز و شب ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آ رہے تھے- اس قسم کے وجوہات کی بنا پر اگر ان کی اعلیٰ درجہ کی اسانید دستیاب نہ ہو سکی ہوں تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم آئندہ آنے والی نسلوں کے غور و فکر کا یہ سارا مواد ہی آپ کی سیرت سے حذف کر ڈالیں یا اپنے ثبوت کی نوعیت کے لحاظ سے ان کو سیرت کا جزء رہنے دیں' حافظ ابن کثیر جو بالاتفاق معتمد محدثین میں شمار ہوتے ہیں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں:

وهذا سياق حسن عليه البها و النور و سيماء الصدق و ان كان في رجالة من هو متكلم فيه. (البدايه و النهايه ج ۲ ص ۲۱۹)	اسی واقعہ کی اسناد میں اگر چہ ایسے راوی موجود ہیں جن میں کلام کیا گیا ہے بااین ہمہ یہاں ایسے قرائن موجود ہیں' جن کی وجہ سے اس خبر پر صدق وصفا کا نور چمک رہا ہے-

آپ کی سیرت کے اس حصہ کے روایتی پہلو کے ساتھ اگر ہم اس پر درایتی پہلو سے نظر ڈالیں تو ہم کو پہلے یہ غور کرنا بھی ضروری ہوگا کہ یہ حالات ہیں کس ہستی کے متعلق؟ کیونکہ حالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس شخصیت کو بھی سامنے رکھا جائے جس کی نسبت یہ واقعات نقل کیے گئے ہیں- ظاہر ہے کہ انورے اور ہٹلر جیسے عاقل افراد کے متعلق ہر بعید سے بعید واقعہ کی تصدیق معقول سمجھی جاسکتی ہے گو اس کی نوعیتِ ثبوت کتنی ہی کمزور ہو' لیکن اگر ان میں سے ایک حیرت انگیز واقعہ بھی کسی دوسری عام شخصیت کی طرف منسوب کیا جائے تو قوتِ واہمہ اس میں سو طرح کے احتمالات نکال کھڑے کرتی ہے خواہ اس کی نوعیتِ ثبوت کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو' پس اس لحاظ سے جب ہم نظر کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ادیانِ سماویہ کے جتنے حاملین ہیں وہ سب متفقہ طور پر اپنے اپنے رسولوں کے متعلق کچھ نہ کچھ مافوق العادۃ عجائبات نقل کرتے چلے آئے ہیں' یہ امر یقینی ہے کہ ان میں اکثر واقعات کی نوعیت روایت و درایت ہر پہلو سے صفر کے برابر نظر آتی ہے مگر اس قدرِ مشترک اتفاق سے اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی زندگیوں میں کچھ امور عام انسانوں کی زندگیوں سے ضرور ممتاز تھے خواہ اس کے اسباب و وجوہات کچھ بھی

ہوں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دورِ طفولیت' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حمل اور ولادت اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات خود قرآن کریم میں بھی موجود ہیں جن کا روایتی پہلو اگر اتنا مضبوط نہ ہوتا تو شاید صرف درایت کے لحاظ سے ہمارے روشن خیال مسلمانوں کے لیے ان کا یاور کرنا مشکل ہوتا' لیکن یہاں تو گفتگو اس شخصیت کے متعلق ہے جس کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ وہ عالم کی سب سے عظیم تر ہستیوں میں بھی عظیم تر ہستی تھی پس اگر ان کی حیات میں کچھ ایسے عجائبات کا ظہور ملتا ہے جو اس نوع کے انسانوں میں تواتر کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے تو کیا ان کو اصولِ درایت کے خلاف کہا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہاں اس جماعت کے ساتھ بھی شدید اختلاف ہے' جنہوں نے پیغمبر اسلام کی حیات میں محض بے سروپا موضوعات داخل کر کے ان کو بھی عقائد کی فہرست میں داخل کر لیا ہے' زیر بحث امر صرف یہ ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے واقعات جو اسانید کے ساتھ ثابت شدہ ہیں' گو وہ ضعیف سہی مگر غیر معقول بھی نہیں بلکہ اس قسم کی شخصیاتِ بارزہ کی زندگیوں میں ہمیشہ نظر آتے رہے ہیں' کیا ان کو یکسر آپ کی سیرت سے خارج کر دیا جائے یا ان کے ثبوت کی نوعیت پر تنبیہ کے ساتھ ان کو سیرت کا جزو رہنے دیا جائے تا کہ وہ آپ کی نبوت کے مابعد حالات پر غور وخوض کرنے میں کارآمد ہوں۔

ترجمان السنہ کا مقصد اپنے مخاطبوں میں کسی ایک فریق کے ساتھ ساتھ چلنا نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر احادیث کی روشنی میں جو بات منقح ہوئی ہو صرف اس کو واضح کر دینا ہے' سعید ہیں وہ جو اپنے عقائد کی روشنی میں حدیثوں کا مطالعہ نہیں فرماتے بلکہ حدیثوں کی روشنی سے اپنے عقائد کی اصلاح کر لیتے ہیں' اس لیے ہم نے بلا خوف لومۃ لائم آپ کی زندگی کے وہ سب حالات جو محدثین کے نزدیک اس سے قبل ذکر میں آتے رہے ہیں یہاں بھی ذکر کر دیئے ہیں' اگر کوئی فریق اس پر چیں بجبیں ہوتا ہو تو ہو' ان مشکلات و حالات کو سامنے رکھ کر اب آپ ہی غور فرمالیجئے کہ اس طرح مسائل کلامیہ کے عنوانات حدیث کی کتاب میں قائم کرنا پھر اس کے لیے بعید سے بعید مقامات سے حدیثیں تلاش کر کر کے لانا اور ساتھ ساتھ جگہ جگہ ان پر محدثانہ نظر بھی کرتے جانا اور عنوانات واحادیث میں ایسی ترتیب قائم کرنا کہ مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں پھر ایسے متعدد مقالات لکھنا جو تمام تر حدیثوں کی روشنی ہی میں لکھے گئے ہوں' یہ کتنی فرصت کا محتاج ہے' بس یہی کچھ باتیں تھیں جو اس جلد کی تصنیف میں اتنی تاخیر کا باعث بن گئیں میں نے اس تاخیر کو تو بخوشی گوارا کر لیا مگر میں یہ گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ رسالت اور نبوت کے اتنے اہم مضامین اپنی مقدور بھر سلجھائے بغیر یوں ہی جوں کے توں ناظرین کے سامنے اٹھا کر رکھ دوں' اب یہ فیصلہ آپ کے سپرد ہے کہ اپنے ان مقاصد میں میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکا۔

مسودہ اب بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ بخوشی اس کو روانہ کیا جا سکتا' مگر چونکہ وہ صرف حجاج ہی کی معرفت روانہ ہو سکتا تھا' اس لیے اگر اصلاح وترمیم کا اور انتظار کیا جاتا تو پھر بات ایک سال پر جا پڑتی اس لیے بادل نخواستہ اپنے قبضہ سے جدا کرنا پڑا' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس ادھوری اور پراگندہ کوشش کو قبول فرما کر امت مسلمہ کے لیے نافع بنائے' آمین۔

<u>نوٹ:</u> ہر باب کے تشریحی نوٹوں کے ملاحظہ سے قبل از بس ضروری ہے کہ اس موضوع کے متعلق جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو بغور اور بار بار پڑھ لیا جائے ورنہ اگر تشریحی نوٹوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن رہ گئی تو اس میں مؤلف کے قصور کے ساتھ تھوڑی سی کوتاہی آپ کی بھی ہوگی۔ والحمدللہ اولاً و آخراً

بندۂ محمد بدر عالم نزیل مدینہ منورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

القَضَاء وَالقَدر

قال الشاه ولی اللّٰہ رحمه الله تعالٰی اعلم انّ اللّٰہ تعالٰی شمل علمه الازلی الذاتی کل ما وجد او سیوجد من الحوادث محال ان یختلف علیه عن شیء او یتحقق غیر ما علم فیکون جهلا لا علما' و هذا مسئلة شمول العلمو لیست بمسألة القدر و لا یخالف فیها فرقة من الفرق الاسلامیة انما القدر الذی دلت علیه الاحادیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قضاء وقدر اور اس پر ایک لمحہ فکریہ

مسئلہ قضاء وقدر بے شک بہت مشکل ہے لیکن ہمارے نزدیک خالق کا وجود تسلیم کرنے کے بعد اس کا انکار کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جس نے یہاں شریعت کی بیان کردہ راہِ اعتدال چھوڑی اس کو ہدایت کا انکار کرنا پڑا یعنی یا تو بندہ کو پتھر کی طرح مجبور ماننا پڑا اور یا اس کو خالقیت میں خالق کے برابر تسلیم کرنا پڑا۔ ہم یہاں آپ کے غور وفکر کی دعوت کے لیے چند سطور پیش کرتے ہیں۔ مسئلہ گو ان سے حل نہ ہو مگر ممکن ہے کہ کسی حد تک مزید انکشاف کا باعث ہو جائے وبہ نستعین۔

اسلامی جملہ فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ان سب کا حق تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے' اور یہ بات بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق جو کچھ ہونا ہے وہ سب کچھ قید کتابت میں بھی آچکا ہے اور اب عالم کا ایک ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کرسکتا۔ اس لیے بحث یہ پیدا ہوگئی ہے کہ اب انسانی افعال کی حقیقت کیا ٹھہری؟ کیا اس کو ان میں مجبور سمجھ لیا جائے یا مختار کہا جائے۔ اگر مختار کہا جاتا ہے تو پھر لازمی طور سے اس میں قدرت اور اختیار کی صفت بھی تسلیم کرنی ہوگی۔ ادھر قدرت اور اختیار تسلیم کر لینے کے بعد پھر قضاء وقدر کے سامنے اس کو مجبور کہنے کا مفہوم باطل ہو جاتا ہے اور اگر مجبور کہہ دیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ اس میں قدرت واختیار کی صفت کا بھی انکار کر دیا جائے اس لیے قضاء وقدر کی بحث میں اصل نقطہ غور وفکر ''افعالِ عباد'' یعنی بندوں کے افعال بن جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے سے قبل جب آپ عالم پر ایک نظر ڈالیں گے تو آپ کے سامنے دو قسم کی مخلوقات نظر آئے گی' ایک وہ جو اختیار وارادہ کے بداہتہً ایک نہیں وہ کھلے طور پر قدرتِ الٰہیہ کی مسخر بنی ہوئی ہے۔ مثلاً آفتاب حرکت کرتا نظر آتا ہے یا زمین وآسمان میں جو بھی متحرک ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ اپنے ارادہ سے متحرک نہیں' بلکہ ارادہ وقدرت الٰہیہ سے متحرک ہیں۔ دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو بداہتہً ارادہ واختیار کی مالک نظر آتی ہے۔ یہ تین قسم کی ہے' ایک وہ جو صرف خیر ہی کا ارادہ کرتی ہے' شر کا ارادہ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فرشتے کہلاتے ہیں' ان کی شان لَايَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمۡ وَ يَفۡعَلُوۡنَ مَايُؤۡمَرُوۡنَ ہے۔ یعنی جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتے' اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو

المستفيضة و مضى عليه السلف الصالح و لم يوفق له الا المحققون و يتجد عليه السؤال بانه متدافع مع التكليف و انه فيم العمل هو القدر الملزم الذى يوجب الحوادث قبل وجودها فيوجد بذلک الايجاب لايدفعه هرب و لا ينفع منه حلية. (صفحہ ۶۵ حجۃ اللہ)

الواحد منا يعلم بداهة انه بمديده ويناول القلم مثلاً و هو فى ذلک مريد قاصد يستوى بالتسبه اليه

حکم دیا جاتا ہے' یہاں نفی واثبات دونوں کو جمع کرنے سے اسی مضمون کی تاکید مقصود ہے- دوسری مخلوق اس کے برعکس ہے وہ شر کے سوا خیر کا ارادہ کرتی ہی نہیں' یہ شیطان ہے' تیسری قسم وہ جو ہر دونوع کے ارادہ کی مالک ہے' اور دونوں قسم کے ارادے کرتی بھی ہے یہ حضرت انسان ہیں- انسانوں کی پھر تین قسمیں ہیں ایک وہ جس کا ایمان اور جس کی عقل ومعرفت اس کی خواہشاتِ نفسانی پر غالب ہوتی ہے' یہ تو ترقی کر کے فرشتوں سے جاملتا ہے- دوسری اس کے برعکس ہے' یہ برادرِ شیطان بن جاتا ہے اور تیسری قسم وہ ہے جس کی عقل اس کی قوتِ شہوانیہ کی مفتوح ہو جاتی ہے' یہ بہائم اور حیوانات سے ملحق ہو جاتا ہے' جس طرح ان جملہ مخلوقات کا وجود محض حق جل وعلا کی بخشائش ہے' اسی طرح ان کا ارادہ واختیار بھی اسی کا عطا کردہ ہے-

اب ہم پہلے اصطلاحات اور مذاہب کی تفصیلات سے علیحدہ ہو کر سادہ طور پر اس مسئلہ پر نظر کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ہم کو ماننی پڑتی ہے کہ بندہ میں اختیار وقدرت کی صفت یقینی ہے اس کا انکار کرنا اپنے بدیہی وجدان کا انکار ہوگا- ایک بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اختیاری حرکات اور ایک رعشہ زدہ شخص کی حرکات کے مابین فرق سمجھتا ہے اور ہرگز دونوں کو یکساں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا' لیکن یہ بھی بدیہی ہے کہ جس طرح بندہ کا خود وجود اور اسی کے ساتھ اس کی دیگر صفات کمزور اور ضعیف ہیں' اسی طرح اس کی یہ قدرت اور اختیار بھی ضعیف در ضعیف ہے- دیکھئے انسان دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے' اس لیے اس کو شنوا اور بینا کہا جاتا ہے' مگر چونکہ اس کی یہ صفات ضعیف ہیں اس لیے ان کی کچھ شرائط بھی ہیں' اگر وہ نہ ہوں تو وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے- پھر ان شرائط کے ساتھ جہاں وہ سنتا اور دیکھتا بھی ہے وہاں بھی کچھ دور چل کر اس کی شنوائی اور بینائی کی دونوں صفتیں معطل نظر آتی ہیں مثلاً ایک خاص فاصلہ کے بعد نہ وہ کچھ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے' مگر کیا اس کی اس معذوری پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں سمع وبصر کی صفت ہی نہیں ہے- ہمارے خیال میں یہاں دو رائیں پیدا نہیں ہوسکتیں بالاتفاق یہی کہا جائے گا کہ ضرور ہیں مگر اتنی ضعیف ہیں کہ زیادہ دور چل کر کام نہیں دے سکتیں- اگر صفتِ اختیار بھی ایسی ہی ضعیف صفت ہو جس کا کچھ دور تک تو اثر ظاہر ہوتا رہے لیکن ذرا آگے چل کر اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو کیا اس ضعف کی وجہ سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دینا صحیح ہوگا یا اگر اس کا اقرار کر لیا جائے تو کیا پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ آخر تک اس کا اثر تسلیم کیا جائے- پس اگر ہم اپنے اختیار کے اثرات کچھ دور چل کر مضمحل یا معدوم دیکھتے ہیں تو اس بناء پر ہم کو اپنے بدیہی وجدان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے' اسی طرح اگر ہم اپنے بدیہی وجدان کی بنا پر اپنے نفس میں صفتِ اختیار تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے کہ پھر اس کے اثرات آخر تک بھی تسلیم کرتے چلے جائیں' اس لیے ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس بات کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم میں قدرت واختیار کی صفت موجود ہے مگر ہاں خود

الفعل والترک بحسب هذا لقصد وبحسب هذه القوی المتشجه فی نفسه وان کان کل شیٔ بحسب للصلحة الفوقانیه اما واجب الفعل او واجب الترک فکذلک الحال فی کل ما یستوجبه استعداد خاص فینزل من باری الضور نزول الصور (۱) علی المواد المستعدة لها کالا ستجابة عقیب الدعاء مما فیه دخل لمتجدد حادث بوجه من الوجوه و لعلک تقول هذا جهل بوجوب الشیء بحسب المصلحة الفوقانیة فکیف یکون فی موطنٍ

اس صفتِ اختیار پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے یعنی اس پر ہم قدرت نہیں رکھتے کہ اس اختیار کو جدھر چاہیں لگا دیں بلکہ ہماری یہ صفت مشیت الٰہیہ کے تحت اسی طرح جبری حرکت کرتی ہے جس طرح ایک سنگ انداز کے ہاتھ کا پھینکا ہوا پتھر نہ اس پتھر کو یہ قدرت ہے کہ وہ اس سمت کو چھوڑ کر جدھر سنگ انداز نے اس کو پھینکا ہے کسی اور سمت چلا جائے‘ نہ بندہ میں طاقت ہے کہ وہ اس جانب کے سوا جس جانب قدرت نے اس کے اختیار کو لگا دیا ہے کوئی ادنیٰ حرکت کر سکے- لہٰذا بندہ جو کرتا ہے یقیناً اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے‘ مگر وہ اپنے اختیار سے کرتا وہی ہے جو مختارِ مطلق اس سے کرانا چاہتا ہے- پس اس لحاظ سے کہ ہم جو کرتے ہیں اپنے اختیار سے ہی کرتے ہیں مختار کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ اختیار سے وہی کر سکتے ہیں جو مشیت الٰہیہ ہوتی ہے‘ مجبور کہلاتے ہیں یا بمنزلہ مجبور‘ مگر یہ ایسا جبر ہے جو جبر مطلق سے ممتاز ہے‘ کیونکہ جبر مطلق میں مجبور کو اپنے ارادہ کے ساتھ مزاحمت محسوس ہوتی ہے- مثلاً اگر کسی مؤمن کو کلمہ کفر کہنے کے لیے مجبور کیا جائے تو اگرچہ وہ کلمہ کفر زبان سے کہہ تو دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس خارجی جبر کی مزاحمت کا احساس بھی کرتا رہتا ہے یا مثلاً ایک منافق زبان سے کلمہ ایمان ادا تو کرتا ہے مگر یہاں بھی ظاہری خوف اس کے باطنی ارادہ کے لیے مزاحم رہتا ہے- لیکن جو چیز یہاں ہے اس کی ارادۂ مجبور کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ہوتی - انسان جو افعال بھی کرتا ہے وہ اپنے احساس کے مطابق آزادانہ اور پوری خود اختیاری سے کرتا ہے‘ حتیٰ کہ اگر تقدیر کا جبر اس کو بتایا بھی جائے تو وہ اس کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے- جس طرح یہاں بندہ کا جبر جبر مطلق سے ممتاز ہے اسی طرح اس کا اختیار بھی مطلق اختیار سے ممتاز ہے کیونکہ وہ جو چاہے اختیار نہیں کر سکتا بلکہ وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا اختیار مختارِ مطلق نے اس کو دے دیا ہے- خلاصہ یہ ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے مگر چاہتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اس سے کرانا چاہتا ہے- اب اگر اس اختیار کے ساتھ کوئی شخص اپنے نفس کو مجبور کہتا ہے تو کہے مگر وہ ایسا مجبور ہوگا جو معذور نہیں ٹھہر سکتا - پروردگارِ عالم کی خالقیت کا یہ کرشمہ بھی عجیب ہے کہ اس نے ایک مجبورِ محض کو کس حکمت سے ایسا مختار بنا دیا ہے کہ وہ اپنے گردو پیش میں اپنے احساس کے مطابق ادنیٰ سا جبر بھی محسوس نہیں کرتا ہے حالانکہ جبر کی گرفت اس پر اس درجہ سخت ہوتی ہے کہ وہ جنبش کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا - حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت اس لیے پیدا ہوگئی ہے کیونکہ یہاں افعال پر جبر نہیں افعال تو اپنے اختیار سے ہوتے ہیں‘ مگر خود اس کا اختیار حق تعالیٰ کی مشیتِ کاملہ کے تحت ہوتا ہے‘ اس لیے اس مختار کو اپنے جبر کا احساس نہیں ہوتا اگر جبر افعال پر ہوتا تو ضرور اس کا احساس ہوتا - یہ صفت صرف ربِ قدیر کی ہے وہ بندوں کے اختیار پر بھی حکومت کرتا ہے‘ قضاء وقدر کے رازہائے سربستہ سب اسی نقطہ میں پنہاں ہیں- بندہ مجبور ہو کر اپنے مختار ہونے کا مدعی بھی اسی لیے رہتا ہے کہ اس کو اپنا اختیار ہی اختیار محسوس ہوتا ہے‘ اور چونکہ اس کو یہاں اپنے ارادہ کے ساتھ کوئی

من مواطن الحق؟ فاقول حاش لله بل هو علم و ایفاء لحق هذا الموطن انما الجهل ان یقال لیس بواجب اصلا و قد نفت الشرائع الالٰهیة هذا الجهل حیث أثبتت الایمان بالقدر و ان ما اصابک لم یکن یحطئک و ما اخطاک لم یکن لیصیبک و اما اذا قیل یصح فعله و ترکه بجسب هذا الموطن فهو علم حق لا محالة کما انک اذا رأیت الفحل من البهائم یفعل افعال الفحلیه و رأیت الانثیٰ تفعل افعال الانثویه فان حکمت بان هذه الافعال صادرة جبرًا

مزاحمت محسوس نہیں ہوتی اس لیے فوقانی جبر کا اس کو کوئی احساس نہیں ہوتا اور جب جبر واختیار اس طرح مدغم ہو جائیں تو پھر اپنے افعال پر مسئول ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے- کیا ایسا مختار بھی مسئول نہ ہونا چاہیے جو اپنے وجدان میں بھی خود مختار ہو- اس فوقانی جبر کا حال تو صرف انبیاء علیہم السلام نے بتایا ہے- حیرت ہے کہ یا تو انسان ایک طرف مختارِ مطلق بننا چاہتا ہے ایسا مختار کہ تقدیر کے جبر کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا اور مسلمان ہو کر بھی اس کی تصدیق میں ہزار حجتیں نکالنے کو بیٹھ جاتا ہے' اور دوسری طرف جب تقدیر کا جبر تسلیم کرنے پر آتا ہے تو یہاں بھی اس کی روش معاندانہ ہی نظر آتی ہے- یعنی پھر جزاء وسزا میں الجھنے لگتا ہے' و لقد صدق الله عزوجل ﴿وَ كَانَ الْإِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکهف: ٥٤) (انسان فطرۃً جھگڑالو ہے) حالانکہ سوچنا تو یہ چاہیے تھا کہ کیا محکومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکم کے زیردست رہے پھر یہاں تو رشتہ صرف محکومیت کا ہی نہیں' بلکہ مخلوقیت کا بھی ہے کیا یہ معقول نہیں کہ یہاں ہمارا غیر مستقل اختیار بھی مختارِ کل کی مشیت کا محکوم بنا رہے' جب یہ معقول بات سامنے رکھی جاتی ہے تو دنیا شور بپا کر دیتی ہے کہ ہم کو مجبور بنا دیا' حالانکہ غور کی بات تو یہ تھی کہ جو سرے سے موجود ہی نہ تھا وہ مختار تھا کس دن' پھر جتنا کچھ مختار تھا تقدیر نے اس کو ختم کب کیا بلکہ آئینی طور پر اور تسلیم کر لیا ہے' پس یہاں تو یہ احسان کہ ایک معدوم محض کو شرفِ وجود بخشا پھر اپنی حکمتِ کاملہ سے ایک جمادِ محض (یعنی نطفہ) کو سمیع وبصیر اور مختار بنا دیا' ادھر یہ احسان فراموشی کہ شکوہ یہ ہے کہ مختار کو مجبور بنا دیا-

یہاں ایک مغالطہ یہ لگ گیا ہے کہ تقدیر اور بندہ کے اختیار کو علیحدہ علیحدہ سمجھ کر تقدیر کو بندہ کے اختیار پر حاکم مانا گیا ہے حالانکہ ہمارا اختیار بھی خود تقدیر کے دائرہ میں شامل ہوتا ہے' اسی قسم کا سوال ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا تھا ''یارسول اللہ امراض میں دواء کا استعمال اور جنگ میں ڈھال کا کیا خدائی تقدیر کو ٹال سکتا ہے' یعنی جب نہیں ٹال سکتا ہے تو پھر ان کے استعمال کا فائدہ؟ آپؐ نے جواب کتنا مختصر مگر کیسا تشفی بخش ارشاد فرمایا میرے صحابہ تم ان اسباب کو تقدیر سے خارج سمجھتے ہی کیوں ہو- تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دواء کرو گے تو شفایاب ہو گے' سپر استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے- پس ارتکابِ اسباب بھی احاطہ تقدیر میں داخل ہو چکا ہے-

حضرت ابن عباسؓ وباء شام کے قصہ میں نقل فرماتے ہیں کہ جب عمرؓ مقام سرغ کے پاس پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ شام میں تو وباء پھیل رہی ہے یہ سن کر آپ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا- اس پر ابو عبیدہؓ نے تعجب سے فرمایا ''اچھا آپ تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟'' یعنی اگر موت مقدر ہو چکی ہے تو پھر اس واپسی کا فائدہ؟ عمرؓ نے اس کا کیا حکیمانہ جواب دیا' فرمایا: ابوعبیدہؓ اگر دو وادیاں ہوں ایک سرسبز دوسری خشک' بولو اپنے اونٹ کس میں چراؤ گے؟ اگر سرسبز وادی میں چراؤ اور یقیناً اسی میں چراؤ گے تو کیا

كحركة الحجر في تدحرجة كذبت و ابن حكمت بانها صادرة من غير علة موجبة لها فلا المزاج الفحلي يوجب هذا الباب و لا المزاج الانثوى يوجب ذلك كذبت و ان حكمت بان الا رادة المتشجه في انفسهما تحكي وجوبًا فوقا نيا و تعتمد عليه و انها لا تفور فورانًا (۳) استقلا ليا كان ليس و راء ذلك عرفي فقد كذبت بل الحق اليقين امر بين الامرين و هو ان الاختيار معلول لا يختلف عن علله و الفعل المراد توجبه العلل

یہ تقدیر سے گریز ہوگا یا یہ بھی اسی تقدیر کے تحت ہوگا' اسی طرح میری واپسی کو احاطہ تقدیر سے باہر کیوں سمجھتے ہو- اگر موت کی وادی سے بچ کر جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہوگا' جب ہی تو جا رہا ہوں- (مؤطا مالک)

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ تقدیر و تدبیر میں جنگ نہیں ہے اور جنگ تو اس وقت ہوتی جب کہ تدبیر تقدیر کے احاطہ سے کہیں باہر ہوتی اب تو تدبیر بھی تقدیر کا جزء بنی ہوئی ہے تقدیر و تدبیر کے مراتب کو اس طرح محفوظ رکھنا یہ علوم نبوت کا فیض ہے' دیکھئے حضرت یعقوب علیہ السلام جب اپنے فرزندوں کو مصر روانہ کر رہے ہیں تو نظر گزر کے خطرہ سے تحفظ کے لیے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں ﴿يَا بُنَيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ﴾ (یوسف :٦٧) بچو! دیکھنا کہیں ایک ہی دروازہ سے سب کے سب مت داخل ہو جانا بلکہ متفرق دروازوں سے جانا (کہیں خاندانِ نبوت کو کسی کی نظر نہ کھا جائے) ادھر شفقتِ پدری نظر گزر سے تحفظ کی یہ تدبیر بھی کرتی جاتی ہے اُدھر لسانِ نبوت رمز تقدیر سے بھی آگاہ کیے جاتی ہے اور فرماتی ہے ﴿وَمَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (یوسف :٦٧) یعنی میری یہ تدبیر صرف عالم اسباب کی ایک تسلی ہے' جو مقدر ہو چکا ہے کہیں اس کو میں ٹال سکتا ہوں-

یہاں اس پر بھی ذرا غور کیجئے کہ جس کو آپ تقدیر کا جبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ہے کیا- یہی تو کہ قدرت نے اپنے دیئے ہوئے اختیار کو اپنے ہی کنٹرول میں رکھا ہے' یا یہ کہ جو اختیار عطا فرمایا تھا اس کو سلب کر لیا ہے پھر اس جبر کا اثر ہے تو کہاں ہے' کیا ان اشیاء میں ہے جہاں آپ کو تقدیر سے قبل اختیار حاصل تھا' یا ان میں جہاں پہلے بھی آپ مجبور ہی مجبور تھے اس لیے یوں نہ کہیے کہ تقدیر نے ہم مختاروں کو مجبور بنا دیا' بلکہ یوں کہیے کہ ہم مجبوروں کو ایک محدود پیمانہ پر مختار بنا دیا ایسا مختار کہ وہ اختیار بھی ہماری حیثیت سے کہیں زیادہ تھا' ایک مجبور میں نہیں بلکہ معدوم محض میں اختیار کا تصور کرنا ہی کب معقول ہے یہ تو مختارِ مطلق کا کرم تھا کہ اس نے محض اپنے کرشمہ قدرت سے ایک جماد کو اختیار بخش دیا اور اس کے اس اختیار کے سامنے اپنا جبر ایسا پس پردہ کر دیا کہ اس عالم میں اس جبر کا ادراک کرنا مشکل ہو گیا- ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ -(الانفال:۲)

ذرا اور دقتِ نظر سے کام لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا یہ نا تمام اختیار قائم ہی جب رہ سکتا ہے جب کہ قدرت کا اختیار اس کے ساتھ ساتھ لگا رہے اگر قدرت کا اختیار کہیں اس کی سرپرستی چھوڑ دے تو ہمارا اختیار خود بخود فناء ہو جائے- اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ بچہ جب ہٹ کرتا ہے کہ چلے اور اپنے پیروں ہی چلے' اس کے والدین جانتے ہیں کہ اس غریب کے پیروں میں خود چلنے کا دم نہیں ہے اس لیے اپنی طاقت سے اس کو چلاتے ہیں اور جس طرف وہ چلنا چاہتا ہے اسی طرف چلاتے ہیں- اس کا

و لا یمکن ان لا یکون و لکن هذا الاختیار من شأنه ان یبتهج بالنظر الی نفسه و لا ینظر الی مافوق ذلک فان ادیت حق هذا الاختیار من شأنه ان یتهج بالنظر الی نفسه و لا ینظر الی مافوق ذلک فان ادیت حق هذا الموطن و قلت اجد فی نفسی ان الفعل و الترک کانا مستویین و انی اخترت الفعل فکان الاختیار علۃً لفعله صدقت و بررت فاجزت الشرائع الالٰهیة عن هذه الارادة المتشجة فی هذه الموطن، و بالجملة فقد ثبتت ارادة

ناتمام اختیار جب اس طرح والدین کے اختیارِ مستقل کے سہارے سہارے کام کرنے لگتا ہے تو اس بچہ کے ارمان تو یوں پورے ہو جاتے ہیں کہ جو اس کی ضد تھی وہ پوری ہوگئی اور والدین یوں خوش ہو جاتے ہیں کہ اس طرح ان کا بچہ خوش ہوگیا' اور ان کا کچھ بگڑا نہیں- اگر کہیں یہ بچہ اس کی ضد کر بیٹھے کہ والدین کی دستگیری کے بغیر خود اپنی ہی طاقت سے چلے تو ظاہر ہے کہ جتنا فاصلہ اپنے اس ناتمام اختیار کے ساتھ اس نے طے کرلیا تھا یہ بھی طے نہ ہو- یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے' کیونکہ بچہ تو اپنی مشیت بھی رکھتا ہے اور کچھ طاقت بھی ادھر اس کے والدین گو طاقت اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں-مگر اپنی مشیت اور اپنی طاقت کو اس بچہ کے تابع بنائے رکھتے ہیں اور ادھر ہی اس کو صرف کرتے ہیں جدھر وہ بچہ ارادہ کرتا ہے مگر خالق کے معاملہ میں بندہ کی مشیت کی ہستی ہی نہیں ہوتی ' وہ اگر کچھ قدم چل سکتی ہے تو خالق کی مشیت کے سیارے سیارے ہی چل سکتی ہے ﴿وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ یعنی تم ارادہ ہی وہ کرسکتے ہو جو مشیتِ الٰہیہ چاہتی ہے-تعجب ہے کہ اتنی محکومیت کے باوجود اگر سطحی نظر ڈالو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عالم میں مشیت الٰہیہ ہمارے ارادہ کے تابع بنی ہوئی ہے اور جو ہم کرنا چاہتے ہیں وہی وہ پورا کرتی رہتی ہے- یہ تمام کرشمہ اسی حکمت کا ہے کہ ہمارے افعال پر قدرت نے جبر نہیں فرمایا بلکہ خود ہمارے اختیار ہی کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے' لہٰذا مجبورِ محض ہونے کے باوجود ہمارا احساس یہی رہتا ہے کہ ہم مختارِ مطلق ہیں اور اس عالم کے لحاظ سے یہ غلط بھی نہیں' جو جبر یہاں ہے وہ عالم غیب کے لحاظ سے ہے' اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے- اب اس کے سواء چارہ کار نہیں کہ اس معاملہ میں صرف انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کیا جائے یہاں دلائل کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو انسان اپنے ذاتی وجدان کے بالمقابل ان کو باور نہیں کرسکتا' اس لیے اسلام نے یہاں صرف تسلیم و رضاء کی ایک راہ بتادی ہے- حقیقت سے بے خبر بھی نہیں رکھا اور اس کو پورے طور پر حل کرنا چونکہ ہمارے بس سے بالاتر تھا اس لیے بحث کرنے سے بھی روک دیا- ﴿فَاتَّبِعُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾

بالفاظ دیگر اس مضمون کو یوں سمجھئے کہ بعض مرتبہ شیء کا وجود ہی اتنا کمزور اور ضعیف ہوتا ہے کہ وہ خود بخود قائم نہیں رہ سکتا' اس کے وجود کی کل حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کسی موجودِ حقیقی کے ساتھ اس کو کوئی صحیح نسبت لگی رہے اور اس لیے اس کا وجود بھی اسی وقت قائم رہتا ہے جب تک کہ یہ نسبت قائم رہتی ہے جہاں یہ نسبت ختم ہوئی اس کا وجود بھی ختم ہوا- دیکھو دن میں دھوپ کی تمازت و تیزی کا کیا عالم ہوتا ہے- موسم گرما میں فضاء عالم گویا کرۂ نار بنی ہوئی نظر آتی ہے' مگر جہاں آفتاب نے غروب ہونے کے لیے رختِ سفر باندھا اسی کے ساتھ ساتھ حرارت کے آثار بھی مضمحل اور مدھم پڑنا شروع ہوئے' ادھر آفتاب غروب ہوا اور ادھر یہ آثار بھی معدوم ہوئے' اور وہی فضاء جو ابھی ابھی بقعہ نور بنی ہوئی تھی ایک دم میں تیرہ و تاریک بن گئی- کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہاں

يتحدد تعلقها و ثبتت المجازاة فی الدنیا و الأخرة و ثبت ان مدبر العالم دبر العالم یا یجاب شریعة یسلکونها لینقعوا فکان الامر شبیها بان السید استخدم عبیده و طلب منهم ذلک و رضی عمن خدم وسخط علی من لم یخدم فنزلت الشرائع الالهیة بهذه العبارة لما ذکرنا أن الشرائع تنزل فی الصفات وغیرها بعبارة لیس هنالک افصح و لا ابین للحق منها أکانت حقیقة لغویة او مجازا متعارفاثم مکنت الشرائع الهیة هذه المعرفة الغامضة

آفتاب نے کچھ ظلم کیا ہے کہ ہماری یہ بزم کی ساری رونق اپنے ساتھ ہی لوٹ کرلے گیا' نہیں نہیں حقیقت یہ ہے کہ عالم کی فضاء پہلے سے تاریک ہی تھی جو نور اس کو عطا ہوا تھا یہ آفتاب ہی کی سخاوت تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس میں استعداد ہی اتنی تھی کہ جب تک اس کی نسبت آفتاب کے ساتھ درست رہے وہ روشن رہے اور جب یہ نسبت ختم ہونے لگے تو اس کا وجود بھی معرضِ خطر میں نظر آئے- یہاں اس فضاء میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اس کا بخشا ہوا نور تھوڑی سی دیر کے لیے جذب ہی کیے رہے' چار و ناچار نتیجہ یہ نکل کر رہتا ہے کہ اس کی اصل مظلم و تاریک شکل پھر عود کر آتی ہے اس میں آفتاب کا ظلم کیا ہے- جتنی دیر فضاء منور رہی یہ اس کا کرم تھا اور جب مکدر و مظلم ہوئی تو یہ خود اس فضا کا اپنا ہی قصور ہے- اسی طرح ممکنات کی حقیقت وجود سے معریٰ اور خالی ہے جو عارضی وجود ان کو ملا ہے یہ خالق کل کا عطا کردہ ہے- اب سوچیے کہ ایسے موجود کی صفات کا حال کیا ہوگا' اسی سے اس کی صفتِ اختیار کو بھی قیاس کر لیجیے' پس اس کا اگر وجود قائم ہے تو اسی موجودِ حقیقی کے انتساب سے قائم ہے اور اگر اس کا اختیار ہے تو بھی اسی کے اختیارِ مطلق کے زیرِ سایہ رہ کر ہے- حق تعالیٰ عالم کو پیدا فرما کر اس سے علیحدہ نہیں ہوگیا' بلکہ اسی نے پھر اس کی ہستی کو برقرار رکھ چھوڑا ہے' اگر اس کی یہ نگرانی نہ رہے تو اسی آن میں سارا عالم درہم و برہم ہو جائے- اسی وجہ سے اس کا نام قیوم بھی ہے- ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَکَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ﴾ (فاطر: ٤١)

پس جب ممکنات کا نفسِ وجود ہی اتنا ضعیف ہو کہ موجود ہونے کے بعد آئندہ اپنی بقا کے لئے بھی سہارے کا محتاج رہے تو پھر کیا اس کی صفات مستقل ہو کر قائم رہ سکتی ہیں- ظل کی کیا مجال کہ اپنی اصل سے مستغنی ہو سکے ناواقف اظلال کی طوفان خیز حرکت کو دیکھتا ہے تو ان حرکات کا خالق ان اظلال ہی کو سمجھنے لگتا ہے' واقف خوب جانتا ہے کہ ان میں کیا رکھا ہے' یہ سب بے حقیقت ہے جو کچھ ہو رہا ہے یہ حرکات اصل ہیں جو اظلال میں بطریق عکس نمایاں ہو رہی ہیں اگر یہ اظلال اپنے اصول کے استقبال کی درخواست پیش کرنے لگیں تو یہ کیسی نادانی ہوگی ظاہر ہے کہ خیریت اسی میں ہوگی کہ یہ سب درخواستیں مسترد کر دی جائیں' ورنہ ظاہر ہے کہ ظلال کی حقیقت ہی اتنی ضعیف ہے کہ ان کا استقلال بس یہی ان کی فناء ہے- مثل مشہور ہے کہ جب چیونٹی کے پر نکلنے لگتے ہیں تو اس کے فناء کا زمانہ قریب ہوتا ہے اسی لئے بعض سلف کا مقولہ ہے:

واللہ ما احب ان یجعل امری الی و کون امری بیدالله خیرمن ان یکون بیدی. (موقف ص ٢٢٤)	بخدا میں اپنے معاملہ کو خدا تعالیٰ کی قدرت کے تحت رکھنا اس سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی قدرت میں رکھوں-

غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جبر کا سوال نہ تو تقدیر سے متعلق ہے نہ پروردگارِ عالم کے عدل سے بلکہ یہ ذاتِ ممکن کا خود اپنا ہی قصور ہے اور جب یہ قصور خود اپنی حقیقت کا ہے تو پھر اس کے ازالہ کی فکر بھی عبث ہے- اتنی تطویل کے بعد بھی یہ مشکل پھر جوں کی توں رکھی ہوئی ہے کہ انسان اپنے وجود کو ضعیف سمجھے کیونکر وہ اپنے نفس ہی کو موجود حقیقی سمجھتا اور جس کی خبر انبیاء

من نفوسهم بثلاثة مقامات مسلمة عندهم جارية مجرى المشهورات البديهية بينهم' احدهم انه تعالٰى منعم و شكر المنعم واجب و العبادة شكراً له علٰى نعمه' و الثانى انه يجازى المعرضين عنه التاركين لعبادته فى الدنيا اشد الجزاء' و الثالث انه يجازى فى الأخرة المطيعين و العاصيين فانبسطت من هنالک ثلاثة علوم' علم التذكير بالأء الله' و علم التذكير بأيام الله' و علم التذكير بالمعاد فنزل القران العظيم شرحًا لهذه العلوم. (صفحہ ۶۸ حجۃ اللہ)

علیہم السلام دیتے ہیں اس کو آنکھوں سے دیکھتا نہیں' اگر کہیں اس کو دیکھ لیتا ہے تو مسئلہ تقدیر اسی وقت بدیہی بن جاتا - اب نہ قیامت سے قبل موجودِ حقیقی کا دیدار ممکن ہے اور نہ مسئلہ تقدیر کا حل ممکن ہے' بس یہاں صحیح راستہ ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر خالق کا وجود مان لیا گیا ہے اسی طرح ان ہی کے اعتماد پر خالق کی تقدیر پر بھی اعتماد کرلیا جائے -

مسئلہ مجازات

جزاء وسزا کے مسئلہ میں الجھنا بھی بیکار ہے' اوّل تو اس لیے کہ یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ مالک اور خالق سے کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا بلکہ مالک کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو ہر قسم کا تصرف کرنے کا مجاز ہو آپ ایک چیز عاریۃً لیتے ہیں' کرایہ پر بھی لیتے ہیں مگر یہاں الٹی اور اس کی حفاظت ہی آپ کے سر پڑتی ہے اور آپ صرف وقتِ مقرر تک وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہوتے ہیں' اس کو فروخت نہیں کر سکتے' ہبہ نہیں کر سکتے' اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کر سکتے اس کو توڑنا اور خراب کرنا تو درکنار لیکن جس چیز کے آپ مالک کہلاتے ہیں اس میں آپ کو ان تمام تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے' بلکہ ایک قیمتی چیز کے ضائع کر دینے پر بھی آپ مسئول نہیں ہو سکتے - جب ایک مجازی مِلک کے حقوق یہ ہیں تو حقیقی مِلک کے حقوق کیا ہوں گے پھر یہاں علاقہ صرف ایک مملوکیت کا ہی نہیں مخلوقیت کا بھی ہے اور چونکہ اس نے بلاشرکت غیرے پیدا فرمایا ہے اس لیے مالکیت حقیقیہ کا حق بھی صرف اسی کا رہنا چاہیے - ایسے مالک سے جو خالق بھی ہو جزاء وسزا کا سوال ہی کیا؟

دیکھئے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالٰی نے مالکیت نہیں صرف ملوکیت عطا فرمائی تھی وہ بھی بہت محدود پیمانہ پر لیکن اس ناتمام ملوکیت کے لیے بھی جو امتیازی شان عطا فرمائی وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:

هٰذَا عَطَاۤؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ. (ص : ۳۹) — یہ ہماری بخشش ہے اب آپ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں آپ سے اس کا کوئی حساب نہیں لیا جائے گا -

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تاریخ البدایۃ والنہایۃ کی جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ نبوت کے ساتھ سلطنت بھی مرحمت ہوئی تھی اس لیے یہ تنبیہ کردی گئی کہ یہ بادشاہت ہے تو ہمارا عطیہ مگر چونکہ بادشاہ سے کوئی باز پرس نہیں ہوا کرتی اس لیے جاؤ اس بارے میں تم سے بھی کوئی حساب نہیں ہوگا -'' اسلام میں غلامی کے مسئلہ سے ذرا سی مالکیت کا پتہ چلتا ہے' اگرچہ وہ صرف یہ جتانے کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ جو مولائے حقیقی اور مالک حقیقی کی مالکیت پر راضی نہیں ہوتا اس کو پھر غلاموں کی مالکیت پر راضی ہونا پڑتا ہے مگر اس مالکیت کے بھی جتنے حقوق ہیں وہ اس سے ظاہر ہیں کہ جو ابھی ابھی غلامی سے قبل خود مالک بننے کی اہلیت رکھتا تھا' ملوکیت کا لفظ سی

افعال العباد اختيارية' لكن لا اختيارلهم فى ذلك الاختيار' و انما مثلهٗ كمثل رجل ارادأن يرمى حجرًا' فلوانه كان قادرًا حكيما خلق فى الحجر الحركة ايضًا' و لا يرد عليه ان الافعال اذا كانت مخلوقة اللّٰه تعالٰى و كذلك الاختيار ففيم الجزاء' لان معنى الجزاء يرجع الى ترتب بعض افعال اللّٰه تعالٰى على البعض' بمعنٰى ان اللّٰه تعالٰى خلق هٰذه الحالة فى العبد' فاقتضٰى ذلك فى حكمته ان يخلق فيه حالة اخرى من النعمة أو الا لم كما

پہلو سے اس پر عائد ہو نہیں سکتا تھا ہر تصرف اس کا نافذ اور ہر حکم اس کا ناطق تھا وہی غلامی کے بعد اس طرح مملوک بن جاتا ہے کہ مالکیت کی اس میں اہلیت ہی نہیں رہتی نہ اس کا کوئی تصرف درست ہوتا ہے نہ کوئی حکم نافذ ہونے کے قابل ہوتا ہے اور اس کے مالک کو اس کو بیچ ڈالنے کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ اس کو مار بھی ڈالے جب بھی بعض ائمہ کے نزدیک گو اس کو گناہ کتنا ہی بڑا ہو مگر دنیا میں اس سے قصاص نہیں لیا جاتا- باپ بیٹے میں خالقیت سے ذرا سی مشابہت پائی جاتی ہے' وہاں بھی بیٹے کے قتل کرنے کا قصاص باپ سے نہیں لیا جاتا- پس جب کہ مالکیت و خالقیت کی ادنیٰ سی مشابہتوں کے بعد سوال و جواب کا مرحلہ ختم ہو جاتا ہو تو جہاں یہ دونوں باتیں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوں بھلا وہاں محاسبہ اور سوال کا حق کس کو ہو سکتا ہے اس لیے فرمایا ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ (الانبیاء:۲۳)

دوم آپ نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے کہ آخر اس عالم کی آفرنیش ہوئی کیوں؟ یہاں صرف ذات جامع صفات کا ایک اقتضاء ہی تو تھا- لہٰذا اب جس صورت سے بھی یہ اقتضاء پورا ہوگا وہی مناسب ہوگی- کمال یہ چاہتا ہے کہ مہر و قہر دونوں ہی کا ظہور ہو اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کے لیے اسباب بھی پیدا فرمائے جائیں اور چونکہ جزاء و سزا کا عنوان چاہتا ہے کہ جزاء میں عمل کی کچھ تاثیر بھی عیاں رہے تا کہ اچھے پر اچھی جزاء اور برے عمل پر اس کی سزا دی جا سکے اس لیے ضروری ٹھہرا کہ بندہ کو کچھ اختیار دے دیا جائے اس تناسب کے لیے جتنا اختیار عقلاً ممکن تھا وہ عطا کر دیا گیا اور اسی پر جزاء و سزاء کو دائر کر دیا گیا- اب جب کبھی بندہ اپنے اس عطا کردہ اختیار سے برا عمل کرتا ہے وہ دنیا میں بھی برا کہلاتا ہے اور اگر بھلا کرتا ہے بھلا کہلاتا ہے جب اس کے ان افعال پر دنیا میں تعریف و مذمت کرنا معقول ہوگئی تو آپ میں معقول کیوں نہ سمجھی جائے۔

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر   بلا میں پھنسنے کو کچھ اختیار لیتا جا

رہ گئی یہ بات کہ جب برے افعال کرنا بری بات ہے تو اس کا پیدا کرنا کمال کیونکر سمجھا جائے تو سمجھئے کہ خلق اور کسب میں بڑا فرق ہے- انسان جب کوئی عمل کرتا ہے تو وہ عمل اس کے ساتھ اس طرح قائم ہوتا ہے جیسے کپڑے کے ساتھ سفیدی اور سیاہی- اب جب اس لحاظ سے کپڑے کو سفید اور سیاہ کہہ سکتے ہیں تو ان اعمال کے لحاظ سے بندہ کو برا اور بھلا بھی کہہ سکیں گے' مگر مخلوق خالق سے علیحدہ رہتی ہے وہ اس کے ساتھ قائم نہیں ہو جاتی' لہٰذا بری مخلوق خالق کی صفت نہیں ہو سکتی' البتہ اس کا پیدا کرنا اس کی صفت ہوتی ہے- صفت خلق بہر کیف کمال ہے' اسی لیے ناقص نہ خیر پیدا کر سکتا ہے نہ شر کیونکہ خلق مطلقاً ایک کمال ہے- اب رہا یہ سوال کہ خلق شر کمال کیوں ہے؟ تو ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب خلق کفر میں ظہور قہر کی مصلحت بھی ہو تو پھر اس کو بھی مقتضائے کمال کیوں نہ کہا جائے۔

درکار خانہ خلق از کفر ناگزیر است   آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

شاعر یہاں یہی مضمون کہہ رہا ہے کہ عالم میں کفر اس لیے ضروری ہے کہ اگر ابولہب جیسا کافر نہ ہو تو پھر جہنم کی پیدائش کا فائدہ؟

انہ یخلق فی السماء حرارہ' فیقتضی ذلک ان یکسوہ صورۃ الھواء' و انما یشترط وجود اختیار و کسب العبد فی الجزاء بالعرض لابالذات' و ذلک لان النفس الناطقۃ لا تقبل لون الاعمال التی لا تستند الیھا بل الی غیرھا من جحۃ الکسب و لا الا عمال التی لا تستند الی اختیارھاو قصدھا' و لیس فی حکمۃ اللہ ان یجازی العبد بما لم تقبل نفسہ النا طقۃ لونہ' فاذا کان الامر علی ذلک کفی ھذہ الاختیار غیر المستقل فی الشرطیۃ اذا کان مصححال

بادشاہی کا کمال دونوں قسم کی طاقتوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے- اس لیے کافر کے حق میں کفر کتنا ہی قبیح سہی لیکن خالق کے حق میں تو مظہر کمال ہوتا ہے- دیکھئے بیت الخلاء یعنی پاخانہ خود کتنی ہی کمتر چیز ہو لیکن ایک بڑی سے بڑی کوٹھی اس وقت تک ناقص ہی سمجھی جاتی ہے جب تک کہ اس میں یہ ناقص در ناقص چیز بھی موجود نہ ہو- جس طرح ایک کوٹھی کے لیے بیت الخلاء کا وجود ضروری ہے اسی طرح عالم کے کمال کے لیے بھی صدیق اکبرؓ جیسے مؤمن کامل کے بالمقابل ایک ابولہب جیسے کافر کی بھی ضرورت ہے' پھر جس طرح کوٹھی میں یہ سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے کہ اس زمین نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو بیت الخلاء بنا دیا' اور اس ٹکڑے میں کیا کمال تھا کہ اس کو شہ نشین بنا دیا- اسی طرح یہاں بھی یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ ابولہب نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو کافر بنا دیا' اور صدیق اکبرؓ میں کیا کمال تھا کہ ان کو صدیقیت سے نواز دیا یہ سب مالک کے اپنے ارادہ اور پسند کی بات ہے' کسی کو اس میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے۔

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا ۔۔۔ غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فوائد قرآن کریم میں زیر تفسیر آیۃ ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الکھف: ۴۹) مسئلہ تقدیر کا حل اس طرح تحریر فرمایا ہے:

''رب جو کرے سو ظلم نہیں سب اسی کا مال ہے پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا' اور جو کوئی کہے (یعنی اعتراض کرے) گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ سو (یہ) بات نہیں (ہے) اپنے دل سے پوچھ لے' جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا تو قصد دونوں طرف لگتا ہے' اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا' سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے' بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اس کی سمجھ پر' بندہ بھی پکڑے گا اسی کو جو اس سے بدی کرے' یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کرا دیا''-

ان سطور کو بار بار بغور پڑھیے مسئلہ تقدیر کا جتنا واضح حل اور جتنی سادگی سے آپ کو یہاں ملے گا بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملے گا' بشرطیکہ سمجھنے کا ارادہ بھی ہو- خاتمہ بحث پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی جو نظم ہے وہ بھی ہدیہ ناظرین کر دی جائے' اس میں تمام گزشتہ تفصیلات کو بہت مختصر اور عمدہ پیرایہ میں سمیٹ دیا گیا ہے' اگر آپ نے ان تفصیلات کو سمجھ کر ذہن نشین کر لیا ہے تو پھر آپ ان اشارات سے جو اس مختصر نظم میں اس مسئلہ میں اشکالات کے حل کے لیے کیے گئے ہیں پورے طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں:

ایا صاحبی ان الکلام بقدر تک ۔۔۔ طویل و تحریر الخلاف یطول

عزیزمن! تمہاری قدرت کی داستان بہت دراز ہے' اگر اس میں مذاہب کی تفصیلات بھی بیان کی جائیں تو افسانہ اور دراز ہوتا ہے-

قبول لون العمل، و هذا الكسب غير المستقل اذا كان مصححا لتخصيص هذا العبد بخلق الحالة المتأخرة فيه دون غيره، وهذا تحقيق شريف مفهوم من كلام الصحابة و التابعين فاحفظه. (صفحہ ۱۶۷ حجۃ اللہ)

ففيک اختيار ليس منک و ذلک لجبر اختيار لا يکنک ذهول

اس لیے مختصر یہ سن لو کہ تم میں اختیار کی صفت تو یقیناً پیدا فرمائی گئی ہے، مگر اس اختیار پر تمہارا اختیار نہیں ہے اس لیے یہاں جبر بھی ہے مگر افعال پر نہیں اختیار پر ہے۔

و اما اختيار مستقل فانه محال فلا يسألک عنه سئول

اب رہا ایسا اختیارِ مطلق جس کے اوپر کسی کا جبر نہ ہو تو وہ مخلوق کے حق میں محال ہے، نہ مخلوق خالق بن سکتی ہے نہ اختیار مستقل اس کو مل سکتا ہے، لہٰذا اس کے متعلق تم سے کوئی حریص سوال نہ کرے۔

فافعالنا منا على اختيارنا و لكنها نحوا القدير يؤل

خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے افعال ہماری قدرت سے سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے اختیار ہی سے صادر ہوتے ہیں لیکن چونکہ ہماری قدرت و اختیارِ قادرِ مطلق کی عطا فرمودہ ہیں اس لیے افعال کی نسبت اس طرف بھی رہتی ہے۔

وهذا هو الكسب الذى كلفوابه و فيه اقتصاد فليكنک قبول

امام ماتریدی نے اس مسئلہ میں خلق وکسب کا جو فرق فرمایا ہے اس کی تفسیر بھی یہی ہے اور یہی درمیانی راہ بھی ہے اس لیے چاہیے کہ تم اس کو بسر و چشم قبول کرلو۔

و يثمر شرّ شرما ينبغى له فيزعمه الظلم الصريح جهول

رہا جزاء وسزا کا مسئلہ تو وہ واضح ہے کہ شر سے شر ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ جاہل آدمی اس کو ظلم سمجھنے لگتا ہے۔

كاثراث خبث البذر خبث نباته طباعاً و لا يأتيه قال يقول

دیکھو اگر خراب درخت کا تخم ہو تو کیا اس سے ویسا ہی درخت طبعاً پیدا نہیں ہوتا پھر یہاں کون سوال و جواب کرتا ہے کہ اس تخم سے یہ خراب درخت ہی کیوں پیدا ہوا؟

وليس جزاء ذاک عين فعالنا و لكن ستراً حال سوف يزول

اگر غور کرو تو جس کو تم جزاء سمجھ بیٹھے ہو یہ جزاء نہیں وہی دنیا میں کیے ہوئے تمہارے اچھے برے اعمال ہیں جو دوزخ اور جنت میں ثواب و عذاب کی شکل میں نظر آئیں گے۔ جو حجاب یہاں ہماری آنکھوں پر اس حقیقت کے دیکھنے سے مانع ہو رہا ہے قیامت میں وہ اٹھ کر رہے گا، اس وقت یہ بات صاف صاف نظر آجائے گی۔

و لا يستوى الميزان الا بحضلة تفوت بادنى ميلة فيعول

ترازو کے دونوں پلوں کے برابر رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہوتی ہے، جہاں ایک طرف جھکاؤ پیدا ہوا اور وہ ختم ہوئی ۔ اسی طرح تقدیر کے جبر و اختیار کے پلوں کو بھی برابر رکھنا چاہیے ورنہ جبریہ یا قدریہ میں شامل ہو جاؤ گے۔

و صلى الله تعالىٰ على خير خلقه و خيرته سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم تسليما كثيرا

مسئلہ قضاء وقدر علمی نظر میں

قضاء وقدر اور اکتشافاتِ عصریہ کا اس پر اثر

مسئلہ قضاء وقدر اگرچہ عہد قدیم سے عقلاء کے درمیان معرکہ بحث بنا ہوا ہے' مگر ہمارے دور میں جس نظریہ کے ماتحت اس پر نظر ڈالی جارہی ہے وہ قدیم نظریہ سے بالکل مختلف ہے- عہد ماضی میں خالق کی زبردست ہستی تو سب کو مسلّم تھی بحث صرف اسی میں تھی کہ بندوں کے افعال قدرت کی گرفت سے آزاد ہیں یا ان پر بھی اس کا فولادی شکنجہ کسا ہوا ہے؟ لیکن دورِ حاضر کا انسان تو یہ سمجھتا ہے کہ جب اکتشافاتِ عصریہ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ انسان اپنے افعال کی دنیا ہی نہیں بلکہ اپنی ضروریات کی جملہ مصنوعات کی تخلیق وتخریب کے لیے خود کافی ہے تو اب کسی خارجی قدرت کو بے وجہ تسلیم کیے چلے جانا محض بے معنی اور کورانہ تقلید ہے- گویا اب بحث یہ نہیں رہی کہ کوئی خارجی طاقت تو موجود ہے مگر ہمارے افعال پر اس کا کنٹرول کتنا ہے' بلکہ نقطہ بحث یہ بن گیا ہے کہ انسانی قدرت کے ان مظاہروں کے بعد کیا اس پر کسی خارجی قدرت کا تسلط تسلیم کر لینا معقول بھی ہے؟ عالم غیب سے اس ناآشنا جماعت کو یہ خبر ہی نہیں کہ مسئلہ تقدیر انسانی جدوجہد یا اس کی درماندگی کی وجہ سے کسی وقت بھی زیر بحث نہیں رہا بلکہ ہمیشہ زیر بحث یہ رہا ہے کہ انسانی افعال خواہ وہ معمولی سے معمولی ہوں یا مشکل سے مشکل درحقیقت ان میں انسانی قدرت کا دخل ہوتا بھی ہے یا نہیں اگر ہوتا ہے تو کتنا؟ جس جماعت کا خیال یہ ہے کہ انسان گو خود مخلوق ہے مگر اپنے افعال کی تخلیق کی اس کو پوری پوری قدرت عطا کر دی گئی ہے اس کے نزدیک اس کے محیر العقول کارنامے اور اس کے معمولی سے معمولی افعال دونوں کے دونوں اسی کی قدرت کے رہین منت ہیں اور جس کے نزدیک اس کو یہ قدرت عطا نہیں ہوئی اس کے نزدیک بھی انسانی افعال میں معمولی اور غیر معمولی کی کوئی تفریق نہیں خواہ وہ سائنس کی جدید ایجادات ہوں یا ادنیٰ سے ادنیٰ افعال دونوں کے دونوں اس کی قدرت سے خارج اور براہِ راست قدرتِ الٰہیہ کے زیر اثر ہیں-

پس انسان کی مصنوعات کی حیرت انگیز ترقیات دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھنا گویا اب مسئلہ تقدیر سے حجاب اٹھ گیا ہے' صرف ایک خوش فہمی ہے- یاد رکھیے کارخانہ عجائبات جتنا پھیلتا چلا جائے گا قضاء وقدر کا سوال بھی اتنا ہی اور پھیلتا چلا جائے گا' کیونکہ قضاء وقدر کا سبق ہمیں اپنی مصنوعات اور مساعی سے کہیں باہر جا کر پڑھنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے ان افعال ہی کے ضمن میں پڑھنا ہے اس لیے ہمارے افعال کا عمق جتنا اور بڑھتا رہے گا قضاء وقدر کا سوال بھی اتنی ہی گہرائی میں اٹھتا رہے گا-

قضاء وقدر اور انسانی جدوجہد سے اُس کا تعلق

موجودہ مفکرین کو ایک مغالطہ یہاں یہ بھی ہے کہ مسئلہ قضاء وقدر انسانی ترقیات میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کا باعث ہے' ان کے زعم میں انسانی دماغ پر کسی فوقانی طاقت کی قہرمانی کے اعتقاد کا اثر اس کے عزائم اور قوائے عملیہ پر پڑے بغیر رہ نہیں سکتا وہ

تقدیر پر یقین کر کے عزم و ہمت کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی پوری پوری جدو جہد کر نہیں سکتا بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا اور نوشتہ تقدیر پر اعتماد کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتا ہے- یہ مغالطہ بھی محض اپنی ہی خام خیالی کا ثمرہ ہے' کیونکہ اس مسئلہ کا حاصل محض ایک غیبی حقیقت کا انکشاف ہے' یعنی یہ کہ عالم اسباب میں جو کچھ بھی نظر آ رہا ہے خواہ وہ اسباب ہوں یا ان کے نتائج یہ دونوں حالتیں اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہوتی ہیں- یوں نہیں ہے کہ تقدیر تو کہیں جداگانہ لکھی ہوئی رکھی ہے اور انسانی افعال اس سے کہیں ایک طرف ہو رہے ہیں بلکہ وہ انسانوں کی ان ہی مختلف جدو جہد میں پنہاں ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی یہ ظاہری جدو جہد سب اسی کی مسخر اور اسی کے تابع ہے' اگر وہ اس کے خلاف کرنا چاہے بھی تو کر نہیں سکتا بلکہ اس کے دل میں اس ارادہ کا خطور بھی نہیں ہوسکتا-

اگر تقدیر کے تحت صرف ثمرات و نتائج ہوتے اور اسباب و وسائل اس سے باہر تو اب اسباب و وسائل میں ضعف کا امکان ہوتا اور ہر انسان یہ خیال کر سکتا تھا کہ جب نتائج طے شدہ ہیں تو اب اپنی جدو جہد بے سود ہے لیکن جب کہ نتائج کی طرح اسباب بھی احاطۂ تقدیر میں شامل ہو چکے ہیں تو صرف اس عقیدہ سے ترکِ اسباب کا اثر کیسے پیدا ہوسکتا ہے' بالخصوص جب کہ ثمرات و نتائج کا کسی کو علم بھی نہیں ہوتا- فرض کرلو اگر ہمیں کسی معاملہ میں اپنی کامیابی یا ناکامی کا علم ہو جائے تو ہوسکتا ہے کہ ہماری عملی جدو جہد بھی سرد پڑ جائے' لیکن اگر نتائج کا علم ہی نہ ہو اور اسباب کے علم کے ساتھ ساتھ ان پر قدرت بھی حاصل رہے تو کیا کوئی انسان ان کے ارتکاب سے باز رہ سکتا ہے یا اس کے عزم میں کوئی ادنیٰ سا اضمحلال بھی پیدا ہوسکتا ہے- ظاہر ہے کہ وہ نتائج سے لاعلمی کی وجہ سے اسباب کے ارتکاب کرنے پر فطرۃً مجبور ہوگا اور اسے ہونا بھی چاہیے- بلکہ اگر نتائج کا علم بھی ہو جائے پھر بھی قضاء وقدر پر اعتقاد کسی ادنیٰ ضعف کا موجب نہیں ہوسکتا کیونکہ تقدیر یہ تعلیم نہیں دیتی کہ جب نتائج میرے احاطہ میں شامل ہو چکے ہیں تو اب وہ برآمد ہو کر ہی رہیں گے خواہ تم سعی کرو یا نہ کرو' بلکہ یہ حکم دیتی ہے کہ تم میری طرف مت تکو تم اپنی عملی جدو جہد جاری رکھو اور اپنی حماقت سے یہ مت سمجھو کہ اسباب و وسائل کا ارتکاب کرنا میرے وسیع احاطہ سے خارج ہے' وہ بھی ٹھیک نتائج کی طرح اس کے اندر داخل ہے' اس لیے جس طرح نتائج مقدرہ کا ظہور ضروری ہے اسی طرح اسبابِ مقدرہ کا ارتکاب کرنا بھی لازمی ہے' ہاں یہ ضروری ہے کہ قضاء وقدر پر ایمان رکھنے کے بعد اسباب پر وہ اعتماد نہیں رہتا جو منکرین قدر کو ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینے میں ذرا تامل نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک اسباب پر یہ بے اعتمادی ایمان باللہ کا لازمی ثمرہ ہے- لیکن اس کے باوجود قضاء وقدر کا نتیجہ ترکِ اسباب نہیں نکلتا' مؤمن بالقدر بھی پوری سعی کرتا ہے مگر اس یقین پر کہ فتح و نصرت صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی لیکن چونکہ ارتکابِ اسباب کے لیے اس کا حکم ہے اور ان ہی کے ضمن میں اس کا وعدۂ نصرت بھی ہے' اس لیے ان کا ارتکاب لازم ہے اور جو منکرِ قدر ہے سعی وہ بھی کرتا ہے مگر بندۂ اسباب بن کر-

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف ایک علمی اور مخفی حقیقت کا انکشاف ہے' اگر اس کو انسانی جدو جہد کے ساتھ کوئی ادنیٰ بھی اختلاف ہوتا تو اس عقیدہ پر ایمان لانے کے ساتھ شریعت ہم پر عملی جدو جہد کا بوجھ کبھی نہ ڈالتی' حالانکہ قرآن کریم کی صدہا آیات' احادیث کے دفتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک ایک لمحہ ہم کو یہی سبق دیتا ہے- اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی

عملی زندگی اگر دیکھی جائے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قضاء وقدر پر اعتماد کا سبق انہوں نے ہمیشہ عملی جدو جہد کے ضمن ہی میں پڑھا ہے۔ فتح وشکست کے میدانوں اور نماز و نیاز کی عبادت گاہوں میں دونوں جگہ یکساں جو عملی سرگرمی ان کی نظر آتی ہے تقدیر کا انکار کرنے والے شاید اس کا کوئی شمہ اپنی زندگی میں پیش نہیں کر سکتے۔ 3

قضاء وقدر کی حقیقت اور شرعی نظر میں اس کی اہمیت

شرعی نظر میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کی طرح ایمان بالتقدیر کو بھی اسلام کا ایک رکن لازم قرار دیا ہے' گویا جو شخص تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور اس کے رسول پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ماننا اسی وقت صحیح طور پر ماننا کہا جا سکتا ہے جب کہ ان کی فرمودہ تمام باتوں کو بھی تسلیم کیا جائے۔ لہٰذا صرف تقدیر ہی نہیں بلکہ اس کی تمام کتابوں کا ماننا' اس کے رسولوں اور فرشتوں کا ماننا' جنت و دوزخ اور اسی طرح قیامت کا ماننا بھی لازم ہوگا۔ ادیانِ سماویہ میں کسی دین کو بھی ان امور میں کوئی اختلاف نہیں رہا' اسی لیے ان امور کو اصولِ دین کہا جاتا ہے۔ رسولؐ خدا نے تنہائی میں' محفلوں میں' کوچوں میں اور بازاروں میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں پہنچ پہنچ کر ایک بار نہیں بار بار ان کا اعلان نہ کیا ہو۔ فرمائیے کہ اس شدومد کے اعلان کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کر گزرتا ہے' کیا وہ درحقیقت رسول خدا کو مانتا ہے اور کیا جو رسول کو نہیں مانتا وہ صحیح طور پر خدا کو مانتا ہے؟

ایمان بالتقدیر کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے اس کی حقیقت کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لیں اس کے بعد آپ کو یہ سمجھ لینا آسان ہوگا کہ اس کو رکن اسلام کی حیثیت کیوں دی گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تقدیر صرف اس یقین کا نام نہیں ہے کہ کائنات میں جو حرکت وسکون ہو رہا ہے ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے' کیونکہ یہ تو قضاء وقدر کی بحث نہیں ہے یہ تو صفتِ علم کا مسئلہ ہے' اس میں تو اسلامی فرقوں میں سے کسی کو بھی کلام نہیں' جو شخص اس کا منکر ہے وہ تو کھلا کافر ہے۔ تقدیر کے جس معنی کے سمجھنے کی توفیق صرف اہل حق کے حق میں آئی ہے وہ یہ ہیں کہ تقدیر کے آگے تمام عالم مجبور ہے اس کا کوئی ذرّہ اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا' جس کے حق میں جنتی ہونا طے پا چکا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنتی شخص ہی کے سے عمل کرے اور جس کے لیے اس کے خلاف طے ہو گیا ہے اس کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کوئی دوسرا عمل کر سکے۔ اس کے باوجود انسان سے افعالِ شرعیہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ کارخانہ عالم تمام کا تمام اسباب ومسبّبات کے پورے پورے تناسب کے ساتھ قدرت نے باہم اس طرح اُلجھا دیا ہے کہ اس کی ظاہری سطح کو دیکھ کر یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے شاید یہی خود بخود کافی ہو۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لاکر کسی ظن وتخمین سے نہیں بلکہ پوری تحقیق سے یہ تعلیم فرماتے ہیں کہ جس طرح یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوگئی اسی طرح اس کا نظام عمل بھی خود بخود نہیں بن گیا بلکہ خالق کائنات نے اس کو شرفِ وجود بخشنے سے قبل ہی اس کا نظام عمل بھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ عالم نہ خود اپنا کوئی نظام حیات بنا سکتا ہے نہ اس پر خود عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جس طرح سرتا سر اپنے

3 وجود میں خالق کا محتاج ہے اسی طرح اپنے نظام حیات میں بھی بلکہ اس پر عمل کرنے میں بھی اسی کا محتاج ہے- جب انبیاء علیہم السلام کی زبانی انسان کو اپنی بے کسی و بے بسی کی یہ داستان معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کے اعتقاد کی دنیا بھی بدل جاتی ہے اور اس میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے لگتا ہے- اسباب سفلیہ اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتے ہیں' دنیا کے ہوش ربا نظارے اس کی نظروں میں ہیچ بن جاتے ہیں' اسبابِ مجازیہ کی تاثیر کا تصور اس کے دماغ سے نکل جاتا ہے وہ ان کا ارتکاب کرتا تو ضرور ہے مگر ان کو معبود بنا کر ان سے چپک نہیں جاتا بلکہ اس حالت میں بھی اس کی دور بین نظریں برابر موثرِ حقیقی کی طرف لگی رہتی ہیں اور اس طرح معبودانِ باطلہ سے کٹ کر معبودِ برحق سے ملنے کا راستہ صاف ہوتا چلا جاتا ہے-

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ایمان بالقدر کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بغیر انسان کو اپنی خود مختاری کے گھمنڈ سے نجات حاصل نہیں ہوتی یا عالم غیب کی ایک ضروری حقیقت سے جہل کا داغ دور نہیں ہوتا بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اس کے بغیر پروردگارِ عالم سے عالم کا کوئی ربط ہی قائم نہیں رہتا' جو لوگ اس کے قائل نہیں وہ یا تو خالق سے مستغنیٰ بن چکے ہیں یا اس کو ایسی حیثیت دے چکے ہیں جس کے بعد اس کا خالق ماننا نہ ماننا برابر ہو جاتا ہے- ہمارے اس بیان سے جہاں اس عقیدہ کی اہمیت ظاہر ہو گئی اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے میں تقدیر کا ماننا بھی کیوں داخل ہے اور تقدیر کا انکار اللہ تعالیٰ کے انکار کے مرادف کیوں ہے؟ اس لیے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ایمان بالقدر نظام التوحید فمن امن و کذب بالقدر فهو نقص للتوحید.

(کتاب السنہ للامام احمدؒ ص ۱۲۳)

یعنی نظام توحید ایمان بالقدر پر دائر ہے' جو شخص ایمان لائے اور تقدیر کا انکار کرے اس نے توحید کو بھی باطل کر دیا-

اسی طرح قیامت کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے برابر ہے سورۂ والتین میں ﴿الیس اللہ باحکم الحاکمین﴾ (آیت :۸) فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے' یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس کی حکومت سب پر ہے پھر لازم ہوگا کہ وہ ایک دن اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ بھی کرے ورنہ وہ احکم الحاکمین تو کیا ہوتا حاکم بھی نہ ہوا' اسی طرح جنت و دوزخ کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے مرادف ہے' تفصیل اپنے اپنے موقعہ پر آئے گی یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے-

مسئلہ مذکورہ میں زمانہ قدیم کے چیدہ خیالات

اور

مذہبِ اہلِ حق کی توضیح و تحقیق

مذکورہ[1] بالا مسئلہ میں اصولی مذاہب چار ہیں- جبریہ' معتزلہ' اشاعرہ' ماتریدیہ' جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ کے افعال صرف اللہ

---

[1] تعجب ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر میں اگر ہمارے دور میں کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے تو انسان کے مجبور کہنے میں ہوتا ہے اگر اس کو مختار مطلق للہ .....

تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہوتے ہیں' اس میں خود کوئی قدرت نہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ اس میں صفت قدرت بھی ہے اور اسی کی تاثیر سے انسانی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندہ میں صفت قدرت تو ہے مگر اس کے افعال میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی بلکہ جب کبھی بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کو پیدا فرما دیتا ہے' گویا اشاعرہ کا مذہب ان دونوں کے درمیان ہے ان کے نزدیک بندہ نہ تو جبریہ کی طرح مجبور محض ہے اور نہ معتزلہ کی طرح مختارِ مطلق۔

بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جبریہ کے نزدیک بندہ میں نہ قدرت ہے نہ ارادہ بلکہ نہ فعل' وہ بالکل جمادِ محض کی طرح بے اختیار ہے اور اشاعرہ قدرت' ارادہ اور فعل تینوں کے قائل ہیں' مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کی قدرت کو صدورِ افعال میں کوئی تاثیر نہیں' اس کے افعال کو اللہ تعالیٰ خود پیدا فرما دیتا ہے' اسی طرح بندہ میں صفت ارادہ بھی ہے اور اس کے افعال اس ارادہ کی طرف منسوب بھی ہوتے ہیں' مگر ارادہ واختیار کی یہ صفت از خود انسان میں نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے جیسا خود انسان کو پیدا فرمایا ہے اس کی اس صفت ارادہ واختیار بلکہ تمام صفات کو بھی اسی نے پیدا فرمایا ہے' اسی وجہ سے انسان کو مختار کہا جاتا ہے۔ اگر اس میں اختیار کی صفت نہ ہوتی تو اس کو مختار کیسے کہا جا سکتا ہاں چونکہ یہ اختیار خود اس کے اختیار میں نہیں اس لحاظ سے اس کو مضطر اور مجبور کہنا بھی صحیح ہے' لہٰذا کہا جاتا ہے کہ بندہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی یعنی اپنے افعال میں تو مختار کیونکہ صفتِ اختیار اس میں پیدا کی گئی ہے اور خود اس صفت اختیار میں مجبور ہے کیونکہ یہ صفت نہ اس کی پیدا کردہ ہے اور نہ اس صفت پر اس کا اختیار ہے کہ جس طرف چاہے اس کو لگا دے وہ اسی جانب لگنے پر مجبور ہے جس طرف مختارِ مطلق اس کو لگا دے۔ اشاعرہ نے صفت قدرت کا اقرار کر کے اپنے مذہب کو جبریہ کے مذہب سے ممتاز کرنے کی کوشش تو کی مگر چونکہ قدرت غیر مؤثرہ کے اقرار اور نفس قدرت کے انکار میں بلحاظِ نتیجہ کوئی فرق نہیں نکلتا اس لیے ان کا مذہب جبریہ کے مذہب سے زیادہ ممتاز نہیں ہوتا اس لیے اس فرق کی وضاحت کے لیے کسی قدر اور تفصیل کی ضرورت ہے۔

شیخ اشعریؒ کے مذہب کی توضیح کے لئے حسب ذیل امور کو صاف کر لینا ضروری ہے:

(۱) انسانی افعال میں جب اس کی قدرت واختیار کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر انسان اور اس کے افعال میں صحیح رشتہ کیا ٹھہرا اور ان کی نسبت انسان کی طرف کرنا کیونکہ درست ہوئی۔

(۲) افعالِ انسانیہ میں جب کہ اس کی قدرت واختیار کی تاثیر بداہۃً محسوس ہوتی ہے تو اس کا انکار کیسے کر دیا جائے۔

(۳) اگر افعالِ انسانیہ میں اس کی قدرت کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر ان پر نہ مدح و ذم معقول ہے اور نہ جزاء وسزا۔

پہلی تنقیح کا جواب یہ ہے کہ شیخ کے نزدیک ان افعال کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہوتا ہے کہ جب بندہ کسی فعل کا

بقیہ ..... پھر دماغوں میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی حالانکہ جن کی اتباع میں آج اسلام کی ہر بات کے اندر نکتہ چینیاں کی جا رہی ہیں ان کا ایک ایسا طبقہ جس کو مسائل فلسفیہ کا ہیرو کہنا چاہیے جبریہ ہی کی طرف مائل تھا' چنانچہ سینٹ اوغسٹن' لوتھر' کانون' جانسن نیوس سب جبریہ تھے اور آخر دور میں ہربس (Hobes) اسپنوزا (Spinoza) ڈیوڈ ہیوم' کولنس' بیل' لائج بھی جبری تھے۔ اسی طرح کانٹ (Kant) سٹورٹ میل' دیدرڈ' درلباخ' لامٹری۔ سب جبر کے قائل تھے۔ (دیکھو دائرۃ المعارف۔ الموقف البشر ص ۲۳۸)

ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کاملہ سے اس بندہ میں پیدا فرما دیتا ہے' بس اس کا ان افعال کے لیے محل ہونا یہی انسان اور اس کے افعال کا علاقہ سمجھنا چاہیے اسی کا نام کسب ہے گویا اب بندوں کے افعال کا حاصل یہ ہے کہ وہ مخلوق تو اللہ تعالیٰ کی ہیں اور مکسوب بندوں کے' لیکن چونکہ بندہ کا محل بننا یہ ہوتا ہے اس کی صفت اختیار کے ساتھ ساتھ اس لیے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ افعال اسی کے اختیار سے ہو رہے ہیں' اس کو ایک مثال سے سمجھئے مثلاً ایک ٹرین جو لاکھوں ٹن کی ہوتی ہے اس کو حرکت دینے والا حقیقت میں تو انجن ہی ہوتا ہے' لیکن اگر ایک بچہ بھی اس کو اسی جانب حرکت دے رہا ہو تو بظاہر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس بچہ کی طاقت کی بھی یہاں کچھ تاثیر ہو گی' بالخصوص جب کہ اس میں بھی قدرت موجود ہے خواہ وہ کتنی ہی ضعیف سہی مگر اس کے باوجود چونکہ یہاں حقیقتِ حال روشن ہو چکی ہے اس لیے یہی کہا جاتا ہے کہ ٹرین کی حرکت میں صرف انجن کی طاقت مؤثر ہے' بچہ میں گو طاقت تو ہے مگر وہ ٹرین کی حرکت میں کچھ مؤثر نہیں صرف انجن کی طاقت کے ساتھ ساتھ اور اس کے مقارن ہو رہی ہے' اسی طرح ''خلق'' بھی بڑی وزنی چیز ہے' وہ ممکن کے بس کی بات نہیں یہاں انسانی قدرت کو اپنے افعال کے خلق میں بس اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی کہ ابھی آپ نے مثال مذکور میں بچہ کی دیکھی بلکہ اتنی بھی نہیں کیونکہ وہاں پھر بھی کسی درجہ میں تو تاثیر کہی جاسکتی ہے گو وہ کتنی ہی قلیل ہو' اور یہاں تو کسی درجہ میں بھی کوئی تاثیر نہیں کہی جاسکتی۔ مگر چونکہ انسانی قدرت صرف ہونے کے ساتھ ساتھ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے چلے جاتے ہیں اور خالق حقیقی رہتا ہے پردۂ غیب میں اس لیے یہ حکم لگانے کا موقعہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ افعال خود انسان ہی کی قدرت کی پیداوار ہیں۔

اب رہا انسانی قدرت کے تاثیر کا بدیہی ہونا تو جہاں بڑے بڑے عقلاء کا اتنا اختلاف موجود ہو وہاں بداہت کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں بدیہی صرف اپنی قدرت کا ادراک ہے۔ آگے اس قدرت کی ان افعال میں تاثیر ہے بھی یا نہیں' اور اگر ہے تو کتنی' یہ بدیہی نہیں ہے اور کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس میں اختلاف آراء بدیہی ہے' بس جتنی بات بدیہی تھی اس کا شیخ نے بھی اقرار کر لیا ہے' یعنی انسان میں صفت قدرت تسلیم کر لی ہے' اور جتنی بات بدیہی نہیں ہے اس کے تسلیم کرنے سے شیخ نے انکار کر دیا ہے۔

دیکھو قدرت نے بے شبہ آگ کو پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ چونکہ جلانا ہمیشہ سے اس کا فعل نظر آ رہا ہے اس لیے یہاں بھی یہ حکم لگا دیا جاتا ہے کہ آگ بداہۃً جلاتی ہے' حالانکہ جلانے میں آگ کی تاثیر کا گمان کر لینا یہ اپنے ذہن کا حکم ہے' بدیہی نہیں اگر ابتداء آفرینش سے آگ جلایا نہ کرتی تو کسی کو بھی اس تاثیر کا وسوسہ نہ گزرتا لیکن اس عالم میں چونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب آگ کہیں ہوتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ساتھ جلانے کا فعل بھی پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ شاید یہ اسی کی تاثیر ہو گی۔ اسی طرح انسان اور اس کے افعال کا حال سمجھنا چاہیے' یہاں تاثیر کا گمان کرنا مغالطہ کے سواء اور کچھ نہیں۔ اہل عرف کی نظریں چونکہ اتنی دوررس اور باریک بین نہیں ہوتیں اس لیے وہ صرف اس ظاہری معیت کو دیکھ کر خود انسان ہی کو اپنے افعال کا فاعل کہہ دیتے ہیں' اور ظاہر کے لحاظ سے درست کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ افعالِ انسانیہ کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ ان افعال کے لیے محل ظہور ہوتا ہے اور چونکہ یہ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں' اس لیے ان پر اس کی تعریف یا مذمت بھی کی جاتی ہے۔ دیکھو خوب صورتی اور بدصورتی

ان پر بھی انسان کی تعریف یا مذمت ہوتی ہے' حالانکہ یہ بھی اس کی اختیاری صفت نہیں' معلوم ہوا کہ مدح و ذم کے لیے ان صفات کا بالاختیار صدور ضروری نہیں ہے بلکہ صرف ان کا قیام کافی ہوتا ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ یہاں فعل و مفعول اور خلق و مخلوق کے مابین خلط ہو رہا ہے اس لیے بات صاف نہیں ہوتی' یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بندہ کا جو فعل ہوتا ہے مثلاً نماز' یہ بے شبہ اسی کا فعل ہے اور حقیقتاً ہے مگر یہ اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہے ہاں اس کا مفعول اور اس کی مخلوق ہے۔ اس جگہ جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ فعل صلوٰۃ کا خلق یعنی اس کا پیدا فرمانا ہے۔ پس جس طرح بندہ کا فعل الگ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فعل الگ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل الگ ہے اور اس کی مخلوق الگ۔ دیکھو جب صلوٰۃ کو یہاں بندہ کا فعل قرار دیا گیا تو جس کا وہ فعل ہے اسی کے ساتھ وہ قائم بھی ہوتی ہے اور جو خدا کا فعل ہے یعنی اس کو پیدا فرمانا یہ خلق اس کی صفت ہے اور وہ اس کے ساتھ قائم ہے۔ نماز اس کا فعل نہیں یہ اس کی مخلوق ہے' لہٰذا اس کے ساتھ قائم بھی نہیں ایسے فعل کو جس کا نفع و نقصان اس کے فاعل کی طرف عود کرے کسب کہتے ہیں' اس لیے کہا جاتا ہے کہ بندے اپنے افعال کے کاسب ہیں اور حق تعالیٰ ان کا خالق ہے اس کا نہ ہماری نماز سے کوئی فائدہ نہ نقصان۔ بندوں کا نماز سے فائدہ بھی ہے اور نہ پڑھنے سے نقصان بھی۔ اس سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے افعال کا علاقہ ہمارے ساتھ کیا۔ اسی کو علماء خلق و کسب سے ادا کرتے ہیں یعنی ہمارے افعال کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے خلق کا ہے اور بندہ سے کسب کا' اس بنا پر جزاء وسزا عطا فرماتا ہے بلکہ یہاں دونوں افعال الٰہیہ ہیں اور افعال انسانی پر جزاء وسزا کا حاصل خود بعض افعال باری کا بعض پر ترتب کے مرادف ہے جیسے ابھی آپ نے سنا کہ آگ پر اللہ تعالیٰ جلانا مرتب فرما دیتا ہے' اسی طرح بدعملی پر سزا پیدا فرما دیتا ہے نہ وہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آگ نے جلایا کیوں نہ یہاں یہ سوال ہونا چاہیے کہ بدعملی پر سزا کیوں دی گئی' بلکہ انسان کے افعال اختیاریہ میں اس کی دوسری غیر اختیاری صفات جن پر اس کی مدح و مذمت کی جاتی ہے اتنی خصوصیت اور زیادہ ہے کہ جن افعال پر صرف مدح و ذم ہوتی ہے وہ انسانی قدرت و اختیار سے مخلوق نہیں ہوتے با ایں ہمہ ان پر تعریف بھی کی جاتی ہے اور مذمت بھی لیکن جن افعال پر جزاء وسزا مرتب ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق انسانی قدرت و اختیار کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے' اس لیے یہاں تعریف و ہجو اور زیادہ معقول ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس حقیقت کی یوں توضیح فرماتے ہیں کہ انسانوں کے افعال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اس کی قدرت اور ارادہ سے صادر نہیں ہوتے جیسے رعشہ زدہ انسان کی حرکات۔ ان افعال کو اگرچہ انسان کی صفت تو کہا جاتا ہے مگر ان پر انسانی افعال کا اطلاق نہیں کیا جاتا چنانچہ اگر کسی ایسے شخص کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر متحرک ہو تو چونکہ یہ حرکت اس کی صفت ہے لہٰذا اس کو متحرک تو کہا جائے گا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شخص اپنا ہاتھ ہلا رہا ہے۔ یعنی یہ حرکت اس کا فعل ہے۔ دوسرے قسم کے افعال وہ ہیں جو بظاہر اس کے اختیار و قدرت سے موجود ہوتے ہیں ان کو اس کی صفت بھی کہا جاتا ہے اور ان پر انسانی فعل کا بھی اطلاق ہوتا ہے جیسے سارے افعالِ اختیاریہ۔ ثواب و عذاب انسان کے صرف ان افعال اختیاریہ ہی پر ہوتا ہے' غیر اختیاری افعال پر نہیں ہوتا۔ اب مسئلہ مجازات کی حقیقت یوں سمجھنی چاہیے کہ جس طرح زہر کھانے سے موت آنا ضروری ہے' اسی طرح زناء سے عذاب ہونا

ضروری ہے، ظلم کا سوال نہ وہاں پیدا ہوتا ہے نہ یہاں پیدا ہونا چاہیے، جس طرح یہ کہا جائے گا کہ زہر کھانا سبب ہی تھا موت کا اسی طرح یہ کہا جائے گا کہ زناء بھی سبب ہی تھا عذاب کا، گویا یہ دونوں باتیں قدرت کی اسی ترتیب سے پیدا کردہ ہیں جب کوئی شخص خدائی تقدیر سے زہر کھالیتا ہے تو اس پر وہی قدرت دوسرا فعل یعنی موت پیدا فرما دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جب اسی تقدیر کی بناء پر کوئی شخص زنا کر لیتا ہے تو قدرت نے جب یہ فعل پیدا کیا تھا تو اسی کے ساتھ وہ دوسرا فعل عذاب کا پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح مسئلہ مجازات کی حقیقت بعض افعالِ الٰہیہ کا بعض پر ترتب ہے۔

اتنی وضاحت کے بعد بھی غیر مؤثر قدرت کے اقرار اور سرے سے قدرت کے انکار میں کوئی خاص فرق واضح نہیں ہوتا اور نہ یہ بات نکھر کر صاف ہوتی ہے کہ کسب انسانی کا تعلق کس چیز کے ساتھ ٹھہرا صرف اتنا کہہ دینا کہ کسب بندہ کا اپنے لیے صرف محل بن جانے کا نام یہاں تشفی بخش نہیں۔ اس لیے امام ماتریدی نے کسب کی اس تفصیل کو بے مصداق سمجھا ہے اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر اس کا مصداق بھی معین فرمایا ہے کہ بندہ جب کوئی فعل کرتا ہے تو یہاں بداہتہً دو چیزیں نظر آتی ہیں ایک اس کا فعل دوم اس فعل کی ہیاۃ پہلی چیز کو معنی مصدری اور دوسری کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص اپنا ہاتھ اوپر سے نیچے ہلاتا ہے تو ایک چیز تو اس کا یہ ہلانا اور یہ حرکت ہوئی یہ تو معنی مصدری ہیں اور دوسری چیز وہ نقشہ ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہاتھ کے اوپر سے نیچے آنے میں نظر آتا ہے، یہ حاصل بالمصدر کہلاتا ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ یہ فعل تو ایک موجود چیز ہے اور انسان کے ہاتھ کے ساتھ قائم ہے دوسری چیز صرف اعتباری ہے اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں نہ وہ جوہر ہے نہ عرض، گویا معنی مصدری تو موجود ہیں گو اس کا وجود بھی خود قائم نہیں ہاتھ کے ساتھ قائم ہے لیکن حاصل بالمصدر موجود ہی نہیں ہوتا، وہ صرف ایک خیالی حقیقت ہے جیسا کہ کسی تنکہ کو روشن کر کے دائرہ کی شکل پر زور سے حرکت دی جائے تو حرکت کی سرعت کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے ایک روشن دائرہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس دائرہ کا بھی حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح حاصل بالمصدر کو سمجھنا چاہیے۔

امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ یہاں یہ فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حاصل بالمصدر بندہ کی اور چونکہ حاصل بالمصدر کا وجود محض خیالی ہوتا ہے اس لیے اگر وہ خدا تعالیٰ کی خالقیت سے خارج رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اشعری اس اعتباری حرکت کو بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ بہر حال بندوں کے افعال میں جملہ اہل حق کا اس پر تو اتفاق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں اور بندہ ان کا صرف کاسب ہے اختلاف ہے تو کسب کی تفسیر میں ہے۔ اشعری انسان کے ساتھ ان افعال کے صرف قیام کو کسب فرماتے ہیں اور ماتریدی حاصل بالمصدر کو کسب فرماتے ہیں۔ علماء کلام نے ماتریدیہ کے نزدیک کسب کے اور معانی بھی بیان فرمائے ہیں مگر ان تمام تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

مسئلہ تقدیر کے لاینحل ہونے کا راز

یہاں دو حقیقتیں اپنی اپنی جگہ اس طرح ثابت شدہ ہیں کہ جب انسان ان کو جدا جدا دیکھتا ہے تو ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مگر جب دونوں کو جمع کرنے کی سعی کرتا ہے تو یکسر ناکام ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دو باتیں ہیں تو جس طرح وہ

علیحدہ علیحدہ صحیح ہیں اسی طرح دونوں کو مل کر بھی صحیح رہنا چاہیے' مگر اس مسئلہ میں جب ان دو ثابت شدہ حقیقتوں پر یکجا نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کھلا تضاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لیے نہ تو انسان بیک وقت دو متضاد باتوں پر جزم ہی کر سکتا ہے اور نہ ثابت شدہ حقیقتوں کے صاف انکار کر دینے کی جرأت کر سکتا ہے' اس لیے اس کے سامنے تفویض و تسلیم کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

دیکھئے انسان جب اپنے وجدان کی طرف غور کرتا ہے تو اپنے نفس میں جبر کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی محسوس نہیں کرتا اور اس کو اتنا ہی مختار پاتا ہے جتنا کہ صفتِ اختیار کا تقاضہ ہونا چاہیے اپنے اس بدیہی وجدان کے ساتھ جب وہ مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اس کو یہ باور کراتا ہے کہ کائناتِ ہستی کا کوئی ذرّہ حتیٰ کہ خود اس کے ارادات و خطراتِ قلبیہ بھی اس کی قدرت میں نہیں ہیں' بلکہ وہ سب ارادۂ الٰہیہ کے تحت گردش کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ قدرت کے سامنے مجبور محض ہے' اسی کے ساتھ جب وہ اس طرف بھی نظر ڈالتا ہے کہ اس جبر کے باوجود آخرت میں وہ اپنے افعال پر مسئول بھی ہے تو اس کی حیرت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ مسئلہ اس کے سامنے اور پر پیچ بن جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو جب انسان کو اپنا مختار ہونا آفتاب کی طرح محسوس ہو تو وہ اپنے مجبور ہونے کا یقین کرے تو کیسے کرے اور اگر مجبور فرض کر لے تو ایک مجبور کو مسئول مانے تو کیونکر مانے مگر جب کہ ایک سچا مذہب اس کو یہی تعلیم دیتا ہے تو وہ انکار کیسے کر سکتا ہے۔ اب ایک طرف تو اس کے سامنے اپنے وجدان کا یقین ہوتا ہے دوسری طرف مذہب کا یقین ہوتا ہے اور ہوتے ہیں دونوں متضاد' آخر مسئلہ تقدیر اس کے لیے ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں محض عقلی شہسوار تو آزاد ہے مشکل اُس کی ہے جس نے مذہب کی قید و بند بھی اپنے سر لے رکھی ہے۔

اس عالم سراسیمگی میں جبریہ پر تو قدرتِ الٰہیہ کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ انہوں نے انسانی وجدان ہی کو غلط قرار دے دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ انسان میں نہ تو قدرت ہے اور نہ اختیار وہ محض ایک پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے قدرتِ الٰہیہ جس طرح اور جس طرف چاہتی ہے اس کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ ان کے نزدیک جو قادرِ مطلق اور مالک علی الاطلاق ہو وہ مجبورِ محض سے بھی سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا اب مجبور کے مسئول ہونے میں بھی کوئی اشکال نہیں رہا۔ یہ فیصلہ تسلیم کر لینا اس فرقہ کے لیے خواہ کتنا ہی خوش کن ہو لیکن ایک خالی الذہن انسان کے لیے اپنے وجدان کے خلاف اس کو تسلیم کر لینا سخت مشکل ہے۔ اس لیے دوسری جماعت نے اس کو قطعاً غیر معقول سمجھا' اور ان پر انسان کو پتھر کی طرح مجبور سمجھ لینا پھر اس مجبور کو مسئول ٹھہرانا اتنا بار گراں ہوا کہ انہوں نے بندوں کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دے ڈالا اور یہ تسلیم کر لیا کہ بندہ میں اپنے افعال کی تخلیق کی قدرت ہے اور اسی قدرت سے وہ افعال کرتا ہے اور جب اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کو مسئول بھی ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مسئلہ تقدیر گو مشکل ہے مگر اس کا انکار اس سے زیادہ مشکل ہے۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ ان دونوں جماعتوں نے اپنے خیال کے مطابق اس مسئلہ کا حل تلاش تو کر لیا مگر یا بداہت کی تکذیب کی یا نصوصِ قرآنیہ کی تخصیص کی' یہاں اہل سنت نے معاملہ سلجھتا ہوا نہ دیکھ کر تفویض کی راہ لی اور اس اعتراف میں کوئی باک نہ سمجھا کہ اگر کوئی عقدہ ان سے حل نہ ہو سکا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حل شدہ نہیں ہے۔ اس بناء پر اس کا انکار اور تاویل دونوں ہی غلط ہیں۔

اس حد پر پہنچ کر ضعیف الاعتقاد انسانوں کے دلوں میں مذہب کی جانب سے کچھ شکوک پیدا ہونے نہیں چاہئیں کیونکہ سب

سے پہلے تو ان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب کبھی دنیا نے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حقیقت کا سراغ لگانا چاہا ہے تو وہ ہمیشہ ناکام ہی ہو کر اٹھی ہے' حتیٰ کہ قدیم عقلاء نے تو قاعدہ کلیہ کے طور پر کہہ دیا ہے: "التحدید الحقیقی عسیر جداً" کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ چلانا یا تو ناممکن ہے یا اتنا مشکل ہے کہ اس کو قریب قریب ناممکن کہہ دینا چاہیے- بے چارے قدیم عقلاء نے تو بعض جگہ اپنے عجز کا اعتراف بھی کرلیا ہے لیکن آج کے عقلاء زمانہ اس اعتراف میں بھی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں' دیکھو ہوا اور پانی کتنی کثیر الاستعمال چیزوں میں سے ہیں لیکن اب تک جو ان کے آخری اجزاء سمجھے گئے تھے اب ثابت ہوگیا ہے کہ وہ آخری نہیں تھے ان کا تجزیہ ابھی اور ہوسکتا ہے اور ہوگیا ہے- جب اتنی تگ و دو کے بعد ایسی معمولی معمولی اشیاء کی حقیقت دریافت نہیں ہوسکی تو باریک مسائل میں اگر ذرا توقف کرلیا جاتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا' اس سے بڑھ کر خود انسان ہی کو لے لیجئے' جب اس نے اپنی حقیقت دریافت کرنے کے لیے قدم اٹھایا تو صدیوں کے بعد جس نتیجہ پر وہ پہنچا وہ یہ تھا کہ اصل میں وہ ایک بندر تھا- میں اس وقت یہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ تحقیق کس حد تک صحیح تھی' لیکن صرف یہ تنبیہ کرنی چاہتا ہوں کہ بہت جلد اس خیال کی بھی تغلیط کردی گئی اور ابھی تک خود انسان کی حقیقت بھی ایک معمہ بنی ہوئی ہے' یہی حال اس جگہ بھی سمجھئے' چونکہ یہاں بھی افعالِ انسانی اور قدرتِ انسانی کی حقیقت میں گفتگو ہو رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ جو دشواری ہر چیز کی حقیقت تلاش کرنے میں پیش آئی ہے یہاں بھی پیش آئے' اگر یہاں شریعت اپنی جانب سے تقدیر کی حقیقت کا اعلان نہ کرچکی ہوتی تو اس مسئلہ میں بھی آپ کی بحث وتمحیص کی وہی حیثیت رہتی جو اس قسم کے دوسرے مسکوت عنہ مسائل میں ہے لیکن یہاں تو بڑی مشکل یہ ہے کہ بعض مصالح کی بناء پر شریعت یہاں خود اس کی حقیقت کا اعلان کرچکی ہے' اس لیے اب آپ پر اسی کا تسلیم کرلینا لازم ہوگیا ہے' اتنی عقل ناقص العقل انسان میں بھی نہیں کہ وہ رازہائے قدرت کو پورا پورا پاسکتا اس لیے مذہب نے یہاں ایک ہی راستہ تعلیم کیا ہے اور وہ تفویض وتسلیم کا ہے- جس مذہب کی صداقت اور معقولیت اور ہزاروں مسائل میں ثابت ہوچکی ہو کچھ حرج تو نہ تھا اگر انسان صبر کرکے اس ایک مسئلہ کو اسی کے بیان پر مان لیتا' مگر وہ اتنا کم عقل ہے کہ اپنی کم عقلی کو بھی نہیں سمجھتا اور جتنا اس کو روکا جاتا ہے' اتنا ہی اس کی تحقیق کے اور درپے ہونے لگتا ہے-

حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہ فرماتے تھے کہ سرِ تقدیر فہم سے بالاتر کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بندہ کے افعال میں خود اس کی قدرت کا احساس بدیہی ہے ادھر مذہب یہ کہتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے اختیار وقدرت سے ہوتے ہیں لہٰذا کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں قدرتوں کو تسلیم کرلیا جائے- اب جو فعل بھی بندہ سے صادر ہوتا ہے ہر جگہ اس میں ان دو قدرتوں کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے- یہاں جو باریکی پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کتنا ہی تجزیہ کریں مگر کسی مرتبہ میں بھی جاکر بندہ کی قدرت کو اور حق تعالیٰ کی قدرت کو علیحدہ علیحدہ ممتاز نہیں کرسکتے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل میں اتنا کام تو بندہ کی قدرت سے ہوا اور اتنا قدرتِ الٰہیہ سے- آپ بندہ کے افعال کا تجزیہ کرتے چلے جایئے آپ کو کوئی مرتبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں قدرتِ الٰہیہ کا اثر نہ ہو اور جب تک یہ بات صاف نہ ہو اس وقت تک بندہ کا مختار کہنا بھی مشکل ہے' اور مجبور کہنا بھی- اس لیے اب اس کو نہ مختار کہے بنتی ہے نہ مجبور- دیکھئے ایک شہسوار گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ارادہ واختیار سے اس کو چلاتا ہے اور گھوڑا گو اس کے اختیار کے ماتحت ہی چلتا ہے مگر آپ یہ بھی بداہۃً جانتے ہیں کہ چلتا ہے وہ اپنی قدرت سے اپنے مالک کی قدرت سے نہیں چلتا' مگر یہاں دو قدرتیں علیحدہ

علیحدہ سمجھتے ہیں آپ کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی لیکن یہاں قدرتِ عبد کی حقیقت یہ نہیں اس کے جس مرتبہ میں بھی غور کیجئے گا وہ قدرتِ الٰہیہ سے علیحدہ ثابت نہیں ہوسکتا اس لیے آپ تجزیہ کیے چلے جایئے مگر قدرتِ عبد کے علیحدہ اور قدرتِ الٰہیہ کے علیحدہ علیحدہ کرنے سے آخر عاجز ہو جائیں گے اور جب تک یہ امتیاز پیدا نہ کرلیں اس وقت تک جبر واختیار کے اشکالات حل نہیں ہوتے اس لیے یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ کا اشکال یوں نہیں ہے کہ یہاں کوئی غیر معقول چیز موجود ہے بلکہ یوں ہے کہ اس کی نظیر کوئی ملتی نہیں اور حسیات میں جہاں نظائر نہیں ملتے عقل خود اپنا ہی حکم مقدم رکھتی ہے' اسی لیے شریعت نے یہ تعلیم فرمائی ہے کہ جو مجھ کو تسلیم کر چکا ہے اس کو میرا حکم ماننا ہوگا اور یہی ایمان بالتقدیر ہے' آخر جنت ودوزخ کو کس نے دیکھا بلکہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات کو کس نے دیکھا یہ تمام حقائق غیب ہیں' یہاں جو شخص محض انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کر چکا ہے بس وہی مؤمن ہے اور جس نے راہِ انحراف اختیار کی وہ دوسری طرف شمار ہو جاتا ہے۔

ناتمام اختیار کا فائدہ

اس ساری تحقیق کا حاصل اگر یہی ہے کہ انسان میں اختیار تو ہے مگر ہے ناتمام اور ناتمام بھی ایسا جو صرف انسان کے لفظی طور پر مختار کہلانے کے لیے کافی ہو اور بس تو صرف اتنے سے اختیار کے مان لینے سے تو جزاء وسزا کا مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ اس کا جواب پہلے تو یہ ہے کہ اگر حاکم علی الاطلاق ایسا ہی کر دیتا تو ظلم پھر بھی نہ تھا مگر اس کی حکمت نے چاہا کہ عمل اور اس کی جزاء وسزا کے مابین کچھ صوری مناسبت بھی باقی رکھے اس لیے اس نے انسان کو ایک ناتمام سا اختیار مرحمت فرما دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو عملی اور علمی ہر دو پہلوؤں میں دوسرے حیوانات سے امتیاز بخشا ہے۔ اس کا عملی امتیاز یہ ہے کہ اس کا نفس اپنے برے بھلے افعال کے اثرات کو اس طرح جذب کر لیتا ہے جیسا سیاہی کو جاذب۔ حیوانات کے نفوس میں یہ خاصیت نہیں' ان سے بھی افعال اختیاریہ سرزد ہوتے ہیں' مگر اُدھر صادر ہوئے اِدھر فناء ہو گئے' ان کے نفس میں ان افعال سے کوئی رنگ پیدا نہیں ہوتا' مگر انسان جب افعال اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کا نفس اسی کے مناسب اثرات سے رنگین ہوتا چلا جاتا ہے۔ افعالِ غیر اختیاریہ کا یہاں بھی کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا' یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ مدح کی جاتی ہے نہ قدح۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح زہر مہلک ہوتا ہے مگر اس کے مہلک ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ حلق کی راہ سے پیٹ میں پہنچے' اسی طرح افعال کی تاثیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا صدور اختیار کی راہ سے ہو اور اس کی یہی وجہ ہے کہ جب تک ان افعال کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا نفس انسانی میں ان کا رنگ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حکمتِ الٰہیہ چاہتی ہے کہ جس فعل کا رنگ نفس انسانی میں پیدا ہو چکا ہے اس پر یا تو انعام فرمائے یا اس کا انتقام لے اور جس عمل کا اس میں کوئی اثر پیدا نہیں ہوا اس کی باز پرس نہ فرمائے اب اگر یہ اختیار صرف اسی مناسبت کے پیدا کرنے کے لیے شرط کیا گیا ہے تو اس کے لیے مستقل اختیار ضروری ہے۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ یہاں دو عالم علیحدہ علیحدہ موجود ہیں ایک عالم تقدیر وہ غیب در

غیب ہے دوسرا عالم تکلیف یعنی جس میں ہم کو افعالِ شرعیہ کا مکلف بنایا گیا ہے یہ مشہود ہی مشہود ہے- عالم تکلیف میں بندہ کھلا ہوا مختار رکھا گیا ہے حتیٰ کہ جب تک اس کا اختیار مستقل نظر آنے نہیں لگتا یعنی وہ بالغ نہیں ہو جاتا اس سے افعالِ شرعیہ کا مطالبہ بھی نہیں ہوتا مگر یہاں عالم تقدیر ظاہر نہیں ہے اور جہاں عالم تقدیر ظاہر ہے وہاں اس کو مجبور ہی مجبور بنایا گیا ہے مگر وہاں ہم مکلّف بھی نہیں ہیں ان دونوں عالموں کے درمیان خلط کر دینے سے مفت میں اشکالات پیدا ہو گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غیبی نظر میں ہم صرف ایک مجبور مخلوق ہیں، حکمتِ ایزدی نے اس جہان میں ہم کو بصورتِ مختار ظاہر فرما دیا ہے اب چاہو تو اس کو ناتمام اختیار سے تعبیر کرلو اور چاہو تو اس جہان کے لحاظ سے مستقل اختیار کہہ دو- جزاء وسزا کا مسئلہ بس اسی پر دائر ہے- جو اس عالم میں موجود ہے اس کو دوسرے عالم میں اپنے مجبور ہونے کا عذر کرنا نہ چاہیے اور نہ یہ معقول ہو سکتا ہے-مشہور ہے قصہ زمین برسرِ زمین- یہاں جب کبھی اپنے نفس کو دیکھو گے تو اس کو مختار ہی پاؤ گے پھر اپنے اس بدیہی وجدان کو چھوڑ کر تقدیر میں الجھنا کٹ حجتی نہیں تو اور کیا ہے- مولانا رومی فرماتے ہیں کہ انسان جب کتے کے لاٹھی مارتا ہے تو کتا کبھی لاٹھی کو قصور وار نہیں سمجھتا وہ انسان ہی پر حملہ کرتا ہے یا اگر کسی پھل دار درخت سے کوئی پھل اس پر آ گرتا ہے تو وہ کبھی درخت پر حملہ نہیں کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ مجبور و مختار کے فرق کو ایک کتا بھی سمجھتا ہے جس کو مختار سمجھتا ہے اس پر حملہ کرتا ہے اور جس کو مجبور سمجھتا ہے اس پر حملہ بھی نہیں کرتا -لہٰذا اس کھلے ہوئے فرق کو نظر انداز کر کے محض تقدیر کے مسئلہ میں الجھنے کے لیے اپنے نفس کو مجبور محض کہہ دینا کتنا غیر معقول ہے- **واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.**

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ و خیرتہ محمد وسلم تسلیما کثیرا

فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ

اور

اُن کے کفر کی ضروری تنقیح

احادیثِ قضاء وقدر پڑھنے سے قبل ضروری ہے کہ فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ معلوم کر لی جائے' تا کہ یہ بات بخوبی واضح ہو جائے کہ احادیث میں اس فرقہ کے متعلق جو تعبیری شدت اختیار کی گئی ہے وہ کیوں کی گئی ہے اور ائمہ وعلماء نے اس فرقہ کی جو تکفیر کی ہے وہ کس بنیاد پر کی ہے- حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے عہدِ مسعود میں اس فرقہ کا نام ونشان نہ تھا' صحابہ کرام کے آخری دور میں اس کا ظہور ہوا اور جو صحابہ اس وقت بقید حیات تھے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کے استیصال میں حصہ لیا جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت واثلہؓ بن اسقع کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے-عراق سے اس فتنہ کا آغاز ہوا اور بصرہ کے ایک یہودی النسل شخص نے اس کی بنیاد ڈالی جس کا نام سوسن یا سیبویہ تھا' پھر اس سے معبد جہنی نے اور معبد جہنی سے عیلان نے اس عقیدہ کو سیکھا' شدہ شدہ یہ فتنہ بصرہ سے لے کر شام وحجاز تک پھیل گیا- لکھتے ہیں کہ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ جب خانہ کعبہ کو آگ لگی تو کسی شخص کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ تقدیر الٰہی یوں ہی ہوگی' اس پر کسی دوسرے شخص نے کہا اللہ تعالیٰ بھلا ایسا کیوں مقدر فرماتا بس اتنی بات پر قضاء وقدر کی بحث چل پڑی-

قدریہ کا عقیدہ یہ تھا کہ "الامر انف " عربی زبان میں "روض انف" اس باغ کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی کے باوجود کسی جانور نے منہ نہ ڈالا ہو- اور یہاں اس سے غرض یہ ہے کہ بندہ کی سعادت وشقاوت بھی خود اپنے ہی عمل سے پیدا ہوتی ہے' حق تعالیٰ کو پہلے سے نہ اس کا علم ہوتا ہے اور نہ کہیں اس کی کتابت ہوتی ہے- ہر انسان جب کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہی خود اس کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے پھر اسی کے مطابق اس کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے' اسی ذہنی نقشہ تیار کرنے کا دوسرا نام خلق ہے-کسی شاعر نے ذیل کے شعر میں خلق کا لفظ اسی معنی میں اختیار کیا ہے:

و لا نت تفری ما خلقت و بعض الناس یخلق ثم لا یفری

یعنی یہ شان تو ایک تمہاری ہے کہ جو ذہن میں سوچ لیتے ہو اس کو خارج میں عملی جامہ بھی پہنا کر رہتے ہو اور تمہارے سوا اور لوگ ہیں کہ وہ خیالات تو پکا لیتے ہیں مگر بس اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے-

اس بناء پر قدریہ کو بندہ کے خالق کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہوتا- اس بد بخت جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ گو اپنے بندوں کے لیے شریعت نازل فرماتا ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون اس کی فرمان برداری کرے گا اور کون نافرمانی' کون ان میں دوزخی ہوگا اور کون جنتی' حتیٰ کہ جب بندے خود عمل کر کے دوزخ اور جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں تو اب اس کو بھی دوزخیوں اور جنتیوں کا علم ہو جاتا ہے- **نعوذ باللہ من ھذ الخرافات** -اس عقیدہ کا بطلان اظہر من الشمس ہے' قرآن کریم ان دونوں

باتوں کے خلاف بھرا پڑا ہے- وہ تصریح کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کو جملہ اشیاء کا پہلے سے علم بھی حاصل ہے اور آئندہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اسی کے مطابق ہوتا ہے- نیز وہ اپنے اس علم کو قید کتابت میں بھی لا چکا ہے- چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ. (القمر: ۴۹) بلاشبہ ہم نے ہر چیز پہلے سے طے کر کے بنائی ہے-

کبھی وہ اپنے علم ازلی کا اظہار بھی فرما دیتا ہے' جیسا کہ شیطان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْکَ وَ مِمَّنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ. (ص: ۸۵) مجھ کو تجھ سے اور ان میں جو جو تیری تابعداری کرے گا ان سب سے دوزخ کو بھرنا ہے-

دوسری جگہ ایک موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ لَوْ لَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَکَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی. (طٰه: ۱۲۹) اگر آپ کے پروردگار کی جانب سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی اور عذاب کا ایک مقررہ وعدہ نہ ہو چکا ہوتا تو یقیناً عذابِ الٰہی آ جاتا-

رسولوں کے متعلق فرمایا:

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ. (الصافات: ۱۷۱-۱۷۳) اور ہمارے بندوں میں جو مرسلین ہیں ان کے لیے ہمارا یہ حکم پہلے ہو چکا ہے کہ بے شک وہی منصور اور فتح مند ہیں اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہے-

ایک اور موقعہ پر فرمایا ہے:

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ وَ لَوْ لَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ. (هود: ۱۱۰) اور البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف کیا گیا اگر کہیں تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے متعلق فیصلہ کر دیا جاتا-

اسی طرح تقدیر کی کتابت کے متعلق بھی بہت سی آیات میں تصریح موجود ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ. (الحج: ۷۰) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ بھی آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے-

حضرت ابن عباسؓ آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا' پھر جو عمل بھی وہ کرنے والی تھی ان سب کا اس کو پہلے سے علم حاصل تھا' اس نے اپنے اس علم کو کتاب کی شکل عنایت فرمائی' چنانچہ اب وہ کتاب کی شکل میں موجود ہے چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے مذکورۂ بالا آیت پڑھ لو-

دوسری جگہ ارشاد ہے:

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ. (الحدید:۲۲)

جب کوئی مصیبت ملک میں یا تمہاری جانوں میں پیش آتی ہے تو اس سے قبل کہ ہم اس کو دنیا میں پیدا کریں وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا ہے:

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ. (الانبیاء:۱۰۵)

اور نصیحت کرنے کے بعد ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ آخرکار زمین کے مالک میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔

محو و اثبات کے متعلق فرمایا ہے:

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ. (الرعد:۳۹)

اللہ جو چاہتا ہے لوحِ محفوظ میں سے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

الغرض علم ازلی اور اس کی کتابت کے متعلق قرآن کریم میں بے شمار آیات موجود ہیں یہاں ان سب کا احصار مقصود نہیں ہے' صرف بطور مشتے نمونہ از خروارے چند آیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے' اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بھی اسی فرقہ کے حق میں ہے۔

علماء اسلام نے جب اس عقیدہ کو باطل کر دکھایا اور اس کی دھجیاں اڑا دیں تو ان کو لاچار ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا اور وہ علم الٰہی کے تو قائل ہو گئے مگر افعال عباد کا مشیتِ الٰہیہ کے تحت ہونے کا ان کو پھر بھی انکار رہا۔ اس جماعت کو کافر کہنا تو مشکل ہے' البتہ ان کو بدعتی کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق افعال عباد کا مسئلہ خود ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی تحقیق میں خود اہل سنت کا قلم بھی کسی ایک رائے پر نہیں جم سکا' ایسے مسئلہ میں کفر کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو مسائل عہد سلف میں مسلّم ہوں اور قطعی ثبوت کے ساتھ ہم تک پہنچ جائیں ان میں تاویل یا ان کا انکار تو ایک لمحہ کے لیے بھی قابل برداشت نہیں ہے جیسا مسئلہ ختم نبوت یا نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ لیکن جو مسائل اس وقت زیر بحث نہیں آ سکے اور بعد میں دماغی کاوشوں' عقلاء کی نکتہ سنجیوں یا زائغین کی مغالطہ آمیزیوں سے پیدا ہو گئے ہیں اگر شریعت اسلام میں اس کا کوئی واضح حکم نہیں ملتا تو اس کے انکار یا اقرار سے تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ خلق افعال عباد کا مسئلہ بھی ان ہی میں داخل ہے لہٰذا اس مسئلہ میں جو فرقے بھی اہل حق سے جدا ہو گئے ہیں ان کو کافر نہیں کہا جائے گا البتہ بدعت کے حکم سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

بعض متاخرین نے قدریہ کے متعلق ائمہ کی جو تکفیر نقل کر دی ہے اس کو اسی تفصیل کے ماتحت سمجھنا چاہیے۔ یعنی یہ وہ فرقہ ہے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا ان کے وجود سے قبل کوئی علم نہیں ہوتا اور نہ پہلے سے لوحِ محفوظ یا کہیں ان کی کتابت ہوتی ہے۔ دیکھو کتاب الایمان ص ۱۵۴ و ۱۵۵ ائمہ حدیث جیسے بخاری و مسلم نے اگر کہیں کسی قدری راوی کی روایت اپنی اپنی صحیح میں درج فرمائی ہیں تو وہ اسی دوسرے فرقہ کا شخص ہوا ہے کیونکہ پہلا فرقہ بالاتفاق کافر ہے اور کافر کی روایت کے مردود ہونے میں کوئی اختلاف نہیں' البتہ بدعتی کی روایت کے قبول و رد میں اختلاف ہے' جس کی تفصیل کا محل اصولِ حدیث ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے

حاشیہ ابی داؤد میں قدریہ اور چند بدعتی فرقوں کے ظہور کی تاریخ اس ترتیب سے تحریر فرمائی ہے-

و اما الارجاء، و الرفض، والقدر، و التجهم، و الحلول و غيرها من البدع: فانها حديث بعد انقراض عصر الصحابه.

و بدعة القدر: ادركت اخر عصر الصحابه، فانكرها من كان حيًا، كعبد الله بن عمر، و ابن عباس و امثالهما رضى الله عنهم. و اكثر ما يجئ من ذمهم: فانماهو موقوف على الصحابة من قولهم فيه ثم حدثت بدعة الارجاء بعد انقراض عصر الصحابة، فتكلم فيها كبار التابعين الذين اوركوها كما حكيناه عنهم.

ثم حدثت بدعة التجهم بعد انقراض عصر التابعين. و استفحل أمرها، و استعار شرها فى زمن الائمة كالامام احمد و ذويه.

ثم حدثت بعد ذلك بدعة الحلول، و ظهر امرها فى زمن الحسين الحلاج.

یعنی تقدیر کے انکار کی بدعت صحابہ کرام کے آخری دور میں شروع ہوئی اور عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور اس قسم کے اور صحابہ نے جو اس دور میں بقیدِ حیات تھے اس کی تردید میں کافی حصہ لیا، اسی لیے اس فرقہ کی مذمت جن احادیث میں آئی ہے وہ کثرت سے صحابہؓ ہی کے اقوال ہیں- اس کے بعد ارجاء کی بدعت نکلی، ان کی تردید میں اکابر تابعین نے حصہ لیا، پھر جب عہد تابعین بھی ختم ہوا تو جہمیہ فرقہ پیدا ہوا اور امام احمدؒ وغیرہ جیسے ائمہ کے دور میں اس کا خوب چرچا رہا، اس کے بعد حلول کا عقیدہ ظاہر ہوا اور حسین حلاج کے زمانہ میں اس کا زور وشور ہوا-

قضاء وقدر کے مسئلہ میں امام ماتریدی کے مسلک کی اہم توضیح

امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسباب میں تاثیر اور اشیاء میں طبعی خواص کا انکار کرنا آیات واحادیث کے ظاہری الفاظ کے قطعاً خلاف سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جس طرح قدرت نے مسببات میں اسباب کی تاثیر ودیعت فرمائی ہے اسی طرح بندہ کے افعال میں بھی اس کی قدرت کی تاثیر رکھی ہے۔ عالم اسباب کے طویل وعریض سلسلہ میں ہر جگہ تاثیر کا انکار کر کے یہ کہہ دینا کہ یہاں دو چیزوں کے درمیان صرف وقتی مقارنت ہے اور ان میں باہم تاثیر وتاثر کا کوئی علاقہ نہیں بداہت کے بھی خلاف ہے، عرف کے بھی خلاف ہے اور آیات واحادیث کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو صاف آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ آدمی زہر کھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ تریاق زہر کا اثر باطل کر دیتا ہے پھر اسی عرفی نسبت کو آیات واحادیث میں بھی قائم رکھا گیا ہے لہٰذا ہم کو ان کا مفہوم وہی لینا ہوگا جو اہل عرف اس نسبت سے سمجھتے ہیں۔ ان تمام آیات میں اور اپنے حسی مشاہدات میں صرف مجازی نسبتیں مراد لے لینا کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ ان جملہ مقامات میں تاثیر کا اقرار کیا جائے، مگر یہ تاثیر ہوتی ہے اسی کے اذن سے۔ بندہ کی صفت اختیار اور اس کے افعال کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے یہاں بھی اختیار کی صفت حق سبحانہ کی پیدا فرمودہ ہے اور بندہ کے افعال میں تاثیر بھی اسی کے اذن سے ہوتی ہے پھر جس طرح دوسرے مقامات میں کسی چیز کے وجود کے لیے صرف اسباب کا وجود کافی نہیں ہوتا بلکہ موانع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ موانع بھی قدرت ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ جہاں یہ موانع موجود ہوتے ہیں وہاں بندہ کی صفتِ اختیار کے باوجود پھر افعال کا صدور نہیں ہوتا۔

(ج ۲ ص ۱۷-۱۸-۲۶ منہاج السنہ - وشفاء العلیل ص ۱۵۲)

اس مسئلہ کی تقریر کرتے ہوئے حافظ موصوف ایک دوسرے مقام پر اور زیادہ زور دے کر تحریر فرماتے ہیں کہ تمام کتب سماویہ میں کسی ایک کتاب نے بھی قرآنِ کریم سے بڑھ کر اسباب کا اثبات نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ پھر کیونکر اسباب کی تاثیر کا انکار کر دیا گیا ہے اور کیونکر اس تاثیر کو توحید کے خلاف سمجھا گیا ہے جب کہ عقیدہ یہ ہے کہ سبب اور مسبب دونوں کا خالق وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے اور سبب کی اپنے مسبب میں تاثیر بھی اسی کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ اگر وہ چاہے تو سبب کی تاثیر باطل بھی فرما سکتا ہے جیسا کہ اپنے خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں آتش نمرود کی تاثیر باطل فرما دی اور اگر چاہے تو اسباب کی تاثیر قائم رکھتے ہوئے پھر کچھ موانع ایسے فرما دے سکتا ہے جو ان کی تاثیر سے مانع ہو جائیں اور اگر ارادہ فرمائے تو ان کو اٹھا بھی دے سکتا ہے کہ پھر پہلے کی طرح وہی تاثیر کرنے لگیں۔ ایسی تاثیر کے اعتقاد سے بھلا توحید کو کیا ٹھیس لگ سکتی ہے اور شرک کا کیا وہم ہوسکتا ہے، لیکن بے علم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پکی توحید یہ ہے کہ نہ آگ میں جلانے کی تاثیر ہے نہ پانی غرق کرنے کی اور نہ روٹی میں پیٹ بھرنے کی اور نہ تلوار میں قطع کرنے کی یہ اثرات سب براہ راست قدرت کا فیض ہیں یہ توحید ایسی ناقابل فہم توحید ہے کہ جس کو سن سن کر آج دشمنانِ اسلام، اسلام ہی سے منکر ہوئے جا رہے ہیں واقعی سچی مثل ہے کہ ''نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے''۔ (دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸۹ و ۱۹۰)

اس لیے امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ بندہ میں قدرت و اختیار کی صفت بھی ہے اور اس کے افعال میں اس کے اختیار و قدرت کی تاثیر بھی ہے۔ امام کے مذہب کی بناء پر اگر بندہ کو مجبور کہا جائے گا تو صرف اس معنی سے کہ قدرت نے اختیار کی صفت اس میں جبراً پیدا فرمائی ہے۔ اس میں بندہ کے اختیار اور پسندیدگی کا کوئی دخل نہیں پس جس طرح ایک پتھر اپنے غیر مختار ہونے میں مجبور ہے اسی طرح بندہ اپنے مختار ہونے میں مجبور ہے۔ یہاں جبر اسی معنے سے نہیں ہے کہ اس اختیار کے استعمال کرنے پر بھی کوئی اور جبر اس پر مسلط کیا گیا ہے کہ بلکہ ہر طرف کے راستے اس کے سامنے کشادہ رکھے گئے ہیں۔ اب جس طرف بھی وہ چاہے اپنی صفت اختیار کو استعمال کر سکتا ہے قدرت نے ہر طرف اس کی معاونت فرمانے کا وعدہ فرما لیا ہے اور اس کے عزم کے موافق جب بھی وہ ارادہ کرتا ہے تو قدرت اس عمل کو پیدا فرما دیتی ہے گویا رشتہ خالقیت ہر جگہ دستِ قدرت ہی کے ساتھ مربوط رہتا ہے۔ اس صفت اختیار کو کسی ایک جانب استعمال کرنے کا نام کسب ہے' اور اسی کے لحاظ سے اس کو بندہ کا فعل اور اس کو اس کا حقیقی فاعل کہا جاتا ہے اور خلق کے لحاظ سے اس فعل کو حق سبحانہ کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی عمل میں بندہ کی تاثیر صرف اس کے کسب کرنے میں ہوتی ہے اور خالق کی اس کے پیدا فرمانے میں۔ اس لحاظ سے وہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی اور مکسوب بندہ کا ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ مخلوق ہمیشہ اپنے خالق سے علیحدہ موجود ہوتی ہے اور فعل اپنے فاعل کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ بندہ کا فعل جو اس کے کسب سے متعلق ہے وہ بندہ کی صفت ہے اور اسی کے ساتھ قائم ہے اور چونکہ وہ حق سبحانہ کی مخلوق ہے اس لیے ہمیشہ اس سے علیحدہ موجود ہوتا ہے' قدرت جب بندہ کا عزم دیکھ لیتی ہے تو اس کے پیدا فرمانے کی سب شرائط موجود فرما دیتی ہے اور اس کو بندہ میں پیدا بھی کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برے اور بھلے ہر قسم کے افعال سے خالق کو نہ برا کہہ سکتے ہیں نہ بھلا کیونکہ ان افعال کی وجہ سے برا یا بھلا اسی کو کہہ سکیں گے جس کی یہ صفات ہوں اور اس کے ساتھ قائم ہوں۔ خالق کے ساتھ بندہ کے یہ افعال چونکہ قائم نہیں ہوتے اس لیے نہ اس کی صفت بنتے ہیں اور نہ اس کو ان کے لحاظ سے برا یا بھلا کہا جا سکتا ہے۔ دیکھو سیاہ یا سرخ رنگ دینے سے اس کپڑے کو تو سیاہ یا سرخ کہا جاتا ہے مگر جو اس کا رنگنے والا ہے اس کو نہ سیاہ کہا جاتا ہے نہ سرخ کیونکہ یہاں بھی سیاہی اور سرخی کپڑے کی صفت ہوتی ہے رنگنے والے کی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ضعیف مخلوق کے اختیار کی تاثیر صرف اس حد تک ہی ہو سکتی ہے کہ جب وہ چاہے اپنے اس اختیار کو کسی ایک جانب استعمال کر لے' رہی وہ طاقت اور قدرت جو کسی چیز کو عدم سے نکال کر لباسِ وجود عطاء کر دے تو یہ صرف قدرتِ قدیمہ کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہی ہر جگہ اس کی مالک بنی ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی عمل دو اعتبار سے خدا تعالیٰ اور بندہ دونوں کی طرف منسوب رہتا ہے جیسا کہ مال و املاک یہ سب خدا تعالیٰ کے پیدا فرمودہ ہیں اور مِلک بھی حقیقتاً سب اسی کی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی نسبت حق سبحانہ کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نسبت بندہ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ پس اموال کی طرح اعمال کا قصہ بھی ہے۔ یہ بھی سب اسی کے پیدا کردہ ہیں مالوں کا مالک اور اعمال کا کاسب اسی نے بندوں کو بنایا ہے اور جس طرح کہ دنیا میں مال بندہ کے کسب سے حاصل ہوتا ہے حالانکہ وہ پیدا کردہ حق سبحانہ کا ہوتا ہے' اسی طرح اعمال بھی بندہ کے کسب سے حاصل ہوتے ہیں اور پیدا کردہ حق سبحانہ کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مال تو قدرت کا پہلے سے پیدا کردہ ہوتا ہے اور بندہ کے اعمال اس کے ارادہ اور عزم کے بعد پیدا کیے جاتے ہیں اس لیے یہاں قدریہ کو مغالطہ لگ گیا

4 ہے اور انہوں نے ان کا خالق خود بندوں کو قرار دے ڈالا ہے۔ اسی طرح ناک، کان، زبان سب قدرت ہی نے پیدا فرمائے ہیں اور ان میں جدا جدا قوتیں بھی سب قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں اور ان کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کی طاقت بھی سب اسی نے مرحمت فرمائی ہے۔ بندہ جب چاہتا ہے اپنی ان قوتوں کا استعمال کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے نہیں کرتا۔ اسی طرح اس میں اختیار کی بھی ایک صفت ہے اس کو بھی وہ جب چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جب چاہتا ہے استعمال نہیں کرتا۔ خالق ان سب مقامات پر وہی ذات وحدہ لاشریک لہ رہتی ہے اور بندہ بھی ان کے ساتھ اپنا ایک اعتباری علاقہ پیدا کر کے ''کسب'' کی نسبت حاصل کرتا رہتا ہے کسی عمل کے بندہ کی طرف صرف منسوب ہو جانے سے یہ سمجھ لینا کہ اس میں شرک ہو گیا ہے سخت بے علمی اور نافہمی ہے۔ کیا ایک بچہ کی نسبت اپنی ماں کی طرف اور غلہ کی کسی خاص زمین کی طرف اور پھل کے کسی خاص درخت کی طرف نہیں کی جاتی اور کیا پھر ان سب اشیاء کی نسبت خالق کی طرف بھی نہیں کی جاتی۔ مگر ان دونوں نسبتوں کا مفہوم بالکل جدا جدا ہوتا ہے۔ کیا یہاں کسی کو شرک کا وہم گزر سکتا ہے۔ اس لیے محض اس وہم کی بناء پر جبر یہ کا بندہ سے اس کے افعال کی نسبت قطع کر کے اس کو مجازی نسبت قرار دینا اور براہ راست ان کو حق سبحانہ کی طرف منسوب کر دینا کھلی ہوئی غلطی ہے۔[1]

مسئلہ مذکورہ پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک اور بہت لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جبر وقدر کا مسئلہ سمجھنے کے لیے پہلے جبر کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ جبر کے ایک معنی تو اکراہ کے ہیں یعنی کسی کی رضامندی اور اختیار کے خلاف اس سے کام لینا۔ اس معنی سے اللہ تعالیٰ نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ جب وہ بندوں سے کسی عمل کرانے کا ارادہ فرماتا ہے تو پہلے ان کو اختیار بخش دیتا ہے پھر ان میں اس عمل کے کرنے کی رغبت یا اس سے نفرت پیدا فرما دیتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ کسی کام کو کرتے ہیں یا نہیں کرتے تو دونوں صورتوں میں اپنی خوشی اور اختیار ہی سے کرتے ہیں۔ یہ اس کی کمال قدرت ہے کہ وہ دوسروں کے اختیار و رغبت سے وہی کرا لیتا ہے جو اس کی مشیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اب وہ کسی پر اکراہ کرے تو کیونکر کرے۔ یہ اکراہ تو وہ شخص کرتا ہے جس کو

---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ افعال عباد کے من العباد ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں۔

انها قائمة به حاصلة بمشية و قدرته و هو المتصف بها فانه قد يقال لما اقصف به المحل و خرج هذا منه و ان لم يكن له اختيار كما يقال هذا الريح من هذا الموضع و هذه الثمرة من هذه الشجرة و هذا الزرع من هذا الارض فلان يقال لما صدر من حي باختياره هذا منه بالطريق الاولى. وهي من الله بمعنى انه خلقها قائمة بغيره و جعلها عملاً له و كسبًا و هو خلقها بمشيئة نفسه و قدرة نفسه بواسطة خلقه بمشيئة العبد و قدرته كما تخلق المسببات باسبابها فيخلق السحاب بالريح و للطر بالسحاب و النبات بالمطر. (و الخلاصه) ان الحوادث تضاف الى خالقها باعتبار و الى اسبابها باعتبار فهي من الله مخلوقة له في غيره وهي من العبد صفة قائمة به و ح فلا شركة بين العبد و بين الربّ كما انا قلنا هذا الولدمن المراء ة بمعنى انهاولدته و من الله بمعنى انه خلقه الخ. و اذا كان غير الله يعاقب عبده على ظلمه و ان كان مقرا بان الله خالق افعال العباذ و ليس ذلك ظلمًا منه فالله سبحانه ان لايكون ظلما منه محكون الرب خالق كل شيء لايمنع كون العبد هو الملوم على ظلمه كما ان غيره من المخلوقين يلومه على ظلمه و عدوانه مع اقراره بان الله خالق' افعال العباد. ص ۲۶ و ۲۷و۲۸ ج ۲ منهاج السنه.

4 دوسرے کومختار بنا کراس کی خوشی سے کام لینے کی قدرت حاصل نہ ہولیکن جس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو کہ وہ دوسرے کومختار اور فاعل بالارادہ بنا کراس میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا داعیہ فرما سکے تو اس کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ کسی سے زبردستی کام لے- بندہ کو چونکہ اتنی وسیع قدرت حاصل نہیں ہوتی اس لیے لازمی طور پر اس کو دوسروں کو مجبور کرنا پڑتا ہے اوراس طرح وہ اس کو مجبور کر کے اپنی منشاء کے موافق کام لے لیتا ہے- جبر کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ کسی میں اختیار کی صفت پیدا فرما کر پھر اس سے اپنی مرضی کے موافق کام لے لیتا ہے- اس لحاظ سے بے شک یہاں جبر موجود ہے اوراسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم جبار بھی ہے چنانچہ محمد بن کعب قرظی اس اسم کی تشریح میں فرماتے ہیں: "ھو الذی جبر العباد علی ما اراد" یعنی جبار اس کو کہتے ہیں جو اختیار عطا فرما کر اپنی مرضی کے مطابق کام لے- (دیکھو منہاج السنہ ص ۵۱ ج ۲)

حافظ ابن قیمؒ اس مضمون کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالجبر بھذا المعنی معناہ القھر و الغبہ و الغلبہ و انہ سبحانہ و تعالیٰ قادر علی ان یفعل لعبدہ ماشاء و اذا شاء منہ شیئًا و قع و لا بدوان لم یشاء لم یکن لیس کا لعاجز الذی یشاء مالا یکون و یکون مالا یشاء. (شفاء العلیل ص ۱۲۹)

یعنی جبر کے ایک معنی قہر وغلبہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایسا قاہر وغالب ہے کہ وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہے اگر وہ کسی کام کے کرانے کا ارادہ فرمائے تو وہ ہو کر رہتا ہے اور اگر ارادہ نہ فرمائے تو پھر وہ ہو نہیں سکتا اس عاجز شخص کی طرح نہیں کہ جو کسی بات کا ارادہ تو کرے اور پھر وہ ہو نہ سکے اور وہ ہوتا رہے جس کا اس نے ارادہ نہ کیا ہو-

حافظ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ میں اس مسئلہ کی طویل تقریر کر کے آخر میں لکھا ہے کہ یہی مسلک جمہور کا مسلک ہے اور یہ ہر قسم کی افراط وتفریط سے پاک ہے اس میں نہ تو قدریہ کی طرح بندوں کو اپنے افعال کا خالق تسلیم کیا گیا ہے نہ جبریہ کی طرح ان کو ایک پتھر کی طرح قدرت واختیار سے معریٰ مانا گیا ہے- اشعریؒ نے اگر چہ یہاں صفتِ قدرت کو تسلیم کر کے جبریہ سے ایک قدم آگے ضرور بڑھایا لیکن افعالِ عباد میں اس کو غیر مؤثر ٹھہرا کر پھر نا قابل فہم بنا دیا- حتیٰ کہ اب ہر نا قابل فہم بات کے لیے یہ مثل بن گئی ہے کہ "یہ بات تو اشعری کے کسب سے بھی زیادہ باریک ہے" یعنی نا قابل فہم ہے- لیکن تحقیق یہ ہے کہ شیخ اشعریؒ بھی تاثیر کے قائل تھے- جس کسی نے ان کی طرف محض نفی کی نسبت کر دی ہے اس نے نا تمام نظر کی ہے- حاشیہ اسماعیل کلنبوی ص ۲۵۰ میں ہے قال بعضھم ان التحقیق ان مذھبہ موافق لمذھب الماتریدیۃ.

تنبیہ: قضاء وقدر کا پہلا مقالہ حاشیۃ الجرجانی علی شرح العقائد للدوانی سے ماخوذ ہے- دیکھو ص ۲۵۷-

قضاء وقدر کے باب میں تغیراتِ حمل کی حدیث کے متعلق ایک اہم حاشیہ

داؤد انطا کی اپنی مشہور تصنیف "التذکرہ" میں حمل کے تغیرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اطباء کے نزدیک نطفہ میں اِس تقسم کے تغیرات ہوتے ہیں- پہلے ہفتہ میں وہ پانی کی شکل پر ہوتا ہے پھر اس کے باہر ایک جھلی بنتی ہے اور اندر منجمد نطفہ ہو جاتا ہے اور سولہ دن میں اس پر لمبے لمبے خطوط کی شکل نمودار ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ سرخ رنگ کا خون بن جاتا ہے اس کے بعد اس کی شکل گوشت کے لوتھڑے کی ہو جاتی ہے اور سب سے پہلے اس میں قلب کی شکل نمودار ہوتی ہے پھر دماغ کی- بتیس دن میں اس میں ہڈیوں کے نشانات قائم ہوتے ہیں اور حمل کے بچہ بننے کی یہ کم سے کم مدت ہے- پچھتر دن کے بعد وہ اپنی غذاء جذب کرنے لگتا ہے اور اس پر گوشت آنا شروع ہو جاتا ہے- اب وہ پہلے سے بالکل علیحدہ ایک جدید مخلوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں حرارتِ عزیزیہ پیدا ہو جاتی ہے اور اب اس میں طبعی نمو شروع ہو جاتا ہے (اسی کا نام روح طبّی ہے) اور سو دن کے بعد اس میں نباتات کی طرح نمو ہونے لگتا ہے اس کے بیس دن کے بعد وہ ایک سوتا ہوا حیوان معلوم ہونے لگتا ہے اور اب اس میں حقیقی روح پھونکی جاتی ہے- اس تقریر سے جو اختلاف نفخ روح کے بارے میں فلاسفہ اور اہل شرع کے مابین تھا وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک نفخ روح کی مدت ستر دن ہے اور اہل شرع کے نزدیک چار ماہ ظاہر ہے کہ فلاسفہ روحِ شرعی کو نہیں پہچانتے ان کے نزدیک روح طبّی ہی ایک روح ہے اسی کے ذریعہ سے انسان کا نشوونما ہوتا ہے اہل شرع کے نزدیک انسان کی حقیقت اس کا جسم نہیں بلکہ دراصل وہ روحِ انسانی ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت مرکوز ہوتی ہے وہ روح چار ماہ کے بعد پھونکی جاتی ہے اور جو روح طبّی ہے وہ مذکورۂ بالا تحقیق کے مطابق اہل اسلام کے نزدیک بھی پچھتر دن میں پیدا ہو جاتی ہے- اس لیے دونوں طبقوں کے درمیان روح طبّی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے- دیکھو حاشیہ ابن عابدین الشامی ص ۸ ۲۷ ص ۱- از باب النفاس"-

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الایمان بالقدر رُکنٌ مِن اِرکَانِ الاِسلام

(۸۸۵) عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمُرَ فِي مُسْلِمٍ قَالَ كَانَ اَوَّلُ مَنْ قَالَ فِي الْقَدْرِ بِالْبَصْرَةِ مَعْبَدُ الْجُهَنِيُّ فَانْطَلَقْتُ اَنَا وَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْحِمْيَرِيُّ حَاجَّيْنِ اَوْ مُعْتَمِرَيْنِ فَقُلْنَا لَوْ لَقِيْنَا اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا يَقُوْلُ هٰؤُلَاءِ فِي الْقَدْرِ فَوُفِّقَ لَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ دَاخِلًا الْمَسْجِدَ فَاكْتَنَفْتُهُ اَنَا وَ صَاحِبِيْ اَحَدُنَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَ الْاٰخَرُ عَنْ شِمَالِهٖ فَظَنَنْتُ اَنَّ صَاحِبِيْ سَيَكِلُ الْكَلَامَ اِلَيَّ فَقُلْتُ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اِنَّهٗ قَدْ ظَهَرَ لَنَا قِبَلَنَا اُنَاسٌ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ يَتَقَفَّرُوْنَ الْعِلْمَ وَ ذَكَرَ مِنْ شَاْنِهِمْ وَ اَنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ اَنْ لَا قَدَرَ وَ اَنَّ الْاَمْرَ اُنُفٌ قَالَ اِذَا لَقِيْتَ اُولٰئِكَ فَاَخْبِرْهُمْ اَنِّيْ بَرِئٌ مِّنْهُمْ وَ اَنَّهُمْ بُرَاءُ مِنِّيْ وَ الَّذِيْ يَحْلِفُ بِهٖ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ اَنَّ

قضاء وقدر پر ایمان لانا اسلام کا ایک رکن ہے

(۸۸۵) یحییٰ بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر میں جس نے سب سے پہلے کلام کیا وہ بصرہ میں ایک شخص معبد جہنی تھا - میں اور میرے ساتھ حمید بن عبدالرحمٰن حمیری حج یا عمرہ کرنے کی نیت سے نکلے تو ہم نے کہا کاش ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص مل جاتا تو ہم اس سے ان شبہات کے متعلق جو یہ لوگ تقدیر کے بارے میں نکالتے رہتے ہیں' کچھ باتیں دریافت کر لیتے - حسب الاتفاق ہمیں عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات نصیب ہوگئی اس وقت وہ اور میں مسجد میں داخل ہو رہے تھے بس میں اور میرا ساتھی ایک ان کی دائیں جانب سے اور دوسرا بائیں جانب سے ان کو لپٹ گئے - میں جانتا تھا کہ میرا رفیق سلسلہ گفتگو کا آغاز میرے ہی سپرد کرے گا اس بناء پر میں نے ہی عرض کی اے ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمر کی کنیت ہے) ہمارے اطراف میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم میں بہت کدو کاوش بھی کرتے ہیں - پھر ان کی مفصل روئداد بیان کی' ان کا عقیدہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اور دنیا کے واقعات کسی تقدیر کے بغیر یونہی چلتے رہتے ہیں - انہوں نے فرمایا جب ان سے تمہاری ملاقات ہو تو ان کو مطلع کر دینا کہ نہ میرا ان سے کوئی تعلق رہا نہ ان کا مجھ سے - اس ذات کی قسم جس کے نام کی قسم عبداللہ بن عمر کھاتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی

(۸۸۵) ✱ قدریہ کی تاریخ میں آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اس کی ابتداء کیونکر ہوئی' اور یہ کہ معبد جہنی بھی اس فتنہ کے بانیوں کی ابتدائی صف میں داخل تھا اور الامر انف کے معنی بھی معلوم کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ عبداللہ بن عمرؓ کے اس فرمان کا تعلق اس فرقہ کے ساتھ ہے جو علم الٰہی کا بھی منکر تھا - اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اس عقیدہ کو آخر اتنی اہمیت کیا ہے کہ اس کو دین کا ایک رکن قرار دے دیا گیا ہے - تو اس کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر بندہ کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ ہی قائم نہیں ہوسکتا وہ اگر اس کی خالقیت کا اقرار کر بھی لیتا ہے مگر آئندہ اس کی زندگی میں جب اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں دیکھتا بلکہ اپنی دنیا کے خود خالق ہونے کا گمان کر بیٹھتا ہے تو اس کو اس کے عالم کی خالقیت کے اعتقاد پر بھی پورے طور پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے' سوچو کہ جب ایک شخص اپنا اور اپنے افعال کی ساری دنیا کا تعلق خالق السمٰوٰت و الارضین کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتا تو بھلا اس کو اسلام ہی سے کیا تعلق ہوسکتا ہے - اب اگر وہ اُحد کے برابر بھی سونا خرچ کر ڈالے تو یہ صرف ایک کافر کا صدقہ ہوگا جس کا بارگاہ بے نیاز میں کوئی وزن نہیں ہے -

لِاَحَدِهِمْ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فَاَنْفَقَهٗ مَا قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ. (رواه مسلم فی کتاب الایمان و ابوداؤد و الامام احمدؒ فی کتاب السنه ص ۱۱۹)

کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اس کو خیرات کر ڈالے جب بھی وہ اس وقت تک اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کا ایمان تقدیر پر نہ ہو۔

(مسلم شریف)

(۸۸۶) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ وَ حَتّٰى يَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهٗ وَ اَنَّ مَا اَخْطَاءَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَهٗ. (رواه الترمذی و قال غریب وفیه عبدالله بن میمون منکر)

(۸۸۶) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک بندہ اس پر ایمان نہ لائے کہ برا، بھلا سب تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس کا یقین نہ کرے کہ جو خیر و شر اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ اس وقت تک اس کا ایمان کچھ نہیں۔

(ترمذی)

(۸۸۷) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ بِاَرْبَعٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِىْ بِالْحَقِّ وَ يُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَ يُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ. (رواه الترمذی و ابن ماجة. و اخرجه الحاکم فی المستدرك و قال علی شرط الشیخین و لم یتعقبه الذهبی)

(۸۸۷) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تک بندہ چار باتوں کی دل سے گواہی نہ دے مؤمن نہیں ہوتا۔ اس بات کی کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کہ مَیں کسی تردد کے بغیر اس کا رسول ہوں، اس نے سچا دین دے کر مجھ کو بھیجا ہے۔ اور مر کر قیامت میں پھر جینے کا یقین نہ کرے، اور جب تک کہ تقدیر کو نہ مانے۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

(۸۸۸) عَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيْقَةٌ وَمَا

(۸۸۸) ابودرداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہر چیز کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایمان کی بھی

---

(۸۸۷) * احادیث درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان گفتگوؤں کا ایک مجموعہ ہیں جو آپ اپنی مجلسوں میں وقتاً فوقتاً فرمایا کرتے تھے اس لیے ان کا اندازِ بیان کتابی شکل کا نہیں ہوتا، اس کی تفصیل جلد ثانی ہی میں ملاحظہ فرمایئے، اس لیے یہاں بھی ایمانیات کے صرف وہی چند اجزاء بیان کر دیئے گئے ہیں جو اس محفل میں کسی وقتی مناسبت سے زیادہ اہم سمجھے گئے تھے۔ ان امور کے علاوہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکۃ اللہ اور اس کی سب کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، مگر چونکہ یہ جملہ امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار میں آ جاتے ہیں اس لیے ان سب کی ہر جگہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ جس نے آپ کو رسول مان لیا ہے وہ ان سب باتوں کو بھی ضرور مانے گا جن کی آپؐ نے خبر دی ہے، ورنہ ان کا انکار آپ کی رسالت ہی کا انکار ہوگا۔

(۸۸۸) * انسان اس عالم میں مختار ہی مختار نظر آتا ہے اگر کہیں انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر اس پر عالم غیب کے جبر کی اطلاع ﷲ .....

بَلَغَ عَبْدٌ حَقِيْقَةَ الْاِيْمَانِ حَتّٰى يَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهٗ وَ مَا اَخْطَأَهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَهٗ.
(رواہ احمد و الطبرانی قال الھیثمی و رجالہ ثقات)

ایک حقیقت ہے۔ بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت نہیں پا سکتا جب تک اس کا یقین نہ رکھے کہ جو کچھ اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا' اور جو نہیں پہنچا یہ بھی ناممکن تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ (احمد' الطبرانی)

(۸۸۹) عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ لَمَّا قَدِمَ عَدِيُّ بْنُ حَاتِمٍ الْكُوْفَةَ اَتَيْنَاهُ فِيْ نَفَرٍ مِنْ فُقَهَاءِ اَهْلِ الْكُوْفَةِ فَقُلْنَا لَهٗ حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عَدِيُّ بْنُ حَاتِمٍ اَسْلِمْ تَسْلَمْ قُلْتُ وَ مَا الْاِسْلَامُ فَقَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ تُؤْمِنَ بِالْاَقْدَارِ كُلِّهَا خَيْرِهَا وَ شَرِّهَا حُلْوِهَا وَ مُرِّهَا. (رواہ ابن ماجۃ و فی الزوائد ھذا اسناد ضعیفٌ لاتفاقھم علی ضعف عبدالاعلی و لہ شاھد من حدیث جابر رواہ الترمذی)

(۸۸۹) امام شعبی روایت کرتے ہیں کہ عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کوفہ آئے تو ہم اہل کوفہ کے کچھ سمجھ دار لوگوں کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے ان سے گزارش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں آپ نے سنی ہیں وہ ہمیں بھی سنائیے۔ انہوں نے فرمایا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدی! اسلام قبول کرلو تو امن و چین سے رہو گے۔ میں نے عرض کی اسلام کیا چیز ہے؟ فرمایا یہ کہ اس بات کی دل سے گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ کی ذات (عزوجل) اور اس بات کی کہ میں کسی تردد کے بغیر اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اس پر بھی یقین کرو کہ برا بھلا اور تلخ و شیریں جو کچھ بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے وہ سب پہلے سے مقدر ہو چکا ہے۔
(ابن ماجہ)

(۸۹۰) عَنْ اَبِيْ حَفْصَةَ قَالَ قَالَ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ لِابْنِهٖ يَا بُنَيَّ اِنَّكَ لَنْ تَجِدَ طَعْمَ حَقِيْقَةِ الْاِيْمَانِ حَتّٰى تَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ

(۸۹۰) ابو حفصہ روایت فرماتے ہیں کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے فرزند سے کہا اے میرے عزیز فرزند تم کو اس وقت تک ایمان کی حقیقت کی لذت نہیں آ سکتی جب تک کہ تم اس کا یقین نہ کرو کہ جو خیر و شر تم

لـــہ ..... نہ دیں تو وہ مدت العمر اپنے اسی جہل میں مبتلا رہے۔ وہ نظر حقیقت میں اس کی مجبوری کو پیرایہ بہ پیرایہ سمجھاتے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ سمجھاتے ہیں کہ اگر اس کو اپنی اس مجبوری کا یقین نہیں تو وہ اس کا بھی یقین رکھے کہ ابھی اس کو ایمان کی حقیقت بھی حاصل نہیں۔ پس جب کہ حقیقت یہ ٹھہری کہ انسان مختار ہونے کے ساتھ مجبور بھی ہے تو پھر ان احادیث کی اہمیت بھی واضح ہوگئی مسئلہ کی تفصیل پہلے معلوم ہو چکی ہے۔
(۸۹۰) * پہلی حدیث میں اسی پختہ اعتقاد کو حقیقت ایمان سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اعتقاد جب پختہ ہو جاتا ہے تو پھر قلب سے گزر کر تمام جسم کو اس کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے اس لیے اعتقاد اب ذائقہ کی چیز بن جاتا ہے اسی کو اس حدیث میں اس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قضاء و قدر پر اس درجہ کا اعتقاد چونکہ ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں حدیثوں میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ مقام کامل مؤمن کا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ جان و دل سے اس مقام اعلیٰ پر پہنچنے کی کوشش کرے' تاکہ جو اب تک صرف مؤمن تھا وہ حقیقی مؤمن بن جائے اور جس کا ایمان آج تک صرف ایک علمی حیثیت رکھتا تھا اب وہ وجدانی اور وجدانی سے حسی بن جائے۔ یہی وہ احسان کا مرتبہ ہے جس کا تذکرہ آپ حدیث جبرئیل میں پھر ترجمان السنہ جلد اول و ثانی میں موقعہ بموقعہ دیکھتے چلے آئے ہیں۔

يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَ مَا اَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْقَلَمُ وَ قَالَ لَهُ اُكْتُبْ فَقَالَ رَبِّ وَ مَاذَا اَكْتُبُ قَالَ اُكْتُبْ مَقَادِيْرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ يَابُنَيَّ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ مَاتَ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا فَلَيْسَ مِنِّي. (رواه ابو داؤد)

کو پہنچ گیا وہ کبھی خطا نہیں کر سکتا تھا اور جو نہیں پہنچا اس کا پہنچنا ممکن نہ تھا' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جو شئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے بنائی وہ قلم ہے پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کی پروردگار کیا لکھوں۔ ارشاد ہوا قیامت تک جس چیز کے لیے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ۔ اے میرے فرزند عزیز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کے سوا کسی دوسرے عقیدہ پر مرے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔

(ابوداؤد)

التشديد فيمن انكر القدر

منکرین تقدیر کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید کلمات

(۸۹۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَ اِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ.

(۸۹۱) ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تقدیر کا انکار کرنے والے اس امت کے مجوسی ہیں' اگر بیمار ہوں تو ان کی عیادت بھی نہ کرنا اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہونا۔

(احمد' ابوداؤد' ابن ماجه)

(رواه احمد و ابوداؤد روى الطبراني في الاوسط عن انس الوعيد في القدرية و المرجئة كليها قال الهيثمي و رجاله رجال الصحيح غير هارون بن موسىٰ الفروى و هو ثقة و ماردى عن ابن عمر فيه زكريا بن منظور و ثقه احمد بن صالح وغيره و ضعفه جماعة قال السندى و قد جاء اصل هذا المتن من حديث ابن عمر ايضًا عند ابى داؤد و قد اخرجه الترمذى و حسنه و قد صححه الحاكم و قال على شرط الشيخين ان صح سماع ابى حازم عن ابن عمر و حقق الحافظ ابن حجرانه صحيح على شرط مسلم فى الاكتفاء بالمعاصرة فلاوجه للحكم بوضعه كما قيل (وفى النسخه بوصفه و هو غلط) يقول العبد الضعيف و قد اخرجه السيوطى فى الدر المنثور بلفظ المكذبون بالقدر مجر موهذه الامة و فيهم انزلت هذه الآية ان المجرمين فى ضلال و سعر الى قوله انا كل شىء خلقنه بقدر ج ٦ ص ١٣٨)

---

(۸۹۱) * حدیث مذکور میں عیادت اور جنازہ کی شرکت کے متعلق خاص طور پر ممانعت فرمانے کا نکتہ یہ ہے کہ یہ ان حقوق میں سے ہیں جو عام مسلمانوں کے لیے بھی واجب ہیں۔ پس جب منکرین قدر کے لیے یہ عام حقوق بھی واجب نہ رہے تو سوچو ان کا شمار کیا مسلمانوں کے زمرہ میں ہوگا۔ قدریہ چونکہ تقدیر کے منکر ہیں اور بندوں کے افعال کا خالق خود ان کو قرار دیتے ہیں اس لیے وہ بھی گویا خالق میں تقسیم کے قائل ہو گئے جس طرح کہ مجوس قائل ہیں' یہ خیر وشر کے خالق کو جدا جدا مانتے ہیں اور منکرین قدر بندوں کے افعال کے خالق جدا جدا مانتے ہیں اس لحاظ سے اس امت کے مجوس یہ ہوئے۔ بلکہ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کہ مجوس تو صرف دو خالق کے قائل ہیں اور یہ بے شمار خالقوں کے قائل ہو گئے۔ نعوذ بالله منه.

(۸۹۲) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ اِبْنَ عُمَرَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْکَ السَّلَامَ فَقَالَ اِنَّهُ بَلَغَنِیْ اَنَّهُ قَدْ اَحْدَثَ فَاِنْ کَانَ قَدْ اَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّی السَّلَامَ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ يَکُوْنُ فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوْ فِیْ اُمَّتِیْ اَلشَّکُّ مِنْهُ خَسْفٌ اَوْ مَسْخٌ اَوْ قَذْفٌ فِیْ اَهْلِ الْقَدَرِ. (رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح غريب و رواه احمد قال الهيثمی و رجاله رجال الصحيح)

(۸۹۲) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے- فرمایا میں نے سنا ہے اس نے تقدیر کے متعلق کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہے- اگر اس نے کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہو تو میری جانب سے اس کو سلام مت کہنا' کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ اس امت میں یا میری امت میں (یہ شک راوی کی جانب سے ہے) جو لوگ تقدیر کا انکار کریں گے ان پر عذاب نازل ہوگا زمین میں دھنسا کر یا اس کی شکل بدل کر یا اُوپر سے پتھر برسا کر-

(ترمذی' مسند احمد)

(۸۹۳) عَنْ نَافِعٍ قَالَ کَانَ لِابْنِ عُمَرَ صَدِيْقٌ مِنْ اَهْلِ الشَّامِ يُکَاتِبُهُ فَکَتَبَ اِلَيْهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَنَّهُ بَلَغَنِیْ اَنَّکَ تَکَلَّمْتَ فِیْ شَیْءٍ مِنَ الْقَدَرِ فَاِيَّاکَ اَنْ تَکْتُبَ اِلَیَّ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَنَّهُ سَيَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ يُکَذِّبُوْنَ بِالْقَدَرِ. (رواه الحاکم و قال صحيح علی شرط مسلم و اقره الذهبی)

(۸۹۳) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک شامی دوست تھا' ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اُس کو اس مضمون کا ایک خط لکھا: مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے تقدیر کے بارے میں کچھ بات چیت شروع کی ہے' لہٰذا آئندہ سے ہرگز مجھ سے خط و کتابت نہ رکھنا' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہے کہ اس امت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو تقدیر کی تکذیب کریں گے-

(مستدرک)

(۸۹۴) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ثَلَاثَةٌ اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِی الْاِسْتِسْقَاءُ بِالْاَنْوَاءِ وَ حَيْفُ السُّلْطَانِ وَ تَکْذِيْبٌ بِالْقَدَرِ. (رواه احمد)

(۸۹۴) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں- میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ مجھے اپنی امت کے متعلق تین باتوں کا اندیشہ ہے- نچھتروں سے بارش طلب کرنا' بادشاہ کا ظلم کرنا اور تقدیر کا انکار کرنا- (احمد)

---

(۸۹۳) * اس حدیث میں اس سے پہلی حدیث سے کچھ زیادہ تفصیل تھی اس لیے اس کو دوبارہ درج کیا گیا ہے- جو لوگ اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائیں ان کے ساتھ مذاقِ سلف کیا تھا! اس حدیث سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے- جہاں معمولی باتوں پر سخت گیری اسلامی معاشرت سے ناواقفی کی دلیل ہے وہاں اہم امور میں تساہل بھی اسلامی تعلیمات سے جہالت کا ثمرہ ہے-

(۸۹۴) * حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کا تخم کلیۃً ایسا فنا نہیں ہوگا کہ ان کا انفرادی طور پر بھی کہیں وجود باقی نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی خطہ میں کسی نہ کسی درجہ تک یہ اعتقاد باقی رہے چلا جائے گا- آپ کا فرمودہ صبح صادق کی طرح پورا ہو رہا ہے- آج بھی لوگ گو اپنے منہ سے تقدیر کا اقرار کرتے ہیں مگر کیا اپنے باطن میں بھی اس پر صحیح اعتقاد رکھتے ہیں- بادشاہوں کے ظلم کا افسانہ تو کب کا کہنہ ہو چکا' بارش کا معاملہ بھی ظاہر ہے-

(۸۹۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُجَالِسُوْا اَهْلَ الْقَدَرِ وَ لَا تُفَاتِحُوْهُمْ. (رواه ابوداؤد. و اخرجه الحاكم و لم يتكلم عليه الذهبي)

(۸۹۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا منکرین تقدیر کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو اور نہ اُن کے ساتھ سلام میں پیش قدمی کرو- (ابوداؤد) یعنی متعدی بیماری اگر ہے تو یہ ہے اس لیے اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ان کی صحبت سے بھی بچا جائے-

(۸۹۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ كُلُّ نَبِيٍّ مُجَابٌ، الزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَ الْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَ الْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ فَيُعِزُّ بِذٰلِكَ مَنْ اَذَلَّهُ اللّٰهُ وَ يُذِلُّ مَنْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَ الْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَ التَّارِكُ لِسُنَّتِيْ. (اخرجه الترمذي و حاكم عن عليؓ و اخرج نحوه الطبراني في الاوسط قال الهيثمي رجاله ثقات و قد صححه ابن حابن. و ماروی عن واثلةؓ وجابرؓ و ابی سعیدؓ صنفان من هذه الامة الحديث فكلها صعافٌ)

(۸۹۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں بھی لعنت کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ بھی لعنت فرماتا ہے (اور تم جانتے ہو) کہ ہر نبی کی دعاء مقبول ہی ہوتی ہے (لہٰذا میری لعنت معمولی بات نہیں) (۱) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی کرنے والا (۲) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا منکر (۳) ظلم و تعدی کر کے بادشاہ بن بیٹھنے والا- جس کی حرکات ناشائستہ یہ ہوں کہ خدا کے نزدیک قابل عزت بندوں کو ذلیل کر ڈالے اور جو قابل ذلت ہوں ان کو عزت دے (۴) خدا تعالیٰ کے حرم میں جو باتیں ناروا ہوں ان کو حلال کر دینے والا (۵) میری اولاد کا احترام نہ رکھنے والا (۶) میرا طریقہ چھوڑ بیٹھنے والا-

كتابة القدر

قضاء وقدر لکھی جا چکی ہے

(۸۹۷) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ قَالَ مَا اَكْتُبُ

(۸۹۷) عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا وہ قلم ہے- پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ- اس نے عرض کیا کیا لکھوں؟ حکم ہوا

---

(۸۹۶) * حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعتقادی یا عملی پہلوؤں میں جب کبھی اسلام کے مرکزی نقطہ سے کوئی ادنیٰ سا ٹکراؤ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی نظروں میں قابل برداشت نہیں سمجھا جاتا اور اسی مقام پر اس قسم کی تعبیرات آ جاتی ہیں- مذکورۂ بالا جتنی باتیں ہیں ان سب ہی میں یہ ٹکر موجود ہے-

(۸۹۷) * یہاں اس بحث میں پڑنا کہ سب سے اوّل قلم ہی کو پیدا کیا گیا ہے یا اس سے پہلے کچھ اور بھی- اسی طرح اس قلم کی تصویر کشی کے درپے ہونا یہ سب امور زیر بحث آ تو چکے ہیں مگر ہمارے نزدیک ہیں غیر ضروری مشغلہ- ہاں اگر کسی کو عالم کا بقیہ......

الْقَدَرِ فَکَتَبَ مَا کَانَ وَ مَا هُوَ کَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ. جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ تو اس نے قیامت تک جو ماضی و مستقبل میں
(رواہ الترمذی و قال هذا حدیث غریب اسنادا) شدنی تھا سب لکھ دیا-(ترمذی)

لله ..... جغرافیہ لکھنا ہو تو اس کے لیے بے شک ضروری ہوں گے-ہمیں تو یہاں صرف اتنی بات بتانی ہے کہ حق تعالیٰ نے جب عالم کو بتدریج بنایا تھا اور اس میں اسباب ومسببات کا سلسلہ بھی قائم فرمایا تھا تو اس کی بنیاد سے لے کر آخر تک جملہ امور بھی اسی مناسبت سے پیدا فرمائے تھے- یہاں قلم اور اس کی کتابت وغیرہ کو بھی اسی کی مناسبت سے سمجھنا چاہیے' ورنہ جس کی شان کن فیکون ہو وہ کسی شئے کا محتاج نہیں ہے- علاوہ ازیں کتابتِ تقدیر میں کچھ مختلف فوائد بھی ہیں:

(۱) تقدیر اس بات کی دلیل ہے، کہ حق تعالیٰ کو جمیع مخلوقات کا علم پہلے سے حاصل تھا- کیونکہ یہ بدیہی ہے کہ جب تک کسی کو پہلے سے علم حاصل نہ ہو' وہ کسی مخلوق کو کسی حکیمانہ نظام کے ساتھ پیدا نہیں کر سکتا- تعجب ہے کہ بعض غالی معتزلہ نے بندوں کے افعال پر حق تعالیٰ کے علم ازلی کا بھی انکار کر دیا ہے-

(۲) تقدیر میں چونکہ ہر چیز کا پورا پورا اندازہ اور اس کی مخصوص مقدار و شکل بھی لکھی ہوئی موجود ہے اس لیے یہ اس کے علم کی اور واضح دلیل ہے گویا خلق اور پیدا کرنے کے لیے جہاں پہلے سے اس شئے کا علم ضروری ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا صحیح صحیح اندازہ اور اس کی پوری پوری شکل کا بھی علم ہو تا کہ اسی کے مناسب اس کو پیدا کیا جا سکے ارشاد ہے:

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا. (طلاق:۳) اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کا اپنے علم میں ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے-
خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا. (فرقان:۲) یعنی ہر چیز کو اس نے پیدا فرمایا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا-

(۳) تقدیری حالات چونکہ مخلوقات کے وجود سے بھی پیشتر مفصلاً لکھ کر رکھ دیئے گئے ہیں' جن کا بقدرِ ضرورت انکشاف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کے وقوع سے قبل بھی ہوتا رہتا ہے تو یہ اس بات کا اور بدیہی ثبوت ہوگا کہ جب ان امور کا علم بندوں کو ممکن ہے تو پھر خالق کو بھلا کیونکر نہ ہوگا-

(۴) تقدیر کی کتابت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے پیدا ہوا ہے- اس طرح نہیں جیسا کہ آفتاب سے دھوپ کا صدور اضطراراً ہوتا ہے-

(۵) چونکہ تقدیر عالم کے وجود سے قبل لکھی گئی اس لیے جہاں ایک طرف یہ حق تعالیٰ کے اختیار و مشیت کی دلیل ہے اسی طرح تمام مخلوق کے حدوث کی بھی دلیل ہے- حدوث کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام کی تمام مخلوق کسی زمانہ میں معدوم تھی' پھر مشیتِ الٰہیہ اور اس کی قدرت سے پیدا ہوئی ہے' یوں نہیں ہے کہ ہمیشہ سے اسی طرح بنی بنائی موجود تھی- (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۲۰۵ و ۲۰۶)

علامہ سید رشید رضا مرحوم تفسیر المنار میں فرماتے ہیں کہ جب صانع عالم نے عالم کو پیدا فرمایا اور اس طرح پیدا فرمایا کہ اس کے ساتھ عرش و کرسی بھی پیدا فرمائے' اس کے نظام قائم رکھنے کے لیے ابر و باد بھی بنائے اور باطنی نظام چلانے کے لیے ملائکۃ اللہ بھی مقرر فرمائے تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کا نظام بھی مقرر فرما کر لکھ دیا جاتا- بس یہی قضاء و قدر اور اس کی کتابت کی حکمت ہے- (دیکھو تفسیر مذکور- ص ۲۷۷ ج ۷)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ حسین بن الفضل سے پوچھا کہ جب سب کچھ طے ہو کر لکھا بھی جا چکا ہے تو کہیے پھر ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ (الرحمٰن:۲۹) کا کیا مطلب ہوگا- انہوں نے جواب دیا کہ هي شئون يبديها لا شئون يبتديها. (فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۹۶) لله ...

(۸۹۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَ قَوْمٌ مِنْ بَنِیْ تَمِيْمٍ فَقَالَ اقْبَلُوا الْبُشْرٰی يَا بَنِیْ تَمِيْمٍ قَالُوْا بَشَّرْتَنَا فَاَعْطِنَا فَجَاءَ نَاسٌ مِنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اِقْبَلُوا الْبُشْرٰی يَا اَهْلَ الْيَمَنِ اِذْلَمْ يَقْبَلْهَا بَنُوْ تَمِيْمٍ قَالُوْا قَبِلْنَا جِئْنَاكَ لِنَتَفَقَّهَ فِی الدِّيْنِ وَ لِنَسْأَلَكَ عَنْ اَوَّلِ هٰذَا الْاَمْرِ مَا كَانَ قَالَ كَانَ اللّٰهُ وَ لَمْ يَكُنْ شَیْءٌ قَبْلَهٗ وَ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ كَتَبَ فِی الذِّكْرِ كُلَّ شَیْءٍ ثُمَّ اَتَانِیْ رَجُلٌ فَقَالَ يَا عِمْرَانُ اَدْرِكْ نَاقَتَكَ فَقَدْ ذَهَبَتْ فَانْطَلَقْتُ اَطْلُبُهَا فَاِذَا السَّرَابُ يَنْقَطِعُ دُوْنَهَا وَ اَيْمُ اللّٰهِ لَوَدِدْتُ اَنَّهَا قَدْذَهَبَتْ وَ لَمْ اَقُمْ.

(رواہ الشیخان)

(۸۹۸) عمران بن حصین بیان فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا کہ بنی تمیم قبیلہ کے کچھ لوگ آ گئے آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا اے بنی تمیم کے لوگو! لو بشارت قبول کرو انہوں نے عرض کیا اچھا آپ بشارت دیتے ہیں تو اب دیجئے کیا دیتے ہیں؟ اس کے بعد کچھ لوگ یمن والے آ گئے آپ نے ان سے بھی یہی فرمایا اے یمن والو! بنو تمیم نے تو اس بشارت کو قبول نہ کیا لو تم قبول کر لو وہ بولے یا رسول اللہ ہم نے بسر و چشم قبول کیا، ہم تو دین سیکھنے کے لیے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور یہ بات بھی دریافت کرنی ہے کہ اس عالم کی ابتداء کیسے ہوئی تھی؟ آپ نے فرمایا بس اللہ تعالیٰ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا، اس کے بعد اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور لوحِ محفوظ میں ہر چیز لکھ کر ثبت فرما دی ہے اتنے میں میرے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا عمران اپنی ناقہ کو پکڑو وہ تو بھاگ گئی- میں اس کو تلاش کرنے کے لیے نکلا تو وہ اتنی دور جا چکی تھی کہ ریت کی چمک بھی نظر نہ آ سکے- (حالانکہ وہ بہت دور سے چمکتا رہتا ہے یعنی بہت دور جا چکی تھی) اور خدا کی قسم مجھے یہ پسند تھا کہ وہ چلی جاتی اور میں اپنی جگہ سے نہ اٹھتا-

(متفق علیہ)

ﷺ..... یعنی اپنی ان نئی نئی شانوں کا وہ ہر دن اظہار فرمایا کرتا ہے اگرچہ طے پہلے کر چکا تھا، یہ نہیں کہ ان کی ابتداء ہی اب کرتا ہے- یہ جواب سن کر عبداللہ بن طاہر امیر خراسان اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا-

(۸۹۸) * یہاں آپ کو بنی تمیم کی یہ ادا پسند نہ آئی کہ انسان اتنا گر جائے کہ اس کی نظر میں خوش خبری کا محور بس دنیوی منفعت کے سواء اور کچھ باقی ہی نہ رہے- آپ نے سکوت فرمایا اور یہ ناگواری کا سکوت تھا، اس پر بھی ان کو کچھ متنبہ نہ ہوا اور طبائع جب گرنے لگتی ہیں تو یہ قاعدہ ہے کہ ان کا احساس بھی گرنے لگتا ہے- اتنے میں یمن کے کچھ عالی ہمت لوگ آ نکلے وہ اس بشارت کو لپک لے گئے اور ان کے سوال کے جواب میں یہ بات بھی ذکر میں آ گئی کہ عالم کی تقدیر لکھی جا چکی ہے- یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالم غیب چونکہ ہم سے غائب ہی ہے اس لیے اگر وہ ہمارے سامنے بیان میں آتا بھی ہے اس وقت بھی بسا اوقات اس کے گوشوں میں ابہام ہی رہتا ہے گویا ذکور ہو جانے کے بعد بھی وہ مشہود کے درجہ میں نہیں آتا اس کے علاوہ بعض حالتوں میں ابہام فی نفسہٖ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے- انعام و اکرام کے مواقع پر دنیا کا بھی یہی دستور ہے، یہاں بھی بشارت منظور تو ہوئی تھی مگر وہ کس کے نصیب میں ہے، یہ گوشہ مبہم چھوڑ دیا گیا تھا حتیٰ کہ جب بانصیب جماعت آ گئی تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے نصیب کی تھی- ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی ایک جماعت کو عالم خواب میں ایک خاص انداز کی فضیلت میں دیکھا- جب آپ نے اس خواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص عکاشہ بن محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہ محفل مبارک میں ﷺ..

متٰی کُتبَ القدرُ

قضاء وقدر کی کتابت عالم کی پیدائش سے کتنی قبل ہوئی؟

(۸۹۹) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اللّٰہُ مَقَادِیْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِخَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ قَالَ وَ کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ (رواہ مسلم)

(۸۹۹) عبداللہ بن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کے لیے جو بھی مقدر فرما دیا تھا وہ سب قیدِ کتابت میں لا کر محفوظ کر دیا ہے اور اس سے پیشتر اس کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم شریف)

(۹۰۰) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وَ کَّلَ اللّٰہُ بِالرَّحِمِ مَلَکًا

(۹۰۰) انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر فرما

للہ ...... حاضر تھے بے ساختہ بول اٹھے یا رسول اللہ دعاء فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس جماعت میں بنا دے۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم ان میں سے ہو گئے۔ اس پر پھر دوسرے صاحب اٹھے اور انہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا "سبقک بھا عکاشہ" وہ تو عکاشہ لے اڑے یعنی اس وقت کسی مبہم کے حق میں اس جماعت میں ہونا طے پایا تھا وہ عکاشہ کے نصیب سے ان کو مل گیا اب تیسرے اور چوتھے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں ایک طرف تقدیر لکھی جا چکی تھی وہاں اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کی قبولیت بھی اہل یمن کے حصہ میں لکھی جا چکی تھی۔

(۸۹۹) * حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تقدیر کے پانچ مراتب تحریر فرمائے ہیں سب سے پہلا مرتبہ ارادۂ ازلیہ ہے جو تمام کائنات کا اصل مبدأ و منشاء ہے اس کے بعد دوسرا نمبر یہ کتابت ہے جس کا یہاں ذکر ہے تیسرا نمبر وہ ہے جب کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمالیا اور ارادہ کیا کہ نوع انسانی کی ان سے بنیاد قائم ہو تو ان کی تمام اولاد کو ان سے نکالا اور ان میں مطیع و عاصی اور مؤمن و کافر کی تقسیم فرمائی چوتھا نمبر وہ کتابت ہے جو رحم مادر میں ہوتی ہے۔ اس کا تذکرہ آئندہ حدیثوں میں آرہا ہے پانچویں نمبر کی تفصیل یہاں عوام بلکہ اکثر خواص کے ذہن سے بھی بالاتر ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا گیا۔ دیکھو حجۃ اللہ۔ ص ۶۵ و ۶۶۔ عرش اور پانی کے درمیان میں جب تک آسمان و زمین کا وجود ہی نہ تھا اس وقت تک یہی کہا جائے گا کہ نیچے پانی اور اوپر عرش پھر جب درمیان میں آسمان و زمین آگئے تو اب تعبیر یہ ہو گی کہ عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔ درحقیقت عرش جہاں پہلے تھا اب بھی وہیں ہے یہ تغیرات سب تحتانی ہوئے ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ نے تقدیری مراتب کو ایک دوسرے پیرایہ میں لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک تو وہ مرتبہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا دوسرا وہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد لکھا گیا ہے مگر ذریت ابن آدم کی پیدائش سے قبل۔ اس کا پتہ حدیث میثاق سے چلتا ہے۔ تیسرا مرتبہ وہ ہے جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے اور چوتھا مرتبہ حولی ہے یعنی وہ سالانہ لکھا جاتا ہے یعنی شب قدر میں اور پانچواں یومی یعنی جو روزمرہ لکھا جاتا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ۔حق تعالیٰ کی شان ہر دن نرالی ہے کسی کو پست کرتا ہے اور کسی کو بلند۔ ان میں سے ہر مرتبہ پہلے مرتبہ کی صرف ایک تفصیل ہی ہوتی ہے۔ شفاء العلیل ص ۲۳ و ۲۴۔ اس کی مثال اس عالم میں بھی ہے یہاں بھی سالانہ بجٹ کی منظوری کے بعد پھر تحتانی دفاتر میں علیحدہ علیحدہ منظوریاں بھی ہوتی ہیں مگر یہ سب بجٹ میں داخل ہوتی ہیں۔

(۹۰۰) * واضح رہے کہ اس حدیث کی اصل غرض اطوار جنین کی پوری تفصیلات بیان کرنی نہیں ہیں یہ موضوع علم تشریح کا ہے للہ .....

فَيَقُوْلُ اَیْ رَبِّ نُطْفَةٌ اَیْ رَبِّ عَلَقَةٌ اَیْ رَبِّ مُضْغَةٌ فَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَقْضِيَ خَلْقَهَا قَالَ اَیْ رَبِّ أَذَكَرٌ اَمْ اُنْثٰى أَشَقِيٌّ اَمْ سَعِيْدٌ فَمَا الرِّزْقُ فَمَا الْاَجَلُ فَيُكْتَبُ كَذٰلِكَ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ.

(رواه البخاری)

رکھا ہے' وہ یہ عرض کرتا رہتا ہے پروردگار ابھی تک یہ نطفہ ہے' پروردگار اب یہ خون بستہ کی شکل ہو گیا - پروردگار اب یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا - اب اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ اس کو پیدا فرما دے تو وہ عرض کرتا ہے پروردگار اس کے متعلق کیا لکھوں مرد ہو گا یا عورت' بد بخت ہو گا یا نیک بخت پھر اس کا رزق فراخ ہو گا یا تنگ اور عمر کتنی ہو گی؟ تو اس طرح یہ ساری باتیں ماں کے پیٹ کے اندر ہی اندر لکھ دی جاتی ہیں - (بخاری شریف)

التحذير عن التنازع فى القدر

قضاء وقدر میں بحث ومباحثہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے

(۹۰۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ نَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی

(۹۰۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے اس وقت ہم تقدیر کے مسئلہ میں

ﷺ ...... یہاں اطوار جنین یعنی حمل کے تغیرات اور بچہ کی تدریجی ترقیات کا تذکرہ صرف مسئلہ تقدیر کے لیے ایک تمہید کے طور پر آ گیا ہے تاکہ تقدیر کی کتابت کی نشان دہی ہو سکے - اس لیے اس کو پورے طور پر علم تشریح کے ساتھ منطبق کرنا قطعاً غیر ضروری ہے - نطفہ اور علقہ اور مضغہ کی تینوں حالتیں بلاشبہ ہر جنین کے لیے ضروری ہیں' اب ان کی درمیانی ترقیات کیا کیا ہوتی ہیں نہ ان کا یہاں ذکر ہے اور نہ چالیس دن کی مدت جیسا کہ آئندہ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں آ رہی ہے' وہ پوری تحدید ہے - صحیح مسلم میں اس روایت کے الفاظ میں راویوں کی جانب سے کچھ اور اختلاف بھی ملتا ہے - ادھر اطباء نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی ان کی آراء کے اختلاف کے سوا خود جنین کے اختلاف سے بھی مختلف حالتیں ہو جاتی ہیں - حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب تک نطفہ میں مکمل تغیر نہیں ہوتا اس کو یہاں نطفہ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے - پھر جب اس میں معمولی سا انجماد ہو جاتا ہے اس کو علقہ سے ادا کیا گیا ہے' جب اس سے زیادہ انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو مضغہ کہا گیا ہے' خواہ اس میں ہڈیاں بھی نمایاں ہو چکی ہوں پھر جس طرح کہ دنیا میں گٹھلی لگا کر باغبان جانتا ہے کہ کتنے کتنے دنوں میں اس میں کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں پھر زمین اور پانی کی موافقت کے لحاظ سے کہاں کہاں درخت عمدہ اور کہاں کہاں خراب پیدا ہوتا ہے اسی طریقہ پر وہ فرشتے جو رحم مادر پر موکل ومقرر ہیں حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے احوال کو جانتے پہچانتے ہیں -

(۹۰۱) * انسانی عاقبت نا اندیشی کی بھی انتہاء ہے کہ جس مسئلہ میں گفتگو کرنے کی عاقبت معلوم ہو چکی ہو اس میں بھی ممانعت کے باوجود وہ الجھنے سے باز نہیں آتا - یہاں ممانعت اس لیے نہیں کہ درحقیقت یہاں کچھ پانی مرتا ہے بلکہ دریا میں جہاں پانی زیادہ گہرا اور خطرناک ہوتا ہے وہاں ہر شفیق' ناآموزوں کو تیراکی سے روکا ہی کرتا ہے ۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تافتن ۔۔۔ کہ جاہا سپر باید انداختن

انسانی تفتیش کی اس طبعی حرص کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار غضب نمایاں ہوں اور بس یہ دیکھتے ہی مخاطبین کے قلوب اس بحث سے ایسے متنفر ہو جائیں کہ دلوں میں کبھی اس کا خطرہ بھی نہ گذر سکے - سبحان اللہ یہ غصہ بھی کیسی شان رحمت لیے ہوئے تھا -

الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰی احْمَرَّ وَجْهُهٗ حَتّٰی كَاَنَّمَا فُقِیَٔ فِیْ وَجْنَتَیْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَیْكُمْ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِیْنَ تَنَازَعُوْا فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ عَزَمْتُ عَلَیْكُمْ اَلَّا تَنَازَعُوْا فِیْهِ. (رواہ الترمذی و قال ھذا حدیث غریب' و اخرجه ابن ماجه باسناد عمرو بن شعیب عن جده و صححه فی الزوائد قال السندی و هو مبنی علی عدم الاعتبار بالتکلم فی روایة عمرو بن شعیب)

بحث کر رہے تھے- اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مارے غصہ کے سرخ ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں میں انار کا عرق نچوڑ دیا گیا ہے- فرمایا کیا تم کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے یا میں اسی بات کے لیے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خوب یاد رکھو تم سے پہلی امتوں نے جب اس بارے میں جھگڑے نکالے تو وہ برباد کر دی گئیں اس لیے میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم ہرگز اس بارے میں بحث و تمحیص نہ کرنا-

(ترمذی شریف)

التکلم فی القدر

قضاء وقدر میں گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے

(۹۰۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَكَلَّمَ فِیْ شَیْءٍ مِنَ الْقَدَرِ سُئِلَ عَنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَ مَنْ لَمْ یَتَكَلَّمْ فِیْهِ لَمْ یُسْئَلْ عَنْهُ.

(۹۰۲) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ جس شخص نے تقدیر کے مسئلہ میں ذرا بھی زبان ہلائی قیامت میں اِس کی اُس سے باز پرس کی جائے گی اور جس نے کوئی گفتگو نہیں کی اس سے کوئی باز پرس بھی نہ ہوگی- (ابن ماجہ)

(رواہ ابن ماجه قال الهیثمی اسناده ضعیف لاتفاقهم علی ضعف یحیی بن عثمان قال فیه ابن معین و البخاری و ابن حبان منکر الحدیث زاد ابن حبان لا یجوز الاحتجاج به و یحیی بن عبدالله بن ابی ملیکة قال ابن فی الثقات یعتبر بحدیثه اذا روی عنه غیر یحیی بن عثمان)

(۹۰۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُخِّرَ الْكَلَامُ فِی الْقَدَرِ لِشِرَارِ اُمَّتِیْ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ. (رواہ الطبرانی و الحاکم)

(۹۰۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ تقدیر کے بارے میں جھگڑے کرنا میری امت کے بدترین افراد کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے' یہ قیامت کے قرب میں ہوں گے- (طبرانی- حاکم)

---

(۹۰۲) * قضاء وقدر کا مسئلہ ایسا دقیق مسئلہ ہے کہ اس میں جھگڑا تو درکنار گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہوتا' کیونکہ ایسے باریک مسائل میں جہاں گفتگو کی وہیں کوئی نہ کوئی پہلو بحث وجدل کا نکلا اور جہاں بحث وجدل کا پہلو نکلا بس انکارِ قدر کے امکانات پیدا ہوئے جس گفتگو کی انتہاء یہ ہو شریعت اس کی ابتداء سے بھی روکتی ہے' لیکن اگر ہزار ممانعت کے باوجود گفتگو شروع ہو ہی جائے اور انفرادی انکار سے نکل کر معاملہ کی نوعیت اجتماعی بننے لگے تو اب اثباتِ قدر کے لیے گفتگو کرنا شاید مذموم گفتگو نہ رہے گی' لیکن یہ اجازت ایک دوسرے پہلو سے پیدا ہوگی- خطرہ کی بات بہرحال خطرہ ہی کی ہے- امارت اور قضاء کے بڑے فضائل ہیں اگر ان کے حقوق کی ادائیگی کی جائے مگر ہیں پھر دونوں مناصب خطرہ ہی کے- اس لیے سلف تا امکان ان سے بچا ہی کرتے تھے- حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کی بات کرتے ہی کیوں ہو کہ جواب دہی کی نوبت آئے-

(٩٠٤) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ اَمْرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ مُوَاتِيًا اَوْ قَالَ مُقَارِبًا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوْا فِى الْوِلْدَانِ وَ الْقَدَرِ. (قال الحاكم على شرط الشيخين و اقره الذهبى)

(٩٠٤) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - میری امت کے معاملات درست رہیں گے جب تک کہ وہ دو مسئلوں میں گفتگو نہ کریں - ایک وفات شدہ بچوں کی نجات و عدم نجات کے متعلق دوم تقدیر کے معاملہ میں -

(مستدرک)

يجب الرضاء بالقضاء و هو علامةٌ لسعادة الانسان

قضاء وقدر کے فیصلہ پر رضامندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے

(٩٠٥) عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهُ اِسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ. (رواه الترمذى قال هذا حديث غريب)

(٩٠٥) سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کے فیصلہ پر راضی ہو جانا آدمی کی سعادت کی دلیل ہے اور اس کی بدبختی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیکی کی توفیق مانگنا چھوڑ دے' اور تقدیر کے فیصلہ پر ناراض ہونا تو اس کی انتہائی بدبختی کا ثبوت ہے- (ترمذی شریف)

---

(٩٠٤) * صاحبِ شریعت یہ چاہتے ہیں کہ امت اپنی حدِ استطاعت تک صرف عمل کرنے کی سعی میں لگی رہے- دقیق امور میں بحث کرنے سے صرف دماغی انتشار پیدا ہوتا ہے اور اس دماغی انتشار سے مذہب کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگتا ہے- وحی کے علوم دماغی مشاق سے مستغنی ہوتے ہیں' اس لیے ان کو جتنا بتا دیا جائے بس اس پر ایمان لے آنا چاہیے اور آئندہ عملی قدم اٹھائے چلا جانا چاہیے- راہِ سلامتی یہ ہے' اس کے سوا ہلاکت ہی ہلاکت ہے- پھر جن مسائل سے ہمارے عمل کا تعلق ہے ان کا صاف صاف فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اگر ان میں اختلاف ہے بھی تو ہر صورت میں اجر کا وعدہ موجود ہے- رہے وہ معاملات جو ہمارے عمل سے متعلق نہیں ہیں ان کا تذکرہ بھی گو کافی حد تک مل جاتا ہے مگر کسی بدیہی چیز کا قبل از وقت معرضِ بحث میں لانا چونکہ کبھی بے وجہ الجھاؤ کا باعث بھی بن جاتا ہے اس لیے ان کی اتنی تفصیلات جتنی کہ انسان کا نفس بے وجہ کرنا چاہتا ہے نہیں ملتیں' اور ان کو اپنے وقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے قیامت میں یہ دونوں مسئلے بدیہی ہو کر آنکھوں کے سامنے آ جائیں گے پھر ابھی سے اس کے در پے ہونے کی ضرورت کیا ہے- لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ جتنا اس کو منع کیجئے تحقیقات کے لیے وہ اتنا ہی اور بے چین ہوتا ہے' حالانکہ وہ نہیں سمجھتا کہ بعض مرتبہ اگر مسئلہ کی تفصیلات اس کی خاطر سب سامنے کر دی جائیں تو اس کے لیے شاید اس سے بڑھ کر کسی اور مصیبت کا باعث ہو جائے-

(٩٠٥) * حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء حدیث میں جب خدا تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر رضامندی کی تاکید آئی تو کسی کے دل میں یہ وہم گزر سکتا تھا کہ پھر اگر انسان سے معصیت ہو جائے تو اس پر بھی اس کو راضی ہونا چاہیے- اس لیے فرمایا کہ انسان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ خیر اور اس کی مرضیات ہی کی توفیق مانگا کرے- اگر اس نے یہ دعاء چھوڑ دی تو یہ اس کی بدبختی کی نشانی سمجھنی چاہیے- علماء نے لکھا ہے کہ قضاء اور فیصلہ خداوندی تو اس کا حکم ہے اس لیے اس پر تو رضامندی ضروری لله ......

(۹۰۶) عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُظْمَ الْجَزَاءِ مَعَ عُظْمِ الْبَلَاءِ وَ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاھُمْ فَمَنْ رَضِیَ فَلَہُ الرِّضَاءَ وَ مَنْ سَخِطَ فَلَہُ السَّخَطُ.

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(۹۰۶) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جتنی آزمائش سخت ہوتی ہے اس کا بدلہ بھی اتنا ہی بڑا ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کو ضرور آزمائش میں بھی ڈالتا ہے' پھر جو اس پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے اور جو ناراض ہوا وہ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

(ترمذی۔ابن ماجہ)

(۹۰۷) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُوْنِ فَاَخْبَرَنِیْ اَنَّہٗ عَذَابٌ یَبْعَثُہُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ وَ اَنَّ اللّٰہَ جَعَلَہٗ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ لَیْسَ مِنْ

(۹۰۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق پوچھا آپؐ نے بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے' جس پر چاہے نازل فرمائے لیکن مؤمنوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی طاعون میں مبتلا ہوا اور یہ یقین رکھتا ہو کہ جو

ﷺ ..... ہے لیکن اگر وہ چیز خود قبیح ہے تو اس پر ناراضائی ضروری ہے۔ کافر کا کفر بھی ایزدی تقدیر سے ہوتا ہے پس اس کا حکم تو پر حکمت ہونے کی وجہ سے بہتر ہی کہا جائے گا گو یہ خود قبیح ہو۔ دیکھو خود بیت الخلاء کیسی گندی چیز ہے مگر کسی مکان کے لیے اس کا بنانا بھی ضروری ہے اور یہ کمال ہے۔

(۹۰۶) * بات یہ ہے کہ امتحان کے بغیر کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ کہیں بھی نہیں ہوتا۔ قدرت چاہتی ہے کہ روزِ محشر جب اپنی مخلوق کو انعام تقسیم فرمائے تو اس کا معیار صرف اپنے علم ازلی پر نہ رکھے بلکہ انصاف و عدالت کے دن ایسا معیار مقرر کر دے جس کا مشاہدہ ہماری آنکھیں بھی کر سکیں وہ چاہتی ہے کہ جن شرکاءِ اُحد کو انعامِ شہادت دے تو اس طرح دے کہ ان کے جسم زخموں سے چور ہوں لیکن اس خستگی میں بھی لبوں پر مسرت کی مسکراہٹ نظر آئے اور جن منافقین کو جہنم میں داخل فرمائے تو اس طرح کہ بروقت رسول سے دغا بازی کا ٹیکہ اُن کی پیشانی پر لگا ہوا ہو۔

(۹۰۷) * طاعون جیسا تکلیف دہ مرض دنیا میں اپنے اسباب سے ہی آتا ہے' مگر دنیا آج تک اس نکتہ سے غافل تھی کہ اس بیماری کے آنے کا مقصد کیا ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انکشاف فرمایا کہ یہ بیماری ظاہر تو ہوئی تھی ایک قوم کے عذاب کے لیے لیکن میری امت کے حق میں رحمت بنا دی گئی ہے' لیکن اس کی چند شرائط بھی رکھی گئی ہیں۔ یہ کہ جب اس کے شہر میں طاعون آئے تو ڈر کر وہاں سے بھاگ نہ جائے یہ مسلمان کی پختگی اور تقدیر پر اعتماد کے خلاف ہے یہ کہ شہر میں رہنا بھی ہو تو صابر بن کر ہو کسی مجبوری سے نہ ہو۔ یہ کہ اس میں ثواب کی نیت اور شامل کر لے اور یہ کہ اس کے اس عقیدہ میں کوئی تزلزل بھی نہ آنے پائے' بس یہ یقین رکھے کہ جو اللہ تعالیٰ میرے مقدر میں لکھ چکا ہے نہ اس کے خلاف وقوع پذیر ہو سکتا ہے اور نہ اس سے رستگاری ممکن ہے۔ اگر ان شرائط کی ادائیگی کے بعد تقدیری طور پر اس کی موت آ گئی تو اس کو ایک شہید کا ثواب ملتا ہے۔ ذیل کی روایت سے اس کی مزید تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں" کہ عام طور پر مرنے والوں اور شہیدوں کے مابین ﷺ .....

اَحَدٍ يَقَعُ الطَّاعُوْنَ فَيَمْكُثُ فِيْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا يُصِيْبُهٗ اِلَّا مَا كَتَبَهُ اللّٰهُ لَهٗ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ شَهِيْدٍ. (رواه البخاری)

کچھ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے اس کے سوا اس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، پھر صبر کے ساتھ ثواب کی امید میں اسی شہر میں پڑا رہے (اور اس کو موت آ جائے) تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔

(٩٠٨) عَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا ابْنُ ثَمَانِ سِنِيْنَ خَدَمْتُهٗ عَشْرَ سِنِيْنَ فَمَا لَامَنِيْ عَلٰى شَيْءٍ قَطُّ اُتِيَ فِيْهِ عَلٰى يَدَيَّ فَاِنْ لَامَنِيْ لَائِمٌ مِنْ اَهْلِهٖ قَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّهٗ لَوْ قُضِيَ شَيْءٌ كَانَ شَيْءٌ. (هذا لفظ المصابيح و رواه البيهقي في شعب الايمان مع تغيير يسير)

(٩٠٨) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے آٹھ سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت شروع کی اور دس سال تک خدمت کی ہے اس عرصہ میں جب کبھی میرے ہاتھ سے کوئی نقصان ہو گیا تو مجھے آپ نے اس پر کبھی ملامت نہیں فرمائی، اگر گھر والوں میں سے کبھی کسی نے کچھ کہا بھی تو آپ نے فرمادیا رہنے دو کچھ نہ کہو اگر مقدر یوں ہوتا (یعنی نقصان نہ ہونا) تو یونہی ہو جاتا۔ (مصابیح ۔بیہقی)

﴾..... ان مُردوں کے معاملہ میں جھگڑا ہوتا ہے جن کا انتقال مرضِ طاعون میں ہوتا ہے۔ شہداء تو یہ کہتے ہیں پروردگار جیسا ہم قتل کیے گئے یہ بھی اسی طرح قتل کیے گئے ہیں، لہٰذا یہ ہمارے بھائی ہوئے ان کا شہیدوں میں شمار ہونا چاہیے، اور عام مردے کہیں گے کہ ان کی موت بستر پر آئی ہے جس طرح ہماری موت اس لیے یہ ہمارے بھائی ہیں۔ پروردگار کا ارشاد ہوگا اچھا ان کے زخم کی شکل دیکھو اگر وہ شہیدوں کے زخموں کے مشابہ ہوں تو ان کا شمار بھی ان میں ہوگا اور یہ ان ہے کہ ساتھ رہیں گے جب اس کی تحقیق کی جائے گی تو ان کے زخم شہیدوں کے مشابہ ملیں گے اس لیے فیصلہ شہداء کے حق میں ہو جائے گا" (احمد ونسائی) اس روایت سے اوپر کی حدیث کی پوری وضاحت ہوگئی اور شہید کے اجر ملنے کی تفصیل بھی معلوم ہوگئی، اور یہ بھی کہ اسباب ومسببات کے اثرات اس عالم سے گزر کر بھی شاید دوسرے عالم میں بھی ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں وہاں بھی شہادت کا ثواب دینے کے لیے اسباب وعلل کا ایک نقشہ جمایا گیا اس میں بحث وتمحیص ہوئی پھر جس جانب پلہ بھاری دیکھا گیا اس جانب فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شہید کا اجر ملے تو پہلے شہید کا سا عمل ہونا چاہیے اگر وہ نہ ہو تو اس عمل کا کوئی اثر ہونا چاہیے۔ شہید بھی بڑے دشوار گزار موقعہ پر صبر کر کے محض رضاء الٰہی کی خاطر جان قربان کرتا ہے، طاعون کا مریض بھی بظاہر اپنی جان کو معرضِ خطر میں ڈال کر صرف رضاء الٰہی کے لیے وہیں جان دیتا ہے۔ جنگ میں میدانِ قتال اور طاعون میں وباء زدہ علاقے موت کی گرما گرمی کے یکساں سے بازار نظر آتے ہیں رحمت بھی اس مشابہت کی رعایت کر لیتی ہے۔ جب ایک ہی بیماری قوموں کے اختلاف سے ثواب وعذاب کی دو متضاد شکل اختیار کر سکتی ہے تو ایک ہی عمل خالق ومخلوق کے فرق سے حسن اور قبیح کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو فرق بھی واضح ہے کہ جو خدا کا فعل ہے وہ اور ہے اور جو بندہ کی صفت ہے وہ دوسری چیز ہے۔ جس پر قبیح ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے وہ خالق کی صفت ہی نہیں ہے، اور جس کو حسن کہا جاتا ہے وہ بندہ کی صفت نہیں بلکہ ایک ہی چیز کا وہ تعلق جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی اس کا پیدا کرنا یہ حسن ہے اور وہ تعلق جو بندہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اس کے ساتھ قائم ہو جانا یہ بعض جگہ قبیح کا حکم اختیار کر لیتا ہے۔

(٩٠٨) * دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سی بات ہی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیجئے گا تو آپ کو رضاء بالقضاء کا ایک کرشمہ ہی معلوم ہوگا کہ اوّل تو دس سال کی طویل زندگی پھر نہ معلوم اس میں کتنی بار اس قسم کے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ ان تمام واقعات میں بلا استثناء اس طرح راضی بالقضاء رہنا کیا یہ کسی معمولی انسان کی استقامت ہو سکتی ہے، بلاشبہ یہ کمال صرف اس شخصیت ہی کا ہو سکتا تھا جس کی نظروں ﴿.....

(۹۰۹) عَنْ اُسَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَهُ رَسُوْلُ اِحْدٰی بَنَاتِهٖ وَ عِنْدَهُ سَعْدٌ وَ اُبَیُّ بْنُ كَعْبٍ وَ مُعَاذٌ اَنَّ ابْنَهَا یَجُوْدُ بِنَفْسِهٖ فَبَعَثَ اِلَیْهَا لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَ لَهٗ مَا اَعْطٰی كُلٌّ بِاَجَلٍ فَلْتَصْبِرْ وَ لْتَحْتَسِبْ.

(رواہ البخاری)

(۹۰۹) اسامہ بیان کرتے ہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ دفعتہً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صاحبزادی کی طرف سے قاصد آیا' اس وقت حضرت سعدؓ اور ابی ابن کعب اور معاذ بھی آپ کی مجلس میں حاضر تھے پیغام یہ تھا کہ ان کا لختِ جگر سفرِ آخرت کے لیے تیار ہے- آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جو دیا تھا وہ بھی اسی کا تھا اور جو لیا ہے وہ اسی کی ملک ہے اور ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہو چکی ہے- لہٰذا صبر کرنا چاہیے اور اس میں ثواب کی نیت رکھنی چاہیے- (بخاری شریف)

الاذعان بان تعذیب المطیع و رحمة العاصی کلاهما عدل فی جنابه تعالٰی روح مبحث القدر

یہ اعتقاد رکھنا کہ فرمانبرداروں کو دوزخ میں ڈال دینا یا نافرمانوں کو جنت بخش دینا مختارِ کُل کی بارگاہ میں دونوں باتیں انصاف ہیں مسئلہ قدر کی جان ہیں

(۹۱۰) عَنْ اِبْنِ الدَّیْلَمِیِّ قَالَ اَتَیْتُ اُبَیَّ بْنَ

(۹۱۰) ابن دیلمی بیان کرتے ہیں کہ میں ابی ابن کعب کی خدمت میں حاضر

لله ..... کے سامنے عالم غیب عالم شہادت سے پہلے متحضر رہا کرتا ہو اور وہ تو کیا جو شخص بھی ایمان کے ساتھ اس کی محفل میں بیٹھ گیا اس کا سینہ بھی اس معرفت سے لبریز ہو گیا- یہاں معمولی نقصانات کا تو ذکر ہی کیا ہے آپؐ کے لختِ جگر کا انتقال ہوتا ہے وہاں بھی عین حالت اضطراب میں زبان سے ایسے نپے تلے کلمات نکلتے ہیں جو ایک طرف ضعیف امت کے لیے اسوہ بن سکیں اور دوسری طرف رضاء بقضاء کا مرقع ہوں آنکھیں اشکبار ہیں مگر آپؐ دردبھری آواز سے جو فقرے فرما رہے ہیں وہ یہ ہیں: و لا نقول الا مایرضی به ربنا. یعنی ان صبر آزما حالات میں بھی زبان سے بجز ان کلمات کے جو رضاء الٰہی کا موجب ہوں ایک کلمہ نہیں نکل سکتا-

(۹۰۹) * انتہائی اضطراب اور صبر شکن مقام میں اطمینان و سکون پیدا کرنے کے لیے ان جامع اور مختصر کلمات سے زیادہ مؤثر اور کلمات نہیں ہو سکتے یہاں سب سے اہم اور سب سے پہلا جو تصور ذہن نشین کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالٰی کی ملک ہے اور مالک کے کسی فعل پر نارضائی کا کسی کو حق ہی نہیں' پس اگر کسی کی اولاد اس نے لے لی ہے تو یہ دی کس نے تھی- دوم یہاں اس کی بھی یاددہانی کی گئی ہے کہ تقدیر میں ہر چیز کی ایک مدت معین کی جا چکی ہے لہٰذا جو چیز دی جاتی ہے اتنی ہی معین مدت کے لیے دی جاتی ہے پس اگر ایک مقرر وقت کے لیے دی ہوئی چیز اپنے وقت مقرر پر لے لی جائے تو اس میں بے صبری کی وجہ کیا- یہ تو ایک علمی درس ہوا- اب عملاً یہ ضروری ہے کہ صبر کیا جائے اور اس صبر میں ثواب کی نیت بھی کی جائے تا کہ ثواب اور زیادہ حاصل ہو- یہ نکتہ یاد رکھیے کہ مصیبت میں صبر کا اجر تو ملتا ہی ہے لیکن اگر اس میں ثواب کی نیت تفصیلی طور پر بھی ہو تو اس کا ثواب اور بڑھ جاتا ہے- احتساب کا لفظ اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے آتا ہے- آپ نے دیکھا کہ ایمان بالتقدیر انسان کے لیے کتنی قوت کا باعث ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشہ میں کس طرح کارآمد ہے-

(۹۱۰) * مسئلہ تقدیر میں گفتگو کی تان جس جگہ جا کر ٹوٹتی ہے وہ یہی باب مجازات ہے یعنی انسانی جزاء و سزا کا مسئلہ- اس لیے صحابی نے یہاں اسی دکھتی رگ کو پکڑ لیا ہے اور اپنے کلام کا آغاز ہی یہیں سے فرمایا ہے- لله .....

كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ فَقَالَ لَوْ اِنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوٰاتِهٖ وَ اَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ وَ لَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَ لَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَ تَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَ اَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَ لَوْ مُتَّ عَلٰى

ہوا' اور میں نے عرض کی تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پڑ گئے ہیں لہٰذا آپ کچھ فرمایئے شاید اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے قلب سے ان کا ازالہ فرما دے- انہوں نے فرمایا (سنو) اگر اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی تمام مخلوق کو عذاب میں ڈال دے تو بھی اس کو ظالم نہیں کہا جا سکتا اور اگر سب پر رحم فرما دے تو اس میں کسی کا استحقاق نہیں' اس کی رحمت ان کے اعمال سے کہیں بڑھ کر ہوگی (سنو) جب تک تم تقدیر پر یقین نہ کرو اور اس کا یقین نہ رکھو کہ جو کچھ تم کو پہنچ گیا ناممکن تھا کہ نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی غیر ممکن تھا کہ تم کو پہنچ جاتا' اس وقت تک اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی خیرات کر ڈالو جب بھی وہ تم سے قبول نہ فرمائے گا- اور

ﷲ ..... حافظ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ دنیوی حوادث میں انسانوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں- ایک طبقہ تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کا مالک ہے' اس کو ہر امر پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اور وہ جو ارادہ فرماتا ہے کرتا ہے لہٰذا یونہی اس کی مشیت ہوگی' یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے- دوسرا وہ ہے جو اس کو قادر اور مالک ہونے کے ساتھ منعم اور مہربان بھی سمجھتا ہے مگر خاص اپنے اس معاملہ میں اس کی کسی نعمت کا ادراک نہیں کرتا- تیسرا طبقہ وہ ہے جس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا مہربان ہے کہ جو بھی اگر کرتا ہے وہ مؤمن کے حق میں خیر ہی خیر ہوتا ہے اس لیے اس کو تلخ سے تلخ حوادث میں بھی نعمت ہی نعمت کا کیف حاصل ہوتا رہتا ہے- چوتھا وہ ہے جس کی نظر مرتبہ صفات سے گزر کر ذات قدسی صفات پر جا پہنچی ہے وہ سمجھتا ہے کہ ذاتِ باری خود مستحق عبادت ہے اور اس کے احسان و انعام سے قطع نظر وہ جو بھی کرے اس کو بہر کیف اس کا حق حاصل ہے وہ ہر حالت میں لائق ستائش ہی ہے' کیونکہ وہ علیم ہے' رحیم ہے اور حکیم ہے' جو بھی کرتا ہے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے- پس وہی اس کا مستحق ہے کہ اسی سے محبت کی جائے' اس کی عبادت کی جائے اور اس کی حمد و ثناء کی جائے- اس شخص کی حمد و ثناء براہِ راست ذات باری تعالیٰ کی ہوتی ہے گو اس کو صفات کا علم ہوتا ہے مگر وہ ان صفات کو بھی ذاتِ باری تعالیٰ کا ایک کمال سمجھتا ہے اور اس کی حمد و ثناء ان صفات کے استحضار کے ساتھ نہیں بلکہ براہ راست ذاتِ منبع صفات کی کرتا ہے-

پہلا طبقہ صابرین کا ہے' دوسرا راضی بقضاء کا' مگر غیر شاکر کا' تیسرا راضی بقضاء کا جو شاکر بھی ہے- اور چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کو احادیث میں "متمادون" کا لقب دیا گیا ہے اور جن کے حق میں یہ بشارت ہے کہ جنت کی طرف سب سے پہلی آواز ان ہی کو دی جائے گی- دوسرے اور تیسرے طبقہ کی معرفت جس نے صرف خدا تعالیٰ کی ربوبیت' مشیت اور قدرت کو پہچانا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کے انعام و احسان کو بھی پہچان لیا ہے ناقص معرفت ہے- جہمیہ اور جبریہ تو صرف پہلی قسم کی معرفت رکھتے ہیں' قدریہ معتزلہ دوسری قسم کی اور تام المعرفۃ وہ اہل علم ہیں جو ذاتِ باری کو صفات سے قطع نظر بھی ہر حالت میں موجب حمد و ثناء سمجھتے ہیں ان کی نظر صرف حکم حاکم کی طرف رہتی ہے نہ کسی مطیع کی اطاعت اور نہ کسی عاصی کی معصیت کی طرف لہٰذا اگر وہ مطیع کو دوزخ میں داخل فرما دے یا عاصی کو جنت میں' دونوں حالتوں میں وہ عادل' منصف اور حکیم ہی رہے گا- ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (تفسیر سورۂ اخلاص ص ٦١ و ٧١ مع تہذیب و ترتیب) ﷲ .....

غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِىْ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ . (رواه احمد، ابو داؤد و ابن ماجه و الحاكم فى صحيحه)

اگر اس عقیدہ کے سوا کسی دوسرے عقیدہ پر مرو گے تو یاد رکھو دوزخ میں جاؤ گے- ابن دیلمی کہتے ہیں اس کے بعد میں عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی یونہی فرمایا پھر میں حذیفہ بن یمان کے پاس پہنچا تو انہوں نے بھی یونہی فرمایا' اور پھر زید بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے یہ مضمون خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نقل فرمایا-
(احمد- ابوداؤد- حاکم- ابن ماجہ)

لله ..... حافظ ابن تیمیہؒ کی اس تفصیل کے بعد آپ اس صحابی کے جواب کی بلندی ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتے ہیں- جبر وقدر کے مسئلہ میں جو شکوک پیدا ہو سکتے ہیں وہ درحقیقت اس معرفت سے محرومی کا ثمرہ ہیں' اگر انسان کو ذات باری کے کمال کا اندازہ ہو جائے تو شبہات کی ساری دنیا خود بخود نیست و نابود ہو جائے- جب تک اس کمال خداوندی کا استحضار حاصل نہ ہو شکوک ختم نہیں ہو سکتے' یہ استحضار ہر ایک کے لیے مشکل مرحلہ ہے' اس لیے صاحب شریعت نے بجائے جواب وسوال کرنے کے اس مسئلہ میں گفتگو ہی کی ممانعت فرمادی ہے- آپ اس سارے بیان کو ایک بار پھر پڑھ جائیے جو اس موضوع کے متعلق ہم نے ان صفحات میں مختلف عنوانات سے پھیلایا ہے- آپ کو لوٹ پلٹ کر پھر اسی نقطہ پر آنا پڑے گا جس کی اس صحابی نے اپنی پہلی مختصر تقریر میں رہبری کی ہے- قضاء وقدر ایک غیبی حقیقت ہے اور جب تک کہ انسان حقائق غیبیہ تسلیم نہ کرلے اس مسئلہ میں اس سے گفتگو لا حاصل ہے- دیکھئے یہاں صحابی نے قضاء وقدر کے معاملہ میں جس تقریر کی تمناء ظاہر کی ہے اس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف دلائل سننا نہیں چاہتا بلکہ وہ طریقہ چاہتا ہے جس سے قلب کو شفا ہو جائے اور ایک ایسا باطنی نور پیدا ہو کہ شبہات کی کھٹک ہی سینہ سے نکل جائے- اسی لیے جواب میں بھی صرف ایسا پہلو اختیار کیا گیا ہے جس کو سن کر ایک خدا پرست کی دل پر الٰہی قدرت وسطوت کا ایسا اثر پڑنا ضروری ہے کہ پھر شبہات خود بخود ختم ہو جائیں- اگر دل اپنی گہرائیوں میں اس عقیدت سے خالی ہے (والعیاذ باللہ) تو پھر اس ضعیف الایمان کے لیے یہ جواب بھلا کب شافی ہوسکتا ہے- یہ قصور جواب کا نہیں بلکہ خود اسی کا ہے یا مصرف القلوب صرف قلوبنا الى طاعتک و معرفتک-

اصولی بات تو اتنی تفصیل کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن پورے طور پر یہ سمجھنے کے لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ سب کو عذاب دے تو بھی اس کو ظالم کیوں نہیں کہہ سکتے -ضروری ہے کہ آپ عدل وظلم کے معنی سمجھ لیں -تو سنیے عدل ہر اس تصرف کو کہتے ہیں جو اپنی ملکیت میں ہوتا ہے اور ظلم کہتے ہیں کسی کے حق دبا لینے کو- اب سوچئے کہ زمین وآسمان میں ایسا کون ہے' جس کو ثواب دینا حق تعالیٰ پر لازم اور ضروری حق ہو' پس اگر یہ حق کسی کا بھی نہیں تو اگر کسی کو بھی جنت عطا نہ فرمائے تو یہ ظلم کیوں ہو' بلکہ چونکہ یہ تصرف اپنی ہی ملک میں ہوگا اس لیے اس کو عین عدل کہا جائے گا' اور فضل یہ ہے کہ جو کسی کا حق نہ ہو اس کو محض اپنے کرم سے عطا کر دینا' لہٰذا اگر وہ سب کو ثواب عطا فرمادے تو یہ اس کا فضل ہی فضل ہوگا- فضل کے متعلق یہ سوال ہی نہیں ہوسکتا کہ فلاں شخص پر کیوں کیا اور فلاں پر کیوں نہیں کیا یہ تو مالک اور حکیم کی اپنی مرضی کی بات ہوتی ہے' جس پر چاہے کرے جس پر نہ چاہے نہ کرے' پھر حکمت والا ہی یہ خوب جانتا ہے کہ کس کو اس نے فضل کا محل بنایا ہے اور کس کو اس کا محل نہیں بنایا- قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِاللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (الحدید: ۲۹) دوسری جگہ جب مشرکین نے سوال کیا تھا ﴿قَالُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ (الانعام: ۵۳) کافر کہتے ہیں اچھا ہم سب میں بس یہ مسلمان ہی رہ گئے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے- لله .....

العباد مختارون فی افعالهم و هم مسوقون الیها و مهیاؤن به للقدر السابق فهم مجبورون ایضًا

بندے اپنے افعال میں مختار ہیں مگران کے اِس اختیار سے کرایا وہی جاتا ہے جو پہلے مقدر ہو چکا ہے اِس لیے وہ مجبور بھی ہیں

(٩١١) عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارِ الْجُهَنِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِ هِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ فَقَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِيْنِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ

(٩١١) مسلم بن یسار جہنی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرتبہ اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ ....الخ انہوں نے فرمایا اس آیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے میں نے خود سنا تھا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر ایک مرتبہ دایاں ہاتھ پھیر کر کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ یہ میں نے جنت کے لیے بنائے ہیں اور جنتیوں ہی کے سے عمل کریں گے' اس کے بعد پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پھر کچھ اولاد نکالی اور ان کے متعلق فرمایا کہ یہ میں نے دوزخ کے لیے بنائے ہیں اور دوزخیوں ہی کے

ﷺ ..... تو ان کے جواب میں ارشاد ہوا ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ (الانعام : ٥٣) یعنی جی ہاں یہ بات ہم ہی جانتے ہیں کہ کون ہماری نعمتوں کا قدردان اور شکرگزار ہوگا اور کون ناقدر اس لیے بنجر زمین میں کوئی تخم پاشی کرتا ہے نہ ہم ناشکر پر اپنا فضل فرماتے ہیں۔
(شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ٢٧٣)

(٩١١) * اس حدیث میں سب سے پہلے عالم تقدیر کے فیصلہ شدہ عالم ہونے پر تنبیہ کی گئی' اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ عمومی حالات وہاں کے فیصلہ اعمال کس نوعیت پر دائر کیے گئے ہیں پھر عمل کی نسبت بندوں کی طرف ظاہر فرما کر ان کے اختیار پر بھی تنبیہ کر دی گئی اور اس پر بھی کہ اختیاری اعمال پر جزاء وسزا معقول ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ ہو چکا تھا انسان کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی قبل' اس لیے آخر کار انسان مجبور ہی ٹھہرا عجیب بات ہے کہ صحابہ کرام کو مسئلہ تقدیر میں جب کہیں شبہ ہوا ہے تو اپنے معاملہ میں ہوا ہے' یعنی جب قضاء و قدر کا فیصلہ ہو چکا ہو تو اب ہماری عملی جدوجہد بیکار ہوگی۔ یہ شبہ کبھی نہیں ہوا کہ جب ہم مجبور ہیں تو پھر ہم کو دوزخ میں ڈالنا ظلم ہوگا' گویا شبہ ہے تو اپنی مجبوری کی بناء پر نہ کہ مختار کل کے اختیار پر۔ حق تعالیٰ کو خالق' مالک اور مختار کل مان کر پھر تو اس پر کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے آپ کے جواب کا رخ بھی اسی طرف رہا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ قضاء وقدر نے تمہارا اختیار سلب نہیں کیا ہاں یہ ضروری ہوگا کہ تم وہی جانب اختیار کر سکو گے جو قضاوقدر کے تحت ہوگی' مگر اختیار کرو گے اپنے اختیار ہی سے ظاہر ہے کہ انسان بیک وقت کسی عمل کی دونوں جانبوں کو تو اختیار کر نہیں سکتا ایک ہی جانب کو بھی وہ اختیار کرے گا بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہی جانب اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ کہ تقدیر کا جبر تمہارے اختیار پر ہے تمہارے عمل پر نہیں اگر تم یہ کہو کہ عمل گو ہمارے اختیار سے صادر ہوتا ہے مگر ہمارا اختیار جب جبر کے تحت ہوا تو بواسطہ گویا عمل بھی جبر کے تحت آ گیا تو یہ درست ہے اس لحاظ سے یقیناً تم مجبور ہو گئے مگر ایسے مجبور نہیں جو معذور ٹھہر سکو جہاں جبری عمل پر جزاء وسزا ظلم نہ ہو وہاں اختیاری عمل پر جزاء وسزا بھلا کیا ظلم ہوسکتا ہے۔

مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَفِيْمَ الْعَمَلُ؟ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ وَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ بِعَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ النَّارَ.

سے عمل کریں گے- اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ تو پھر اب عمل کس لیے کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتی شخص کے سے عمل بھی کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی اسی قسم کے عملوں پر ہو جاتا ہے اور آخر جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی کو دوزخ کے لیے پیدا فرماتا ہے تو اس سے عمل بھی دوزخی شخص کے کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی ان ہی اعمال پر ہو جاتا ہے جو دوزخی لوگوں کے عمل ہیں اور آخر وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے-

(رواه مالك فى المؤطا و الترمذى و ابوداؤد و قال الحاكم على شرط مسلم و قال الحافظ ابن عبدالبر هو حديث منقطع ثم قال هذا الحديث و ان كان عليل الانسناد فان معناه قد روى عن النبى صلى الله عليه وسلم من وجوه كثيرة عن عمر بن الخطاب وغيره و ممن روى معناه فى القدر على بن ابى طالب، و ابى بن كعب، و ابن عباس، و ابن عمر و ابوهريره و ابو سعيد الخدرى و ابو سريحة الغفارى و عبدالله بن مسعود و عبدالله بن عمرو بن العاص و ذوالنحية الكلابى و عمران بن الحصين و عائشه و انس ابن مالك و سراقة بن جعشم و ابو موسى الاشعرى و عبادة بن الصامت و زاد غيره حذيفة اليمان و زيد بن ثابت و جابر بن عبدالله و حذيفة ابن اسيد و ابا ذر و معاذ بن جبل و هشام بن حكيم فاحاديث القدر متواتر المعنى)- (انظر و اشفاء العليل ص ۱۰)

(۹۱۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ خَرَجَ اِلَى الشَّامِ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِسَرْغَ لَقِيَهُ اُمَرَاءُ الْاَجْنَادِ اَبُوْ عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَ اَصْحَابُهُ فَاَخْبَرُوْهُ اَنَّ الْوَبَاءَ

(۹۱۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام کی طرف تشریف لے گئے جب مقام سرغ میں پہنچے تو لشکروں کے جرنیل ابوعبیدہ اور ان کے ہمراہیوں نے یہ اطلاع دی کہ ملک شام میں تو طاعون ہو رہا ہے- ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا ان لوگوں کو ذرا بلاؤ جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی- ان کو بلا کر اس

---

(۹۱۲) * حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جو افعال ہم کرتے ہیں اگر چہ وہ اپنے اختیار ہی سے کرتے ہیں لیکن اس اختیار کی وجہ سے قضاء وقدر کے جبر سے خارج نہیں ہو جاتے' وہ رہتے ہیں پھر اسی کے نیچے نیچے لہٰذا اگر میں یہاں سے اپنے اختیار سے بھاگ رہا ہوں تو کیا ہوا' مجھ کو بھگا بھی قضاء وقدر رہی ہے' اگر یہاں رہتا تو بھی تقدیر کے تحت رہتا' اور اب جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر ہی کے تحت ہے-

حضرت عمرؓ ان صائب الفکر صحابہ میں سے تھے جن کی رائے کی موافقت بسا اوقات خود وحی نے بھی فرمائی تھی' آج پھر کسی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی آنکلا اور اس سے پھر معلوم ہوا کہ جو رائے اس معاملہ میں ان کی قائم ہو چکی تھی وہی عین وحی الٰہی کا منشاء تھا-

قد وقع بالشام قال ابن عباس فقال عمر ادع لي المهاجرين الاولين فدعا هم فاستشارهم و اخبرهم ان الوباء قد وقع بالشام فاختلفوا فقال بعضهم قد خرجت لامر و لا نرى ان ترجع عنه و قال بعضهم معك بقية الناس و اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم و لا نرى ان تقدمهم على هذا الوباء فقال ارتفعوا عني ثم قال ادع لي الانصار فدعوتهم فسلكوا سبيل المهاجرين و اختلفوا كاختلافهم فقال ارتفعوا عني ادع لي من كان ههنا من مشيخة قريش من مهاجرة الفتح فدعوتهم فلم يختلف منهم عليه رجلان فقالوا نرى ان ترجع بالناس و لا تقدمهم على هذا الوباء فنادى عمر في الناس اني مصبح على ظهر فاصبحوا عليه قال ابو عبيدة رضي الله تعالى عنه أفرارا من قدر الله قال عمر رضي الله تعالى عنه لو غيرك قالها يا ابا عبيدة نعم نفر من قدر الله الى قدر الله ارأيت لو كان لك ابل هبطت و اديا له عدوتان احداهما خصبة و الاخرى جدبة اليس ان رعيت الخصبة رعيتها بقدر الله و ان رعيت الجدبة رعيتها بقدر الله قال فجاء عبدالرحمن بن عوف رضي الله تعالى عنه و كان متغيبا في بعض حاجته فقال عندي في هذا علما سمعت

معاملہ میں ان سے مشورہ کیا اور کہا کہ شام میں تو طاعون ہو رہا ہے یہ سن کر ان کی رائے باہم مختلف ہوگئی' کسی نے تو یہ کہا کہ جب آپ جہاد کے ارادہ سے نکل چکے ہیں تو ہمارے خیال میں اب آپ کی واپسی مناسب معلوم نہیں ہوتی اور کسی نے یوں کہا کہ آپ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے کھچے صحابہ ہیں ہمارے نزدیک تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان کو اس طاعون زدہ علاقہ میں لے جا کر ڈال دیں- یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا آپ لوگ تشریف لے جائیں' اس کے بعد فرمایا اب انصار کو بلاؤ- میں نے ان کو بلا لیا' انہوں نے بھی مہاجرین کا سا جواب دیا اور جیسے ان کی رائے مختلف ہوگئی تھی انہوں نے بھی مختلف جوابات دیئے- حضرت عمرؓ نے ان سے بھی فرمایا کہ آپ لوگ بھی تشریف لے جایئے' اس کے بعد فرمایا اچھا ان مہاجرین قریش حضرات کو بلاؤ جو فتح مکہ میں شریک تھے- میں ان کو بلا کر لایا تو ان میں سے دو شخصوں نے بھی ذرا اختلاف نہ کیا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا ایسی حالت میں ہمارے نزدیک واپس ہو جانا ہی مناسب ہے اور ہمارے نزدیک لوگوں کو اس وباء زدہ علاقہ میں لے جانا نامناسب ہے- اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کرا دیا کہ کل صبح کو سواریوں پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں میں بھی چلوں گا- اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا اے عمرؓ کیا یہ واپسی کا حکم تقدیر الٰہی سے بھاگ کر دیا جا رہا ہے- یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اے ابوعبیدہؓ یہ بات تو تمہارے شایانِ شان نہیں تھی کاش کہ تمہارے سوا ایسی موٹی بات تو کوئی اور شخص کہتا' جی ہاں میں تقدیر الٰہی سے بھاگ کر جا رہا ہوں مگر تقدیر الٰہی کی طرف ہی جا رہا ہوں- فرمایئے تو سہی اگر آپ کے پاس کچھ اونٹ ہوں اور آپ ان کو لے کر کسی وادی میں اتریں جس کے دو کناروں میں ایک کنارہ خشک ہو اور دوسرا سرسبز تو فرمایئے اگر آپ اپنے اونٹوں کو اس سرسبز جانب چرائیں گے تو کیا یہ تقدیر الٰہی کے موافق ہی نہ ہوگا' اور اگر خشک جانب چرائیں گے تو کیا یہ بھی تقدیر کے تحت ہی نہ ہوگا- راوی کہتا ہے کہ اس درمیان میں عبدالرحمن بن عوف واپس آ گئے وہ اپنی کسی ضرورت سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے' انہوں نے فرمایا کہ

رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدِمُوْا عَلَيْهِ وَ إِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَ أَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللّٰهَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ ثُمَّ انْصَرَفَ. (رواه البخاري و مالك في الموطأ)

اس معاملہ کے متعلق میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا فرمودہ علم موجود ہے۔ میں نے آپؐ سے خود سنا ہے کہ جب کسی خطہ میں طاعون ہو جائے تو اس میں تم جاؤ مت اور اگر طاعون اس جگہ ہو جائے جہاں تم موجود ہو تو موت کے ڈر سے وہاں سے بھاگو مت یہ سن کر حضرت عمرؓ نے خدا تعالیٰ کی حمد کی اور مدینہ طیبہ واپس ہو گئے۔ (بخاری و مؤطا مالک)

لايسوغ لاحدا لا عتذا ربالقدر

حکم عدولی کے لیے تقدیر کا عذر تراشنا روا نہیں

(۹۱۳) عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهٗ وَ فَاطِمَةَ بِنْتَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَقَالَ أَلَا تُصَلِّيَانِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَنْفُسُنَا بِيَدِ اللّٰهِ فَإِذَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَنَا بَعَثَنَا فَانْصَرَفَ حِيْنَ قُلْتُ ذٰلِكَ وَ لَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئًا ثُمَّ سَمِعْتُهٗ وَ هُوَ مُوَلٍّ يَضْرِبُ فَخِذَهٗ وَ هُوَ يَقُوْلُ وَ كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا. (رواه البخاري و البيهقي و في كتاب الاسماء و الصفات)

(۹۱۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس شب میں تشریف لے آئے اور فرمایا تم لوگ تہجد کی نماز نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جب ہمیں اٹھانا چاہے گا اٹھا دے گا۔ یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے اور میری بات کا کوئی جواب نہ دیا' جب آپ پشت پھیر کر تشریف لے جا رہے تھے تو میں سن رہا تھا کہ آپ اپنا دست مبارک اپنی ران پر مار کر یہ آیت پڑھتے ہوئے جا رہے تھے "وَ كَانَ الْإِنْسَانُ الخ.. انسان بہت جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

---

(۹۱۳) ٭ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ انسان کو جب مختار بنایا گیا ہے اور اسی اختیار پر اس کو احکام شریعت کا مکلف بھی کیا گیا ہے تو اب اس اختیار پر تقدیری جبر کا عذر کرنا بے موقعہ عذر ہونا چاہیے کیونکہ یہ جبر اپنے احساس میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں چونکہ یہ عذر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ نماز تہجد کے لیے اٹھنے سے کوئی انحراف تھا' حضرت علیؓ جو امام الاولیاء ہوں ان کی عبادت و ریاضت کا حال کس سے پوشیدہ ہے لیکن بعض مرتبہ کسی عمل کا ارادہ رکھنے کے باوجود انسانی فطرت اپنی گزشتہ فروگزاشت کا وقتی عذر کر دیتی ہے۔ پوری عقیدت کے ساتھ اگر ناز کا کوئی رشتہ بھی حاصل ہو تو اس مقام میں ایسی تعبیری آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ وسعت بھی نکل آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المؤمنین کے خانگی معاملات میں گفتگو سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ا ص ۳۷۳۔ نوٹ حدیث (۹) مگر معاملہ چونکہ یہاں نبی وقت کے سامنے کا تھا اس لیے کچھ اغماض اور کچھ تنبیہ ضروری ہوگئی۔ تنبیہ تو اس لیے کہ ہر شخص سے تخاطب اس کے منصب کے مناسب ہوا کرتا ہے اور اغماض اس لیے کہ جو پیرایہ عذر یہاں اختیار کیا گیا تھا وہ بہر حال ایک حقیقت کا حامل تھا۔ لہذا آپ نے ان دونوں باتوں کی رعایت فرما کر کوئی معارضہ بھی نہیں فرمایا صرف اپنی ایک ادنیٰ بے التفاتی سے یہ ظاہر فرما دیا کہ صحیح بات اگر بے موقعہ منہ سے نکل جائے تو بے مزہ رہتی ہے اور صراحۃً ان کے اس عذر کی تصویب بھی نہیں فرمائی۔ اگر بات صحیح ہو مگر بے محل واقع ہو جائے تو وہاں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

الالتجاء الی القدر عند المصیبة من سنة ادم علیه السلام

مصیبت میں تقدیر کا سہارا لینا حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے

(۹۱۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَّ اٰدَمُ وَ مُوْسٰی عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی قَالَ مُوْسٰی اَنْتَ اٰدَمُ الَّذِیْ خَلَقَکَ اللّٰهُ بِیَدِهٖ وَ نَفَخَ فِیْکَ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ اَسْجَدَ لَکَ مَلٰٓئِکَتَهٗ وَ اَسْکَنَکَ فِیْ جَنَّتِهٖ ثُمَّ اَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِیْئَتِکَ اِلَی الْاَرْضِ قَالَ اٰدَمُ اَنْتَ مُوْسٰی الَّذِیْ اصْطَفَاکَ اللّٰهُ بِرِسَالَاتِهٖ وَ بِکَلَامِهٖ وَ اَعْطَاکَ الْاَلْوَاحَ فِیْهَا تِبْیَانُ کُلِّ

(۹۱۴) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مرتبہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے مابین اپنے پروردگار کے سامنے گفتگو ہوگئی اس میں حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے- موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی آپ وہی آدم تو ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے پیدا فرمایا' پھر آپ میں اپنی خاص روح پھونکی' آپ کو فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ علیہ السلام کو اپنی جنت میں بسایا- آپ نے یہ کیا کیا کہ اپنی ایک خطا کی بدولت اپنی تمام اولاد کو زمین پر نکلوا پھینکا- آدم علیہ السلام نے فرمایا- اچھا تم بھی وہی موسیٰ تو ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور شرف ہم کلامی کے لئے منتخب کیا' تورات کی تختیاں عنایت

---

(۹۱۴) خلاقِ عالم نے عالم کو پیدا فرما کر جہاں عالم کے جملہ حوادث طے فرما کر لکھ دیے تھے اس کے ساتھ ہی نسل انسانی کی سبق آموزی کے لئے تقدیر کے ایک واقعہ کا ذکر بھی کر دیا ہے وہ یہ کہ ہماری ہی مشیت تھی کہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنائیں اس لئے ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ہم نے ہی ان کو گیہوں کھانے سے منع کیا اور پھر ہم نے ہی ان کو اس کی قدرت دے کر ان سے اس کا ارتکاب بھی کرایا اس کے بعد پھر ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ سوال کیا ''اے آدم کیا ہم نے تم کو اس درخت کے پاس پھٹکنے سے بھی منع نہیں کر دیا تھا اور کیا اس سے بھی خبردار نہیں کر دیا تھا کہ دیکھو شیطان تمہارا بڑا پکا دشمن ہے اس کے کہے میں نہ آنا' پھر تم ان سب باتوں کو فراموش کر کے کیوں گیہوں کھا بیٹھے-

اب نسل انسانی کو خوب سن لینا چاہیے کہ اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے جو جواب دیا وہ صرف گریہ وزاری تھا اس کے سواء ایک حرف تک منہ سے نہیں نکالا اور کلماتِ استغفار بھی اُس وقت کہنے کی جرأت کی جب کہ پروردگار ہی کی طرف سے ان کا القاء کیا گیا- اس واقعہ میں بھی بڑا سبق تھا کہ جو خالق اور مالک ہو اس سے سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا یہ حق صرف اسی کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے باز پرس کرے- یہاں ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ وسوسہ گزر جاتا کہ شاید حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں اس وقت جواب نہ آ سکا ہوگا اس لیے عالم غیب میں اس عقدہ کے حل کے لیے بھی ایک محفل مکالمہ مرتب فرمائی گئی اور عالم غیب میں کشف اسرار کے لیے یہ بھی ایک طریقہ ہے اور ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کی صورت سے معاملہ کی حقیقت واضح کر دی گئی- یہاں ابوالبشر سے مکالمہ کے لیے مشیتِ الٰہیہ نے ان کی اولاد میں سے ایسے فرزند کو منتخب فرمایا جو فطرۃً تیز مزاج اور ناز پروردہ تھے تاکہ ان سے گفتگو کی ابتداء کر سکیں اور ان کے سامنے سوال و جواب کے لیے یہی موضوع رکھ دیا اور اس ضمن میں یہ واضح کر دیا کہ ابوالبشر کے پاس جواب تو تھا اور ایسا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر بھی اس کے جواب سے عاجز ہو گیا' مگر یہاں معاملہ مخلوق کا مخلوق کے سامنے تھا لیکن جب یہی معاملہ خالق کے سامنے پیش آیا تھا تو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے لاجواب تھے کہ گریہ وزاری کے سواء ان کے پاس کوئی اور جواب ہی نہ تھا- بقیہ .....

شَيْءٍ وَ قَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَ اللّٰهَ كَتَبَ التَّوْرَاتَ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ قَالَ مُوْسٰى بِاَرْبَعِيْنَ عامًا قَالَ اٰدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا وَ عَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى اَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ اَنْ اَعْمَلَهٗ قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَنِيْ بِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰى .(وفي لفظ اخرجتنا و نفسک من الجنة و في لفظ حَيَّبتنا) (رواه مسلم)

فرمائیں جس میں ہر ہر بات کی تفصیل موجود تھی' پھر تم کو اپنی سرگوشی کے لئے قریب بلایا- ذرا بتاؤ تو سہی اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے کتنے پہلے تورات لکھ دی تھی- موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال پہلے- آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم کو اس میں یہ لکھا ہوا بھی ملا تھا و عصٰی آدم ربّہ فغوٰی. انہوں نے عرض کی جی ہاں- آدم علیہ السلام نے فرمایا پھر بھلا ایسی بات پر مجھے کیا ملامت کرتے ہو جس کا کرنا اللہ تعالیٰ میری قسمت میں میری پیدائش سے بھی چالیس سال پیشتر لکھ چکا تھا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس اس بات پر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے-

(مسلم شریف)

(۹۱۵) عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ سِرْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ لَيْلَةً فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ لَوْ

(۹۱۵) ابوقتادہؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک شب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں سفر کیا کچھ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کاش

ﷺ ...... یہ واضح رہنا چاہیے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے گیہوں کھایا کیوں' بلکہ یہ ہے کہ آپ نے ہم کو اس دار التکلیف میں رہنے کی مصیبت میں کیوں ڈال دیا' مگر چونکہ یہاں آنا گیہوں کھانے کے نتیجے میں ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر بھی ضمناً آ گیا ہے- علماء نے لکھا ہے کہ اپنی معصیت کے لیے تقدیر کا عذر کرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ نبی کے لیے ورنہ تو پھر تمام بساطِ شریعت ہی درہم برہم ہوئی جاتی ہے اور دنیا اپنے تمام معاصی کے لیے یہی تقدیر کا عذر پیش کر کے اپنا پیچھا چھڑا سکتی ہے- پس آدم علیہ السلام نے تقدیر کا عذر اپنی معصیت کے لیے نہیں کیا بلکہ دنیا میں آنے کی جو مصیبت ان کی اولاد کو پیش آ گئی ہے اس کی تسلی وتشفی کے لیے کیا تھا- مطلب یہ تھا کہ یہ مصیبت تمہارے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی تھی پھر جو بات پہلے سے مقدر ہو چکی تھی اس کے لیے باعث گو میں ہی ہوا لیکن اس پر مجھے ملامت کرنا درست نہیں وہ تو شدنی امر تھا' ہو کر رہتا- مصیبت میں تقدیر کا ذکر کرنا رضاء بالقضاء کی علامت ہے اور گناہ پر تقدیر کی آڑ لینا انتہائی جسارت ہے- آج بھی دنیا اس قسم کے مواقع میں تقدیر ہی کا تذکرہ کر کے اپنے دل کی تسلی کا سامان کیا کرتی ہے- مثلاً اگر کوئی شخص تجارت کا ایک شعبہ چھوڑ کر دوسرا شعبہ اختیار کر لے اور اس میں اس کو کافی نقصان ہو جائے تو اگر لوگ اس تبدیلی پر اس کو ملامت کریں تو ان سے پیچھا چھڑانے اور اپنے نفس کو تسلی دینے کے لیے وہ تقدیر ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ میرے مقدر کی بات تھی اس لیے نقصان ہونا تھا ہو گیا' حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مختلف تصانیف میں اس واقعہ کی بھی توجیہ فرمائی ہے اور یہی سب سے مستحسن اور بے تکلف بھی ہے مگر اس کی پوری وضاحت حافظ ابن قیم نے فرمائی ہے' اس کے علاوہ بھی اور جوابات دیئے گئے ہیں مگر وہ سب تکلف معلوم ہوتے ہیں- حافظ ابن قیم نے ان کی تردید بھی فرمائی ہے- دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸ و شرح عقیدہ الطحاویہ ص ۷۹- البدایۃ والنہایہ ج ۱ ص ۸۵-

(۹۱۵) ✽ نبی کے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری ہو کر رہتی ہے آپ کے دہن مبارک سے نماز کے قضاء ہونے کا خطرہ نکلا دیکھو ﷺ .....

عَرَّسْتَ بِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَخَافُ اَنْ تَنَامُوْا عَنِ الصَّلٰوةِ قَالَ بِلَالٌ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَا اُوْقِظُكُمْ فَاضْطَجَعُوْا وَ اَسْنَدَ بِلَالٌ ظَهْرَهٗ اِلٰى رَاحِلَتِهٖ فَغَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ فَنَامَ فَاسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ قَدْ طَلَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَقَالَ يَا بِلَالُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَيْنَ مَاقُلْتَ قَالَ مَا اُلْقِيَتْ عَلَيَّ نَوْمَةٌ مِثْلُهَا قَطُّ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَاءَ وَ رَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَاءَ يَا بِلَالُ قُمْ فَاَذِّنْ بِالنَّاسِ بِالصَّلٰوةِ فَتَوَضَّأَ فَلَمَّا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ وَ ابْيَاضَّتْ قَامَ فَصَلّٰى.

(رواہ البخاری فی او اخر مواقیت الصلوۃ)

شب میں آرام کی اجازت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ تم صبح کی نماز سے نہ رہ جاؤ۔ بلالؓ بولے میں آپ لوگوں کو بیدار کردوں گا۔ اس پر سب لوگ لیٹ رہے ادھر بلالؓ نے اپنی سواری سے ذرا کمر لگائی (اور خیال یہ تھا کہ بیٹھا صبح صادق کو دیکھتا رہوں گا) وہ بھی اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکے اور سو گئے اب آپ بیدار ہوئے تو آفتاب کا کنارہ چمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا بلال! وہ بات جو تم کہتے تھے کہاں گئی (آخر جس کا مجھے خطرہ تھا وہ واقع ہو گیا یا نہیں) بلالؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اتنی سخت نیند تو مجھے کبھی نہیں آئی (معذور ہوں معاف کیجئے) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب چاہا تمہاری جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور تم سو گئے اور جس وقت چاہا ان کو چھوڑ دیا اور تم بیدار ہو گئے۔ بلال! لو کھڑے ہو اور اذان دے کر لوگوں کو نماز کی اطلاع کر دو۔ پھر وضوء فرمایا جب آفتاب اونچا ہو گیا اور طلوع کی زردی کی بجائے سفید روشنی ہو گیا۔ آپ کھڑے ہوئے اور صبح کی نماز قضاء فرمائی۔ (بخاری شریف)

ﷺ ..... آخر وہ قضاء ہو کر رہی۔ سورۂ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا ﴿وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ﴾ ڈرتا ہوں کہیں میری یوسف کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔ آخر بھائیوں نے وہی بہانا بنایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے نکلا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ" پروردگار جس کام کے لیے یہ مجھے دعوت دے رہی ہے اس سے تو مجھے جیل خانہ پیارا ہے۔ آخر وہ پورا ہوا اور جیل خانہ بھگتنا پڑا۔ یا یوں کہہ دو کہ بعض مرتبہ جو مقدرات ہوتے ہیں وہ مقربین کی زبانوں پر کبھی کبھی اپنے وقوع سے قبل غیر اختیاری طور پر آ جاتے ہیں۔ اس واقعہ میں غور تو کیجئے' حضرت بلالؓ نے کس مستعدی سے پہرہ دینے کا ارادہ کیا ہے یعنی آفتاب کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے لیٹے بھی نہیں' مگر کیا اس تدبیر سے قضاء وقدر ٹل گئی نہیں وہ آئی اور آخر بلالؓ کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں' نیند وہ بھی آخری شب میں پھر مسلسل سفر کے بعد آنکھ نہ کھلنے کا معقول عذر تھا مگر یہاں بلال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں تقدیر کا عذر پیش کیا۔ اس روایت کے اور الفاظ سے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی اس تقصیر سے تمام صحابہؓ پر پریشانی اور خوف کا عجیب عالم تھا۔ لہٰذا اب اس کا موقع آ گیا تھا کہ تقدیر ایزدی کا حوالہ دے کر اپنی بے چینی واضطراب کو تسلی دیتے۔ دیکھئے یہ وہی الفاظ تو تھے جو ابھی ابھی حضرت علیؓ نے آپ کے تہجد کی نماز میں تاکید پر آپ کے جواب میں فرمائے تھے مگر وہاں یہ عذر قبل از وقت تھا' اگر کوشش کے بعد بھی آنکھ نہ کھلتی تو بے شک غم وافسوس کی تسکین کے لیے موزوں ہوتے۔ لیکن چونکہ سعی کرنے سے قبل ہی یہ عذر پیش کیا گیا تھا اس لیے آپ کی مسرت کا باعث نہ ہوا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادھر تقدیر پردۂ غیب میں نافذ ہوا کرتی ہے ادھر عالم اسباب میں انسان پر ارتکاب اسباب کی ذمہ داری بھی پوری پوری عائد رہتی ہے' بلکہ اسباب کے ارتکاب کرنے کے بعد بھی تقصیر وکوتاہی کا الزام پھر عائد رہتا ہے اور اس الزام کے جواب میں ﷺ .....

لا يغربُ عَنْ احاطه القَدَرشیٔ

قضاء وقدر کے احاطہ سے کوئی شئے باہر نہیں ہے

(۹۱٦) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَ الْكَيْسُ. (رواه مسلم و مالك فى المؤطا)

(۹۱٦) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سب کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے' یہاں تک کہ انسان کی درماندگی اور ہوشیاری بھی- (مسلم-موطا)

(۹۱۷) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ خَالِقُ كُلِّ صَانِعٍ وَصَنْعَتَهُ.

(رواه الحاكم فى المستدرك وقال وهو الذهبى على شرط مسلم قال الحافظ ابن القيمؒ)

(۹۱۷) حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جتنے کاریگر ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور جو ان کے کام ہیں ان کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے-

(مستدرک-خلق افعال عباد)

(۹۱۸) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا شَجِّ عَبْدِالْقَيْسِ اِنَّ فِيْكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ الْحِلْمُ وَ

(۹۱۸) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا (یہ اپنے وفد اور قبیلہ کے سردار تھے) تم میں دو عادتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند فرماتے ہیں- ایک برداشت

لله ..... کسی کو تقدیر کی آڑ لینے کی اجازت نہیں ہے' اور کیوں ہو جب ہم اس عالم میں اپنے احساس کے مطابق پورے پورے مختار ہیں تو ہم سے ہمارے اس علم کے مطابق باز پرس ہونی چاہیے- حضرت آدم علیہ السلام نے بھی جب ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں نزول کی مصیبت میں مبتلا کرنے کا الزام دیا محض تسلی کے لیے تقدیر کا نوشتہ یاد دلایا تھا- وہاں بھی جو کچھ ہوا ارادۃً نہیں ہوا- اپنی سی کوشش ختم کر لینے کے بعد ہوا اور یہاں بھی جو کچھ تقصیر ہوئی وہ پوری جد و جہد ختم کر لینے کے بعد ہوئی مگر اس کے باوجود سوال حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوا اور یہاں بلالؓ سے بھی ہوا اگر چہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ تو واقعہ اور متکلم کی نوعیت کے اختلاف سے اختلاف بھی رہا-

(۹۱٦) ٭ ہوشیاری اور عجز انسان کی دو صفتیں ہیں- حدیث کہتی ہے کہ ان کا تعلق بھی تقدیر ہی کے ساتھ ہے پس تقدیر کو صرف جنت و دوزخ تک محدود رکھنا غلط ہے وہ انسانی حیات کے ہر ہر شعبہ کو حاوی ہے خواہ وہ اس کے خلقی اوصاف ہوں یا کسبی اعمال بلکہ اس عالم سے گذر کر دوسرے عالم میں اس کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ بھی اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہیں- ظاہر ہے کہ جب کاتب تقدیر کا قلم قیامت تک کے جملہ احوال کی کتابت کر رہا تھا تو وہ انسان کے ان احوال کی کتابت سے کیسے چوک سکتا تھا- اس وسعت کے بیان سے مقصد قضاوقدر کی عظمت کا نقش قائم کرنا ہے-

(۹۱۷) ٭ عقلاء کو افعالِ عباد میں بحث ہے یعنی یہ کہ بندہ تو ضرور مخلوق ہوا لیکن آگے چل کر جو ان کے افعال ہوتے ہیں کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے مخلوق ہوتے ہیں یا وہ بندوں کے اپنے اختیار کے اثرات ہیں- اس بارے میں یہ حدیث بہت صریح ہے اس لیے ہم نے اس کو یہاں نقل کیا ہے- مسئلہ پر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے- اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی طرح اس کے افعال بھی خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں اب ذرا انسان اپنی ہستی اور اس کی بیچارگی پر غور کرے کہ اس کی حقیقت ہے کیا اور وہ اس کو سمجھتا کیا ہے-

(۹۱۸) ٭ یہ حدیث ایک بار ترجمان السنہ ج ۲ ص ۲۰۷ پر مجملاً گزر چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کے لله .....

اَلْاَنَاةُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ خَلَّتَيْنِ تَخَلَّقْتُ بِهِمَا اَوْ جُبِلْتُ عَلَيْهِمَا قَالَ قَالَ بَلْ جُبِلْتَ عَلَيْهِمَا قَالَ الْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِيْ جَبَلَنِيْ عَلٰى خَلَّتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ. (رواه مسلم)

دوم بردباری - انہوں نے دریافت کیا یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی طور پر رکھی گئی ہیں یا میری حاصل کردہ ہیں؟ فرمایا پیدائشی ہیں - یہ سن کر انہوں نے کہا خداتعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ میں دو عادتیں ایسی پیدا فرمادیں جن کو وہ پسند فرماتا ہے- (مسلم شریف)

(۹۱۹) عَنْ اِبْنِ بُرْدَةَ بْنِ اَبِيْ مُوْسٰى عَنْ بُرْدَةَ قَالَ اَتَيْتُ عَائِشَةَ فَقُلْتُ يا اُمَّاهُ حَدِّثْنِيْ بِشَيْءٍ سَمِعْتِهِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّيْرُ تَجْرِيْ بِقَدَرٍ وَ كَانَ يُعْجِبُهُ الْفَالُ الْحَسَنُ.

(رواه الحاكم في المستدرك و قال قدا حتج به الشيخان بروا ة هذا الحديث عن آخر هم غير يوسف بن ابى بردة و الذى عندى انهما لم يهملاه بجرح و لا بضعف بل لقلة حديثه فانه عزيز الحديث جدا و اقره الذهبى)

(۹۱۹) ابو بردہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے مادر محترم! آج تو مجھے آپ کوئی ایسی حدیث سنا دیجئے جو آپ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو- اس پر انہوں نے فرمایا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ جو پرندہ اڑ کر جاتا ہے یہ تو تقدیر کے موافق اڑ کر جاتا ہے' (لیکن اس سے فال بد لینا جو عرب کا طریق ہے یہ بات بے اصل ہے اور آپ کو ناپسند تھا) ہاں نیک فال لینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے تھے-

(مستدرک)

لله ..... لیے صفت کیس اور عجز مقدر ہوتی ہے اسی طرح حلم اور اناءۃ جیسی صفات بھی مقدر شدہ ہیں- حلم غضب کے مقابل صفت کا نام ہے اور اناءت عجلت کے مقابل صفت کا- یہ صفتیں اگر کسب سے حاصل ہوں تو بھی وہ تقدیر کے احاطہ سے خارج نہیں ہوں گی مگر اس وقت تقدیر میں لکھا ہوا بھی یونہی ہوگا کہ یہ شخص اس صفت کے حاصل کرنے میں سعی کرے گا اور اس طرح حق تعالیٰ اس کو کسی حد تک ان کا کوئی حصہ عطا فرمادے گا اگرچہ کسبی صفات پیدائشی صفات کے مرتبہ کو نہ پہنچیں مگر ایک کمال بہرحال کمال ہی رہتا ہے- شیخ عبدالقیس نے اسی فرق کے لحاظ سے یہ سوال کیا تھا کہ یہ صفتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا کسبی ہیں؟ اور اسی لیے جب ان کو یہ معلوم ہوگیا کہ پیدائشی ہیں تو زیادہ مسرت ہوئی- عربی کا شاعر کہتا ہے لیس التکحل فی العینین کا لکحل. سرمہ لگا کر سرگیں چشم ہونے کے برابر بھلا کب ہوسکتا ہے-

(۹۱۹) ✽ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ پرندہ کی پرواز بھی کیا کوئی شئے ہے مگر قضاء وقدر کے احاطہ میں یہ معمولی سی بات بھی آچکی ہے آگے اس کو نحوست یا برکت کا باعث سمجھنا یہ عرب کی اپنی وہم پرستی ہے اور بے اصل بات ہے- جس فال کے متعلق یہاں ذکر آیا ہے یہ بھی زمانہ جاہلیت کی فال نہیں بلکہ اس کی تفصیل دوسری حدیثوں میں صرف اتنی ہے کہ اگر کسی پیش آمدہ معاملہ کے وقت آپ کے سامنے کوئی اچھا نام آجاتا تو اس کو سن کر آپ خوش ہوجاتے تھے- گویا اس کو اس معاملہ کی حسب دلخواہ طے ہوجانے کی ایک بشارت تصور فرماتے تھے' یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ مریض عیادت کرنے والوں سے اپنی شفاء کے کلمات سن کر خوش ہوجاتا ہے اور اس کو نیک فال تصور کرتا ہے حالانکہ ان کے کہہ دینے سے کہیں شفاء ہوتی ہے' جو مقدر ہو چکا ہے ہوتا تو وہی ہے' مگر ان کلمات سے مریض کا دل ضرور خوش ہوجاتا ہے- اچھا نام سن کر آپ کی مسرت بھی اسی نوع کی ایک چیز تھی-

(۹۲۰) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قُبْضَۃٍ قَبَضَھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ اٰدَمَ عَلٰی قَدْرِ الْاَرْضِ مِنْھُمُ الْاَحْمَرُ وَ الْاَبْیَضُ وَ الْاَسْوَدُ وَ بَیْنَ ذٰلِکَ وَ السَّھْلُ وَ الْحَزْنُ وَ الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ. (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد)

(۹۲۰) ابوموسیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی زمین میں سے ایک مٹھی بھری پھر اس مٹھی سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے اس لیے ان کی اولاد بھی زمین کے رنگوں کی طرح مختلف رنگوں کی پیدا ہوئی- کوئی سرخ ' کوئی گورا ' کوئی کالا ' اور کوئی درمیانی اسی طرح کوئی نرم خوتو کوئی تند خو' کوئی خبیث طبیعت تو کوئی شریف طبیعت-

(۹۲۱) عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ یُصِیْبُکَ فِیْ کُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاۃِ الْمَسْمُوْمَۃِ الَّتِیْ اَکَلْتَ قَالَ مَا اَصَابَنِیْ شَیْءٌ مِنْھَا اِلَّا وَ ھُوَ مَکْتُوْبٌ عَلَیَّ وَ اٰدَمُ فِیْ طِیْنَتِہٖ. (رواہ ابن ماجہ)

(۹۲۱) حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ خیبر کے یہود نے زہر آلود بکری کا جو گوشت آپ ؐ کو کھلا دیا تھا (میں دیکھتی ہوں) کہ اس کی تکلیف ہر سال ہی آپ کو ہوتی ہے- آپ ؐ نے فرمایا- اس کی وجہ سے جو تکلیف بھی مجھ کو اب ہوتی ہے وہ میرے مقدر میں اس وقت لکھی جا چکی تھی جب کہ حضرت آدم علیہ السلام گارے کی شکل میں تھے (یعنی ان کا پتلہ بھی تیار نہ ہوا تھا)

---

(۹۲۰) * مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے رنگوں کا معمولی سا اختلاف بھی قدرت کا پیدا کردہ ہے- زمین کے مختلف رنگ بھی قدرت نے بنائے پھر جو مخلوق ان سے مرکب کی اس کے رنگ بھی مختلف ہوئے' مگر یہ اس لیے نہیں کہ یہ ان کے مادہ کا اقتضاء تھا بلکہ یہ بھی براہ راست قدرت ہی کا فیض ہے- فطرت پرست تو دو چیزوں کے مابین صرف ظاہری تناسب دیکھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے فارغ ہو جاتا ہے مگر قدرت کا قائل صرف اس حد پر جا کر ٹھہر نہیں جاتا وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ قدرت کے وسیع احاطہ میں کالے سے سفید اور سفید سے کالا بنانا بھی ہے لیکن وہ بسا اس تناسب کا نقض پسند نہیں کرتی - اور اس عالم کی زیبائش قائم رکھنے کے لیے کالے سے کالا اور گورے سے گورا ہی بناتی رہتی ہے پس مواد میں جو خواص ہیں وہ بھی قدرت نے رکھے ہیں اور ان کے مناسب جو آثار ان سے رونما ہوتے ہیں وہ بھی اسی نے پیدا فرمائے ہیں اور اس کے بعد ان آثار کا ترتب بھی قدرت ہی کے تحت رہتا ہے اور یہ کچھ اسی ایک جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دائرہ مخلوقات میں یہ اللہ تعالیٰ کی سنت قدیمہ ہے کہ جو خواص اس نے مادہ میں رکھے ہیں وہ ان کے مناسب ہی ان پر آثار مرتب فرماتی رہتی ہے اور اس صورت میں ایک طرف قدرت کا کمال دوسری طرف عالم کی مرتب زیبائش دونوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے- (دیکھو حجۃ اللہ ص ۱۷)

(۹۲۱) * یہ حدیث عقائد شرعیہ کو حقائق بنا کر ان کو استعمال کرنے کی تعلیم دیتی ہے- ہر ہر موقعہ پر تقدیر کی یاد دہانی اس کے استحضار کا موجب ہوتی ہے اور بار بار استحضار سے انسان کو ایک فطری سا یقین میسر آ جاتا ہے عالم غیب پر یقین کرنے کا راستہ بس ایک یہی ہے- وہ دلائل کی رسائی سے بہت بلند عالم ہے انبیاء علیہم السلام کا احسان ہے کہ وہ اس سے خبردار کرتے ہیں پھر اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر ہر چھوٹے بڑے شعبوں میں قدم قدم پر اس کو استعمال کر کر کے یقینی بھی بنا دیتے ہیں- اب دیکھئے حضرت ام سلمہؓ نے آپ کی تکلیف ......

(۹۲۲) عَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَأَلَتْ خَدِیْجَةُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَیْنِ مَاتَا لَهَا فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِی النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَأٰی الْکَرَاهَةَ فِیْ وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَأَیْتِ مَکَانَهُمَا لَاَبْغَضْتِهِمَا قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَلَدِیْ مِنْکَ قَالَ فِی الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَوْلَادَهُمْ فِی الْجَنَّةِ وَ اِنَّ الْمُشْرِکِیْنَ وَ اَوْلَادَهُمْ فِی النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ (رواه احمد)

(۹۲۲) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے دو بچے جو کفر کے دور میں پیدا ہوئے تھے وہ دوزخ میں ہیں یا جنت میں؟ فرمایا دوزخ میں- یہ سن کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرہ پر غم کے آثار دیکھے تو فرمایا اگر تم ان کا ٹھکانا دیکھ لو تو تمہارے دل میں بھی ان سے نفرت پیدا ہو جائے- اس کے بعد انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ اچھا جو میری اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے ان کا حال بتایئے؟ فرمایا وہ جنت میں ہے- اس کے بعد فرمایا مؤمنین اور ان کی اولاد جنت میں جائیں گی اور مشرکین اور ان کی اولاد دوزخ میں اس کے بعد اس کی تصدیق کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی: وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں-
(مسند احمد)

ﷲ ..... کا احساس کر کے محض ایک کلمہ محبت کہا تھا جیسا کہ محبت میں ہر محبت بھرا شخص کہہ دیا کرتا ہے لیکن آپ نے فوراً ان کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ فرما دیا جس کے بعد یہ اثر تو ہلکا ہو گیا اور اس سے کہیں بڑھ کر دوسرا اثر پیدا ہو گیا اور وہ قضاء وقدر پر اعتقاد جازم تھا' آپ کی یہ شانِ تعلیم دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؎

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

جب علوم شرعیہ مشاہدہ کی کیفیت میں بدلنا شروع ہو جائیں تو بشارت ہونی چاہیے کہ اب احسان کا میدان شروع ہو گیا ہے' یہ وہی احسان ہے جس کا سوال و جواب حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں- اس زمانہ میں اعتقادیات کا تذکرہ چونکہ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے جن کا ذکر تعلیم و تعلم میں صرف ایک کہانی کے طور پر آ جاتا ہے اور بس' اس لیے ہمارے ایمان کا حال بھی ناگفتہ بہ ہو چکا ہے- اگر کاش وہ موقعہ بموقعہ اسی طرح استعمال بھی ہوتے رہیں تو مذہب میں شکوک وشبہات کا یہ عالم پیدا ہی نہ ہو اور دلائل کی دردسری کے بغیر وہ نعمت یقین نصیب ہو جائے جس کو پہاڑوں کی ٹکر بھی نقصان رساں نہ ہو سکے-

(۹۲۲) * دوزخ اور جنت کی جو تقدیر شکم مادر میں لکھ دی جاتی ہے' علم الٰہی میں وہ بھی کسی ضابطہ کے تحت ہوتی ہے اس کا ضابطہ اسی کو معلوم ہے کہیں اس کا مدار ظاہری عمل پر ہوتا ہے اور کہیں صرف اس استعداد پر جو اچھے برے عمل کا اصلی سبب ہوتی ہے (حجۃ اللہ ص ۱۶۲) تقدیر کا یہ پہلو بھی قدرت نے صیغہ راز میں رکھا ہے اور جس طرح قیامت کے وقت کا اخفا کیا گیا ہے' کیونکہ نظام عالم اسی میں مضمر ہے اسی طرح محشر سے قبل جنتی اور دوزخی ہونے کا آخری فیصلہ بھی مستور رکھا گیا ہے- ہاں اجمالی طور پر اتنا پتہ دے دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اولاد جنتی ہے اور کفار و مشرکین کی دوزخی- تقدیر کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ سوال بالکل بے معنی رہ جاتا ہے کہ جب بچہ نے کوئی برا ﷲ .....

(۹۲۳) عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْغُلَامُ الَّذِیْ قَتَلَہُ الْخَضِرُ طُبِعَ یَوْمَ طُبِعَ کَافِرًا. (رواہ الترمذی

(۹۲۳) ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا' وہ جب شکم مادر میں جما تھا اس کی تقدیر میں کافر ہی لکھا گیا تھا. (ترمذی شریف)

و قال ھذا حدیث صحیح غریب و اخرجہ مسلم و ابوداؤد و الترمذی. قال الحافظ ابن القیمؒ المراد بہ انہ کتب کذلک و قدر و ختم فھو من طبع الکتاب و لفظ الطبع لا صار یستعملہ کثیر من الناس الطبیعۃ التی ھی بمعنی الخلقہ و الجبلہ ظن الظان ان ھذا لمراد الحدیث اھ. شفاء العلیل ص ۲۹۵)

ﷺ ..... عمل ہی نہیں کیا تو پھر اس کے لیے دوزخ کیوں ہے- اوّل تو یہ اعتراض اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ جزاء سزا کا ضابطہ صرف ایک عمل ہی ہو پھر یہ تو بتائیے کہ جس نے عمل کر لیے ہیں اسی کے لیے دوزخ کیوں ہو' جب کہ دوزخ کے عمل کرا کے دوزخ میں ڈالنا بھی قابل اعتراض ہونا چاہیے- اگر یہ کہا جائے کہ عمل اس بات کی شہادت ہوتا ہے کہ اس میں استعداد ناقص تھی- پھر اگر مدار استعداد پر ہو تو بچوں میں بھی قدرت نے مختلف نوع کی استعدادیں رکھی ہیں' بری استعداد کا بچہ اسی طرح قابل رحم نہیں ہوتا جیسا سانپ اور بچھو کا بچہ یہاں کوئی بے رحمی کا سوال پیدا نہیں ہوتا' بلکہ ان کے کاٹے ہوئے بغیر بھی ان کو مار ڈالنا دنیا کے حق میں بڑی رحم دلی ہوتا ہے- حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کا حال اسی درجہ پر تباہ دیکھا تو آخر بددعاء کے لیے ہاتھ اٹھانے کے لیے مجبور ہو ہی گئے- اور اس کا یہی عذر بیان فرمایا رب ﴿اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا﴾ (نوح:۲۷) یعنی اب یہ تخم ہی خراب ہو چکا ہے اگر آگے باقی رہا تو اس سے جو پیداوار ہوگی وہ ایسی ہی بدبخت قوم کی ہوگی- پس جس کو دوزخ میں ڈالنا منظور ہوگا اس کی استعداد بھی اسی کے مناسب ہوگی اور اس کی اس کی علامت یہ ہے کہ وہ کافر و مشرک کے یہاں پیدا ہوگا- یہ بھی صرف ایک علامت کے طور پر ہے پوری بات یہاں بھی ہم کو بتانا منظور نہیں کیونکہ یہ بھی تقدیر کا ایک شعبہ ہے اور اس کو بھی محشر سے قبل کھول دینا پسند نہیں ہے- اسی لیے حدیث میں بچوں کی نجات و ہلاکت کے مسئلہ میں بحث کرنے کی بھی ممانعت آئی ہے- اس جگہ حدیث نمبر ۸۰۲ کو بھی دیکھ لینا چاہیے- ملاحظہ ہو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۶۸-

(۹۲۳) ✱ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شقاوت وسعادت شکم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہے اور اس کتابت کے تحت وہ مولود ایسا مسخر ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر وہی افعال کرتا ہے جو اس کتابت کے مطابق ہوتے ہیں- گو کرتا ہے اپنے اختیار ہی سے- تقدیر کا سارا جغرافیہ کیسے بتایا جا سکتا ہے' اور اگر بتا دیا جائے تو کون اس کو محفوظ رکھ سکتا ہے- دیکھئے یہاں والدین مسلمان ہیں ادھر تقدیر بچہ میں ایسی استعداد ودیعت فرما چکی ہے کہ بڑے ہو کر اس سے کفر ہی کے افعال سرزد ہوں اور ادھر مقصد یہ ہے کہ والدین اس کی محبت میں آ کر کافر نہ ہو جائیں تو ان دونوں مقدرات میں جوڑیوں لگایا جاتا ہے کہ اس نوبت سے قبل ہی قبل بچہ کو ان سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے- ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر بڑا ظلم ہوا کیسا خوش رو بچہ اور کس طرح موت کے زبردست ہاتھوں نے ان سے چھین لیا مگر تقدیر یہ کہتی ہے کہ بہت بہتر ہوا کیونکہ اگر اس کی حیات مقدر ہو جاتی تو اس کے ساتھ ساتھ ان کا کفر بھی مقدر ہو جاتا بچہ کی حیات سے یہ زندگی تو بہت پر لطف گزرتی مگر آخرت کی زندگی برباد ہو جاتی- اب اگر یہ راز یہیں کھول دیا جاتا ہے تو بتائیے کہ اس بچہ کی وفات پر والدین کے صبر میں کیا بات رہ جاتی- تقدیر کے اخفاء کے ساتھ جب وہ صبر کرتے ہیں تو پروردگار کی طرف سے ان کو رضا بالقضاء کا تمغہ مل جاتا ہے' حالانکہ ان کا صبر بھی قضاء الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے مگر عالم اسباب میں یہ تمام باتیں مستور رہتی ہیں ظاہر میں تو یہی نظر آتا ہے کہ ایک شخص کے بچہ کا انتقال ہوتا ہے اور وہ محض خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد ﷺ .....

۴ الحوادث کلها تحت سیطرۃ القدر | کائنات کا ذرّہ ذرّہ قضاء وقدر کے فولادی شکنجہ میں کسا ہوا ہے

(۹۲۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا | (۹۲۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیۃ الذین یجتنبون

بقیہ ..... کر کے صبر کر لیتا ہے بس اس عالم ظاہر کے اختیار ہی پر یہ جزاء وسزا مرتب ہو جاتی ہے اگر عالم غیب ظاہر ہو جائے تو جزاء وسزا کے لیے اس دنیا کو اتنی تفصیل کے ساتھ بچھانے کی ضرورت نہ تھی۔

اور دیکھئے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فرزند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں استعداد تو وہ رکھی جاتی ہے کہ اگر عمر پائیں تو نبوت سے سر فراز ہوں ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم نبوت کا تاج پہنایا جا چکا ہے اب اگر ان کو حیات بخشی جاتی ہے تو اس استعداد کے ماتحت ان کا نبی ہونا مناسب ہوتا' اگر یہ استعداد نہ رکھی جاتی تو قدرت کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ خاتم النبیین کی اولاد ایسی ہو جس میں منصب نبوت کی استعداد بھی نہ ہو۔ اس لیے ان دونوں باتوں میں ربط یوں قائم کیا جاتا ہے کہ ان میں تو نبوت کی استعداد رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ عمر مقدر نہ فرمائی جس میں نبوت ملا کرتی ہے تا کہ خاتم النبیین کے بعد دوسرا نبی پیدا نہ ہو خواہ وہ آپ کا خاص فرزند ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح ختم نبوت کا کمال اپنی جگہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند کی استعداد کی بلندی اپنی جگہ درخشاں رہے۔ اتفاق سے اس معاملہ میں بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں آپ زیر شرح حدیث ج ا ص ۱۵۶ پڑھ چکے ہیں جس میں صاف موجود ہے کہ اگر (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) زندہ رہتے تو نبی ہوتے' اور اسی لیے جب آیت خاتم النبیین میں قرآن کریم نے آپ کے باپ ہونے کی نفی کی تو اس کو مردوں کے ساتھ مقید کر دیا۔ ورنہ تو آپ کی دختری اور پسری دونوں اولادیں تھیں' لیکن پسری اولاد سن بلوغت کو کوئی نہیں پہنچی۔

(۹۲۴) * اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے انسان میں قوت شہوانیہ اور رغبت الی النساء خلقۃً ودیعت فرمائی ہے اور اس میں ہاتھ' آنکھیں' زبان اور نفس بھی پیدا فرما دیئے ہیں جو اس کی لذت کا مرتبہ بہ مرتبہ ادراک کرتے ہیں' اگر چہ اس فعل کی حقیقت انسانی شرمگاہ کے ساتھ تمام ہوتی ہے' مگر شریعت میں مقامات زنا کو بھی ایک مرتبہ کا زنا قرار دیا گیا ہے لہٰذا بدنظری سے غیر محرم کو دیکھنے والا یہ نہ سمجھے کہ اس نے کسی محظور امر کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے آنکھوں کا زنا کر لیا' اسی طرح غیر محرم کو ہاتھ لگانے والا بھی یہ نہ سمجھے کہ اس نے کوئی بری حرکت نہیں کی بلکہ اس کو یقین کرنا چاہیے کہ اس کے ہاتھوں نے زنا کر لیا اور ان کا زنا یہی ہے کہ انہوں نے غیر محرم کو چھو لیا۔ مگر چونکہ یہ اقتضاء انسان میں قدرت نے رکھ دیا ہے اس لیے اگر انسان کسی غفلت کے موقعہ پر ان مقدمات میں مبتلا ہو جائے اور پھر خدا کے خوف سے اس فعل کی تکمیل سے باز رہے تو اسے پروردگار عالم کی رحمت سے امیدوار رہنا چاہیے کہ جو ناجائز حرکات اس سے سرزد ہو چکیں وہ "لمم" یعنی صغائر میں شمار ہوں گی اور ان کی مغفرت ہو جائے گی۔

تقدیر کا دائرہ بھی کتنا وسیع ہے کہ اس میں صرف حسنات اور سیئات ہی نہیں ان کے مقدمات بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ جب اس نے زنا نہیں کیا تو شاید اس سے قبل جو حرکات اس سے سرزد ہو گئیں وہ نہ ہونے کی برابر ہوں گی۔ اس لیے شاید وہ محاسبہ تقدیر میں داخل نہ ہوں' مگر اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ بھی مقدرات میں شامل ہیں۔ پھر تقدیر کی گرفت بھی کتنی زبردست ہے کہ جو حصہ زنا اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کا ارتکاب کیے بغیر بھی اس کو چارہ کار نہیں تعجب ہے کہ جبر تو اتنا پھر جو کچھ آگے ظہور پذیر ہوتا ہے اپنے ہی اختیار سے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ.

حافظ ابن تیمیہ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں اس حدیث کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی لا بد للانسان من مقدمات بقیہ .....

اَشْبَہَ بِاللَّمَمِ مِمَّا قَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلَی ابْنِ اٰدَمَ حَظَّہٗ مِنَ الزِّنٰی اَدْرَکَ ذٰلِکَ لَا مَحَالَۃَ فَزِنَی الْعَیْنِ النَّظْرُوَزِنَی اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَ النَّفْسُ تَمَنّٰی وَ تَشْتَھِیْ وَ الْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِکَ وَ یُکَذِّبُہٗ . (رواہ البخاری و عند مسلم مثلہ و فی المتفق علیہ عن ابی ھریرۃ ایضًا)

کبائر الاثم و الفواحش الا اللمم میں "اللمم" کی تفسیر میں ان باتوں سے زیادہ مناسب مجھے اور کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی جو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا ہے وہ اس کو ضرور مل کر رہے گا۔ پس آنکھ کا زنا تو غیر محرم کو دیکھنا ہے اور زبان کا زناء اس قسم کی بات چیت کرنا اور نفس کا کام اس کی خواہش کرنا اور تمناء کرنا ہے۔ پھر آخر میں شرمگاہ اس کی تصدیق کر دیتا ہے یا تکذیب کر دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۲۵) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ

(۹۲۵) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

ﷺ ...... الکبیرۃ و کثیر منھم یقع لی الکبیرۃ فیومر بالتوبۃ و یومرون ان لایصرو اعلی صغیرۃ فانہ لا صغیرۃ مع اصرار و لا کبیرۃ مع استغفار (ص ۱۸)۔ یعنی بشر آخر بشر ہے کبیرہ گناہ سے اگر بچ رہے تو بچ رہے مگر اس کے مقدمات و مبادی سے بچنا مشکل ہے کبھی نہ کبھی نظر اٹھ ہی جاتی ہے اس سے ترقی کر کے کبھی اور اعضاء بھی اس میں ملوث ہو ہی جاتے ہیں پھر کوئی بدنصیب آخر کبیرہ گناہ میں بھی مبتلاء ہو جاتا ہے۔ اب جو کبیرہ سے بچ نکلا اس کو حکم یہ ہے کہ آئندہ یہ حرکت نہ کرے اور جو پھنس گیا اس کو حکم یہ ہے کہ فوراً توبہ کرے۔ پس اس طرح اگر صغائر پر اصرار نہ ہو اور کبائر پر ہمیشہ توبہ ہوتی رہے تو اس کو سن لینا چاہیے کہ نہ صغائر صغائر رہتے ہیں اور نہ کبائر کبائر بارگاہ رحمت میں سب پر قلم عفو کھینچ دیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی تکمیل تو بہ صرف زبان سے نہیں ہوتی اس کی واضح شہادت یہ ہے کہ شرعی حکم اپنے نفس پر جاری بھی کرائے اور جس جرم کی گہرائی اتنی ہو کہ اس میں اس کا عضو عضو شریک ہو چکا ہو اس کی سزا بھی اس کے ہر ہر عضو کو بھگتنی چاہیے شاید جنابت میں تمام جسم کا غسل بھی اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہو (اس کی پوری بحث اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک آدھ واقعہ ایسا بھی ہو گیا ہے اور جب ہو گیا ہے تو اس صحابی نے اپنی جان قربان کرنے کے سواء کوئی چارۂ کار نہیں دیکھا۔ ایسے صحابی کے متعلق اگر اس وقت کے اسلامی معیار کی بلندی کی بناء پر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ کچھ کمی کا مشعر نکل گیا ہے تو آپ نے فرمایا ہے؟ "لقد تاب توبۃ لو قسمت علی اھل المدنیۃ لو سعتھم" اُس نے تو ایسی زبردست توبہ کر لی کہ اگر اس کو سارے اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا جاتا تو ان کے گناہوں کی بخشش کے لیے بھی کافی ہو جاتی۔ (او کما قال)

(۹۲۵) ❋ صحیح مسلم میں اس حدیث میں کچھ اضافات ہیں اس میں اس حدیث کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے فرمایا جو شخص شقی ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ ہی سے شقی پیدا ہوتا ہے اور سعید کی شناخت یہ ہے کہ جو دوسرے کو دیکھ کر نصیحت حاصل کر لے۔ اس پر کسی صحابی نے سوال کیا۔ عمل کیے بغیر شقاوت کیسی؟ اس پر اس شخص نے جواب دیا۔ اس میں تعجب کیا ہے اس کے بعد حدیث مذکورہ بالا بیان کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سعادت و شقاوت شکم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہے۔ اور اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ثم یخرج الملک بالصحیفۃ فی یدہ - یعنی پھر فرشتہ اپنے ہاتھ میں جو دفتر تھا وہ نکالتا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جن چار امور کی کتابت کا یہاں ذکر ہے ان کی کتابت کسی متعلقہ دفتر میں ہوتی ﷺ ......

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ ھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اِنَّ خَلْقَ اَحَدِکُمْ یَجْمَعُ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَبْعَثُ اللّٰہُ اِلَیْہِ مَلَکًا بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ فَیَکْتُبُ عَمَلَہٗ وَ اَجَلَہٗ وَ رِزْقَہٗ وَ شَقِیٌّ اَوْ سَعِیْدٌ ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْہِ الرُّوْحُ فَوَالَّذِیْ لَا اِلٰہَ غَیْرُہٗ اِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی مَا یَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَھَا

اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خود بیان فرمایا اور بے شبہ آپ صادق تھے ایسے صادق جن کی جہان تصدیق کرتا ہے تم چالیس دن تک اپنے شکم مادر میں بشکل نطفہ رہتے ہو پھر ایک فرشتہ چار باتوں کی تحریر کے لیے بھیجتا ہے وہ اس کے عمل اس کی عمر اس کا رزق اور نیک و بد ہونا لکھ دیتا ہے' اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے اس خدا کی قسم ہے جس کے سواء معبود کوئی نہیں کہ (پیدائش کے بعد) تم میں کا ایک شخص (ساری عمر) جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے بعد جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن آخر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے اور وہ دوزخی شخص کے

للبقیہ ..... ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امور دونوں آنکھوں کے درمیان لکھے جاتے ہیں' واللہ تعالیٰ اعلم- شاید یہ بھی کتابت کا محل ہو- اہل عرف کو دیکھا کہ وہ آج بھی پیشانی پر ہاتھ مار کر ہائے مقدر کہا کرتے ہیں- ابن ابی حاتم نے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب سے چار باتوں کے علاوہ پانچویں چیز مقام موت کا ذکر بھی ہے- مسند بزار میں ابن عمرؓ مرفوعاً روایت فرماتے ہیں: "ثم یکتب بین عینیہ ما ھو لاق حتی انکبۃ ینکبھا" یعنی پھر اس کی آنکھوں کے درمیان جو جو امور پیش آمدنی ہیں وہ سب لکھ دیئے جاتے ہیں حتیٰ کہ جو ذرا سی خراش کبھی اسی کو لگنی ہے وہ بھی لکھ دی جاتی ہے- ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابوذرؓ سے بھی اس تعمیم کو نقل کیا ہے- ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ایک اور مفید ٹکڑا بھی نقل کیا ہے: فیقال اذھب الی ام الکتاب فانک تجد فیہ قصۃ ھذہ النطفۃ (جامع العلوم) حق تعالیٰ کی جانب سے اس فرشتہ کو جو رحم مادر پر مقرر ہے حکم ہوتا ہے- جا اور لوح میں جا کر دیکھ وہاں تجھ کو اس نطفہ کے متعلق پوری پوری تفصیلات مل جائیں گی- ان مختلف آثار کے نقل سے مقصد یہ ہے کہ ہر مقام پر سوالات تو بہت پیدا ہو جاتے ہیں جن کے جوابات بعض مرتبہ کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نہیں ملتے- یہ چیزیں ان ضروریات میں شامل نہیں ہیں جن کا معلوم ہونا امت کے لیے فرض و لازم ہو' اس لیے نہ بیان میں اس کی اہمیت رہی ہے نہ آپ کو اس کی اہمیت چاہیے- جتنا بیان آ بھی چکا ہے وہ بھی اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اب اس کا کوئی پہلو ہی تشنہ نہ رہے- پھر اس میں بھی راویوں کے اختلاف سے بڑی حد تک اشتباہ لگ جاتا ہے اس کو براہ راست اسلام کے سر نہ لگانا چاہیے- یہاں راوی کا قصور اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنے اندازِ فکر کے مطابق اور اپنے ہی شرائط حفظ کے مطابق روایت کرتا ہے جس کی دوسرے راوی کو نہ اطلاع ہوتی ہے اور نہ وہ ان امور کی پابندی کر سکتا ہے' اس طرح ایک ایک حدیث بیس بیس مختلف صحابہ سے ملک کے مختلف گوشوں سے سننے میں آتی ہے' ضروری طور پر یہاں لفظی اختلاف ہو جانا چاہیے- حیرت ہے کہ ایک طبقہ تو یہاں اسی اختلاف کو حدیث سے دست برداری کا ایک اچھا بہانہ بنا لیتا ہے اور دوسرا اسی کو حفاظت حدیث کی دلیل سمجھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جب ایک ہی بات ملک کے مختلف حصوں' زمانہ کے مختلف ادوار اور مختلف اشخاص سے مسلسل سنی گئی ہے تو اگر اس کے الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف بھی پایا جائے تو بھی یہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اصل واقعہ یقیناً اپنی جگہ ہوا ہے اور ضرور ہوا ہے لہٰذا ایسے مقامات پر جو بات متفقہ طور پر ثابت ہو جائے اس کو مان لینا چاہیے اور جس میں اختلاف باقی رہے اور کوئی راہ ترجیح یا توفیق بھی نہ کھل سکے تو اس کو راویوں کے اختلاف کا نتیجہ سمجھنا چاہیے نہ یہ کہ اصل بیان ہی کو ناقص سمجھ کر اس کو شریعت کے سر رکھا جائے-

اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْتَبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْتَبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (متفق عليه)

سے عمل کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح تم میں ایک شخص ساری عمر دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے آخر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے اور وہ جنتی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۲۶) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَ اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَ يَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَ اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ. (متفق عليه)

(۹۲۶) سہل بن سعد روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ جنتی اور اسی طرح جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ دوزخی۔ بات یہ ہے کہ دارومدار صرف خاتمہ پر ہے (اس وقت جیسے عمل ہوں) (متفق علیہ)

وفي لفظ عند مسلم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان الرجل ليعمل عمل اهل الجنة فيما يبدو للناس و هو من اهل النار و ان الرجل ليعمل عمل اهل النار فيما يبدو للناس و هو من اهل الجنة.

(۹۲۷) وَ عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى

(۹۲۷) ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

---

(۹۲۶) * اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ وہی ہوتا ہے جو قضاء قدر کر چکی ہے رہے اعمال ظاہری تو وہ انسان کے اچھے اور برے ہونے کی صرف ظاہری نشانیاں ہیں' اسی کے مناسب ایک حدیث آپ جلد ثانی میں پڑھ چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی راہ خدا میں جانبازی دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہاں اچھے اعمال سے حسن خاتمہ کی امید اور برے اعمال سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ضرور ہوتا چاہیے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جہان میں فیصلہ بیشتر عمل کے تابع رکھا گیا ہے لہذا جس کو جنت عطا فرمائیں گے اس سے عمل بھی اہل جنت کے کرائیں گے اور جس کو بخشنا منظور نہیں اس سے پہلے اعمال بھی اسی کے مناسب کرا لیے جائیں گے تاکہ اعمال اور جزاء کے درمیان ظاہری تناسب بھی باقی رہے اگرچہ وہ اصل علت نہ سہی۔ حق تعالیٰ اچھے عمل والے کو دوزخ میں اور برے عمل والے کو جنت میں بھی داخل فرما سکتا ہے' مگر وہ خود یہ خبر دے چکا ہے کہ وہ ایسا کرے گا نہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو دوزخی ہو اس عمل بھی اہل دوزخ کے سے کرا لیے جائیں تاکہ عمل و جزاء کے مابین مماثلت باقی رہے۔ صحیح مسلم میں یہ لفظ ہیں: ان الرجل ليعمل عمل اهل الجنة فيما يبدو للناس. یعنی ایک شخص لوگوں کو جنتی شخص کے سے عمل کرتا نظر آتا ہے گویا حقیقت کی انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ دوزخی ہے' پس جب مدار خاتمہ پر رہا تو اب ظاہر پر قطعی حکم کیسے لگایا جائے' اسی حدیث نے اولیاء اللہ کا خون پانی بنا رکھا ہے' کیونکہ یہ خبر کس کو ہے کہ اس کا خاتمہ کیسے اعمال پر ہوگا اور اسی خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیل القدر صحابی بھی یہاں گریہ وزاری میں مبتلاء ہے۔ دیکھو حدیث ۹۲۸۔

(۹۲۷) * سیاہ و سفید شاید یہ عالم تقدیر میں کامیاب و ناکامیاب کے رنگ مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں شاید اس وقت ارواح کو کسی خاص قسم کا مختصر سا جسم بھی مرحمت کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ بعض علماء نے اس کا نام ہی عالم ذر رکھ دیا ہے۔

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ حِیْنَ خَلَقَہٗ فَضَرَبَ کَتِفَہٗ مَالْیُمْنٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً بَیْضَاءَ کَاَنَّھُمُ الذَّرُّ وَ ضَرَبَ کَتِفَہُ الْیُسْرٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً سَوْدَاءَ کَاَنَّھُمُ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِیْ فِیْ یَمِیْنِہٖ اِلَی الْجَنَّۃِ وَ لَا اُبَالِیْ وَ قَالَ لِلَّذِیْ فِیْ کَتِفِہِ الْیُسْرٰی اِلَی النَّارِ وَ لَا اُبَالِیْ. (رواہ احمد)

کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کے دائیں بازو پر ایک ضرب لگائی تو اس سے سفید رنگ کی ایسی چھوٹی چھوٹی ذریۃ نکالی جیسی چیونٹی پھر بائیں بازو پر ضرب لگائی تو سیاہ رنگ کی ایسی ذریۃ نکالی جیسا کوئلہ پھر دائیں طرف والی کو فرمایا کہ یہ جنت میں جائیں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں اور جو بائیں جانب تھے ان کو فرمایا کہ یہ دوزخ میں جائیں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

(۹۲۸) وَ عَنْ اَبِیْ نَضْرَۃَ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لَہٗ اَبُوْ عَبْدِاللّٰہِ دَخَلَ عَلَیْہِ اَصْحَابُہٗ یَعُوْدُوْنَہٗ وَھُوَ یَبْکِیْ فَقَالُوْا لَہٗ مَا یُبْکِیْکَ اَلَمْ یَقُلْ لَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِکَ ثُمَّ اَقِرَّہٗ حَتّٰی تَلْقَانِیْ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَبَضَ بِیَمِیْنِہٖ قُبْضَۃً وَ اُخْرٰی بِالْیَدِ الْاُخْرٰی وَ قَالَ ھٰذِہٖ لِھٰذِہٖ وَ ھٰذِہٖ لِھٰذِہٖ وَ لَا اُبَالِیْ وَ لَا اَدْرِیْ فِیْ اَیِّ الْقُبْضَتَیْنِ اَنَا. (رواہ احمد. و قال الهیثمی رجاله رجال الصحیح)

(۹۲۸) ابونضرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ایک شخص کے پاس جس کی کنیت ابوعبداللہ تھی عیادت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئے تو اس وقت وہ رو رہے تھے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رونے کا سبب پوچھا اور کہا کیا تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنی لبیں تراشتے رہنا اور اسی طریق پر ہمیشہ قائم رہنا یہاں تک کہ مجھ سے آملو انہوں نے کہا کیوں نہیں ضرور فرمایا تھا' لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے بھی خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک مٹھی بھری اور دوسری دوسرے ہاتھ سے پھر فرمایا کہ یہ دائیں مٹھی والے تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ بائیں والے دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ دوستو! مجھے کیا علم ہے کہ میں اس کی کس مٹھی میں آ گیا۔

(۹۲۹) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ قَتَادَۃَ السُّلَمِیِّ

(۹۲۹) عبدالرحمٰن بن قتادہ سلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ

---

(۹۲۸) ٭ تقدیر کی قہرمانی کا جس کسی کے دل پر ایسا تسلط ہو وہی اس کا ادراک بھی کر سکتا ہے کہ اس ہیبت کے سامنے کیا کسی کا حافظہ ساتھ دیا کرتا ہے یا سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے اور صرف ایک دعاء کے سواء کچھ بن نہیں آتی۔ جو قلوب اس خشیت سے خالی ہیں وہ اس کو کیا سمجھیں۔ یہاں انکشاف حال سے قبل اطمینان کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ جب صحابی کا یہ حال ہو تو عامہ مومنین کا حال کیا ہونا چاہیے۔ اللھم اقسم لنا من خشیتک ما تحول بہ بیننا و بین معا صیک.

(۹۲۹) ٭ ان تمام احادیث کے آخر میں لفظ "لا ابالی" (ہمیں کوئی پرواہ نہیں) حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کے اظہار کے لیے بیان ہوتا جا رہا ہے وہاں نہ اس کی پرواہ ہے کہ جنتیوں پر اس انعام و اکرام کا انتظام کہاں سے ہوگا اور نہ اس کا غم ہے کہ یہ سارے جہنمی مل کر ہمارے خلاف کیا سازش بنائیں گے۔

سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ مِنْ ظَهْرِهٖ ثُمَّ قَالَ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ لَا اُبَالِيْ وَ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَ لَا اُبَالِيْ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَعَلٰى مَاذَا نَعْمَلُ قَالَ مُوَافَقَةَ الْقَدَرِ. (رواه الحاكم قال الذهبي على شرطهما الى الصحابي)

صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اس کے بعد ان کی پشت سے ان انسانوں کو نکالا اور فرمایا یہ تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اس پر کسی نے عرض کی یا رسول اللہ معاملہ جب یوں ہے تو اب عمل کس لیے؟ فرمایا وہ تو تقدیر میں لکھے جا چکے۔ (اس کے موافق ہو کر رہیں گے) (مستدرک)

(۹۳۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ فِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اَسْمَاءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَ اَسْمَاءُ اٰبَاءِ هِمْ وَ قَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَ لَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهٖ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اَسْمَاءُ اَهْلِ النَّارِ وَ اَسْمَاءُ اٰبَاءِ هِمْ وَ قَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَ لَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا فَقَالَ اَصْحَابُهٗ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَ اَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَ قَارِبُوْا فَاِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَ اِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ وَ اِنَّ

(۹۳۰) عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں لیے ہوئے باہر تشریف لائے اور فرمایا جانتے ہو یہ کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہمیں کیا پتہ آپ ہی بتائیں تو کچھ پتہ چلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں تھی' یہ وہ کتاب ہے جس میں پروردگار عالم نے تمام جنتی اشخاص کے نام اور ان کے باپ دادوں کے اور قبیلوں کے نام لکھ دیئے ہیں۔ اور آخر میں ان کی میزان بھی لگا دی ہے اب اس میں نہ کسی اور نام کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ کمی ہو سکتی ہے پھر جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں ہاتھ میں تھی اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ وہ کتاب ہے جس میں تمام دوزخی اشخاص کے نام ہیں اور ان کے باپ دادوں اور قبیلوں کے نام ہیں۔ ان کے آخر میں بھی میزان لگا دی ہے اب اس میں بھی کسی نام کا اضافہ اور کمی نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے فرمایا رسول اللہ اگر دوزخی اور جنتی ہونا پہلے سے لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کرنے کا کیا فائدہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلند پروازیاں چھوڑو اور سیدھے سیدھے عمل کیے جاؤ' کیونکہ جنتی

---

(۹۳۰) * اس حدیث کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں جو دو کتابیں تھیں وہ حقیقتاً دو کتابیں ہی تھیں۔ حدیث کے الفاظ از اوّل تا آخر بار بار پڑھیے ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو یہ خیال نہیں آ سکتا کہ یہاں راوی نے کسی حقیقت کو مجازی صورت سے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے' پھر جب کہ نبی کا تعلق خود عالم غیب سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو جنت کے باغوں میں سے انگور کا خوشہ توڑ لائے اور ہم کو دے دے' چاند کی طرف اشارہ کرے تو اس کے دو ٹکڑے کر دے' انگلیوں کو جھکا دے تو اس سے چشمے ابلے.....

صَاحِبِ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ وَ اِنْ عَمِلَ اَىَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ. (رواه الترمذى)

شخص کا خاتمہ ایسے ہی اعمال پر ہوگا جو دوزخی اشخاص کے ہوتے ہیں اگر چہ اس سے قبل کیسے ہی اچھے کام کرتا ہو- اس کے بعد آپ نے اشارہ کر کے دونوں کتابوں کو اپنے پیچھے کی طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ تمہارا پروردگار سب کچھ لکھ لکھا کر فارغ ہو چکا' بس اسی کے مطابق اب کچھ لوگ جنت میں چلے جائیں گے اور کچھ دوزخ میں- (ترمذی شریف)

(٩٣١) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىْ رَجُلٌ شَابٌّ وَ اَنَا اَخَافُ عَلٰى نَفْسِى الْعَنَتَ وَ لَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ فَسَكَتَ عَنِّىْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّىْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّىْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰى ذٰلِكَ اَوْ ذَرْ. (رواه البخارى)

(٩٣١) ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں- میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں نوجوان شخص ہوں عورتوں سے نکاح کے مصارف میرے پاس نہیں مجھے اپنے نفس پر کسی مصیبت میں مبتلاء ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے (اجازت ہو تو خصی ہو جاؤں) یہ سن کر آپ خاموش رہے' میں نے پھر عرض کی آپ پھر خاموش ہو رہے میں نے پھر مکرر عرض کی اور پھر بدستور خاموش رہے (ابو ہریرہ کا منشاء یہ تھا کہ آپ ان کو خصی ہونے کی اجازت دے دیں) جب میں نے چوتھی بار وہی سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا- تمہیں جس جس مصیبت میں بھی گرفتار ہونا ہے وہ تو تقدیر کا قلم لکھ لکھا کر فارغ بھی ہو چکا' اب چاہو تو خصی ہو جاؤ اور چاہے رہنے دو- (بخاری شریف)

ﷲ ...... پھوٹ نکلیں اگر ایسے ہاتھوں میں آپ دو کتابوں کا ذکر سنتے ہیں تو اس پر چونکتے کیوں ہیں اور کیوں اس کی تاویل کی فکر میں پڑ جاتے ہیں جو لوگ عالم غیب پر ایمان نہیں رکھتے وہ اسی ایک جگہ کیا ہر جگہ عالم تردد ہی میں پڑے رہتے ہیں ان کا غم نہ کھائیے- ان کے تو یہ بھی فہم سے بالاتر ہے کہ اتنی غیر متناہی مخلوق کے اسماء کے لیے اتنا مختصر دفتر کیسے ہو سکتا ہے' وہ صرف دنیا کا شارٹ ہینڈ ہی جانتے ہیں' وہ مسکین کیا جانیں کہ غیب کے اختصار و طول کا عالم کیا ہوتا ہے ﴿وان یوما عند ربک کالف سنة مماتعدون﴾ نبی کی پر اسرار ہستی اگر عالم غیب کی دو کتابیں اپنے ہاتھوں میں لے آتی ہے اور ایک اشارہ سے پھر انہیں عالم غیب میں پہنچا دیتی ہے تو اس کو بسر و چشم قبول کر لیجئے اور فکر یہ کیجئے کہ معلوم نہیں آپ کا نام کس فہرست میں درج ہو چکا ہے-

یہاں کمی وبیشی کے لیے جتنے احتمال ہو سکتے تھے سب کو ذکر کر کے میزان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح اس صورت میں زیادتی کمی کا کوئی موقع نہیں رہتا اسی طرح اب نئے جنتی اور نئے دوزخی بننے کا بھی کسی کے متعلق کوئی احتمال باقی نہیں رہا- قضاء و قدر کی قہرمانی اور تسلط کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے-

(٩٣١) ✽ آپ کی بار بار کی خاموشی بتا رہی تھی کہ منشاء مبارک کیا ہے مگر حاجت مند اور حکم کا منتظر چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی ہو اگر اس کو خصی ہو جانے کی صراحۃً اجازت مل جائے تو وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے زناء جیسی مصیبت سے بچ رہے- سبحان اللہ معصیت سے صحابہؓ کے تنفر کا عالم بھی کیا تھا- حضرت ابو ہریرہؓ کی زناء سے اس درجہ نفرت گو قابل داد تھی مگر ان کے بار بار اصرار سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ﷲ .....

(۹۳۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِيْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ يُصَرِّفُهُ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ. (رواه مسلم)

(۹۳۲) عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام انسانوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو پھیر سکتا ہے' اس کے بعد آپ نے یوں دعا فرمائی اے دلوں کے لوٹنے پلٹنے والے ہمارے دلوں کو تو اپنی تابعداری ہی کی طرف جھکائے رکھنا-

(مسلم شریف)

(۹۳۳) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ اَنْ يَقُوْلَ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِكَ وَ بِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ.

(رواه الترمذی و ابن ماجه)

(۹۳۳) انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات یوں دعا فرماتے اے قلوب کے پلٹنے والے میرے قلب کو اپنے دین پر جمائے رکھ' ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا نبی اللہ ہم تو آپ پر اور آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لا چکے ہیں کیا آپ کو ہمارے متعلق اب بھی کوئی خطرہ باقی ہے- آپ نے فرمایا ہاں قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں ان کو جیسے چاہے پلٹ سکتا ہے-

(ترمذی و ابن ماجہ)

ﷺ ..... وہ اپنی اس تدبیر سے گویا تقدیر کو بھی پلٹ دیں گے' اس لیے صاحب شریعت نے بڑے تاثر کے انداز میں فرمایا: ابو ہریرہ! تقدیر کے سامنے تدبیر کی کچھ پیش نہیں جاتی 'تقدیر کا قلم چل چکا ہے- اب اگر تمہاری قسمت میں زنا لکھا جا چکا ہے تو وہ ہو کر رہے گا اور اگر مقدر نہیں ہوا تو پھر اگر خصی نہ بھی ہو گے جب بھی نہیں ہو سکتا' اب چاہو تو خصی بن جاؤ اور چاہو تو رہنے دو- آپ کے جملوں کے بعد قضاء وقدر کی گرفت کا جتنا اثر ہو سکتا تھا ظاہر ہے- اس لیے اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ کو آئندہ سوال کی نہ جرأت ہوئی نہ ضرورت رہی- دوسری جگہ حدیثوں میں موجود ہے کہ اس قسم کی ضرورت کے وقت شریعت نے روزہ رکھنے کی تعلیم فرمائی ہے- روزہ اگر ہماری سی سحری و افطاری کے ساتھ نہ ہو تو اس خواہش کے قطع کرنے کا بہترین علاج ہے- اس کے بعد ایسے خلاف فطرت فعل کا حاصل کیا؟

(۹۳۲) * حق تعالیٰ کی علی الاطلاق قدرت اور بندہ کی انتہائی بے چارگی اور بے بسی کا نقشہ اس سے زیادہ مؤثر اور مختصر انداز میں اداء نہیں کیا جا سکتا- ایک نیم مختار انسان جب کبھی اپنے اختیار کلی کے اظہار کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کے سامنے انگلیوں کا اشارہ کر کے ہی اس کو سمجھاتا ہے- یہاں اسی معہود طریقہ کو استعمال کیا گیا ہے- حق تعالیٰ اعضاء سے منزہ و مبرأ ہے- احادیث میں بندہ کو مختار ثابت کیا گیا ہے مگر ایسا مختار جس کے اوپر قدرت کا اختیار اس طرح مسلط ہے کہ اس کے بعد اس اختیار کی ہستی فناء ہو جاتی ہے اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس اعتقاد کے بعد انسان کی زبان پر جو بے ساختہ درخواست آنی چاہیے وہ سب سے پہلے ایک یہی- پروردگار! ہمارے دلوں کو اپنی تابعداری کی طرف ہی جھکائے رکھنا-

(۹۳۳) * یہاں صحابہ کرام کے فہم وادب پر بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء سنتے ہیں آپ ﷺ .....

(۹۳۴) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِیْشَةٍ بِاَرْضٍ فَلَاةٍ یُقَلِّبُهَا الرِّیَاحُ ظَهْرًا لِبَطْنٍ. (رواه احمد و ابن ماجة و فی الزوائد اسناده ضعیف ففیه یزید الرقاشی و قد اجمعو اعلٰی ضعفه)

(۹۳۴) ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- انسان کے قلب کی مثال اس پر کی سی ہے جو بیابان زمین میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اس کو کبھی سیدھا اور کبھی الٹا کر رہی ہوں-

(ابن ماجہ' مسند امام احمد)

(۹۳۵) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَتَذَاكَرُ مَا یَكُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ فَاِنَّهٗ یَصِیْرُ اِلٰی مَا جُبِلَ عَلَیْهِ.

(۹۳۵) ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں کے عادات و اخلاق کے متعلق کچھ ذکر کر رہے تھے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کر لینا اور اگر یہ سنو کہ کسی شخص کی فطری عادات بدل گئی ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنا- آخر کار ایک دن وہ پھر ان ہی خصائل کی طرف لوٹے گا جس پر کہ اس کی پیدائش ہوئی ہے- (احمد)

(رواه احمد قال الهیثمی و رجاله رجال الصحیح الاان الزهری لم یدرك ابا الدرداء)

لله ..... کے حق میں اور سمجھتے ہیں اپنے حق میں' اسی لیے سوال یہ کرتے ہیں کہ جب ہم آپ پر ایمان لا چکے تو کیا پھر بھی آپ کو ہمارے متعلق کوئی خطرہ ہے- آپ کا جواب یہ ہے جی ہاں مقام صحابیت پر فائز ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص قضاء و قدر کے قاہرانہ تصرف سے نڈر نہیں ہوسکتا- خوف کی بات بہر حال خوف ہی کی رہتی ہے شانِ بندگی اسی میں ہے کہ کسی بلند سے بلند مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی مختار کل کے اختیار سے ڈرتا رہے- اس جگہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ صحابہ کرامؓ جو بڑی حد تک ان خطرات سے مامون تھے جب ان کے متعلق بارگاہِ نبوت سے جواب یہ ملا تو پھر ماوشما کا تو ذکر ہی کیا ہے-

(۹۳۴) * ایک وسیع جنگل میں تند و تیز ہوا اور ایک ذرا سے پر کا بھلا کیا مقابلہ لیکن پھر یہ دونوں مخلوق ہی مخلوق ہیں اور دونوں کے دونوں محکوم ہی محکوم ہیں- قلوب بنی آدم کی جو نسبت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے وہ تو خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کی ہے یہاں اس بے چارگی کا اندازہ ہی کیا لگایا جاسکتا ہے' یہاں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو عدم کو وجود سے' لیکن احادیث میں بسا اوقات حقیقت سے ہٹ کر محاورات کے مطابق کلام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد تفہیم و تعلیم ہوتا ہے انسان جتنا جلد اپنے محاورات سے کسی حقیقت کو سمجھ سکتا اور متاثر ہوسکتا ہے اتنا وہ فلسفیانہ تعبیرات سے کسی حقیقت کو نہیں پاسکتا اور نہ ان سے متاثر ہوسکتا ہے- اسی لیے کہیں احادیث میں اصابع (انگلیوں) کا لفظ بھی آیا ہے اور کہیں مذکورۂ بالا حدیث کے اندازِ بیان کو اختیار کیا جارہا ہے تاکہ ان امثال سے انسان اپنی بے چارگی کا اندازہ لگا سکے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کی بالادست قدرت و اختیار کے سامنے جتنا اسے جھکنا چاہیے جھک جائے-

(۹۳۵) * انسان کی عادات و اخلاق بھی چونکہ کاتب تقدیر کے قلم کے نیچے آچکی ہیں اس لیے جس طرح قضاء و قدر کے دوسرے شعبوں میں تبدیلی و ترمیم نہیں ہوسکتی اسی طرح اس میں بھی نہیں ہوسکتی اسی لیے مشہور ہے: ''جبل گردد و جبلی نہ گردد'' عقلاء کے مابین ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث ہے کہ اخلاق کسبی ہیں یا خلقی؟ اس حدیث سے اس پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے- غرض انسانی اختیار کا افسانہ جتنا اس لله ....

(۹۳۶) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ يَعْنِيْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَذَكَرَ الْقَوْمُ رَجُلًا فَذَكَرُوْا مِنْ خُلُقِهِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ أَرَأَيْتُمْ لَوْ قَطَعْتُمْ رَأْسَهُ أَكُنْتُمْ تَسْتَطِيْعُوْنَ اَنْ تُعِيْدُوْهُ قَالُوْا لَا قَالَ فَيَدَهُ قَالُوْا لَا قَالَ فَرِجْلَهُ قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تُغَيِّرُوْا خُلُقَهُ

(رواه الطبرانی قال الهیثمی و رجاله ثقات)

(۹۳۶) عبداللہ بن ربیعہ روایت کرتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے لوگوں نے ایک شخص کا ذکر کیا اور اسی ضمن میں اس کے عادات و اخلاق کا ذکر بھی آ گیا - اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: تم لوگ بتاؤ اگر تم اس کا سر کاٹ دو تو کیا اس کو پھر جوڑ سکتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں - فرمایا اچھا اگر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو تو کیا پھر اس کو جوڑ سکتے ہو؟ وہ بولے نہیں - آخر میں فرمایا اچھا پیر؟ انہوں نے کہا یہ بھی نہیں - فرمایا اگر تم یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو یاد رکھو اسی طرح اس کے عادات و اخلاق کو بھی بدل نہیں سکتے - (طبرانی)

(۹۳۷) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَتْ اُمُّ حَبِيْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اَمْتِعْنِيْ بِزَوْجِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَ بِاَبِيْ اَبِيْ سُفْيَانَ

(۹۳۷) عبداللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ام حبیبہ زوجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ دعا مانگی کہ الٰہ العالمین میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے والد ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ کا سایہ مدت دراز تک مجھ پر قائم رکھنا - یہ دعا سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

للہ ..... عالم میں گرم ہے عالم غیب میں وہ اتنا ہی سرد ہے - یہ قدرت کا کمال ہی کمال ہے کہ جو سرتا پا مجبور ہے وہ مختار ہی مختار نظر آتا ہے -

(۹۳۶) * اس حدیث سے اوپر کی حدیث کی ذرا اور تشریح ہو جاتی ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا گیا ہے - ابودرداء کی اوپر والی حدیث میں ایک نہایت لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ حدیث میں ''جبل'' کا لفظ استعمال کیا ہے ''جبر'' کا نہیں استعمال کیا گویا بندہ خیر و شر پر مجبول یعنی مخلوق تو ہوتا ہے مگر ان پر مجبور نہیں ہوتا - بے شک جیسا حدیث میں انسان کا انجام وہی ہوگا جس پر وہ مخلوق ہوا ہے مگر اس سے خیر و شر کا ظہور ہوگا بالاختیار ہی اس لیے اس کو مجبول تو کہا جائے گا لیکن مجبور نہیں کہا جا سکتا - دیکھو شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۳۷۳ -

(۹۳۷) * دیکھئے یہاں بھی حضرت ام حبیبہؓ کی دعاء کچھ ایسی دعاء نہ تھی جس کو انسان کی فطرت نہ کہا جا سکے لیکن صاحب نبوت کو یہاں ایک دوسرا تاثر پیدا کرنا تھا جو انسان کی فطرت میں خود بخود موجود نہیں ہوتا' ہاں نبی جیسا معلم اس کو پیدا کر دیتا ہے - کسی بی بی کے پہلو میں اپنے محبوب ترین شوہر' کسی لڑکی کے دل میں اپنے مکرم ترین والد اور کسی ہمشیرہ کے قلب میں اپنے عزیز ترین بھائی کی حیات کے کتنے ارمان ہو سکتے ہیں یہ ظاہر ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سارے جذبات کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیتے ہیں کہ یہ تو سب طے شدہ باتیں ہیں' جس کا جتنا رزق جس کی جتنی عمر اور جو وقت موت لکھ دیا گیا ہے اس سے ایک انچ بھر بھی اس سے تجاوز نہیں ہو سکتا - یہ دعاء مانگی اتنی اہم نہیں' اہم یہ ہے کہ دوزخ یا قبر کے عذاب سے نجات کی دعاء مانگی جائے' حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پہلی باتیں مقدر ہو چکی ہیں عذاب و ثواب کا مسئلہ بھی مقدر ہو چکا ہے مگر انسان کو اس کا علم تو حاصل ہوتا ہے لیکن اس دعاء کے لیے اس کے قلب میں وہ جذبات نہیں اٹھتے جو شوہر یا والد کی درازیٔ عمر کے لیے اٹھتے ہیں آپ چاہتے ہیں کہ آخرت کا استحضار اتنا ہو کہ دعاء کے موقعہ پر عزیز سے عزیز کی درازیٔ عمر سے پہلے اپنی آخرت کا تصور آ جائے اور اس طرح شریعت اُس جگہ آ جائے جہاں انسان کی فطرت ہوتی ہے - جب آخرت کا استحضار اتنا نصیب للہ .....

وَ بِاَخِيْ مُعَاوِيَةَ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَأَلْتِ اللّٰهَ لِاٰجَالٍ مَضْرُوْبَةٍ وَ اَيَّامٍ مَعْدُوْدَةٍ وَ اَرْزَاقٍ مَقْسُوْمَةٍ لَنْ يُعَجِّلَ شَيْئًا قَبْلَ حِلِّهٖ اَوْ يُؤَخِّرَ شَيْئًا عَنْ حِلِّهٖ وَ لَوْ كُنْتِ سَأَلْتِ اللّٰهَ اَنْ يُعِيْذَكِ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ اَوْ عَذَابٍ فِي الْقَبْرِ كَانَ خَيْرًا اَوْ اَفْضَلَ. قَالَ وَ ذُكِرَتْ عِنْدَهُ الْقِرَدَةُ قَالَ مِسْعَرٌ وَ اُرَاهُ قَالَ وَ الْخَنَازِيْرُ مِنْ مَسْخٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ لِمَسْخٍ نَسْلًا وَ لَا عَقِبًا وَ قَدْ كَانَتِ الْقِرَدَةُ وَ الْخَنَازِيْرُ قَبْلَ ذٰلِكَ.

(رواہ مسلم)

تم نے اللہ تعالیٰ سے دعاء تو کی مگر ایسی مدتوں کے لیے جو پہلے سے مقرر شدہ ہیں- ان کی زندگی کے ایام سب شمار کیے جا چکے ہیں' ان کے رزق بھی سب تقسیم شدہ ہیں اللہ تعالیٰ وقت سے پہلے ان میں سے نہ کسی چیز کو مقدم کرے گا اور نہ وقت کے بعد اس کو مؤخر کرے گا- کاش اگر تم دوزخ کے عذاب یا قبر کے عذاب سے پناہ مانگتیں تو اس سے بہتر رہتا (یہاں راوی کو خیر یا افضل کے لفظ میں تردد ہو گیا ہے) راوی کہتا ہے کسی شخص نے اس وقت بندروں کا ذکر چھیڑ دیا کہ کیا وہ مسخ شدہ قوم ہے' مسعر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ سؤروں کے متعلق بھی ذکر آیا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی مسخ شدہ قوم کی نسل جاری نہیں کی اور نہ وقت مقرر کے بعد ان میں سے کسی کو باقی رکھا ہے- آخر بندر اور سور ان سے پہلے بھی تو ہوا کرتے تھے- (مسلم شریف)

لے ..... ہو جائے تو اب امید کرنی چاہیے کہ وہ جاں کنی کی تکالیف میں' ملک الموت کی ہیبت' شیطان کے اغواء اور منکر ونکیر کے سوال کے وقت بھی ان شاء اللہ تعالیٰ صحیح وسالم رہے گا- قضاء وقدر کے تسلط اور آخرت کی اہمیت ذہن نشین کرنے کا یہ بھی کیا نرالا انداز ہے- موت کی گھڑیاں بھی کیسی گنی چنی ہوتی ہیں کہ آپ نے جلد اول حدیث نمبر ۸۳ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ملاحظہ فرمایا ہوگا- دیکھیے حق تعالیٰ کو اپنے نبی کی یہاں کتنی خاطر داری بھی منظور ہے اس لیے یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ ایک بیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آجائیں گے اتنے سال تمہاری عمر اور ہوگی' مگر اس کے بعد بھی موت کا وقتِ مقرر نہیں ٹلتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ جب اتنے سالوں کے گزرنے کے بعد بھی موت سے چارہ نہیں ہے تو پھر اس جام کو آج ہی کیوں نہ منہ سے لگا لیا جائے یہ کہہ کر وہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں- پس موت کا وقت نبی کا بھی ٹلا نہیں کرتا اور کسی کا تو ذکر [illegible] ہے- اب بھی آپ کچھ سمجھے کہ تقدیر کا جبر انسان کے اختیار پر کس طرح مسلط ہے اور وہ کتنی آسانی سے انسانی اختیار کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے دیکھیے ابھی ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی موت پر کیسے ناراض تھے یا ابھی کیسے خوش نظر آ رہے ہیں-

دوسرا مسئلہ یہاں مسخ شدہ قوموں کے متعلق تھا- سوال وجواب کے انداز سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جن حضرات نے مسخ سے معنوی مسخ اور طبائع کی کجی مراد لی ہے وہ محض باطل اور غلط خیال ہے اس بناء پر نہ کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ آپ ؐ کا جواب منطبق ہوتا ہے' ہاں یہ بات بھی مسلّم ہے کہ شکلیں اسی وقت مسخ کی جاتی ہیں جب کہ قلوب پہلے مسخ ہو جاتے ہیں- پس مسخ کا تعلق صرف ظاہر شکلوں ہی کے ساتھ نہیں ہوتا باطن پر [illegible] اس [illegible] پر [illegible] ہے اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ میں اسی طرف اشارہ ہے- انسان جب اپنے باطن بندر اور سؤر کے خصائل اختیار کر لے تو پھر اس کے لیے احسن تقویم کی صورت زیبا نہیں رہتی او مشیۃ الہیہ کبھی کبھی ان کے ظاہر کو بھی باطن کے ہم شکل بنا دیتی ہے تا کہ آئندہ انسان اس کے ذکر سے عبرت حاصل کرے-

(۹۳۸) عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ عَلَی الْمَرِیْضِ فَنَفِّسُوْالَهُ فِیْ اَجَلِه فَاِنَّ ذٰلِکَ لَایَرُدُّ شَیْئًا وَ یَطِیْبُ بِنَفْسِه . (رواه الترمذی و ابن ماجه و قال الترمذی غریب)

(۹۳۸) ابوسعید روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - جب تم کسی بیمار کی عیادت کو جایا کرو تو اس کی درازئ عمر کے کلمات کہا کرو کیونکہ تمہارے اس کہنے سے کچھ تقدیر تو بدلتی نہیں البتہ مریض کا دل خوش ہو جاتا ہے-

(ترمذی شریف - ابن ماجہ)

(۹۳۹) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَیْسٍ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ وَلَدَ جَعْفَرٍ تُسْرِعُ اِلَیْهِمِ الْعَیْنُ اَفَاسْتَرْقِیْ لَهُمْ قَالَ نَعَمْ فَاِنَّهٗ لَوْ کَانَ شَیْءٌ سَابِقُ الْقَدَرَ لَسَبَقَتْهُ الْعَیْنُ. (رواه الترمذی و احمد و ابن ماجه و قال الترمذی حسن صحیح)

(۹۳۹) اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جعفرؓ کے بچوں کو نظر بڑی جلدی لگ جاتی ہے کیا میں ان پر یہ منتر پڑھ سکتی ہوں؟ فرمایا پڑھ سکتی ہو کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر بھی غالب آ سکتی تو وہ نظر ہوتی -

(ترمذی - ابن ماجہ - احمد)

---

(۹۳۸) ٭ اسلام کو باہم مروت و اخلاق اور ہمدردی کی بھی کس حد تک رعایت منظور ہے کہ وہ ایک بیمار کے حق میں ایسے کلمات کہہ دیئے کی بھی اجازت دے دیتا ہے جن کے متعلق اگر کہیں صریح اجازت نہ آ جاتی تو شاید ممانعت کا شبہ لگ سکتا تھا - لیکن یہ انبیاء علیہم السلام کا کمال ہے کہ وہ عام تخاطب میں بھی اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کسی گوشہ سے بھی اسلام کے کسی اہم نقطہ نظر کو ٹھیس نہ لگنے پائے - دیکھئے یہاں کس طرح عیادت کے بیان میں تقدیر کا سبق تازہ کیا جا رہا ہے اور کس طرح تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ عالم ناقابل ترمیم ہے اور اس کے فیصلے سب اٹل ہیں لیکن جب وہ ہمارے علم میں نہیں تو پھر اگر کسی تعبیری طریقہ سے ہمارے بھائی کا دل خوش ہوتا ہے تو اس سے بخل کیوں کیا جائے مگر یہ نکتہ پھر فراموش نہ ہو کہ ہوگا یہ سب کچھ لفظی جمع خرچ' جو مقدر ہے وہی ہو کر رہے گا -

واضح رہے کہ اخلاق اس کا نام نہیں کہ محض کسی کا دل خوش کرنے کے لیے خلاف واقع کلمات کہہ دیئے جائیں یہ تو کذب ہے- اخلاق یہ ہے کہ جہاں ہمارا علم قاصر ہو وہاں ہم اللہ تعالیٰ سے اچھی ہی امید رکھیں اور وہی اپنی زبانوں سے نکالیں انا عند ظن عبدی بی - یہ تمام وسعتیں صرف اس لیے ہیں کہ تقدیر پردۂ غیب میں رکھی گئی اگر کہیں ظاہر کر دی جائے تو دنیا کی ساری چہل پہل ایک آن میں ختم ہو جائے - اس پر بھی عاقبت نااندیش انسان تقدیر ہی کے سراغ لگانے کی فکر میں پڑا رہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس کے حق میں اس کا اخفاء اس کے اظہار سے کہیں سودمند ہے-

(۹۳۹) ٭ نظر لگنے کی حقیقت کچھ بھی سہی لیکن ہے یہ امر واقعہ کہ نظر ضرور لگتی ہے- دو چار مغلوب العقل انسانوں کے صرف مذاق اڑا دینے سے ہزاروں انسانوں کے تجربے کی تکذیب نہیں کی جا سکتی حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس کے وجوہ و اسباب اور اس کی حقیقت پر بصیرت افروز بحث کی ہے- پھر جس طرح نظر لگنے کی حقیقت عام طور پر نہیں سمجھی جاتی اسی طرح اس کے علاج بھی اکثر اسی طرح کے کلمات ہیں جو بیشتر معقول المعنی نہیں ہوتے اس قسم کے مقامات پر حدیث کا رویہ کتنا معتدل ہے کہ وہ نہ تو واقعات کا انکار کرتی ہے اور نہ غیر معقول امور کی حقیقت کے دریافت کے درپے ہوتی ہے- بلکہ اس امر کے متعلق جو عوام کا دستور چلا آتا ہے اگر اس میں کوئی شرعی سقم نہیں تو .....

(۹۴۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا وَ كَادَ الْحَسَدُ اَنْ يَّغْلِبَ الْقَدَرَ.

(رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

(۹۴۰) انس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے احتیاج میں کفر تک نوبت پہنچ سکتی ہے اور حسد ایسی سخت چیز ہے کہ کہیں تقدیر پر بھی غالب نہ آ جائے۔

(شعب الایمان)

یمحوا الله مایشاء و یثبت و عنده ام الکتاب

حق تعالی کے علم ازلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قضاء وقدر کے تحتانی مراتب میں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے

(۹۴۱) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهٖ كُلُّ نَسَمَةٍ

(۹۴۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالی نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کر لیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نسل سے جتنی اولاد اس کو تا قیامت پیدا کرنی تھی

بقیہ ...... ہوتا تو اس میں دست اندازی نہیں کرتی۔ اسی ضابطہ کے مطابق نظر لگنے کا معاملہ بھی ہے اہل تجربہ کے نزدیک جو کلمات یا جو طریقے اس بارے میں مفید ثابت ہو چکے ہیں اگر وہ کلمات شرکیہ پر مشتمل نہ ہوں تو یہ صرف ایک علاج کے طور پر ہوں گے اس لیے شریعت ان سے ممانعت بھی نہیں فرماتی اور نہ ان کے استعمال کی رغبت دلاتی ہے۔ نظر اور سانپ بچھو کا کاٹا یہ سب ایسی موذی چیزیں ہوتی ہیں کہ اس میں مریض طبیب کا انتظار بھی نہیں کر سکتا اور ان میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر جھاڑ پھونک فوری فائدہ بخش ہو جاتی ہیں کہ اس میں مریض طبیب کا انتظار بھی نہیں کر سکتا اور ان میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر جھاڑ پھونک فوری فائدہ بخش ہو جاتے ہیں اس لیے ایسے مواقع پر جھاڑ پھونک سے آپؐ نے روکا بھی نہیں اور اجازت دے دی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمادی کہ چونکہ نظر کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اگر تقدیر بھی کسی چیز سے بدل سکتی تو نظر سے بدل جاتی۔ اس لیے اس بارے میں اپنے تجربوں پر عمل کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ ممنوعات شرعیہ سے خالی ہوں۔

(۹۴۰) * فقر جب حد سے تجاوز کر جائے تو اس کا نتیجہ کبھی کفر کی صورت میں بھی نکل آتا ہے۔ دوسری چیز جو انتہاء درجہ خطرناک ہے وہ حسد ہے اسی لیے سورۂ فلق میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم کی گئی ہے اس کی تاثیر کو اس انداز میں ادا کیا گیا ہے کہ جو چیز کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی وہ تقدیر ہے کہ سب اس کے زیر اثر ہیں اور وہ کسی کے زیر اثر نہیں اور حقیقت ہے بھی یہی کہ جو علم الٰہی ہے وہ کسی کے زیر اثر ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز تقدیری فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی تو وہ حسد ہوتا۔ سلسلہ اسباب و مسببات میں انسانی عزائم کو بڑا دخل ہی حاسد کا نفس جب ہمہ وقت پوری عزیمت کے ساتھ کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو یہاں بھی ایسے ایسے شگوفے کھلنے لگتے ہیں جس سے شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید تقدیر ہی بدل دی گئی ہے۔

(۹۴۱) * تقدیر کی کتابت کے پانچ نمبروں میں سے یہ وہی دوسرا نمبر ہے جس کو ابھی آپ حدیث کی شرح میں بحوالہ حضرت شاہ ولی اللہؒ پڑھ چکے ہیں۔ اس سے پہلا مرتبہ علم الٰہی کا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس مرتبہ کے لحاظ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہی کی تھی، مگر اس حساب سے ۶۰ + ۴۰ = ۱۰۰۔ یعنی حق تعالی جس کو عالم کا ذرہ ذرہ روشن ہے یہ جانتا تھا کہ آئندہ واقعہ اس طرح پیش بقیہ ......

هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ جَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ اِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَ بِيْصًا مِنْ نُوْرٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى اٰدَمَ فَقَالَ اَیْ رَبِّ مَنْ هٰؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَاٰى رَجُلًا مِنْهُمْ فَاَعْجَبَهُ وَ بِيْصُ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ اَیْ رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ دَاوٗدُ فَقَالَ اَیْ رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ قَالَ سِتِّيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِیْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ اٰدَمَ اِلَّا اَرْبَعِيْنَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ اٰدَمُ اَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِیْ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ اَوَلَمْ تُعْطِ ابْنَكَ دَاوٗدَ فَجَحَدَ اٰدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَ

وہ سب ظاہر ہوگئی' ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک چمکتا چمکتا نور پیدا فرمایا اور اس کے بعد ان سب کو آدم علیہ السلام کے سامنے حاضر کیا- آدم علیہ السلام نے عرض کی پروردگار یہ لوگ کون ہیں؟ ارشاد ہوا یہ تمہاری ہی اولاد ہے- آدم علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو ایک شخص کی آنکھوں کے درمیان چمکتا ہوا نور ان کو بہت پیارا معلوم ہوا- عرض کی پروردگار یہ کون ہیں ارشاد ہوا داؤد (نبی اللہ علیہ السلام) عرض کی پروردگار تو نے ان کی کتنی عمر مقرر فرمائی ہے؟ ارشاد ہوا ساٹھ سال- عرض کی پروردگار ان کی عمر میں تو میری عمر میں سے چالیس سال اور بڑھا دے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب آدم علیہ السلام کی عمر پوری ہوگئی اور صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو تو ملک الموت قبض روح کے لیے ان کے پاس آ گئے- آدم علیہ السلام نے کہا ابھی تو میری عمر میں چالیس سال باقی ہیں- انہوں نے فرمایا کیا آپ وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش نہیں چکے- حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کر دیا- (باپ کے خصائل

ﷺ ..... آئے گا ان کی عمر میں چالیس سال کا اضافہ ہوگا اور مجموعہ سو ہو جائے گی- پس اگر اس تفصیل کو دیکھو تو یوں کہہ دو کہ چالیس سال کا اضافہ ہوا اور اگر نظر ذرا اس سے اور اوپر کر کے دیکھو تو حق تعالیٰ کے علم کے لحاظ سے آخری بات یہی تھی کہ ان کی عمر سو سال ہوگی' اس لیے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا-

یاد رہے کہ دوسرے مرتبہ کے اس ذرا سے ایر پھیر سے حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی میں اتنا نمایاں اثر پیدا ہوگیا کہ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد خلیفہ کا لقب صرف ان ہی کو دیا ہے- ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ ان کے علاوہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ظاہر ہے کہ سب انبیاءؑ خلیفۃ اللہ ہی تھے مگر چونکہ اصل خلیفۃ اللہ کی عمر کے چالیس سال صرف داؤد علیہ السلام ہی کو ملے تھے اس لیے تقدیر کی اس حقیقت کا اثر قرآنی الفاظ میں بھی اتنا سا نمایاں ہونا ضروری ہوا عالم غیب حقیقت ہی حقیقت کا عالم ہے وہاں جو بھی ہوتا ہے اس عالم میں اس کا اثر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا- رہا اس جگہ یہ سوال کرنا کہ کیا کسی اور نبی کی پیشانی کا نور اتنا پیارا نہ تھا یہ محض بے علمی کا سوال ہے- عالم غیب کی ساری تفصیل نہ ہم کو بتائی گئی ہے نہ اس کی ضرورت تھی- اس حدیث میں تمام انبیاء کی خصوصیات بیان کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا- قضاء وقدر کا یہ ایک واقعہ بھی کسی خاص مصلحت کے لیے معرض بیان میں آ گیا ہے- جو عالم ہم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور قصداً پوشیدہ رکھا گیا ہے- اس کی کچھ کچھ جزئیات اس لیے بھی ذکر کر دی جاتی ہیں کہ اس عالم کو اس عالم کی باتیں سن سن کر یہ تنبہ ہوتا رہے کہ اس عالم کے سواء کوئی اور دوسرا عالم بھی ہے اور اس طرح اس پر ایمان لانے میں مدد مل سکے-

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا- ترجمان السنہ جلد ثانی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب موت کا ﷺ .....

نَسِیَ اٰدَمُ فَاَکَلَ مِنَ الشَّجَرَۃِ فَنَسِیَتْ ذُرِّیَّتُہٗ وَ خَطَأَ اٰدَمُ وَ خَطَأَتْ ذُرِّیَّتُہٗ. (رواہ ترمذی)

اولاد میں ظاہر ہوا کرتے ہیں) اس لیے ان کی اولاد میں بھی کہہ کر مکر جانے کی عادت ظاہر ہوئی وہ بھولے تھے اور شجرۂ ممنوعہ کھالیا تھا اور خطاء کی تھی اس لیے اولاد میں بھی بھولنے اور خطاء کاری کی سرشت باقی رہی۔ (ترمذی)

(۹۴۲) عَنْ اِبْنِ شِهَابٍ قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَ ابْنُ حَزْمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى

(۹۴۲) ابن شہاب انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن حزم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (شب معراج میں) اللہ تعالیٰ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض فرمائیں جب میں ان کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا آپ (صلی

ﷺ ..... فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے اس کے تھپڑ مارا آخر میں بات یہاں پہنچی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ بیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آ جائیں اتنے سال تمہاری عمر۔ یہاں عمر کی زیادتی کا سوال ہی نہیں ہے کیونکہ جہاں یہ اختیار دیا گیا تھا اسی کے ساتھ ان کے اختیار کو اس طرف لگا دیا گیا تھا کہ وہ موت ہی کو اختیار فرمالیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس صورت سے نبی اولوالعزم کا اکرام بھی پورا ہو گیا اور جو تقدیر الٰہی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔

تنبیہ: مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے یہ لازم کر دیا گیا کہ آئندہ ملک الموت جس کی روح بھی قبض کرنے جائیں اپنی اصل صورت میں جائیں۔ اس سے یہ بات بھی حل ہوگئی کہ فرشتے پر اس رسول اولوالعزم کو غصہ آیا کیوں تھا یعنی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ بشری صورت پر حاضر ہوگئے تھے۔

(۹۴۲) * یہ حدیث بہت مجمل ہے تفصیلی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہر بار پانچ پانچ نمازوں کی معافی ہوتی رہی ہے اور جب پانچ ہی رہ گئی تھیں تو چلتے وقت کچھ ایسے کلمات ارشاد ہوگئے تھے جن سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس سے زیادہ تخفیف کی گنجائش نہیں رہی اس نکتہ کے سمجھ جانے کے بعد گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے واپس جانے کا اصرار بھی فرمایا اور یوں بھی امت کے حق میں تخفیف کے لیے آپ کے قلب مبارک میں نہ معلوم کتنے ارمان ہوں گے لیکن شانِ عبدیت حکم کے سامنے جھک گئی اور جو اتنی بار آمد و رفت سے نہ تھکے تھے وہ اس مرتبہ جانے میں شرم محسوس فرمانے لگے۔ سبحان اللہ! شانِ معبودیت بھی کیسی بلند ہے اور اس کے بالمقابل شانِ عبدیت بھی کتنی کامل ہے۔ ادھر جب آخری فیصلہ فرما دیتے ہیں تو پھر کوئی نہیں جو اس میں ذرا سی ترمیم بھی کرا سکے اور ادھر شانِ عبدیت کا کیا کمال ہے کہ جب آخری حکم ہونے کا احساس بھی ہو جاتا ہے تو پھر ترمیم کی درخواست پیش کرنے کے لیے قدم ہی نہیں اٹھتے اس لیے ایک طویل حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب ان کو جیل خانے سے نکلنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے تو یہ فرما دیا تھا کہ پہلے جا کر ان عورتوں کے حال کی تحقیق کرو جنہوں نے مجھے متہم کیا تھا۔ لیکن اگر یہی واقعہ مجھ کو پیش آتا تو میں تو فوراً اس بلانے والے کے ساتھ ساتھ ہو لیتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی آپ کی کمالِ عبدیت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک مشیت الٰہیہ جیل میں رکھتی جیل میں رہتا اور جب باہر نکالتی تو باہر نکل آتا۔ نہ عذر اس میں ہوتا نہ تاخیر اس میں ہوتی۔

عالم تقدیر میں ایک ترمیم و تبدیل کی شکل تو وہ تھی جو آپ نے ابھی پہلی حدیث میں پڑھی تھی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں چالیس سال کا اور اضافہ ہو گیا دوسری شکل یہ ہے کہ پچاس میں ترمیم ہو کر پانچ رہ گئیں مگر اس کے باوجود ایک لحاظ سے وہ پچاس ہی رہیں۔ غور ﷺ .....

مر بموسى عليه السلام قال ما فرض ربك على امتك قلت فرض عليهم خمسين صلوة قال موسى فراجع ربك عزوجل فان امتك لاتطيق ذلك فراجعت ربى عزوجل فوضع شطرها فرجعت الى موسى فاخبرته فقال راجع ربك فان امتك لا تطيق ذلك فراجعت ربى عزوجل فقال هى خمس و هى خمسون لايبدل القول لدى فرجعت الى موسى فقال راجع ربك فقال انى استحييت من ربى عزوجل وفى لفظ انى يوم خلقت السموات و الارض فرضت عليك و على امتك خمسين صلوة.

(رواه النسائي و الحديث اخرجه الشيخان وغيرهما)

اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں- میں نے کہا پچاس- انہوں نے فرمایا جایئے پھر جا کر کچھ تخفیف کی درخواست کیجئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں ان کی ادائیگی کی سکت نہیں ہے- میں واپس ہوا اور پروردگار کی خدمت میں عرض معروض کی اس نے ایک حصہ معاف فرما دیا- میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا اور سرگزشت بیان کی- انہوں نے کہا میں کہتا ہوں کہ پھر جایئے ابھی اور تخفیف کرایئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے- میں پھر گیا اور پروردگار سے درخواست کی ارشاد ہوا دیکھو اب یہ پانچ ہیں مگر ہمارے یہاں وہی پچاس کی پچاس شمار ہوں گی، ہمارے یہاں جو بات ایک بار طے ہو جاتی ہے پھر وہ بدلا نہیں کرتی- میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا انہوں نے پھر واپس جا کر مزید تخفیف کے لیے فرمایا- میں نے کہا اب تو مجھے بار بار جانے میں شرم آتی ہے-

(نسائی شریف- صحیحین وغیرہ)

لله ..... کیجئے تو پہلی جگہ بھی علم الٰہی میں کوئی ترمیم نہیں اس کو معلوم تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہوگی مگر ہوگی اس طرح کہ اس میں چالیس سال کے اضافہ کی حضرت آدم علیہ السلام درخواست فرمائیں گے اور وہ ہم منظور کریں گے یہاں یہ صورت ہوئی کہ پچاس کو پانچ تو کیا گیا مگر ایک دوسرے ضابطہ کے تحت پھر ان پانچ کو پچاس بنا دیا گیا وہ یہ کہ اس کی ایک نیکی کا ثواب دس گناہ لکھا جائے' اس لحاظ سے جو دنیا میں پانچ ہوں گی وہ آخرت کے دفتر میں پھر پچاس رہیں گے- اگر پہلی امتوں کے ضابطہ کے مطابق حساب رکھا جاتا تو ایک نیکی کا ایک ہی کا ثواب ملتا اس لیے یا تو تخفیف ہی نہ کہہ جاتی اور یا پھر پچاس کی کو پانچ ہی کر دیا جاتا' مگر چونکہ ادھر طے شدہ قدر کی ترمیم منظور نہیں اُدھر خالی ہاتھ آپ کو واپس کر دینا گوارا نہیں اس لیے طے یہ پایا کہ ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت یہ دونوں باتیں قائم رکھی جائیں- مگر اس کے ساتھ یہ اظہار بھی کر دیا جائے کہ تقدیر کے فیصلے ٹلا نہیں کرتے- یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپ کی خاطر داری اور اکرام میں ہوا ہے اور اسی لیے صرف پہلی بار مراجعت پر آخری فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا کہ آپ کی بار بار آمد ہو اور درخواست ہو اور ہر بار اس کو منظور کر کر کے آپ کے اکرام میں اور اضافہ فرمایا جائے مگر آخر میں ہر فیصلے پر قضاء و قدر کی حاکمیت کا اعلان بھی کر دیا جائے-

یہاں ایک اور واقعہ بھی مطالعہ کر لینا مفید ہوگا- ترجمان السنہ جلد دوم ص ۳۷۹ میں حدیث نمبر ۸۱۵ ملاحظہ کیجئے اس میں ثوبانؓ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعاء کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ آپ نے پروردگار عالم سے اپنی امت کے حق میں یہ دعاء فرمائی تھی پروردگار میری امت پر ایسا عام قحط نازل نہ فرما جو ان سب کی ہلاکت کا باعث بن جائے- اور ایک یہ کہ غیروں کو ان پر مسلط نہ کیجیو ورنہ لله .....

(۹۴۳) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَ لَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ. (رواه ابن ماجه)

(۹۴۳) ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کو کوئی چیز پلٹ نہیں سکتی مگر صرف دعاء اور مقررہ عمر میں کوئی شئے زیادتی نہیں کر سکتی مگر نیکی اور یقیناً آدمی گناہوں کی شامت سے کبھی رزق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

للہ ..... وہ ان کی جڑ نکال کر پھینک دیں گے۔ حق تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کی یہ دونوں دعائیں تو منظور کر لیں انی اذا قضیت قضاء فانه لا یرد. لیکن جو فیصلہ ہم ایک بار کر دیتے ہیں پھر وہ بدلا نہیں کرتا۔

دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک دعاء یہ بھی فرمائی تھی کہ ان کو باہمی اختلاف اور آپس کی جنگ کے عذاب میں بھی گرفتار نہ کرنا' مگر یہ نا منظور ہوئی اور خدائی فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ عالم غیب میں ایک چیز کو پہلے مبہم رکھنا پھر رفتہ رفتہ اس کی تفصیل کرنا بھی ایک طریقہ رکھا گیا ہے۔ اسی باب میں اس کی چند مثالیں آپ کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔

(۹۴۳) * اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر آیا ہے تقدیر' عمر اور رزق اسی کے اجزاء ہیں۔ ان تین کے بالمقابل آپ نے یہاں تین چیزیں اور بیان فرمائی ہیں جن کی تاثیر سے آج تک دنیا ناواقف تھی یعنی دعاء' نیکی اور گناہ۔ ان میں سے دعاء کی برکت سے کبھی نوشتہ تقدیر بھی ٹل جاتا ہے اور نیکی کی بدولت کبھی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ بھی مقرر شدہ ہے اور گناہوں کی شامت سے وہ رزق بھی جو مقرر شدہ ہے کبھی منقطع ہو جاتا ہے پھر یہ سب کچھ احاطہ تقدیر میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی کوئی دعاء کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو شفاء عطا فرما دے گا' نیکی کرے گا تو اتنی عمر دے دی جائے گی اور فلاں گناہ کے باعث رزق گھٹ جائے گا اور یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دعاء کرے گا یا نہیں نیکی کی توفیق ملے گی یا نہیں اور اسی طرح گناہ کا صدور ہوگا یا نہیں۔ پس اگر تقدیر کے پہلے نمبر کی طرف نظر کی جائے جس میں رد بلاء دعاء کے ساتھ اور عمر کا اضافہ نیکی کے ساتھ اور رزق کا انقطاع گناہ کے ساتھ معلق ہوتا ہے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مقدرات بھی قابل تبدیل ہوتے ہیں اور جب اس سے اوپر نظر کی جائے جہاں تعلیقات کچھ نہیں صرف احکام ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقدرات میں جو ترمیمات ہیں وہ سب تحتانی مراتب میں ہیں حقیقت میں کوئی ترمیم نہیں۔

اس جگہ مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے وہ تحریر فرماتے ہیں۔ ''حضرت قبلہ گاہی ام قدس سرہ میفر مودند کہ حضرت سید محی الدین جیلانی قدس سرہٗ در بعضے رسائل نوشتہ اند کہ در قضاء مبرم ہیچ کس را مجال نیست کہ تبدیل کند مگر مرا کہ اگر خواہم آنجا ہم تصرف کنم'' پھر اس مقولہ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ''قضاء معلق بر دو گونہ است قضاے است کہ تعلیق او را در لوح محفوظ ظاہر ساختہ اند و ملائکہ را بران اطلاع دادہ و قضائے کہ تعلیق او نزد خدا است جل شانہ و بس در لوح محفوظ صورت قضاء مبرم دارد و ایں قسم اخیر از قضائے معلق نیز احتمال تبدیل دارد در رنگ قسم اول و بقضاء کہ بہ حقیقت مبرم است تصرف و تبدیل دراں محال است عقلاً و شرعاً۔ مکتوبات شریفہ نمبر ۲۱۷ ص ۲۲۲ بنام ملا طاہر بدخشی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ علم الٰہی کے لحاظ سے تو تقدیر کے سب ہی فیصلے مبرم اور اٹل ہوتے ہیں لیکن جہاں اس عالم اسباب کا نقشہ کھینچ کر رکھا گیا ہے وہاں کچھ دور تک اسباب و مسببات کا الجھاؤ دکھانا بھی مناسب معلوم ہوا ہے۔ جس طرح اس عالم میں اسباب و مسبباتمیں فعل و انفعال ظاہر ہے۔ اسی طرح عالم غیب میں بھی اسباب و مسببات کا جو سلسلہ دکھایا گیا ہے اس میں بھی تاثیر اور ثمرات موجود ہے اب جہاں تقریر کے احکامات کے استحکام پر زور دینا منظور ہوتا ہے وہاں پیش نظر اس کا وہ مرتبہ ہوتا ہے جس میں نہ کوئی تعلیق ہے نہ ترمیم اور جہاں للہ .....

مساعی الناس الیوم ھی من عوامل القدر المکنونه

(۹۴۴) عَنْ اَبِیْ خِزامةَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَیْتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْهَا وَ دَوَاءً نَتَدَاوٰی بِهٖ وَ تُقَاةً نَتَّقِیْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ قَالَ هِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ.

(رواه احمد' و الترمذی و ابن ماجه)

(۹۴۵) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ اَنَّ رَجُلَیْنِ مِنْ مُزَیْنَةَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَیْتَ مَا یَعْمَلُ النَّاسُ الْیَوْمَ وَ یَکْدَحُوْنَ فِیْهِ اَشَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْهِمْ وَ مَضٰی فِیْهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ اَوْ فِیْمَا یُسْتَقْبَلُوْنَ بِهٖ مِمَّا اَتَاهُمْ بِهٖ نَبِیُّهُمْ وَ ثَبَتَتْ الْحُجَّةُ عَلَیْهِمْ فَقَالَ لَابَلْ شَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْهِمْ

دنیا میں لوگوں کی جو کچھ بھی جدوجہد نظر آ رہی ہے درحقیقت یہ تقدیر ہی کی خفیہ کارفرمائیاں ہیں

(۹۴۴) ابوخزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ فرمائیے یہ جو منتر ہم لوگ پڑھتے ہیں یا دواء کا استعمال کرتے ہیں یا ہتھیاروں سے جنگ میں اپنا بچاؤ کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر کو بدل دیتی ہیں؟ فرمایا نہیں' یہ چیزیں خود تقدیر کے اندر لکھی ہوئی موجود ہوتی ہیں- (اور یہ ظاہری جدوجہد اسی کی کارفرمائی ہوتی ہے)- (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

(۹۴۵) عمران بن حصین بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ مزینہ کے دو شخصوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ فرمائیے آج دنیا اپنے اعمال میں جو کچھ بھی جدوجہد کر رہی ہے کیا یہ سب کچھ ان کی تقدیر میں پہلے سے طے شدہ تھا یا جب انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر خدائی حجت ان پر پوری کر دیتے ہیں تو اس کے بعد لوگ اپنے اعمال کا سلسلہ کسی تقدیر کے بغیر خود شروع کرتے ہیں- آپ نے فرمایا یوں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام جدوجہد

؎..... کسی عمل کے اچھے یا برے ہونے پر زور دینا مقصود ہوتا ہے وہاں تقدیر کا وہ درجہ لے لیا جاتا ہے جس میں احکامات اپنے اسباب کے ساتھ معلق ہوتے ہیں- حدیث مذکور میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو تین باتیں ناقابل ترمیم ہیں جن میں سے عمر اور رزق کی فکر ہر انسان کے سر پر سوار رہتی ہے عالم غیب میں اگر ان میں ترمیم کا کوئی سبب نظر آتا ہے تو صرف وہ یہ تین ہی اعمال ہیں دعاء' نیکی یا نقصان رزق کے لیے معصیت-

(۹۴۴) * حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قضاء و قدر اسباب کی سببیت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسباب خود قضاء و قدر کے اندر داخل ہوتے ہیں (حجۃ اللہ ص ۶۷) صحابہ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ جب اسباب تقدیر کو بدل نہیں سکتے تو ان کا ارتکاب کرنا ہی لاحاصل ہے آپ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ارتکاب کرنا بھی تقدیری احاطہ میں داخل ہے لہٰذا اس کے ارتکاب کرنے نہ کرنے کا سوال ہی بے محل ہے اب چاہے تو یوں سمجھ لو کہ جو مقدر ہو چکا ہے ہم کرتے وہی اسباب ہیں اور چاہے یوں کہہ دو کہ جو اسباب بھی ہم اس عالم میں کرتے ہیں یہ سب اسی خفیہ تقدیر کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی نکلتا ہے-

(۹۴۵) * اس حدیث کے بعض الفاظ میں کچھ لفظی تشویش ہے بعض الفاظ مراد میں واضح ہیں ہم نے یہاں ان کو بھی نقل کر دیا ہے اس لیے ان الفاظ کو بھی پیش نظر رکھا جائے تا کہ مطلب سمجھنے میں آسانی ہو- یہاں بھی آپ کے جواب کا حاصل یہی ہے کہ اس عالم میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ سب عالم تقدیر کی کارفرمائیاں ہیں- حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ آیۃ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا﴾ میں الہام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس میں تقویٰ و فجور کی صورت پیدا فرما دیتا ہے جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شکم مادر ہی میں شقاوت لکھ دی جاتی ہے اس کا ؎.....

وَ مَضٰى فِيهِمْ وَ تَصْدِيْقُ ذٰلِکَ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا.
(رواه مسلم)

طے شدہ تقدیر کے تحت ہوتی ہے چنانچہ اس کی شہادت خود قرآن شریف میں بھی موجود ہے۔ ارشاد ہے " وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا "، یعنی اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست کیا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری دونوں کا الہام فرمایا' یعنی دونوں کی صورت پیدا فرمادی۔

(قلت و قد اخرجه السيوطى فى الدر المنثور فى تفسير سورة و الشمس و فيه "فى قدر سبق" مكان "من قدر سبق" و "ما اتاهم به نبيهم" الخ و "و اتخذت عليهم به الحجة" مكان "ثبتت عليهم الحجة" و فيه زيادة و هى "قال فلم يعملون اذًا قال من كان الله خلقه لواحدة المنزلتين هيأه لعملها و تصديق ذلك" الخ ج ٦ ص ٣٥٢ و اخرجه فى سورة و الليل عن جابر و فيه اسم السائل ايضا و لفظه ان سراقة بن مالك قال يا رسول الله أفى اى شىء نعمل أفى شىء ثبتت فيه المقادير و جرت فيه الاقلام ام فى شىء نستقبل فيه العمل قال بل فى شىء ثبتت فيه المقادير و جرت فيه الاقلام ج ٦ ص ٣٥٩ و اخرج نحوه ابن ماجة عن سراقة بن جعشم و هو مالك بن جعشم قال قلت يا رسول الله العمل فيما جف به القلم و جرت به المقادير ام امر مستقبل قال فيما جف به القلم و جرت به المقادير و كل ميسر لما خلق له و فى الزوائد فى اسناده فقال فان مجاهد الم يسمع من سراقة فلزم الانقطاع و عطاء مختلف فيه انتهى قال السندى و المتن قد ذكره ابوداؤد و من رواية ابن عمر. و عند مسلم عن جابر قال جاء سراقة بن مالك بن جعشم قال يا رسول الله بين لنا ديننا (اى ما نعتقد من حال اعمالنا) كانا خلقنا الأن (اى نهم غيرعا مليس بتلك المسئلة) فيما العمل اليوم ايما جفت به الاقلام و جرت به المقادير ام فيما تستقبل' الخ)

الحوادث الكونية مع اسبابها كائنة تحت القدر

دنیا کے واقعات کے ساتھ اُن کے اسباب بھی قضاء وقدر کے تحت ہی ہوتے ہیں

(٩٤٦) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرِيْتُکِ قَبْلَ اَنْ اَتَزَوَّجَکِ مَرَّتَيْنِ رَاَيْتُ الْمَلَکَ يَحْمِلُکِ

(٩٤٦) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شادی سے قبل مجھے تم کو دو مرتبہ خواب میں دکھایا گیا تھا۔ میں نے کیا دیکھا کہ ایک فرشتہ ہے جو ایک ریشمین کپڑے میں تم کو لیے ہوئے ہے' میں

لِلّٰهِ ..... خلاصہ بھی یہی ہے۔ الہام اصل میں اس صورتِ علمیہ کو کہتے ہیں جس کی بناء پر کسی کو عالم کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ صورتِ اجمالیہ جو آثار کے لیے مبدء ومنشاء ہو الہام کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے' خواہ اس کی بناء پر عالم کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ اس جگہ الہام کے یہی معنی مراد ہیں۔ (حجۃ اللہ ص ١٦٩)

شرح عقیدۃ الطحاویہ میں اس جگہ ایک اور لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لفظ اَلْهَمَهَا (جس کا ترجمہ ہے اسی نے نفس کو الہام کیا اور سکھایا) قدر کی طرف اشارہ ہے اور فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا میں فجور اور تقویٰ کے نفس کی اضافت سے اس کے اختیار کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بندہ کا بھی کوئی فعل ضرور ہوتا ہے' جس کی بناء پر اس کا نفس فاجرہ یا متقیہ بن جاتا ہے' اسی طرح آئندہ آیت میں زَكّٰهَا اور دَسّٰهَا میں تزکیہ اور تدسیس کی انسان کی طرف نسبت بھی دلالت کرتی ہے کہ یہاں عبد کا بھی کچھ فعل ہوتا ہے۔ گویا تقدیر کے جبر اور بندہ کے فاعل بااختیار ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ دیکھو ص ٣٦٨ اس کے اختیار کے ساتھ ساتھ تقدیر کا جبر بھی لگا جارہا ہے۔

(٩٤٦) * انبیاء علیہم السلام کی شخصیت بھی کتنی پاکیزہ اور بلند ہوتی ہے کہ بیداری کی حالت ہو یا خواب کی امور تشریعیہ ہوں یا لِلّٰهِ .....

فِیْ سَرَقَةٍ مِنْ حَرِیْرٍ فَقُلْتُ لَهُ اکْشِفْ فَاِذَا کَشَفَ فَاِذَا هِیَ اَنْتِ فَقُلْتُ اِنْ یَکُ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یُمْضِهٖ (رواہ البخاری فی التعبیر)

نے اس کہا ذرا پردہ ہٹا تا اس نے پردہ ہٹایا' دیکھتا کیا ہوں کہ وہ تم ہو میں نے اپنے دل میں کہا اگر اللہ تعالیٰ نے اس خواب کو اپنی اسی ظاہری شکل پر پورا کرنا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا کر کے رہے گا۔ (بخاری شریف)

(۹۴۷) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِابْنِ صَیَّادٍ خَبَأْتُ لَکَ خَبِیْأً قَالَ الدُّخُّ قَالَ اِخْسَأْ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَکَ قَالَ عُمَرُ ائْذَنْ لِیْ فَاَضْرِبَ عُنُقَهٗ

(۹۴۷) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد سے امتحاناً فرمایا میں نے تیرے امتحان کرنے کے لیے ایک بات دل میں چھپائی ہے بتاوہ کیا ہے اس نے کہا کہ وہ دُخ کا کلمہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا جا تو اپنی مقدر اوقات سے تجاوز نہیں کر سکتا اس پر عمرؓ نے فرمایا اجازت

لله ..... تو یہ ان کے ذاتی معاملات ہوں یا دوسروں کے کسی وقت بھی ان کا تعلق ملاءِ اعلیٰ سے علیحدہ نہیں ہوتا' اس لیے ان کی خواب کو بھی وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے' اب ذرا دیکھئے یہ کیا چھوٹا سا معاملہ تھا بات بھی خواب کی تھی اور وہ بھی ایک ذاتی معاملہ میں جس کا کوئی ظاہری سامان بھی نہ تھا مگر یہاں بھی نبی کی ذات اس پر اسی طرح یقین رکھتی ہے جس طرح کہ اپنی بیداری کی وحی پر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اتنی بھی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بیداری کے بعد اس ظاہری حلیہ کا کوئی سراغ ہی لگاتے بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو تقدیر کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ نے اس خواب کا اسی ظاہری شکل پر پورا ہونا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا ہو کر رہے گا اور اس کے اسباب بھی ہو کر رہیں گے۔

(۹۴۷) * تقدیر کا قطعی فیصلہ اگر کہیں کسی کے لیے ٹل سکتا تو آج عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر مایوس نہ کر دیا جاتا کہ تم اس بچہ کو قتل کر ہی نہیں سکتے۔ دیکھئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں دوبارہ تشریف لانا اور تشریف لا کر دجال کو قتل کرنا تقدیر کے ان حتمی فیصلوں میں داخل ہو چکا ہے جو ائل ہیں یہاں فاروق اعظمؓ جیسے کی قوت آزمائی بھی بیکار ہے۔ یہ قدرت کے راز ہیں اگر آج وہ کسی قید و شرط کا اظہار فرما کر اپنے اس فیصلہ کو ٹال دیتی تو آج ہی امت محمدیہ ان تمام ہولناک مصائب سے نجات پا لیتی جن کے تصور سے بھی رونگٹا کھڑا ہوتا ہے مگر ذات بے نیاز کو اس کی پرواہ نہیں ہے اس نے شیطان کی درخواست منظور کر لی اور قیامت تک کے لیے اس کو طویل حیات بخش دی۔ تقدیر کے فیصلے اسی طرح ٹلا نہیں کرتے اور اگر کہیں ٹل سکتے تو ایک بار ایسا نازک موقعہ بھی آ چکا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ عالی مقام کی روح قبض ہو رہی تھی اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں مگر یہاں بھی یہ سب کچھ گوارا کر لیا گیا مگر ختم نبوۃ کے فیصلہ پر نظر ثانی نہیں کی گئی آخر آپؐ کے فرزند گرامی کی وفات ہو گئی۔ اگر اس فیصلہ میں بھی کوئی قید یا کوئی شرط مستور ہوتی تو آج سے زیادہ اس کے لیے کوئی دوسرا موقعہ نہ تھا۔ یہاں یہ بات کتنی قابل غور ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے بعد عمرؓ کے قلب میں اب یہ وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کہ لاؤ ذرا آزمائش تو کر کے دیکھوں کہ مجھ میں اس کے قتل کی طاقت ہے بھی یا نہیں بلکہ وہ ہاتھ جو ابھی ابھی شمشیر کے قبضہ پر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ اب اجازت ملے تو فوراً شمشیر بے نیام کر لے' وہی ہاتھ اس حکم کے سننے کے بعد اس طرح مفلوج بن چکا تھا گویا کہ اس میں اس آزمائش کے لیے کوئی حس و حرکت ہی نہ تھی۔ جب تک قضاء و قدر پر یہ ایمان نصیب نہ ہو اس وقت تک مؤمن بھی کیا مؤمن ہے خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر میں جس طرح دجال کا قتل مقدر ہو چکا ہے اس کا قاتل بھی مقدر ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ قتل تو ہو جائے مگر ہو کسی اور سبب سے۔ نہیں وہ ضرور ہو گا اور اسی اپنے سبب کے ذریعہ ہو گا جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ پھر جب دونوں لله .....

قَالَ دَعْهُ اَنْ يَكُنْ هُوَ فَلَا تُطِيْقُهُ وَ اِنْ لَمْ يَكُنْ هُوَ فَلَا خَيْرَ لَكَ فِيْ قَتْلِهِ.

(رواه البخاري في ابواب القدر)

(۹۴۸) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْاَلِ الْمَرْاَةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَ لْتَنْكِحْ فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا.

(رواه البخاري ص ۷۷۴ و ابوداؤد وغيرهما)

(۹۴۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِيْ جَارِيَةً هِيَ خَادِمَتُنَا وَ اَنَا اَطُوْفُ عَلَيْهَا وَ اَكْرَهُ اَنْ تَحْمِلَ فَقَالَ اِعْزِلْ عَنْهَا اِنْ شِئْتَ

دیجئے تو میں ابھی اس کی گردن اڑا دوں۔ آپؐ نے فرمایا جانے دو کیونکہ اگر یہ وہی دجال اکبر ہے تو تم چاہو بھی جب بھی اس کو قتل نہیں کر سکتے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو پھر اس نابالغ بچہ کے قتل سے کیا فائدہ۔ (بخاری شریف)

(۹۴۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کو یہ نہ چاہیے کہ وہ دوسری عورت کی طلاق کا اس نیت سے مطالبہ کرے کہ جو اس کے نصیب کا لکھا ہے وہ بھی سب یہی حاصل کر لے' اس کو نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ جو اس کے نصیب کا ہوگا وہ اسی کو ملے گا۔ (دوسری کو نہیں مل سکتا) (بخاری شریف۔ ابوداؤد شریف وغیرہما)

(۹۴۹) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری ایک باندی ہے جو میرے کام کاج کرتی ہے اور میں اس سے صحبت بھی کرتا ہوں اس لیے مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ حاملہ ہو جائے (کیا میں عزل کر سکتا ہوں؟) آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو

لله ..... باتیں قضاء وقدر کے تحت داخل ہو چکی ہیں تو یہ سوال کیسے ہو سکتا ہے کہ جب تقدیر کے فیصلے اٹل ہیں تو ہمارے مساعی کی ضرورت کیا؟ جی ہاں ان مساعی کا کرنا بھی آپؐ کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان فیصلوں کا منصۂ شہود پر آنا لہٰذا آپ کا سوال ہی مہمل ہے آپ ایسے فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال فرما رہے ہیں جس کی ایک جانب پہلے سے آپ کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے۔ اس لیے اگر آپ بضد آ کر سعی نہ کریں تو یقین رکھیے کہ یہی جانب آپ کے مقدر میں تھی' لیکن چونکہ اس فعل کو اپنے اختیار ہی سے کیا ہے اس لیے جو جبر آپ کے اختیار پر مسلط تھا (یعنی آپ کے اختیار ہی کو اس طرف لگا دینا) وہ آپ کو محسوس نہیں ہوتا۔ ابن صیاد کون تھا' اس کے متعلق بحث ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں کی جائے گی۔

(۹۴۸) * انسانی پست ہمتی اور خست کی یہ ایک بدترین مثال ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کرے تو پہلے وہ اس سے یہ شرط لگائے کہ جو عورت اس کے نکاح میں موجود ہے اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو یہ اس سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ بھی ہو صرف اس لالچ میں کہ اس صورت میں وہ شوہر کے پورے مال پر قابض رہے گی حتیٰ کہ جو اس وقت اس کی اسلامی بہن کا حصہ ہے وہ بھی اسی کے پاس آ جائے گا۔ اسلام اپنے نفع کی خاطر دوسرے کو نقصان رسانی کی اس بدتر صورت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کٹھن سبق کو یہ کہہ کر آسان کر دیتا ہے کہ سرے سے لالچ کا یہ تخیل ہی غلط ہے کیونکہ کسی کے مقدر کا رزق دوسرے کو مل جائے یہ ممکن ہی نہیں تو پھر مفت میں اس دنائت اور خست کے اظہار کی ضرورت۔ اب آپ نے دیکھا کہ تقدیر کا مسئلہ کتنی مشکلات کا حل ہے حیات وموت کا کوئی گوشہ جب انسان کے لیے لاینحل بن رہا ہو تو تقدیر کا سبق بڑی آسانی سے اس کو حل کر دیتا ہے۔

(۹۴۹) * عزل لغت میں اس کو کہتے ہیں کہ جب مرد انزال کے قریب پہنچے تو اپنے عضو کو باہر نکال کر باہر انزال کر دے تاکہ لله .....

فَاِنَّهٗ سَيَأْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا فَلَبِثَ الرَّجُلُ ثُمَّ اَتَاهُ فَقَالَ اِنَّ الْجَارِيَةَ قَدْ حَبِلَتْ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُكَ اِنَّهٗ سَيَأْتِيْهَا مَا قُدِّرَ لَهَا.

(رواہ مسلم)

عزل کر لو مگر اس کے مقدر میں جو بچہ لکھا جا چکا ہے وہ اسے جن کر رہے گی- کچھ عرصہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کی کہ وہ تو حاملہ ہوگئی- آپ نے فرمایا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ جو بچہ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے وہ اس سے ضرور پیدا ہو کر رہے گا- (مسلم شریف)

(۹۵۰) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ مَا مِنْ كُلِّ الْمَاءِ يَكُوْنُ الْوَلَدُ وَ اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ خَلْقَ شَيْءٍ لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْءٌ.

(رواہ مسلم)

(۹۵۰) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا آپؐ نے فرمایا مرد کی ساری منی سے تو بچہ بنتا نہیں (تو پھر عزل سے فائدہ) اور اللہ تعالیٰ جب کسی بچے کے پیدا فرمانے کا ارادہ کرے تو پھر کوئی شئے اس کے لیے مانع نہیں ہو سکتی- (مسلم شریف)

(۹۵۱) عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى

(۹۵۱) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

للہ ..... استقرار حمل نہ ہو- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ اگر بات غیر پسندیدہ ہوتی تو اس کی اجازت تو دیتے مگر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر- مشکل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا رسول اگر منع فرما دے تو حرمت کا مرتبہ آ سکتا ہے اور اگر کھلی اجازت دے دے تو یہ خلافِ مقصود ہوتا ہے اس لیے یہاں لفظ "اِنْ شِئْتَ" (یعنی اگر تو چاہتا ہے تو کر لے) فرما کر تنبیہ فرما دی کہ ہماری مرضی کی تو یہ بات ہے نہیں- دوم اس عمل کے بیکار ہونے کی طرف بھی اشارہ فرما دیا- حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ اگر تقدیر میں اولاد مقدر ہوگی تو مرد کے نطفہ کے بغیر بھی ہو کر رہے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اولاد مقدر ہوگی تو عزل کے بعد بھی غیر شعوری حالت میں اتنا مادہ رحم میں پہنچ جائے گا جو بچہ بننے کے لیے کافی ہوگا اور اس طرح تقدیر کا نوشتہ تو پورا ہو کر رہے گا اور یہ عمل آخر کار بیکار ثابت ہوگا' چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا اور اس وقت آپ نے پھر اس کو اپنا مقولہ یاد دلایا-

(۹۵۰) * اس حدیث میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تقدیر آ کر رہتی ہے' مگر اسباب کو توڑ کر نہیں بلکہ اس طرح کہ اس کے اسباب بھی ہو کر رہتے ہیں مثلاً یہ کہ اس صورت میں عزل سے قبل نطفہ کا کوئی نہ کوئی حصہ نکل جائے اور اسی سے لڑکا پیدا ہو جائے- اولاد کی پیدائش کے لیے پورے کا پورا مادہ تو ضروری ہے نہیں- پھر عزل کرنے والے کو ایسے وقت میں بھلا اس کی احتیاط کیا رہ سکتی ہے کہ وہ اس طرح عزل کرے کہ ایک قطرہ منی بھی اندر نہ نکلنے پائے-

(۹۵۱) * انسانی بخل کی بھی حد ہوگئی کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں بھی اس وقت تک مال خرچ کرنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ اس سے بھی اس کا کوئی معاوضہ وصول نہ کر لے اور وہ بھی پیشگی یعنی وہ نیاز ادا کرنے کا عزم بھی جب کرتا ہے جب کہ مثلاً پہلے اس کا مریض شفایاب ہو جائے' حدیث کہتی ہے کہ کارکنانِ قضاء وقدر کے سامنے یہ مشروط نذر و نیاز بیکار اور لاحاصل بات ہے وہ طے شدہ معاملہ ہے اور اسی طرح ہو کر رہے گا- مشروط نذریں تقدیری فیصلوں پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوتیں- صدقہ کرنے سے بے شک کبھی ردِ بلا ہو جاتا ہے اس لیے تم اگر یہ چاہتے ہو تو شرط کیے بغیر صدقہ دیتے رہو- اگر عالم تقدیر میں یہ طے پا چکا ہے کہ تم صدقہ کرو گے تو یہ بلاء تم سے ٹل جائے گی للہ .....

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّذْرِ وَ قَالَ اِنَّہٗ لَا یَرُدُّ شَیْئًا وَ اِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ۔ (رواہ البخاری)

علیہ وسلم نے منتیں ماننے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ منتیں ماننے سے تقدیر تو بدلتی نہیں ہاں اس بہانہ سے بخیل آدمی کا مال اس کے قبضہ سے زبردستی نکلوالیا جاتا ہے۔ (بخاری شریف)

القدر تأتی علی وجه لاینحزمُ نظام الاسباب

قضاء وقدر کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر ٹکرائے نہیں

(۹۵۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْرًا اِسْتَعْمَلَہٗ فَقِیْلَ وَ کَیْفَ یَسْتَعْمِلُہٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ یُوَفِّقُہٗ بِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ۔ (رواہ الترمذی و قال هذا حدیث صحیح)

(۹۵۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے متعلق بھلائی کا ارادہ فرمالیتے ہیں تو اس سے نیک کام کرا لیتے ہیں۔ دریافت کیا گیا نیک کام کرانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ موت سے قبل اس کو نیک کام کرنے کی توفیق بخش دیتے ہیں۔

(۹۵۳) عَنْ اَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

(۹۵۳) ابان بن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کو یہ بیان کرتے خود سنا ہے کہ اگر کوئی بندہ ہر صبح و شام کو تین بار یہ کلمات پڑھ لیا

لله..... تو ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا' اور تمہارے اس بخل کا مظاہرہ بھی نہ ہوگا۔ حدیث میں جہاں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ امورِ مقدرہ کے لیے اسباب بھی مقدرہ ہوتے ہیں' اسی طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کا ارتکاب عبث ہے۔ عام تقدیر میں ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ ایسے اسباب نہیں ہیں جیسے عمر میں برکت کے لیے صدقہ۔ اس لیے ان کا ارتکاب کرنا اضاعت وقت کے ساتھ ساتھ حماقت بھی ہے۔ عورت کا کسی مرد سے نکاح کرنے کے لیے دوسری بی بی کے طلاق کا مطالبہ کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

(۹۵۲) * یعنی جنتی جنت میں یا دوزخی دوزخ میں جائے گا تو اپنے مقدر ہی سے مگر خانہ پری کے لیے پہلے اس سے اعمال ویسے ہی کرا لیے جائیں گے تاکہ دوزخ یا جنت ملے تو ان کے اسباب کے ساتھ ملے اور قضاء وقدر بھی نافذ ہو تو اس طرح نافذ ہو کر عالم اسباب میں جو نظام اسباب رکھا گیا ہے وہ درہم برہم نہ ہونے پائے۔ جب اسبابِ ظاہر یہ قضاء وقدر کے اس طرح جزء بنے ہوئے ہوں تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تقدیر پر ایمان رکھنے والے اسباب کے بیکار ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

(۹۵۳) * دیکھئے یہ صحابی اسباب اور قضاء وقدر کا باہم ربط کتنا ٹھیک ٹھیک سمجھے ہوئے ہے۔ وہ بہت مختصر الفاظ میں یہ بتاتا جاتا ہے کہ جب کوئی امر ظہور پذیر ہونا مقدر ہوتا ہے تو وہ اسباب کو توڑ کر مقدر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اسی کے مناسب اسباب بھی مقدر ہو جاتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ میرے لیے فالج کی بیماری مقدر ہوئی تو یوں نہیں ہوئی کہ میں اس سے حفاظت کے اسباب تو پورے کرلوں اور اس کے باوجود پھر فالج میں مبتلا ہو جاؤں بلکہ یوں مقدر ہوئی کہ آج اس کے سامان تحفظ ہی نہ کروں تاکہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر دونوں کے دونوں قائم رہیں۔ مستدرک حاکم میں ابن عباسؓ کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ نے اپنے استاد حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ آپ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہد ہد زمین میں چونچ مار کر حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام کو پانی کا سراغ لگا دیتا تھا۔ تعجب ہے کہ زمین کی تہہ کا پانی تو اس کو نظر لله.....

وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُوْلُ فِيْ صَبَاحِ كُلِّ يَوْمٍ وَ مَسَاءِ كُلِّ لَيْلَةٍ بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَيَضُرَّهٗ شَيْءٌ فَكَانَ اَبَانٌ قَدْ اَصَابَهٗ طَرَفُ فَالِجٍ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ اِلَيْهِ فَقَالَ لَهٗ اَبَانٌ مَا تَنْظُرُ اِلَيَّ اَمَا اِنَّ الْحَدِيْثَ كَمَا حَدَّثْتُكَ وَ لٰكِنِّيْ لَمْ اَقُلْهُ يَوْمَئِذٍ لِيُمْضِيَ اللّٰهُ عَلَيَّ قَدَرَهٗ. (رواه الترمذی و ابن ماجه)

کرے تو پھر کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی - بسم الله الذی لاینصر الخ اس اللہ کے نام کے ساتھ جس کے نام کی برکت سے کوئی چیز نہ زمین پر نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ آسمان میں اور وہ جاننے والا ہے سننے والا ہے ابان کو اتفاق سے فالج پڑ گیا تھا' تو جس شخص سے ابان یہ روایت بیان کر رہے تھے وہ ان کو از راہ تعجب دیکھنے لگا - اس پر ابان نے فرمایا دیکھتے کیا ہو سن لو حدیث تو ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ میں نے تم سے بیان کی ہے لیکن آج مجھ کو یہ کلمات پڑھنے ہی یاد نہ رہے تا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی تقدیر جاری فرمادے - (ترمذی - ابن ماجہ)

لله ..... آ جائے لیکن جب بچے جال بچھا کر ایک مٹھی بھر خاک اس پر ڈال دیں تو وہ اس کو نظر نہ آئے اور وہ ان کے جال میں پھنس جائے - حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا خدا تجھے فہم دے اذا جاء القضاء ذهب البصر. جب قضاء آ جاتی ہے تو اسی طرح آنکھیں بیکار ہو جایا کرتی ہیں - غالباً اسی لیے فارسی کی مثل ہے ''چون قضاء آید طبیب ابلہ شود'' اس جواب کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ نفاذِ قضاء کے لیے اسباب سے غفلت یہ بھی حکمتِ تقدیر ہے -

یہاں یہ اہمیت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے دنیا میں آ کر مذاقِ سخن اور اندازِ غور و فکر بھی اتنا بدل دیا تھا کہ جب تک آپ اس سانچے میں ڈھل نہ جائیں ان کے کلمات کی گہرائی کو پا نہیں سکتے - اگر آج یہی سوال ہمارے سامنے کیا جاتا تو ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات میں قدرت نے کچھ خصوصی شعور طبعاً رکھ دیے ہیں وہ صرف اسی حد تک ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں جس حد تک کہ وہ ان میں رکھے گئے ہیں - کسی جانور میں پانی کا کھوج لگا لینے کا خاصہ رکھا گیا ہے تو یہ اس کا کوئی ہنر نہیں بلکہ ایک طبعی شعور ہے اسی طرح کے دوسرے حیوانات میں بھی دوسرے قسم کے علیحدہ علیحدہ خواص موجود ہیں اور حیوانات ہی میں نہیں جمادات میں بھی یہ خواص نظر آتے ہیں - مقناطیس ایک خاص تناسب کے ساتھ لوہے جیسے بھاری چیز کو تو گھسیٹ سکتا ہے مگر کاغذ جیسی خفیف چیز کو ادنیٰ جنبش بھی نہیں دے سکتا - مگر یہ جواب اور یہ مذاقِ سخن اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک کہ عالم حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا - جن کے سامنے عالم غیب عالم حقیقت ہے ان کے نزدیک یہ سارا جہان ایک ٹاکیز سینما سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس لیے ہر سوال و جواب کے موقعہ پر ان کے سامنے پہلے عالم غیب آ جاتا ہے اس لیے وہی کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں جو اس کی ترجمانی کر رہے ہوں - دنیا کے واقعات پر بھی آپ ذرا غور کریں یہاں ایک مؤرخ' ایک فلسفی' پھر ان میں نفسیات کے ماہرین' علم طبقات الارض کے رمز شناس سب علیحدہ علیحدہ نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں اور اسی طبقہ کے پہلو بہ پہلو ایک کمتر سے کمتر طبقہ جوتشیوں کا بھی اپنی پوتھی لیے غور کرتا نظر آتا ہے ان دونوں سے بلند تر اسلام کا بھی یہاں ایک نقطہ غور و فکر ہوتا ہے اور جس طرح کسی ایک واقعہ کے جواب میں ان سب کے جوابات مختلف ہوتے ہیں یہاں اسلام کا بھی ایک علیحدہ جواب ہوتا ہے - وہ دنیوی اسباب کا انکار نہیں کرتا بشرطیکہ وہ محض وہم پرستی نہ ہو' مگر اسی کے ساتھ دوسرے اسباب سے خبردار کرتا ہے - جن سے عام عالم بے خبر ہوتا ہے' اس لیے یہاں ابن عباسؓ نے وہی جواب دیا ہے جو اس وقت عبرت آموز اور سخن شناس طبائع کے لیے مناسب تھا -

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

(۹۵۴) عَنْ اَبِیْ عَزَّةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضَى اللّٰهُ بِعَبْدٍ اَنْ يَّمُوْتَ بِاَرْضٍ جَعَلَ لَهٗ اِلَيْهَا حَاجَةً اَوْ قَالَ بِهَا حَاجَةً.

(۹۵۴) ابوعزہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی موت کی جگہ مقدر فرمادیتے ہیں تو اس جگہ اس کو کوئی ضرورت پیدا فرمادیتے ہیں (جس کے پورا کرنے کے لیے وہ جاتا ہے اور اس ذریعہ سے وہ اپنی موت کی جگہ جا پہنچتا ہے)

(رواہ احمد و الترمذی و قال هذا حدیث حسن صحیح و ابو عزة له صحبة اسمه یسار بن عبد و روی الحاکم فی المستدرك عن ابن مسعودؓ و عروة بن مفرس و مطر بن عکامس نحوه)

(۹۵۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ اَنَّهٗ قَالَ كَانَ صَدِيْقًا لِاُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ وَ كَانَ اُمَيَّةُ اِذَا مَرَّ بِالْمَدِيْنَةِ نَزَلَ عَلٰى سَعْدٍ وَ كَانَ سَعْدٌ اِذَا مَرَّ بِمَكَّةَ نَزَلَ عَلٰى اُمَيَّةَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ انْطَلَقَ سَعْدٌ

(۹۵۵) سعد بن معاذ روایت فرماتے ہیں کہ ان کا اور امیہ بن خلف کا باہم دوستانہ تھا جب کبھی امیہ مدینہ طیبہ آتا تو ان کا مہمان بنتا اور جب یہ مکہ مکرمہ جاتے تو اس کے مہمان ہوتے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو ایک بار سعد عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور حسب قاعدہ امیہ کے مہمان ہوئے اور اس سے کہا ذرا دیکھنا کوئی خالی

---

(۹۵۴) * ان احادیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں بعض واقعات محض اسباب کا بھرم قائم رکھنے کے لیے پیش آتے ہیں اگر تقدیر عالم اسباب کو توڑ کر سامنے آجائے تو اسباب کی تاثیر کا سارا راز فاش ہو جائے - دیکھئے آدمی سفر کرتا ہے اپنی ضرورت کی خاطر' ادھر تقدیر کھینچتی ہے موت کی خاطر - ظاہر میں تو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں آنا ہوا تھا ایک ضرورت کے لیے' اس لیے یہاں موت آگئی اور تقدیر یہ کہتی ہے کہ چونکہ موت ہی یہاں کی مقدر تھی اس لیے یہاں آنا ہوا - پہلی صورت میں انسان کے دل میں یہ خیال رہ رہ کر آسکتا ہے کہ اگر کاش یہ شخص یہاں نہ آتا تو اس کی موت اپنے وطن ہی میں آتی اور موت غربت سے بچ جاتا - لیکن دوسری صورت میں اس خیال کی بجائے دل میں یہ جزم حاصل ہوتا ہے کہ جب موت یہاں کی مقدر تھی تو یہ اپنے وطن میں رہتا کیونکر -

نقول میں کسی جگہ نظر سے گزرا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاس میں ایک مرتبہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی بصورت انسان موجود تھے وہ بار بار ایک شخص کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اس درمیان میں اس شخص نے کسی بعید مقام پر پہنچا دینے کی ان سے درخواست کی' اس پر حضرت عزرائیل علیہ السلام کے چہرہ پر مسکراہٹ سی آگئی - دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کے متعلق مجھ کو فلاں مقام پر اس کی روح قبض کرنے کا حکم ہوا ہے وہ مقام یہاں سے بہت طویل مسافت پر ہے اور اس کی قبض روح میں اتنے وقت کی گنجائش نہیں' پھر یہ ہوگا کیسے - جب اس نے یہ درخواست پیش کی تو مجھ کو اس پر ہنسی آگئی کہ اس کے وہاں پہنچنے کے سامان حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ مقدر تھی ادھر اب یہ وہاں پہنچتا ہے اور ادھر ٹھیک محل ٹھیک وقت پر حکم ربی نافذ ہوتا ہے -

حضرت سلیمانؑ کی تسخیر کا تذکرہ خود قرآن عزیز میں موجود ہے اس لیے اس خاص واقعہ کو صرف اس کے برمحل ہونے کی وجہ سے ذکر کر دیا گیا ہے اسی لیے اس کے اسناد وغیرہ کی تفتیش بھی ضروری نہیں سمجھی گئی - اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو اس پر بھی تحقیق کر لی جاتی -

(۹۵۵) * آپ نے دیکھا مٹی کی کشش کیسی ہوتی ہے اور یہ کہ جب کسی شخص کی موت کسی جگہ مقدر ہوتی ہے تو وہ کس طرح مجبور ہو ہو کر آخر اسی جگہ پہنچ جاتا ہے - یہاں امیہ نے ہزار جتن کیے مگر ایک نہ چلا اپنے ارادہ کے خلاف اس کو جنگ میں شریک ہونا بھی پڑا اور وہ اونٹ للہ .....

مُعْتَمِرًا فَنَزَلَ عَلٰى اُمَيَّةَ بِمَكَّةَ فَقَالَ لِاُمَيَّةَ اُنْظُرْ لِیْ سَاعَةَ خَلْوَةٍ لَعَلِّیْ اَنْ اَطُوْفَ بِالْبَیْتِ فَخَرَجَ بِهٖ قَرِیْبًا مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ فَلَقِیَهُمَا اَبُوْ جَهْلٍ فَقَالَ یَا اَبَا صَفْوَانَ مَنْ هٰذَا مَعَکَ فَقَالَ هٰذَا سَعْدٌ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْ جَهْلٍ اَلَا اَرَاکَ تَطُوْفُ بِمَکَّةَ اٰمِنًا وَ قَدْ اٰوَیْتُمُ الصُّبَاةَ وَ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ تَنْصُرُوْنَهُمْ وَ تُعِیْنُوْنَهُمْ اَمَا وَ اللّٰهِ لَوْلَا اَنَّکَ مَعَ اَبِیْ صَفْوَانَ مَا رَجَعْتَ اِلٰی اَهْلِکَ سَالِمًا فَقَالَ لَهٗ سَعْدٌ وَ رَفَعَ صَوْتَهٗ عَلَیْهِ اَمَا وَ اللّٰهِ لَئِنْ مَنَعْتَنِیْ هٰذَا لَاَمْنَعَنَّکَ مَا هُوَ اَشَدُّ عَلَیْکَ مِنْهُ طَرِیْقَکَ عَلٰی اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ فَقَالَ لَهٗ اُمَیَّةُ لَا تَرْفَعْ صَوْتَکَ یَا سَعْدُ عَلٰی اَبِی الْحَکَمِ سَیِّدِ اَهْلِ الْوَادِیْ فَقَالَ سَعْدٌ دَعْنَا عَنْکَ یَا اُمَیَّةُ فَوَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّهُمْ قَاتِلُوْکَ قَالَ بِمَکَّةَ قَالَ لَا اَدْرِیْ فَقَالَ اُمَیَّةُ وَ اللّٰهِ لَا اَخْرُجُ مِنْ مَکَّةَ فَلَمَّا کَانَ یَوْمُ بَدْرٍ اِسْتَنْفَرَ اَبُوْ جَهْلٍ النَّاسَ قَالَ اَدْرِکُوْا عِیْرَکُمْ فَکَرِهَ اُمَیَّةُ اَنْ یَّخْرُجَ فَاَتَاهُ اَبُوْ جَهْلٍ فَقَالَ یَا اَبَا صَفْوَانَ اِنَّکَ مَتٰی یَرَاکَ النَّاسُ قَدْ تَخَلَّفْتَ وَ اَنْتَ

سا وقت ملے تو مجھے بیت اللہ کا طواف کرنا ہے- دوپہر کے قریب یہ طواف کے لیے نکلے اتفاقاً ابوجہل کی ان دونوں سے ملاقات ہوگئی اس نے پوچھا' ابوصفوان! (امیہ کی کنیت ہے) یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟ اُس نے کہا سعد بن معاذ ہیں- اس پر ابوجہل بولا میں دیکھ رہا ہوں' تم بڑے اطمینان سے بیت اللہ) کا طواف کر رہے ہو حالانکہ تم نے ان لوگوں کو جو یہاں سے اپنا آبائی دین چھوڑ کر چلے گئے ہیں اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور تمہارا گھمنڈ یہ ہے کہ جنگ میں تم ان کی مدد بھی کرو گے- خدا کی قسم اگر اس وقت تم ابوصفوان کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر زندہ نہیں جا سکتے تھے- اس پر سعد برہم ہو کر ذرا بلند آواز سے بولے خدا کی قسم اگر تو مجھ کو طواف سے روکے گا تو میں تجھ کو ایسی بات سے روکوں گا جو اس سے زیادہ تجھ پر شاق ہوگی- یعنی اہل مدینہ کی طرف سے تیرا تجارتی راستہ بند کر دوں گا- امیہ نے کہا دیکھو سعد ان سے ایسی تیزی سے گفتگو نہ کرو آخر یہ بھی اس وادی کے سردار ہیں- سعد نے امیہ سے مخاطب ہو کر کہا بس آپ بھی رہنے دیجئے خدا کی قسم میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں گے- امیہ بولا ارے کیا مکہ میں- سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں- امیہ نے کہا خدا کی قسم میں مکہ سے کہیں باہر نکلوں گا ہی نہیں- اس گفتگو کے بعد جب غزوۂ بدر کی نوبت آئی تو ابوجہل نے لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور یہ تقریر کی- تمہارا تجارتی قافلہ روک لیا گیا ہے لوگو! تم اس کی خبر لو- لیکن امیہ کو جنگ کے لیے نکلنا سخت ناگوار تھا- ابوجہل کو جب یہ احساس ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور سمجھانے لگا- ابوصفوان! دیکھئے آپ اس وادی کے سردار ہیں جب لوگ آپ ہی کو دیکھیں گے کہ آپ جنگ سے ہٹ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ ہے رہ جائیں گے- ابوجہل اس کو برابر سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ بولا- اچھا بھئی جب تم

بقیہ ..... جس کو جان کے ساتھ لگائے لگائے پھرتا تھا وہ بھی خاک کام نہ آ سکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پیش گوئی تھی وہ صبح صادق کی طرح پوری ہو کر رہی- اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار گو زبانوں سے آپ کی نبوت کا اقرار نہ کرتے ہوں مگر دلوں میں اس کا یقین رکھتے تھے کہ آپ کا فرمودہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے' ٹل نہیں سکتا- یہاں ابوصفوان کی بیوی چلتے چلتے سمجھاتی رہی مگر قضاء وقدر جہاں کی موت لکھ چکی تھی وہاں ابوصفوان کو کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے آنا ضروری تھا کچھ نہ سہی تو ابوجہل کا اصرار اور قوم کی عار ہی کے سبب سہی-

سَیِّدُ اَھلِ الْوَادِیْ تَخَلَّفُوْا مَعَکَ فَلَمْ یَزَلْ بِہٖ اَبُوْ جَھْلٍ حَتّٰی قَالَ اَمَّا اِذَا غَلَبْتَنِیْ فَوَاللّٰہِ لَا شْتَرِیَنَّ اَجْوَدَ بَعِیْرٍ بِمَکَّۃَ ثُمَّ قَالَ اُمَیَّۃُ یَا اُمَّ صَفْوَانَ جَھِّزِیْنِیْ فَقَالَتْ لَہٗ یَا اَبَا صَفْوَانَ وَ قَدْ نَسِیْتَ مَا قَالَ لَکَ اَخُوْکَ الْیَثْرِبِیُّ قَالَ لَا وَ مَا اُرِیْدُ اَنْ اَجُوْزَ مَعَھُمْ اِلَّا قَرِیْبًا فَلَمَّا خَرَجَ اُمَیَّۃُ اَخَذَ لَا یَنْزِلُ مَنْزِلًا اِلَّا عَقَلَ بَعِیْرَہٗ فَلَمْ یَزَلْ بِذٰلِکَ حَتّٰی قَتَلَہُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ.

(رواہ البخاری فی باب من یقتل ببدر)

میرا پیچھا چھوڑتے ہی نہیں تو دیکھو میں مکہ میں جو بڑھیا سے بڑھیا اونٹ ہوگا وہ خریدتا ہوں- اس کے بعد اپنی بیوی ام صفوان سے کہا سامان سفر تیار کر- اس نے کہا ابوصفوان کیا وہ بات جو تمہارے یثربی بھائی نے تمہارے متعلق کہی تھی بھول گئے ہو؟ ابوصفوان نے کہا نہیں تو مگر میرا ارادہ ان کے ساتھ صرف دو ایک دن ہی رہنے کا ہے- یہ انتظام کر کے جب امیہ جنگ کے لیے نکلا تو جس پڑاؤ پر ٹھہرتا اپنا اونٹ پاس ہی باندھتا (تاکہ ذرا خطرہ ہو اور اونٹ پر بیٹھ بھاگ لے) یہ انتظامات وہ برابر کرتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں اس کو ہلاک کیا-

(بخاری شریف)

اعتقاد القدر لا یمنع ارتکاب الاسباب بل یحث علیھا

قضاء وقدر کا اعتقاد اسباب کے ارتکاب سے نہیں روکتا بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے

(۹۵۶) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَضٰی بَیْنَ رَجُلَیْنِ فَقَالَ الْمَقْضِیُّ عَلَیْہِ لَمَّا اَدْبَرَ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَلُوْمُ عَلَی الْعَجْزِ وَ لٰکِنْ عَلَیْکَ بِالْکَیْسِ فَاِذَا غَلَبَکَ اَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ.

(رواہ ابوداؤد)

(۹۵۶) عوف بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کے ایک معاملہ میں فیصلہ فرمایا- جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا جب وہ پشت پھیر کر چلنے لگا تو اس نے افسوس کے ساتھ کہا حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ یعنی مجھے خدا تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے- یہ سن کر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سعی و کوشش نہ کرنے پر ملامت کرتا ہے اس لیے ہمیشہ پہلے اپنے معاملات میں دانائی سے کام لیا کر پھر اس کے بعد بھی اگر حالات خلاف ہو جائیں تو اس وقت حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ پڑھا کر-

(ابوداؤد شریف)

(۹۵۷) عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْکَیِّسُ مَنْ وَ اَنْ

(۹۵۷) شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے- درحقیقت دانا شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا تابعدار بنالیا

---

(۹۵۶) * سبحان اللہ تقدیر کا سبق دینے والے تو تدبیر میں ادنیٰ سے تساہل کا نام بھی عجز رکھیں' اس کو نفرت سے دیکھیں اور دانائی و ہوش سے کام لینے کی سخت تاکیدیں فرمائیں اور جب تمام کوششیں پوری کرنے کے بعد بھی گھٹنے ٹک جائیں اس کے بعد اپنی تسلی کے لیے تقدیر کو یاد کرنے کی ہدایت فرمائیں اور لوگ یہ سمجھیں کہ آپ خود گھٹنے توڑ کر بیٹھ رہنے' اسباب کو یکسر معطل کر ڈالنے کے عقیدہ کی تعلیم دے رہے ہیں-

(۹۵۷) * یہ حدیث کہتی ہے کہ جو جدوجہد کے میدان میں سرگرمی دکھا رہا ہے اس کا نام تو دانا ہے اور جو اسباب کیے بغیر بیٹھا ہے......

نَفْسَهُ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ. (رواه الترمذي و ابن ماجه)

اور اپنی موت کے بعد کی زندگی کے لیے سامان کیا اور درماندہ شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو تو اس کی خواہشات کے تابع رکھا اور اس پر لگا اللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھنے- (ترمذی-ابن ماجہ)

(۹۵۸) عَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ اُجَهِّزُ اِلَى الشَّامِ وَ اِلَى مِصْرَ فَجَهَّزْتُ اِلَى الْعِرَاقِ فَاَتَيْتُ اِلَى اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا يَا اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ كُنْتُ اُجَهِّزُ اِلَى الشَّامِ فَجَهَّزْتُ اِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلْ مَالَكَ وَ لِمَتْجَرِكَ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا سَبَّبَ اللّٰهُ لِاَحَدِكُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْهٍ فَلَا يَدَعْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ لَهُ اَوْ يَتَنَكَّرَ لَهُ. (رواه احمد و ابن ماجه)

(۹۵۸) نافع بیان فرماتے ہیں کہ میں اپنا سامانِ تجارت ملک شام اور مصر کی طرف لے جایا کرتا تھا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عراق لے گیا (واپسی میں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے ام المؤمنین پہلے میں اپنا سامانِ تجارت شام لے جایا کرتا تھا- اس مرتبہ عراق لے گیا تھا- آپ نے فرمایا آئندہ ایسا مت کرنا آخر تم نے اپنی پہلی تجارت گاہ میں کیا نقصان دیکھا (جو دوسری بدلی) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی روزی کسی حیلہ سے لگادے تو جب تک وہ صورت خود ہی نہ بدل جائے اس وقت تک اس کو ترک نہ کرنا چاہیے- (احمد-ابن ماجہ)

للہ ..... ہوا ہے اور اس بے عملی میں پڑا ہوا بڑی بڑی تمناؤں میں پھنسا ہوا ہے اس کا نام متبع نفس اور درماندہ انسان ہے- پھر مخالفین کو یہ مجہ کیسے پیدا ہو گیا کہ عقیدۂ تقدیر ہی امت مسلمہ کے عملی ضعف کا باعث بنا ہوا ہے اور اسی لیے یہ امت دنیوی ترقیات میں سب سے پیچھے رہ گئی ہے- یہاں دنیوی ترقیات میں پیچھے رہ جانا تو صحیح ہے مگر اس کا سبب ہے کیا؟ اس کے جواب میں ہر شخص کا جواب مختلف ہے- منکر تقدیر تو تقدیر پر اعتقاد سمجھتا ہے- سود خور یہ کہتا ہے کہ سود نہ لینا اس کا سبب ہے- کمیونسٹ کہتا ہے کہ اس کسل کا اصل راز مذہب کی افیم کھانا ہے- یہاں اسلام بھی کچھ کہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اصل سبب جس کے دامن سے وابستہ ہو کر بامِ عروج پر پہنچے تھے اسی کو چھوڑ بیٹھنا ہے-

(۹۵۸) * اس حدیث کو بار بار پڑھنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت ام المؤمنین نے اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تیری یہ شکایت کرنا ہی غلط ہے تیری قسمت میں اس مرتبہ تھوڑا ہی رزق ہوگا اگر شام جاتا تو بھی تجھ کو تھوڑا ہی نفع ہوتا' بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جن ممالک میں تجارت فائدہ بخش ہو چکی ہو اس کو ترک کرنا اسبابِ ظاہر یہ کے بھی خلاف ہے آپ بھی جانتے ہیں کہ آمد و رفت کی جگہ آدمی کی معرفت پیدا ہو جاتی ہے اور بھی تجارتی منافع ہو جاتے ہیں' اجنبی جگہ میں نہ انسان کی معرفت ہوتی ہے نہ وہ تجارتی منافع تو پھر بے وجہ تقدیر آزمائی کی ضرورت- جتنی بات تقدیر کے حق میں ہم پر لازم قرار دے گئی ہے وہ اس پر ایمان رکھنا ہے یعنی یہ سمجھ لینا کہ ہماری ہر نقل و حرکت سب پہلے سے لکھی جا چکی ہے مگر اس طویل دفتر میں سے ہمیں علم ایک شوشہ کا بھی نہیں ہوتا اس لیے عملی طور پر ہم کو صرف صحیح طور پر جدوجہد کرتے رہنے کا ہی مکلف بنایا گیا ہے-

غور فرمایئے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کس طرح اسباب اور قضاء و قدر دونوں کے اسرار لپیٹے ہوئے ہیں- رزق کا معاملہ چونکہ مقدرات میں داخل ہے مگر ہے اپنے اسباب کے ساتھ اس لیے فرماتے ہیں کہ رزق کا سبب ہونا تو ضروری ہے مگر للہ .....

(۹۵۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا فِیْ دَارٍ كَثُرَ فِيْهَا عَدَدُنَا وَ اَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا اِلٰى دَارٍ قَلَّ فِيْهَا عَدَدُنَا وَ اَمْوَالُنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرُوْهَا ذَمِيْمَةً. (رواہ ابوداؤد)

(۹۵۹) انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی- رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس میں ہماری جانوں اور ہمارے مال دونوں میں بڑی برکت ہوئی اب جو دوسرے مکان میں آئے ہیں تو وہاں جان و مال دونوں میں گھاٹا ہو رہا ہے- آپ نے فرمایا ایسے خراب کو چھوڑ دو- (ابوداؤد)

(۹۶۰) عَنْ يَحْيٰى بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بَحِيْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ فَرْوَةَ بْنَ مُسَيْكٍ يَقُوْلُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عِنْدَ نَا اَرْضٌ يُقَالُ لَهَا اَبْيَنُ وَ هِیَ اَرْضُ رِيْفِنَا وَ مِيْرَتِنَا وَ اِنَّ وَ بَاءَ هَا شَدِيْدٌ فَقَالَ دَعْهَا عَنْكَ فَاِنَّ مِنَ الْقَرَفِ التَّلَفَ. (رواہ ابوداؤد)

(۹۶۰) یحیٰی کہتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے شخص نے اطلاع دی ہے جس نے فروۃ بن مسیک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ یا رسول اللہ صلی ہماری ایک زمین ہے جس کا نام ''ابین'' ہے، ہمارے کھانے پینے اور کھیتی کی جگہ وہی ہے لیکن وہاں کی آب و ہوا بہت خراب ہے- آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کیونکہ ایسی جگہ بود و باش رکھنے سے جان کا نقصان ہوتا ہے- (ابوداؤد)

لله ..... اس کو سبب بنانے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے' اب سبب پر تو نظر کرنا اور مسبب سے قطع نظر کرنا یہ کس درجہ ناانصافی اور احسان فراموشی کی بات ہے- پھر جب اس نے تمہاری روزی کا کوئی سبب پیدا فرما دیا ہے تو اب اچھی خاصی لگی لگائی روزی پر لات مارنا بھی کتنی ناشکری ہے- ناشکری کی جزاء ہے یہی کہ دی ہوئی نعمت لے لی جائے- حدیث کا ہر ہر جملہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ کو جوامع الکلم مرحمت ہوئے تھے عمیق حقائق کو اس طرح سادے سادے الفاظ میں پھر اتنی بے تکلفی اور برجستگی سے کیا یہی ایک کمال آپ پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہے-

(۹۵۹) * یہ وہ برکت و نقصان نہیں جو زمانہ جاہلیت کے قدیم لوگ صرف کسی مکان کا اثر سمجھا کرتے تھے خواہ وہ کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو یا آج بھی جیسا بعض ضعیف الاعتقاد نحوست وغیرہ کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ برکت و نحوست ہے جو مکان کے محل وقوع یا اس کی ناموزونیت یا اس کے تعمیری سقم سے عالم اسباب کے تحت پیدا ہونی ناگزیر ہے- قضاء و قدر کا اعتقاد یہ تعلیم نہیں دیتا کہ رہائش کے لیے ایسا مکان انتخاب کیا جائے جس میں نہ وسعت ہو نہ ہوا کی آمد و برآمد ہو اور نہ اس کا محل وقوع ہی مناسب ہو انسان کو دنیا میں مختار بنایا گیا ہے اور اعمالِ شرعیہ کا مطالبہ اس کے اسی اختیار کی بناء پر ہے پس جس طرح وہ اچھے اعمال کے کرنے اور برے اعمال کے نہ کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اسی طرح اپنی دنیوی زندگی میں بھی اس کو ان دونوں راہوں کا امتیاز لازم ہے-

(۹۶۰) * وبائی امراض اچھی آب و ہوا کے ملکوں میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں- ان کا حکم ان علاقوں سے بالکل علیحدہ ہے جن کی آب و ہوا مستقلاً خراب ہو- اس حدیث نے یہ درمیانی راہ تعلیم دی کہ انسان کو نہ تو اتنا ضعیف الاعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر اچھی آب و ہوا کے ملک میں اتفاقاً کوئی وبائی مرض آ جائے تو وہاں سے بھاگ پڑے اور نہ اتنا جامد ہونا چاہیے کہ بود و باش ہے ایسے ملک میں رکھے جہاں کی آب و ہوا ہلاکت کا باعث ہو- بندہ مختار ہے اور قضاء و قدر کے تحت بھی ہے- ان دونوں اعتقادوں کا ثبوت اس کے عمل سے ظاہر ہونا چاہیے لله .....

(۹۶۱) عَنْ اُسامَۃَ بنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ رِجْزٌ اُرْسِلَ عَلٰی طَائِفَۃٍ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَوْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِہٖ فَلَا تَقْدِمُوْا عَلَیْہِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَ اَنْتُمْ بِھَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْہُ۔ (متفق علیہ)

(۹۶۱) اسامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون خدا تعالیٰ کا عذاب تھا جو بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں پر نازل ہوا تھا (آپؐ نے یہ لفظ کہے یا ''تم سے پیشتر کے لوگوں پر'' فرمایا) لہٰذا جب تم کسی جگہ طاعون سنو تو وہاں نہ جاؤ اور اگر طاعون اس جگہ آ جائے جہاں تم رہتے ہو تو طاعون کے خوف سے بھاگ کر بھی نہ جاؤ۔
(متفق علیہ)

(۹۶۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِیْدِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ کَانَ فِیْ وَفْدِ ثَقِیْفٍ رَجُلٌ مَجْذُوْمٌ فَاَرْسَلَ اِلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّا قَدْ بَایَعْنَاکَ فَارْجِعْ۔ (رواہ مسلم)

(۹۶۲) عمرو بن شرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وفد (جماعت) ثقیف (قبیلہ کا نام ہے) میں ایک شخص تھا جس کو جذام کا مرض تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کہلا بھیجا۔ ہم نے تجھے بیعت کر لیا ہے لہٰذا وہیں سے واپس چلا جا۔ (مسلم شریف)

لٰہ..... پس خراب آب و ہوا میں رہنا اس کے قدر کے اعتقاد کی پختگی کا ثبوت ہے۔ مگر اس عالم اسباب میں انسانی اختیار کی نفی کرتا ہے اور اچھے مقام سے وبائی امراض میں بھاگ پڑنا صرف اس کے مختار ہونے کا ثبوت ہے مگر قضاء و قدر پر اس کے اعتقاد کی نفی کرتا ہے۔ اس عالم اسباب میں اعتدال کی راہ درمیان کی ہے نہ خراب آب و ہوا میں بود و باش رکھو اور نہ اتفاقی وباء سے ڈر کر بھاگ نکلو۔

(۹۶۱) * اس حدیث میں ''فرارا منہ'' کی قید بہت زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وباء زدہ علاقہ سے نکلنا اگر کسی اتفاقیہ ضرورت سے ہو تو وہ ممنوع نہیں جس بات سے روکا گیا ہے وہ بندہ کا ایسا عمل ہے جو قضاء و قدر کی تکذیب کرتا ہو۔ طاعون کے خوف سے بھاگنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس تدبیر سے یا تو تقدیر الٰہی کو بدل دے گا یا اس کے نزدیک یہ معاملہ قضاء و قدر کے تحت ہی نہیں ہے۔ لیکن جس کا اعتقاد یہ ہو کہ اس کی موت و حیات سے لے کر اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی کاتب تقدیر کے قلم کے تحت آ چکی ہے اور اس کا اعتقاد بھی ہو کہ کسی صورت میں بھی اس کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں وہ وباء زدہ علاقہ سے ڈر کر ہرگز ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ دین اسلام میں اعتقاد کے ساتھ ضرورت اسباب اور انسانی ضعف کی اس حد تک خود رعایت کر لی ہے جس سے اس کے اعتقاد کی تکذیب لازم نہ آتی ہو۔

(۹۶۲) * فطرۃً کمزور انسان کو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو آزمائش میں نہ ڈالے۔ وباء زدہ علاقوں میں جا جا کر نہ گھسے جو مریض موذی امراض میں گرفتار ہیں ان کو بالا بالا کرنا اے اعتماد علی التقدیر کے ساتھ اپنی کمزور فطرت کی رعایت بھی ضروری چیز ہے۔ ہاں اگر طاعون اس کے شہر میں آ جائے یا گھر میں ہی کوئی شخص کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اب اپنی استقامت کا ثبوت دے اور تقدیر کو یاد کر کر کے اپنے فطری ضعف کا مقابلہ کرتا رہے۔ چونکہ بہت سے انسانوں کے دلوں میں اختلاط تعدیہ امراض کے اعتقاد کا سبب ہو جاتا ہے اس لیے بے وجہ شریعت اپنی فطرت کے ساتھ زور آزمائی کی اجازت نہیں دیتی۔ اور جب ضرورت سر پر آ جائے تو اب ضعف بشری کے بہانے کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اسلام ثبات قدمی کی دعوت دیتا ہے۔ مگر ہوش کے ساتھ صرف جوش کے ساتھ نہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا لا تتمنو القاء العدو د (دشمن سے جنگ ہونے تمنائیں نہ کیا کرو) بے بڑے فضیلت کی چیز مگر اتنی ہی پر خطر بھی ہے اگر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تو پھر کہیں ٹھکانا بھی نہیں اس لیے اس کی تمنا نہ کرو اور جب سر پر آ جائے تو پہاڑوں سے بڑھ کر ثابت قدمی دکھاؤ۔

(٩٦٣) عَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَاِذَا اُصِيْبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرِأَ بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى. (رواه مسلم)

(٩٦٣) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہر مرض کے لیے دوا ہے جب کسی بیماری کے لیے ٹھیک دواء پہنچ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے حکم سے شفاء ہو جاتی ہے۔ (مسلم شریف)

(٩٦٤) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالَتِ الْاَعْرَابُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَتَدَاوٰى قَالَ نَعَمْ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً اَوْ قَالَ دَوَاءً اِلَّا دَاءً وَاحِدًا فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا هُوَ قَالَ الْهَرَمُ. (رواه احمد و ابوداؤد و الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح)

(٩٦٤) اسامہ بن شریک روایت کرتے ہیں کہ کچھ دیہاتی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہم بیماریوں کا علاج کیا کریں؟ فرمایا ہاں دواء کا استعمال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے لیے دوا پیدا کی ہے مگر صرف ایک بیماری۔ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون سی بیماری ہے؟ فرمایا حد سے گذرا ہوا بڑھاپا۔

(احمد، ترمذی، ابوداؤد)

(٩٦٥) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اِخْوَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَحَدُهُمَا يَاْتِى النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ يَحْتَرِفُ فَشَكَى الْمُحْتَرِفُ

(٩٦٥) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی تھے ان میں ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر رہا کرتا اور دوسرا تجارت کرتا۔ جو بھائی تجارت کرتا تھا اس نے اپنے بھائی کے کام میں شرکت نہ کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

(٩٦٣) * اس عالم میں بیماری اور اس کی دواء دونوں قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں، لہٰذا دواء کا استعمال کرنا تو ضروری ٹھہرا لیکن یہ غلط ہوگا کہ شفاء تو شافی مطلق دے اور تم تعریف کرو دواء کی۔ سوچنا یہ چاہیے کہ اس جمادِ محض میں یہ اثر پیدا کس نے فرمایا؟ کہو اُس نے جس نے بیماری پیدا فرمائی۔ اس جگہ ترجمان السنہ جلد ثانی حدیث ۶۵۶ ص ۳۳۸ کو ضرور ملاحظہ فرمالیجئے۔

(٩٦٤) * یہاں دوا کرنے کا صریح حکم ہو رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ وسوسہ لانا چاہیے کہ قضاء وقدر اسباب سے تعطل کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر کہیں انسان کے قبضہ میں بڑھاپے کی دواء بھی آ جائے تو شاید وہ بڑی جرأت سے قدرت کا انکار کردے عام بیماریوں کے معالجات پر بھی اب تک اس نے جتنا قابو پالیا ہے وہی اس کے اعتقاد کو متزلزل بنا رہا ہے اب اگر کہیں بوڑھے بھی جوان بن بن کر خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں ڈٹے رہتے تو خالق کا کون یقین کرتا، اس لیے ہر دروازہ پر شکست دینے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا لاینحل بنا دیتی ہے جہاں انسان متحیر کھڑا نظر آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر نصیب والے کی تو آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بدنصیب آئندہ انکشاف کی امید میں پھر بھی یہ سبق بھی قدرتِ الٰہیہ کا قائل ہو کر نہیں دیتا۔

(٩٦٥) * تقدیر کے معلم اوّل نے کبھی کسی کو ایک مرتبہ بھی یہ سبق نہیں دیا کہ وہ کسبِ معاش چھوڑ کر صرف تقدیر کے بھروسہ پر معطل ہو کر بیٹھ جائے، البتہ جب کہیں یہ دیکھا ہے کہ کسبِ معاش کا خمار اتنا چڑھ چکا ہے کہ دوسروں کا رزق بھی اپنے ذمہ سمجھ لیا ہے تو اس جگہ اتنی سی تنبیہ کر دینی ضروری سمجھی ہے کہ معاملہ کہیں اس کے برعکس نہ ہو یعنی تمہارا ہی رزق اس کی بدولت نہ مل رہا ہو۔ یہاں بھی آپؐ نے اس لئے .....

اَخَاهُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ. (رواہ الترمذی و قال ھذا حدیث صحیح غریب)

شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تجھے رزق اُسی کے مقدر سے ملتا ہو۔

(ترمذی شریف)

الایمان بالقدر من اعظم منابع القوۃ

قوتِ ارادیہ کے استحکام میں قضاء وقدر پر اعتقاد کا عجب اثر ہوتا ہے

(۹۶۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمًا فَقَالَ یَا غُلَامُ احْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ احْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ تُجَاھَکَ وَ اِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰہَ وَ

(۹۶۶) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، آپ نے فرمایا اللہ کو یاد رکھا کرو وہ تمہارا نگہبان رہے گا، اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو تو اس کو اس طرح پاؤ گے جیسے وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ جب مانگنا تو خدا تعالیٰ سے ہی مانگنا اور جب مدد طلب کرنا تو

للہ ..... محترف کو اس کے حرفہ سے نہیں روکا لیکن جب حرفہ پر اعتماد کی یہ نوبت آ گئی کہ جو بھائی علم نبوت کی تحصیل میں مشغول تھا اور اس وجہ سے کسی حرفہ کے کرنے سے معذور تھا اس کی شکایت کی گئی تو اس وقت آپ نے ضروری سمجھا کہ اب اس کے سامنے ایک دوسرا ورق بھی کھول دیا جائے۔ اور فرمایا جیسا ماں کی چھاتیوں میں دودھ بچہ ہی کے مقدر کا اترتا ہے ایسا ہی کبھی کبھی حرفہ کرنے والے کو بھی کسی غیر محترف کے مقدر کا رزق مل جاتا ہے اس لیے یہ سمجھنا تو صحیح کہ رزق کے لیے کسب کی ضرورت ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ جس کا رزق ہو اسی کے لیے کسب کرنا بھی ضروری ہے، بلکہ کبھی کسب کوئی کرتا ہے اور اس میں رزق کسی کا ہوتا ہے دولت اور کسب کے مابین کیا رشتہ رہنا چاہیے اس حدیث سے اس مسئلہ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک خیال تو یہ ہے کہ کسب کا دولت سے کوئی تعلق ہی نہیں لہٰذا جو کماتا ہے اس کا اپنی کمائی ہوئی دولت میں کوئی حق نہیں ہوتا۔ دوسرا خیال اس کے بالمقابل ہے وہ یہ کہ کسب کا دولت سے اتنا گہرا ربط ہے کہ انسان کی کمائی ہی دولت سرتاسر کمانے والے ہی کی ملکیت ہوتی ہے ایسی ملکیت کہ اس میں کسی غیر کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسلام کی رائے یہاں کتنی معتدل ہے وہ کہتا ہے کہ کسب سے ملکیت تو ضرور ثابت ہو جاتی ہے آخر کمائی ہوئی دولت اسی کی محنت کا ثمرہ ہے مگر غریبوں کے حقوق واجب اور غیر واجب منضبط اور منتشر اس میں اتنے ہیں کہ پھر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سارا کا سارا کمایا ہوا مال خالص اسی کی ملکیت تھا اس لیے اسلام نہ تو امپریلیزم کا حامی ہوسکتا ہے نہ کمیونزم کا وہ اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے، اس میں یہ لچک نہیں ہے کہ کبھی اس کو اس طرف کھینچ لیا جائے کبھی اس طرف۔

اس حدیث سے ایک اور بلند نظریہ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی مدد کرے تو اس کو یہ سمجھنا زیبا نہیں ہے کہ خود وہ اس کی مدد کر رہا ہے بلکہ یہ تصور کرنا مناسب ہے کہ جو رزق اس کے پاس اس کے مقدر کا جمع تھا وہ اس نے اُس کے حوالہ کر دیا ہے گویا حق بحق دار رسید کا مصداق ہے۔

(۹۶۶) * پہلی جلدوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اسلام کا اعلیٰ مرتبہ احسان کا ہے یہاں اسی کو پھر تازہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سے دور نہیں وہ ہم سے اتنی قریب ہے کہ اگر ہم توجہ کریں تو اس کو اپنے سامنے ہی پائیں گے، جو بُعد اور دوری ہے وہ ہماری ہی طرف سے ہے۔ بس حجاب غفلت اُٹھا دو پھر قرب در قرب دیکھو گے۔ جب یہ قرب میسر آ جائے تو کب مناسب ہوگا کہ ایسے داتا کو چھوڑ کر ہاتھ کسی اور کے سامنے پھیلاؤ، اور ایسے توانا کو چھوڑ کر مدد کسی اور سے مانگو، مگر انسان فطرۃً اتنا کچا ہے کہ سوال کی ذلت اٹھائے بغیر اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ ایک محتاج مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر باز نہیں آتا اور ذرا سی مشکل میں جب کبھی مدد کی ضرورت للہ .....

٤ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَ اعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَنْفَعُوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ لَکَ وَ لَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیْکَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَ جُفَّتِ الصُّحُفُ. (رواه احمد و الترمذی)

اسی سے طلب کرنا اور اس کا یقین رکھنا کہ اگر سارے لوگ مل کر بھی تم کو کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو بس اتنا ہی پہنچا سکتے ہیں جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر میں پہلے سے لکھ چکا ہے' اور اگر سب مل کر نقصان پہنچانا چاہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر بس اتنا ہی جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر میں پہلے لکھ چکا ہے۔ تقدیر کا قلم سب کچھ لکھ لکھا کر کاغذ سے اٹھا لیا گیا ہے اور تقدیر کے کاغذات کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ (اب کوئی جدید نوشت وخواند کا موقعہ ہی باقی نہیں) (ترمذی - مسند امام احمد)

(۹٦۷) عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَ قَدْ کُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَ مَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَّکِلُ عَلٰی کِتَابِنَا وَ نَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ کَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَیُیَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَ اَمَّا مَنْ کَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَیُیَسَّرُ لِعَمَلِ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی الایه متفق علیه و فی مسند عمر عند احمد زاد مسدد قلت ففیم العمل قال لاینال الا بالعمل قلت اذا نجتهد. و فی حدیث ابن عباس عند

(۹٦۷) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کا ٹھکانا دوزخ میں یا جنت میں لکھا نہ جا چکا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ تو کیا پھر اس نوشتہ خداوندی پر بھروسہ کر کے عملی جد و جہد کو ترک نہ کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمل کیے جاؤ کیونکہ جو شخص جن اعمال کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے اسی قسم کے اعمال سرزد ہوں گے تو جو نیک ہوگا اسے توفیق ہی نیک کام کی ملے گی اور جو بدبخت ہوگا اس سے کام بھی بدبختی کے لیے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ثبوت میں قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی الخ مسند امام احمد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر عمل کس لیے ہوا؟ اس پر آپؐ نے ارشاد

ﷺ ..... محسوس کرتا ہے تو اسی کی طرف اس کی نظریں اٹھتی ہیں' اس لیے فرمایا کہ اس فطری خامی کا علاج قضاء وقدر کا استحضار ہے بس جب یہ عقیدہ جما لو گے کہ نفع ونقصان پہنچانا جہان بھر میں کسی کے بس کی بات نہیں' اور یہ کہ یہ سارے معاملات سب طے شدہ ہیں تو تمہارے دل میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جب کبھی تم کو کوئی ضرورت ہوگی تو تمہارے ہاتھ صرف اسی کی طرف اٹھیں گے جو سارے جہان کو دیتا ہے اور جب کبھی مدد کی ضرورت ہوگی تو صرف اسی سے مدد مانگو گے جو ہر محتاج کا فریادرس ہے۔ پس قضاء وقدر کا عقیدہ اسباب کے ارتکاب سے بے نیازی کی تعلیم نہیں دیتا' ہاں مخلوق سے بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عملی جد و جہد اب اور بھی بڑھ جانی چاہیے جو انسانوں کا بھروسہ رکھتا ہے وہ بسا اوقات اسباب میں بھی تساہل کر جاتا ہے۔

(۹٦۷) * حیرت ہے کہ جس حدیث کو آج سننے والے سن کر ترک عمل کا عہد کرتے ہیں اسی کو کل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سننے والے صحابہ سن کر جد و جہد کا عہد کر رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ حکم کے تابعدار تھے اور ہم عقل کے بندے ہیں۔ عقل ﷺ .....

البزار فقال القوم بعضهم لبعض فالجدادًا و عند الطبرانی فی اخر حدیث سراقة قال الان الجدالان الجد و عند الفریابی بسند صحیح الی بشیر بن کعب احد کبار التابعین قال سأل غلامان رسول الله صلی الله علیه وسلم فیما العمل فیما جفت به الاقلام و جرت به المقادیر ام شیء نستأنفه قال بل فیما جفت به الاقلام قالا ففیم العمل قال اعملوا و کل میسر لما هو عامل قال فالجد الان.

(کذافی فتح الباری ملخصًا ج۷ ص ۴۰۱)

فرمایا کہ عمل کیے بغیر تو جنت نہیں مل سکتی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر تو ہم عمل میں جان توڑ کوشش کریں گے۔ مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے آخر میں ہے کہ مذکورہ بالا سوال و جواب کے بعد صحابہؓ نے فرمایا اب تو کوشش کرنے کے سواء چارۂ کار نہیں اور طبرانی میں حضرت سراقہ کی حدیث کے آخر میں ہے اب تو کوشش کرنی ہے' کوشش کرنی ہے۔ فریابی نے صحیح سند کے ساتھ دونو جوانوں کا واقعہ ذکر کیا ہے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی مذکورہ بالا سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری جتنی جدوجہد ہے یہ سب تقدیر کا قلم لکھ کر فارغ ہو چکا ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کی پھر عمل کا فائدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر عمل کرنے والا عمل ہی وہ کر سکے گا جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے یہ سن کر انہوں نے کہا تو پھر تو کوشش کیے بغیر چارہ کار نہیں۔

(۹۶۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَ فِیْ کُلٍّ خَیْرٌ اِحْرِصْ

(۹۶۸) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مضبوط مؤمن کمزور سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارا ہوتا ہے اور یوں ہیں دونوں ہی بہتر (یاد رکھو) جو چیز تم کو نفع رساں ہو اس کے لیے حریص بنے رہنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے مدد مانگا کرنا اور درماندہ

ﷲ ..... نارسا بیچاری دنیا کی معمولی الجھنوں کو سلجھا نہیں سکتی وہ تقدیر کے مسئلہ کو کہاں سمجھتی ہاں جب وہ بھی اسلام قبول کر لیتی ہے تو پھر مسائل شرعیہ میں اس کے نزدیک بھی کوئی الجھن الجھن نہیں رہتی' پھر اس میں وہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ جتنا اختیار اس کو مل چکا ہے اس کو وہ کام میں لے آنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور تقدیر میں ہے کیا اس سے کوئی بحث نہیں کرتی وہ اس کے علم سے بالاتر ہے۔ کس کو یہ خبر ہے کہ فلاں معاملہ میں ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے' جب یہ خبر نہیں تو پھر محسوس اختیار سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

(۹۶۸) * حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کے اسماء و صفات کا مظہر بنا رہے۔ مثلاً اس کا اسم مبارک ''القوی'' ہے' تو وہ یہ پسند کرتا ہے کہ مؤمن بھی قوی ہو۔ وہ جمیل ہے اس لیے وہ جمال کو بھی پسند فرماتا ہے' وہ علیم ہے اس لیے علماء کو پسند فرماتا ہے' اسی طرح اس کا اسم محسن اور صابر بھی ہے اس لیے وہ محسنین اور صابرین کو بھی پسند فرماتا ہے۔ جو مسئلہ یہاں ہمارے موضوع بحث سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں حریص بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ حرص کے معنی یہ ہیں کہ جدوجہد کی جو طاقت بندہ میں ودیعت فرمائی گئی ہے اس کو اپنی معاش و معاد میں ختم کر ڈالنا لیکن یہ حرص کمال اسی وقت شمار ہوگی جب کہ ہوا ان ہی چیزوں میں جو اس کے لیے نفع رساں ہوں پس مؤمن قوی وہی ہے جس میں حرص کا مادہ موجود ہو اور ہر نیکی میں وہ مسابقت کے لیے تیار رہے۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ معاصی اور گناہوں پر حرص کرنا اتنا ہی بڑا عیب بھی ہے۔ چونکہ یہ حرص بھی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہے اس لیے یہ حکم ﷲ .....

عَلٰی مَا یَنۡفَعُکَ وَ اسۡتَعِنۡ بِاللّٰہِ وَ لَا تَعۡجَزۡ وَ اِنۡ اَصَابَکَ شَیۡءٌ فَلَا تَقُلۡ لَوۡ اَنِّیۡ فَعَلۡتُ کَانَ کَذَا وَ کَذَا وَ لٰکِنۡ قُلۡ قَدَّرَ اللّٰہُ وَ مَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوۡ تَفۡتَحُ عَمَلَ الشَّیۡطَانِ. (رواہ مسلم)

بن کر سعی کرنے سے بیٹھ مت رہنا اور اگر کبھی کوئی نقصان ہو جائے تو یہ مت کہنا - اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہو جاتا بلکہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یونہی مقدر فرما دیا تھا' لہٰذا جیسا اس نے چاہا تھا اسی کے موافق ہو گیا - کیونکہ اس ''اگر'' کے کلمہ سے آئندہ ایک شیطانی عقیدہ کا دروازہ کھلتا ہے (یعنی تدبیر کی حاکمیت) (مسلم شریف)

(۹۶۹) عَنۡ ابۡنِ مَسۡعُوۡدٍ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ

(۹۶۹) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

ﷺ ..... دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں بھی مدد طلب کرنی چاہیے - حدیث کہتی ہے جو شخص مفید اور نافع اعمال میں حریص نہیں وہ عاجز انسان ہے کمال عاجز بن جانے میں نہیں ہے بلکہ کامیابی کے لیے جان توڑ کوشش کرنے میں ہے اور یہ سمجھ کر کرنے میں ہے کہ جو ہمارے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ہماری یہ کوشش سب اسی کے لیے ہے پس تدبیر کرنا تو ضروری ہوا مگر اس کو حاکم بنا کر نہیں بلکہ تقدیر کا محکوم سمجھ کر - اب اگر تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اسباب کر لینے کے بعد بھی مقصد برآری نہ ہو سکی تو یہ کہنے لگنا اگر ہم یوں کرتے تو کامیاب ہو جاتے یہ بھی درحقیقت تقدیر کو تدبیر کا محکوم بنانے کے مرادف ہے - اس لیے یہ عبد مؤمن کی شان نہیں' یہ شیطان کی حرکت ہے کیونکہ اب ''اگر' اگر'' کہنے سے سوائے ندامت' پشیمانی اور افسوس کے ہوتا ہی کیا ہے' جو مقدر تھا وہ تو واقع ہو ہی چکا لہٰذا اب اس دروازہ کو کھولنے سے نفع؟ ہاں جدوجہد کے بعد بھی جب مقصد حاصل نہ ہو تو اب اس کو قضاء الٰہی کے حوالہ کر دینا یہ مؤمن کی شان ہے اور یہ اس کے لیے باعث تشفی و تسکین بھی ہے - پس ظہور نتائج سے قبل تدبیر سے غفلت کا نام تو عجز ہے' اعتماد علی التقدیر نہیں اور نتائج کے خلاف ہونے کی صورت میں اپنی ضعف تدبیر کو یاد کرنا عمل شیطانی ہے اور اس کو تقدیر الٰہی کے سپرد کر دینا یہ شانِ مؤمن ہے - خلاصہ یہ کہ قضاء و قدر اپنی جگہ ہیں اور کسب و اختیار اپنی جگہ' اور شانِ مؤمن اسی میں ہے کہ کامیابی ہو یا ناکامیابی دونوں حالتوں میں وہ اپنی بندگی اور عبودیت کو قائم رکھے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے معاملات کے لیے پوری جدوجہد کرے پھر اگر نتیجہ موافق برآمد ہو تو اس پر اترائے نہیں اور اگر خلاف ہو جائے تو بے صبری بھی نہ دکھائے - اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے -

﴿لِکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ﴾ (الحدید:۲۳)

تاکہ اس پر تم غم نہ کھایا کرو جو تم کو حاصل نہ ہو سکا اور نہ اس پر شیخی مارا کرو جو تم کو عطا فرمایا -

یعنی تقدیر میں ہر چیز کی نوشت موجود ہے اس پر تم کو اس لیے اطلاع بخشی ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو تمہارے لیے مقدر ہو چکا ہے' وہ ضرور پہنچ کر رہے گا اور جو مقدر نہیں ہوا وہ کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں ٹھہر چکا ہے بس ویسا ہی ہو کر رہے گا لہٰذا جب فائدہ کی چیز ہاتھ نہ لگے اس پر غمگین و مضطرب نہ ہو اور جو مقدر سے ہاتھ لگ جائے اس پر اکڑو اور اتراؤ نہیں' بلکہ مصیبت و ناکامی میں صبر و تسلیم اور راحت و کامیابی میں ثناء و شکر سے کام لو -

(۹۶۹) ✻ اس حدیث میں عالم غیب کے چند مہم اسباق کی تعلیم دی گئی ہے - پہلا یہ ہے کہ انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مرنے کے بعد دفعۃً جنت یا دوزخ میں پہنچ جاتا ہے بلکہ اپنے عملی مساعی کے لحاظ سے کبھی وہ اس طرف قریب ہو جاتا ہے کبھی اس طرف - پس زندگی کیا ہے وہ دوزخ و جنت کی مسافت کا نام ہے جتنا وہ ختم ہوتی ہے اتنا ہی وہ ایک طرف کا راستہ طے کر لیتا ہے ہر چند کہ اصل دارومدار تو خاتمہ ﷺ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ الرُّوْحَ الْاَمِيْنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَاِنَّهٗ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ.

(رواه في شرح السنة و البيهقي في شعب الايمان)

علیہ وسلم نے فرمایا - لوگو! اب ایسی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی جو تم کو جنت سے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے مگر ان سب کا میں تم کو حکم دے چکا ہوں اور اسی طرح نہ ایسی کوئی چیز رہ گئی ہے جو دوزخ سے تم کو قریب کر دے اور جنت سے دور مگر میں تم کو اس سے بھی روک چکا ہوں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ابھی میرے قلب میں یہ بات ڈالی ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنا مقدر رزق پورا نہیں کر لیتا وہ ہرگز مر نہیں سکتا - دیکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور رزق حاصل کرنے میں صاف ستھرے طریقے اختیار کرو' ایسا نہ ہو کہ رزق کی ذرا سی تاخیر تم کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کر دے' کیونکہ تمہارا رزق خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور جو چیز اس کے قبضہ میں ہو وہ صرف اس کی فرمان برداری ہی کر کے حاصل کی جا سکتی ہے -

(شرح السنہ - شعب الایمان)

❀ ❀ ❀

لہ ..... ہی پر رکھا گیا ہے' لیکن ایک مؤمن قانت کو اپنے اوقات و اعمال کا محاسبہ ہمہ وقت لازم ہے کہ وہ اپنی عمر میں کتنا کس طرف قریب ہو رہا ہے جتنا وہ جس طرف بھی قریب ہو گیا بظاہر امید یہی ہوتی ہے کہ بقیہ عمر میں بھی وہ اسی سمت کی بقیہ مسافت طے کرے گا لہٰذا زندگی کا ہر قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے کسی جگہ سے قریب ہو کر پھر دفعۃً دور ہو جانا بڑا مشکل کام ہے - اس لیے عموماً جس حالت میں بھی عمر گزرتی ہے اسی پر خاتمہ بھی ہو جاتا ہے گو کبھی کبھی اس کے خلاف بھی پیش آ جاتا ہے -

دوسری بات اہم یہ ہے کہ انسان عبث ایسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے جو خود اسی کے پیچھے لگی ہوئی ہے یعنی رزق - انسانی مقدرات میں جہاں اور باتیں لکھی جاتی ہیں اس کے مقدر کا رزق بھی لکھا جاتا ہے' پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کو پورا کیے بغیر وہ سفر آخرت کر سکے - تیسری بات اہم تر یہ ہے کہ انسان رزق کی ہوس میں یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال ذریعہ سے رزق تھوڑا حاصل ہوتا ہے' اور حرام ذرائع سے زیادہ اس لیے حرام ذرائع اختیار کر لیتا ہے' حدیث اس کو سمجھاتی ہے کہ تمام مخلوق کا رزق رزاق کے پاس ہے - جب یہ ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں رزق ہو تم اس کی مخالفت کو کیسے رزق کا ذریعہ سمجھ لیتے ہو - چہارم یہاں کسب حلال پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے جتنا کہ تقویٰ کی تحصیل پر - حلال کے بارے میں جد و جہد کرنا اور حرام سے بچنے کے لیے تقدیر کو یاد رکھنا اسلامی معیشت کے لیے سہل ترین نسخہ ہے -

الانبیاء والرسل علیہم الصلوٰۃ والسلام

فی ضوء الاحادیث و التاریخ

حضرات انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کا مختصر تذکرہ احادیث اور تاریخ کی روشنی میں

اس مقدس گروہ کے تذکرہ سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ کے سامنے نبوت اور رسالت کے متعلق قدیم عقلاء کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے- تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جو قیاس آرائیاں آج کی جارہی ہیں یہ زمانہ قدیم کے وہی فرسودہ خیالات ہیں کوئی جدید تحقیق نہیں ہے-

متاخرین علماء میں سے حافظ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر مبسوط بحثیں کی ہیں ان کی دیگر تصانیف کے سواء ''شرح عقیدۃ الاصفہانیہ'' اور ''الجواب الصحیح'' میں بھی اس پر کافی بحث ہے اور ''کتاب النبوات'' تو اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف ہے- وہ لکھتے ہیں کہ قدیم عقلاء میں سے ارسطو اور اس کے متبعین تو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے کچھ آشنائی نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کے یہاں تو نبوت اور رسالت کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ملتا' البتہ فارابی نے اس پر کچھ بحث کی ہے- پھر ابن سیناء نے آکر اس کی مزید تشریح و تفصیل کی ہے اس کے نزدیک نبی کے متعین خاصے ہوتے ہیں-

انبیاء علیہم السلام کا مقام ابن سیناء کی نظر میں ٭ (۱) نبی وہ ہوتا ہے جس کی قوت عقلیہ اتنی کامل ہو کہ کسی سے سیکھے بغیر اس کو خود بخود علم حاصل ہو جائے' اس کا نام اس نے قوت قدسیہ رکھا ہے-

(۲) نبی اپنے علم کے مطابق خود اپنے نفس میں کچھ نورانی صورتیں دیکھتا ہے اور مختلف نوع کی آوازیں بھی سنتا ہے مگر خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا- ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ عام انسان خواب کی حالت میں مختلف صورتیں مشاہدہ کرتے اور مختلف آوازیں سنتے ہیں مگر یہاں بھی خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا- گو نبی کو محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خارجی عالم میں ہو رہا ہے' جیسا کہ خواب دیکھنے والا شخص بھی اپنے مرئیات اور مسموعات کے متعلق عقیدہ یہی رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ خارجی عالم میں دیکھ رہا ہے- ابن سیناء کے نزدیک اسی مسموع صوت کا نام ''کلام اللہ'' ہے- والعیاذ باللہ- خلاصہ یہ کہ ابن سیناء کے نزدیک نبی کے مبصرات و محسوسات کی حقیقت وہ ٹھہری جو عالم رویاء کے مبصرات و محسوسات کی ہوتی ہے نہ وہ بالکل بے حقیقت ہے نہ یہ بے حقیقت ہیں- مگر خارجی عالم میں دونوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا- (والعیاذ باللہ)

(۳) نبی کو عالم کے مادہ میں تصرف کرنے کی فطری طاقت حاصل ہوتی ہے اور اس فطری طاقت سے ہی وہ عجیب عجیب افعال کی قدرت رکھتا ہے' اسی کا نام ''معجزہ'' ہے- فلاسفہ کے نزدیک اس مادی عالم میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب انسانی قوت نفسیہ یا قوت طبعیہ یا عقل فعال کا فیض ہے- شیاطین اور فرشتوں کی یہ جماعت قائل ہی نہ تھی کہ عالم کے تصرفات کو ان کی طرف منسوب کر سکتی- ہنود اور ترک' شیاطین و جنات کے قائل تھے' ان کے نزدیک یہ تصرفات' جنات کے تصرفات تھے-

فلاسفہ کے نزدیک نبوت کیوں کسبی چیز تھی؟ ٭ جب ان کے نزدیک نبوت' کلام اللہ' معجزہ اور فرشتے کی حقیقت یہ ٹھہری

تو ظاہر ہے کہ یہ تمام امور کسب انسانی اور ریاضت سے بھی حاصل ہونا ممکن ہیں' اس لیے ان کے نزدیک نبوت و رسالت بھی دیگر صنعتوں کی طرح کسبی چیز تھی - سہروردی مقتول اور ابن سبعین اسی جدو جہد میں مصروف تھے کہ ان کو نبوت کا مقام حاصل ہو جائے - اسی لیے ان فلاسفہ کے نزدیک ایک فلسفی کو نبی پر فوقیت حاصل ہوتی ہے - کیونکہ فلسفی کی نظر بہ نسبت نبی کے پھر پراز حقیقت ہوتی ہے - (والعیاذ باللہ)

اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا صرف استعمال کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی اس حقیقت کا اعتراف بھی نہ ہو جو اسلام نے بیان کی ہے

* نبوت کے متعلق فلاسفہ کی اصل تحقیق تو یہ تھی لیکن جب اسلامی دور میں فلاسفہ کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پہنچیں تو انہوں نے ان کے اور فلاسفہ قدیم کے علوم کے مابین پیوند لگانا چاہا اور اسلامی اصطلاحات یعنی وحی' نبوت' فرشتہ' قیامت' جنت اور دوزخ وغیرہ کو اپنے تراشیدہ معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا - اب جس کو اس حقیقت کا متنبہ نہ ہوا وہ تو اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ شاید یہ جماعت بھی ان سب امور کی قائل تھی - جن کے انبیاء علیہم السلام قائل تھے - مثلاً جب انہوں نے ابن سینا کے کلام میں نبوت' معجزہ وغیرہ کے الفاظ دیکھے تو یہ خیال قائم کر لیا کہ شاید ابن سینا بھی ان سب امور کا قائل تھا لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ ان الفاظ کی حقیقت اس کے نزدیک وہ نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے نزدیک تھی تو پھر محض ان الفاظ کے استعمال کر لینے سے اس کو اسلامی تعلیمات کا حامل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے - جب تک کہ یہ بھی ثابت نہ کر دیا جائے کہ ان الفاظ کی حقیقتیں بھی اس کے نزدیک وہی تھیں جو ادیان سماویہ کے نزدیک مسلم تھیں [1]

---

[1] مثلاً ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے الفاظ ہمیشہ سے امت مسلمہ میں تواتر کے ساتھ مستعمل ہوتے چلے آئے ہیں' لیکن ہمیشہ ان کا یہی ایک مفہوم سمجھا گیا ہے کہ حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام بنفس نفیس خود آسمان سے اپنے اسی جسم عنصری کے ساتھ تشریف لانے والے ہیں اور کبھی اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھا گیا کہ ان کا کوئی معنوی نظیر یا مشابہ شخص اسی امت میں سے پیدا ہوگا - اسی طرح ختم نبوت کا مفہوم بھی صرف یہی سمجھا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی جدید نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے' خواہ وہ کسی قسم اور کسی مرتبہ ہی کی کیوں نہ ہو ظلی ہو یا بروزی اور صفحات تاریخ نے بھی ہمیشہ اسی کی تائید کی ہے - چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک جب کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو آپ ؐ نے اور آپ ؐ کے بعد ہمیشہ امت مسلمہ نے اس کو کاذبین اور دجالین کی فہرست میں شمار کیا ہے جیسا کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کی تاریخ سے ظاہر ہے - اور اگر زمانہ کے دستور کے مطابق کبھی کسی قلیل جماعت نے اس کی تصدیق کی بھی ہے تو ہمیشہ تاریخ نے اس کو مسلمانوں کی عام جماعت سے علیحدہ شمار کیا ہے اور اس جماعت کا ہمیشہ ایک جداگانہ لقب کے ساتھ علیحدہ تذکرہ کیا ہے - س لیے اگر کوئی جماعت صرف نزول مسیح علیہ السلام اور ختم نبوت کا لفظ تو استعمال کرتی ہے مگر ان معنوں سے نہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو ستعمال کرتے چلے آئے ہیں تو محض ان الفاظ کے الفاظ استعمال کرنے والے فلاسفہ کو صرف ان الفاظ کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے عقائد سے متفق نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان الفاظ کے استعمال ان ہی معنوں میں کرتے ہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں - کیا نصاریٰ اور ہنود بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے' مگر کیا صرف لفظ توحید کے استعمال کر لینے سے ن کو اسلامی توحید کا معتقد کہا جا سکتا ہے اس لیے اس نکتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے - خلاصہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ن حقائق کو اپنے ان ہی معنوں میں مانا جائے جن میں کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں مسلم رہے ہیں' صرف اسی الفاظ کی نقالی بے سود ہے -

اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ ہمارے دور کے عقلاء نبوت کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں؟ یہاں ابن سیناء اور اس کے ہمنواؤں کی کل کائنات تو یہ تھی اب آپ ذرا علوم نبوت سے روشن دماغوں کی بات بھی سنئے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں نبوت کی حقیقت اور اس کے ارکان ثلاثہ یعنی ملوکیت و سیاست، علم و حکمت اور رشد و ہدایت کی فطری اور غیر معمولی استعداد ⁂ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تم نبی اور اس کے خواص جاننا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ حیات انسانی کے نظم و نسق کے لیے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بیک وقت نبی کی ذات میں تمام انسانوں سے بڑھ کر پیدا فرمائی جاتی ہیں وہ ایک بادشاہ کی طرح ہوتا ہے جس کے نفس ناطقہ کی قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے سایہ کے نیچے اہل قلم بھی، بڑے بڑے جرنیل اور سیاست داں بھی، کاشت کار اور تاجر بھی غرض تمام عالم اپنی اپنی زندگی کے مطابق تربیت حاصل کرتا ہے اور ہر ہر شعبہ کا نظام اس کے اقوال و افعال کے دم سے قائم رہتا ہے۔ وہ اسی کے ساتھ ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علم اخلاق و تدبیر منزل اور سیاست مدن کا ماہر ہو، وہ حکیم نہیں جو صرف ان علوم کے الفاظ سے آشنا ہو بلکہ وہ حکیم جس کی یہ تمام صفات طبیعت ثانیہ بن چکی ہوں حتیٰ کہ اس کے حرکات و سکنات سے یہ علوم ٹپکتے نظر آ رہے ہوں۔ وہ ایک مرشد کامل بھی ہوتا ہے جو جماعت صوفیاء میں مصدر کرامات و خوارق بنا ہوا ہو اور طاعات و عبادات کے ان تمام طریقوں سے آگاہ ہو جو تہذیب نفس کے لیے ضروری ہیں اور ان علوم حقہ کا ماہر ہو جن سے کہ انسانوں پر عالم ملک و ملکوت کے اسرار پنہاں روشن ہوتے ہیں اور اسی طرح اعمال جوارح اور اذکار لسانی کے علیحدہ علیحدہ تمام خواص سے بھی پورا پورا آشنا ہو۔ وہ جس طرح کہ آسمانوں پر حضرت جبرئیل علیہ السلام تدبیر الٰہی کا جارحہ اور علوم الٰہی اخذ کرنے میں واسطہ ہیں اسی طرح انسانوں میں ان تمام صفات جبرئلیہ کا مالک بھی ہوتی کہ ﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ (یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس بات میں جس کا وہ ان کو حکم دیتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے) اس کی شان بن چکی ہو اور اس طرح اس کی فطرت کو عالم بالا سے وہ مناسبت حاصل ہو کہ علوم الہیہ اور یقین و اطمینان کی نعمت اس کے قلب و قالب پر بہہ رہی ہو اور اس کے یہ سب کمالات اس میں فطری ہوں کسی معلم اور درس گاہ کے رہین منت نہ ہوں۔ نبی کے ان علوم، اس کی حکمت، اس کے تزکیہ اور اس کے اس نظامی لیاقت کی طرف جس سے کہ وہ ان صفات کے اثرات خدا تعالیٰ کی مخلوق میں پھیلاتا ہے، ذیل کی آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (جمعہ : ۲)

یہ خدا ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول پیدا فرمایا جو خود انہی میں کا ہے پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے کتاب اور عقلمندی کی باتیں اور اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں مبتلاء تھے۔

اب آپ آیت بالا کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا ایک ورق ملاحظہ فرمایئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ اہم خدمت امیوں میں کس حکمت سے شروع کی گئی اور کس تدبیر و تدبر سے پایہ تکمیل کو پہنچی جس دور میں آپ تشریف لائے اس وقت ضلالت و ظلمت کی حالت کیا تھی؟ عبادت میں شرک کرنا ان کا دین بن چکا تھا، قیامت کا وہ انکار کرتے تھے اور ملت

حنیفیہ کی صورت انہوں نے بالکل مسخ کرڈالی تھی پھر آپ نے تشریف لاکر کیا کیا؟ عبادات میں سے شرک کی رسم مٹادی، قیامت کا وجود ثابت کیا اور ملت حنیفیہ کو تحریفات سے پاک کرکے پھر سرنو اس کو اصل بنیادوں پر راست فرمادیا۔ اس پر جب عرب کے عوام و خواص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو آخرکار جہاد کی طاقت سے اس کو دبادیا چھوٹی چھوٹی بے سروسامان جماعت کو لے کر جرار لشکروں کا مقابلہ کیا، مگر تائید ربانی سے فتح و کامرانی آپ کے حصہ میں آئی اور شکست و ہزیمت کفار کا حصہ رہا۔ اوران میں ایسے علوم کے دریا بہادیئے جن سے کہ وہ اس سے قبل قطعاً آشنا نہ تھے یعنی علم قرآن، علم ایمان یعنی ارکان، پنجگانہ اسلام وغیرہ۔علم معاد یعنی احوال برزخ وحشر ونشر و جنت و دوزخ علم احسان جس کو آج کی اصطلاح میں حقیقت اور معرفت کہا جاتا ہے۔علم شرائع و تدبیر منزل و سیاست مدن وطریق معاش، علم اخلاق، علم آداب، علم فتن یعنی آئندہ واقعات وحوادث کے متعلق خبریں، علم فضائل اعمال، علم مناقب پھر ان علوم کو اس خوبی سے مشرح بیان کیا کہ تھوڑی سی مدت میں قوم کی قوم کا وہ طبعی مذاق بن گئے اور خورد وکلاں ذکی وغبی میں کوئی ایسا نہ رہا جس کے دل و دماغ میں وہ نقش کالحجر نہ بن گئے حتیٰ کہ جو آپ کی بعثت سے قبل صحرا نشین بدو تھے وہ اب مقربین بارگاہ صمدیت اور دنیا کے حکمراں نظر آنے لگے۔ نبوت جیسی نعمت کی حقیقت اور اس کی برکات کا اس سے کچھ اندازہ کرلینا چاہیے۔ (قرۃ العینین۔ص ۱۴۱و۱۴۲)

میں کہتا ہوں کہ اسلامی دور کے اس آخری فلسفی نے جو کچھ اپنی علمی زبان اور اصطلاحی الفاظ میں یہاں بیان فرمایا ہے اگر اس کا لب لباب فنی اصلاحات کی قیدو بند سے آزاد ہوکر انتہائی سادگی اور مؤثر الفاظ میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ تقریر پڑھ لیجئے جو حضرت جعفر طیار (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے شاہ حبشہ کے سامنے فرمائی تھی انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ نبوت کے ان تمام خواص کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مذکورۂ بالا بیان میں فرمائی ہے۔

تعلیمات نبوتؐ کے متعلق ایک غلط فہمی اور اُس کا ازالہ ✻ حقیقت یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام اوران کی تعلیمات کے متعلق کج فہموں کو ہمیشہ سے یہ مغالطہ رہا ہے کہ ان کا تعلق صرف ایک ایسی غیر محسوس حیات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جس کے وجود میں بھی مادی عقول بہت سے شکوک وشبہات رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مذہبی تعلیمات کا تعلق اگر ہے تو صرف قبر، حشر ونشر اور مابعد الموت زندگی کے مسائل کی حد تک ہے دنیوی نظم ونسق کے ساتھ اس کا کوئی محکم رشتہ ثابت نہیں۔ ادھر عالم غیب اور اس کے علوم سے چونکہ مادی عقول بالکل خالی ہوتی ہے اس لیے وہ انبیا علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے لیے کوئی بلند مقام تجویز کرنے سے قاصر رہتی ہیں لیکن دوسری طرف مذہب کا رشتہ اس پر ان کو مجبور کرتا ہے کہ ان کی برتری کو چارو ناچار تسلیم کیا جائے اس کشمکش کی وجہ سے ان کو ایسی توجیہات کرنی پڑتی ہیں کہ انبیا علیہم السلام کی صداقت و امانت اور فہم و دانائی بھی اپنی جگہ مسلّم رہے اور پھر مادی عقول کو ان کی کوئی خاص فوقیت بھی تسلیم کرنی نہ پڑے۔

اس لیے اسلامی دور کے فلاسفہ نے تو ان کی قوت عقلیہ اور قوت عملیہ کی برتری کا اعتراف کرکے یہ سمجھ لیا کہ بس اتنی بات سے انہوں نے مقام نبوت کا حق ادا کردیا مگر اسی کے ساتھ ان کے علوم کی حیثیت ایک خوابیدہ شخص کے منامات کی برابر قرار دے کر ان کو ایسا بے وقعت بنایا کہ حقیقت کی دنیا میں وہ ازاول تا آخر لایعنی بن کر رہ گئیں۔ والعیاذ باللہ۔

تعجب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی قوتِ عقلیہ اور عملیہ کی عام برتری تسلیم کر لینے کے بعد ان کے مدرکات کی حقیقت اتنی بے حقیقت بنا دینا کون سی عقل اور کیا فلسفہ کی بات ہے۔ اگر آج یہی حیثیت ڈارون' ہٹلر اور لینن کے علوم کی قرار دے دی جائے تو شاید اس شخص کو مخبوط الحواس سمجھا جائے' حالانکہ اگر ان کے فلسفوں پر غور کیا جائے تو وہ بھی ابتداء میں نامعقول بات ہی سمجھے جاتے تھے۔ ہٹلر کی ساحرانہ کرشمہ سازیاں' لینن کی اشتراکیت اور مذہب کشی اور ڈارون کا فلسفہ ارتقاء بھلا کس شخص کے ذہن میں آنے والی باتیں تھیں لیکن کیا کچھ عرصہ بعد ہی پھر وہی ایک دنیا کا دین و مذہب نہیں بن گئیں؟ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات گو آج پھر اس سے ناآشنا دماغوں کو بعید از عقل نظر آ رہی ہیں' مگر کیا عہدِ ماضی کے عقلاء نے اس کی معقولیت کا اعتراف نہیں کیا اور کیا آج بھی مذہبی دنیا کا بڑا حصہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اگر آپ ان کے لائے ہوئے آئین پر کبھی نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ملوکیت سے لے کر دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات کے متعلق پوری پوری ہدایات موجود ہیں اس میں صرف عقائد و عبادات کا باب نہیں بلکہ بیع و شراء' ہبہ و عاریہ' رہن و شفعہ' نکاح و طلاق' وصیت و وراثت غرضیکہ جملہ معاملات و تعزیرات حتیٰ کہ صلح و جنگ کے قوانین بھی پوری روشنی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں تہذیب اسماء اور تہذیب الفاظ کے ابواب تک بھی ہیں۔ غرض کھانے پینے' سونے جاگنے اور ہنسنے بولنے جیسی معمولی اشیاء کے متعلق بھی تمام اہم ہدایات ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ منافقوں نے طعن کے طریق پر کہا کہ تمہارا نبی تم کو سب ہی باتیں سکھاتا ہے حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کا طریقہ بھی۔ اس پر صحابہؓ نے کیا اچھا جواب دیا ہے۔ جی ہاں' وہ ہمیں ان جیسی معمولی باتوں کے متعلق بھی ہدایات دیتے ہیں مگر سنو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنی عمیق اور ضروری ہوتی ہیں یہاں آپ کی ہدایت یہ ہے کہ اس حالت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو' اپنی شرم گاہ کو دایاں ہاتھ نہ لگاؤ اور تین بار سے کم ڈھیلے کا استعمال نہ کرو وغیرہ اگر ہم اس کی شرح کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حیاتِ انسانی کے ہر ہر شعبہ کے متعلق اسلامی آئین میں کتنی مکمل اور کتنی ضروری ہدایات موجود ہیں۔ حدیث و تفسیر اور فقہ کا مطبوع ذخیرہ آج کتب خانوں کی شکل میں آپ کے سامنے ہے بلکہ اس کا کچھ حصہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ اگر عملی لحاظ سے دیکھنا ہو تو قرآن شریف اٹھا کر پڑھ لیجئے' آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملوکِ دنیا کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی بحث و نظر اور جنگی معرکوں کی سرگرمیوں کا نقشہ کیا تھا۔ یعنی کیا وہ صرف ایک معلم کی حیثیت رکھتے تھے یا عمل کے ہر میدان میں سب سے پیش پیش نظر آتے تھے۔ صحیح حدیثوں میں تو آج کل کی اصطلاح کا لفظِ سیاست بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں موجود ہے کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبياء یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اور نظم و نسق یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام چلایا کرتے تھے۔ میں چونکہ خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اس لیے میری امت کا نظم و نسق خلفاء کے حوالہ ہو گیا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنہ ج ۱)

ان واضح حقائق کے ہوتے ہوئے اس بے وجہ غلط فہمی کا کوئی موقعہ تو نہ تھا کہ نبوت کا رشتہ مادی دنیا کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام صرف ایک خیالی عالم کے مالک ہوتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مذکورہ بالا بیان میں بڑی خوبی کے ساتھ اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ انہوں نے قرآن کریم سے انبیاء علیہم السلام کی ان صفات پر روشنی ڈالی ہے جن کے انبیاء علیہم السلام حامل ہوتے ہیں اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان صفات کے اثرات کیا نکل چکے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون

کی ذرا اور تفصیل کر دیں تاکہ پورے طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے اور انبیاء علیہم السلام کا صحیح صحیح تعارف ہو جائے -

نبوت کے ارکانِ ثلاثہ کی مزید تشریح ٭ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ دنیوی انسان تو حیاتِ انسانی کے صرف ایک ایک شعبہ کی ہدایت کرتے ہیں اور وہ بھی ناتمام اور انبیاء علیہم السلام انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے متعلق ہدایات فرماتے ہیں اور وہ بھی انتہاء درجہ مکمل گویا عالم کو اپنے نظام کے لیے جن مختلف قابلیتوں کے مختلف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام قابلیتیں بیک وقت اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر تنہا ایک نبی میں موجود ہوتی ہیں یہاں سب سے پہلے بادشاہی اور ملوکیت کی صفت کو لے لیجئے اور اسی صفت میں شاہانِ دنیا کے ساتھ اس مقدس گروہ کا مقابلہ کر لیجئے -

مقدمہ

ہر شئے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت مگر اعتبار حقیقت کا ہے اور کمال مجموعہ میں ہے ٭ پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس طرح کہ ہر چیز کے لیے اس کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت' مثلاً انسان اس کی ایک خاص صورت ہے اور اسی طرح انسانیت کی چند مخصوص صفات بھی ہیں جو اس کی حقیقت کہلاتی ہیں - مکمل انسان وہ ہے جو ان دونوں کا جامع ہو - صورت بھی انسان کی رکھتا ہو اور خواص وصفات بھی اسی کو رکھتا ہے - بندر میں صرف انسان کی سی صورت تو ہے مگر چونکہ وہ انسانی صفات سے بالکل معریٰ ہے اس لیے کوئی اس کو انسان نہیں کہتا - اسی طرح اگر کسی انسان میں ہیکل انسانی تو ہو مگر انسانیت کی صفات ناقص ہوں تو فوراً اس کی انسانیت پر نقصان کا حکم لگا دیا جاتا ہے - ایک بیوقوف کو آپ گدھا اور لڑاکو شخص کو بھیڑیا کہہ دیتے ہیں - کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس کی صورت گو انسان کی نظر آتی ہے مگر اس میں کسی ایک انسانی صفت کی کمی ہوتی ہے - اس کے ساتھ جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اصل اعتبار صورت کا نہیں بلکہ حقیقت کا ہے اگر کسی کی حقیقت انسان کی ہے' پھر اس کی صورت میں خواہ کتنا ہی نقص کیوں نظر نہ آئے مگر اس کا شمار انسانوں ہی کے زمرہ میں رہتا ہے' لیکن اس کے برخلاف اگر کسی میں انسان کی حقیقت ہی نہ ہو تو صرف اس کی صورت کے انسانی صورت ہونے سے کوئی اس کو انسانوں میں شمار نہیں کرتا - اس سے یہ ثابت ہوا کہ اصل اعتبار حقیقت کا ہے - ہاں مکمل انسان وہی کہا جائے گا جس میں صورت اور سیرت دونوں جمع ہوں - اس فرق کو کسی شاعر نے کیا اچھے انداز میں ادا کیا ہے' وہ کہتا ہے:

نالۂ من صورتے بگرفت بلبل ساختند   لخت ہائے دل بیک جا جمع شد گل ساختند

یعنی دنیا جس کو بلبل شوریدہ کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرا نالہ وفغاں قدرت نے اس حقیقت کو بلبل کی صورت عطا کر دی ہے - اسی طرح جس کو دنیا گل کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرے پارہائے جگر - قدرت نے انہی کو گل کی صورت پہنا دی ہے -

ملوکیت کی صورت اور اس کی حقیقت ٭ اسی طرح آپ بادشاہی کو بھی سمجھ لیجئے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت اس کی حقیقت پر غور فرمایئے تو یہ صفات ہیں:

معاشی' معاشرتی' تمدنی انتظامات' ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت' رعایا کی تعلیم و تربیت کے پورے نظم و نسق کی پوری استعداد و قابلیت' اولوالعزمی' بہادری و فیاضی' عدل و انصاف' دل سوزی و ہمدردی اور عام اخلاق کی برتری اور ان صفات کے ساتھ

اس کے نمایاں اوصاف یہ بھی ہیں مثلاً طبعی نخوت وتکبر، تعیش وتلذذ اور تنعم وتکلف وغیرہ۔ اس کی ظاہری صورت دیکھئے تو یہ ہے۔ جاہ وجلال، شان وشوکت، تخت وتاج، دولت وخزانہ فوج ولشکر، محل وقلعہ، داد ودہش، یعنی انعام میں تبذیر واسراف اور انتقام میں ظلم و تعدی وغیرہ۔

پس اگر ایک انسان تاج وتخت کا تو مالک ہو مگر ملوکیت کے معنوی اوصاف میں کورا ہو تو دنیا اس کو بادشاہ نہیں کہتی وہ صرف صورت کا بادشاہ ہے حقیقت میں وہ ایک قزاق، لٹیرا اور نفس پرور انسان سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی میں یہ اوصاف مذکورہ تو ہوں مگر وہ تخت وتاج کا مالک نہ ہو تو دنیا اس کو بھی بادشاہ نہیں کہتی مگر ان دونوں میں جو سیرت ملوکیت کا مالک ہوتا ہے وہ اپنی درویشی میں بھی بادشاہ کہلاتا ہے، اس کی حکومت جسموں سے تجاوز کر کے مخلوق کی جانوں تک ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جو صرف ظاہری صورت ملوکیت رکھتا ہے، اس کی حکومت صرف جسموں تک محدود رہتی ہے، لوگوں کے قلوب اس پر لعنت کرتے ہیں اور عزت کی بجائے اس کو ذلیل ترین انسان شمار کرتے ہیں۔

ملوکیت نبوت کی صورت وحقیقت ٭ اب اس معیار سے آپ انبیاء علیہم السلام کو دیکھیں اور صرف اعتقاد کی روشنی میں نہیں بلکہ تاریخ اور واقعات کی روشنی میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ بہترین صفات ملوکیت کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طرح ان میں ملوکیت کی صحیح صورت بھی موجود ہوتی ہے۔ دیکھئے جب دنیا میں وہ آتے ہیں تو اس وقت دنیا کے عام اخلاق، ان کا عام تمدن ان کی زندگی کا عام نظم ونسق، ان کی عام تعلیم وتربیت کا عالم کیا ہوتا ہے؟ رہا عالم قدس سے ان کا تعلق تو اس جگہ ہم اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ پہلے یہاں اس پر نظر کیجئے کہ جب اس ماحول میں رسول آئیں تو عقلاً رسولوں کو کن صفات کا ہونا چاہیے۔ پھر یہ دیکھئے کہ وہ ہوتے ہیں کن صفات کے۔ اسی کے ساتھ اس پر بھی نظر رکھیے کہ یہ صفات ان میں کسبی اور تعلیم کا ثمرہ ہوتی ہیں یا محض فطری اور قدرتی، پھر وہ بھی کس اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ ان کی اولوالعزمی اور فیاضی، ان کا عدل وانصاف اور ان کی عام ہمدردی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ وہ صدق وامانت میں کیا مقام رکھتے ہیں، ان کا کیریکٹر کیسا ہوتا ہے؟ اگر یہ تمام صفات ان میں بادشاہوں بلکہ شہنشاہوں جیسی موجود نظر آتی ہیں تو عقل وانصاف کی روشنی میں آپ کو یہ حکم لگانا ہوگا کہ وہ یقیناً بادشاہ سیرت ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ ان میں بادشاہی کی صورت بھی موجود ہو تو پھر ان کے مکمل بادشاہ ہونے میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس معیار پر ہم سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت اور بادشاہی کے جتنے اوصافِ حمیدہ عقل تصور کر سکتی ہے وہ سب آپ کی ذات ستودہ صفات میں اعلیٰ مرتبہ کے جمع تھے۔ عرب کے بگڑے ہوئے نظام میں آپ تشریف لائے جہاں تعلیم کا دور دور تک پتہ نہ تھا، قوم اتنی درشت اور جنگجو جس کی انتہا نہیں، عادات واطوار اتنے بگڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ، اخلاق اتنے گرے ہوئے کہ العظمۃ للّٰہ ملک میں وہ بدامنی کہ انسانوں کا جینا مشکل، تمدنی نظم ونسق کی اتنی ابتری کہ ہر فرد خود مختار اور بادشاہ کی جہالت کی یہ نوبت کہ برہنگی شراب خواری وحرام کاری باعث ناز وافتخار اور قتل وغارت ان کی شرافت کا معیار۔

ایسے پست ماحول میں آپ کا ظہور ہوا تو آپ کن صفات کے مالک تھے، کسی سے تعلیم حاصل کی تھی یا فطرۃً ممتاز صفات رکھتے تھے؟ کسی شاہی خاندان سے متعلق تھے یا صرف ایک شریف گھرانے کے نونہال تھے؟ ان سب باتوں کا جواب اگر سننا ہو تو

ہرقل وابوسفیان کی زبانی سن لیجئے جس میں دونوں غیر مسلم ہیں- پھر ایک شہنشاہ ہے اور دوسرا اپنی قوم کا دانا سردار- تاریخ کی روشنی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ عقل و ہنر' علم و دانائی' تہذیب و اخلاق' عدل و انصاف' شجاعت و سخاوت اور جملہ ملوکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے مالک تھے- جو ملک بھی آپ کی زیر تعلیم آ گیا اس کی کایا پلٹ گئی اور وہ انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر جا پہنچا -عرب کی تاریخ آپ کی بعثت سے قبل اور بعد کی ملا کر دیکھ لیجئے' تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ وہ ایک ایسی قوم بن گئے تھے جو صفحات عالم پر گویا اب پہلی بار نمودار ہو رہی ہے ان کے اوضاع و اطوار بدل چکے ہیں وہ اب قتل و غارت کی زندگی کے بجائے امن کے شہزادے اور سارے جہان کے لیے پیغام سلامتی بن چکے ہیں' حرام و حلال کی تمیز کرنا معروف و منکر کو پہچاننا' عہد و پیمان کا پورا پابند رہنا' معاملات میں دوست و دشمن کو ایک نظر سے دیکھنا اور انسانوں کو چھوڑ کر خدا کی بے زبان مخلوق یعنی حیوانات کے ساتھ بھی بے رحمی سے اجتناب رکھنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے- عفت و پاک بازی' حیاء و غیرت' صلہ رحمی اور عام خلق اللہ کی ہمدردی ان کی فطرت کا جز ٹھہر چکی ہے- وہ جس ملک میں نکل گئے ہیں وہ ملک ان کا گرویدہ بن گیا ہے- آخر وہ نوبت بھی آ گئی ہے جب کہ دشمن اہل کتاب نے ان کو دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے ہیں کہ یہ امت وہی امت ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے سے اپنی کتابوں میں پڑھتے چلے آئے ہیں اور کسی جنگ کے بغیر اپنا ملک ان کے حوالہ کر دیا ہے اتنے عظیم پھر اس سرعت کے ساتھ انقلاب اور وہ بھی اتنے پائدار انقلاب کی تاریخ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی کیا آپ کی شاہانہ قابلیتوں کے لئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور ثبوت درکار ہے-

اب اگر ملوکیت کی ظاہری صورت پر نظر کیجئے تو یہاں بھی جاہ و جمال' شان و شوکت میں کئی کمی نظر نہیں آئی بلکہ آپ کے رعب و ہیبت کا جو عالم یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی - دشمنوں کے قلوب دور دور سے ہی آپ سے سہمے ہوتے رہتے تھے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ نے جن مخصوص صفات سے مجھ کو نوازا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرا رعب بے سرو سامانی میں بھی ایک ماہ کی مسافت سے دشمن کے دل پر پڑتا ہے ابوسفیان جب زمانہ جاہلیت میں ہرقل کے دربار سے واپس آئے تو باہر آ کر ان کا جو احساس تھا وہ انہوں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے' "انه يخافه ملك بنى لاصفر "'یعنی مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور غالب رہیں گے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان سے شاہ روم تک خائف ہے- صلح حدیبیہ کے موقع پر جب اہل مکہ نے عروہ بن مسعود کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تو انہوں نے آپ کی محفل کو دیکھ کر اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا تھا وہ یہ تھے-

"اے قریش میں نے شاہ حبش' شاہ قسطنطنیہ اور شاہ ایران کے دربار دیکھے' لیکن کوئی بادشاہ ایسا نظر نہیں آیا جس کی عظمت اس کے درباروالوں کے دلوں میں ایسی ہو جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابیوں کے دلوں میں محمدؐ کی ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھوکتے ہیں تو ان کا لعاب دہن زمین پر گرنے سے پہلے لوگ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ پر مل لیتے ہیں- جب وہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو سب اسی تعمیل کے لئے دوڑ پڑتے ہیں' ان کے دل میں محمدؐ کا اتنا ادب واحترام ہے کہ وہ ان کے دربار میں نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے"

رہی آپ کی فوج و لشکر اور اس کے تقسیم و نسق تو وہ بھی تاریخوں میں موجود ہے' آلات حرب کی فراہمی اور ان کی حفاظت کے حالات' فوجی راشن اور اس کی تقسیم کے انتظامات بھی سب سیرت کی کتابوں میں مدون ہیں- آپ کے دربار میں شاہانہ داد و

دہش اور انعام و اکرام کا حال بھی ایک ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ لیکن جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی سیرت میں شاہانِ دنیا کے بعض اجزاء نظر نہیں آتی اسی طرح ان کی ملوکیت کی صورت میں بھی اس کے کچھ نمایاں اجزاء نہیں ملتے' ان کی شاہانہ سیرت میں نخوت وتکبر کی بجائے تواضع وانکسار' تعیش وتلذذ کی بجائے جفاکشی وتعب اور تکلف وتنعم کی بجائے انتہاء درجہ سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے' اسی طرح اس کی صورت میں بھی تخت وتاج دولت وخزانہ اور شاہانہ محل سرائے کا نام ونشان نہیں ملتا اور ان کی اس انوکھی ملوکیت کی وجہ سے ہی تاریخ نہ تو ان کو ملوک دنیا کی فہرست میں شمار کر سکتی ہے اور نہ اس سے پورے طور پر انکار ہی کی قدرت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اس بلند شخصیت کا اگر آپ کو اندازہ ہو جائے تو آپ اس حقیقت کو باور کر لیں کہ وہ دنیا میں جو نظامِ حیات لے کر آئے ہیں اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نظام ممکن ہی نہیں ہے۔ کاش ملوکیت کا جو تصور اسلام نے دنیا کے سامنے رکھا ہے اگر دنیا اس کو محفوظ رکھتی تو یقین کیجیے کہ آج امپیریلزم اور کمیونزم کی یہ عالمگیر اور بھیانک جنگ دنیا کے کسی خطہ میں آپ کو نظر نہ آتی۔ اور اگر آج بھی اس پر غور کر لیا جائے تو دنیا کو پھر اس جنگ زرگری سے نجات مل سکتی ہے۔

ملوکیت نبوت کا اہم رکن عالم غیب سے اس کا رشتہ ہے ٭ انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی حقیقت اگر صرف اسی حد تک جا کر ختم ہو جاتی تو یقیناً مادی عقول کے لیے ملوکیت کے اس تصور سے بڑھ کر کوئی دوسرا تصور نہ ہوتا' لیکن یہاں ملوکیت کی حقیقت میں جس اہم جزء کا وہ آگے اضافہ فرماتے ہیں بس وہی ان کے لیے نقطہ اختلاف بن جاتا ہے یعنی عالم غیب کے ساتھ ان کا رشتہ اور وہ بھی اس شدومد کے ساتھ کہ سطحی نظروں کو یہ متوہم ہونے لگتا ہے کہ مادی نظام کے ساتھ ان کا رشتہ گویا کٹ چکا ہے۔ وہ اپنی کسی حالت میں بھی اس رشتہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ وہ چلتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے' نماز پڑھتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے' حتیٰ کہ جب سو جاتے ہیں تو بھی بیداری کی طرح عالم غیب ان کے سامنے ہی رہتا ہے' اسی لیے ان کے خواب کو بھی وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ عالم غیب میں کبھی خود جا کر اس کا مشاہدہ کرآتے ہیں اور کبھی خود عالم غیب ان کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ اگر چاہیں تو اس کے باغات کے پھل توڑ کر لوگوں کے حوالہ کر دیں اور اس طرح عالم شہادت میں عالم غیب کی گویا وہ ایک مجسم دلیل ہوتے ہیں۔ جس نے ان کو دیکھ لیا گویا اس نے پورے عالم غیب کو دیکھ لیا۔ یہی سبب ہے کہ جو ان کا منکر ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی منکر ہو گیا' اور جو ان کا معتقد ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی معتقد بن گیا۔ اس لیے ان کی ملوکیت بھی تمام تر عالم غیب سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ دشمنوں کی سازشوں کی اطلاعات مخلصین صحابہ کرامؓ سے پہلے ان کو خدا تعالیٰ کے فرشتے بلکہ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے ہو جاتی ہے۔ آپ کی حیات میں دشمنوں نے کتنی سازشیں خفیہ در خفیہ کیں مگر یہاں دیکھا تو آپ کو پہلے سے ان کی اطلاع مل چکی تھی ایک بار یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دیا' آپ نے فوراً ان کو بلا کر پوچھا بتاؤ تم نے کھانے میں زہر ملایا ہے انہوں نے اس کا اعتراف کیا مگر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ آپ کو یہ راز بتایا کس نے؟ آپ نے اسی کھانے میں سے بکری کا دست اٹھا کر فرمایا۔ اس نے۔ پس یہاں گھر' باہر' دوست ودشمن کی بہت سی خبریں ظاہری انتظام سے پہلے ہی ان کو عالم غیب سے مل جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں آپ کے ایک خانگی معاملہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق آپ کی بیوی صاحبہ نے اپنی ایک رازدارانہ گفتگو پر آپ کو خبردار دیکھ کر تعجب سے پوچھا "من انباک ھذا؟" یارسول اللہ بھلا یہ تو بتا دیجیے کہ اتنی پوشیدہ بات کی

اطلاع آپ کو دی کس نے؟ آپ نے فرمایا ''نَبَّانِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ'' اس نے جس سے بڑھ کر نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی خبر رکھنے والا- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو قرآن کریم میں ایک معجزہ ہی یہ موجود ہے کہ تم لوگ جو اپنے گھروں میں کھاتے پیتے اور جمع کر کر کے رکھتے ہو وہ سب میں جانتا ہوں' اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی ملوکیت کا رشتہ کسی جگہ بھی عالم غیب سے کٹ جائے- ان کے نزدیک ان کی ملوکیت کی حقیقت قوت نفید سے ایک ذرہ آگے نہیں ہوتی' اپنی ذاتی حکومت کا وہ کوئی تصور ہی نہیں رکھتے اور جو آئین وہ لے کر آتے ہیں وہ کسی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہوتا- وہ یہ اعلان کر کر کے کہتے ہیں کہ جس آئین کی ہم تم کو دعوت دیتے ہیں وہ آئین خود خالق کائنات ہی کا بنایا ہوا ہے' ہم اس میں ایک شعشہ کا نہ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس میں ذرا سی کمی کر سکتے ہیں- ﴿قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ﴾ (یونس: ۱۵) کہہ دو کہ میرا تو ایسا مقدور نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں (کسی قسم کا) ردوبدل کروں بلکہ اس پر عمل کرنے میں خدا تعالیٰ کی دوسری تمام مخلوق کے ساتھ ہم بھی شریک ہیں وہ اپنے غیبی رشتہ کو صرف عقیدہ کی حد تک نہیں رکھتے بلکہ بدر وحنین کے میدانوں میں اس کا تجربہ بھی کرا دیتے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں- اب بتاؤ فتح ونصرت تمہاری قلت وکثرت پر منحصر ہے' یا خالق کائنات کی غیبی مدد پر-

﴿وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ (انفال: ۱۰)

فتح تو اللہ کی طرف سے ہے' بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے-

اور اسی غیبی رشتہ کے اعتماد پر اپنی بے سروسامان فوج لے کر دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت سے بھڑ جاتے ہیں اور اس کا وسوسہ بھی نہیں لاتے کہ فتح ان کو نہیں ہوگی' وہ تن تنہا کھڑے ہو کر بڑی بے جگری کے ساتھ اپنے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں اور یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں' ہماری پشت پر خالق کائنات کی غیبی مگر حقیقی طاقت موجود ہے' اس لیے تم جو بھی کر سکتے ہو کر کے دیکھ لو-

﴿فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَ لَا تُنْظِرُوْنِ﴾ (یونس: ۷۱)

پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرا لو تمہاری وہ بات تم میں کسی پر مخفی نہ رہے (تاکہ سب اس کی تکمیل میں شریک ہوسکیں) پھر (جو کچھ تم کو کرنا ہے) میرے ساتھ کر چکو اور مجھ کو مہلت نہ دو-

وہ دشمن کے مقابلہ میں جب صف آرا ہوتے ہیں تو اپنی فوج کو بینڈ کی بجائے ذکر اللہ کا ترانہ گانے کا حکم دیتے ہیں اور ان کی نظر ظاہری سازوسامان ہونے کے باوجود دعاؤں کے بم اور ملائکۃ اللہ کی ایٹمی طاقت پر زیادہ لگی رہتی ہے- اسی لیے عین حالت جنگ میں بھی وہ نمازوں کو اپنے اوقات سے مؤخر نہیں کرتے گو وہ اس حالت میں اپنی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھنا بھی لازم سمجھتے ہیں- ان کی جنگ کا مقصد صرف قتل وغارت اور اقتدار وملکیت نہیں ہوتا وہ اس نازک موقعہ پر بھی مجرم اور غیر مجرم کی تمیز رکھتے ہیں اور یہ ہدایت کرتے ہیں- کسی بچہ کو قتل نہ کیا جائے کسی عورت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے' جو شخص خدائی حکومت کا اقرار کرے اس سے فوراً درگزر کر دیا جائے- جو مال دشمن سے حاصل ہو اس کو اپنی ملکیت نہ سمجھا جائے' جو ملک قبضہ میں آئے اس کے باشندوں

کے ساتھ عادلانہ سلوک کیا جائے- عام ملکی حقوق جان و مال کی حفاظت میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی امتیاز نہ رکھا جائے' کافر کا دعویٰ مسلمان پر اسی نوعیت کے ساتھ سنا جائے جیسا مسلمان کا کافر پر اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ملک دراصل اللہ تعالیٰ کا ہے' ہماری جنگ و صلح بھی اسی کے حکم کے تابع ہے' وہ خالق کائنات ہے اس لیے جو حقوق کائنات کی بقاء کا موجب ہیں اس میں مساوات رکھی جائے گی- دوست و دشمن' کافر و مسلم کے درمیان پورے امتیاز کا دن فردائے قیامت ہے- ﴿اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ یعنی ہماری موت و حیات تک کا اصل مقصد بھی صرف رضاء الٰہی ہے- بس اسی نقطہ پر پہنچ کر ملوکیت اور نبوت کی راہیں علیحدہ علیحدہ پھٹ جاتی ہیں- ملوکیت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ملک اس کا ہو' ملک اس کی ہو' آئین اس کا ہو' دولت و خزانہ اس کا ہو' قوت اس کی ہو اور اختیار و اقتدار تمام تر اس کا ہو- اس کے برعکس نبوت کا اعلان یہ ہے کہ یہ ملک اس کا ہے نہ مِلک اس کی نہ آئین اس کا ہے' نہ حکومت و اقتدار اس کا- دولت و خزانہ اور طاقت و اختیار جو کچھ بھی ہے وہ سب مالک علی الاطلاق کی ہے- اس لیے وہ اپنی بادشاہت کا نام حاکم اور ملک کی بجائے خلیفہ رکھتی ہے-

<u>ملوکیت نبوت کی حقیقت خلافت ہے</u> ٭ یعنی اس کی جانب سے ایک مقرر شدہ نائب اور بس- ان کے سامنے بس یہی ایک پروگرام ہوتا ہے کہ وہ خدائی آئین کو اس کی پیدا کردہ مخلوق میں پوری جدوجہد کے ساتھ نافذ کردیں- حضرات انبیاء علیہم السلام کے طویل و عریض سلسلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملوکیت کی ظاہری شان و شوکت کا تذکرہ خود قرآنی اوراق میں موجود ہے' مگر اس کی حقیقت بھی قدم قدم پر خلافت سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتی' وہ اس اقتدار اور حکومت کے بعد بھی ہر ہر موقعہ پر یہی اعلان کرتے رہے کہ میں ایک نائب کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہیں ہوں- نصب العین میرا بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جو دیگر انبیاء علیہم السلام کا تھا یعنی احکام الٰہیہ کی تنفیذ-

مادی عقول اس غیبی رشتہ کا ادراک نہیں کرتیں' اس لیے وہ ہر موقعہ پر رسولوں کا یہ رشتہ سن کر بدکتی ہیں اور وہ خلافت کی بجائے انسان کو خود مستقل مالک و حاکم کی حیثیت دے دینا معقول بات سمجھتی ہے حالانکہ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو ملوکیت کی صحیح حقیقت اگر ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہو سکتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں نظر آتی ہے اور صرف اسی کی نظام عالم کو ضرورت بھی ہے- اس سے زیادہ ملوکیت کا جو تصور مادی عقول نے تراش لیا ہے نہ تو اس کی کوئی حقیقت ہے اور نہ نظام عالم کو اس کی ضرورت ہے- ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی مستقل مالکیت و حاکمیت کا دعویٰ کرنا حقیقت کی نظر میں کتنا خلاف واقع ہے پھر اس پر آئین سازی اور اختیارِ مطلق کے جو شاخسانے اس نے اور لگا لیے ہیں وہ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہیں- اور ان بے حقیقت خیالات کی نظامِ عالم کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ عالم میں فتنہ و فساد کی جڑ ملوکیت کا یہی مادی تخیل ہے- یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مملکت بھی گو ظاہر میں کتنے ہی اقتدار و حکومت کی مالک ہو مگر اس کی زیردست رعایا کے قلوب پر بھی اس کا سکہ نہیں جمتا اور اسی لیے ہمیشہ دنیوی بادشاہوں کو اپنے گردوپیش سے خطرات لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک نہ ایک دن صفحہ ہستی سے ان کو نابود ہو جانا پڑ جاتا ہے- انبیاء علیہم السلام جس ملوکیت کے حامل ہوتے ہیں اس میں چونکہ انسانی فلاح و بہبود کے سواء کوئی تخیل ہی نہیں ہوتا وہ اپنی مالکیت و حکومت کا کوئی دعویٰ ہی نہیں رکھتے اس لیے فطرتِ انسانی کو ان سے ٹکرانے کا موقعہ ہی نہیں ہوتا' اور اس لیے ان کی محبت

اور محبت کے ساتھ عقیدت بھی دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے حتی کہ ان کی محفل کا نقشہ وہ بن جاتا ہے جو ابھی عروہ بن مسعود کی زبان سے آپ سن چکے ہیں اور اسی لیے ان کی عقیدت میں حیات اور بعد حیات کا کوئی فرق نہیں پڑتا- قلوب جس طرح ان کی حیات میں ان کا انتہائی درجہ احترام کرتے ہیں ان کی وفات کے بعد بھی ان کے احترام کے لیے اتنے ہی مضطر رہتے ہیں- اس مقام سے یہ بات بھی حل ہوگئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ اتنی والہانہ محبت اور عقیدت کیوں تھی- اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ محض بے سمجھے سوچے آپ پر فدا ہو گئے تھے بلکہ وہ آپ کی ذات مبارک میں جاذبیت کے جو متفرق سامان متعدد انسانوں میں جمع ہو سکتے تھے وہ یہاں بیک وقت زیادہ سے زیادہ جمع دیکھتے تھے وہ تجربہ کر کر کے دیکھ چکے تھے کہ رسول خدا کی ذات میں ان کی خیر خواہی خود ان کی اپنی جانوں سے زیادہ موجود ہے- اس لیے بادشاہ' والد' محسن اور ان کے علاوہ محبت کے جتنے رشتے تصور میں آ سکتے ہیں وہ سب کے ساتھ آپ میں جمع ہو گئے تھے- سچ پوچھئے تو ان کی محبت وادب کا جو نقشہ عروہ بن مسعود نے اپنے الفاظ میں ادا کیا تھا وہ بھی ناتمام تھا-

نبوت کے لیے قدرت جن نفوس کا انتخاب کرتی ہے ان میں اعلیٰ قابلیتیں بھی ودیعت فرما دیتی ہے ٭ اور اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ یہ شاہانہ حکومت انبیاء علیہم السلام کے یونہی حوالہ نہیں کی جاتی بلکہ اس نوع کی حکومت اور شاہی کی قابلیت چونکہ صرف ان ہی میں پیدا کی جاتی ہے اس لیے خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق میں صرف وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ خدائی حکومت کا نازک اور اہم منصب ان کے حوالہ کر دیا جائے- اسی لیے مقام نبوت کا انتخاب انسانوں کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ جو خالق کائنات ہے وہی خود ان کا انتخاب فرماتا ہے-

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ۷۵)

اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام پہنچانے کے لیے انتخاب فرمالیتا ہے اور اسی طرح بعض کو آدمیوں میں سے بھی-

اگر تاریخی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کا یہ جوہر استعداد دیکھنا ہو تو سورۂ یوسف اٹھا کر پڑھ لیجئے- کس طرح فوطی فار فرعون کی فوج کے سردار نے پہلے غلام سمجھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا پھر تجربہ کے بعد کس طرح اپنی سلطنت کا نظم و نسق سب ان کے حوالہ کر دیا- حسب بیان تورات ان کے حسن انتظام سے فوطی فار کی آمدنی دوگنی ہوگئی تھی- (پیدائش ۳۹:۴)

کون باور کر سکتا ہے کہ اگر انبیاء میں یہ جوہر استعداد نہ ہوتا تو جو کل زرخرید غلام نظر آ رہا تھا وہ بہت تھوڑی سی مدت میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نظر آ سکتا تھا' بالخصوص جب کہ وہ اپنے گھرانے سے جدا ہوا تو اس کے ماحول کی زندگی بدویانہ زندگی تھی اور جہاں آ کر اس نے زمام حکومت سنبھالی وہ انتہاء درجہ پر متمدن ملک تھا- اسی خدا نے آخر میں پھر ایک صحرا نشین ہی کو پیدا فرمایا اور فارس و روم جیسی متمدن حکومتیں سب اس کے زیر نگیں کر دیں- کیا اب بھی کوئی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں ملوکیت کا جوہر نہیں ہوتا-

آدم علیہ السلام کی سرگزشت میں اسی حقیقت پر ایک اہم تنبیہ ٭ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کی خلافت اور ملائکۃ اللہ کی سرگزشت کا جگہ جگہ تذکرہ فرمایا گیا ہے- اور خوب واضح کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو زمین

کی خلافت صرف یونہی سپرد نہیں کر دی گئی تھی بلکہ قدرت نے پہلے سے ان میں وہ اعلیٰ جوہر بھی ودیعت فرما دیئے تھے جو خدائی خلافت اور نیابت کے لیے ہونے چاہئیں- اور اسی لیے زیر حکومت آنے والی اشیاء کی تعلیم خاص طور پر ان ہی کو دی گئی تھی- تعجب کی بات ہے کہ ملائکۃ اللہ ہزار اپنی تسبیح و تقدیس کا بڑے عجز و نیاز کے ساتھ اظہار کرتے رہے مگر قدرت کا فیصلہ پھر ان کے خلاف ہی رہا یہ اس لیے کہ دنیا کو یہ سبق ملے کہ اسلامی حکومت یا خلافت میں سب سے پہلے صلاحیت و قابلیت کو جانچا جاتا ہے-

آدم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ میں مقابلہ کا امتحان اور اس کا نتیجہ ٭ صرف مصلی اور تسبیح کی فضیلت سے ملک حوالہ نہیں کر دیا جاتا- اس قابلیت کے فقدان کی وجہ سے خلافت تو درکنار اشیاء کے اسماء کی بھی ان کو تعلیم نہیں دی گئی- اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت ملا اور ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ان کو فرعون کا مقابلہ کرنا ہے- ایسے بد دماغ کو یہ بات سمجھانی کہ تو نہ حقیقی مالک ہوسکتا ہے' نہ حقیقی ملک- کتنی فصاحتِ لسانی کا محتاج ہے' ادھر میری زبان میں لکنت ہے تو ان کی نظر بھی اسی طرف گئی اور انہوں نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر مجھے ایک فصیح البیان وزیر بھی مددگار کے طور پر عنایت ہو جائے تو میرے کام میں بہت سہولت پیدا ہو جائے پھر جب اس امت کا دور آیا تو یہاں بھی خلافت کے وقت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زاہد کی طرف کسی کی نظر نہ اٹھی بلکہ اس سے بڑھ کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرابت کی طرف بھی اس وقت نظریں نہ گئیں- معلوم ہوا کہ دنیوی خلافت ہو یا اخروی ہر جگہ قابلیت و صلاحیت کی رعایت انبیاء علیہم السلام نے بھی سب سے مقدم رکھی ہے' ان کے خلفاء نے بھی اور خود خالق کائنات نے بھی- پھر یہ خیال کس قدر سفیہانہ خیال ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کے لیے صرف تسبیح و تہجد کی تلاش ہوتی ہے- اگر ایسا ہوتا تو زمین کی خلافت کے لیے تسبیح و تقدیس سے زیادہ نظامی قابلیت کا ہونا ضروری ہے- بھلا جو مخلوق اپنی زیر حکومت اشیاء کے ناموں تک سے ناآشنا ہو وہ ان کی ضروریات کی رعایت کیا کر سکتی ہے' اور ان کا نظم و نسق کیا چلا سکتی ہے- یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کسی منصب کے لیے دنیا میں اس کی قابلیت کا ہونا ضروری ہو اور اس کے لیے مقابلہ کا امتحان بھی لازم سمجھا جائے تو جس کے قبضہ میں قابلیتوں کی آفرینش ہے وہ قابلیت اور امتحان مقابلہ کے بغیر صرف یونہی اپنی نیابت کا اہم منصب آدم علیہ السلام کے سپرد کر دیتا- بے شک حکومت کے لیے جہاں صرف تسبیح و تہجد کو دیکھا نہیں جائے گا وہاں یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ جو نیابت کے فرائض ہی سے ناآشنا ہو اور حکومت الٰہیہ کی بجائے خود اپنے تراشید وقوانین نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو- خدا تعالیٰ کی زمین اس کے حوالہ کر دی جائے- دنیا کی تاریخ میں جب کبھی ایسا ہوا ہے تو خدا تعالیٰ کی زمین ہمیشہ طغیان و سرکشی اور شر و فساد سے بھر گئی ہے' لہٰذا اسلامی حکومت کے لیے وہی شانِ جامعیت درکار ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کلام میں ذکر ہو چکا ہے-

ہمارے مذکورۂ بالا بیان سے یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اس غیبی رشتہ کا مطلب یہ ہے کہ مادی نظام ان کی نظروں میں بالکل معطل ہوتا ہے- علل و اسبابِ ظاہری کا قدرتی نظام سب بیکار ہوتا ہے اور اب حصولِ مقاصد کے لیے صرف دعاؤں اور خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتوں کا انتظار کرنا چاہیے- نہیں نہیں' مادی نظام کی رعایت مادہ پرستوں سے کم یہاں بھی

نہیں ہوتی مگر یہاں اس کو صرف اسباب وعلل ظاہری کی حد تک ہی سمجھا جاتا ہے' مؤثر حقیقی نہیں سمجھا جاتا - اس لیے لشکر کی صف آرائی بھی ہوگی' جس سمت سے دشمن کا خطرہ ہو اس طرف پہرہ بھی مضبوط رکھا جائے گا - جدید آلات بھی استعمال کیے جائیں گے' خندق بھی کھودی جائے گی' جنگی راشن اور اس کی تقسیم کا انتظام بھی پورا پورا کیا جائے گا - غرض تمام نظام زندگی کے ہر ہر گوشہ میں مادی اسباب کی بھی پوری رعایت رہے گی یہ سب کچھ ہوگا مگر ہوگا اسی استحضار کے ساتھ کہ اصل تاثیر صرف وحدہٗ لاشریک لہ کے قبضہ میں ہے - اس لیے اگر ان کے پیچھے دشمن ہو اور سامنے سمندر اور موت کے اسبابِ ظاہری سب جمع نظر آئیں پھر بھی ان کو ذرا ہراس نہیں ہوتا اور بڑے اطمینان کے لہجے میں وہ یہ کہہ دیتے ہیں ﴿اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ﴾ جب میرے رب کی حقیقی طاقت میری پشت پر موجود ہے تو مجھے غم کیا ہے - سیال پانی بھی مجھ کو راستہ دینے پر مجبور ہوگا - آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اس میں جھونک دینے پر دشمن تلے نظر آتے ہیں مگر ان کے بحر سکون میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی' اس لیے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جس نے آگ میں جلانے کی فطری صفت پیدا کی ہے وہ اس کو بدل بھی سکتا ہے - بس عالم غیب پر ان کے اس اعتماد کو دیکھ کر ہی ناواقف عقول کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ مادی نظام ان کے یہاں معطل ہوتا ہے - حالانکہ مادی نظام کی غیبی نظام کے سامنے حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ مادی نظام صرف ایک صورت کی حیثیت رکھتا ہے اس کی روح وہی غیبی نظام ہوتا ہے - یہ دوسری بات ہے کہ ضعیف نظریں اس غیبی نظام کا ادراک ہی نہ کر سکیں -

اب آپ دنیوی حکومت اور اسلامی خلافت کا فرق سمجھ گئے ہوں گے - ہم آخر میں پھر اس کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام صرف جبرئیل صفت نہیں ہوتے بلکہ وہ ملوکیت مگر شرعی ملوکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے حامل بھی ہوتے ہیں' بے شک ان کے پورے کے پورے آئین کا رشتہ خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی ہدایت ربانی سے کٹ نہیں سکتا اور نہ ہمارے نزدیک یہ ممکن ہے - جب دنیا میں ہر کمزور کی سیاست یہ ہے کہ وہ کسی طاقتور کی پناہ میں رہے تو انبیاء علیہم السلام جیسے حقائق آگاہ سے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے عہد خلافت میں خود اپنی حکومت کی اصل طاقت ہی کو فراموش کر بیٹھیں - یہ تو ان کی ملوکیت کی کچھ تفصیل تھی اب اسی پر ان کے علم وحکمت اور رشد وہدایت کے معاملہ کو قیاس کر لیجئے -

نبوت کا رکنِ ثانی یعنی علم وحکمت ٭ انبیاء علیہم السلام جو علوم لے کر آتے ہیں اس کی تفصیل آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیان میں ملاحظہ فرما چکے ہیں یہ وہ علوم ہیں جن سے کہ نفس انسانیہ کے شرف وکمال اور تمام نظام عالم کی اصلاح کا تعلق ہوتا ہے' اگر عالم ان علوم سے غافل رہے تو انسانیت کا کمال ہی عالم سے معدوم ہو جائے -

علوم نبوت کی پہلی خصوصیت حقوقِ انسانیت کا تحفظ اور مصالح عالم کی رعایت ہے ٭ اب مثال کے طور پر آپ صرف معاملات کے ایک شعبہ ہی کو لے لیجئے' جیسے بیع وشراء اور نکاح وطلاق' یوں تو سب دنیا ہی اس پر ہمیشہ سے غور کرتی چلی آئی ہے - اور اپنے اپنے زاویہ خیال کے مطابق ان کا ایک آئین بھی مقرر کرتی رہی ہے مگر اس کی انتہاء صرف بائع ومشتری اور صرف زوج وزوجہ کی بہبودی کی حد تک ہے یا اس سے اور آگے اپنے ملک کی حد تک سمجھ لیجئے لیکن بقیہ عالم پر اس کے اثرات کیا ہوں گے اس بحث سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا - انبیاء علیہم السلام کی نظر اس طرف بھی رہتی ہے کہ ان کے آئین میں ایک دفعہ بھی ایسی

نہیں ہوسکتی جو عالم کے کسی خطہ کے حق میں بھی مضرت رساں ہو۔[۱] یہ اس لیے کہ وہ حقوقِ انسانیت کے سب سے بڑے محافظ بنا کر بھیجے جاتے ہیں، اور دراصل خلافتِ الٰہیہ کا تقاضہ بھی یہی ہے اور اسی لیے ان کی ملوکیت کا بڑا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اگر آپ انبیاء علیہم السلام کے آئین کی تلاش کریں گے تو اس میں حیوانات تک کے حقوق کے تحفظ کا بھی ایک مستقل باب دیکھیں گے۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی احادیث میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اس وقت اگر ہم اس پر تفصیلی کلام کریں تو اصل موضوع سے بہت دور ہو جانے کا خطرہ ہے اس لیے ہم صرف معاملات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی نظام میں اگر کوئی جزء اہم سمجھا گیا ہے تو وہ صرف طرفین کی رضامندی ہے اگر طرفین کسی معاملہ پر راضی ہو جاتے ہیں تو اس معاملہ کا اثر خواہ نظامِ عالم پر کچھ بھی ہو اور حقوقِ انسانیت اس کی بدولت کتنے ہی پامال ہوتے نظر آئیں مگر مادی قانون میں وہ جائز تصور کیا جاتا ہے اسی بناء پر سود کا لین دین جائز ہی نہیں بلکہ ایک بڑے طبقہ کی نظر میں ترقی کی سب سے بڑی شاہراہ سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح زناء اگر طرفین کی رضامندی کے ساتھ ہو تو وہ کوئی جرم متصور نہیں ہوتا لیکن انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں طرفین کی رضامندی بھی گو اہم جزء ہے مگر صرف اتنی بات کسی عقد کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی وہ اس پر بھی نظر رکھتے ہیں کہ اس معاملہ کا اثر بقیہ عالم اور حقوقِ انسانیت پر کیا پڑتا ہے اس لیے اسلام طرفین کی رضامندی کے باوجود سود کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ سود اگرچہ ایک طبقہ کے لیے جلبِ زر کا ذریعہ ہو جائے مگر دوسرے طبقہ کے لیے یقیناً نقصان کا موجب ہو جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے آئین کی ایک دفعہ بھی ایسی ہو جس سے اصولی طور پر عالمِ انسانی کے کسی طبقہ کی بربادی کا خطرہ یقینی ہو جائے اس لیے ان کی نظروں میں یہاں طرفین کی رضامندی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی طرح زناء کا مسئلہ ہے یہاں بھی ان کے آئین میں رضامندی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ان کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسے انسان کو خدا تعالیٰ کی زمین پر جینے کا کوئی حق ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اگر شرعی ثبوت کے بغیر کسی انسان کے متعلق یہ تہمت لگائی جائے تو ہمیشہ کے لیے اس تہمت لگانے والے کی گواہی قابلِ قبول نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ معاملہ صرف دو انسانوں کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ تمام ماحول اور آئندہ نسل تک بھی اس کے برے اثرات متعدی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس فعل کا کسی حیوان کے ساتھ بھی مرتکب ہو تو اس حیوان کی نقل و حرکت سے چونکہ اس مخرب اخلاق فعل کی یاد تازہ ہوتی ہے اس لیے اس کے بھی

---

[۱] کمیونسٹ بھی گو آج یہی دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں مگر یہ دعویٰ ان کا صرف زبانی ہے۔ وہ ریاست کے نام سے وہ تمام مظالم جائز سمجھتے ہیں جو ملوک شخصی نام سے جائز سمجھتے رہے ہیں، بس ع وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملوکیت کی نفی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ نظامِ عالم کو جس مہذب ملوکیت کی ضرورت تھی اس کی بھی نفی کر ڈالی ہے اور اس طرح اب گو یہ وہ ملوکیت تو نہیں رہی جس کے ظلم سے تنگ آ کر دنیا چیخ اٹھی ہے لیکن اس سے بدتر وہ صورت بن گئی ہے کہ جس کے مظالم سے دنیا کے نابود ہو جانے کے خطرات آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہیں، جو آج نہیں تو کل ضرور آپ کے مشاہدہ میں آ کر رہیں گے اس وقت آپ چیخ چیخ کر کہیں گے کہ رحم اللّٰہ علی النباش الاولی - یعنی اس سے تو پہلی ہی ملوکیت غنیمت تھی۔ درحقیقت ملوکیت کا اگر کوئی صحیح تصور ہوسکتا ہے تو وہ صرف خلافت کے لفظ سے ادا ہوسکتا ہے جس کی قدرے تفصیل آپ سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

معدوم کر دینے کا حکم ہے- یہ شدت اسی لیے رکھی گئی ہے کہ اس حیاء سوز حرکت سے حقوق انسانیت کو بھی دھبہ لگتا ہے اور نظام عالم بھی درہم برہم ہوتا ہے-

مادی دنیا کے نزدیک دولت جمع کرنے کا اصول دولت کی آمد وصرف کا صحیح علم حاصل کرنا ہے- انبیاء علیہم السلام کی معاشیات میں بھی اس نقطہ سے غفلت نہیں ہوتی ان کے یہاں بھی مالی مسئلہ صرف ان دو سوالوں ہی کے ماتحت دائر ہے- حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلا سوال جو مالیات کے متعلق ہوگا وہ یہی ہوگا ''من این اکتسبه و این انفقه'' یعنی اس کے ذرائع آمدنی اور مواقع صرف بتاؤ- مگر مادی دنیا میں اس سوال کی جوابدہی خالق عقل کے سامنے بھی کافی ہو سکتی ہے یا نہیں- اس لیے ان کے یہاں آمد اور صرف کے ذرائع میں پہلی بحث یہ ہوتی ہے کہ یہ مال حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے یا حرام ذرائع سے اور اسی طرح اس کا صرف بھی کس محل پر ہوا ہے-

حلال وحرام کا صحیح مفہوم ✻ حلال وحرام کی تعبیر سے آپ متوحش نہ ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آمد وصرف میں نظام عالم کی صلاح و بہبودی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یا نہیں یعنی کسی انسان پر ظلم تو نہیں کیا گیا' کسی ظلم کے لیے صرف تو نہیں ہوا' جو چیز مال کی تعریف میں نہیں آتی اس کو مال تو نہیں بنالیا گیا- اس قسم کے دوسرے مصالح کی رعایت سے شریعت حلال وحرام ہونے کا حکم لگا دیتی ہے اب رہے وہ علوم جو انسان کی خارجی ضروریات سے متعلق ہیں چونکہ ان کا تعلق زندگی کے ارتقاء وانحطاط کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس لیے وہ خود انسانی عقل کے حوالے کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ حسب ضرورت جتنا چاہے ان کو پھیلا لے- یہاں صرف اتنی ہی مداخلت کی گئی ہے کہ ان میں شریعت کے اہم اصول پیش نظر رہنے چاہئیں یعنی نہ حرام طریقے پر وہ حاصل کیے جائیں اور نہ حرام مقصد سے حاصل کیے جائیں' وغیرہ وغیرہ-

علوم نبوت کی دوسری خصوصیت حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے ✻ انبیاء علیہم السلام کے علوم کی دوسری امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کے لیے پورے ضامن ہوتے ہیں اسی لیے کسی نبوت میں بھی ان کے اصول قابل ترمیم نہیں ہوتے جس طرح ایک حقیقت ہمیشہ حقیقت رہتی ہے اسی طرح ان کے اصول بھی یکساں رہتے ہیں- رہ گئے فروعی تغیرات تو چونکہ وہ انسانی تغیرات کے تابع ہیں اس لیے ان میں ترمیم اور کمی بیشی ہونا ضروری ہے مگر یہ بھی ان ہی اصول کی روشنی میں ہوتی ہے جو روز ازل مقرر ہو چکے ہیں- دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں وہ کسی جگہ بھی اپنے متعلق حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے' اسی لیے یہاں ہر شخص کو طبع آزمائی کا موقعہ ملتا ہے اور ہر نئے دن ایک نئی تحقیق دنیا کے سامنے آجاتی ہے اور وہ بھی متناقض- ابھی چند روز کی بات ہے کہ فلسفہ ارتقاء کا کس زور شور سے نقارہ پیٹا جا رہا تھا' یا فوراً کچھ ہی مدت کے بعد اس کو ایک علمی جرم سمجھا جانے لگا- کمیونزم ابھی اپنے شباب کو بھی نہیں پہنچا کہ افراط وتفریط کی کتنی صورتیں بدل چکا ہے اور ابھی اس کا انتظار کیجئے کہ وہ جا کر ٹھہرتا کہاں ہے- یا پھر واپس ہو کر ادھر ہی آتا ہے جدھر اسلام نے راہنمائی کی ہے-

علوم نبوت کی تیسری خصوصیت جزم وقطعیت ہے ✻ انبیاء علیہم السلام کے علوم کی تیسری امتیازی صفت قطعیت ہے- وہ یقین کے اس نقطہ پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی' اسی صفت کو قرآن کریم میں جابجا

﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کہہ کر ادا کیا گیا ہے- عجیب بات ہے کہ عالم غیب مادی عقول کے نزدیک جتنا علم ویقین سے دور ہے' انبیاء علیہم السلام کے نزدیک وہ اس سے زیادہ علم ویقین میں ہوتا ہے- مثلاً قیامت کا عقیدہ- دیکھ لیجئے ہمیشہ سے مادی عقول اس کو قابل مضحکہ سمجھتی رہی ہیں اور اس کے خلاف عقلی دلائل کا زور بھی صرف کرتی رہی ہیں- عقلاء کو چھوڑ کر اگر عرب کو دیکھئے وہ ہر بعید سے بعید بات کو مان لیتے تھے مگر یہاں ان کو بھی صاف انکار تھا' مگر تمام عالم کے اس انکار اور خلافِ دلائل کی بھرمار کے باوجود کیا کوئی نبی بھی ایسا گزرا ہے جس کو قیامت کے وجود میں ادنیٰ سا بھی شبہ گزرا ہو- حتیٰ کہ آخر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ مبارک آیا تو یہاں پھر جتنے زور کے ساتھ اس کا انکار کیا گیا اتنے ہی زور کے ساتھ اس کا اثبات کیا گیا' اور اس مسلسل اور مدلل انکار سے ادنیٰ شبہ بھی پیدا نہ ہو سکا-

﴿قُلْ بَلٰى وَ رَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ﴾ اے پیغمبر کہہ دو ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم پر ضرور آ کر رہے گی- (السبا : ۳)

دنیا کے کسی علم میں اتنی قطعیت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے- یہ بات دوسری ہے کہ محض توہمات اور ظنیات کے دفتر کو قطعیات سمجھ لیا جائے' یہ اپنے قصورِ علم اور قصورِ فہم کا نتیجہ ہے- پھر ان کے یہ سب علوم وہ ہوتے ہیں جن کے حصول کا انسانوں کے ہاتھ میں کوئی ذریعہ نہیں ہوتا- اسی لیے آپ قرآن کریم میں جابجا ان کا یہ اعلان پڑھیں گے- ﴿اِنِّىْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی میرے جو علوم ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں تم ان کو نہیں جانتے- پھر چونکہ ان علوم کی نوعیت ہی کسبی اور اصطلاحی علوم سے جداگانہ ہوتی ہے اس لیے جو کسبی اور فنی علوم کے خوگر دماغ ہیں وہ ان کے ان علوم کو بھی اسی معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ انسانی دماغ کے تراشیدہ علوم سے مطابقت نہیں رکھتے اس پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے لگتے ہیں- حالانکہ معقول بات ہمیشہ معقول ہی رہتی ہے اگر وہ علوم درحقیقت معقول ہیں تو اس بناء پر کہ وہ چونکہ موجودہ کتابوں میں کہیں مدون نہیں ملتے' بس اس لیے ان کو تسلیم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں وہاں اگر آپ کے پاس چشمِ بینا ہو تو آپ ان کو خود اپنے صحیفۂ فطرت اور صحائفِ عالم میں پڑھ بھی سکتے ہیں-

<u>انبیاء علیہم السلام کے رُشد و ہدایت اور جمیع کمالات کی نوع علیحدہ ہوتی ہے</u> ٭ ان کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی الفاظ میں کیا ادا کیا جا سکتا ہے- بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ جو ان کی صحبت میں ایمان کے ساتھ ایک مرتبہ آ بیٹھا وہ باجماع امت جنیدؒ و شبلیؒ سے کہیں بڑھ کر بن کر اٹھ گیا- اگر یہ ہستیاں دنیا میں نہ آتیں تو نہ کوئی جنیدؒ بنتا نہ شبلیؒ- خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات خواہ وہ ان کی قوتِ علمیہ کے ہوں یا قوتِ عملیہ کے سب کی نوع ہی تمام مخلوقات کے کمالات سے علیحدہ ہوتی ہے- ان کی صفات کا منبع براہِ راست حق تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ ہوتی ہیں' خدا تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں مالک الملک' علیم' حکیم' رشید بھی ہیں- انبیاء علیہم السلام کے مذکورہ بالا کمالات ان اسماءِ حسنیٰ کے مظاہر ہوتے ہیں- ان کی صفت ملوکیت وہ نہیں ہوتی جو قیصر و کسریٰ کی تاریخوں میں مدون ہے بلکہ خود حاکم حقیقی اور مالک علی الاطلاق کا ظل ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ گو وہ خود حکومت کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ان کی نیابت کا احترام ارضی اور سماوی سب طاقتیں کرتی ہیں- سمندر دو ٹکڑے ہو کر ان کی فوج کو راستہ دے دیتے ہیں اور

آسمان کے فرشتے نمازوں میں اور جنگوں میں حاضر ہوکر ان کے ساتھ شرکت کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں- ان کی حکمت اور ان کا علم بھی وہ نہیں ہوتا جس پر یونان کو یا ڈارون اور ہٹلر کو ناز تھا' بلکہ وہ اس علم بیکراں اور حکمت بے پایاں سے سیراب کیے جاتے ہیں جس کے احاطہ کے لیے اگر دنیا کے اشجار قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی تو بھی ناکافی رہیں- ان کی رشد و ہدایت بھی وہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں اس کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو تمام جہان میں رشد و ہدایت کی ایک کرن بھی چمکتی نظر نہ آتی - اس لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ان بیان کردہ صفات کا اندازہ صرف اتنا ہی نہیں کرنا چاہیے کہ نبی میں قوت علمیہ بھی ہوتی ہے اور عملیہ بھی' بلکہ یہاں تمام مخلوقات میں کسی کو ان کے ساتھ شرکت حاصل نہیں ہوتی اور جو شرکت محسوس ہوتی ہے وہ صرف اسمی شرکت ہوتی ہے' ان کی حقیقت میں کوئی شرکت نہیں ہوتی - اگر کچھ اجمالاً اشارہ کیا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ جس طرح نبوت و رسالت کسب سے بالاتر کمال ہے- اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی کسب سے بالاتر ہوتا ہے- ع قلم اینجا رسید و سر بشکست -تفصیل دیکھنی ہو تو مکتوبات امام ربانیؒ کا مطالعہ فرمائیے-

نبی کی عام صفات کی حقیقت بھی مخلوق کی عام صفات سے علیحدہ ہوتی ہے ٭ یہاں ایک بات قاعدۂ کلیہ کے طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی مذکورہ بالا صفات کے سواء ان کی جتنی اور صفات ہیں ان کی حقیقت بھی عام مخلوق کی صفات سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے- مثلاً صداقت' دیانت و امانت' اخلاق کی رفعت' خلق اللہ کے ساتھ ان کی عام ہمدردی اور ان کا عدل و انصاف وغیرہ- جب کبھی انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے ذیل میں آپ ان صفات کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو آپ کا قلب اس کا ضرور اعتراف کر لیتا ہے کہ اپنے اپنے دور میں بے شک و شبہ وہ بلند کردار کے حامل انسان تھے مگر اس کے ساتھ آپ ہر دور میں ایسے اور انسان بھی تاریخ میں دیکھ لیتے ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوتی ہیں مگر وہ نبوت و رسالت کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتے اس لیے آپ اپنے ذہن میں ان صفات اور نبوت و رسالت کے مابین کوئی ایسا ربط نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے آپ کسی انسان کو ان صفات کا مالک دیکھ کر کوئی ایسا غیر مدرک بالعقول منصب دے دیں جو مادی عالم میں ممکن الحصول نہ ہو اس لیے آپ اس کو صرف فرط عقیدت اور دنیا کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثمرہ تصور کر لیتے ہیں- حالانکہ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ دنیا میں جب کبھی ایسی ہستیوں نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیشہ عقلاء نے ان کے متعلق ان کے اخلاق' ان کی صفات' ان کی تعلیمات اور تبع جماعت ہی کی تفتیش کی ہے جیسا کہ ہرقل کی حدیث میں عنقریب آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان صفات اور اس دعوے کے درمیان عقلی لحاظ سے گو کوئی تلازم نہ ہو مگر خارجی تاریخ کے لحاظ سے کوئی ایسا ربط ضرور ہے جس کے سبب ایسا دعویٰ غور و تامل کا محتاج ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت ایسے دعوے کا امکان ہو تو اس کی تصدیق کے لیے شاہانہ عقل بھی مضطر ہو جاتی ہے-

اس کا راز یہ ہے کہ یہ صفات گو عام انسانوں میں بھی پائی جا سکتی ہیں مگر اس کی وہ خاص نوعیت نہیں ہوتی جو نوعیت کہ انبیاء علیہم السلام کی صفات کی ہوتی ہے مثلاً صدق و امانت عام انسانوں میں بھی موجود ہو سکتی ہے- مگر جب آپ انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے صدق و صفا پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں اگر کوئی والدہ اپنے بچہ کو کچھ دینے کے بہانہ سے بلائے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز نہ ہو تو یہ بھی ایک جھوٹ شمار ہو جاتا ہے اسی طرح دو شخص اگر باتیں کر رہے ہیں اور باتیں کرتے کرتے

ان میں سے کوئی دفعہ اپنے دائیں بائیں دیکھ لیتا ہے تو ان کے نزدیک یہ بات بھی امانت میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کو اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے سامنے کہنا روا نہیں رہتا- جب عام امت کے لیے ان معمولی اوصاف میں ان کا معیار یہ ہو تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کی نوعیت کیا ہو گی اس کا اندازہ آپ خود فرمالیں یہی وجہ تھی کہ صدق و امانت کی صفت اگرچہ آپ کے زمانہ میں بھی بہت سے شرفاء میں موجود تھے خود ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ آئندہ لوگ میری نسبت دروغ گوئی کا عیب نقل کرتے رہیں گے تو ہرقل کے سامنے میں آپ کے متعلق ضرور کوئی بات جھوٹی لگا کر رہتا- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی کذب کی تہمت نا قابل برداشت عیب سمجھا جاتا تھا- اب سوچئے کہ ایسے ماحول میں پھر وہ بات کیا تھی جس کی بناء پر لوگوں نے صدوق و امین کا لقب صرف آپ ہی کی ذات گرامی کے لیے مخصوص کر دیا تھا- اسی طرح تاریخ میں ایک عبداللہ بن سلام کی نہیں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ آپ کی صفات کا حال سن کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکے مگر جب انہوں نے بچشم خود ان کا نظارہ کر لیا تو پھر ان کا صرف یہی ایک فیصلہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں- بات یہی تھی کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ- آپ کی صفات کے صرف سننے اور پڑھنے والے ان کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے اور مشاہدہ کرنے والے یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ صفات گو عام انسانوں ہی کی ہیں مگر یہاں ان کی نوعیت کچھ علیحدہ نظر آتی ہے-

ساحرین فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء کا حال جب تک سنا ہی سنا تھا' اس وقت تک وہ ذرا مرعوب نہ تھے بلکہ خود اپنی رسیاں لے لے کر ان سے مقابلہ کرنے کے لیے آڈٹے تھے مگر جب آ کر بچشم خود اس کا مشاہدہ کر لیا تو اپنے منہ کے بل جا پڑے اور حق کی اس قاہرانہ طاقت کو دیکھ کر بے ساختہ ایمان لے آئے- پس انبیاء علیہم السلام کی ظاہری صفات ہوتی تو وہی ہیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں مگر ان کی حقیقت اور ان کے مراتب کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا نہ الفاظ میں وہ ادا کی جا سکتی ہے۔

گر مصور صورتے آں دلربا خواہد کشید　　　لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

اسی لیے جب ایک بار حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے متعلق سوال کیا گیا' وہ کیا تھے اور کیسے تھے؟ تو اس کے جواب میں وہ صرف ایک یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئیں کان خلقه القرآن- آپ کا اخلاق دیکھنا چاہو تو بس یہ قرآن دیکھ لو- اگر وہ چاہتیں تو یہاں آپ کے اخلاق حسنہ کا ایک دفتر کھول دیتیں مگر ان کے سامنے اخلاقِ نبوت کی حقیقت بے حجابانہ جلوہ نما تھی وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کی تفصیل کرنی حیطہ بیان سے باہر ہے اگر اداء کریں تو اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں' اور اگر بیان نہ کریں تو جواب کیا دیں- سبحان اللہ آپ کی اس نو سالہ صحبت یافتہ زوجہ مطہرہؓ نے کیا فصاحت و بلاغت سے لبریز جواب دیا جس کو سن کر ایک فہیم انسان کے سامنے آپ کے معجز اخلاق اور ان کی ادائیگی کے لیے الفاظ کی کوتاہی کا پورا پورا فوٹو کھنچ جاتا ہے- فرماتی ہیں کان خلقه القرآن - یہ سارا کا سارا قرآن آپ کا اخلاق ہی تو ہے- اسی طرح آپ کی تہجد کی رکعات کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا- ذرا بتایئے وہ کس کیفیت اور کس انداز کی ہوا کرتی تھیں تو یہاں بھی ان کا پورا نقشہ کھینچنے سے وہ اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر کے خاموش ہو گئیں- یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنهن و طولهن - آپ چار چار رکعتیں پڑھتے مگر وہ کتنی لمبی لمبی رکعتیں ہوا کرتی تھیں اور کیسی دلفریب ہوتی تھیں اس کا حال نہ پوچھو بس اتنا ہی سن لو کہ وہ پڑھنے والے تھے اور میں ان کا نظارہ کرنے والی' وہ زبان

میرے پاس نہیں کہ جس سے ان کا طول وحسن ادا کرسکوں -

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں ــــ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی
دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار ــــ گلچیں بہار تو زد اماں گلہ دارد

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سارا عالم ہی نرالا ہوتا ہے' ان کی صورتوں کا بھی ان کی سیرتوں کا بھی - آپ چاہتے ہیں کہ یہاں بھی صرف تاریخ کے چند الفاظ پر ہی فیصلہ کر ڈالیں - اور ادھر ذرا توجہ نہیں فرماتے کہ تاریخ اتنا ہی کرسکتی ہے کہ ان کی صفات اور ان کے اخلاق کو صرف الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے لے آئے یہ فرض آپ کا ہونا چاہیے کہ خارجی حالات و واقعات سے ان کے مراتب اور ان کی نوعیت کا اندازہ لگائیں مگر ان سے بھی حقیقت کا انکشاف کیا ہوسکتا ہے کیونکہ جب واقعات آپ کے سامنے آئیں گے تو وہ بھی الفاظ کا نقاب ڈال کر آئیں گے اس لیے حقیقت پھر مخفی کی مخفی رہ جائیں گی بس یہی ذرا سی بات تھی جس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں آنے والی امت کے ایمان کا رتبہ بہت بلند ہوگیا تھا - جمالِ رسالت کے مشاہدہ کی دولت گو صحابہ کے نصیب میں آگئی تھی مگر اس وجہ سے ان کو ایمان لانے میں بھی بڑی سہولت بہم پہنچ گئی تھی اس لیے وہ اگر ایمان نہ لاتے تو یہ قابل تعجب ہوتا اور پچھلی امت گو اس نعمت سے محروم رہی لیکن ان نامساعد حالات میں بھی چونکہ وہ ایمان لے آئی اس لیے ان کا ایمان لانا قابل تعجب بن گیا - (تفصیل کے لیے ترجمان السنہ جلد دوم کا پہلا باب ملاحظہ فرمائیے)

قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک خاص امتیاز ❊ بے موقعہ نہ ہوگا اگر ہم یہاں اتنا اور عرض کردیں کہ آئندہ امت کے سامنے جس طرح رسول کی ہستی موجود نہیں تھی اگر کہیں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص معجزہ بھی اپنی اصل صورت پر موجود نہ ہوتا اور وہ بھی صرف تاریخ اور راویوں کے بیان پر رہ جاتا تو نہ معلوم ایمان لانے والوں کی راہ میں کتنے کانٹے اور پیدا ہوجاتے -

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فلق بحر کا معجزہ دکھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑھ کر شق قمر کا معجزہ دکھایا مگر یہ دونوں کے دونوں قاہرانہ معجزے صرف ناظرین کے سامنے ہی سامنے ظاہر ہوئے اور ختم ہوگئے آئندہ امت کے سامنے صرف ان کی نقل در نقل باقی رہ گئی گو ان کی صداقت کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اٹھالی اور اپنی واضح اور محکم آیات میں جابجا اس کا تذکرہ بھی فرمایا مگر کیا کج فطرت انسانوں نے پھر ان مقدس الفاظ کی گردن مروڑ کر نہیں رکھ دی اور کیا آفتاب کی چمکتی ہوئی روشنی اور شب کے چمکتے ہوئے چاند کے یہ دونوں معجزے پھر مخفی کے مخفی نہ رہ گئے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ کی اصل صورت دیکھنے اور صرف اس کے سن لینے یا پڑھ لینے میں کتنا فرق ہوتا ہے - پس انبیاء علیہم السلام کی صفت ملوکیت' علم وحکمت اور رشد وہدایت کا تو کہنا ہی کیا ہے یہاں ان کے روزمرہ کے اخلاق و عادات کی گہرائی کا بھی اندازہ لگانا مشکل ہے - غریب ابن سینا تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیداری کے علوم کی حیثیت منامات کی برابر ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے منامات کی حیثیت بیداری کی وحیٔ کے برابر ہوتی ہے - اس کا خیال تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مدرکات کی خارج میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی وہ صرف ان کے نفس کے اندرونی خیالات ہوتے ہیں - مگر واقعہ یہ ہے کہ خارج میں درحقیقت کوئی حقیقت ہوتی ہے تو صرف ان کے علوم ہی کی ہوتی ہے -

قرآن کریم کو دیکھو وہ تم کو بتائے گا کہ مادی عالم سارا کا سارا لہو ولعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا - یہاں جو کچھ نظر آ رہا ہے سب بے حقیقت ہے، حقیقت کا عالم دوسرا ہے اور یہ عالم وہ ہے جس کا علم انبیاء علیہم السلام کو مرحمت ہوتا ہے کتنا تعجب ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم سے عالم خارجی کے گوشہ گوشہ میں جو عظیم الشان انقلابات مشاہدہ میں آ چکے ہیں ان کے بعد بھی عقلاء کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہو جاتی ہے کہ ان کو خارجی عالم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - اگر ان کے علوم کو خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو بھی عقل مندی اور دانائی کی ہر بات قابل غور ہوتی ہے - مگر یہاں تو جتنا گہرائی میں جائیے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن امور کو انسانی زندگی سے جتنا زیادہ لگاؤ ہوتا ہے وہ اتنا ہی انبیاء علیہم السلام کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں اور جتنا ان کا انسانی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا اتنا ہی وہ ان کے نزدیک دلچسپی کے قابل نہیں رہتے - اسی لیے افلاک و نجوم کے مباحث ان کے دائرہ علوم سے بالکل خارج ہوتے ہیں بلکہ جن علوم کا تعلق صرف خیالات کے ساتھ وابستہ ہو خواہ وہ کتنے بھی قابل ستائش اور ناز کے لائق شمار ہوں مگر وہ ان کے منصب سے گرے ہوئے سمجھے جاتے ہیں - عرب میں شاعری کا جو درجہ تھا سب کو معلوم ہے کیا یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن کریم ایک دیوان کی شکل ہی میں نازل ہو جاتا، مگر یہ تو کیا ہوتا وہاں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت ہی کو شاعری سے اتنا بعید رکھا گیا تھا کہ اگر شاذ و نادر طور پر کسی دوسرے شاعر کا شعر کبھی آپ کی زبان مبارک پر آ گیا ہے تو آپ نے قصداً اس کا وزن شعری کسی کلمہ کو مقدم مؤخر کر کے توڑ دیا ہے - گویا شعر گوئی تو درکنار شعر خوانی بھی نبوت کے شایانِ شان نہیں ہوتی پھر دنیا جانتی ہے کہ ظرافت بھی حیاتِ انسانی کا ایک باب ہے جس میں ملوک و سلاطین بھی شریک ہوتے ہیں مگر یہاں ظرافت میں بھی کیا مجال کہ ایک کلمہ زبان سے ایسا نکل جائے جو ہو بہو حقیقت نہ ہو، اسی طرح غصہ کی حالت میں ایک ضابطہ سے ضابطہ انسان کی زبان پر بھی ایسے کلمات آ جاتے ہیں جو صرف حالتِ غضب کا مظہر ہونے کے سواء کوئی حقیقت نہیں رکھتے - مگر یہاں حالتِ غضب کا عالم بھی یہ ہے کہ جو بات اس حالت میں آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے وہ بھی اتنی ہی اہمیت سے قابل ضبط و کتابت ہوتی ہے جیسا کہ عام حالات کی - پس جن شخصیتوں کی ظرافت اور غصہ کے کلمات بھی حقیقت سے سر مو تجاوز نہ کرتے ہوں ان کے علوم کو منامات کے برابر سمجھنا کتنا ظلم عظیم ہے اسی طرح جن کے نظام زندگی کا خارجی عالم سے اتنا گہرا تعلق ہو اور عالم حقیقت کے فوز و فلاح کا اسی پر دار و مدار ہو ان کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ خارجی عالم سے ان کو کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا کتنی بے بنیاد بدظنی ہے -

امید ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس بیان سے آپ نے نبوت کے کمالات کا کچھ اندازہ کر لیا ہوگا اور اسی طرح اس کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کا بھی آپ کو کچھ نہ کچھ تعارف حاصل ہو گیا ہوگا، لیکن چونکہ اس کو پورے طور پر سمجھنا علم و دقت فہم کا محتاج ہے اس لیے ہم یہاں آپ کے سامنے دوسرا وہ طریقہ بھی پیش کیے دیتے ہیں جو نہایت سادہ اور صاف ہے اور اس کا سمجھنا زیادہ غور و فکر کا محتاج بھی نہیں ہے -

حافظ ابن تیمیہؒ کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا طریقہ بھی دوسرے انواعِ انسانی کی طرح ان کے امتیازات و خواص ہیں ✻ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی شناخت کا طریقہ وہی ہے جو دوسرے انواع انسانی کی شناخت کا ہوتا ہے، دنیا میں اس مقدس نوع کے افراد بھی اسی طرح کثرت سے آتے رہے ہیں جس طرح کہ اطباء، شعراء،

ساحرین' مجنون اور کاہنوں کے- ان میں سے ہر ہر نوع کے ہر زمانہ میں کچھ ایسے خواص و امتیازات بھی صفحات تاریخ میں مدون ہوتے چلے آئے ہیں جن سے کہ وہ نوع کسی دور میں خالی نہیں رہی اس لیے بعد کی نسلوں نے ان کی ان ہی خصوصیات سے ان کو کسی تکلیف و تکلف کے بغیر پہچان لیا ہے- مثلاً جن اطراف میں طبیب پیدا ہوتے رہے ہیں یا کم از کم طبیبوں کی تاریخ سے ان کو پوری آگاہی حاصل ہوئی ہے ان کو اپنے دور کے کسی طبیب کی شناخت میں کبھی کوئی لاینحل دشواری پیش نہیں آئی- اسی طرح سحر و کہانت بھی مدت سے دنیا کی جانی پہچانی باتیں ہیں اس لیے یہاں بھی ساحر و کاہن کا حکم لگانے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی اور اگر بالفرض کچھ دشواری ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک حالات کا صحیح علم نہیں ہوتا- پاگل اور مجنون اور صفراوی بیماروں کا حال اس سے بھی زیادہ روشن ہے کیونکہ اس نوع کا وجود پہلی انواع سے بھی زیادہ عام ہے اس لیے ان کی خصوصیات بھی ان سے زیادہ روشن ہیں- اس لیے عام آدمی بھی مجنون اور غیر مجنون میں فرق کر لیتے ہیں- اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا گروہ بھی آفرینش عالم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہوتا چلا آیا ہے- ان کی بھی ایک تاریخ زندگی اور اس کی خصوصیات معلوم ہیں- لہٰذا جس طرح انسانوں کی دوسری انواع اپنی اپنی خصوصیات سے بآسانی معلوم ہو سکتی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی نوع کا معلوم کرنا بھی ذرا دشوار نہیں ہے- یہاں دشواری اگر ہے تو صرف اس کے لیے ہے جس کو اس نوع کی تاریخ ہی کا صحیح علم نہیں یا اس کا صحیح مطالعہ نہیں تو پھر ایک ان ہی پر کیا انحصار ہے طبیب اور ڈاکٹروں سے ناواقف کے لیے ان کی شناخت بھی اتنی ہی دشوار ہے- اب یہ بات بھی حل ہو گئی کہ یہ بدیہی مسئلہ آخر فارابی و ابن سیناء جیسے عقلاء کو حل کیوں نہیں ہوا اور آج بھی وہ کیوں لاینحل بنا ہوا ہے- بات یہ ہے کہ ان کو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے صحیح حالات نہیں پہنچے اور جن کو پہنچے انہوں نے غور کے ساتھ ان کا مطالعہ نہیں کیا اس لیے لازمی طور پر ان کو یہاں صرف انکل کے تیر ہی چلانے پڑے جیسا کہ ابن سینا نے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ نبوت کی یہ تحقیق ہم نے اس وقت لکھی جب کہ ہم کو ایک جماعت کے کچھ حالات پہنچے تو ہم نے چاہا کہ دوسری اشیاء کی طرح اس کے بھی کچھ اسباب لکھ دیں-

اس جگہ آپ کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبوت اور معجزات و وحی یہ سب اشیاء دین کے اہم مبادیات میں داخل ہیں- جب تک پہلے یہی مفہوم و معقول نہ ہو جائیں اس وقت تک دین کے آئندہ مسائل بھلا کیسے قابل تسلیم ہو سکتے ہیں اور جب ان مبادی کی حقیقتوں کے سمجھنے سے ارسطو اور فارابی اور ہمارے موجودہ دور کے عقلاء بھی عاجز ہوں تو ایسے امور کو دین کی مبادیات میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

نبوت و رسالت کی حقیقت دریافت کرنی گو مشکل ہے مگر نبی کی معرفت بدیہی ہے ⁕ یہ اہم سوال درحقیقت ایک ذرا سا نکتہ فروگزاشت کر دینے سے پیدا ہوتا ہے اگر آپ اس پر غور کر لیں کہ بہت سی اشیاء بدیہی ہوتی ہیں' لیکن جب بحث ان کی حقیقت معلوم کرنے میں آتی ہے تو وہی ہر نظری سے بڑھ کر نظری بن جاتی ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا' بے شک نبوت' معجزہ اور وحی کی حقیقت معلوم کرنی صرف عقلاء غیر مسلمین کے لیے ہی دشوار نہیں خود اہل اسلام کے لیے بھی لاینحل مسئلہ ہے' چنانچہ آج تک کتب کلام وغیرہ میں اس کی حقیقت کی تنقیح میں مختلف اقوال موجود نظر آتے ہیں لیکن اس دقت کے باوجود پھر خود نبی' وحی اور معجزہ کی معرفت اتنی بدیہی ہے کہ اس سے بڑھ کر شاید کوئی بات بدیہی نہ ہو اہل کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور

آپ کو اس طرح پہچان لیا جیسے باپ اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے عرب کے امی ایک دو نہیں ہزاروں ہزار کی تعداد میں آپ کی خدمت میں آئے' بہتوں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ کے نبی برحق ہونے کا یقین کالیا اور بہتوں نے کسی معجزہ کو دیکھا اور اس معجزہ کو بھی بداہۃً سمجھا اور پھر کسی دقت کے بغیر آپ کی نبوت پر بھی یقین کرلیا - اس کے بعد کسی کو آپ ؐ کے فیض صحبت سے کوئی خاص حصہ مل گیا وہ رموزِ وحی سے یہاں تک آشنا ہوگیا کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو وہ فوراً پہچان لیتا کہ اب آپ پر وحی نازل ہورہی ہے اور اس سے زیادہ اگر کسی کو اور قرب نصیب ہوگیا تو نزول وحی کے وقت اس کے قلب پر وحی کا کبھی اتنا انعکاس بھی ہوگیا کہ وحی کے ظاہری شکل میں آنے سے قبل ہی اس کا کوئی کلمہ اس کی زبان پر جاری ہوگیا - اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ عناصر اربعہ یعنی پانی' آگ' ہوا اور خاک یہ ان بدیہیات میں داخل ہیں' جن کے سمجھنے اور شناخت کرنے میں کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے - ذرا سا بچہ بھی پیاسا ہوتا ہے تو پانی کہہ کر اپنی ماں سے مانگ لیتا ہے اور اپنی تشنگی دور کرلیتا ہے - لیکن اگر اسی پانی کی حقیقت اس سے دریافت کی جائے تو وہی بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کالج سے باہر نکلتا ہے تو بھی اس کی پوری تشریح سے قاصر نظر آتا ہے - یہی حال ہوا کا ہے وہ پانی سے کہیں لطیف عنصر ہے اتنا لطیف کہ آنکھوں سے اس کا ادراک بھی نہیں ہوسکتا' لیکن اس کا بھی ایک بچہ ادراک کرلیتا ہے اور گرمی کے وقت پنکھا ہاتھ میں لے کر ہوا حاصل کرلیتا ہے لیکن کیا وہ اس کی حقیقت بتا سکتا ہے -

یہ حال تو ان بدیہی محسوسات میں ہے آپ اگر اس سے ذرا قدم آگے بڑھا کر عقلیات میں قدم رکھیے تو یہاں ان کی حقیقت کے ادراک میں آپ کو اور تاریکی در تاریکی نظر آئے گی - اسی لیے عقلاء قدیم نے عاجز آکر یہ بطور قاعدۂ مسلمہ لکھ دیا کہ ان التحدید الحقیقی عسیر جداً . یعنی کسی چیز کی حقیقت کا صحیح صحیح پتہ دینا یہ بہت مشکل ہے آپ اس فیصلہ کو تسلیم کریں یا نہ کریں مگر بہر حال ہے یہ بھی ایک عقلاء کی جماعت ہی کا فیصلہ یہی وجہ تھی کہ کسی نبی نے ان اشیاء کی نہ تو حقیقت بیان کرنے کی طرف خود کوئی خاص توجہ کی اور نہ اس کا بوجھ ہماری ضعیف عقول پر ڈالا ہے اور نہ کبھی ان پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور صرف بدیہی معجزات دکھا کر اپنے نبی ہونے کی بدیہی شناخت کرائی ہے' اس کے بعد وحی کے آبِ زلال سے تشنگانِ راہ خدا کی پیاس بجھائی ہے - پس نبوت اور معجزہ کی حقیقت کی پہچان خواہ کتنی ہی دقیق ہو لیکن خود نبی اور معجزہ کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہے اور یہی شناخت دین کی بنیاد ہے - حقیقت کے ادراک کی بحث کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے - نبوت تو درکنار ولایت والہام جو اس کے تحت کی اشیاء ہیں ان کی حقیقتوں کا ادراک بھی ناممکن ہے جب تک کہ خود اس شخص کو مقام ولایت حاصل نہ ہو - اسی وجہ سے مشہور ہے کہ ولی را ولی می شناسد - اگر اس ضرب المثل مقولہ پر بھی آپ ذرا گہری نظر ڈالیں گے تو یہ بھی آپ کو محل تامل نظر آئے گا اور واقعات شہادت دیں گے کہ یہ مقولہ بھی اطلاق کے ساتھ قابل تسلیم نہیں ہے بسا اوقات ایک ولی کو بھی دوسرے ولی کی ولایت کا پورا ادراک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ نفس ولایت کے بارے میں خود اولیاء کرام میں بڑا اختلاف موجود ہے - پھر نبوت کا تو ذکر ہی کیا ہے - شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں:

فلاینبغی ان یتکلم فی مقام الرسول الا رسول ولا فی مقام الانبیاء الانبی ولا ذوق	اس لیے رسول کے مقام میں رسول ہی کو اور انبیاء علیہم السلام کے مقام میں صرف نبی ہی کو گفتگو کرنا مناسب ہے - انبیاء علیہم

لنا فی مقام الانبیاء حتٰی تتکلم علیہ. السلام کے مقامات ہی سے جب ہم آشنا نہیں تو ان سے بحث
(الیواقیت ج ۲ ص ۴۷ و ۷۲) کیا کر سکتے ہیں-

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے جس امر کا مخلوق کو مکلّف بنایا ہے اس کو ہمیشہ آسان سے آسان تر رکھا ہے' اور جس حقیقت کا پورا ادراک نہیں ہوسکتا اس کا ہم کو مکلّف بھی نہیں بنایا- یہ شیطان کا ایک گہرا فریب ہے کہ جب وہ کسی کو راہِ حق سے روکنا چاہتا ہے تو مقاصد سے ہٹا کر ہمیشہ ایک عبث مشغلہ میں اُلجھا دیتا ہے اور ایسا اُلجھاتا ہے کہ انسان اسی میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور مقاصد تک اس کو رسائی کی نوبت ہی نہیں آتی - والعیاذ باللہ- اس لیے ہم یہاں ان مباحث میں پڑنے کی بجائے خود انبیاء علیہم السلام کے تعارف اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں-

انبیاء علیہم السلام جب کبھی دنیا میں تشریف لائے ہیں تو اپنے کامل تعارف کے ساتھ آئے ہیں

یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جب کبھی دنیا میں ظاہر ہوئی ہیں تو اپنے پورے تعارف کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں- وہ اچانک دنیا کے سامنے یونہی نہیں آ گئیں بلکہ پہلے سے ان کی ذات کا تعارف' ان کے مقام کا تعارف' اور ان کی خدمات کا تعارف بھی کرا دیا جاتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی آمد سے قبل ایک طبقہ کو جو اس تعارف سے آشنا ہوتا ہے ان کی آمد کا اس طرح انتظار ہونے لگتا ہے جیسا کسی متعارف اولوالعزم شخصیت کی آمد کا انتظار ہونا چاہیے- مثال کے طور پر اس وقت ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کا تذکرہ کرتے ہیں- تاریخ اور معتبر احادیث اس کی شاہد ہیں اور کتب سابقہ بھی اس کی گواہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل آپ کے ظہور کی علامات آپ ؐ کا آبائی وطن اور آپ کی ہجرت کا مقام' بلکہ اس کا نقشہ' آپ ؐ کا اسم مبارک اور مکمل حلیہ شریفہ' حتیٰ کہ آپ کے خاص اصحاب اور ان کے ساتھ عام امت کی صفات بھی اس تفصیل سے بیان میں آ چکی تھیں کہ آپ کے ظہور سے قبل عام محفلوں میں بھی آپ کا تذکرہ آنے لگا تھا' دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح ونصرت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں- قسیس اور رہبان آپ کی تلاش میں چشم براہ تھے اور سلمان فارسی جیسے عشاق گھر بار چھوڑ کر آپ ؐ کی جستجو میں صحراء بصحراء خاک چھانتے پھرتے تھے- جس طرح دن نکلتا ہے اور اس کے اجالے سے قبل روشنی کے آثار افق عالم پر چمکنے لگتے ہیں' شب کی تاریکی آتی ہے اور اس کے چھانے سے پہلے افق کا اجالا مدھم پڑنا شروع ہو جاتا ہے- اسی دستور کے مطابق اس آفتابِ ہدایت کے طلوع سے پہلے بھی آسمان کے افق اور زمین کے اطراف میں طرح طرح کے عجائبات کا ظہور ہونا لازمی امر تھا جن کے سبب سے بے علم انسانوں میں بھی کچھ کچھ شعور پیدا ہونے لگا تھا اور خفتہ طبیعتیں بیدار ہونے لگی تھیں- حتیٰ کہ ذی شعور انسانوں اور جنات سے گزر کر بے شعور مخلوق حجر وشجر بھی اس عظیم الشان انقلاب انگیز ہستی کی آمد آمد کے اثرات سے متاثر ہونے لگے تھے اور اس طرح ایک غیر معمولی واقعہ کے انتظار میں عالم کی آنکھیں لگ گئی تھیں- دوسری طرف حاسدین کی جماعت تھی' جو جزم ویقین میں تو اس طبقہ کی شریک تھی لیکن اس مبشر نبی کی آمد سے قبل ہی اس کا سینہ عداوت سے بھڑک رہا تھا اس نے بھی اپنی فرطِ عداوت سے چاروں طرف آدمی دوڑا دیئے تھے- خدا ہی جانے کہ آپ کی آمد سے قبل آپ کا یہ تعارف کس درجہ کا

تعارف ہوگا کہ کھوج لگانے والوں نے ٹھیک اس راستہ اور مقام کا بھی کھوج لگا لیا تھا جس راستہ سے آپ سفر کر رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر بعض روایات سے یہاں تک بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ملوک و سلاطین کے پاس تو آپ ؐ کی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی شکل و شمائل کی تفصیلات سن کر ہو بہو تصاویر بھی تیار کر لی گئی تھیں۔ یہاں اگر اس بیان کی جزئیات سے کسی معاند کو اختلاف ہو تو ہو مگر اس حقیقت سے ایک دشمن سے دشمن معاند کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ کی آمد سے قبل اہل علم طبقہ کو ایک نبی آمد کا حد درجہ انتظار تھا۔ ہم اس کو ایک تاریخی حقیقت سمجھتے ہوئے اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتے' کیونکہ اس وقت ہمارا موضوع صرف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق صرف دماغی فلسفیانہ مباحث سے ہٹا کر آپ کو واقعات کی اس دنیا میں لے آئیں جہاں ان کی شخصیات کا سابق تعارف ان کی معرفت کے لیے دماغ سوزی سے مستغنی کر دیتا ہے۔ یہاں ان نامنصف اور جاہل قوموں کا تذکرہ کرنا بالکل عبث ہے جنہوں نے اتنے تعارف کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا یا اگر پہچانا تو محض ضد کی راہ سے ان کی بات نہیں مانی۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام نے دنیا میں آ کر جس سادہ اور واضح انداز سے اپنا تعارف امتوں کے سامنے رکھا ہے آپ اس کو خالی الذہن ہو کر مطالعہ کر لیجئے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کے بعد عدل و انصاف کی دنیا میں کسی شک و تردد کا محل ہی باقی نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل کی حالت تو خود قرآن کریم ہی میں موجود ہے اور ملوک و سلاطین کے بیانات سے کچھ ان اوراق میں بھی آپ کے سامنے عنقریب آنے والی ہے۔ ارشاد ہے: وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ یعنی ان اہل کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ ؐ کی تشریف آوری سے قبل تو یہ لوگ کافروں کے مقابلہ میں آپ کے توسل سے دعائیں مانگا کرتے تھے اور جب آپ تشریف لے آئے تو اب انکار کرنے لگے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر اب خود یہ فیصلہ کر لیجئے کہ سطح عالم پر اس منظم سلسلہ کے ظہور کی حقیقت کیا صرف اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی کہ فارابی اور ابن سیناء نے سمجھی یا جیسا کہ آج ہمارے فلسفیانہ دماغ اس کو سمجھ رہے ہیں؟

مشرکین عرب نے آپ ؐ کو ساحر و مجنون کیوں ٹھہرایا؟ ❋ مشرکین عرب اور جو اس زرّیں تاریخ سے جاہل تھے انہوں نے از راہِ جہالت کبھی تو انبیاء علیہم السلام کو بے علم و نافہم سمجھ کر مجنون قرار دے دیا اور کبھی ان کے علوم کی تاثیر دیکھی تو زیادہ سے زیادہ ان کو ساحر کہا' مگر جس طرف ان کا دماغ نہ چل سکا وہ یہی ایک بات تھی کہ آپ خدا تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ﴾ (الشعراء:۲۷) — تمہارا یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے یقیناً مجنون ہے۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ﴾ (الشعراء: ۳۴-۳۵) — یہ بہت علم والا جادوگر ہے اس کی نیت یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنے جادو کے زور سے اپنے ملک سے نکال دے۔

دیکھئے پہلی آیت میں خدا کے سچے رسول کو بے علم سمجھا تو دیوانہ قرار دیا' اور دوسری آیت میں اگر اس کے علم سے مرعوب ہوئے تو اس کو جادوگر کا لقب دیا۔ گو عناد اور جہالت کی باتوں کے اسباب بیان کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے تاہم رسولوں کے مجنون کہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن باتوں کو کفار سودمند سمجھا کرتے تھے خدا تعالیٰ کے رسول آ کر ان کو مضرت رساں کہتے اور جن

کو وہ مضرت رساں سمجھا کرتے تھے وہ آ کر ان کو سودمند بتاتے - چونکہ دیوانہ بھی نفع ونقصان میں امتیاز نہیں کرتا اس لیے یہ احمق جماعت اپنے زعم باطل میں برعکس رسولوں ہی کو دیوانہ قرار دیتی تھی، پھر جب کبھی قرآن کریم پر نظر کرتے تو اس کو نظم ونثر کے درمیان ایک تیسری نوع کا کلام دیکھتے تھے جس سے وہ اب تک آشنا نہ تھے اس لیے کبھی تو مبہوت ہو کر اس کو شعر قرار دیتے اور کبھی کاہنوں کے کلام سے تشبیہ دیتے تھے - قرآن کریم نے ان تمام طبقوں کو اسی کی دعوت دی ہے کہ وہ ان طبقات کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات سے آپ کو جانچ لیں -

سب سے پہلے خود نبی کی ذات پر نظر ڈالیں وہ سب میں معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے اخلاق، اس کی سلامت فطرت اور اس کی اولوالعزمی ضرب المثل ہوتی ہے - اس کی صداقت، اس کی دیانت وامانت اور اس کی خدا ترسی پر کسی کو حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی وہ عدل وانصاف اور غم خواری وہمدردی میں خدا کے بندوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا، کبر ونخوت طمع ولالچ کا کہیں اس کے کوچہ میں بھی گزر نہیں ہوتا اور اس قسم کے جملہ اوصاف اس کی حیات میں اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دور طفولیت ہی سے ان میں گویا ایک علیحدہ ممتاز انسان نظر آتا ہے - اس کی زندگی میں سب سے نمایاں عنصر اس کی راست بازی اور دیانت ہوتی ہے، وہ راست بازی اور راور دیانت جس کا دشمن بھی اعتراف رکھتے ہیں اور عین عداوت کی حالت میں بھی اس میں ذرا لب کشائی کی مجال نہیں رکھتے - ان کے دلوں میں جذبات امنڈتے ہیں کہ کسی حیلہ سے اگر وہ اس پر تہمت لگا سکتے ہیں تو لگادیں - مگر پھر اس کی جرأت اس لیے نہیں کر سکتے کہ اس کی دیانت وامانت کو ایک بدیہی مسئلہ دیکھتے ہیں - اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو ''نبی اللہ'' ہوتا ہے، اس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا -

نبوت کے صدق وصفا کا بلند مقام ✽ اس لیے جس نبی کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ غیب کی خبریں دیتا ہے اس میں بھی صدق وصفا کا اتنا ظہور ہونا چاہیے کہ وہ اس صفت میں بھی تمام کلاموں میں ممتاز نظر آئے - یہاں اس کی کوئی تفریق نہیں ہوتی کہ وہ خبریں کس نوعیت کی ہیں معمولی معاملات کے متعلق ہیں یا غیر معمولی، قریبی دور سے متعلق ہیں یا بعید زمانہ سے، دوستوں کے متعلق ہیں یا دشمنوں کے وہ اس عالم کے حوادث سے تعلق رکھتی ہیں یا عالم غیب کے عجائبات سے یہاں بلاتفریق دو باتیں ان سب میں یکساں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو صدق وصفا، دوم جزم ویقین واقعات اور اسباب کا رخ خواہ کسی جانب کیوں نظر نہ آئے مگر نہ تو ان خبروں میں اس کو ادنیٰ سے کذب کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اس کے جزم ویقین میں ذرا سا تذبذب پیدا ہوتا ہے - ایک جنگ کا واقعہ ہے کہ آپ کا ایک جانباز صحابی اس بے جگری سے جنگ کرتا نظر آیا کہ دوسرے صحابہ کو بھی اس پر غبطہ ہونے لگا، مگر جب آپ کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا ''وہ تو دوزخی ہے'' دیکھئے واقعات کیا ہیں اور رسول اعظم کی خبر اس کے متعلق کتنی برخلاف ہے - لیکن کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک شخص آ کر شہادت دیتا ہے - یا رسول اللہ جو خبر آپ نے دی تھی وہ مو بمو سچی نکلی - اس شخص نے زخمی ہو کر خودکشی کر لی - (دیکھو ترجمان السنہ)

جنگ حنین کے واقعہ پر نظر کیجئے جہاں دشمنوں کے شدید حملوں سے تھوڑی دیر کے لیے تو صحابہ کی صفیں بھی پھٹ گئی تھیں اور میدان کا رخ کچھ دوسری طرف نظر آنے لگا تھا حتیٰ کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب صرف چند افراد ہی باقی رہ

گئے تھے- راوی کہتا ہے کہ جنگ جتنی خطرناک ہوتی جاتی تھی- خدا تعالیٰ کے رسول کا پائے ثبات اتنا ہی اور مضبوط ہوتا جاتا تھا- ابو سفیانؓ کوشش کررہے تھے کہ اس خطرناک حالت میں آپؐ کی سواری کا ایک قدم دشمن کی جانب بڑھنے نہ پائے، مگر دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا رخ دونا دونا دشمن ہی کی جانب کیے جارہے ہیں حتیٰ کہ جب بہادروں کی آنکھوں کے سامنے بھی صرف موت کا نقشہ تھا، ادھر دیکھتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر سے نیچے اتر ے کھڑے ہیں اور بڑے جزم و یقین کے ساتھ یہ کلمات زبان پر رواں ہیں:

انــــا الــنـبــــی لا کــــذب انـــا ابــن عــبـدالــمـطــلــب

میں سچا نبی ہوں جھوٹا نہیں اور میں ہوں وہی عبدالمطلب کا بیٹا

انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہاں تمام زندگی کی خبروں میں ایک بھی خلاف نکل آئے تو سارا کارخانہ نبوت ہی درہم برہم ہوجائے کیونکہ ان کو خبر دینے والا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس کی خبر میں ذرّہ برابر بھی کذب کا احتمال نہیں ہوسکتا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات آج بھی دوست و دشمن سب کے سامنے کھلی پڑی ہے کیا اس قسم کا کوئی ایک واقعہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے جہاں دشمنوں نے بھی آپ کے متعلق ادنیٰ سی کذب بیانی کا کوئی حرف رکھا ہو' یہاں فیصلہ اکثری حالات پر نہیں ہوتا بلکہ یہاں ساری عمر کی صداقت ایک غلط بیانی سے ختم ہوجاتی ہے- پھر جب اس کی خبروں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی نوعیت بھی عام خبروں سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے ان میں مختلف انواع' مختلف ادوار اور مختلف طبقات و بلاد کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب ہی قسم کی خبریں ہوتی ہیں مگر کیا مجال کہ کسی میں ذرا سا بھی خلاف ثابت ہوجائے- اس کے صدق وصفا کی یہ حالت اس کی نبوت کے بعد کے زمانہ سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس کی پہلی زندگی بھی اتنی ہی صاف ستھری ہوتی ہے- اسی لیے ہرقل شاہ روم نے اس معاملہ میں آپ کی پہلی زندگی کا حال دریافت کیا' اور جب اس کو اطمینان بخش جواب مل گیا تو وہ یہ معقول بات کہنے پر مجبور ہوگیا- ''یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے معاملات میں کبھی جھوٹ نہ بولے وہ خدا تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ باندھنے کے لیے تیار ہوجائے''- یہاں ابوسفیان اپنے دورِ جاہلیت میں بڑے پیچ و تاپ کھاتا ہے مگر اس کا سر نیچا ہے اور وہ ایک حرف بھی اس کے خلاف بولنے پر قادر نہیں ہے-

قرآن کریم کا مشرکین کے مقابلہ میں اعلان کہ آپ ہرگز کاہن نہیں

✻ بھلا اس مقدس جماعت کو کاہنوں یا شاعروں کے گروہ سے کیا نسبت ہوسکتی ہے لیکن چونکہ اس وقت عرب میں کثرت سے کاہن موجود تھے جو غیب کی خبریں بیان کیا کرتے تھے اس لیے عرب کو یہ تہمت لگانے کا موقعہ مل گیا تھا کہ آپ بھی ان ہی کی طرح ایک کاہن ہیں' مگر یہاں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ تم کہتے ہو آپ کاہن ہیں- اچھا تو دونوں کے خصائص تمہارے سامنے ہیں' جماعتی خصوصیات ہی سے افراد کی شناخت کی جاتی ہے- اس معیار پر آپ کو بھی پرکھ کر دیکھ لو- تم جانتے ہو کہ کاہنوں کی خبریں اگر دو سچی نکلتی ہیں تو دس جھوٹی' پھر بھی بالکل ادھوری اور نا تمام ہوتی ہیں اور اگر خود ان کی ذات کی طرف نظر کرو تو عام طور پر جھوٹے فریبی اور لالچی اس کا راز یہ ہے کہ کاہن کو غیب کی خبریں دینے والا شیطان ہوتا ہے اور شیطان چونکہ خود کذب و زور اور فسق و فجور کا مجسمہ ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی وحی کے

لیے بھی ایسی ہی جماعت کا انتخاب کرتا ہے جو اسی کی مذاق کی ہوتی ہیں مشہور ہے: کند ہم جنس باہم جنس پرواز ☆ کبوتر با کبوتر باز با باز خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور بہتان طرازی کر کر کے عالم میں شر و فساد کی بنیادیں قائم کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے- ارشاد ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. (۲۲۲-۲۲۱)	آ ؤ میں تم کو بتاؤں شیطان کس قسم کے لوگوں کے پاس وحی لے کر آتا ہے- ان کے پاس آتا ہے جو سخت بہتان طراز اور سخت گنہگار ہوں-

حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''ابن صیاد'' نامی شخص کے حالات سن کر اس کی تحقیق حال کے لیے تشریف لے گئے اس وقت آپ نے اپنے دل میں یہ آیت سوچ کر اس سے پوچھا ''بتا میرے دل میں کیا ہے؟'' ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الدخان: ۱۰) تو جیسا نا تمام خبریں دینا کاہنوں کا خاصہ ہوتا ہے اس نے بھی کہا آپؐ کے دل میں کچھ دخ دخ کا لفظ سا معلوم ہوتا ہے- اس کا یہ نا تمام جواب سن کر آپؐ نے فوراً اس کے کاہن ہونے کا فیصلہ فرما دیا اور کہا- **اخسأفلن تعدو قدرک انما انت من اخوان الکھان** - جا دور ہو جا تو اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تو تو ٹھیک ٹھیک کاہنوں کی جماعت میں سے ہے اور بس-

جس طرح کاہنوں کی ذات اپنے قبیح اوصاف میں ممتاز اور علیحدہ ہوتی ہے، اسی طرح ان کے کلام کی نوعیت بھی رسولوں کے کلام سے علیحدہ اور جدا ہوتی ہے- وہ بہ تکلف اپنے کلام میں سجع بندیاں کرتے ہیں اور یہاں ان کو حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی چنانچہ آپ کے زمانہ میں ایک شخص حمل بن مالک نے آپؐ کے ایک فیصلہ پر جو آپؐ نے ایک عورت کے حمل ضائع کر دینے پر مجرم کے متعلق صادر فرمایا تھا یہ کلمات کہے: **أیو دی من لاشرب و لا اکل، و لا نطق و لا استھل، فمثل ذلک یطل** - یعنی بھلا ایسے حمل ضائع کرنے کی دیت بھی کہیں لازم ہوا کرتی ہے جس نے اب تک نہ کھایا ہو نہ پیا ہو بلکہ آواز تک بھی نہ نکالی ہو وہ تو قابل معافی ہونا چاہیے یہ سن کر آپؐ نے فرمایا **انما انت من اخوان الکھان**. تو تو کاہنوں کی طرح فقرہ باز شخص معلوم ہوتا ہے- اس مسجع کلام کی مناسبت ہی سے قرآن کریم نے کاہن اور شاعر کو ایک سیاق میں جمع فرما دیا ہے-

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ. وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ، تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الحاقۃ: ۴۰-۴۳)	یہ قول ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ قول کسی شاعر کا، تم تھوڑا یقین کرتے ہو اور نہیں ہے قول کاہنوں کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو- یہ اتارا ہوا ہے جہان کے رب کا.

قرآن کریم کا اعلان کہ آپؐ شاعر بھی نہیں ❋ غرض جب آپ کی صفات اور آپ کے کلام کی صفات دونوں کاہنوں کی جماعت سے جدا جدا ہیں تو پھر آپؐ پر کاہن کا شبہ کرنا کیسے درست ہے- تم کہتے ہو آپؐ شاعر ہیں- اچھا شاعروں کو بھی تم خوب جانتے پہچانتے ہو ان کی اور آپؐ کی خصوصیات کا موازنہ کر لو تم کو خود معلوم ہو جائے گا یہ شاعر بھی نہیں ہیں- ارشاد ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ. (یٰسین: ۶۹)	ہم نے نہ شعر گوئی آپ کو سکھائی نہ یہ شانِ نبوت کے مناسب تھی
وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ. (الشعراء: ۲۲۴)	شاعروں کی بات مانتے ہیں بے راہ چلنے والے-
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ. (الشعراء: ۲۲۵)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں، اور کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں-

یعنی اس رسول امی کو جو کچھ سکھایا یا پڑھایا ہے ہم ہی نے سکھایا پڑھایا ہے- پس پہلی بات تو یہ ہے کہ جو اس کا معلم ہے وہی خود اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہم نے شعر گوئی کی اس کو تعلیم نہیں دی تو پھر یہ شاعر ہو کیسے سکتے ہیں اور جو بات انسان کو سکھائی نہیں جاتی اگر وہ اس کو نہیں جانتا تو یہ اس کا کوئی عیب بھی نہیں اور یہاں تو برعکس اس علم کی تعلیم ہی ان کے حق میں عیب ہے' کیونکہ منصب نبوت شاعری سے کہیں بلند تر ہوتا ہے- شاعروں کو دیکھو تو ان کے پیچھے لگنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو صحیح اور پراز حقیقت باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا- شاعر محض مبالغہ آمیزی' خیال بندی اور بے حقیقت باتوں کی حقائق کے رنگ میں دکھانے کے درپے ہوتے ہیں ان کے اشعار دیکھو تو معرفت سے لبریز' اعمال کا جائزہ لو تو رند مشرب- ادھر انبیاء علیہم السلام کو دیکھو تو ان کے اقوال و اعمال میں سر مو مخالفت نہیں ہوتی' وہ جو بات زبان سے نکالتے ہیں پہلے اس پر خود عمل کرتے ہیں' ان کے کلام کو دیکھو تو اس کو مبالغہ اور خیال بندی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اگر کہیں وہ بھی مبالغہ آمیزی کا مزاج رکھتے تو جنت و دوزخ' ثواب و عذاب اور اس سے بڑھ کر ذات و صفات کا نازک اور پراز حقیقت کارخانہ سب درہم و برہم ہو کر رہ جاتا' ان کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ حقیقت کے کانٹے پر تلا ہوا نکلتا ہے یہاں رضاء و غضب کی بے اختیاری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا حتیٰ کہ ان کے کلام میں تشبیہات کا باب بھی اس معیار سے نہیں اترتا- ان کی تشبیہات میں بھی ایک حقیقت اور اس حقیقت میں صداقت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تشبیہ و استعارات عام محاورات کے مطابق کثرت سے نہیں ملتے- اس کے باوجود جب اس کو بلاغت کے معیار پر پرکھا جاتا ہے تو وہ اعجاز کی سرحد سے ملا ہوا نظر آتا ہے جو تاثیر دوسرے کلاموں میں سو طرح کی مبالغہ آمیزیوں کے بعد بھی پیدا نہیں ہوتی وہ ان کے روزمرہ کے کلام میں جلوہ نما ہوتی ہے- بس اسی تاثیر کو دیکھ کر کافر مجبور ہو جاتے تھے کہ اس کو سحر کہہ دیں یا شاعر قرار دیں' مگر قرآن کریم کا معقول فیصلہ یہاں بھی یہ ہے کہ آپ کی صفات کو دیکھو کیا ان میں شاعروں کی ایک صفت بھی ہے- پھر آپ کے کلام پر بھی غور کرو اس میں عالم غیب اور انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ اور ان کے دوستوں اور دشمنوں کے عواقب کے سواء کہیں شاعرانہ مضامین کا تذکرہ ہے؟ اگر ان کی ذات شاعروں کی صفات سے منزہ و مبراء ہے اور اسی طرح ان کا کلام بھی شعر سخن کی خصوصیات سے بالکل ممتاز ہے تو پھر ان کو شاعر کہنا کتنا نامعقول ہے-

<u>قرآن کریم کا اعلان کہ آپ کو ساحر و مجنون کہنا بھی انتہاء درجہ ظلم اور سفاہت ہے</u> * اچھا تم کہتے ہو آپ ساحر و مجنون ہیں تو لو اس جماعت کی خصوصیات پر بھی آپ کو جانچ لو- ساحر بدعمل صرف انسانوں میں کچھ تصرف کرنے کی مشق رکھتا ہے خواہ وہ نظر بندی کی حد تک ہو یا اس سے زیادہ مرض اور ہلاک کرنے کی حد تک بھی ہو- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو ساحر مقابلہ کے لیے آئے تھے ان کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جادو کا اثر کچھ نہ کچھ حواس انسانی پر ضرور پڑتا ہے- ارشاد ہے:

فَلَمَّا اَلْقَوْا سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ. (الاعراف:١١٦)	جب انہوں نے ڈالا تو باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں اور ان کو ڈرا دیا اور بڑا جادو کیا-

پھر ساحر کی زندگی دیکھو تو ہمیشہ ایک پست زندگی ہوتی ہے' اس کا نصب العین صرف چند دراہم ہوتے ہیں آخرت کی لازوال حیات ان کے دائرۂ فکر میں بھی کہیں نہیں گذرتی' ان کے عملیات کو دیکھو تو اپنے عملوں میں وہ ہمیشہ ارواحِ خبیثہ اور شیاطین

سے استعانت طلب کیا کرتے ہیں اور جو امرِ خارق دکھاتے بھی ہیں وہ اس اندازہ کے مطابق ہی ہوتا ہے جتنا کہ شیاطین کا مقدور ہوا کرتا ہے- چنانچہ قرآن کریم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ساحروں کے سامنے آخرت کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا -

و لقد علموا لمن اشتراه ماله فی الاخرة من خلاق. اور وہ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ جس نے جادو اختیار کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں-

اب اس کے بالمقابل انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو دیکھو تو ان کی تمام زندگی تقویٰ وطہارت' عفت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کا مرقع ہوتی ہے ان کا بڑا نصب العین آخرت کے فوز وفلاح اور بنی نوع انسان کے دارین کی فلاح و بہبود ہوتی ہے ذاتی منافع کا ان کے دماغوں میں کہیں گزر نہیں ہوتا' شرک وکفر اور استعانت لغیر اللہ سے بیزاری تو ان کے دین کی بنیاد ہوتی ہے- ان کے معجزات کے مقابل جو بھی آتا ہے اس کو ہمیشہ شکست فاش ہوتی ہے ساحرین موسیٰ علیہ السلام کا حشر جابجا قرآن کریم میں مذکور ہے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن کریم کے بالمقابل جو کلام پیش کیے گئے ہیں وہ آج تک اپنے قائلین کے لیے صفحاتِ تاریخ پر قابل مضحکہ بنے ہوئے ہیں پھر ساحر تو حواس کو معطل اور بیکار کرتا ہے اور یہ جماعت معطل شدہ حواس کو اور بیدار کرتی ہے چنانچہ جب عطاء بن یسار نے عبداللہ بن عمرو سے آپ کے ان اوصاف کے متعلق پوچھا تھا جو توراۃ میں مذکور تھے تو انہوں نے منجملہ دیگر صفات کے یہ بھی بیان کیا تھا ولن اقبضه حتی اقیم به املة العوجاء فافتح به اعینا عمیا و اذانه صما و قلوبنا غلفا. یعنی وہ رسول ایسا ہوگا کہ میں اس وقت تک اس کو نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ اس کے ذریعہ کج شدہ ملت کو پھر سیدھا نہ کردوں اور اندھی آنکھوں کو پھر بینا اور بہرے کانوں کو پھر شنوا اور غافل دلوں کو پھر سرنو کھول نہ دوں-

حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کہ نبی وساحر میں فرق بدیہی ہے ✽ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ نبی اور ساحر ومجنون میں زمین وآسمان کا فرق ہے- بلکہ ان میں کوئی اشتراک ہی نہیں- ان دونوں میں خبر' مخبر اور غایت ہر لحاظ سے فرق ہے- نبی کو خبر دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہوتی ہے اور ساحر کو شیطان- نبی کی وحی سرتاسر ہدایت ہی ہدایت ہوتی ہے اور شیطان کی ضلالت ہی ضلالت نبی کے کلام میں صدق ہی صدق اور حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے اور ساحر ومجنون کا کلام بیشتر کذب ہی کذب اور بے معنی باتوں سے مملو اور صرف خیال ہی خیال پر مبنی ہوتا ہے- اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (التکویر: ۱۹-۲۷)

یہ قرآن اس فرشتہ کا آوردہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے' عزت والا ہے' قوت والا ہے' عرش کے مالک کے نزدیک بڑے درجہ والا ہے اور سب کا مانا ہوا ہے اور وہاں کا معتبر ہے اور یہ تمہارے رفیق کچھ دیوانے تو نہیں اور وہ اس فرشتہ کو آسمان کے صاف کنارے پر ایک بار پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور نہ وہ غیب کی بات بتانے میں بخیل ہیں- یہ قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے پھر تم کدھر جارہے ہو یہ تو جہاں بھر کے لیے ایک نصیحت (کا پیغام) ہے-

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کا تخیل کیسے ہوسکتا ہے یہ ایک فرشتہ کا آوردہ ہے جو آپ سے منفصل اور اپنا علیحدہ وجود رکھتا ہے اور وہ بھی اپنی جانب سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے جو اس کو حکم ملتا ہے بس وہی کہتا ہے۔ اور نہ یہ قرآن شیطان مردود کا قول ہوسکتا ہے بھلا کجا وہ فرشتہ جس کی صفات یہ ہوں کہ جس کی جانب سے وہ یہ قرآن لاتا ہے اس کے نزدیک وہ حرمت وعزت والا ہو اور مراتبِ قرب میں سب فرشتوں میں بلند پایہ ہو' آسمانوں کے سب فرشتے اس کی بات مانتے ہوں اور اس پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوں' اور کجا وہ شیطان لعین جس کی دنائت اور خست کے لیے صرف اس کا مردود ہونا ہی کافی ہے' وہ بھلا ایسا کلام کیسے نازل کرسکتا ہے جس میں بنی آدم کی سرتاسر بھلائی ہو اور جس میں خود جا بجا اسی کی مذمت کی گئی ہو۔ یہ فرق تو مخبر کی جہت سے تھا اب اگر رسول ملکی سے گزر کر خود اس کی ذات یعنی رسول بشری کی صفات ملاحظہ کرو تو تم چالیس سال سے برابر اس کو دیکھتے چلے آئے ہو یہ فیصلہ کرسکتے ہو کہ وہ تم میں عاقل سے عاقل مسلم رہا ہے یا نہیں' پھر اس کو مجنوں کیسے کہا جاسکتا ہے' پھر جس کی سخاوت کا یہ عالم ہو کہ وہ آخرت کے لازوال خزانے دنیا کو مفت لٹا رہا ہو اس کو بھلا اس ساحر اور کاہن سے کیا نسبت ہوسکتی ہے جو ذرا سی بات بھی شیرینی لیے بغیر بتانا نہیں جانتا' اس کے بعد اگر اس پر نازل شدہ کلام کی نوعیت پر غور کرو گے تو روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گا کہ یہ قرآن کسی خاص ملک یا کسی خاص زمانہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور تمام جہانوں کے لیے ایک مجسم نصیحت ہے۔ ایسے مفید کلام کا بھلا کاہن وساحر اور مجنونوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ ساحر ومجنون کے کلام کی غایت وغرض چند دراہم مغشوشہ جمع کرنا ہوتا ہے اور یہاں قرآن کریم دارین کی فلاح وبہبود کے لیے ایک پیغام ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام اور ساحر وکاہن کے مابین اتنا ہی فرق سمجھنا چاہیے جتنا کہ فرشتہ اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔

مجنون کا تو پوچھنا ہی کیا ہے وہ تو حق تعالیٰ کی سب سے عام نعمت یعنی نعمت عقل ہے سے محروم ہوتا ہے اس کے اقوال و افعال کسی اخلاقی معیار پر تو کیا تولے جاتے وسرتاپا لغویات اور بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ الزام اس شخصیت پر لگانا جس کی ایک ایک بات دانائی وفراست' علم وعاقبت اندیشی سے لبریز ہو کیسے معقول ہے۔ ارشاد ہے:

مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ٥ وَ اِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ٥ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ٥ (القلم: ۲-۴)	تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانہ نہیں ہو اور تمہارے لیے ثواب ہے بے انتہاء اور تم تو فطرۃً بلند اخلاق ہو۔ (سورہ القلم)

مشرکین کے بے حقیقت اعتراض کی طرف قرآن کریم کے التفات فرمانے کی حکمت ✲ قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے' ان کے دماغوں کی رسائی یہیں تک تھی کہ وہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ساحر وشاعر اور کاہن و مجنون ہونے کے بدیہی البطلان الزامات تھوپ دیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ مگر قرآن نے ان بے معنی الزامات کا جواب بھی بڑا مدلل' بڑی فراخدلی اور بڑے معقول انداز سے دیا ہے' اور اندازِ بیان ایسا انوکھا اختیار فرمایا ہے کہ اس سے جہاں ایک طرف معاند مخاطبین کی زبانیں بند ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح اس قسم کی آئندہ موشگافیوں کا بھی شافی خواب ہوجاتا ہے۔ نیز اس تقریب سے بہت سے حقائق بلند اور معارف ارجمند بیان میں آجاتے ہیں۔ مثلاً آیاتِ بالا ہی کو ملاحظہ فرمالیجئے۔ سیاق کلام تو

ایک ایسے بے سر و پا الزام کے جواب میں ہے جس کا یہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا' مگر کیا کیا جائے کہ جب اس وقت قرآن کریم کے مخاطبین قرآنی دعوت قبول نہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک بہانہ بنا رہے تھے' تو مقاصد تبلیغ کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا بھی جواب دے دیا جائے' مگر قرآنِ کریم نے جب ادھر توجہ فرمائی تو اس انداز سے فرمائی کہ ان کے جواب کے ساتھ ساتھ مقام رسالت و نبوت کے بعض ایسے گوشے بھی سامنے آ گئے جن کی طرف کسی کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا- اس نے یہ تنبیہ کی کہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت بہت سی صفات میں ممتاز ہوتی ہے' ان کی پرورش ابتداء ہی سے نعمت کے گہوارہ میں ہوتی ہے حتیٰ کہ سب سے اول اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کا مصداق وہ ہوتے ہیں- گویا خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق یہاں ان کی طفیلی نظر آتی ہے- پھر جس ذات برتر کا تذکرہ آج تمہارے سامنے ہے وہ تو اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ میں بھی وہ شان رکھتی ہے جس کو وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی منعم حقیقی نے اپنے انعامات کی دولت تو بہتوں پر تقسیم کی ہے- مگر ان کی ذات پر تو اپنی خاص نعمت کو پورا فرما دیا ہے- اب سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی مخلوق میں منعم علیہم کی پہلی صف میں ہو پھر ان میں بھی اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ کا تاج اس کے سر پر نظر آ رہا ہو حتیٰ کہ رحمۃ للعالمین اس کا لقب بن چکا ہو کیا اس کو مجنون کہا جا سکتا ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی عام نعمت جس میں سب شریک ہوتے ہیں یعنی عقل اس میں بھی حصہ دار نہیں ہوتا- اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی دوسری امتیازی شان ان کا مستقبل ہے' وہ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ بقیہ تمام مخلوق کا مستقبل گویا ان کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے- خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق کو صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمانے والے وہی ہوتے ہیں اس لیے امت میں جو فرد بھی کوئی حسنہ کرتا ہے اس کا ثواب ان کو بھی ملتا ہے اور اس طرح اپنے اعمال کے ساتھ ساتھ تمام امت کے اعمال کا ثواب بھی ان کے اعمالنامہ میں درج ہو جاتا ہے پھر ان کے مستقبل کا پوچھنا کیا اور جن کا تذکرہ یہاں ہے چونکہ ان کی امت کے بعد کوئی دوسری امت نہیں اس لیے جب ان کی امت اور ان کے اعمال کا ثواب لامتناہی ہے تو پھر آپ کے ثواب کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے وہ بھی بے انتہاء اور بے حساب ہے کیا ایسی ذات پر بھی مجنون کی تہمت لگائی جا سکتی ہے جس کے ایک عمل کا بھی کچھ ثواب نہیں ہوتا- تیسری سب سے کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ ہر نبی اپنے اپنے زمانہ میں اخلاق جمیلہ کی تصویر ہوتا ہے- خدا کی مخلوق میں جو بھی صحیح اخلاق سیکھتا ہے ان سے سیکھتا ہے- پھر جس ہستی کا تذکرہ تمہارے سامنے ہے ان کے اخلاق کے متعلق تو خود خالق کائنات خلق عظیم فرماتا ہے- ﴿اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ﴾ (القلم : ۴) ایسی مجسم اخلاق ذات پر مجنون کی تہمت کتنا عظیم ظلم ہے- غریب مجنون کا تو ایک عمل بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ اخلاق کے معیار پر نہیں تولا جا سکتا- آپ نے دیکھا کہ یہاں جو مخاطبوں نے کہا وہ تو ان کے ظرف کے مطابق تھا لیکن جو جواب ان کو قرآن نے دیا وہ اس کی شانِ رفیع کے مطابق تھا- اس لیے یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ الزامات اور اعتراضات کی حیثیت کتنی رکیک ہے- دیکھنا یہ چاہیے کہ جواب کی جو نوعیت قرآن نے اختیار فرمائی وہ کتنی بلند ہے جو ابن سیناء جیسے عاقل پر نہ کھل سکا- قرآن کریم کے اسی فیصلہ کے ماتحت اب یہاں ابن سیناء جیسے عقلاء کو بھی غور کر لینا چاہیے کہ دنیا میں کیا صفراوی مریضوں کے اوصاف بھی یہی ہوئے ہیں- کیا کبھی تاریخ نے ان کی صفات اور ان کے تبعین کی صفات' ان کی مخالفت اور موافقت کے نتائج اسی طرح مدون کیے ہیں جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے- کیا صفراوی مریضوں نے اسی تسلسل کے ساتھ اپنے بعد میں آنے والوں کی بشارتیں اسی طرح سنائی ہیں- کیا عالم کی ہوشمند جماعتوں نے ان

کے ہذیانات کو اسی طرح اپنا نصب العین بنایا ہے۔ بس اسی ایک نقطہ پر نظر کرنے سے جہاں عرب کے جاہلوں کا جواب ہو جاتا ہے اسی طرح ابن سینا جیسے عقلاء کا جواب بھی نکل آتا ہے۔

یہاں ابن سیناء اور اس کے ہم مشربوں کو غور کرنا چاہیے کہ اگر کارخانہ نبوت عالم خیال سے متعلق ہوتا تو خیالات سے تاثر کی زیادہ صلاحیت یا عورتوں میں ہوتی ہے یا پھر بچوں میں عورت بھی اپنے صنفی ضعف کی وجہ سے ان کا زیادہ اثر لیتی ہے اور اسی طرح بچہ بھی خیالات کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے' اسی لیے مسمریزم کے لیے جب کسی معمول کی تلاش ہوتی ہے تو بچہ ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ لیکن جب آپ نبوت کی تاریخ اٹھا کر پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں نہ عورتوں میں کوئی نبی گزرا ہے اور نہ بچپن میں نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ نبوت کے لیے قدرت نے ابتداء ہی سے وہی صنف پسند فرمائی ہے جو تاثر سے نسبۃً بالاتر تھی اور ان میں بھی جن کو نبوت سے سرفراز کیا ہے ان کو جسمانی طاقتوں میں بھی دوسرے افراد پر فوقیت بخشی ہے پھر بعثت کے لیے بالعموم وہی عمر مقرر کی گئی ہے جو خیالات سے آزاد ہونے کی عمر ہے' یعنی چالیس سال۔ اس کے بعد جو تعلیمات ان کو دی جاتی ہیں جب ان پر نظر کیجئے تو وہ بھی شاعرانہ مضامین کی طرح صرف نازک خیالی کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک مکمل دستور العمل ہوتی ہیں ان کی تعلیمات کا اگر ایک حصہ عالم غیب کی غیر مدرک جزئیات پر مشتمل ہوتا ہے تو دوسرا بڑا حصہ باہمی معاشرت و معاملات کے متعلق بھی ہوتا ہے اس میں جہاں بانی کے اصول بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ معیار عقل پر پرکھے جاتے رہے ہیں ان پر عمل کر کے جو قوم بکریاں چرایا کرتی تھی وہ تخت و تاج کی مالک بن چکی ہے۔ صفحہ عالم پر کوئی جماعت ایسی نہیں ملتی جس کے اصول میں کچھ نہ کچھ تفاوت موجود نہ ہو' لیکن انبیاء علیہم السلام کی ایک لاکھ سے زیادہ کی عظیم الشان جماعت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملتا جس کی اصولی تعلیمات میں ایک ذرہ کا بھی فرق ثابت کیا جا سکے ان کی عظیم الشان جماعت میں کبھی کوئی نبی دوسرے کی کاٹ پر نظر نہیں آتا' ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کرتا ہے اور اپنی امتوں کو بھی اسی کی ہدایت کرتا ہے اور اگر اس میں کوئی ذرا سی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کو ایسا ہی مجرم قرار دیتا ہے جیسا اپنی اہانت کرنے والے کو ان معمولی اور کھلے ہوئے امتیازات کے بعد بھی انبیاء علیہم السلام کی جماعت اور ان کے علوم کا نہ پہچاننا یا ان کو شعبدہ بازوں اور خفتہ انسانوں سے تشبیہ دینا بداہت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ کو انصاف و غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کی کبھی فرصت ہی تلاش نہیں کی گئی اور اگر کبھی ادھر توجہ کی گئی ہے تو صرف اسی نظریہ سے کی گئی ہے کہ ان کے انکار کو کس طرح اور مدلل و مبرہن کیا جائے اور اس طرح اس کھلے ہوئے مسئلہ کو خود بخود بھول بھلیاں بنا دیا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ ﷺ کی صفات حمیدہ کے مشاہدہ کر لینے کے باوجود ابتداء میں مشرکین عرب نے آپ کو کیوں نبی نہیں مانا؟ ✽

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عام طور پر عرب انبیاء علیہم السلام کی جنس ہی سے نا آشنا تھا۔ اس لیے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نبوت بالکل ایک جدید اور اجنبی آواز تھی وہ آپ کے متعلق بعید سے بعید بات سوچ سکتے تھے' مگر جو بات ان کے دماغوں میں نہیں آ سکتی تھی وہ صرف آپ ﷺ کی نبوت تھی۔ اسی لیے ان کے مقابلہ میں قرآن کریم نے اپنا اسلوب بیان بدل دیا ہے۔ اس نے مکی سورتوں میں جس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی جنس کی آمد کا اثبات ہے' اس نے بتایا ہے کہ تم

خود ان کے حالات پڑھو پھر اہل کتاب سے بھی جو اس جنس کے قائل ہیں جا کر پوچھ لو۔ ان کے مخالفوں کا حشر دیکھو۔ ارم کے اجڑے ہوئے سبزہ زار' قوم لوط کے الٹے ہوئے دیار اور عاد وثمود کی ویران بستیاں یہ سب تم کو شہادت دیں گے کہ جن اقوام نے خدا تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کی ہے وہ کس طرح برباد ہو کر رہ گئی ہیں۔ دریائے نیل اور کوہ جودی اس کے گواہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے رسولوں کی بات نہ ماننے والوں کا نام ونشان صفحۂ عالم سے کس طرح مٹ گیا ہے اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ کس طرح کامیاب اور خدا کی زمین کے وارث بن گئے ہیں۔ ان واقعات پر اگر انصاف سے نظر کرو گے تو تم کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ بے شک یہ اولوالعزم ہستیاں اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ اور اس کی رسول تھیں۔

پس اگر ان حالات پر غور کرنے کے بعد تم اس نتیجہ پر پہنچتے ہو تو اب تمہارے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر یقین لانا ایک بدیہی مسئلہ ہوگا' یہاں بھی آپ کے مخالفوں کا حشر اور متبعین کی سرسبزی و کامیابی اپنے سامنے رکھو' آپؐ کے کمالات اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کمالات کا موازنہ کرلو' آسمانی صحائف سب ایک طرف اور دوسری طرف اکیلے قرآن کریم کو رکھ لو' تم کو روشن ہو جائے گا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ اگر آپ کے آثار و برکات کا موازنہ کرنا ہو تو آپ کی امت موجود ہے' اس کی جاں نثاری' اس کی بے مثال قربانی' اس کی ہمدردی اور خدا ترسی' اس کا عدل وانصاف اور اس کے اخلاق وشمائل سب تاریخ میں مدون ہیں' تم بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کرلو گے کہ یہ امت ان اوصاف اور برکات میں جملہ امتوں سے آگے ہے یا نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر پہلی امتوں کے رسول خدا کے سچے رسول تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول نہ ہوں ارشاد ہوتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ. (الفتح: ۲۹)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ شدید ہیں کافروں کے حق میں اور رحم دل ہیں آپس میں تم ان کو دیکھو گے رکوع میں ہیں اور سجدہ میں ہیں اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشی کے جویاں ہیں۔

آیت بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر غور کرنے کے لیے آپ کے آثار و برکات اور خاص طور پر ان انقلابی اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو عرب کی فطرت ہی کے بالکل متضاد تھے دیکھو وہ آپؐ سے قبل کس طرح باہم دشمن تھے اور آپ کے بعد کیسے فدا کار دوست بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ عبودیت کتنا کٹ چکا تھا اور آپؐ کے بعد کتنا مستحکم اور عمیق ہو گیا تھا کہ ان کے سامنے ایک اُس کی رضا کے سواء کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان کے باطن کے تذلل وعبودیت کی کیفیات ان کے چہرہ بشرہ بلکہ جسم کے ایک ایک روئیں سے کس طرح ٹپکتی تھیں۔ پس جس نے ایک ایسی امت کی دنیا میں بنیاد ڈالی ہو اس کے آثار و برکات کا پوچھنا کیا ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی یہاں رسولوں کی جنس کا قائل ہوگا اس کو آپ کی رسالت بھی طوعاً وکرہاً تسلیم کرنی ہوگی۔

درحقیقت گزشتہ اقوام کے حالات کی تکرار میں بڑی روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے۔

ارشاد ہے:

فَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ. (الحج: ٤٥-٤٦)

تو کتنی بستیاں ہم نے غارت کر ڈالیں اور وہ گنہگار تھیں وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں نکمے پڑے ہیں اور کتنے پختہ محل کیا انہوں نے سیر نہیں کی ملک کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے تو یہ بات نہیں ہے کہ آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں لیکن وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اسی طرح کفار مکہ کی تکذیب پر آپ کے لیے جو سامانِ تسلی بیان فرمایا گیا ہے وہ بھی انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تلخ سرگزشت ہے:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ. (الاحقاف: ۹)

کہہ دو! کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا ہوں۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ. (الحج: ٤٢-٤٤)

اور اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے قوم نوح، قوم ثمود، قوم عاد، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) بھی جھٹلائے گئے پھر میں نے ڈھیل دی ہے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا تو (دیکھا) میرے انکار کا حشر کیا ہوا۔

غرض ان حقائق کے ماتحت یہ انصاف کرلو کہ یہ مقدس گروہ خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے یا نہیں اس کے بعد یہ فیصلہ کرلو کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو کر دنیا میں صرف کہانیاں بن کر رہنا پسند کرتے ہو یا اس کے وارث اور خدا تعالیٰ کے ملک کے مالک بن کر باقی رہنا چاہتے ہو۔ جو قوم رسولوں کی مقدس تاریخ سے واقف نہ تھی ان کے سامنے علامات نبوت اور سابق بشارات بیان کرنا بے سود ہے۔ اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ عرب کیوں آپ کی نبوت کی طرف نہیں آتا تھا اور کیوں ساحر و مجنون کے بے جا الفاظ آپ کے متعلق کہتا تھا۔

ضرورتِ نبوت و رسالت

مذکورہ بالا عنوان ترتیب کے لحاظ سے تو سب سے پہلا عنوان ہے مگر ہم نے اپنے مخاطبوں کی رعایت سے اس کو دوم نمبر میں رکھا ہے۔ ہمارا خطاب یہاں ان اصحاب کے ساتھ ہے جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لا چکے ہیں اور صرف اپنے اطمینان قلبی کی خاطر کسی قدر اس کی وضاحت کے متلاشی ہیں اس جماعت سے ہمارا خطاب ہی نہیں ہے جو انبیاء علیہم السلام کی علی التواتر آمد اور اب ان کے خاتمہ کے قطعی اعلان کے بعد بھی ابھی اسی میں بحث کر رہی ہے کہ عالم انسانی کو اپنی ہدایت کے لیے کسی سماوی ہدایت اور

سماوی ہادی کی ضرورت ہے بھی یا نہیں - ساری یوسف زلیخا پڑھ لینے کے بعد یہ سوال کرنے والے کہ زلیخا مرد تھی یا عورت ہمارے نزدیک قابل خطاب نہیں ہیں-

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا تعالٰی کی صفت حاکمیت اور ملوکیت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح شاہانِ دنیا اپنی رعایا کے پاس اپنے ملک کا قانون خود لے کر نہیں آیا کرتے بلکہ اس کے لیے اپنے پیغمبر اور رسول مقرر کیا کرتے ہیں اور ان کے واسطہ سے اپنا ملکی قانون بھیجا کرتے ہیں' اسی طرح وہ بھی اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسول بھیجے اور ان کی معرفت اپنا قانون ان کو بتائے پھر اس کی صفت حکمت یہ چاہتی ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کو انعام اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دے گو اس کے علی الاطلاق خالق اور حاکم ہونے کی وجہ سے اس کے بغیر بھی جزاء و سزا دینے کا اس کو حق حاصل تھا لیکن اس کی صفت حکمت نے یہ تقاضا کیا کہ جن کو سزا دے ان کو پوری تفہیم کے بعد دے تا کہ عام عدالت کے دن کسی کو اپنی لاعلمی کے عذر کا موقعہ بھی نہ رہے' ارشاد ہے-

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ. (المائدہ:۱۹)

اے اہل کتاب جب رسولوں کا آنا مدتوں تک نہ ہوا پھر ہمارے یہ رسول تمہارے پاس آئے جو صاف صاف احکام الٰہی بیان کرتے ہیں اور ان کو ہم نے اس لیے بھیجا ہے مبادا کل تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی رسول خوشخبری سنانے والا آیا اور نہ ڈرانے والا تو لو اب تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آ گیا-

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ لَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى. (طٰهٰ:۱۳۴)

اگر ہم قرآن اتارنے سے قبل ہی کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور یہ عذر کرتے کہ ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسواء ہونے سے پہلے ہم تیرے حکموں پر چلتے-

وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا. (بنی اسرائیل:۱۵)

ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ پہلے اپنا کوئی رسول نہ بھیج دیں-

امام موصوف لکھتے ہیں کہ حق تعالٰی کی معرفت عقلاً تمام مخلوق پر واجب ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بغیر یہ معرفت حاصل ہونا ہی ناممکن ہے اس لیے نبوت و رسالت کا انکار درحقیقت حق تعالٰی کی ذات پاک کا ہی انکار ہے' ارشاد ہے:

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ. (انعام:۹۱)

انہوں نے حق تعالٰی کے کمالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہی نہیں لگایا جب کہ یہ کہا کہ اس نے کسی بشر پر کوئی کتاب ہی نازل نہیں فرمائی-

یعنی جب یہ لوگ رسولوں پر شریعت کے نزول کا انکار کرتے ہیں تو گویا خدا تعالٰی کی جانب سے رسالت ہی کا انکار کرتے ہیں اور رسالت کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو خدائی صفات اور اس کے کمالات کی برتری کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکا- آج دنیا کی اقوام پر نظر ڈال لیجئے آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ جو قوم نبوت و رسالت کی منکر ہوئی ہے اس کو پھر خدائی معرفت میں بھی کوئی

حصہ نصیب نہیں ہوا بلکہ جو رسولوں کی معرفت میں جتنی پیچھے رہ گئی ہے وہ اتنی ہی خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی پیچھے رہ گئی ہے- آج نصاریٰ جو عقلاء زمان کہلاتے ہیں جب انہوں نے اپنے رسول کے صحیح مقام کو پہچاننے میں ٹھوکر کھائی تو پھر دیکھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی ان کا حصہ کتنا رہا حتیٰ کہ توحید فی التثلیث کا بنیادی مسئلہ بھی ان کے نزدیک تقدیر کی طرح مذہب کا ایک راز بن کر رہ گیا- اس کے بالمقابل امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جب وہ اپنے رسول کا صحیح مقام پہچاننے میں پیش گام رہی تو اس کو اپنے رب کی معرفت کا جام بھی سب میں بھرپور نصیب ہوا- اسی لیے یہ امت تمام امتوں پر فوقیت لے گئی ہے-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران: ۱۱۰)

تم امتوں میں سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے مقرر کی گئی ہے- نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر صحیح ایمان رکھتے ہو-

آیت بالا کی روشنی میں اب یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعتراف نہیں کرتے اور صرف توحید کے قائل ہیں کیا ان کو صحیح معنی میں توحید اور ''ایمان باللہ'' نصیب ہو سکتا ہے- اسی لیے امام موصوف فرماتے ہیں:

من انكر النبوة و الرسالة فهو فى الحقيقة ماعرف الله عزوجل. (تفسیر کبیر ج ٤ ص ۱۲۸)

جس نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا در حقیقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی معرفت ہی سے بے نصیب رہا-

پس رسالت اور ربوبیت کا رشتہ اتنا مستحکم ہے کہ اس میں تفریق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا ہے:

وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِه. (النساء: ۱۵۰) اور اللہ میں اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں-

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء: ۸۰) جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ تعالیٰ کا-

اب اندازہ فرما لیجئے کہ جن ہستیوں کی معرفت و عدم معرفت حق تعالیٰ کی معرفت و عدم معرفت کا معیار ہو- دنیا میں خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن کی تفریق اور آخرت میں دوزخ و جنت کی تقسیم ان کے وجود پر دائر ہو گویا دنیا و آخرت کا کارخانہ ان کے دم کے ساتھ وابستہ ہو وہ کتنی بلند ہستیاں ہوں گی- درحقیقت قدرت کی رافت و رحمت کا سب سے بڑا مظہر یہی ہستیاں ہوتی ہیں ان ہی کی تشریف آوری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ''رحمٰن'' کو اپنی مخلوق پر کتنی رحمت ہے کہ جب وہ سرکشی اور طغیانی کی حد کر دیتی ہے' اس کے دوستوں کی صف سے نکل کر دشمنوں کی صف میں جا کھڑی ہوتی ہے اور ہدایت کی روشنی چھوڑ کر گمراہی کی تاریکی اختیار کر لیتی ہے اور جنت کی' لازوال نعمت سے محروم ہو کر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتی ہے تو وہ ان کو مٹا دینے کی بجائے پھر ان کی بقاء کے سامان پیدا فرما دیتا ہے- دشمنوں کی صف سے نکال کر پھر دوستوں کی صف میں شامل فرما لیتا ہے' تاریکی در تاریکی میں پھنس جانے کے بعد پھر ہدایت کی چمکتی ہوئی روشنی میں لا کھڑا کرتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے سے نکال کر پھر جنت الفردوس کا مالک بنا دیتا ہے' مگر اس کے یہ سارے انعامات اور اس کی یہ ساری نعمتیں میسر آتی ہیں ان ہی نفوس قدسیہ کے طفیل میں- سبحان اللہ رسولوں کی شخصیتیں بھی کتنی بلند اور پراسرار ہوتی ہیں' جو ان سے جڑ جاتا ہے اس کا رشتہ عالم قدس سے جڑتا ہے اور جو ان سے کٹ جاتا ہے اس کا رشتہ بھی

عالم قدس سے کٹ جاتا ہے۔

وَ كُنتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا. (آل عمران:۳: ۱۰۳) اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر تم کو اس سے نجات دی۔

حافظ ابن قیمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اقوال و اعمال و اخلاق کی وہ صحیح میزان ہوتے ہیں کہ جو اس پر پورا اتر گیا وہ ہر معیار پر پورا اتر گیا اور جو یہاں سرمو اوچھا رہ گیا ہے وہ ان تمام امور میں بھی ناقص رہ گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جتنی ضرورت جسم کو جان کی اور آنکھوں کو نور کی ہے اس سے زیادہ ضرورت عالم کو انبیاء علیہم السلام کی ہے' کیونکہ جسم کو جان اور آنکھ کو نور کی ضرورت صرف حیات دنیا تک محدود ہے اور حیاتِ دنیا خود بھی محدود ہے' لیکن ان نفوسِ قدسیہ کی ضرورت دونوں جہان کے ساتھ وابستہ ہے انسان اپنی عارضی اور دائمی دونوں حیات میں ان کا یکساں محتاج ہے۔ اسی کے ساتھ ضمناً امام موصوف انبیاء علیہم السلام کی شناخت پر بھی مختصر سا کلام کر گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی صفت ملوکیت کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسولوں کو بھیجے اسی طرح اس کی صفتِ قدرت کا یہ تقاضہ تھا کہ رسولوں کے ہاتھوں پر ایسے افعال کا ظہور فرمائے جو عام انسانوں کی طاقت سے بالاتر ہوں تاکہ یہ اس کی علامت ہوں کہ درحقیقت کسی ایسی ہی ذات کی طرف سے آئے ہیں جس کی قدرت کے سامنے سب عاجز ہیں اور اس طرح رسولوں کی شخصیت کا پورا تعارف ہو جائے۔ لہٰذا جو شخص معجزات کا منکر ہے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی صفت قدرت ہی کا منکر ہے۔ امام موصوف کا مطلب یہ ہے کہ معجزات خود انبیاء علیہم السلام کے افعال نہیں ہوتے اور اسی لیے دوسرے افعال کی طرح وہ ان کی قدرت اور اختیار سے سرزد نہیں ہوتے کہ جب چاہیں اپنے دوسرے افعال کی طرح معجزات دکھا دیا کریں جیسا کہ آئندہ معجزات کی بحث میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اس کی تفصیل کریں گے۔ پس یہاں معجزات کا اندازہ دوسرے انسانی افعال سے لگانا ہی غلطی ہے یہاں اگر ان کا موازنہ کرنا چاہیے تو قدرت کے براہ راست افعال کے ساتھ کرنا چاہیے۔ زمین و آسمان میں قدرت کی خالقیت اور عجائبات کی جتنی عجیب و غریب داستان بکھری پڑی ہے کسی نبی کا کوئی معجزہ ان سے عجیب تر نہیں ہے قرآن کریم کے بیان کردہ معجزات اور احادیث کے تمام معجزات قدرت کے بلاواسطہ افعال کے مقابلہ میں اٹھا کر رکھ لیجئے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ اگر وہ بلاواسطہ افعال معقول ہیں تو پھر اس قدرت کے سامنے یہ معجزات بھی نامعقول نہیں ہو سکتے۔ لیکن جو شخص نبی کے واسطہ سے قدرت کے عجائبات کا انکار کرتا ہے اس کے لیے پھر قدرت کے دیگر براہ راست افعال کے قبول کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ امام موصوف کے اس مختصر بیان سے رسالت و نبوت کی ضرورت اور ان کی شناخت کے دونوں مسئلے عقلاً و نقلاً ہر دو طریقہ پر ثابت ہو گئے۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مخلوق کو اپنی دین و دنیا میں جس چیز کی حاجت جتنی شدید تھی خالق کائنات نے اتنی ہی زیادہ سخاوت اور بہتات کے ساتھ اس کو پیدا فرمایا ہے۔ دیکھئے سانس لینے کے لیے ہوا کی ضرورت سب کو ہے اور ہر ضرورت سے زیادہ' لہٰذا اس کو پیدا بھی اس افراط کے ساتھ فرمایا ہے کہ اپنی حاجت روائی میں کسی کو کہیں بھی ذرا تکلیف نہیں ہوتی اس سے دوم نمبر میں پانی کی حاجت ہے اس کے بعد پھر کھانے اور پینے کی ہے اس لیے پانی کو بھی اسی فراوانی سے پیدا فرمایا ہے' لیکن اس

فراوانی سے نہیں جس سے کہ ہوا کو اسی طرح اب دینی پہلو کو لیجئے تو یہاں سب سے زیادہ حاجت ربوبیت کی معرفت کی ہے اس لیے اپنی ربوبیت کے دلائل انسان کی شش جہت میں اس کثرت کے ساتھ پھیلا دیئے ہیں کہ ذرہ ذرہ اس کی ربوبیت کا شاہد بنا ہوا ہے۔

ففی کل شیٔ لہ ایۃ تدلّ علٰی انہ واحد

اس سے دوم نمبر کی حاجت نبوت کی ہے' کون نہیں جانتا کہ ایک انسان جب اپنے جیسے دوسرے انسان کی خوشی اور ناخوشی کے ذرائع و اسباب اس کے بتائے بغیر نہیں جان سکتا تو خالق کی خوشی و نارضائی کے اسباب اس کے فرمائے بغیر بھلا کون جان سکتا ہے اس لیے اس نے انبیاء علیہم السلام بھیجے تا کہ ان کے ذریعہ وہ اس کے تمام اسباب بتفصیل بیان فرما دے- اوران کی شناخت کے دلائل بھی اتنی کثرت سے ظاہر فرمائے کہ پھر ایک ان پڑھ سے ان پڑھ انسان کے لیے بھی ان کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے- اگر عقلی مناقشات کا میدان چھوڑ کر آپ خود ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی معرفت کے سامان قدرت نے ہر دور میں اس کثرت کے ساتھ جمع کر دیئے تھے کہ ان پڑھ جاہلوں کے لیے بھی انبیاء علیہم السلام کی شناخت میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی- حتیٰ کہ دشمنوں کے لیے ان سے انکار کرنا ایک بڑا غور طلب مسئلہ بن گیا- قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون جیسے مدعی الوہیت کے مقابلہ کا واقعہ مذکور ہے دیکھئے کس طرح ساحرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آ کر ذرا سی دیر میں ان کی نبوت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ بھی کس یقین کے ساتھ کہ پر فرعون نے ہزار دھمکیاں بھی دیں مگر کیا وہ ذرا ٹس سے مس ہوئے ؟ بلکہ اور صاف یہ اعلان کر دیا:

فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَا اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ. (طٰہٰ: ۷۲-۷۳)

تو اب جو تو کرنے والا ہے کر گزر تو اس دنیا کی زندگی پر ہی حکم چلا سکتا ہے (یعنی بہت سے بہت مروا دے) بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے اور خاص کر جادو کے گناہ کو جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا-

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپؐ کے گرد و پیش میں جو دلائل کی بارش برسی اس کی کیفیت تو آج دنیا کی زندہ تاریخ سے ظاہر ہے کن نامساعد حالات میں تشریف لائے اور کس قبول اور جاذبیت کے ساتھ جہان کو چند سالوں میں فتح کر ڈالا' جس میں بادشاہ بھی تھے اور فقیر بھی' کاہن اور ساحر بھی تھے اور سخن شناس شاعر بھی- پھر جن ضدی اور ہٹ دھرموں نے آپ کو نہیں مانا تو اس انکار کے لیے ان کو کتنی سازشیں' کتنے ظلم اور کتنے اور حربے استعمال کرنے پڑے اور اس پر بھی کوئی جماعت ان کے ساتھ نہ ہوسکی آخر کار شقاوت کا داغ اپنی ہی پیشانی پر لگا کر محروم اور ناکام دنیا سے گزر گئے' جیسا کہ آئندہ اوراق میں اس کا مختصر سا نمونہ آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا- اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی - فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ. (الجواب الصحیح ص ۲۸۴ ج ۴)

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے مکتوبات شریف میں متعدد مقامات پر ضرورت نبوت پر طویل بحث فرمائی ہے- جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ربِ کریم کی ان عام بخشائشوں میں سے جو کسی ملک' کسی خطہ اور کسی خاص جماعت کے

ساتھ مخصوص نہیں رہیں سب سے بڑی بخشائش یہ ہے کہ اس نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ہم کلامی کی راہ کھول دی۔

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر: ۲۴) یعنی ہر ہر جماعت میں ایک ایک ڈرانے والا آ چکا ہے جس نے آ کر وہ رازہائے گراں مایہ جن سے ایک انسان بھی رشک ملک بن سکتا تھا سب ارزاں کر دیئے ہیں۔

وجود کی نعمت' ابر و باد کی نعمت' شمس و قمر کی نعمت اور ان سب سے برتر شرف انسانی کی نعمت گو یہ سب ہی ان عام نعمتوں میں داخل ہیں جو دوست و دشمن اور شاہ و گدا سب ہی میں عام رکھی گئی ہیں' لیکن ان سب میں بیش بہا نعمت نبوت کی نعمت ہے کہ اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو ساری نعمتیں ہیچ ہو جاتیں۔ اسی نعمت کے ذریعہ پروردگارِ عالم نے اپنی ذات وصفات کا اشرف علم بخشا' حشر و نشر' جنت و دوزخ اور انسان کی دائمی و ابدی زندگی کی اطلاع دی اور عالم غیب کے بیش بہا حقائق سے حجاب اٹھا دیا۔ ان ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ اپنی رضامندی کے راستے بتلائے۔ عقل انسانی خواہ کتنی ہی دور بین کیوں نہ ہو مگر اس کی جولانگاہ صرف عالم امکان تک ہے اور وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی دائرۂ محسوسات و مشاہدات میں محدود ہے' حق تعالیٰ کی ذات پاک تک اگر کروڑوں عقلاء میں سے کسی کی رسائی ہوئی بھی تو وہ بہت ناتمام اور ناقص در ناقص تھی' اگر یہاں دلائل کے بڑے تیر چلائے بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ یہی دریافت ہو سکا کہ اس عالم کے لیے کوئی فاعل مختار ہونا ضروری ہے جس کی صناعی کی شہادت ذرہ ذرہ میں عیاں ہے' لیکن اس کی توحید اور اس توحید کی نزاکتیں' اس کی صفات اور ان صفات کی دقتیں تو یہاں آ کر عقل بے چاری پھر حیران و سراسیمہ رہ گئی۔ اس وادی میں جب عقلاء قدیم نے قدم رکھا اور بزورِ عقل خالق تک رسائی کی سعی نافرجام کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو فاعل اور علت تو مانا مگر بالایجاب یعنی بے اختیار۔ اس کی ذات اقدس اور عالم کے درمیان بہت سے اور قدماء گھڑ لیے' اور عالم اشرف کا وجود جس کے حوالہ کیا اس کا نام عقل عاشر رکھا۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ (الکہف: ۵) وہ افلاک جن کے وجود کا بھی آج کوئی ثبوت نہیں ملتا قدیم مانے گئے بلکہ متحرک بالارادہ کہے گئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان میں خرق والتیام یعنی ٹوٹ پھوٹ کا تغیر بھی محال سمجھا گیا اور آخرکار یہاں تک نافہمی کا ثبوت دیا کہ براہ راست عالم کا صدور ہی حق تعالیٰ کی ذات سے محال قرار دے دیا۔ رہ گئیں صفاتِ باری تعالیٰ تو ان سے بھی ان کو کوئی بہرہ نصیب نہ ہوا ملائکۃ اللہ اور دوسرے غیوب کا تو ذکر ہی کیا ہے' آپ نے دیکھا کہ جب انسان ماوراء محسوسات و مشاہدات میں قدم رکھتا ہے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ پھر جب ہمارے عقلاء کا دور آیا تو ان بلند پروازوں کی نظر اتنی پیچھے رہی کہ انہوں نے تو سرے سے خالق کا انکار کر دیا اور عالم کا وجود خود عالم ہی کے سپرد کر کے اپنی عقل کا سب زور خواص مادیات کی تلاش پر صرف کر ڈالا' پھر اس ضمن میں بھی جو سوال سب سے اہم ان کے سامنے آیا وہ ایسا سوال تھا جس کو انسانی شرافت ہمیشہ خست کی نظر سے دیکھتی رہی ہے یعنی دولت و زر کی تقسیم اور پیٹ کا مسئلہ۔[1]

---

[1] جب سے اس مسئلہ کا حل اس جدید انداز سے شروع ہوا ہے عالم جس دورِ حیات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اب عنقریب اس مسئلہ کا حل ایٹم بم سے ہونے والا ہے اور اس کے استعمال کے بعد امید ہے کہ پیٹ کا مسئلہ اور دولت کی تقسیم کا تصفیہ خود بخود اتنا مختصر ہو جائے گا کہ اس پر غور و خوض کی حاجت ہی نہ رہے گی اور اس وقت انبیاء علیہم السلام کے علوم اور ان کے برکات اور عقلاء کے علوم اور ان کے نتائج کا موازنہ کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

کاش یہ عقلاء اگر زرا اس پر غور کر لیتے کہ قدرت نے جس طرح ان کو مختلف ذرائع علم عطا فرمائے ہیں اسی طرح ان کے معلومات کی انواع بھی مختلف بنائی ہیں' حواس خمسہ کو دیکھئے ہر حاسہ دوسرے حاسہ کے محسوسات سے کتنا بے خبر ہے مثلاً حاسہ سمع عالم مبصرات سے اسی طرح نا آشنا ہے جس طرح کہ حاسہ بصر عالم مسموعات سے ایک حدید البصر سے حدید البصر انسان ہزار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اگر آواز کو اپنی آنکھوں سے سننا چاہے تو نہ اس کو سن سکتا ہے اور نہ دیکھ ہی سکتا ہے' اسی طرح اگر مبصرات کو حاسہ سمع کے قریب سے قریب تر لے آؤ تو اس کو بھی اس کے رنگ و ہیات کا ادنیٰ سا ادراک بھی نہیں ہو سکتا - پس اگر یہاں فیصلہ صرف ایک ہی حاسہ کے ادراک پر ختم کر دیا جائے تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ محسوسات کے ایک بڑے حصہ کا انکار کر دینا پڑے گا مگر یہاں ہر شخص اس کے انکار کے بجائے اپنے اس حاسہ ادراک ہی کا قصور سمجھتا ہے اگر کہیں قدرت اس کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا حاسہ عطا نہ فرمادیتی تو جاہل انسان آپ کو یہاں صرف انکار کرتا ہوا نظر آتا پھر ان حواسِ خمسہ سے بالاتر انسان کو ایک آلہ ادراک اور مرحمت ہوا ہے جس کا نام عقل ہے' ان حواسِ خمسہ کی حقیقت عقل کے سامنے ٹھیک وہی ہے جو ایک حاسہ کی دوسرے حاسہ کے سامنے یعنی یہاں حواس خمسہ کا مجموعہ مل کر بھی مملکت عقل کے ایک چھوٹے سے چھوٹے گوشہ کے ادراک سے عاجز نظر آتے ہیں- اگر رحمت کی فیاضی اس کے علوم کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا آلہ ادراک عطا نہ فرمادیتی تو یہ مسکین صرف اپنے حواسِ خمسہ کے بھروسہ پر عقل کے جملہ ادراکات کا منکر ہی نظر آتا - اس میں شبہ نہیں کہ قوتِ ادراک میں عقل کا نمبر سب سے فائق تر ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی امر کے ادراک سے بھی وہ عاجز نہیں ہے لیکن اگر فیصلہ صرف کسی ایک ہی حاسہ کے تابع رکھا جائے تو ہر حاسہ اپنے ماحول میں اتنی ہی وسعت اور حدت رکھتا ہے مگر جب دوسرے آلاتِ ادراک کی طرف بھی نظر کی جاتی ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ ساری وسعت اپنے ہی دائرۂ احساس میں محدود تھی' اسی طرح عقل کا حال بھی سمجھنا چاہیے- عالم غیب جو حواس اور مشاہدہ اور اسی طرح عقل کی دسترس سے باہر ہے اس کے ادراک سے عقل بھی ٹھیک اسی طرح درماندہ ہے جیسا کہ حواس خمسہ عقل کے علوم کے ادراک سے- پس جس طرح وہاں راہِ صواب یہی ہے کہ حواسِ خمسہ ہی کا قصور تسلیم کر لیا جائے اور عقل کی معلومات کا انکار نہ کیا جائے - اسی طرح یہاں بھی یہی ایک بات درست ہے کہ ادراکاتِ نبوت اور وحی کا اعتراف کر لیا جائے اور اپنی عقل کوتاہ کی نارسائی کی وجہ سے اس کا انکار نہ کیا جائے - فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ وہاں آلہ ادراک یعنی عقل سب کو ملی ہے اور یہاں وحی و نبوت صرف چند مخصوص اور چیدہ افراد کو پھر جس طرح عقلیات میں ہر انسان دوسرے کی عقل پر اعتماد کر لیتا ہے- اسی طرح یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کی عقول اور دیگر عقلاء کے ان کی تصدیق کرنے پر اعتماد کر لینا چاہیے تھا اور ان کے علوم غیبیہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے تھا - مگر یہاں ہر انسان یہی مطالبہ کرتا ہے کہ جب تک براہ راست وہ خود بھی ان علوم کا ادراک نہ کر لے محض انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کو تسلیم نہیں کر سکتا - قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ . (دیکھو مکتوباتِ امام ربانی جلد ثالث ص ۳۸)

رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک ورق

حق پسند انسانوں کے غور وفکر کے لیے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طویل وعریض بحث کے بعد آپ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک ورق پیش کر دیا جائے جس کو مذکورۂ بالا مضمون کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں۔

قرآنِ شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت ورسالت آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ہی محدود ہوگئی تھی۔ چنانچہ بعد میں جو نبی آیا ان ہی کی ذریت میں آیا آپ کے دو فرزند تھے اسحٰق اور اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کا تذکرہ تورات میں موجود ہے۔ حسب بیان تورات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نسل میں صرف ایک ہی نبی کی بشارت تھی۔ حضرت خلیل علیہ السلام جب بناء بیت سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جو بناء بیت میں ان کے شریک تھے ان کی ذریت کے حق میں ایک رسول مبعوث ہونے کی دعاء فرمائی تھی جو اسی بلدۂ مبارکہ میں پیدا ہوں جہاں انہوں نے خدا تعالیٰ کا بیت تعمیر فرمایا تھا' چنانچہ دعاء ابراہیمی کے مطابق آپ تشریف لائے۔ نسب میں سب سے عالی' حسب میں سب سے برتر' اپنی عہد طفولیت ہی سے ہمیشہ ممتاز سیرت' ممتاز صورت' عادات وشمائل میں قوم سے علیحدہ' عبادات ورسوم میں ان سے الگ' لہو ولعب سے مجتنب' شرک و کفر سے متنفر' صدق وصفا' احسان وسلوک سے مزین' ظلم وعدوان اور جملہ فواحش سے کوسوں دور' جنگ وجدال سے نفور' مال وجاہ کی محبت سے بالاتر' عدل وانصاف کے شاہزادے۔ غرض جملہ اخلاقِ فاضلہ سے محلی اور جملہ اخلاقِ رذیلہ سے معری' جوانی میں عصمت وعفت کے فرشتے' پیری میں وقار ورعب کا پیکر' بال بال سے حسن ٹپکتا' کلمہ کلمہ سے پھول جھڑتے' روئیں روئیں سے فہم و فراست چمکتی' غصہ ومحبت اور جدل وہزل میں یکساں حق گو۔ عفو ودرگزر کرنے والے' مخلوق خدا کے سب سے بڑے ہمدرد' عہد و پیمان کے سب سے پکے' سب سے زیادہ راست گو' سب سے بڑھ کر امانت دار' لطف یہ کہ خود امی اور قوم بھی سب امی۔ تورات و انجیل کو نہ آپ جانتے نہ آپ کی قوم جانتی' نہ کسی سے کوئی حرف پڑھا' نہ اہل علم کے پاس نشست و برخاست رکھی قسیس ورہبان آپ کے موعود نبی ہونے پر سب متفق اور مشرکین عرب سب آپ کی ان صفات کے معترف۔ اسی حالت پر چالیس سال گزارے' کبھی نبوت کا ایک حرف زبان سے نہ نکالا۔ جب عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی تو ایک ایسا عجیب وغریب دعویٰ کیا جس سے نہ ملک آشنا' نہ باپ دادے آشنا اور ایک ایسا کلام لوگوں کے سامنے پیش کیا جو آج تک نہ کسی نے سنا اور نہ آئندہ اس کی نظیر ممکن' صحف سماویہ سب اس کے سامنے سرنگوں نہ الٰہیات وعملیات میں کوئی اس کے ہم پلہ نہ سیاسیات ومعاشیات میں کوئی اس کا ہمسر' اسرار کا مخزن' علوم کا سمندر' قصص وامثال' نصائح وعبر کا دریا' طیبات کے حلال کرنے والے اور خبائث کے حرام کرنے والے' بھلائی کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے' کوئی بھلی چیز ایسی نہ تھی جس کو عقولِ سلیمہ بھلی سمجھیں کہ اس کا حکم نہ دیا ہو اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس کو عقولِ سلیمہ برا جانیں مگر اس سے روک نہ دیا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جس کا آپ حکم دیں

طبائع سلیمہ کی خواہش یہ ہو کہ آپ اس کا حکم نہ دیتے اور نہ کبھی ایسی بات سے روکا جس کے متعلق طبائع سلیمہ کی تمنا یہ ہو کہ آپ نہ روکتے - اس پر ریاست و سرداری سے بیزار' دشمنوں اور مخالفوں سے لا پرواہ' احباب و انصار سے بے نیاز' نہ ہاتھ میں کوئی دولت' نہ پشت پر کوئی طاقت' نہ قبضہ میں کوئی ملک' زن' زر کی کوئی دولت نہیں جو قدموں پر ڈال نہ دی گئی ہو اور آپ نے اس کو ٹھکرا نہ دیا ہو' حبس و قید' جلاء وطنی حتی کہ قتل کی کوئی تدبیر اٹھا کر نہیں رکھی گئی جس کو پورا نہ کر لیا گیا ہو' مگر آپ دشمنوں کے جھرمٹ میں اسی طرح خدا کے دین کے بے خوف و ہراس منادکو چوں میں بازاروں میں ایام حج میں کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں پہنچ کر اعلانِ حق نہ کر دیا ہو' تنہائی میں بھی اور محفلوں میں بھی' عوام میں بھی اور خواص میں بھی' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے دین قبول کرنے کے لیے کسی کو قتل کی دھمکی دی ہو یا کسی قسم کی طمع و لالچ دی ہو' تیرہ سال اسی طرح گزار دیئے نہ ساز و سامان اور نہ کوئی یار و مددگار' مگر نہ دل میں کسی کا خوف نہ چہرہ پر کچھ ہراس - جب اقتدار ملا تو دشمنوں سے درگذر اور ایذاء رسانوں کے لیے عفو کا اعلان کسی پر ذرا ظلم و تعدی ہو کیا مجال - تمام عمر کانٹے پر تلی ہوئی - امن ہو یا خوف' فراغت ہو یا تنگی' شکست ہو یا فتح' اپنے متبعین کی قلت ہو یا کثرت ہر حال میں وہ استقامت کہ ایک انچ قدم اِدھر اُدھر پڑ جائے کیا ممکن -

خلاصہ یہ کہ جب دنیا میں تشریف لائے تو فضائے عالم تاریک نہ دنیا سے باخبر نہ ہدایت سے آشنا' بت پرستی سے خدا کی زمین ناپاک' خوں ریزی اور قتل و غارت سے نالاں' نہ مبدء کی خبر نہ معاد کا علم اور جب آپ تشریف لے گئے تو وہی سب سے بڑھ کر عالم' سب سے زیادہ مہذب' سب میں ممتاز دیندار' انصاف و امن کے قائم کرنے والے اور دنیا کی نظروں میں ایسے سر بلند کر اگر ان پر بادشاہوں کی نظر پڑتی تو وہ مرعوب ہو جاتے اور اگر اہل کتاب ان کو دیکھتے تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری بھی بھلا ان سے کیا افضل ہوں گے -

اس اقتدار و قبول کے ساتھ جب آپ نے دنیا کو چھوڑا تو ترکہ میں نہ درہم و دینار نہ کوئی ملک و خزانہ صرف خچر اور ذرہ مبارک کہ وہ بھی ایک یہودی کے ہاتھ تیس صاع جو کے عوض میں مرہون -

جب آپ کے خلفاء پر نظر کیجئے تو ان میں اوّل خلیفہ وہ جو سب میں مشہور عاقل' اخلاق میں برتر' قوم میں محبوب ہستی کے بزرگ' جس دن سے آپ کا دامن پکڑا پھر مرتے دم تک کسی خطرناک سے خطرناک جگہ ساتھ نہ چھوڑا - ہر موقعہ پر اپنی جان قربان کی اپنا سارا مال آپ کی حمایت میں لٹا دیا اور جب آپ کے بعد خلیفہ ہوئے تو شروع میں پھیری پھر کر اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالتے - آخر میں جب بجبوری وظیفہ قبول کیا تو وہ بھی صرف اتنا کہ بمشکل گزران کے لیے کافی ہو اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو بیت المال کے یہ محدود مصارف بھی بے باق کر گئے - (دیکھو فتح الباری ص ۲۴۳ ج ۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہنا ہی کیا - روم و فارس کی سلطنتیں فتح کیں - پھر بیت المال سے ادھار لے کر کھایا - آخر جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو بیت المال کا حبہ حبہ ادا کر گئے اور اس کے لیے ایک گھر جو اپنی ملکیت تھا اس کی فروختگی کی وصیت کر گئے -

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بات ہی کیا خود غنی مگر ان کا سب مال ہمیشہ مسلمانوں کے لیے بے حساب لٹتا رہا - پورے اقتدار

کے ساتھ مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہنا گوارا نہ فرمایا آخر اپنی جان قربان کر دی۔

حضرت علیؓ اور صاحبزادگانِ اطہار کا کیا پوچھنا کس مظلومیت میں دین پر جانیں دیں اور صرف حق کی خاطر سچی قربانی کی جو مثالیں قائم کیں وہ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنی یادگار رہ گئیں۔

امت پر نظر کیجئے تو وہ امت جس کی دیانت داری' بےلوثی اور بےطمعی بھی مدتوں تک ضرب المثل اپنے مذہب کے اتنے بڑے نگراں اور اپنی ساوی کتاب کے بلکہ اپنے رسول کے حرف حرف کے بھی ایسے محافظ جس پر جہان ششدر' نہ ان سے قبل اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے نہ ان کے بعد ممکن۔ حکمرانی میں اتنے ممتاز کہ صدیوں تک اطرافِ عالم پر حکمراں رعایا میں یگانہ و بیگانہ سب یکساں مداح' اور اپنی پستی میں بھی اتنے بھاری کہ عالم ان سے خائف' قوموں نے جتنا ان کو مٹایا اتنے ہی وہ ابھرے۔ الغرض اس دورِ پستی میں بھی ان کی وہ دھاک کہ عالم کفر کو اگر کچھ خطرہ ہے تو صرف ایک ان سے!

گو یہ کوئی طریقہ عدل و انصاف کا نہیں ہے کہ جب کسی قوم پر نظر ڈالی جائے تو صرف اس کے انحطاط ہی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے دورِ عروج کی تاریخ دیگر اقوام کے بالمقابل کیا تھی؟

اب آپ اس رسولِ اعظم کے یہ اجمالی صفات اور ان کی آمد سے یہ عظیم انقلابات سامنے رکھ کر خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ نبوت کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کیا ہوتے ہیں اور ان سب میں افضل الرسل اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کا مقام رفیع کیا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ہماری آنکھیں نیچی ہیں اور قلم شرمندہ کہ بحث ونظر کا جو طریقہ کبھی اہل کتاب اور منکرین کے سامنے اختیار کیا گیا تھا آج بصد افسوس وہی طریقہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کی تفہیم کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اب تک جو سبق آپ نے تاریخ وعقل کی روشنی میں پڑھا اب ایک بار پھر اس کو حدیثوں کی روشنی میں ملاحظہ فرمالیجئے۔

وَ مَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ.

❁ ❁ ❁

الذین کان لھم علم بسیر الانبیاء علیھم السلام و معرفۃ بمیزاتھم کانوا یعرفونھم بسیماھم او بنبذۃ من احوالھم من غیر تامل

جن کو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی خصوصیات کا ذرا بھی علم تھا وہ اُن کو دیکھ کر یا اُن کے مختصر حالاتِ زندگی سن کر فوراً اُن کو پہچان لیتے تھے

(۹۷۰) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ اَبَا سُفْیَانَ ابْنَ حَرْبٍ اَخْبَرَہٗ اَنَّ هِرَقْلَ اَرْسَلَ اِلَیْهِ فِیْ رَکْبٍ مِنْ قُرَیْشٍ کَانُوْا تُجَّارًا بِالشَّامِ فِی الْمُدَّةِ الَّتِیْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَادَّفِیْهَا اَبَا سُفْیَانَ وَ کُفَّارَ قُرَیْشٍ فَاَتَوْهُ وَ هُمْ بِاِیْلِیَاءَ فَدَعَاهُمْ وَ حَوْلَهٗ عُظَمَاءُ الرُّوْمِ ثُمَّ دَعَاهُمْ فَدَعَا بِالتَّرْجُمَانِ فَقَالَ اَیُّکُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ قَالَ اَبُوْ سُفْیَانَ فَقُلْتُ اَنَا اَقْرَبُهُمْ فَقَالَ اُدْنُوْهُ مِنِّیْ وَ قَرِّبُوْا اَصْحَابَهٗ فَاجْعَلُوْهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهٖ ثُمَّ

(۹۷۰) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے (یہ واقعہ ان کے اسلام سے پیشتر کا ہے) ان سے بیان کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان کے بلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا جب کہ وہ قریش کے ایک ایسے قافلہ میں شامل تھے جن کی تجارت ملک شام سے ہوتی تھی - یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور دیگر کفارِ قریش کے ساتھ ایک معین مدت کے لیے صلح کر رکھی تھی - القصہ ابوسفیان مع اپنے قافلہ کے ہرقل کے دربار میں حاضر ہو گئے - اس وقت یہ لوگ اتفاق سے مقام ایلیاء میں تھے - ہرقل نے ان کو اپنے سامنے طالب کیا اس وقت اس کی مجلس میں روم کے اور بڑے بڑے لوگ بھی موجود تھے پھر ان کو ذرا اور قریب بلایا اور ایک ترجمان طلب کیا اور قریشی لوگوں سے کہا کہ بلحاظِ نسب تم میں وہ شخص کون ہے جو ان کا سب سے زیادہ

---

(۹۷۰) * یہ ایسے دو شخصوں کا باہم مکالمہ ہے جن میں ابھی تک دونوں غیر مسلم ہیں یعنی ہرقل شاہ روم اور ابوسفیان رئیس قافلہ پھر کیا بات تھی کہ ہرقل تو چند سوالات کے بعد ہی حقیقت تک جا پہنچا' اور ابوسفیان آپؐ کے چشم دید حالات کے بعد بھی جس بات کے سمجھنے سے قاصر رہا وہ صرف ایک بات یہی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں - غور کیجیے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فرق صرف یہ تھا کہ ہرقل چونکہ اہل کتاب میں سے تھا اس لیے اس کو انبیاء علیہم السلام کے خصائص و امتیازات اور ان کی تاریخ کا پورا علم حاصل تھا اور ابوسفیان ان امور سے قطعاً لاعلم تھا وہ نہ تو خود اہل کتاب میں سے تھا نہ ان سے استفادہ کا اس کو موقعہ مل سکا تھا' اس کے ماحول میں ساحر و شاعر اور کاہنوں کے سواء انبیاء علیہم السلام کا کوئی تذکرہ نہ تھا اس لیے نبوت کے مسئلہ کو سمجھنا اس کے لیے ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا تھا - عرب کے امیوں کے لیے ایمان لانے کا راستہ دوسرا تھا جو آئندہ خود ان کے بیانات سے واضح ہوگا -

ہرقل نے یہاں جتنے سوالات بھی کیے ہیں ان سے قدم قدم پر آپ کو یہ ظاہر ہوتا چلا جائے گا کہ اس کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے اہم اسباق آپ کی سیرت میں بھی مطالعہ کر لے اور صرف اسی ایک بات سے آپؐ کے صدق و کذب کا فیصلہ کر دے - چنانچہ اس نے آپؐ کے خاندان کی تحقیق سب سے پہلے کی اور اس کا جواب سن کر جو پہلی بات کہی وہ یہی تھی کہ گذشتہ رسول بھی ہمیشہ عالی خاندان ہی ہوا کرتے تھے - اس کے بعد جب آپ کے متبعین کے متعلق یہ جواب سنا کہ اس میں بڑی تعداد عوام اور کمزور طبقہ کی ہے تو اس کے بعد جو لفظ اس نے کہے وہ بھی یہی تھے کہ یہی جماعت ہے جو پہلے بھی ہمیشہ رسولوں کی متبع ہوا کرتی تھی اسی طرح جب لطف ......

قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ قُلْ لَهُمْ اِنِّیْ سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ فَاِنْ كَذَبَنِیْ فَكَذِّبُوْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْ لَا الْحَيَاءُ اَنْ يُؤْثِرُوْا عَلَیَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَنْهُ ثُمَّ كَانَ اَوَّلَ مَا سَأَلَنِیْ عَنْهُ اَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهٗ فِيْكُمْ قُلْتُ هُوَ فِيْنَا ذُوْ نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ اَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهٗ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَاَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ اَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ قُلْتُ ضُعَفَاءُهُمْ قَالَ اَيَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ قُلْتُ بَلْ يَزِيْدُوْنَ قَالَ فَهَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ سُخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَ نَحْنُ مِنْهُ فِیْ مُدَّةٍ لَا نَدْرِیْ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيْهَا وَ لَمْ يُمْكِنِّیْ كَلِمَةٌ اُدْخِلُ فِيْهَا شَيْئًا غَيْرَ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ اِيَّاهُ قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهٗ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَ نَنَالُ مِنْهُ قَالَ فَمَاذَا

قریبی رشتہ دار ہو جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں- ابوسفیان کہتے ہیں میں نے کہا ان کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار میں ہوں- یہ سن کر ہرقل نے کہا اچھا ابوسفیان کو میرے اور قریب لے آؤ اور اس کے رفقاء کو اس کی پشت کی جانب پاس بٹھا دو- اس کے بعد اپنے ترجمان سے کہا اس کے رفقاء سے کہہ دو کہ میں ان کے متعلق اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں اگر یہ ذرا بھی غلط بیانی سے کام لے تو تم لوگ فوراً اس کی تکذیب کر دینا- ابوسفیان کہتا ہے خدا کی قسم اگر مجھ کو اس بات کی غیرت نہ ہوتی کہ میری نسبت لوگ ہمیشہ دروغ گوئی کا عیب لگاتے رہیں گے تو یقیناً میں آپ کے متعلق جھوٹی جھوٹی باتیں بیان کر کے رہتا- اس کے بعد سب سے پہلا سوال جو ہرقل نے مجھ سے کیا یہ تھا- جو شخص پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے اس کا خاندان کیسا ہے؟ میں نے کہا بڑا شریف گھرانا ہے- پھر اس نے پوچھا اس کے خاندان میں سے کسی اور نے کبھی پہلے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں- اس نے پوچھا کیا اس کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں- پھر ہرقل نے پوچھا اچھا جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں وہ رئیس لوگ ہیں یا غریب؟ میں نے عرض کی جی کمزور اور غریب لوگ- پھر ہرقل نے پوچھا ان کی مردم شماری بڑھ رہی یا گھٹ رہی ہے؟ میں نے عرض کی بڑھ رہی ہے- پھر اس نے پوچھا کوئی شخص اس کے دین سے بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں- اس کے بعد ہرقل نے سوال کیا پیغمبری کے دعوے سے بھی پہلے تم لوگوں نے کبھی اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں- پھر اس نے پوچھا یہ

لله ..... اس کو معلوم ہوا کہ آپ کی جماعت برابر ترقی پر ہے اور ان میں اپنے دین سے ناراض ہو کر اس کو ترک کرنے والا ایک متنفس بھی نہیں ہے تو یہاں بھی اس نے انبیاء سابقین پر ایمان لانے والوں کا حال بھی بیان کیا ہے- پھر جب اس نے آپؐ کے صدق و کذب کا حال دریافت کیا جو کسی نبی کے لیے سب سے پہلی شرط ہوتی ہے تو جو کلمات ابوسفیان کی زبان سے نکلے وہی سب سے زیادہ زوردار تھے وہ کہتا ہے کہ آپ کے صدق و صفا کا پوچھنا ہی کیا ہے یہاں دوست تو دوست دشمن بھی آپ کو صدوق و امین کے لقب سے پکارتے ہیں- اس سے بھی زیادہ نازک مسئلہ جنگ کا ہے یہ معاملہ قومی ہوتا ہے اور یہاں ایک راست باز سے راست باز انسان بھی لغزش کر سکتا ہے مگر جب ہرقل کو معلوم ہوا کہ آپؐ کے پائے استقلال کو یہاں بھی ادنیٰ سی لغزش نہیں ہوتی اور یہاں بھی آپ ایفاء عہد میں نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر اس کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ استقامت تو صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا حصہ ہوتی ہے- صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ جنگ کے نتائج کا حال سن کر ہرقل نے کہا کہ شکست و فتح میں انبیاء سابقین کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ان دونوں لله .....

يَـأْمُرُكُمْ قُلْتُ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَاتْرُكُوْا مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاؤُكُمْ وَيَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهٗ اِنِّيْ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهٖ فَذَكَرْتَ اَنَّهٗ فِيْكُمْ ذُوْنَسَبٍ وَ كَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِيْ نَسَبِ قَوْمِهَا وَ سَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ هٰذَا الْقَوْلَ قَبْلَهٗ فَذَكَرْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ اَحَدٌ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ قَبْلَهٗ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَّتَاَسّٰى بِقَوْلٍ قِيْلَ قَبْلَهٗ وَ سَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ فِيْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَّلِكٍ فَذَكَرْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَّلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ اَبِيْهِ وَ سَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكِذْبِ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ مَا قَالَ فَذَكَرْتَ اَنْ لَّا فَقَدْ اَعْرِفُ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ لِّيَذَرَ الْكِذْبَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ وَ سَأَلْتُكَ اَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ اَمْ ضُعَفَاءُ هُمْ فَذَكَرْتَ اَنَّ ضُعَفَاءُ هُمْ اتَّبَعُوْهُ وَ هُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَ

شخص کبھی عہد و پیمان کو توڑ بھی دیتے ہیں میں نے جواب دیا نہیں- لیکن ان کے ساتھ اس سال جو ہمارا معاہدہ ہوا ہے دیکھنا ہے کہ اس کو وہ پورا کرتے ہیں یا نہیں- ابو سفیان کا بیان ہے کہ ایک بات کے سواء آپؐ کے حالات میں نکتہ چینی کا ایک حرف بھی میں داخل نہ کر سکا- پھر اس نے سوال کیا اچھا ان کے ساتھ کبھی تمہاری جنگ بھی ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا جی ہاں- اس نے پوچھا تو اس کا نتیجہ کیا رہا؟ میں نے عرض کی اس کے اور ہمارے درمیان جنگ ڈول کی طرح سے رہتی ہے کبھی وہ جیت جاتے ہیں (بدر) اور کبھی ہم (احد) پھر اس نے پوچھا وہ تم کو کس بات کی تعلیم دیتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ' آباء و اجداد کی بت پرستی چھوڑ دو' نماز پڑھو' سچ بولو' پاکباز بنو' رشتہ کا حق پہچانو- یہ تمام حالات سن کر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا ابوسفیان سے کہہ دو میں نے ان کے خاندان کے متعلق تجھ سے تحقیق کی تو تو نے جواب دیا وہ بڑے شریف النسب ہیں اور اسی طرح نبی ہمیشہ شریف گھرانے کے ہوتے چلے آئے ہیں- پھر میں نے تجھ سے پوچھا اس کے دعویٰ نبوت سے قبل تم میں سے کسی اور نے تو کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا؟ تو تو نے جواب دیا نہیں- اس پر میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص ان سے پہلے بھی یہ دعویٰ کر چکا ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس دعوے کی ریس کرتے ہیں- پھر میں نے پوچھا تھا کہ ان کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ تو نہیں گذرا؟ تو تو نے جواب دیا نہیں- اس پر میں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ وہ اس بہانہ سے اپنے باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہیں- پھر میں نے تم سے اس

بقیہ ..... حالتوں سے گزرتے تھے' پھر آخر کار کامیابی ان ہی کو نصیب ہوتی تھی- اس مسئلہ پر اگر عقلی طور سے غور فرمایئے تو شاید آپ پر حکم لگائیں کہ صداقت کی علامت دائمی فتح ہونی چاہیے- مگر یہاں ہرقل اس کے برعکس گاہ گاہ شکست کو بھی صداقت کی علامت سمجھتا ہے کیونکہ وہ انبیاء سابقین کی تاریخ پڑھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ بشر ہوئے ہیں اور اس لیے ان کی حیات میں انسانی حیات کے سب نشیب و فراز نظر آنے چاہئیں- آخر میں اس نے آپؐ کی تعلیمات کے متعلق اہم سوال کیا ہے' اور جب خوب دیکھ لیا کہ آپؐ کی تاریخ نبوت کی تاریخ سے کہیں بھی سرمو خلاف نہیں جاتی تو آپ کے رسول برحق ہونے کے اظہار پر مجبور ہو گیا یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کی عارضی بادشاہت کی طمع نے آخرت کی لازوال بادشاہت سے اس کو محروم رکھا-

یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام جب کبھی صفات عالم پر نمودار ہوئے ہیں تو ان کے سامنے مختلف طبقات کے لوگ آئے ہیں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا جو رسولوں کی جنس ہی سے انکار کرتے تھے' جیسے قوم نوح علیہ السلام اور قوم عاد و ثمود علیہما السلام' اسی لیے بقیہ .....

سَأَلْتُکَ اَیَزِیْدُوْنَ اَمْ یَنْقُصُوْنَ فَذَکَرْتَ اَنَّهُمْ یَزِیْدُوْنَ وَ کَذٰلِکَ اَمْرُ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یَتِمَّ وَ سَاَلْتُکَ اَیَرْتَدُّ اَحَدٌ سَخْطَةً لِدِیْنِهٖ بَعْدَ اَنْ یَدْخُلَ فِیْهِ فَذَکَرْتَ اَنْ لَّا وَ کَذٰلِکَ الْاِیْمَانُ حِیْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ وَ سَاَلْتُکَ هَلْ یَغْدِرُ فَذَکَرْتَ اَنْ لَّا وَ کَذٰلِکَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَ سَاَلْتُکَ بِمَا یَاْمُرُکُمْ فَذَکَرْتَ اَنَّهٗ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ لَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَ یَنْهَاکُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالصَّلٰوةِ وَ الصِّدْقِ وَ الْعَفَافِ فَاِنْ کَانَ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَسَیَمْلِکُ مَوْضِعَ قَدَمَیَّ هَاتَیْنِ وَ کُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهٗ خَارِجٌ لَمْ اَکُنْ اَظُنُّ اَنَّهٗ مِنْکُمْ فَلَوْ اَعْلَمُ اَنِّیْ اَخْلُصُ اِلَیْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهٗ وَ لَوْ

کی تحقیق کی کہ کیا اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ تو تو نے بیان کیا نہیں- اس پر میں نے سوچا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس شخص نے کبھی لوگوں پر جھوٹ نہیں بولا ہے وہ خدا پر جھوٹ باندھے- اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ اس کو ماننے والا طبقہ غریبوں کا ہے یا رئیسوں کا؟ تو تو نے بتایا غریب مسکینوں کا اور ہمیشہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو رسولوں کو ماننے والے ہوتے ہیں- پھر میں نے دریافت کیا ان کی مردم شماری بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے تو تو نے بتایا بڑھتی ہے اور درحقیقت ایمان کا یہی نقشہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے آخر حد کمال تک پہنچ جاتا ہے- پھر میں نے تجھ سے پوچھا کوئی شخص ان کا دین قبول کرنے کے بعد اس سے کبھی بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے؟ تو نے جواب دیا نہیں اور لذت ایمان کی تاثیر درحقیقت یہی ہوتی ہے کہ جب وہ دلوں میں گھر کر جاتی ہے تو پھر نکلا نہیں کرتی- پھر میں نے تجھ سے پوچھا وہ عہد شکنی تو نہیں کرتے؟ تو نے جواب دیا نہیں- اور تمام نبیوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرتے- پھر میں نے تجھ سے پوچھا تم کو تعلیم کیا دیتے ہیں؟ تو نے بیان کیا یہ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور بتوں کی پوجا سے تم کو منع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں

لله ..... قرآن کریم نے ان کا حال ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے: ﴿کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ کَذَّبَتْ قَوْمُ عَادِ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾ دوسرا طبقہ وہ تھا جن کو رسولوں کی ضرورت اور ان کی جنس تو مسلم تھی مگر ان کو یہ بحث رہتی تھی کہ رسول وہی مبشر رسول ہے یا نہیں- یہاں ہرقل چونکہ اہل کتاب میں سے تھا اس کے سامنے ضرورت نبوت و رسالت کا مسئلہ نہ تھا اس لیے اس کے سوالات بھی اس نوعیت کے نہ تھے جو رسالت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے اس کو صرف یہ تحقیق کرنی تھی کہ جس رسول کی بشارات وہ کتب سابقہ میں پڑھتا چلا آ رہا ہے جس کا حلیہ جس کی صفات اور جس کی زندگی کی مفصل تاریخ اس نے مطالعہ کی ہے کیا یہ وہی رسول منتظر ہیں؟ اسی لیے حقیقت تک رسائی میں اس کو صرف ایک ہی قدم کی دیر تھی اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی آمد کی تاریخ مقرر ہو جائے تو اس مقرر تاریخ پر ہوائی جہازوں کی آمد اور توپوں کی آوازوں کے سننے کے ساتھ ہی فوراً یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی آمد ہو گئی ہے یہاں کسی وہمی مزاج شخص کو بھی یہ خطرہ نہیں گزرتا کہ بادشاہ کی آمد کے سواء یہاں کوئی دوسرا احتمال بھی ہوگا- چنانچہ ہرقل نے آخر میں خود ہی اس کی تصریح کر دی کہ مجھے ان کی آمد کا تو یقین تھا مگر تحقیق طلب بات صرف یہ تھا کہ وہ رسول منتظر کہاں مبعوث ہوئے ہیں- میرے گمان میں یہ نہ تھا کہ اس رسول اعظم کی آمد کے لیے نظر ربوبیت امیوں کا انتخاب کر چکی ہے- ترجمان السنہ ج ۲ ص ۶۸ میں آپ یہ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ابن ناطور نے بھی جو اہل کتاب میں ہرقل ہی کے مرتبہ کا دوسرا عالم سمجھا جاتا تھا جب آپ کی تفصیلات سنیں تو آپ کے آخری رسول ہونے میں ہرقل کے ساتھ قطعی طور پر اتفاق کیا- لله .....

كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمِهٖ ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ بَعَثَ بِهٖ دِحْيَةَ اِلٰى عَظِيْمِ بُصْرٰى فَدَفَعَهُ اِلٰى هِرَقْلَ فَقَرَاَهُ فَاِذَا فِيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) عَبْدِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْاَرِيْسِيِّيْنَ وَ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا

کہ نماز پڑھو' سچ بولو' پاکباز ہو- اگر تم نے یہ سب جوابات سچ سچ دیئے ہیں تو ایک دن وہ میرے ان قدموں کی جگہ یعنی شام و بیت مقدس کے مالک ہو کر رہیں گے مجھے اس کا تو پہلے سے علم تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں مگر یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوں گے- اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو آپ کی ملاقات کے لیے پوری سعی کرتا اے کاش کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کے قدم مبارک دھو کر پیتا- اس کے بعد اس نے آپ کا وہ نامہ مبارک جو دحیہؓ نے بصریٰ کی معرفت بھیجا تھا طلب کیا' انہوں نے ہرقل کی خدمت میں پیش کیا- اس کو پڑھا تو اس کا مضمون یہ تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم- یہ خط ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہے ہرقل کے نام جو روم کا بڑا معزز شخص ہے- وہ لوگ سلامت رہیں جو سیدھی راہ چلیں- میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کرلو دونوں جہان کی آفتوں سے محفوظ رہو گے اور تم کو اللہ تعالیٰ اس کا دوگنا ثواب دے گا اور اگر تم نے انکار کیا تو اریس کے سب متبعین کا گناہ تمہارے سر رہے گا- اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جس میں ہمارے تمہارے درمیان کوئی

ﷺ ..... اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ رسول صرف عالی نسب یا صادق القول ہونے سے رسول نہیں بن جاتے- رسول بننے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رسول بنا دے- البتہ جس کو وہ رسول بنا دیتا ہے اس کے لیے پھر یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان تمام صفات کا مالک ہو جو حدیث ہرقل میں آپ نے پڑھی ہیں- نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جہاں چند امور کے مجموعہ سے یقین حاصل ہو گیا ہو وہاں ہر ہر جزء علیحدہ بھی یقین کا فائدہ دے سکے اس لیے یہ بھی غلط ہے کہ اس مجموعہ کے بعض اجزاء کو لے کر نبوت کی دلیل بنا دیا جائے-

یہاں ایک تیسرا طبقہ امت محمدیہ کا ہے جس کے سامنے ان مسائل میں سے اب کوئی مسئلہ بھی باقی نہیں ہے' وہ نبوت کی ضرورت سمجھنے سے جس طرح مستغنی ہے اسی طرح کسی جدید نبی کی آمد کے انتظار اور اس کی تعیین کی بحث سے بھی فارغ ہو چکی ہے- کتنی بدنصیبی ہوگی کہ جو امت ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی اجمالی اور تفصیلی تاریخ پڑھ چکی ہو اس کے افراد یا تو نبوت کی ضرورت پر بحث کرنے والوں کی صف میں نظر آئیں یا پھر کسی جدید رسول کی تلاش میں سرگرداں و سراسیمہ ہوں- یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول جب دنیا میں آتے ہیں تو وہ پہلے سے اپنا پورا تعارف بھی رکھتے ہیں' ان کی بشارت بیان ہو جاتی ہے- ان کی علامات بلکہ مختصر تذکرہ بھی امت کے سامنے ذکر میں آ جاتا ہے- اس لیے جب وہ ان تمام خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں جو اس نوع کی ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہیں- تو یہاں ان کے مخالفین میں ان کو مجنون سمجھنے والی صرف وہی ایک جماعت ہوتی ہے جو تاریخ نبوت سے جاہل ہوتی ہے- کیا مجنون اور صفراء کے مریض اسی اہتمام اور اسی تاریخ حیات کو لے کر آیا کرتے ہیں؟ لیکن ناشکرا انسان جب اللہ تعالیٰ کی بڑی سے بڑی نعمت کا انکار کرنے پر آمادہ ہو ﷺ .....

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ. قَالَ قَالَ اَبُوْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَ فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ وَ ارْتَفَعَتِ الْاَصْوَاتُ وَ اُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِاَصْحَابِيْ لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِيْ كَبْشَةَ اَنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْاَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوْقِنًا اَنَّهُ سَيَظْهَرُ حَتّٰى اَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الْاِسْلَامَ.

(رواہ البخاری و قدمضی باقی الحدیث فی ترجمان السنۃ ج ٢ ص ٦٦)

اختلاف نہیں ہے یعنی یہ کہ ایک اللہ تعالیٰ کے سواء کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور آپس میں کوئی کسی کے لیے خدائی کا درجہ تجویز نہ کرے-اگر اہل کتاب اتنی بات بھی نہ مانیں تو تم ان سے صاف کہہ دو کہ ہم تو خدا کے فرمان بردار ہو چکے-ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ابوسفیان کہتے ہیں جب ہرقل کو جو کہنا تھا اس نے کہہ لیا اور آپ کا نام مبارک پڑھ کر وہ فارغ ہوگیا تو اس کی محفل میں ایک چیخ و پکار اور غوغا مچ گیا-اور ہم لوگ باہر نکال دیئے گئے تو میں نے باہر آ کر اپنے رفقاء سے کہا ابن ابی کبشہ (اس کنیت سے مراد آپ کی ذات تھی) کا معاملہ تو اب ایسا بڑھ گیا کہ روم کا بادشاہ تک ان سے ڈرتا ہے اس کے بعد سے مجھے ہمیشہ اس بات کا یقین رہا کہ آپ عنقریب سب پر غالب آ جائیں گے یہاں تک کہ وہ روز سعید آ پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مشرف باسلام فرمادیا- (بخاری شریف)

(١٧٩) قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فِيْ خُرُوْجِهٖ اِلَى الْمَقُوْقِسِ مَعَ بَنِيْ مَالِكٍ وَ اَنَّهُمْ لَمَّا دَخَلُوْا عَلَى الْمَقُوْقِسِ قَالَ كَيْفَ خَلَصْتُمْ اِلَيَّ مِنْ طَائِفَتِكُمْ وَ مُحَمَّدٌ وَ اَصْحَابُهٗ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ؟ قَالُوْا اَلْصَقْنَا بِالْبَحْرِ وَ قَدْ خِفْنَاهُ

(١٧٩) مغیرہ بن شعبہؓ (اپنے اسلام لانے سے قبل) اپنے اس سفر کا حال بیان کرتے ہیں جس میں وہ قبیلہ بنی مالک کے ساتھ شاہ مقوقس کے پاس گئے تھے-وہ کہتے ہیں جب وہ پہنچے تو شاہ مقوقس نے پوچھا-محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفقاء کے ہوتے ہوئے تم یہاں میرے پاس تک بھلا کیسے پہنچ گئے-انہوں نے کہا ہم دریا کے کنارہ کنارہ آباد ہو گئے تھے مگر ہم کو

لله ...... ہوتا ہے تو اس سے زیادہ حیا سوز کلمات سے بھی نہیں شرماتا- ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ﴾

لفظ اریسین کی تحقیق: اس لفظ کے ضبط و تحقیق میں شارحین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں-لیکن تاریخ کی روشنی میں جو بات راجح قرار پاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''عبداللہ بن اریس'' ایک مشہور پادری تھا یہ اسکندریہ میں قسیس کا منصب رکھتا تھا اور اس کا عقیدہ توحید ہی کا تھا' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اس کا بندہ ہی سمجھتا تھا-اس کا زمانہ وہی تھا جس میں قسطنطین اوّل بانی قسطنطنیہ ہوا ہے-شاہانِ روم میں سب سے پہلے نصرانی مذہب اختیار کرنے والا یہی تھا اور اسی ''اریس'' پادری کا مقلد تھا-اس لحاظ سے جو لوگ اس کے متبع تھے ان کو اریسین کہا جاتا تھا-یہ ہرقل اور اس کی رعایا بھی چونکہ اسی کی متبع تھی اس لیے ان کو اریسی کہا جاتا تھا-لہٰذا آپؐ نے اپنے نامہ مبارک میں اس کو یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ اگر تو اسلام سے منحرف ہوا تو تیری اتباع میں اریس کے جتنے متبعین ہیں تیری رعایا ہونے کی وجہ سے یہ بھی منحرف ہو جائیں گے اس لیے اس لیے ان کے انحراف کا گناہ بھی تیری گردن پر رہے گا (دیکھو مشکل الآثار امام طحاوی-الملل والنحل ابن حزم ج ا ص ٤٨ اور الجواب الصحیح ج ٣ ص ١٤) ہماری اس تحقیق سے جنہوں نے اس لفظ کے معنی رعایا لکھے ہیں ان کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی-یعنی چونکہ اریس کے متبع لوگ ہی اس کی رعایا تھے اس لیے بلحاظِ مصداق رعایا کو اروسی کہنا بھی صحیح ہے گو بلحاظِ لغت اس کا صحیح ترجمہ ''اروس والے لوگ'' ہی صحیح ہو-تاریخ میں اس کا نام اروس اور اریوس دونوں طرح نظر سے گذرا ہے-

عَلٰی ذٰلِکَ قَالَ فَکَیْفَ صَنَعْتُمْ فِیْمَا دَعَا کُمْ اِلَیْہِ قَالُوْا مَا تَبِعَہٗ مِنَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ قَالَ وَ لِمَ ذٰلِکَ؟ قَالُوْا جَاءَ نَابِدِیْنٍ مُجَدَّدٍ لَا تَدِیْنُ بِہِ الْاٰبَاءُ وَ لَا یَدِیْنُ بِہِ الْمُلْکُ وَ نَحْنُ عَلٰی مَا کَانَ عَلَیْہِ اٰبَاءُ نَاقَالَ فَکَیْفَ صَنَعَ قَوْمُہٗ قَالُوْا تَبِعَہٗ اَحْدَا ثُھُمْ وَ قَدْ لَاقَاہُ مَنْ خَالَفَہٗ مِنْ قَوْمِہٖ وَ غَیْرِھِمْ مِنَ الْعَرَبِ فِیْ مَوَاطِنَ مَرَّۃً تَکُوْنُ عَلَیْھِمُ الدَّائِرَۃُ وَمَرَّۃً تَکُوْنُ لَہٗ قَالَ اَلَا تُخْبِرُوْنَنِیْ اِلٰی مَاذَا یَدْعُوْا اِلَیْہِ قَالَ یَدْعُوْنَا اِلٰی اَنْ نَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَخْلَعَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا وَ یَدْعُوْ اِلَی الصَّلَاۃِ وَ الزَّکَاۃِ قَالَ وَ مَا الصَّلٰوۃُ وَ الزَّکَاۃُ اَلَھَا وَقْتٌ یُعْرَفُ وَ عَدَدٌ تَنْتَھِیْ اِلَیْہِ؟ قَالُوْا یُصَلُّوْنَ فِی الْیَوْمِ وَ اللَّیْلَۃِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ کُلَّھَا لِمَوَاقِیْتَ وَ عَدَدٍ سَمُّوْہُ لَہٗ وَ یُؤَدُّوْنَ مِنْ کُلِّ مَا بَلَغَ عِشْرِیْنَ مِثْقَا لًا نِصْفَ مِثْقَالٍ وَ اَخْبَرَہٗ بِصَدَقَۃِ الْاَمْوَالِ کُلِّھَا قَالَ اَفَرَاَیْتُمْ اِذَا اَخَذَھَا اَیْنَ یَضَعُھَا؟ قَالُوْا یَرُدُّھَا عَلٰی فُقَرَائِھِمْ وَ یَاْمُرُ بِصِلَۃِ الرَّحِمِ وَ وَفَاءِ الْعَھْدِ وَ تَحْرِیْمِ الزِّنَاءِ وَ الْخَمْرِ وَ لَا یَاْکُلُ مِمَّا ذُبِحَ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَالَ الْمَقْوْقِسُ ھٰذَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ اِلَی النَّاسِ وَ لَوْ اَصَابَ الْقِبْطَ وَ الرُّوْمَ اِتَّبَعُوْہُ وَ قَدْ اَمَرَھُمْ بِذٰلِکَ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ وَ ھٰذَا الَّذِیْ تَصِفُوْنَ مِنْہُ بُعِثَ بِہِ الْاَنْبِیَاءُ مِنْ قَبْلِہٖ وَ سَیَکُوْنُ لَہُ الْعَاقِبَۃُ حَتّٰی لَا یُنَازِعُہٗ اَحَدٌ وَ یَظْھَرُ اِلٰی مُنْتَھَی الْخُفِّ وَ الْحَافِرِ وَ مُنْقَطَعِ

یہاں بھی ان کا خوف لگا رہتا تھا- اس نے کہا اچھا بتاؤ ان کی باتوں پر تم نے کیا عمل کیا؟ انہوں نے کہا- ہم میں سے تو کسی ایک نے بھی ان کی بات نہیں مانی- اس نے کہا کیوں؟ ہم نے کہا اس لیے کہ وہ ایک ایسا انوکھا دین لے کر آئے ہیں جس کو نہ ہمارے بڑوں نے مانا نہ ملک اس کو مانتا ہے اور ہم تو اپنے بڑوں ہی کے دین پر قائم ہیں اس نے پوچھا کہ اچھا تو اس کی قوم کے لوگوں نے کیا کیا؟ ہم نے کہا نوجوانوں نے تو اس کو مان لیا ہے' جو لوگ مخالف تھے خواہ وہ عرب تھے یا غیر عرب انہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی نتیجہ میں کبھی ان کو شکست ہوتی رہی کبھی آپ کو پھر اس نے پوچھا اچھا یہ تو بتاؤ کہ آخر وہ کن باتوں کی دعوت دیتا ہے؟ ہم نے کہا اس کی کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں جس کا کوئی شریک نہیں- اور جن بتوں کی ہمارے بزرگ عبادت کرتے آئے ہیں ان کو یکلخت چھوڑ دیں اور نماز اور زکوۃ کی بھی دعوت دیتے ہیں- اس نے کہا- نماز اور زکوۃ کیا چیز ہے؟ کیا اس کا کوئی وقت بھی مقرر ہے جس کو لوگ جانتے ہوں اور کوئی مقرر عدد بھی ہے؟ انہوں نے کہا شب و روز میں وہ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں اور پانچوں کی پانچوں اپنے اپنے وقتوں میں پھر اس سے ان کا عدد بھی بیان کیا- نیز یہ لوگ ہر مال میں سے جس کی قیمت بیس مثقال ہوتی ہے نصف مثقال ادا کرتے ہیں- اس کے بعد مال کے جملہ اقسام میں جو جو صدقہ واجب ہوتا تھا وہ سب تفصیلاً بیان کیا- اس نے پوچھا اچھا بتاؤ تم سے وصول کر کے پھر یہ صدقہ وہ کہاں خرچ کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا- جن کے مال داروں سے وصول کرتے ہیں ان ہی کے فقیروں پر تقسیم کر دیتے ہیں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور عہد پورا کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں' زناء اور شراب کو حرام قرار دیتے ہیں اور بجز اللہ کے نام کے کسی اور کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے- یہ سن کر شاہ مقوقس نے کہا- خوب سن لو کہ یہ اللہ کے برحق نبی ہیں جن کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے- اگر وہ مصر اور روم کے پاس بھی پہنچیں گے تو وہ لوگ بھی ان کی اتباع کریں گے کیونکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی ان کی اتباع کا حکم دے گئے ہیں اور جو جو باتیں تم لوگ بیان کر رہے ہو ان ہی سب باتوں کو لے کر پہلے تمام انبیاء علیہم السلام بھی مبعوث ہوئے ہیں- یقین رکھو کہ نتیجہ ان ہی کے

الْبُحُوْرِ وَ يُوْشِكُ قَوْمُهُ اَنْ يُدَافِعُوْهُ بِالرَّاحِ قَالُوْا فَلَوْ دَخَلَ النَّاسُ كُلُّهُمْ مَعَهُ مَا دَخَلْنَاهُ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَانْغَضَ الْمَقُوْقِسُ رَأْسَهُ وَ قَالَ اَنْتُمْ فِي اللَّعِبِ ثُمَّ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِيْ قَوْمِهِ؟ هُوَ اَوْ سَطُهُمْ نَسَبًا قَالَ كَذٰلِكَ[1] وَ الْمَسِيْحُ الْاَنْبِيَاءُ تُبْعَثُ فِيْ نَسَبِ قَوْمِهَا ثُمَّ قَالَ فَكَيْفَ صِدْقُ حَدِيْثِهِ قَالَ قُلْنَا مَا يُسَمّٰى اِلَّا الْاَمِيْنَ مِنْ صِدْقِهِ قَالَ انْظُرُوْا فِيْ اَمْرِكُمْ اَتَرَوْنَهُ يَصْدُقُ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ وَ يُكَذِّبُ عَلَى اللّٰهِ قَالَ فَمَنْ تَبِعَهُ قُلْنَا الْاَحْدَاثُ قَالَ هُمْ[2] وَ الْمَسِيْحُ اَتْبَاعُ الْاَنْبِيَاءِ قَبْلَهُ قَالَ فَمَا فَعَلَتْ يَهُوْدُ يَثْرِبَ فَهُمْ اَهْلُ التَّوْرَاةِ قُلْنَا خَالَفُوْهُ فَاَوْقَعَ بِهِمْ فَقَتَلَهُمْ وَ سَبَاهُمْ وَ تَفَرَّقُوْا فِيْ كُلِّ نَاحِيَةٍ قَالَ هُمْ قَوْمٌ حَسَدَةٌ حَسَدُوْهُ اَمَا اِنَّهُمْ يَعْرِفُوْنَ مِنْ اَمْرِهِمْ مِثْلَ مَا نَعْرِفُ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَقُمْنَا مِنْ عِنْدِهِ وَ قَدْ سَمِعْنَا كَلَامًا ذَلَّلَنَا لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَضَعْنَالَهُ وَمُلُوْكُ الْعَجَمِ يُصَدِّقُوْنَهُ وَ يَخَافُوْنَهُ فِيْ بُعْدِ اَرْحَامِهِمْ مِنْهُ وَ نَحْنُ اَقْرِبَاؤُهُ وَ جِيْرَانُهُ وَ لَمْ نَدْخُلْ مَعَهُ وَ قَدْ جَاءَ نَادَاعِيًا اِلٰى مَنَازِلِنَا قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَرَجَعْتُ اِلٰى مَنْزِلِنَا فَاَقَمْتُ بِالْاِسْكَنْدَرِيَّةِ لَا اَدَعُ كَنِيْسَةً اِلَّا دَخَلْتُهَا وَ سَاَلْتُ اَسَاقِفَتَهَا مِنْ قِبْطِهَا وَ

موافق نکل کر رہے گا- یہاں تک کہ ایک متنفس کو بھی یہ طاقت نہ ہوگی کہ ان کے ساتھ مقابلہ کر سکے- خشکی و تری کے آخری حصوں تک ان کا غلبہ ہو جائے گا- عنقریب اس کی قوم اس کے ساتھ دست بدست جنگ کرے گی- مگر یہ سب سن سنا کر انہوں نے کہا اگر تمام لوگ بھی اس کے ساتھی ہو جائیں پھر بھی اس کا ساتھ نہیں دیں گے- مغیرہ کہتے ہیں یہ سن کر شاہ مقوقس نے ناگواری سے اپنا سر ہلایا اور کہا تم بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو- اس کے بعد پوچھا اپنی قوم میں اس کا خاندان کیسا ہے؟ ہم نے جواب دیا- سب سے بہتر- اس نے کہا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قوم میں بہترین خاندان میں سے ہوئے ہیں- پھر اس نے پوچھا اچھا اس کی راست گوئی کی کیا کیفیت ہے؟ ہم نے جواب دیا- اس کی راست گوئی کی وجہ سے ہی اپنی قوم میں اس کا لقب امین مشہور ہے- اس نے کہا اب تم خود ہی غور کر لو- کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو جو شخص باہم اپنے معاملات میں راست باز ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ بول سکتا ہے- پھر اس نے پوچھا- کن لوگوں نے اس کی اتباع کی ہے؟ ہم نے کہا- نوجوانوں نے- اس نے کہا یہی لوگ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء کے متبعین ہیں- پھر اس نے کہا کہ یثرب (مدینہ) کے یہودیوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے' کیونکہ وہ لوگ تو توریت کے ماننے اور جاننے والے ہیں- ہم نے کہا انہوں نے تو اس کی مخالفت کی ہے اور اس وجہ سے اس نے ان کو سزا دی ہے- یعنی بعض کو قتل کیا ہے اور بعض کو قید کیا ہے- بقیہ ادھر اُدھر اطراف میں تتر بتر ہو گئے ہیں- شاہ مقوقس نے کہا یہ لوگ تو ہمیشہ سے بڑے حاسد ہیں' انہوں نے ان پر بھی حسد کیا ہے' ورنہ یہ لوگ آپ کی صداقت ہماری طرح پہچانتے ہیں- مغیرہ کہتے ہیں کہ ہم مقوقس کے دربار سے ایسی گفتگو سن کر اٹھے جس کے بعد ہمارے حوصلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست ہو گئے اور ہم نے اپنے دل میں کہا کیا غضب ہے کہ شاہان عجم تو اس کے ساتھ

---

[1] بظاہر عبارت یہ ہے: كذلك المسيح و الانبياء تبعث فى نسب قومه.

[2] بظاہر عبارت یہ ہونی چاہیے: لم اتباع المسيح و الانبياء من قبله.

رُوْمِهَا عَمَّا يَجِدُوْنَ مِنْ صِفَةِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ اُسْقُفُّ مِنَ الْقِبْطِ هُوَ رَأْسُ كَنِيْسَةِ يُوْحَنَّس كَانُوْا يَأْتُوْنَهُ بِمَرْضَاهُمْ فَيَدْعُوْ لَهُمْ لَمْ اَرَقَطُّ اَشَدَّ اجْتِهَادًا مِنْهُ فَاَتَيْتُهُ فَقُلْتُ هَلْ بَقِيَ اَحَدًا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ قَالَ نَعَمْ هُوَ اٰخِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ اَحَدٌ وَ هُوَ نَبِيٌّ مُرْسَلٌ وَ اَمَرَنَا عِيْسٰى بِاتِّبَاعِهٖ وَ هُوَ النَّبِيُّ الْاُمِّيُّ الْعَرَبِيُّ اسْمُهُ اَحْمَدُ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَ لَا بِالْقَصِيْرِ فِيْ عَيْنَيْهِ حُمْرَةٌ وَ لَيْسَ بِالْاَبْيَضِ وَ لَا بِالْاٰدَمِ يُعْفِيْ شَعْرَهٗ وَ يَلْبَسُ مَا غَلُظَ مِنَ الثِّيَابِ وَ يَجْتَزِئُ بِمَا بَقِيَ مِنَ الطَّعَامِ سَيْفُهٗ عَلٰى عَاتِقِهٖ وَ لَا يُبَالِيْ بِمَنْ لَاقٰى يُبَاشِرُ الْقِتَالَ بِنَفْسِهٖ وَ مَعَهٗ اَصْحَابُهٗ يَفْدُوْنَهٗ بِاَنْفُسِهِمْ هُمْ لَهٗ اَشَدُّ حُبًّا مِنْ اَوْلَادِهِمْ وَ اٰبَائِهِمْ يَخْرُجُ مِنْ اَرْضِ حَرَمٍ وَ يَاْتِيْ اِلٰى حَرَمٍ يُهَاجِرُ اِلٰى اَرْضِ سِبَاخٍ وَ نَخْلٍ يَدِيْنُ بِدِيْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَقُلْتُ لَهٗ زِدْنِيْ فِيْ صِفَتِهٖ قَالَ يَأْتَزِرُ عَلٰى وَسْطِهٖ وَ يَغْسِلُ اَطْرَافَهٗ وَ يَخُصُّ بِمَا لَا تَخُصُّ بِهِ الْاَنْبِيَاءُ قَبْلَهٗ وَ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ وَ يُبْعَثُ هُوَ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَ جُعِلَتْ لَهُ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا اَيْنَمَا

نسب ور شتے کا دور کا تعلق بھی نہ رکھتے ہوئے اس کی تصدیق کریں اور اس سے خوف کھائیں اور ہم اس کے عزیز و قریب اور پڑوسی ہو کر بھی اس کا دین قبول نہ کریں بالخصوص جب کہ وہ خدا تعالیٰ کا داعی بن کر ہمارے گھروں میں خود آیا ہے۔مغیرہ کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد میں اپنے گھر واپس آیا اور مقام اسکندریہ میں آ کر ٹھہر گیا۔ میں نے کسی گرجے کو نہیں چھوڑا جس میں نہ گیا ہوں اور اس کے ہر ہر پادری سے خواہ وہ مصری تھا یا رومی ان علامات کی تحقیق کی جو یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب سابقہ میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اس وقت ایک مصری پادری تھا جو کنیسہ یوحنس میں سب کا سردار سمجھا جاتا تھا' جس سے بڑھ کر عابد و زاہد کوئی شخص میں نے نہیں دیکھا تھا' اس کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے مریضوں کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہ ان کی صحت کے لیے دعاء کیا کرتا تھا میں اس کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اس سے پوچھا کیا انبیاء علیہم السلام میں کوئی نبی ایسا رہ گیا ہے جس کی آمد ابھی باقی ہو۔ وہ بولا ہاں ایک نبی باقی ہے اور وہی آخر الانبیاء ہے۔ ان کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی اتباع کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے۔ وہ ایسا نبی ہے جس نے کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ عرب کا رہنے والا ہے اسم مبارک اس کا احمد ہے۔ نہ حد سے زیادہ دراز قامت اور نہ انتہا سے زیادہ کوتاہ قد اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے نہ چونے جیسا سفید رنگ نہ بالکل گندم گوں۔ زلفیں رکھنے والا۔ موٹا جھوٹا سادہ لباس پہننے والا۔ بچا کھچا کھا لینے والا۔ جہاد کے لیے تیار۔ اس کی تلوار اس کے کاندھے پر۔ اپنے مقابل دشمن کی پروانہ کرنے والا اور جنگ میں خود شریک ہونے والا۔ اس کے ساتھ سو جان سے اس پر قربان۔ اپنی اولاد اور والدین سے زیادہ ان پر شفیق۔ ایک حرم محترم سے نکل کر دوسرے ایسے ہی حرم محترم کی طرف ہجرت کرنے والا جس میں زمین کا ایک حصہ شور دوسرے حصہ

(۱۷۹) * روایت بالا میں خط کشیدہ جملہ بہت اہمیت رکھنے کے قابل ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامات ذکر کی گئی تھیں ان میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی اور نبی نہ ہو ......

اَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ تَيَمَّمَ وَ صَلّٰى وَ مَنْ كَانَ قَبْلَهُ كَانَ مُشَدَّدًا عَلَيْهِمْ لَا يُصَلُّوْنَ اِلَّا فِي الْكَنَائِسِ وَ الْبِيَعِ قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَوَعَيْتُ ذٰلِكَ كُلَّهُ مِنْ قَوْلِهٖ وَ قَوْلِ غَيْرِهٖ وَ مَا سَمِعْتُ مِنْ ذٰلِكَ فَذَكَرَ الْوَاقِدِيُّ حَدِيْثًا طَوِيْلًا فِيْ رُجُوْعِهٖ وَ اِسْلَامِهٖ وَ مَا اَخْبَرَبِهٖ مِنْ صِفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ ذٰلِكَ مِمَّا يُعْجِبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يُحِبُّ اَنْ يَسْمَعَهُ اَصْحَابُهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ قَالَ الْمُغِيْرَةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَكُنْتُ اُحَدِّثُهُمْ بِذٰلِكَ وَ هٰذَا اَمْرٌ مَعْرُوْفٌ عِنْدَ عُلَمَاءِ اَهْلِ الْكِتَابِ وَ عُظَمَائِهِمْ.

(رواه محمد بن عمر الواقدي. كذافي الجواب الصحيح)

میں کھجور کا باغ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر اس کا دین-مغیرہ کہتے ہیں میں نے اس پادری سے کہا ذرا ان کی علامات کے متعلق کچھ اور ارشاد فرمایئے-اس نے کہا وہ پنڈلیوں تک تہ بند باندھنے والا اور اپنے ہاتھ پیر اور چہرے کو دھونے والا اور اس کے علاوہ ایک ایسی خصوصیت کا مالک جو اس سے قبل انبیاء علیہم السلام میں نہ تھی-یعنی ہر نبی صرف اپنی ہی قوم کے لیے مبعوث ہو کر آیا اور وہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوگا-تمام زمین اس کے لیے مسجد اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنادی جائے گی-یعنی جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جائے گا اسی جگہ وہ تیمم کر کے نماز ادا کرلے گا-اس سے قبل انبیاء پر اس بارے میں تنگی تھی وہ گرجوں اور مندروں کے سوائے کسی اور جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے-مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں یہ تمام باتیں میں نے اس کی زبانی اور اس کے سواء دوسروں کی زبانی بھی سنی ہیں-اس کے بعد واقدی (مشہور مؤرخ) نے مغیرہ کی واپسی ان کے اسلام اور آنحضرتؐ کی جن علامات کو انہوں نے بیان کیا تفصیل ذکر کیا ہے-سرور کائناتؐ کو مغیرہ کی یہ حدیث بہت پسند آتی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ آپؐ کے اور صحابہ بھی اس کو سنیں-مغیرہ کہتے ہیں اس لیے میں اس حدیث کو صحابہ کرام کے سامنے بیان کیا کرتا تھا-یہ تمام واقعہ اہل کتاب اور ان کے بڑے بڑے پادریوں کے درمیان معروف و مشہور واقعہ ہے-(الجواب الصحیح)

(۹۷۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهُ قَالَ خَرَجَ جَيْشٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَنَا اَمِيْرُهُمْ حَتّٰى نَزَلْنَا الْاِسْكَنْدَرِيَّةَ فَقَالَ عَظِيْمٌ مِنْ عُظَمَائِهِمْ اَخْرِجُوْا اِلَيَّ رَجُلًا يُكَلِّمُنِيْ وَ اُكَلِّمُهُ فَقُلْتُ لَا يَخْرُجُ اِلَيْهِ غَيْرِيْ قَالَ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ وَ

(۹۷۲) عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ مسلمانوں کا ایک لشکر باہر نکلا جس کا میں امیر تھا-یہاں تک کہ ہم مقام اسکندریہ میں جا کر اترے وہاں کے بڑے پادریوں میں سے ایک بڑے پادری نے کہا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیجو جس سے میں کچھ گفتگو کروں اور وہ مجھے جواب دے سکتے-میں نے سوچا کہ میرے سوائے اس کے پاس بھلا اور کون جائے گا-یہ کہتے

لله ..... ہوگا-اس کے بعد جن حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "ہمارے دونوں کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے-اس کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے-ورنہ دونبیوں کے درمیان کسی نبی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کے بیان کی کوئی خاص اہمیت ہو-اب اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ چونکہ یہ بھی آپ کی ایک علامت تھی اس لیے جس طرح آپ نے اپنی دوسری علامات کا اعلان فرمایا ہے اسی طرح اس کا بھی اعلان فرمایا ہے-

مَعِیْ تَرْجُمَانِیْ وَ مَعَهٗ تَرْجُمَانُهٗ فَقَالَ مَا اَنْتُمْ؟ فَقُلْتُ نَحْنُ الْعَرَبُ وَ نَحْنُ اَهْلُ الشِّرْکِ وَ نَحْنُ اَهْلُ بَیْتِ الْحَرَامِ کُنَّا اَضْیَقَ النَّاسِ اَرْضًا وَّ اَجْهَدَهُمْ عَیْشًا نَاْکُلُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ یُغِیْرُ بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ حَتّٰی خَرَجَ فِیْنَا رَجُلٌ لَیْسَ بِاَعْظَمِنَا یَوْمَئِذٍ وَ لَا بِاَکْثَرِنَا مَالًا فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ فَاَمَرَنَا بِمَا لَا نَعْرِفُ وَ نَهَانَا عَمَّا کُنَّا عَلَیْهِ وَ کَانَ عَلَیْهِ اٰبَاءُ نَا فَکَذَّبْنَاهُ وَ رَدَدْنَا عَلَیْهِ مَقَالَهٗ حَتّٰی خَرَجَ اِلَیْهِ قَوْمٌ غَیْرُنَا فَقُلْنَا وَ ظَهَرَ عَلَیْنَا وَ غَلَبَنَا وَ تَنَاوَلَ مَنْ یَلِیْهِ مِنَ الْعَرَبِ فَقَاتَلَهُمْ حَتّٰی ظَهَرَ عَلَیْهِمْ وَ لَوْ یَعْلَمُ مَنْ وَّرَائِیْ مِنَ الْعَرَبِ مَا اَنْتُمْ فِیْهِ مِنَ الْعَیْشِ لَمْ یَبْقَ اَحَدٌ اِلَّا جَاءَ کُمْ یَشْرَکُکُمْ فِیْمَا اَنْتُمْ فِیْهِ مِنَ الْعَیْشِ فَضَحِکَ ثُمَّ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَکُمْ قَدْ صَدَقَ قَدْ جَاءَ تْنَا رُسُلُنَا بِمِثْلِ الَّذِیْ جَاءَ بِهٖ رَسُوْلُکُمْ فَاِنْ اَنْتُمْ اَخَذْتُمْ بِاَمْرِ نَبِیِّکُمْ لَمْ یُقَاتِلْکُمْ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبْتُمُوْهُ وَ لَنْ یُشَادِرَکُمْ اَحَدٌ اِلَّا ظَهَرْتُمْ عَلَیْهِ وَ اِنْ فَعَلْتُمْ مِثْلَ الَّذِیْ فَعَلْنَا وَ تَرَکْتُمْ اَمْرَ نَبِیِّکُمْ لَمْ تَکُوْنُوْا اَکْثَرَ عَدَدًا مِنَّا وَ لَا اَشَدَّ مِنَّا قُوَّةً.

(اخرجه ابو حاتم فی صحیحه)

کہ میں اس کے پاس گیا میرے ساتھ میرا ترجمان اور اس کے ساتھ اس کا ترجمان تھا- اس نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ میں نے کہا- عرب ہم شرک کیا کرتے تھے- درانحالیکہ ہم بیت الحرام کے باشندے تھے- ہمارے پاس رہنے کے لیے زمین بہت تنگ تھی' ہمارا گذران بہت عسرت کی حالت میں تھا- مردار اور خون کھایا کرتے تھے- ہمارا ایک قبیلہ دوسرے پر لوٹ مار امچایا کرتا تھا ہم اسی عسرت اور جہل کے عالم میں تھے کہ ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جو اس وقت ہم میں نہ سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا نہ سب سے زیادہ مال دار تھا- اس نے اعلان کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف تمہارے پاس رسول ہو کر آیا ہوں' اس نے ہم کو ایسی باتوں کا حکم دیا جن سے ہم آشنا نہ تھے اور ان تمام باتوں سے روکا جن کے ہم اور ہمارے باپ دادے ہمیشہ سے خوگر تھے- اس لیے ہم نے اس کی تکذیب کی اور اس کی بات ٹھکرادی تا آنکہ ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ اس کے ساتھ ہو کر ہم سے جنگ کے لیے نکلے اور ہم کو قتل کیا اور ہم پر غالب آگئے- اس کے بعد انہوں نے عرب کے گردونواح کا قصد کیا اور ان پر بھی غالب آگئے- اور بزرگ من! اگر عرب اس پر عیش زندگی کو جان لیں جو اس وقت آپ کی ہے تو ان میں ایک تنفس بھی ایسا نہ رہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے عیش وعشرت میں حصہ دار نہ بن جائے- یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور بولے کہ تمہارا رسول سچا ہے- ہمارے پاس بھی اللہ تعالیٰ کے رسول اسی قسم کی باتیں لے کر آئے تھے' جیسی تمہارے رسول تمہارے پاس لے کر آئے ہیں- اب اگر تم اپنے نبی کے حکم پر کاربند ہو گے تو جو قوم بھی تم سے جنگ کرے گی اس پر تم غالب ہی رہو گے اور جو بھی تم سے برسرپیکار ہو گا' وہ مغلوب ہو کر رہے گا- اور اگر کہیں تم نے وہی حرکت کی جو ہم نے کی تھی اور اپنے نبی کا حکم نہ مانا تو یاد رکھو کہ تم نہ تو مردم شماری میں ہم سے زائد ہو اور نہ قوت وطاقت میں بڑھ کر- (صحیح ابوحاتم)

(۹۷۳) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ فِیْ قِصَّةِ الْهِجْرَةِ وَ

(۹۷۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حبشہ کی طرف اپنی ہجرت اور

---

(۹۷۳) * یہاں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ حضرت جعفرؓ نے اپنے اسلام لانے کا جو بڑا سبب ذکر فرمایا ہے وہ ایک لله .....

سوال النجاشیّ عَنْ سَبَبِ مُفارقتِهِمْ مِنْ دِیْنِهِمْ قالتْ فکان الَّذِیْ کلّمهٗ جعفرُ بْنُ ابی طالب فقال ایُّھا الملکُ کُنَّا قوْمًا اھْلَ جاھلیّةٍ نعْبُدُ الْاصْنامَ و نأکُلُ المیْتَةَ و نأتِی الْفواحشَ و نقْطعُ الْاَرْحامَ و نُسیْئُ الْجوارَ و یأکُلُ القویُّ منَّا الضعیْفَ فکُنَّا علی ذٰلک حتّٰی بعثَ اللّٰهُ اِلیْنا رسُوْلًا منّا نعْرفُ نسبَهٗ و صِدْقَهٗ و امانتَهٗ و عفافَهٗ فدعانا اِلی اللّٰهِ لِنُوحِدَهٗ و نعْبُدَهٗ و نخْلعَ ما کُنَّا نعْبُدُ نحْنُ و اٰباءُنا مِنْ دُوْنِهٖ من الْحجارةِ و الْاَوْثانِ و امرَنا بِصِدْقِ الْحدیْثِ و اداءِ الْاَمانةِ و صِلةِ الرَّحِمِ و حُسْنِ الْجِوارِ و الْکفّ عنِ الْمحارِمِ و الدِّماءِ و نَھانا عنِ الْفواحشِ و قوْلِ الزُّوْرِ واَکْلِ مالِ الْیتیْمِ و قذْفِ

نجاشی کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے اپنا قدیم دین کیوں چھوڑا بیان فرماتی ہیں کہ ہماری طرف سے جنہوں نے گفتگو کی وہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ اے بادشاہ ہم لوگ جاہلیت کی ایک قوم تھے' بتوں کی پوجا کرتے مردار کھاتے' بے حیائیوں میں مبتلا رہتے' آپس کے رشتہ کاٹتے' اپنے پڑوسی سے برا سلوک کرتے اور جو شخص ہم میں مضبوط اور بااقتدار ہوتا وہ کمزور کو کھالیا کرتا تھا' ہم اسی تاریکی میں زندگی بسر کررہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی اندر سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا کہ جس کا نسب' جس کی راست گوئی' جس کی امانت داری اور جس کی پاک دامنی ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے اس نے ہم کو ایک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی کہ ہم اس کو ایک جانیں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادے جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے ان کو یکسر چھوڑ دیں اور اس کا حکم دیا کہ سچ بولیں' امانت کو ادا کریں اور رشتہ داری کا لحاظ رکھیں۔ پڑوسی

﴿بقیہ﴾ ..... تاریک ماحول میں آپ کی درخشاں تعلیمات ہیں جن سے یک لخت ان کی کایا پلٹ گئی تھی یا تو وہ ابھی ابھی عباد اوثان میں داخل تھے یا دوسری ہی ساعت میں عباد الرحمٰن میں شامل تھے' جن کے متعلق قرآن کریم نے ﴿اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا﴾ کی صفت بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد اپنی ہجرت کا سبب یہ بتایا ہے کہ ہماری قوم ہمارے اور ہمارے دین میں حائل بن گئی ہے۔ گویا اب اس مقدس دین کی محبت ان پر اتنی غالب ہوچکی تھی کہ اس کے مقابلہ میں مال ومتاع اور احباب ووطن کا چھوڑنا سب آسان تھا۔ سوچئے کہ یہ حالات سن کر شاہ حبشہ آخر سوچ میں کیوں پڑ گیا۔ اگر اسی قسم کا واقعہ آج بھی فرض کرلیا جائے تو اس قسم کی گری ہوئی قوم کی ایسی غیر مانوس باتیں کیا بادشاہوں کے لیے کچھ درخور اعتناء ہوسکتی ہیں' مگر یہاں شاہ حبشہ غور کررہا ہے اور پھر یہ سوال کرتا ہے کہ اچھا اس کلام کا کچھ حصہ پڑھ کر مجھ کو بھی سناؤ جو ان پر نازل ہوتا ہے۔ اور جب اس کا ذرا سا حصہ سنتا ہے تو اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے تمام اہل محفل سب آنسو بہانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ یہ کلام کیسا ہوگا اور جن پر یہ کلام اترا ہے ان کی ذات کن عالی صفات کی مالک ہوگی' پھر جو کلمات اس کی زبان سے یہاں نکلے ہیں وہ اس کی شاہانہ فہم اور عالمانہ دقت نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کی چند آیات ہی سن کر کس طرح یہ دریافت کرلیتا ہے کہ قرآن کریم اور تورات دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہوئی کتابیں ہیں' اور وہ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ اس یکسانیت کو بھی پالیتا ہے جس کے بعد اس کو یہ حکم لگا دینا آسان ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی مصدر کا فیضان ہیں اگر شاہ حبشہ کو تاریخ انبیاء اور ان پر نازل شدہ کلاموں کا پورا پورا ذوق نہ ہوتا تو وہ ذرا سی خبر سے چند بادیہ نشینوں کو لے کر نہ بیٹھتا اور نہ اتنی جلد یہ حکم لگا سکتا کہ قرآن کریم جو عربی زبان میں ہے اور وہ انجیل جو عبرانی یا سریانی زبان میں تھے ان کی متکلم ایک ہی ذات معلوم ہوتی ہے۔ ﴿بقیہ﴾ .....

اَلْمُحْصَنَةِ وَ اَمَرَنَا اَنْ نَعْبُدَ اللّٰهَ لَا نُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَ اَمَرَنَا بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الصِّيَامِ قَالَتْ فَعَدَّدَ عَلَيْهِ اُمُوْرَ الْاِسْلَامِ. قَالَ فَصَدَّقْنَاهُ وَ اٰمَنَّا بِهٖ وَ اتَّبَعْنَاهُ عَلٰى مَا جَاءَ بِهٖ فَعَبَدْنَا اللّٰهَ فَلَمْ نُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا وَ حَرَّمْنَا مَا حَرَّمَ عَلَيْنَا وَ اَحْلَلْنَا مَا اَحَلَّ لَنَا فَعَدٰى عَلَيْنَا قَوْمُنَا فَعَذَّبُوْنَا وَ فَتَنُوْنَا عَنْ دِيْنِنَا لِيَرُدُّوْنَا اِلَى عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ عَنْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَ اَنْ نَسْتَحِلَّ مَا كُنَّا نَسْتَحِلُّ مِنَ الْخَبَائِثِ فَلَمَّا قَهَرُوْنَا وَ ظَلَمُوْنَا وَ شَقُّوْا عَلَيْنَا وَ حَالُوْا بَيْنَنَا وَ

کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور حرام اور خوں ریزی سے اجتناب کریں اور ہم کو بے حیائیوں سے اور جھوٹ بات منہ سے نکالنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورت پر تہمت لگانے کی سخت ممانعت فرمائی اور اس کا حکم دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور ہم کو نماز، زکوٰۃ، روزے کا بھی حکم دیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کے اور بقیہ احکام بھی گنوائے۔ اس پر ہم نے آپ کو خدا تعالیٰ کا پیغمبر مانا اور آپ پر ایمان لے آئے اور جو دین آپ لے کر آئے تھے اس کی پیروی کی چنانچہ اب ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور ذرہ برابر بھی کسی کو اس کا شریک

ﷺ ...... انجیل وقرآن کریم کی اس اندرونی یک رنگی سمجھنے کے لیے پہلے ذرا اس پر غور کر لیجئے کہ ہر اہل کمال اپنی مصنوعات میں اس طرح صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ جس کو اس صنعت کا ذرا سا بھی ذوق ہو اس کو فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ فلاں شخص ہی کی صنعت ہو سکتی ہے' مثلاً ایک مشہور معمار اگر دس عمارتیں تعمیر کرتا ہے تو وہ سب عمارتیں اس کی دست کاری کی اس طرح شہادت دیا کرتی ہیں کہ جس کو ذرا بھی سلیقہ ہو وہ فوراً شناخت کر لیتا ہے کہ یہ ایک ہی معمار کی بنائی ہوئی ہیں۔ دہلی کی عمارات کی سیر کر جائیں شاہ جہاں کو اس سلسلہ میں جو ذوق تھا اس کے دور کی بنی ہوئی عمارات آپ کو الگ بتا دیں گے کہ یہ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ ہیں حالانکہ شاہجہاں نے ان کو ہاتھ تک بھی نہیں لگایا۔ اسی طرح ایک خیاط کا حال ہے۔ کسی جگہ' کسی دکان پر آپ کسی مشہور خیاط کا سلا ہوا کپڑا دیکھ لیتے ہیں تو فوراً حکم لگا دیتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ فلاں خیاط کا سلا ہوا ہے۔ اس سے اوراو پر اگر نظر اٹھائیے تو شعر وسخن کا حال ہے یہاں ایک ایک شعر اور اس کی ہر ہر بندش میں شاعر اس طرح نظر آیا کرتا ہے کہ اہل ذوق سامعین ہزار اشعار میں سے اس ذوق کا شعر الگ پہچان لیتے ہیں۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اگر اس حقیقت سے ان موٹی موٹی مثالوں میں آپ روشناس ہو چکے ہیں تو پھر یہیں سے قرآن کریم کے طرز استدلال کو بھی سمجھ لیجئے وہ آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی دونوں کی طرف آپ کو متوجہ کر کے کہتا ہے کہ دونوں پر اپنی اپنی جگہ غور کرو گے تو تم کو دونوں میں ایک ہی کامل کا کمال نظر آئے گا۔ آسمان کی خلقت' بارش کا نزول اور اس سے رونق کے پیدا شدہ باغوں پر نظر کر۔ تم کو یقین ہو جائے گا کہ یہ سب نیرنگیاں ایک ہی کامل کا کمال ہیں۔ اس کے بعد زمین کی طرف نظر بڑھاؤ' اس میں پہاڑوں کو دیکھو اور بڑے بڑے سمندروں کو بھی دیکھو کس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتے۔ تم کو منکشف ہو جائے گا کہ جس کی دیکھو اور بڑے بڑے سمندروں کو بھی دیکھو کس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتے۔ تم کو منکشف ہو جائے گا کہ جس کی صنعت کا کمال آسمانوں میں نظر آ رہا ہے اسی کی صناعی کا مظاہرہ زمین کی اس بے مثال صنعت میں ہے۔ آسمان اور ملک سماوی کے کمالات اگرچہ زمین اور ارضی انقلابات سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر اس اختلاف میں پھر ایک ایسی یک رنگی نمایاں ہے کہ اس کے بعد یہ جزم حاصل ہونا ضروری ہے کہ ان سب کمالات کا سرچشمہ ایک ہی ذات پاک ہے۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا تری ہی سی رنگت تری ہی سی بُو ہے ﷺ ......

بَيْنَ دِيْنِنَا خَرَجْنَا اِلٰى بَلَدِكَ وَ اخْتَرْنَاكَ عَلٰى مَنْ سِوَاكَ وَ رَغِبْنَا فِيْ جِوَارِكَ وَ رَجَوْنَا اَنْ لَا نُظْلَمَ عِنْدَكَ اَيُّهَا الْمَلِكُ قَالَتْ فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ هَلْ مَعَكَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ عَنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالَتْ فَقَالَ لَهٗ جَعْفَرٌ نَعَمْ فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ فَاقْرَاْهُ عَلَيَّ فَقَرَاَ عَلَيْهِ صَدْرًا مِنْ سُوْرَةِ مَرْيَمَ كٓهٰيٰعٓصٓ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا اِلٰى قَوْلِهٖ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ. قَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ فَبَكٰى وَ اللّٰهِ النَّجَاشِيُّ حَتّٰى اَخْضَلَ لِحْيَتَهٗ وَ بَكَتْ اَسَاقِفَتُهٗ حَتّٰى اَخْضَلُوْا مَصَاحِفَهُمْ حِيْنَ سَمِعُوْا مَا تُلِيَ عَلَيْهِمْ ثُمَّ قَالَ النَّجَاشِيُّ اِنَّ هٰذَا وَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى لَيَخْرُجُ مِنْ مِشْكٰوةٍ وَاحِدَةٍ. (رواہ احمد و ابن سعد و ابو نعیم فی الحلیۃ و غیرھم قال الحافظ ابن تیمیۃ و

نہیں کرتے جو چیزیں اس نے ہمارے حرام کر دیں بس ان کو حرام سمجھتے ہیں اور جو حلال فرما دیں ان کو حلال جانتے ہیں۔ بس اسی بات پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی ہے اور ہم کو دین سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں تا کہ ہم خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے پھر بتوں کی پوجا کرنے لگیں اور جو خبیث چیزیں ہم نے پہلے حلال بنا رکھی تھیں ان کو پھر حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر بہت زور ڈالا اور ہم پر ظلم کیا اور ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکنے لگے تو ہم نے آپ کے شہر کا رخ کیا ہے اور سب کو چھوڑ کر آپ کو اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا ہے اے بادشاہ ہم کو آپ سے امید ہے کہ اب یہاں ہم پر ظلم نہ ہو گا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں یہ سن کر نجاشی بادشاہ نے پوچھا جو کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس لے کر آئے ہیں کیا اس کا کوئی حصہ تم کو یاد ہے؟ جعفر بولے جی ہاں اس پر نجاشی نے کہا اچھا اس کو میرے سامنے بھی پڑھو انہوں نے سورۂ مریم کی شروع کی آیتیں پڑھیں (جس کی ابتداء یہ ہے) کٓھٰیٰعٓصٓ ..... حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں یہ سن کر بخدا نجاشی ایسا زار و قطار رویا کہ اس کی

لِلّٰهِ ..... اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ. (النمل: ۶۰)

بھلا کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی پھر ہم نے اگائے اس سے باغ رونق والے تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ تم اگاتے ان کے درختوں کو کیا کوئی اور معبود ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ' کوئی نہیں' وہ لوگ کجروی کرتے ہیں۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. (النمل: ۶۱)

بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور پیدا کر دیں اس کے بیچ میں نہریں اور بنا دیئے اس کے لیے پہاڑ اور رکھی دو سمندروں میں اوٹ۔ کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ۔ کوئی نہیں۔ بلکہ ان میں بھتیرے جانتے نہیں۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ. (النمل: ۶۲)

بھلا کون بیقرار کی فریاد کو پہنچتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اٹھا دیتا ہے سختی کو اور تم کو بناتا ہے نائب زمین میں کیا لِلّٰهِ .....

ذکر ھا اھل التفسیر و الحدیث و الفقه وھی متواترہ عند العلماء و قدروی جمل ھذہ القصة ابو داؤد فی سننه من حدیث ابی موسیٰ وفی الصحیحین ایضًا کما فی الجواب الصحیح ج۱ ص ۸۱ و ۸۷)

داڑھی تر ہوگئی اور اس کے اردگرد پادری لوگ بھی اتنے روئے کہ ان کے سامنے جو صحیفے تھے وہ بھی تر ہوگئے۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے بلا شبہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔

(احمد۔ ابونعیم وغیرہما)

(۹۷۴) عَنِ ابْنِ اِسْحَاقَ قَالَ ثُمَّ قَدِمَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِشْرُوْنَ رَجُلًا وَ هُوَ بِمَكَّةَ اَوْ قَرِيْبٌ مِنْ ذٰلِكَ مِنَ النَّصَارٰى حِيْنَ ظَهَرَ خَبَرُهٗ فِى الْحَبْشَةِ فَوَجَدُوْهُ فِى الْمَجْلِسِ فَكَلَّمُوْهُ وَ سَائَلُوْهُ وَ رِجَالٌ مِنْ قُرَيْشٍ فِىْ اَنْدِيَتِهِمْ حَوْلَ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا فَرَغُوْا مِنْ مَسْاَلَتِهِمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمَّا اَرَادُوْا دَعَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ تَلٰى عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا سَمِعُوْا فَاضَتْ اَعْيُنُهُمْ مِنَ الدَّمْعِ ثُمَّ اسْتَجَابُوْا لَهٗ وَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ صَدَّقُوْهُ وَ

(۹۷۴) محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد جب آپ کی خبر حبشہ میں پھیلی تو آپ کی خدمت میں بیس یا اس سے کچھ کم و بیش اور نصرانی حاضر ہوئے اس وقت آپ مکہ مکرمہ ہی میں تھے انہوں نے آپ کو ایک مجلس میں تشریف فرمایا، دیکھا آپ سے کچھ گفتگو کی اور کچھ سوالات بھی کیے۔ قریش کے چند لوگ بھی کعبہ شریف کے اردگرد اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے (یہ ماجرا دیکھ رہے تھے) جب ان لوگوں کو جو سوالات آپ سے کرنے تھے کر چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے سامنے قرآن کریم کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں۔ انہوں نے سنیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی، آپ کی تصدیق کی اور وہ سب علامتیں جو آپ کے متعلق ان کی کتاب میں بیان کی گئی تھیں آپ میں دیکھ لیں۔ جب یہ لوگ آپ کی مجلس سے اٹھ کر چلنے لگے تو

لے ..... کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ (کوئی نہیں) تم بہت ہی کم غور کرتے ہو۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. (النمل: ۶۳)

بھلا کون تم کو راہ دکھاتا ہے جنگل اور سمندر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہوائیں خوشخبری دینے والی اپنی رحمت (بارش) کے آگے آگے کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ (کوئی نہیں) اللہ اس سے بہت بلند ہے یہ لوگ شریک کرتے ہیں۔

اس اندرونی یک رنگی ہی کہ قرآن کریم نے لفظ "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" سے تعبیر کیا ہے عام لوگ اس کے معنے صرف لفظی تصدیق تک ہی محدود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لفظ اسی بلند حقیقت کا حامل ہے اور اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ قرآن کریم اور انجیل و توراۃ میں گو زبانی اور بہت سے احکام کا اختلاف بھی سہی لیکن اپنی اپنی جگہ ان کے کمالات میں ایک ایسی یک رنگی بھی ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر ایک سلیقہ شعار یہ حکم لگانے پر مجبور ہوگا کہ یہ دونوں کلام ایک ہی سرچشمہ کا فیض ہے جیسا آپ نے یہاں شاہ نجاشی کا حال دیکھا اسی کے قریب ورقہ بن نوفل کی شہادت ہے۔

عرفوہ منہ ما کان یوصف لھم فی کتابھم من امرہ فلما قاموا من عندہ اعترضھم ابوجھل فی نفر من قریش فقال خیبکم اللہ من رکب بعثکم من وراء کم من اھل دینکم ترتادون لھم فتأتون لھم بخبر الرجل فلم تطمئن مجالسکم عندہ حتی فارقتم دینکم و صدقتموہ بما قال لکم ما نعلم رکبا احمق منکم او کما قال لھم فقالوا سلام علیکم لا نجاھلکم لنا اعمالنا و لکم اعمالکم لا نألوا لانفسنا الا خیرا.

(کما فی جواب الصحیح) (محمد ابن اسحاق)

راستہ میں ابوجہل چند اور قریشی لوگوں کو لے کر سامنے آیا اور بولا تمہاری جماعت کو خدا نا کام کرے تمہارے ہم عقیدہ لوگوں نے تم کو بھیجا تو اس لیے تھا کہ تم تلاش کر کے اس شخص کے متعلق ذرا تحقیق حال کرنا اور اس کی اطلاع جا کر اپنی قوم کو دینا مگر تم اس کے پاس آ کر ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے یہاں تک کہ تم خود ہی اپنا دین چھوڑ بیٹھے اور جو بات اس نے کہی بس اس کی تصدیق کر لی' ہم نے کوئی جماعت تم سے زیادہ احمق نہیں دیکھی یا اسی قسم کے اور سخت وسست کلمات کہے انہوں نے اس کے جواب میں بس اتنا ہی کہا آپ صاحبان کو ہمارا سلام ہم آپ سے الجھنا نہیں چاہتے - ہم کو ہمارا دین مبارک اور آپ کو آپ کا دین مبارک - اپنی جانوں کی خیر خواہی کرنے میں خود ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر سکتے -

(سیرت محمد بن اسحاق)

(٩٧٥) عن عائشۃ ام المؤمنین رضی اللہ عنھا قالت اول ما بدیٔ بہ صلی اللہ علیہ وسلم الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لا یری رؤیاء الا جاء ت مثل فلق الصبح ثم حبب الیہ الخلاء فکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیہ و ھو التعبد اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اھلہ و یتزود

(٩٧٥) ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں سب سے پہلی وحی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی وہ اچھے خواب تھے' چنانچہ جو خواب آپ دیکھتے وہ صبح صادق کی روشنی کی طرف صاف صاف ظاہر ہو جاتا اس کے بعد آپ کو تنہائی اور خلوت گزینی پسند ہوگئی - چنانچہ آپ غار حرا میں آ کر تنہا رہا کرتے اور وہاں کئی کئی شب تحنث کیا کرتے تھے - راوی تحنث کی تفسیر عبادت کرنا' کرتا ہے یعنی عبادت کیا کرتے تھے بغیر اس کے کہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر آتے' اور اس مدت کے لیے زادِ راہ اپنے

(٩٧٥) * ابن ہشام اپنی سیرت میں صدیقہ عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذاء رسانی سے تنگ آ کر ترک وطن کا قصد کیا تو ابن الدغنہ نے ان سے پوچھا آپ کہاں جاتے ہیں؟ صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذا رسانی کا سارا ماجرا بیان کیا' اس پر جو کلمات اس نے صدیق اکبرؓ کی شان میں کہے وہ ان الفاظ سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے یہاں آپ ؐ کی شانِ مبارک میں فرمائے ہیں وہ کہتا ہے و اللہ انک لتزین العشیر' و تعین علی النوائب' و تفعل المعروف' و تکسب المعدوم' ارجع و انت فی جواری. (ص ٢٣١ ج ١ - مطبوعہ بر حاشیہ روض انف)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ اوصاف خیر لوگوں میں عام طور پر مشہور تھے اور کسی انسان کی بلندی کا سب سے اعلیٰ معیار سمجھے جاتے تھے اسی بناء پر حضرت خدیجہؓ نے بے ساختہ یہاں ان کا تذکرہ کیا ہے - للہ .....

1 لِذٰلِکَ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی خَدِیْجَةَ فَیَتَزَوَّدُ لِمِثْلِھَا
حَتّٰی جَاءَهُ الْحَقُّ وَ هُوَ فِیْ غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ
الْمَلَکُ فَقَالَ اِقْرَاْ قَالَ مَا اَنَا بِقَارِیٍ قَالَ
فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَهْدَ ثُمَّ
اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَاْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ فَاَخَذَنِیْ
فَغَطَّنِی الثَّانِیَةَ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَهْدَ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ
فَقَالَ اِقْرَاْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِی
الثَّالِثَةَ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ
خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ
الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . فَرَجَعَ بِهَا رَسُوْلُ
اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَرْجُفُ فُؤَادُهٗ
فَدَخَلَ عَلٰی خَدِیْجَةَ بِنْتِ خُوَیْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُوْنِیْ
زَمِّلُوْنِیْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰی ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ
لِخَدِیْجَةَ وَ اَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی

ساتھ لے جاتے پھر جب یہ زادِراہ ختم ہو جاتا تو اتنی ہی مدت کے لیے اور زادِ راہ لے جاتے یہاں تک کہ آپ کے پاس حق کا پیغام غارِ حراء میں آ پہنچا - چنانچہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا پڑھو - آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں - آپ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور اتنی زور سے دبایا کہ مجھ کو تکلیف ہوئی پھر چھوڑ کر مجھ سے کہا پڑھو - تو میں نے وہی کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر فرشتہ نے پھر مجھے پکڑ کر زور سے دبایا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی' پھر چھوڑ کر کہا پڑھو تو میں نے پھر کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہو - تیسری بار اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا پھر مجھے چھوڑ کر کہا - اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . یعنی اپنے پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا (اور) انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا - پڑھو تمہارا پروردگار بہت بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا - آپ ان آیات کو لے کر واپس آئے اور اس واقعہ سے آپ کا دل کانپ رہا تھا - آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا مجھے کمبل اڑھا دو مجھے کمبل اڑھا دو -

---

ف ..... یہ حدیث نزولِ قرآن کے سلسلہ میں سب سے پہلی ہے اور اتصالِ ملکی و بشری کے بہت سے رموز کی حامل ہے - ابتدائی واقعہ میں وحی کا ثقل' آپ کا اضطراب اور حضرت خدیجہؓ کے تسلی آمیز کلمات سب بالکل قرین قیاس اور معقول باتیں ہیں' اور آپ کی صداقت کی سب سے واضح دلیل ہیں - دیکھیے ورقہ بن نوفل ذرا سا واقعہ سن کر کس طرح یہ سمجھ گئے کہ یہ فرشتہ جو آپ پر وحی لے کر آیا ہے وہی فرشتہ ہے جو آپ سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا - اس سے جہاں آپ کی بے لوث صداقت کا ثبوت ملتا ہے اس کے ساتھ وحی اور نبوت کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے مگر کیا تاریخ نبوت کے علم کے بغیر محض عقلی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے جو یہاں چند جملوں سے ورقہ نے اخذ کر لیا اور وہ بھی کس جزم اور یقین کے ساتھ -

یہ بات بھی قابل یادداشت ہے کہ جب نزولِ وحی شروع ہوتا ہے تو ایسے حال میں شروع ہوتا ہے جب کہ آپ اس سے قطعاً لاعلم تھے - اور جب آپ وحی سے آشنا ہو چکے تھے تو ایک مدت کے لیے نزولِ وحی ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اس کے اشتیاق میں بارہا آپ کے قلب مبارک میں یہ خیال گذرتا ہے کہ کسی پہاڑ پر جا کر اپنے آپ کو گرا دیں مگر وحی کا ایک حرف بھی نازل نہیں ہوتا - وحی کی اس ابتداء اور اس انقطاع سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالم نبوت پرواز خیال سے کتنا بالاتر عالم ہے - کیونکہ خیالی معاملات تمام تر انسان کے خیال کرنے نہ کرنے پر موقوف ہوا کرتے ہیں - اور یہاں نبوت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب وحی کا خیال بھی نہ تھا تو وحی نازل ہوئی اور جب انتہائی شوق و ذوق موجود تھا تو مدت تک وحی کا ایک حرف بھی سننے میں نہیں آیا - ف .....

نَفْسِیْ فَقَالَتْ خَدِیْجَةُ كَلَّا وَ اللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَ تَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِی الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ فَانْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ حَتّٰی اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِالْعُزّٰی بْنِ عَمِّ خَدِيْجَةَ وَ كَانَ امْرَاً قَدْ تَنَصَّرَ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِیَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْاِنْجِيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكْتُبَ وَ كَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْعَمِیَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اِسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ يَا ابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَرٰی فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَاٰی فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰی مُوْسٰی عَلَيْهِ السَّلَامُ يَالَيْتَنِیْ فِيْهَا جَذَعًا يَا لَيْتَنِیْ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِیَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِیَ وَ اِنْ يُدْرِكْنِیْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّیَ وَ فَتَرَ الْوَحْیُ. (رواه البخاری)

گھر والوں نے آپ ؐ کو کمبل اڑھا دیا- یہاں تک کہ جب آپ کے قلب مبارک سے خوف کا وہ عالم جاتا رہا تو آپ ؐ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان فرمایا اور فرمایا خدا کی قسم مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا- حضرت خدیجہؓ بولیں ہرگز نہیں خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی شرمندہ نہیں کرے گا آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں، بے وسیلہ شخص کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور محتاج کو مال کما کر دے دیتے ہیں، مہمان کی مہماں نوازی کرتے ہیں اور راہِ حق کے حادثوں میں لوگوں کی امداد کرتے ہیں (پھر آپ ناکام کیسے رہ سکتے ہیں) پھر حضرت خدیجہؓ آپ ؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ کے پاس لے کر آئیں، یہ زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور عبرانی لکھا کرتے تھے اس لیے انجیل جس قدر اللہ کو منظور ہوتی عبرانی میں لکھا کرتے تھے اور اس وقت بڑھاپے کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے- حضرت خدیجہؓ نے فرمایا اے ابن عم! ذرا اپنے بھتیجے سے ان کا حال تو سنیے- ورقہ نے آپ سے کہا بھتیجے تم نے کیا واقعہ دیکھا- آنحضرت ؐ نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کر دیا- یہ سن کر ورقہ نے آپ ؐ سے کہا یہ تو وہی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا، اے کاش کہ میں آپ کے زمانہ نبوت میں توانا جوان ہوتا، اے کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا- جب آپ کی قوم آپ ؐ کو مکہ مکرمہ سے نکالے گی آنحضرت ؐ نے تعجب سے فرمایا اچھا کیا میری قوم مجھ کو نکالے گی ورقہ نے کہا جی ہاں، ہمیشہ جب کوئی رسول وہ دین لے کر آیا ہے جیسا تم لے کر آئے ہو تو ضرور اس کے ساتھ دشمنی کی گئی ہے اور اگر مجھ کو آپ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی بہت زوردار مدد کروں گا- مگر ایسا ہوا کہ چند ہی روز بعد ورقہ کی وفات ہو گئی اور ادھر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہو گئی- (بخاری شریف)

لہ ..... نیز حضرت خدیجہؓ جو خود بڑی عاقلہ تھیں اور مدت دراز تک آپ کے روز و شب حالات کا جائزہ لے چکی تھیں وہ اس واقعہ کو سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ میں نہیں پڑتیں اور قسم کھا کر پورے جزم و وثوق کے ساتھ کہتی ہیں کہ آپ کا معاملہ ہر ایسے تصور سے جو آپ کے شایانِ شان نہ ہو بالاتر ہے اور یہ اس لیے کہ آپ کے اوصاف خود اس کے شاہد عدل ہیں کہ خدا ایسے نیک طینت اور بلند فطرت انسان کو ناکام نہیں کر سکتا، اس کے بعد جب یہ واقعہ ورقہ کے سامنے آتا ہے تو وہ صرف اس کا اجمالی حال سن کر آنے والے فرشتے، آپ کی وحی، آپ کی نبوت اور آئندہ آپ کے حالات کا اس طرح اندازہ کر لیتے ہیں گویا یہ سب پہلے سے مسلّم باتیں ہیں- حدیث مذکور میں آپ کے قبل از نبوت دور کے مجاہدات کا کچھ نقشہ بھی ملتا ہے صوفیاء کرام نے غارِ حراء کے اس قیام کو چلہ کی اصل قرار دیا ہے-

(۹۷۶) عَنْ خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ اَنَّهَا قَالَتْ قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا ابْنَ الْعَمِّ اَتَسْتَطِيْعُ اِذَا جَاءَكَ هٰذَا الَّذِيْ يَأْتِيْكَ اَنْ تُخْبِرَنِيْ بِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ فَجَاءَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ذَاتَ يَوْمٍ وَ اَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ يَا خَدِيْجَةُ هٰذَا صَاحِبِيَ الَّذِيْ يَأْتِيْنِيْ قَدْ جَاءَ فَقُلْتُ لَهٗ قُمْ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِيْ فَجَلَسَ عَلَيْهَا فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ تَحَوَّلْ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِي الْيُسْرٰى فَجَلَسَ فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ فَتَحَسَّرْتُ فَطَرَحْتُ خِمَارِيْ فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ لَا فَقُلْتُ هٰذَا وَ اللّٰهِ مَلَكٌ كَرِيْمٌ

(۹۷۶) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے میرے چچا زاد بھائی! کیا یہ ممکن ہے کہ یہ شخص جو آپ کے پاس آتے ہیں اب کی بار آئیں تو آپ مجھ کو بھی بتا دیں؟ آپؐ نے فرمایا ہو سکتا ہے- حضرت خدیجہ کہتی ہیں ایک دن ایسا ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور میں اتفاق سے اس وقت آپ کے پاس ہی بیٹھی تھی تو آپ نے فرمایا لو میرے رفیق جو میرے پاس آیا کرتے ہیں وہ اس وقت تشریف لائے ہیں- یہ سن کر میں نے کہا اچھا آپ اٹھ کر ذرا میری دائیں ران پر آ بیٹھیے آپ ادھر آ کر بیٹھ گئے- میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں- آپ نے فرمایا ہاں- پھر میں نے کہا اچھا اب آپ میری بائیں ران پر آ جائیں آپ ادھر آ کر بیٹھ گئے- میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں؟ فرمایا ہاں- حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں پھر میں نے اپنی اوڑھنی اتار کر (سر ننگا کر کے) پوچھا اچھا کیا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں- فرمایا نہیں؟ میں نے کہا خدا کی قسم یہ تو خدا تعالی کا بزرگ فرشتہ

(۹۷۶) * حضرت خدیجہؓ گو اہل کتاب میں سے نہ تھیں مگر اپنی فطری دانش مندی سے اتنا ضرور جانتی تھیں کہ جس طرح نبی و ساحر اور کاہنوں کی شخصیتوں میں پاکیزگی و بلندی کا بڑا فرق ہوتا ہے- اسی طرح جو ان کے پاس غیبی خبریں لانے والا ہوتا ہے ان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہونا چاہیے اس امتحان کے لیے جو فوری اور آسان صورت ان کے ذہن میں آئی اس پر انہوں نے صورتِ حال کو پرکھا اور اس کے بعد جو عقیدہ ان کا پہلے قائم ہو چکا تھا وہ اور مستحکم ہو گیا- یہ بات تو اس وقت کی تھی جب کہ آپ نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے لیکن آپ کے حالات تو کچھ ابتداء ہی سے اس قسم کے تھے کہ جب حلیمہ سعدیہ شق صدر کے واقعہ سے خائف ہو کر آپ کو آپ کی والدہ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے آئیں تو انہوں نے متحیر ہو کر پوچھا تم تو اصرار پر اصرار کر کے ان کو مجھ سے اپنے گھر لے گئی تھیں کچھ بات بتاؤ آخر آج کیوں از خود ان کو لے کر آ رہی ہو انہوں نے مجبور ہو کر سارا واقعہ بیان فرما دیا اس پر آپ کی والدہ کے جو کلمات ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

قالت افتخوفت عليه الشيطان قالت قلت نعم قالت كلا و الله ما للشيطان عليه من سبيل و ان لبني لشانا (فذكرت ما رأت فى حمله و عند و لادته من كرامته تعالى عليه صلى الله عليه وسلم)

آپ کی والدہ ماجدہ نے حلیمہ سعدیہؓ سے کہا کیا ان کے متعلق تم کو کسی شیطانی دخل کا خیال ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں- فرمایا خدا کی قسم ہرگز نہیں ہو سکتا- میرا یہ فرزند بہت بڑی شان والا ہے شیطان کو ان پر ذرا بھی دسترس نہیں ہو سکتی- اس کے بعد انہوں نے اپنے حالتِ حمل اور آپ کی ولادت کے وقت کے سارے مشاہدات بیان فرمائے- للہ .....

لَا وَ اللّٰهِ مَا هٰذَا شَيْطَانٌ ثُمَّ ذَكَرَتْ لَوْ رَقَةَ مَا اَخْبَرَهَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ فِيْ رِوَايَةٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِسًا مَعَ خَدِيْجَةَ يَوْمًا مِنَ الْاَيَّامِ اِذْ رَأٰى شَخْصًا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ لَا يَزُوْلُ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ اُدْنُ مِنِّيْ فَدَنَا مِنْهَا فَقَالَتْ لَهٗ اَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ اَدْخِلْ رَأْسَكَ تَحْتَ دِرْعِيْ فَفَعَلَ ذٰلِكَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ لَهٗ أَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا قَدْ اَعْرَضَ عَنِّيْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ اَبْشِرْ فَاِنَّهٗ مَلَكٌ كَرِيْمٌ لَوْ كَانَ شَيْطَانٌ مَا اسْتَحْيٰى ثُمَّ ذَكَرَتْ اِسْلَامَهَا. (رواه ابو نعيم في دلائل النبوة و الطبراني في الاوسط قال الحافظ الهيثمي و اسناده حسن. و ذكره ابن هشام في سيرته)

ہی ہے خدا کی قسم یہ شیطان نہیں ہوسکتا- اس کے بعد آپ کا سارا واقعہ نوفل سے بیان کیا (جو پہلے مذکور ہو چکا ہے) دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں- ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص زمین و آسمان کے درمیان نظر آ رہا ہے جو نہ اوپر جاتا ہے نہ نیچے اترتا ہے (میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر کہا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا میرے قریب آ جائیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریب آ گئے- انہوں نے پوچھا کیا اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ رہے ہیں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں- اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اچھا اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گریبان میں منہ ڈال لیجئے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ ڈال لیا- پھر پوچھا کہیے کیا اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ رہے ہیں آپؐ نے فرمایا نہیں- اب انہوں نے ادھر سے اپنا رخ پھیر لیا ہے- حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہو یہ خدا تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ ہے اگر شیطان ہوتا تو بھلا یہ شرم کہاں کرتا- (دلائل النبوۃ)

(٩٧٧) عَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ خَرَجَ اَبُوْ طَالِبٍ اِلَى الشَّامِ وَ خَرَجَهُ مَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

(٩٧٧) ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو طالب ملک شام کے ارادہ سے نکلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے اور قریش کے کچھ اور بڑے لوگ بھی تھے جب یہ قافلہ بحیرا کے پاس پہنچا

لله ..... حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات شروع سے ہی ایسے صفات و حالات کی حامل رہی ہے کہ مخالفین نے بھی گو آپ کو رسول نہ مانا ہو مگر نبوت کے معاملہ کے سواء ہر موقعہ پر آپ کے غیر معمولی انسان ہونے کا اعتراف کیا ہے- اگر فطری سعادت امداد نہ کرے تو جنہوں نے نہ تو کسی نبی کی تاریخ کبھی دیکھی ہو اور نہ سنی ہو بلکہ اس کے برعکس ضد اور جہل نے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو وہ اس کھلی ہوئی صداقت سے کیا فائدہ اٹھاتے-

آپ نے دیکھا کہ تاریخ نبوت کے جاننے والے یا آپ کی شخصیت کے مشاہدہ کرنے والوں میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ وسوسہ نہیں گزرا کہ جو کچھ آپ دیکھتے یا سنتے ہیں یہ صرف آپ کے نفس ہی کے خیالات ہیں ان کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے-

(٩٧٧) * تاریخ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل دو سفر ایسے معلوم ہوتے ہیں جن میں اہل کتاب کے علماء کے ساتھ آپ کا اجتماع ہوا ہے ایک ''بحیراء'' راہب اور دوسرے ''نسطوراء'' پہلا سفر آپ کا بالکل صغر سنی میں ہوا ہے- البتہ دوسرا سفر آپ کے عہد لله .....

وَسَلَّمَ فِیْ اَشْیَاخٍ مِّنْ قُرَیْشٍ فَلَمَّا اَشْرَفُوْا عَلَی الرَّاهِبِ هَبَطُوْا فَحَلُّوْا رِحَالَهُمْ فَخَرَجَ اِلَیْهِمُ الرَّاهِبُ وَ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ یَمُرُّوْنَ بِهٖ فَلَا یَخْرُجُ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَلْتَفِتُ قَالَ فَهُمْ یَحُلُّوْنَ رِحَالَهُمْ فَجَعَلَ یَتَخَلَّلُهُمُ الرَّاهِبُ حَتّٰی جَاءَ فَاَخَذَ بِیَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هٰذَا سَیِّدُ الْعَالَمِیْنَ هٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ فَقَالَ لَهٗ اَشْیَاخٌ مِّنْ قُرَیْشٍ مَا عِلْمُکَ فَقَالَ اِنَّکُمْ حِیْنَ اَشْرَفْتُمْ مِنَ الْعَقَبَةِ لَمْ یَبْقَ شَجَرٌ وَ لَا حَجَرٌ اِلَّا خَرَّسَا جِدًا وَ لَا یَسْجُدُوْنَ اِلَّا لِنَبِیٍّ (صَلَّی اللّٰهُ

جو اس وقت نصرانیوں کا بڑا درویش تھا تو یہاں آ کر انہوں نے اپنے کجاوے کھول دیئے' اور اس سے قبل جب کبھی ان کا اس طرف سے گزر ہوتا تو یہ درویش کبھی ان کے پاس نہ آتا اور نہ ان کی طرف کوئی توجہ کرتا' اس مرتبہ خلافِ معمول وہ نکل کر ان کے پاس آیا' لوگ ابھی اپنے کجاوے کھولنے ہی میں مشغول تھے یہ قافلہ کے درمیان گھس کر کچھ ٹٹولنے لگا یہاں تک کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ یہ شخص ہیں جو تمام جہانوں کے سردار ہیں' یہ وہ ہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار کے رسول ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اس پر قریش کے مشائخ نے پوچھا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا جب تم لوگ اس گھاٹی کے قریب پہنچے تو نہ کوئی درخت ایسا رہا اور نہ کوئی پتھر جو سرنگوں نہ ہو گیا اور جمادات و نباتات نبی کے علاوہ کسی اور کے لیے اس طرح سرنگوں نہیں ہوا کرتے اور ان کو تو میں ایک اور خاص علامت سے بھی پہچانتا ہوں یعنی مہر نبوت جو آپ کے شانہ کی باریک ہڈی کے نیچے سیب کے سے انداز کی ہے- اس کے بعد

لطف ..... شباب کا ہے لیکن ان ہر دو سفروں میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے ان راہبوں سے کہیں تنہائی میں ملاقات کی ہو چہ جائیکہ ان سے کوئی تعلیم حاصل کی ہو اس کے علاوہ آپ کا مفصل لایا ہوا دین آج بھی سب کے سامنے موجود ہے جس میں بہت سے مقامات پر نصاریٰ کے دین سے صراحۃً اختلاف موجود ہے- سب سے بنیادی مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کا ہے- قرآن کریم نے اس کا جابجا رد کیا ہے اور ان کے معاملہ میں اہل کتاب میں جو جو غلط یا بے تحقیق باتیں مشہور تھیں ان کی تردید کی ہے' پھر کیسے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قرآن اس ملاقات کا نتیجہ ہے- رہا فروع اور عملی احکام کا معاملہ تو پہلے تو انجیل میں یہ حصہ ہی بہت کم ہے اور نصاریٰ کے اپنے خیال کے مطابق تو ان کے یہاں حلال و حرام کا کوئی منظم باب ہی نہیں اس کے برخلاف ہماری شریعت میں جس تفصیل کے ساتھ یہ ابواب موجود ہیں وہ کسی شخص پر پوشیدہ نہیں ہیں- پھر فتح مکہ کے بعد کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ عملی احکام میں اختلاف ایک بنیادی سا مسئلہ بن گیا تھا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت مقدس کا سولہ سترہ ماہ استقبال فرما کر پھر کعبۃ اللہ کا استقبال فرمایا' کیا ان لوگوں کے ساتھ یہ معمولی اختلاف تھا- اگر آپ شروع سے ہی بیت مقدس کا استقبال نہ فرماتے تو بھی ایک بات تھی لیکن اس کی طرف استقبال کر کے پھر قبلہ بدلنا کتنے طعن اور ناگواریوں کا موجب بنا- اس کا تذکرہ خود قرآن شریف میں موجود ہے- پھر شریعتِ اسلام کچھ دو چار کلمات کی شریعت نہیں- رہ گئے قرآنی قصص تو وہ کچھ افواہ کا مجموعہ نہیں- اس تفصیل اور اس تحقیق اور اس شرح و بسط کے ساتھ واقعات کا بیان فرمانا بلکہ ان واقعات کا بھی بیان کر دینا جن کے متعلق تورات خاموش نظر آتی ہے کیا چند لمحات کی صحبت کے تعلم سے حاصل ہو سکتا ہے' پھر عجیب تر حکمت ایزدی یہ ہے کہ قرآن کریم تورات کی طرح لکھا لکھایا نہیں اترا- آپ کی تئیس سالہ زندگی میں ہر ضرورت کے مناسب اترتا رہا ہے- مگر نزول کی ترتیب اور تالیف کی ترتیب پھر مخالف رہی ہے آپ کی ہدایت آیتوں کو اپنی اپنی سورتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا ایک لطف .....

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) وَ اِنِّیْ اَعْرِفُہٗ بِخَاتَمِ النُّبُوَّۃِ اَسْفَلَ مِنْ غُضْرُوْفِ کَتِفِہٖ مِثْلَ التُّفَّاحَۃِ ثُمَّ رَجَعَ فَصَنَعَ لَھُمْ طَعَامًا فَلَمَّا اَتَاھُمْ بِہٖ وَ کَانَ ھُوَ فِیْ رِعْیَۃِ الْاِبِلِ فَقَالَ اَرْسِلُوْا اِلَیْہِ فَاَقْبَلَ وَ عَلَیْہِ غَمَامَۃٌ تُظِلُّہٗ فَلَمَّا دَنٰی مِنَ الْقَوْمِ وَ جَدَھُمْ قَدْ سَبَقُوْہُ اِلٰی فَیْءِ الشَّجَرَۃِ فَلَمَّا جَلَسَ مَالَ فَیْءُ الشَّجَرَۃِ عَلَیْہِ فَقَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰی فَیْءِ الشَّجَرَۃِ مَالَ عَلَیْہِ. قَالَ فَبَیْنَمَا ھُوَ قَائِمٌ عَلَیْھِمْ یُنَاشِدُھُمْ اَنْ لَا یَذْھَبُوْا بِہٖ اِلَی الرُّوْمِ فَاِنَّ الرُّوْمَ اِنْ رَاَوْہُ عَرَفُوْہُ بِالصِّفَۃِ فَیَقْتُلُوْنَہٗ فَالْتَفَتَ فَاِذَا

وہ واپس ہو گیا اور اس نے ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا جب وہ کھانا لے کر آیا تو آپ اس وقت اونٹ چرانے نکل گئے تھے اس نے کہا کسی کو آپ کے پاس بھیج دو- آپ تشریف لے آئے تو سب لوگ آپ سے پہلے درخت کے سایہ میں جا چکے تھے، جب آپ آ کر بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک گیا- اس درویش نے کہا دیکھو ذرا درخت کے سایہ کو دیکھو کیسا آپ کی طرف جھک گیا ہے- ابھی یہ درویش ان سے کھڑے یہ اصرار ہی کر رہے تھے کہ آپ کو وہ اپنے ہمراہ روم نہ لے جائیں کیونکہ وہ لوگ اگر آپ کو دیکھ پائیں گے تو آپ کی خاص علامت کی وجہ سے آپ کو پہچان جائیں گے اور آپ کو قتل کے درپے ہو جائیں گے- اس نے جو رخ بدلا کیا دیکھتا ہے کہ سات آدمی روم سے آ رہے ہیں- درویش صاحب نے ان کا استقبال کیا اور پوچھا آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انہوں نے کہا اس لیے کہ وہ نبی اسی مہینہ میں اپنے وطن سے باہر نکلنے والا ہے، کوئی راستہ ایسا نہیں رہا جس پر لوگ نہ

لله ..... ہی زمانہ میں کئی کئی سورتیں جدا گانہ جدا گانہ اترتی رہتی تھیں پھر علیحدہ علیحدہ ہی ان کی ترتیب دی جاتی تھی کیا کوئی شخص ہر سوال کا مناسب جواب اور ہر مصلحت پر مناسب مناسب احکام کا نزول دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ کتاب تقریباً چالیس سال قبل کسی کی تعلیم سے مرتب ہو چکی تھی اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ کہ جن کو اس راز کا بانی کہا جائے ان سے اس کی کوئی شہادت بھی نہ ملے- کیا اس موقعہ پر صرف مابعد کے لوگوں کی غلط اور غیر معقول قیاس آرائیوں پر فیصلہ کر دینا بھی کوئی عقل کا فیصلہ کہا جا سکتا ہے- مدعی سست اور گواہ چست اسی کو کہتے ہیں- اس بارے میں اگر مذکورۂ بالا روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیراء راہب سے ملاقات ثابت ہوتی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بحیراء کے نزدیک جس آنے والے نبی کی پیش گوئی گزشتہ کتابوں میں کی گئی تھی وہ آپ ہی کی ذات ہے- چلئے اگر خود ان راہبوں سے اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے دین کے حرف کا کوئی کلمہ آپ کو بتایا ہے تو پھر دوسرے نمبر کی شہادت آپ کے رفقاء سفر کی ہے کم از کم ان میں سے ہی کسی کا یہ بیان ہونا چاہیے اور اگر یہ بھی اس کی شہادت نہیں دے سکتے تو سب سے کمزور شہادت آپ کے زمانہ کے اہل کتاب کی ہے کم از کم وہی یہ شہادت دیں کہ آپ نے ان راہبوں سے دین یا غیر دین کی کوئی تعلیم تھوڑی یا بہت حاصل کی تھی لیکن اگر یہ شہادت نہ خود ان راہبوں کی ہے جن کو اس افسانہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور نہ ان رفقاء کے جو واقعہ کے مشاہدہ کرنے والے اور آپ کے ہم سفر تھے اور نہ اس زمانہ کے اہل کتاب ہی یہ دعویٰ رکھتے ہیں تو پھر بعد کی قیاس آرائیوں کی کیا وقعت کی جا سکتی ہے- حقیقت یہ ہے کہ جب بعد کے اہل کتاب نے ایک رسول امی کی زبان سے علوم و معارف کا وہ سمندر موجیں مارتا دیکھا جس کے سامنے انجیل و تورات سرنگوں کھڑی تھیں تو فطرۃً میزان مستوفی ملانے کے لیے یہی ایک عذر گناہ بدتر از گناہ تراش سکے کہ یہ علوم درحقیقت ان ہی کے گھر کا فیض ہیں مگر کیا آپ کے عہد کے کسی ایک شخص کی شہادت بھی وہ اپنے اس دعوے کے لیے پیش کر سکتے ہیں- ان بے چاروں کو اتنی فہم بھی نہ آئی کہ ان کے راہبوں کا تو ذکر کیا ہے قرآن کے علوم کا براہ راست انجیل و توریت سے موازنہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں کون معلم لله .....

بِسَبْعَةٍ قَدْ اَقْبَلُوْا مِنَ الرُّوْمِ فَاسْتَقْبَلَهُمُ الرَّاهِبُ فَقَالَ مَاجَاءَ بِكُمْ؟ قَالُوْا جِئْنَا لِاَنَّ هٰذَا النَّبِيَّ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) خَارِجٌ فِيْ هٰذَا الشَّهْرِ فَلَمْ يَبْقَ طَرِيْقٌ اِلَّابُعِثَ اِلَيْهِ بِاُنَاسٍ وَ اِنَّا قَدْ اُخْبِرْنَا خَبْرَهٗ بِطَرِيْقِكَ هٰذِهٖ. فَقَالَ اَرَأَيْتُمْ اَمْرًا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَقْضِيَهٗ هَلْ يَسْتَطِيْعُ اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ رَدَّهٗ؟ قَالُوْا فَبَايَعُوْهُ وَ اَقَامُوْا مَعَهٗ قَالَ اُنْشِدُكُمْ يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ اَيُّكُمْ وَلِيُّهٗ فَقَالَ اَبُوْطَالِبٍ اَنَا فَلَمْ يَزَلْ يُنَاشِدُهٗ حَتّٰى رَدَّهٗ اَبُوْ طَالِبٍ وَ زَوَّدَهُ الرَّاهِبُ مِنَ الْكَعْكِ وَ الزَّيْتِ وَ بَعَثَ مَعَهٗ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ بِلَالًا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ.

بھیجے گئے ہوں اور ہم کو اطلاع ملی ہے کہ وہ آپ کے اسی راستہ پر ہیں- درویش صاحب نے کہا ذرا بتاؤ تو سہی جس بات کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرما چکا ہو کہ وہ پوری کر دے پھر لوگوں میں وہ کون ہے جو اس کو ٹال سکتا ہو- یہ سن کر وہ لوگ اس کی بات مان گئے اور کچھ دن اس کے یہاں قیام پذیر رہے- اس کے بعد ان درویش صاحب نے کہا اے عرب کے لوگو قسم کھا کر بتاؤ تم میں سے اس کا ولی کون ہے؟ ابو طالب بولے میں- اس پر وہ آپ کی واپسی پر برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ ابو طالب نے آپ کو مکہ مکرمہ واپس کر دیا- اور رخصت کے وقت درویش صاحب نے آپ کے ساتھ زادِراہ کے لیے کچھ زیتون کا تیل اور چپاتیاں پیش کیں اور ابوبکرؓ نے بلال کو آپؐ کے ساتھ بھیج دیا (ترمذی وغیرہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اچھی ہے اگر چہ اس کا راوی تنہا ہے- حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور اس میں آخری جملہ کے سواء کوئی بات منکر نہیں ہے- بظاہر ابوبکر کا بلال کو آپ کے ہمراہ بھیجنا کسی اور سفر کا واقعہ تھا کسی راوی کو وہم ہو گیا ہے اور اس نے اس کو اس قصہ کے ساتھ لگا دیا ہے-

قال الترمذی هذا حديث حسن غريب لانعرفه الا من هذا الوجه. و رواه البيهقی فی كتاب دلائل النبوة من حديث العباس بن محمد عن قراد بن نوح. و قال العباس لم يحدث به يعنی بهذا الاسناد غير قراد و سمعه يحيی و احمد بن قراد قال البيهقی ارادانه لم يحدث بهذا الاسناد سوی هؤلاء فاما القصة فهی عند اهل المغازی مشهورة. و اخرجه ابن سعد فی الطبقات ايضوابن الجوزی كما ذكره الحافظ ابن تيمية فی الجواب الصحيح ص ٢٠٥ ج ١. و فيه و تابعوه

لـ ..... کی حیثیت میں اور کون متعلم کی حیثیت میں نظر آ رہا ہے- باادب نجاشی کے کانوں نے جب یہاں سورۂ مریم کی چند آیتیں ہی سنیں تو اس نے معلم اور متعلم کی بجائے کیا سچے اور ادب سے لبریز کلمات کہے کہ جو کلام موسیٰ پر اترا تھا وہ اور یہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں-

پھر اگر صرف ان دو راہبوں کی ملاقات سے آپ کی تعلیمات پر کوئی حرف آ سکتا ہے تو صحیح بخاری میں ورقہ بن نوفل سے بھی آپ کی ملاقات ثابت ہے اور یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ کو قبائے نبوت پہنایا جا چکا تھا اور ان راہبوں کے سواء بھی بہت سے نصرانی آپ سے ملتے رہے ہیں ان کے ساتھ آپ کو بڑی بڑی دیر تک گرم مجلسیں بھی رہی ہیں یہاں تو اس قیاس کا اور بھی بہت اچھا موقعہ تھا پس محض دشمنوں کے بے سروپا اعتراضات سے ثابت شدہ حدیثوں کو آپ کے تذکرہ سے نکال ڈالنا نہ علم کی بات ہے نہ دانش مندی کی-

اب ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر اس اعتراض کا کوئی بھی محل ہوتا تو کیا قرآن اس سے سکوت اختیار کرتا آخر مشرکین عرب نے بھی آپ پر یہی تہمت تو رکھی تھی کہ مکہ مکرمہ میں یہ جو ایک عجمی آدمی ہے یہی آپ کو سب کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے- لیکن اس محض بے اصل بکواس کو قرآن نے نقل بھی کیا ہے اور اس کے بعد اس کا مسکت جواب بھی دیا ہے- لـ .....

بدل بايعوه و معناه كما في السيرة الحلبية اى علىٰ عدم التعرض منه كما يدل عليه لفظ تابعوه ثم قال الحافظ ابن تيميةؒ في المجلد الرابع منه عند ذكر ما ينقله كثير من اهل الجهل من معجزات النبى صلى الله عليه وسلم مثل قول كثير من العامة ان الغمامة كانت تظلّه دائما فهذا لا يوجه في شيء من كتب المسلمين المعروفة عند علمائهم و لا نقله عالم من علمائهم بل هو كذب عندهم و ان كان كثير من الناس ينقله. و انما نقل ان الغمامة اظلته لما كان صغيرا فقدم مع عمه الى الشام تاجرًا و راه بحيرا الراهب و معهذا فهذا لا يجزم بصحته (الجواب الصحيح فحه ۲۳۰ و ۲۳۱

ﷺ ..... وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِىْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ. (النحل:۱۰۳)

ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت کر رہے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے۔

قدرت کے عجب رموز ہیں کہ مشرکین عرب کی زبانوں سے اگر کوئی اعتراض نکلا بھی تو یہ کہ فلاں شخص قریشی کا فلاں غلام آپ کو یہ قرآن سکھاتا ہے۔ کتنی بے جوڑ بات تھی کہ اس دریائے علوم کا منبع کس کو قرار دیا جائے اس کو جو خود غلام ہے اور پھر عجمی ہے نہ وہ عربی سے آشنا ہے اور نہ آپ عجمی زبان سے واقف ہیں۔ اگر یہ تہمت لگانی تھی تو یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہ باتیں آپ علماء اہل کتاب سے سیکھ کر آتے ہیں، مگر وہ اتنے احمق نہ تھے کہ جس بات کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہ ہو اس کو اپنے منہ سے نکال کر مفت میں رسوا ہوتے۔ یہ غلام گو عجمی تھا مگر اس کے ساتھ ہم شہر ہونے کی وجہ سے آپ کا اختلاط بعید از قیاس نہ تھا مگر اہل کتاب کے علماء کے ایسے مشتبہ اختلاط کا چونکہ کوئی وجود ہی نہ تھا اس لیے ان سے تعلیم حاصل کرنا بالکل بیرون از قیاس بات تھی۔ معلوم ہوا کہ انتہائی دشمنوں کے نزدیک بھی آپ پر علماء اہل کتاب سے تعلیم حاصل کرنے کی تہمت رکھنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

و لم يقل احد منهم ما يمكن ان يكون شبهة في تعلمه انباء الغيب من علماء اهل الكتاب و نحو ذلك و انما قالوا ما ظهر بطلانه لكل احد و لم ينقل عن احد منهم انه قال قولا يخفى بطلانه بل ما يظهر كذبه لكل احد فتبين انه لم يمكنهم ان يقولوا انه تعلم اخبار الغيوب من احد.

مشرکین عرب میں سے جب کسی نے ایک بات بھی ایسی بات نہیں کہی جس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی یہ خبریں اہل کتاب کے علماء سے سیکھ لیتے ہیں، اور کہی بھی تو وہ بات کہی جو بدیہی البطلان تھی تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان علوم کو کسی کی تعلیم کا نتیجہ قرار دینا غیر ممکن تھا۔

(الجواب الصحيح ج ٤ ص ٢٦)

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ قرآنی نظم اور اس کا اسلوب بیان آپ کی چالیس سالہ عمر اور آپ کی بے لوث صداقت کی زندگی میں بھی کیا اس شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اسی لیے آپ نے اہل فکر و انصاف کو اپنی ماسبق زندگی پر غور کرنے کی دعوت دی اور فرمایا:

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.

میں اس سے قبل ایک بڑی مدت سے تم ہی میں رہا ہوں تو کیا تم اتنی بات سمجھتے نہیں۔

بہر حال اگر صحیح طریقوں سے ایک نہیں ایک ہزار راہبوں کی ملاقات بھی آپ کے ساتھ ثابت ہو تو ہم نصاریٰ کے محض ﷺ .....

ج ٤) و اخرجه الحافظ ابن كثير فى البداية و النهاية و قال هكذا رواه الترمذى و الحاكم و البيهقى و ابن عساكر و غير واحد من الحفاظ و معهذا فى حديثه غرابة ثم عددها فقال انه من مرسلات الصحابة فان ابا موسىٰ الاشعرى انما قدم فى سنة خيبر سنة سبع من الهجرة.... و لعله تلقاه من النبى صلى الله عليه و سلم فيكون ابلغ او من بعض كبار الصحابة او كان هذا مشهورًا مذكورًا اخذه من طريق الاستفاضة. الثانى ان الغمامة لم تذكر فى حديث اصح من هذا و الثالث قوله و بعث معه ابوبكر بلالاً. ثم ذكر سياق الواقدى و ابن سعد و قال عند ذكره قصة بحيرا الواهب و قد اورد له الحافظ ابن عساكر شواهد و سائغات فى ترجمة بحيرا او لم يورد ما رواه الترمذى و هذا عجب. قال الحافظ ابن حجر فى الاصابة الحديث رجاله ثقات و ليس فيه منكر سوى هذا اللفظ و بعث معه ابوبكر بلالاً فتحمل علىٰ انها مدرجة فيه

لله ..... بے بنیاد اعتراضوں کی خاطر ہرگز اس سے اغماض نہیں کر سکتے اور نہ ہم کو کرنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ہم کو یہ تلاش کرنا چاہیے کہ کس کس راہب سے آپ کی ملاقات ثابت ہوئی ہے اور اس نے ظلم یا انصاف کی راہ سے آپ کے متعلق کیا کیا رائے ظاہر کی ہے' کیونکہ تورات و انجیل کے وہی حامل تھے اور اگر آپ کے بارے میں ان ہی کی جانب سے ہم کو کوئی مفید شہادت ملتی ہے تو یہ بڑی مضبوط شہادت ہو گی - اور اگر وہ آپ کے خلاف شہادت دیتے ہیں جس پر وہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں - قرآن کریم نے ذیل کی آیتوں میں اسی لیے مشرکین کے سامنے اہل کتاب کی شہادت رکھی ہے -

اَوَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِيْلَ. (الشعراء:١٩٧)
کیا ان کے لیے یہ بات نشانی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کی خبر رکھتے ہیں -

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِیْ وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ. (الرعد:٤٣)
کہہ دو اللہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ کافی ہے اور جس کو کتاب کی خبر ہے -

وَ يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ. (السبا:٦)
اور دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو تجھ پر اترا تیرے رب سے وہی ٹھیک ہے -

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ. (القصص:٥٢-٥٣)
جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب وہ ان کو سنائی جائے تو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے یہی ٹھیک ہے ہم تو اس سے پہلے کے حکم بردار ہیں -

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ. (انعام:١١٤)
اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے -

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ. (البقرة:١٤٦)
جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو پہچانتے ہیں جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو -

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ
اور جب اس کو سنتے ہیں جو نازل ہوا ہے رسول پر ان کی آنکھیں دیکھو تو ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ انہوں نے پہچان لیا ہے

مقتطعة من حديث اخر و هماً من احد رواته كذافى الخصائص (ص ٨٤ ج ١) و ذكره ابن الاثير فى تجريد الصحابة و قال رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل البعث و امن به ذكره ابن منده و ابو نعيم فى الصحابة و هكذا فى تاريخ الخميس ايضـ ص ٢٥٧ ج ١ - و حقق ابن حجر فى الاصابة تحت تذكرة ورقة ما حاصله انه ينبغى ان يكون حال ورقة و بحيراء سواء و اما الذهبى فقد ضعف الحديث لكن قال الحافظ الحلبى فى سيرته و لا جل هذا الوهم

ﷺ ..... الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَ نَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ. (المائدہ:۸۳-۸۴)

حق بات کو وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو تو ہم کو ماننے والوں کے ساتھ لکھ اور ہم کو کیا ہوا کہ ہم اس پر یقین نہ لائیں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم کو حق سے پہنچی اور توقع رکھیں اس کی کہ ہمارا رب ہم کو نیک بختوں کے ساتھ داخل فرمائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا. (بنی اسرائیل:۱۰۷)

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم ملا ہے جب ان کے سامنے اس کو پڑھا جائے تو جھک جاتے ہیں ٹھوریوں سے سجدہ میں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ. (اعراف ۱۵۷)

وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ. (یونس:۹۴)

تو اگر تم کو اس کتاب میں کچھ شک ہو جو ہم نے اتاری ہے تو تم ان لوگوں سے پوچھ دیکھو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔ (یعنی اہل کتاب)

اس روایت کا ایک رخ تو یہ تھا۔ آیئے اب ہم آپ کو اس روایت کا دوسرا رخ بھی دکھائیں اور وہ اس کا افادی رخ ہے۔ اس روایت میں دوسرے اہل دین کی زبان سے آپ کی نبوت کی شہادت ہے جب کہ ابھی آپ کی عمر دس بارہ سال ہی کی ہے اور وہ بھی محض ظن وتخمین سے نہیں بلکہ ان علامات کی بناء پر ہے جو اہل کتاب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سواء کسی دوسرے شخص میں پائی نہیں جاتیں۔ اسی کے ساتھ اس میں وہ خاص علامت بھی ہے جو کتب سابقہ میں خاص سید العالمین اور رحمۃ للعالمین کے لیے بیان کی گئی تھی یعنی ''مہر نبوت'' اس کے بعد اس واقعہ میں چند ایسی وقتی علامات اور خصوصی خارجی قرائن کا بھی تذکرہ ہے جو آسمانی شخصیات بارزہ کے ساتھ ہمیشہ نظر آیا کرتی ہیں یعنی درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ جس نبی کے معجزات میں حیوانات کا سجدہ' پتھروں کا سلام کرنا' اس کے دست مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا اور جس کے حکم سے کھجور کے درخت کے خوشہ کا آجانا اور جس کے حکم سے دو درختوں کا آکر باہم مل جانا اور پھر اس کے حکم سے جدا جدا اپنی جگہ جا کر کھڑے ہو جانا مستند طریقوں سے ثابت ہو وہاں اتنی بات پر ایک پر کیا تعجب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ درخت کی شاخوں کا جھک جانا یا بادل کا امرایزدی کے ماتحت صرف ایک واقعہ میں آپ کے ساتھ حرکت کرنا ان امور میں سے نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے معاملوں میں موجب حیرت ہوں آخر اسی نبی اولوالعزم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدقہ میں ابو طالب نے بارش مانگی تو کیا بادل نہ آ گئے اور نہ برسے پھر کیا اسی رسول کی دعاء پر بار ہا بادلوں نے اپنی بارش کے دہانے نہیں کھول دیئے اور کیا پھر اسی رسول کی انگلی کے اشارہ پر بادلوں نے مدینہ طیبہ کی بستی کو چھوڑ کر ٹیلوں اور پہاڑوں کا رخ نہیں کر لیا۔ جی ہاں جس کے اشارہ پر چاند دو ٹکڑے ہو سکتا ہے اس کے اشارہ پر بادلوں کی اتنی حرکت کیا بعید ہونی چاہیے۔ پھر جب کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ فگن رہنا قرآن ﷺ .....

(ای لما فیه من ذکر ابی بکر رضی الله عنه و بلال رضی الله عنه) قال الذهبی فی الحدیث اظنه موضوعًا ثم نقل عن الحافظ الدمیاطی و همین و اجاب عن کل منهما و هناك قصة اخری فی سفره الی الشام ثانیًا مع میسرة و فیها ملاقاته مع نسطورا الراهب بمثل بحیراء و قد بسطها صاحب السیرة الحلبیه بما لها و ما علیها. و اعلم ان بحیراء مکبر لا مصغر کما ضبطه صاحب القاموس وغیره.)

(۹۷۸) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ حَدَّثَنِیْ سَلْمَانُ الْفَارِسِیُّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ فِیْ قِصَّةِ اِسْلَامِهٖ مِنْ فِیْهِ قَالَ لَحِقْتُ بِصَاحِبِ عَمُوْرِیَّتِهٖ فَاَخْبَرْتُهٗ خَبَرِیْ قَالَ اَقِمْ عِنْدِیْ فَاَقَمْتُ عِنْدَ خَیْرِ رَجُلٍ عَلٰی هُدَیْ اَصْحَابِهٖ وَ اَمْرِهِمْ. قَالَ وَ اکْتَسَبْتُ حَتّٰی کَانَتْ لِیْ بَقَرَاتٌ وَ غُنَیْمَةٌ قَالَ ثُمَّ نَزَلَ بِهٖ اَمْرُ اللّٰهِ فَلَمَّا حَضَرَ قُلْتُ لَهٗ یَا فُلَانُ اِنِّیْ کُنْتُ مَعَ فُلَانٍ فَاَوْصٰی بِیْ اِلٰی فُلَانٍ ثُمَّ اُوْصٰی بِیْ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ ثُمَّ اُوْصٰی بِیْ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ ثُمَّ اُوْصٰی بِیْ فُلَانٌ اِلَیْکَ

(۹۷۸) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے یہ واقعہ خود سلمان فارسی کی زبان سے سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ میں اصبہان کے ایک گاؤں میں ایک پارسی مذہب کا آدمی تھا اور میرے والد اپنے گاؤں کے سردار تھے میں ان کو بہت پیارا تھا' اس لئے انہوں نے لڑکیوں کی طرح گھر کے اندر رکھ کر میری پرورش کی تھی میں مجوسیت کی عبادت میں ہر وقت لگا رہا کرتا' یہاں تک کہ آگ کے اس نگراں کی طرح بن گیا تھا جو ہر وقت اس کو روشن رکھتا ہے اور ایک لحہ کے لئے بھی گل ہونے نہیں دیتا- میرے والد کی بڑی زمین تھی ایسا ہوا کہ وہ ایک دن کسی تعمیری کام میں لگ گئے اور مجھ سے فرمایا فرزند عزیز میں آج اس کام لگ گیا ہوں اس لئے آج زمین پر نہیں جا سکتا تم ذرا جا کر اس کو دیکھ لو اور جو کام کرنے کا وہاں ان کا زیادہ تھا وہ مجھ کو بتا دیا اور تاکید سے کہہ دیا کہ میرے پاس آنے میں دیر نہ لگانا' اگر تم نے دیر کی تو یاد رکھنا

لله ...... کریم میں موجود ہو اس کے بعد بادل کے ایک ٹکڑے کا آپ پر سایہ کر لینا کون سی بیرون از قیاس بات ہونی چاہیے- مگر جو نفوس یہاں متردد ہیں وہ کچھ اسی ایک واقعہ میں نہیں معجزات اور خوارق کا سارا باب ہی ان کی مادی عقول کے لیے ایک پہاڑ بنا ہوا ہے- وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ.

اب رہا اس حدیث کا اسنادی پلہ تو اس پر بھی ہم عربی کے حاشیہ میں مختصر سا کلام کر چکے ہیں- ہمارے نزدیک امام ترمذیؒ، بیہقیؒ اور آخر میں حافظ ابن حجرؒ جیسے متفق علیہ محدثین نے جب اس حدیث کو مستند مان لیا ہے اور حافظ ابن تیمیہؒ جیسے شخص نے نصاریٰ کے مقابلہ پر اس کو بطور حجت پیش کیا ہے تو اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نکالنا بہت ناموزوں ہے- صرف کتب رجال سے اٹھا اٹھا کر مخالفین کے اقوال نقل کرنا اور موافقین کا ذکر تک نہ کرنا انصاف نہیں ہے کون نہیں جانتا کہ اوہام سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں رہیں- ان کے رجال پر بھی کہیں کہیں کلام کیا گیا ہے بعض رواۃ کا حال تو یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کی بناء پر امام مالکؒ جیسے شخص نے اس کو دجال تک کا لفظ کہہ دیا ہے مگر جو لوگ اس فن کا کچھ بھی مطالعہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک اس کا بھی ایک معیار ہے- ہم کو یہاں مناظرہ کا اکھاڑہ قائم کرنا نہیں ہے اس لیے ان تفصیلات کے درپے ہونا نہیں چاہتے اور مذکورۂ بالا کبار محدثین کی رائے کی متابعت میں اس حدیث کو یہاں درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

(۹۷۸) * سلمانؓ فارسی کی شخصیت ایک عظیم تاریخی شخصیت ہے- مذہب حق کی تلاش کی جو تڑپ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں لله ......

فالی، مَنْ تُوْصِیْ بِیْ وَ بِمَ تَاْمُرُنِیْ قَالَ اَیْ بُنَیَّ وَ اللّٰہِ مَا اَعْلَمُ اَصْبَحَ اَحَدٌ عَلٰی مِثْلِ مَا کُنَّا عَلَیْہِ مِنَ النَّاسِ اٰمُرُکَ اَنْ تَاْتِیَہٗ وَ لٰکِنَّہٗ قَدْ اَظَلَّ زَمَانُ نَبِیٍّ مَبْعُوْثٌ بِدِیْنِ اِبْرَاھِیْمَ یَخْرُجُ بِاَرْضِ الْعَرَبِ مُھَاجِرُہٗ اِلَی الْاَرْضِ بَیْنَ حَرَّتَیْنِ بَیْنَھُمَا نَخْلٌ بِہٖ عَلَامَاتٌ لَا تَخْفٰی یَاْکُلُ الْھَدِیَّۃَ وَ لَا یَاْکُلُ الصَّدَقَۃَ بَیْنَ کَتِفَیْہِ خَاتَمُ النُّبُوَّۃِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَلْحَقَ بِتِلْکَ الْبِلَادِ فَافْعَلْ قَالَ ثُمَّ مَاتَ وَ غُیِّبَ وَ مَکَثْتُ بِعَمُّوْرِیَّۃَ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ اَمْکُثَ ثُمَّ مَرَّبِیْ نَفَرٌ کَلْبٍ تُجَّارًا فَقُلْتُ لَھُمْ اَحْمِلُوْنِیْ اِلٰی اَرْضِ الْعَرَبِ وَ اُعْطِیْکُمْ بَقَرَاتِیْ ھٰذِہٖ وَ غُنَیْمَتِیْ ھٰذِہٖ قَالُوْا نَعَمْ فَاَعْطَیْتُمُوْھَا وَ حَمَلُوْنِیْ مَعَھُمْ حَتّٰی اِذَا بَلَغُوْا وَادِی الْقُرٰی ظَلَمُوْنِیْ فَبَاعُوْنِیْ مِنْ رَجُلٍ یَھُوْدِیٍّ عَبْدًا فَکُنْتُ عِنْدَہٗ وَ رَاَیْتُ النَّخْلَ فَرَجَوْتُ اَنْ یَّکُوْنَ الْبَلَدُ الَّذِیْ وَصَفَ لِیْ صَاحِبِیْ وَ لَمْ یَحِقَّ فِیْ نَفْسِیْ فَبَیْنَا اَنَا عِنْدَہٗ اِذْ قَدِمَ ابْنُ عَمٍّ لَّہٗ مِنْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ مِنَ الْمَدِیْنَۃِ فَابْتَاعَنِیْ مِنْہُ فَاحْتَمَلَنِیْ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ فَوَ اللّٰہِ مَا ھُوَ اِنْ رَاَیْتُھَا فَعَرَفْتُھَا بِصِفَۃِ صَاحِبِیْ لَھَا فَاَقَمْتُ

مجھ کو زمین سے زیادہ تمہاری فکر ہو جائے گی اور میں یہاں کسی کام کا بھی نہ رہوں گا- یہ کہتے ہیں گھر سے نکلتے وقت تو میرا ارادہ اسی زمین پر جانے کا تھا جس کے لئے انہوں نے مجھ کو بھیجا تھا- لیکن درمیان میں نصاریٰ کے گرجوں میں سے ایک گرجے سے میرا گزر ہوا میں نے وہاں اس کی کچھ آوازیں سنیں وہ نمازیں ادا کر رہے تھے- چونکہ والد نے مجھے گھر میں بند کر رکھا تھا- اس لئے مجھے اس کا پتہ ہی نہ تھا کہ لوگ کس جہان میں بستے ہیں ان کی آوازیں سن کر میں اندر چلا گیا اور جا کر یہ دیکھنے لگا کہ وہ کرتے کیا ہیں جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھے ان کی نماز پسند آئی اور میں نے ان میں شامل ہونے کی کوشش کی اور دل میں کہا خدا کی قسم جس دین میں میں اس وقت ہوں اس سے یہ دین بہتر معلوم ہوتا ہے یہ سوچ کر میں ان ہی کے ساتھ رہا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور اپنے والد کی زمین تک نہ جا سکا پھر میں نے کہا آپ لوگ اس دین کی اصل جگہ بتایئے- انہوں نے کہا ملک شام- میں اپنے والد کے پاس واپس آ گیا- ادھر انہوں نے میری تلاش کے لئے آدمی بھیج رکھے تھے اور سب اپنے کاروبار سے معطل پڑے تھے- جب میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا عزیز فرزندم تم کہاں تھے تم کو جو بات ضروری تھی کیا وہ بتا نہ دی تھی کہ دیر نہ لگانا- میں نے عرض کیا پدر بزرگوار بات یہ ہوئی کہ چند لوگوں کے پاس سے میرا گزر ہوا جو اپنے گرجوں میں نمازیں پڑھ رہے تھے مجھے ان کا دین پسند آیا اور اس لیے خدا کی قسم شام تک میں وہاں ہی رہا- والد نے فرمایا فرزند عزیز اس دین میں تو کوئی بھی خوبی نہیں تیرا اور تیرے بزرگوں کا دین اس سے کہیں بہتر ہے میں نے عرض کیا خدا کی قسم ہرگز نہیں وہ دین ہمارے دین سے بہت بہتر ہے- یہ کہتے ہیں والد نے مجھے بہت ڈرایا دھمکایا اور میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور گھر میں بند کر لیا- یہ کہتے ہیں

لطیفہ ..... ودیعت فرمائی تھی اس کا اندازہ آپ کو ان چند سطور سے ہو سکتا ہے- ہمیں یہاں جس چیز پر تنبیہ کرنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے واقعہ سے آپ یہ اندازہ فرمائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا معاملہ اہل کتاب علماء کے درمیان کس درجہ شہرت اور وضاحت کے ساتھ مشہور و معروف تھا اور یہ کہ آپ کی چند علامات معلوم کر لینے کے بعد آپ کے شناخت کر لینے میں کیا سلمان رضی اللہ عنہ کو کوئی ادنیٰ سی دشواری بھی پیش آئی- اگر ان علامتوں پر محض عقلی لحاظ سے بحث کی جاتی اور نبوت و رسالت کے معنی محض عقلی اعتبار سے سمجھنے کی لطیفہ .....

بِهَا وَبُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقَامَ بِمَكَّةَ مَا اَقَامَ وَ لَا اَسْمَعُ لَهٗ بِذِكْرٍ مِمَّا اَنَا فِيْهِ مِنْ شُغْلِ الرِّقِّ ثُمَّ هَاجَرَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَوَاللّٰهِ اِنِّىْ لَفِىْ رَأْسِ عِذْقٍ لِسَيِّدِىْ اَعْمَلُ فِيْهِ بَعْضَ الْعَمَلِ وَ سَيِّدِىْ جَالِسٌ تَحْتِىْ اِذْ اَقْبَلَ ابْنُ عَمٍّ لَهٗ حَتّٰى وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا فُلَانُ قَاتَلَ اللّٰهُ بَنِىْ قَيْلَةَ وَ اللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمُجْتَمِعُوْنَ الْاٰنَ بِقُبَاءٍ عَلٰى رَجُلٍ قَدِمَ مِنْ مَكَّةَ الْيَوْمَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهٗ نَبِىٌّ قَالَ سَلْمَانُ فَلَمَّا سَمِعْتُهَا اَخَذَتْنِى الرِّعْدَةُ حَتّٰى ظَنَنْتُ اِنِّىْ سَاقِطٌ عَلٰى سَيِّدِىْ فَنَزَلْتُ عَنِ النَّخْلَةِ فَجَعَلْتُ اَقُوْلُ لِابْنِ عَمِّهٖ مَاذَا تَقُوْلُ مَاذَا تَقُوْلُ قَالَ فَغَضِبَ سَيِّدِىْ فَلَكَمَنِىْ لَكْمَةً شَدِيْدَةً ثُمَّ قَالَ مَالَكَ وَ لِهٰذَا اَقْبِلْ عَلٰى عَمَلِكَ قَالَ فَقُلْتُ لَاشَىْءَ اِنَّمَا اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَثْبِتَهٗ عَمَّا قَالَ. قَالَ وَ قَدْ كَانَ عِنْدِىْ شَىْءٌ قَدْ جَمَعْتُهٗ فَلَمَّا اَمْسَيْتُ اَخَذْتُهٗ ثُمَّ ذَهَبْتُ بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ بِقُبَاءٍ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ فَقُلْتُ لَهٗ اِنَّهٗ قَدْ بَلَغَنِىْ اَنَّكَ رَجُلٌ صَالِحٌ وَ مَعَكَ اَصْحَابٌ لَكَ غُرَبَاءُ ذُوْحَاجَةٍ وَ هٰذَا شَىْءٌ كَانَ عِنْدِىْ

میں نے نصاریٰ کے پاس کہلا بھیجا کہ جب کبھی شام کا کوئی قافلہ تمہارے پاس آئے تو مجھے بھی خبر کرنا- یہ کہتے ہیں جب شام جانے والا ایک قافلہ ان کے پاس آیا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے اس کی خبر کی- میں نے کہا جب وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہولیں اور پھر شام واپسی کا ارادہ کریں تو اس وقت مجھے خبر کرنا چنانچہ جب وہ اپنے کام پورے کر چکے تو انہوں نے مجھے اس کی اطلاع دی یہ کہتے ہیں میں نے زنجیریں اپنے پیروں سے نکال پھینکیں اور ان کے ساتھ روانہ ہولیا- یہاں تک کہ شام جا پہنچا- وہاں جا کر میں نے پوچھا اس دین کا یہاں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس گرجے کا پادری- یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور میں نے کہا- مجھے یہ دین پسند ہے اور میری تمنا ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں اور اس گرجے میں آپ کی خدمت کیا کروں اور آپ سے نماز سیکھوں اور پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھوں اس نے کہا اچھا آ جاؤ میں اس کے ساتھ گرجے میں داخل ہوگیا- یہ شخص بدنیت آدمی تھا لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دیتا اور جب لوگ صدقہ لاتے تو اس کو اپنی ذات کے لیے جمع کرتا اور مسکینوں کو تقسیم نہ کرتا یہاں تک کہ اس تدبیر سے اس نے سات مٹکے چاندی اور سونے کے جمع کر لیے- یہ کہتے ہیں مجھے اس سے سخت بغض ہوگیا' ان حرکات کی وجہ سے جو میں نے اس کو کرتے دیکھا تھا- اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا- اس کے دفن کے لیے نصاریٰ جمع ہوئے تو میں نے ان سے کہا یہ بڑا خراب انسان تھا' تم کو صدقہ کی ترغیب دیا کرتا تھا اور جب تم اس کے پاس صدقے لاتے تو اس کو اپنی ذات کے لیے جمع کر لیتا تھا اور مسکینوں کو کچھ نہ دیتا تھا- انہوں نے کہا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ میں نے کہا میں تم کو اس کے خزانہ کا پتہ بتاتا ہوں- انہوں نے کہا اچھا بتاؤ- چنانچہ وہ جگہ میں نے ان کو دکھائی- انہوں نے

ﷺ ..... کوشش کی جاتی تو جس آسانی سے سلمان رضی اللہ عنہ کو ساحل مقصود ہاتھ آ گیا کیا یہ ممکن تھا حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس لیے قدرت نے ان کی شناخت بھی آسان سے آسان تر رکھی ہے اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت کے دلائل تو اور بھی زیادہ روشن رکھے ہیں-

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ کتبِ سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارات سو مقامات سے بھی زیادہ مذکور ہیں ﷺ ......

لِلصَّدَقَةِ فَرَأَيْتُكُمْ اَحَقُّ بِهٖ مِنْ غَيْرِكُمْ قَالَ فَقَرَّبْتُهُ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهٖ كُلُوْا وَ اَمْسَكَ يَدَهُ فَلَمْ يَاْكُلْ قُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ هٰذِهٖ وَاحِدَةٌ ثُمَّ صَرَفْتُ عَنْهُ فَجَمَعْتُ شَيْئًا وَ تَحَوَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ ثُمَّ جِئْتُهُ وَ قُلْتُ اِنِّيْ رَاَيْتُكَ لَا تَاْكُلُ الصَّدَقَةَ وَ هٰذِهٖ هَدِيَّةٌ اَكْرَمْتُكَ بِهَا. قَالَ فَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا وَ اَمَرَ اَصْحَابَهٗ فَاَكَلُوْا مَعَهٗ قَالَ فَقُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ هَاتَانِ ثِنْتَانِ قَالَ ثُمَّ جِئْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ بِبَقِيْعِ الْغَرْقَدِ قَدْ تَبِعَ جَنَازَةَ رَجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَ عَلَيْهِ شَمْلَتَانِ وَ هُوَ جَالِسٌ فِيْ اَصْحَابِهٖ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ اسْتَدْبَرْتُهٗ اَنْظُرُ اِلٰى ظَهْرِهٖ هَلْ اَرَى الْخَاتَمَ الَّذِيْ وَصَفَ لِيْ صَاحِبِيْ فَلَمَّا رَاٰنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَدْبَرْتُهٗ عَرَفَ اَنِّيْ اَسْتَثْبِتُ فِيْ شَيْءٍ وُّصِفَ لِيْ فَاَلْقٰى رِدَاءَهٗ عَنْ ظَهْرِهٖ فَنَظَرْتُ اِلَى الْخَاتَمِ فَعَرَفْتُهٗ فَاَكْبَبْتُ عَلَيْهِ اُقَبِّلُهٗ وَ اَبْكِيْ فَقَالَ لِيْ

سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے سات مٹکے وہاں سے برآمد کیے- جب انہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو کہا ہم ایسے شخص کو ہرگز دفن نہیں کریں گے- اس کو سولی پر لٹکایا اور پتھروں سے سنگسار کیا' اور دوسرا آدمی بلا کر اس کی جگہ بٹھلا دیا- سلمانؓ کہتے ہیں میں نے اس آدمی سے بڑھ کر کوئی شخص جو پنجوقتہ نماز کا پابند' دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا طالب اور روز و شب عبادت میں مشغول ہو نہیں دیکھا' لہٰذا مجھے اس سے اتنی محبت ہوگئی کہ اس سے پہلے دنیا کی کسی چیز سے نہ تھی- میں اس کے پاس ایک مدت تک مقیم رہا پھر جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو میں نے ان سے عرض کیا میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا اور آپ سے اتنی محبت رکھتا ہوں کہ اس سے قبل دنیا کی کسی چیز سے مجھ کو اتنی محبت نہیں ہوئی- اب آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے پاس پیغام اجل آ پہنچا ہے تو آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جاتے ہیں اور میرے لیے آئندہ اب کیا حکم ہے- انہوں نے فرمایا' فرزند عزیز! خدا کی قسم میرے علم میں اب کوئی شخص نہیں ہے جو صحیح طور پر اس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ میں تھا' لوگ تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور جس دین پر پہلے تھے اس کو اکثر بدل سدل کر چکے ہیں ہاں موصل میں ایک شخص ہے جس کا نام فلاں ہے' وہ شخص اسی دین پر ہے جس میں میں ہوں اس کے پاس چلے جانا- یہ کہتے ہیں جب ان کی وفات ہوگئی اور دفن ہو چکے تو میں ان موصل والے پادری کے پاس چلا گیا- میں نے ان سے کہا اے فلاں مجھ کو فلاں پادری نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور یہ بتایا تھا کہ آپ ان ہی کے دین پر پورے پورے قائم ہیں- انہوں نے فرمایا اچھا تو میرے پاس قیام کرو- میں نے ان کے پاس قیام کیا' اور میں نے ان کو

ﷲ ..... (الجواب الصحیح ج ۲ ص ۲۷۷) اسی لیے یہود مدینہ کی حالت تو یہ تھی کہ آپؐ کے ظہور سے قبل وہ اوس و خزرج کے مقابلہ میں ہمیشہ آپؐ کے وسیلہ سے دعاء فتح و نصرت مانگا کرتے تھے لیکن جب آپ کا ظہور ہوا تو پھر سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن یہی تھے چنانچہ معاذ بن جبل' بشر بن براء اور داؤد بن سلمہ نے یہود کو یہی طعنہ دیا کہ ہم مشرک تھے اور تم اہل کتاب ہمارے مقابلہ میں جب جنگ ہوتی تو تم لوگ آپؐ کے وسیلہ سے دعاء فتح مانگتے اور ہمارے سامنے آپ کی علامتیں اور آپ کی صفات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتے اب تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ اور الٹے برسر پیکار نظر آتے ہو- ﷲ .....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَوَّلْ فَتَحَوَّلْتُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَصَصْتُ عَلَيْهِ حَدِيْثِيْ كَمَا حَدَّثْتُكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَاَعْجَبَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَسْمَعَ ذَاكَ اَصْحَابُهُ ثُمَّ شَغَلَ سَلْمَانَ الرِّقُّ حَتّٰى فَاتَهُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدْرٌ وَ اُحُدٌ قَالَ سَلْمَانُ ثُمَّ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاتِبْ يَا سَلْمَانُ فَكَاتَبْتُ صَاحِبِيْ عَلٰى ثَلَاثِمِائَةِ نَخْلَةٍ اُحْيِيْهَا لَهُ بِالْفَقِيْرِ وَ اَرْبَعِيْنَ اُوْقِيَةً. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهِ اَعِيْنُوْا اَخَاكُمْ فَاَعَانُوْنِيْ فِي النَّخْلِ الرَّجُلُ بِثَلَاثِيْنَ وَ دِيَّةً وَ الرَّجُلُ بِعِشْرِيْنَ و دية وَ الرَّجُلُ بِخَمْسَ عَشْرَةَ وَدِيَّةً و الرَّجُلُ بِعَشْرَةٍ يُعِيْنُ الرَّجُلُ بِقَدْرِ مَا عِنْدَهُ حَتّٰى اجْتَمَعَتْ لِيْ ثَلَاثُمِائَةِ وَدية فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْهَبْ يَا سَلْمَانُ فَفَقِّرْلَهَا فَاِذَا فَرَغْتَ فَأْتِنِيْ اَكُنْ اَنَا اَضَعُهَا بِيَدِيْ قَالَ فَفَقَرْتُ وَ اَعَانَنِيْ اَصْحَابِيْ حَتّٰى اِذَا فَرَغْتُ جِئْتُهُ فَاَخْبَرْتُهُ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

بھی بہت نیک شخص پایا۔ جس دین پر ان کے پہلے رفیق تھے یہ بھی اسی پر تھے۔ ابھی کچھ مدت نہ ہوئی تھی ان کی بھی وفات کا وقت آ گیا تو میں نے ان سے عرض کیا۔ اے فلاں مجھ کو فلاں پادری نے آپ کے لیے وصیت کی تھی اور یہ حکم دیا تھا کہ آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں اب جیسا آپ دیکھ رہے ہیں آپ کے پاس بھی حکم ربی آ چکا ہے تو آپ مجھے کس کی وصیت فرماتے ہیں اور میرے لیے کیا حکم دیتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا بخدا میں اس دین پر جس پر کہ خود قائم ہوں آج ایک شخص کے سواء کسی اور کو نہیں جانتا وہ شخص نصیبین میں ہیں ان کا نام فلاں ہے تم ان کے پاس چلے جانا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا اور دفن ہو چکے تو میں ان نصیبین والے شخص کے پاس چلا گیا اور اپنا قصہ عرض کیا اور دو میرے بزرگ جو پہلے حکم دے چکے تھے وہ سب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اچھا میرے پاس ٹھہرو میں نے ان کو بھی پہلے دو بزرگوں جیسا پایا اور میں اس مرد صالح کی خدمت میں رہا۔ خدا کی قسم ابھی ان کو بھی کچھ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ ان کی بھی وفات کا وقت آ گیا۔ اسی طرح میں متعدد بزرگوں کی خدمت میں گذرتا ہوا عموریہ والے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے بھی اپنا سارا واقعہ عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا اچھا میرے پاس ٹھہرو۔ اب میں ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں قیام پذیر تھا جو نہایت نیک اور اپنے سے پیشرو بزرگوں ہی کے قدم بقدم تھے۔ اس اثناء میں میں نے تھوڑا مال بھی کما لیا تھا اور میرے پاس کچھ گائے اور تھوڑی سی بکریاں ہو گئی تھیں آخر کار ان کے پاس بھی فرمانِ الٰہی آ پہنچا۔ جب ان کی نزعِ روح کا وقت ہوا تو میں نے عرض کی کہ فلاں فلاں بزرگوں نے مجھ کو ایک دوسرے کی وصیت فرمائی تھی تا آنکہ میں آپ تک آ پہنچا اب آپ مجھے کس

٭ ..... حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل یہود مدینہ میں آپ کا بڑا چرچا رہا کرتا تھا اور یہی باعث تھا کہ انصار کسی پس و پیش کے بغیر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ ایک یہود مدینہ پر کیا منحصر تھا شاہ ہرقل، مقوقس اور شاہ حبشہ جیسے بڑے بڑے بادشاہوں نے آپ کی تصدیق کی اور اہل کتاب کا بڑا طبقہ آپ کی بشارات دیکھ دیکھ کر ہی اسلام میں داخل ہوا اور جو ان میں داخل نہیں ہوا اس کو بھی آپ کے معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی، بلکہ محض عناد، عداوت اور اپنی ریاست کی خاطر داخل نہ ہوا۔ یہ بیان اہل اسلام کا نہیں بلکہ خود ان کا ہے جنہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی زبانوں سے ان سب امور کا اقرار کیا ہے۔ ٭ .....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعِیَ اِلَیْهَا فَجَعَلْنَا نُقَرِّبُ اِلَیْهَا
الْوَدِیَّ وَ یَضَعُهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ
وَسَلَّمَ بِیَدِهٖ حَتّٰی اِذَا فَرَغْنَا فَوَالَّذِیْ نَفْسُ
سَلْمَانَ بِیَدِهٖ مَا فَاتَتْ مِنْهَا وَ دِیَةٌ وَاحِدَةٌ
فَاَدَّیْتُ النَّخْلَ وَ بَقِیَ عَلَیَّ الْمَالُ فَاُتِیَ
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ
بَیْضَةِ الدُّجَاجَةِ مِنْ ذَهَبٍ مِنْ بَعْضِ الْمَعَادِنِ
فَقَالَ مَا فَعَلَ الْفَارِسِیُّ الْمُكَاتَبُ قَالَ
فَدُعِیْتُ لَهٗ قَالَ خُذْ هٰذِهٖ فَاَدِّ مِمَّا عَلَیْكَ یَا
سَلْمَانُ قَالَ قُلْتُ وَ اَیْنَ تَقَعُ هٰذِهٖ مِمَّا عَلَیَّ یَا
رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خُذْهَا فَاِنَّ اللّٰهَ یُؤَدِّیْ بِهَا
عَنْكَ قَالَ فَاَخَذْتُهَا فَوَزَنْتُ لَهُمْ مِنْهَا وَ
الَّذِیْ نَفْسُ سَلْمَانَ بِیَدِهٖ اَرْبَعِیْنَ اُوْقِیَةً فَاَوْ
فَیْتُهُمْ حَقَّهُمْ وَ عَتَقَ سَلْمَانُ فَشَهِدْتُ مَعَ
رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْخَنْدَقَ
حُرًّا ثُمَّ لَمْ یَفُتْنِیْ مَعَهٗ مَشْهَدٌ. رواه محمد
ابن اسحٰق و الحاکم و البیهقی فی کتاب
دلائل النبوة قال الحافظ ابن کثیر و طریق
محمد ابن اسحاق اقوی اسنادا و احسن
اقتصاصا الی ما رواه البخاری فی صحیحه

بات کا حکم دیتے ہیں انہوں نے فرمایا بخدا میرے علم میں اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ ہم لوگ تھے تا کہ میں تم کو ان کی خدمت میں حاضری کے لیے کہہ سکوں لیکن ایک نبی کے مبعوث ہونے کا وقت بالکل سر پر آ چکا ہے جو دین ابراہیمی لے کر آئیں گے' سرزمین عرب میں ان کا ظہور ہوگا' اور وہ ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرمائیں گے جس کے دو طرف سنگستان ہوگا اس میں کھجوروں کے باغات ہوں گے اس نبی میں ایسی کھلی علامتیں بھی موجود ہوں گی جو کسی پر پوشیدہ نہ ہوں گی' وہ ہدیہ کھالیں گے اور صدقہ نہیں کھائیں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ''مہر نبوت'' ہوگی اگر تم ان مقامات میں پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جانا اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور دفن کر دیئے گئے- ان کے بعد جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا میں مقام عموریہ میں قیام پذیر رہا- پھر قبیلہ کلب کے کچھ تاجروں کا میری طرف سے گذر ہوا میں نے ان سے کہا مجھے بھی سرزمین عرب میں لے چلو اور میں اپنی یہ گائیں اور بکریاں (اس کے عوض میں) سب تم کو دیتا ہوں انہوں نے کہا اچھا- چنانچہ میں نے وہ سب ان کو دے دیں- انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا لیکن جب مقام ''وادی القریٰ'' میں پہنچے تو انہوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا اور ایک یہودی کے ہاتھ مجھ کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالا- میں اس کے پاس رہا گیا اور جب میں نے یہاں کھجور کے درخت دیکھے تو مجھے کچھ امید ہوئی کہ شاید یہ وہی مقام ہوگا جس کے متعلق عموریہ والے بزرگ نے مجھ کو ہدایت کی تھی' لیکن میرے دل میں اس کا پورا پورا یقین نہ ہوا ابھی میں اس کے گھر ہی میں تھا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی مدینہ (شریف) سے آیا جو بنو قریظہ کے خاندان سے تھا اس یہود نے مجھ کو اپنے چچازاد بھائی کے ہاتھ فروخت

لـه ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف صفات ہی نہیں بلکہ بعض علماء اہل کتاب اور بادشاہوں کے پاس تو ان علامات کے مطابق آپ کی تصویریں تک بھی موجود تھیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ شام جانے کے ارادہ سے نکلا' بصریٰ پہنچ کر چند اہل کتاب علماء سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم حرم کے باشندہ ہو- میں نے کہا جی ہاں- یہ سن کر مجھ کو وہ ایک بڑے گرجا میں لے گئے جہاں متعدد تصویریں موجود تھیں انہوں نے مجھ سے کہا پہچان سکتے ہو ان میں تمہارے صاحب کون ہیں؟ میں نے ایک تصویر کو دیکھا تو وہ ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد دیکھا تو آپ کے قریب ہی ایک دوسرے بزرگ نظر آئے جو آپ کے پیر کی ایڑی پکڑے بیٹھے تھے- انہوں نے پوچھا ان کو بھی پہچانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں- اس نے کہا یاد رکھو یہی شخص ہیں جو ان کے بعد ان کے خلیفہ ہوں گے- اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام ہوئے ہیں سب کے بعد کوئی نہ لـه .....

عن سلمان انه تداوله بضعة عشر من ربّ الی رب ای معلّم و مربّ الی مثله و الله تعالی اعلم قال السهيلی تداوله ثلاثون سيدًا من سيد الی سيد فالله اعلم. و كذلك استقصی قصة اسلامه الحافظ ابو نعيم فی الدلائل و او ردلها اسانيد و الفاظًا كثيرة . و قد حذفنا صدر القصة روماً للاختصار فتنبه .

کردیا وہ مجھ کو مدینہ لے آیا- خدا کی قسم جوں ہی کہ میں نے مدینہ کو دیکھا تو میں نے اپنے ان بزرگوں کے بیان کردہ علامات سے اس کو فوراً پہچان لیا- اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی تھی لیکن اس وقت آپ کا قیام مکہ ہی میں تھا اور چونکہ میں غلامی کے فرائض ادا کرنے میں پڑا رہا کرتا اس لیے مجھ کو آپ کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی کچھ عرصہ بعد ایسا اتفاق ہوا کہ آپ ؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی- بخدا میں اس وقت ایک کھجور کے درخت کے اوپر اپنے آقا کے کسی کام میں مشغول تھا اور میرا آقا نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کا چچا زاد بھائی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا اے فلاں خدا تعالیٰ بنو قیلہ کو موت دے یہ سب کے سب ایک شخص کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں جو آج ہی مکہ سے آیا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہے- سلمانؓ کہتے ہیں بس یہ سننا تھا کہ میرے جسم پر رعشہ پڑ گیا اور مجھے یقین ہوا کہ میں اپنے آقا پر جا گروں گا اس لیے درخت کے اوپر سے اتر آیا اور اس کے چچا زاد بھائی سے پوچھنے لگا- ہیں کیا کہتے ہو' کیا کہتے ہو؟ اس پر میرا آقا بھڑک اٹھا اور مجھے ایک سخت لات ماری اور بولا تجھ کو اس کی کیا پڑی تو اپنے کام میں لگ- میں نے کہا کچھ نہیں میں تو صرف وہ بات سمجھنی چاہتا تھا جو انہوں نے کہی تھی- میں نے کچھ تھوڑا سا مال جمع کر لیا تھا جب شام کا وقت ہوا تو میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا پہنچا- ابھی آپ قباء ہی میں رونق افروز تھے' میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ ؐ سے عرض کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نیک شخص ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ بے وطن غریب لوگ بھی ہیں- میرے پاس یہ کچھ صدقہ کا مال تھا میں نے دوسروں کی بجائے آپ لوگوں کو اس کا زیادہ حق دار سمجھا ہے- چنانچہ میں نے وہ مال آپ ؐ کے سامنے پیش کر دیا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء سے مخاطب ہو کر فرمایا اس کو تم لوگ کھا لو اور آپ ؐ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور خود تناول نہ فرمایا- میں نے اپنے دل میں کہا یہ ایک علامت تو پوری ہو گئی- پھر میں واپس آیا اور میں نے کچھ مال جمع کیا' اب آپ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور میں نے حاضر ہو کر عرض کی- میں نے دیکھا کہ آپ ؐ صدقہ کا مال نہیں کھاتے ہیں لہٰذا یہ ہدیہ ہے آپ کی خدمت میں اکراماً حاضر ہے- سلمانؓ کہتے ہیں اس کو آپ ؐ نے بھی تناول فرما لیا اور اپنے رفقاء سے بھی فرمایا تو انہوں نے بھی آپ ؐ کے ساتھ کھایا- میں نے اپنے دل میں کہا یہ دو علامتیں پوری ہوئیں اس کے بعد پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ؐ اپنے کسی صحابی کے جنازہ کے ساتھ بقیع غرقد میں آئے ہوئے تھے اور اس وقت آپ دو چادریں اوڑھے ہوئے اپنے رفقاء میں رونق افروز تھے- میں نے آپ کو

ﷺ .....کوئی نبی ہوتا رہا ہے صرف یہ ایک ایسے نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا- اس واقعہ کو ابونعیم نے بھی دلائل النبوۃ میں ذکر کیا ہے-

اسی طرح موسیٰ بن عقبہ ذکر کرتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہشام بن العاص' نعیم بن عبداللہ اور تیسرے ایک شخص اور شاہِ روم کے پاس بھیجے گئے تھے یہ کہتے ہیں کہ ہم جبلہ بن ایہم سے ملے اس وقت یہ مقام غوطہ میں تھے وہ ہم کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے- بادشاہ نے ہم کو چند تصویریں دکھائیں پھر ایک تصویر کے متعلق کہا کہ یہ سب سے آخری تصویر تھی لیکن میں نے تم کو پہلے اس لیے دکھائی ہے کہ ان کے متعلق تمہارا خیال معلوم کروں- یہ تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد اس نے دیگر سب ﷺ .....

سلام کیا پھر میں آپ کے پیچھے کی جانب گھوما تا کہ پشت والی علامت بھی دیکھوں کہ مہر نبوت جو علامت میرے بزرگ نے مجھ سے بیان کی تھی وہ بھی ہے یا نہیں- جب آپؐ نے دیکھا کہ میں آپ کی پشت کی جانب گھوما ہوں تو آپ پہچان گئے کہ کوئی علامت مجھے بتائی گئی ہے میں اس کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں- آپ نے اپنی پشت کے اوپر سے اپنی چادر اتار دی- میں نے مہر نبوت دیکھ لی اور اس کو خوب پہچان لیا اور یہ دیکھتے ہی میں اس کے اوپر گر پڑا' بس اس کو چومتا تھا اور روتا تھا- آپ نے مجھ سے فرمایا ادھر آؤ- میں سامنے حاضر ہو گیا اور میں نے اے ابن عباس جس طرح اپنا قصہ آپ کے سامنے پورا بیان کیا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کہہ سنایا- آپ کو یہ پسند ہوا کہ اس قصہ کو آپ کے اور صحابہ بھی سنیں- اس کے بعد ایسا ہوا کہ سلمانؓ اپنی غلامی کے دھندوں میں پھنسے رہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگ بدر و احد میں شریک نہ ہو سکے- سلمانؓ بیان کرتے ہیں مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- سلمان دیکھو تم اپنے آقا سے عقد کتابت کر لو (یعنی کچھ مقرر رقم دے کر آزاد ہو جاؤ) چنانچہ میں نے اپنے آقا سے عقد کتابت کر لیا اس معاوضہ میں کہ میں اس کو تین سو کھجور کے درخت لگا کر دوں گا یہاں تک کہ وہ پھل لے آئیں اور ان کے نصب کرنے کے لیے گڑھے کھودنے بھی میرے ہی ذمہ ہوں گے اور چالیس اوقیہ سونا نقد بھی دوں گا- اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ترغیب دی کہ تم لوگ اپنے بھائی سلمان کی امداد کرو- چنانچہ انہوں نے میری مدد کی کسی شخص نے تیس پودے کھجوروں کے دیئے اور کسی نے بیس کسی نے پندرہ اور کسی نے دس غرض ہر شخص نے اپنی اپنی وسعت کے مطابق میری امداد کی یہاں تک کہ میرے پاس تین سو پودے جمع ہو گئے- اس کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا جاؤ سلمان اب جا کر ان گڑھوں کا انتظام کرو اور جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آنا تا کہ میں خود اپنے ہاتھ سے پودے نصب کروں- چنانچہ میں گیا اور گڑھے خود بھی کھودے اور میرے اصحاب نے بھی ان میں میری امداد کی یہاں تک کہ جب میں کھود کر فارغ ہو گیا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اطلاع دی' آپ میرے ساتھ وہاں تشریف لے آئے- ہم آپ کے سامنے ایک ایک پودہ پیش کرتے جاتے اور آپ اس کو اپنے دست مبارک سے نصب کرتے جاتے یہاں تک کہ ہم سب کو نصب کر کے فارغ ہو گئے- اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے کہ ان پودوں میں ایک پودا بھی ایسا نہ تھا جو مرا ہو (اس کے بعد وہ باغ اگلے ہی سال پھل لے آیا) اور میں نے اس کو اپنے مالک کے حوالہ کر دیا- اب میرے ذمہ صرف نقد کی قسط باقی رہ گئی- اتفاق ایسا ہوا کہ کسی کان میں سے آپ کے پاس مرغی کے انڈے کے برابر کچھ سونا آیا تو آپ نے فرمایا وہ فارسی مکاتب کدھر گیا- اس پر میں بلایا گیا- آپ نے فرمایا سلمان! لو اس کو لے لو اور جو قرض تم پر ہے اس کو ادا کر دو- میں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے قرض کے مقابلہ میں اتنا سا سونا بھلا کیا کافی ہو گا- آپ نے ارشاد فرمایا- اس کو لے لو اور اللہ تعالیٰ اسی سے تمہارا سب قرض ادا کرا دے گا- میں نے اس کو لے لیا اور وزن کر کے چالیس اوقیہ ادا کر دیئے- اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے' میں نے اسی سونے سے اس کا سب حق ادا کر دیا اور یہ سلمان آزاد ہو گیا- اور میں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ خندق میں شریک ہوا' اور پھر کوئی غزوہ ایسا نہ تھا جس میں میں شریک نہ رہا ہوں- (دلائل النبوۃ از بیہقی' حاکم وغیرہما)

لله ..... انبیاء سابقین علیہم السلام کی تصاویر بھی دکھائیں- مغیرہ بن شعبہ نے شاہ مقوقس کا واقعہ بھی اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے ان تاریخی شہادتوں سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ اہل کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کس حد تک تھا اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کا تعارف کس درجہ تھا-

(۹۷۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَضَرَتْ عَصَابَةٌ مِنَ الْيَهُوْدِ يَوْمًا اِلَى النَّبِى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَدِّثْنَا عَنْ خِلَالٍ نَسْئَلُكَ عَنْهَا لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا نَبِىٌّ فَقَالَ سَلُوْنِىْ مِمَّا شِئْتُمْ وَ لٰكِنْ اجْعَلُوْا لِىْ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَ مَا اَخَذَ يَعْقُوْبُ عَلٰى بَنِيْهِ اِنْ اَنَا حَدَّثْتُكُمْ بِشَيْءٍ تَعْرِفُوْنَهٗ صِدْقًا لَتُتَابِعُوْنِىْ عَلَى الْاِسْلَامِ قَالُوْا لَكَ ذٰلِكَ قَالَ فَسَلُوْنِىْ مِمَّا شِئْتُمْ قَالُوْا اَخْبِرْنَا عَنْ اَرْبَعِ خِلَالٍ اَخْبِرْنَا عَنِ الطَّعَامِ الَّذِىْ حَرَّمَ اِسْرَائِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ وَ اَخْبِرْنَا عَنْ مَاءِ الرَّجُلِ كَيْفَ يَكُوْنُ الذَّكَرُ مِنْهُ حَتّٰى يَكُوْنُ ذَكَرًا و كَيْفَ يَكُوْنُ اُنْثٰى حَتّٰى يَكُوْنُ اُنْثٰى وَ اَخْبِرْنَا كَيْفَ هٰذَا النَّبِىُّ الْاُمِّىُّ فِى التَّوْرَاتِ وَ مَنْ وَّلِيُّهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالَ فَعَلَيْكُمْ عَهْدُ اللّٰهِ وَ مِيْثَاقُهٗ لَئِنْ اَنَا حَدَّثْتُكُمْ لَتُتَابِعُوْنِىْ فَاَعْطَوْهُ مَاشَاءَ مِنْ عَهْدٍ وَ مِيْثَاقٍ قَالَ اَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِىْ اَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ اِسْرَائِيْلَ مَرِضَ مَرَضًا شَدِيْدًا طَالَ سَقَمُهٗ فِيْهِ فَنَذَرَ لِلّٰهِ نَذْرًا لَئِنْ شَفَاهُ اللّٰهُ مِنْ سَقَمِهٖ لَيُحَرِّمَنَّ اَحَبَّ الشَّرَابِ وَ اَحَبَّ الطَّعَامِ اِلَيْهِ وَ كَانَ اَحَبَّ الشَّرَابِ اِلَيْهِ اَلْبَانُ الْاِبِلِ وَ اَحَبَّ الطَّعَامِ اِلَيْهِ لُحُوْمُ الْاِبِلِ

(۹۷۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک دن یہود کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی' اور بولی یا رسول اللہ! ہم کو چند باتوں کا جواب دیجئے جو ہم آپؐ سے ابھی پوچھنے والے ہیں' ان کو نبی کے سوا اور کوئی شخص نہیں جانتا- آپؐ نے فرمایا جو دل چاہے شوق سے پوچھو- لیکن اگر میں ایسا جواب دے دوں جس کی صداقت کا تم بھی اعتراف کرلو تو مجھ سے اس بات کا عہد کرو کہ تم اسلام قبول کرلو گے اور اُس بات کا بھی عہد کرو جس کا عہد یعقوبؑ نے اپنی اولاد سے لیا تھا' یعنی خدا تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے- انہوں نے کہا منظور ہے اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اب جو تمہاری مرضی میں آئے مجھ سے پوچھو وہ بولے ہم کو آپؐ چار باتیں بتادیجئے- پہلی یہ کہ تورات کے نزول سے قبل وہ کھانا کیا تھا جو اسرائیل علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا- دوم یہ بتایئے کہ مرد کی منی سے جب لڑکا بنتا ہے تو کیسے بنتا ہے اور عورت کی منی سے جب لڑکی بنتی ہے تو کیسے بنتی ہے- تیسرے یہ بات بتایئے کہ تورات میں اس نبی امی کی کیا علامت بیان کی گئی ہے- چوتھی یہ کہ فرشتوں میں سے کون فرشتہ ان کا رفیق کار مقرر کیا گیا ہے- آپؐ نے فرمایا مجھ سے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ عہد کرو کہ اگر میں ان کا جواب دے دوں تو تم لوگ اسلام قبول کرنے میں میرا کہا مان لو گے- اس پر انہوں نے خوب لمبے چوڑے عہد کیے اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اچھا میں اس خدا تعالیٰ کی تم کو قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی بتاؤ کیا تم نہیں جانتے کہ اسرائیل جب سخت بیمار پڑے اور ان کی علالت بہت طویل ہوگئی تو انہوں نے یہ منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مجھے بیماری سے صحت بخشی تو جو مجھے کھانے پینے کی چیزوں میں سب سے زیادہ پسند ہوگی میں اس کو چھوڑ دوں گا اور واقعہ یہ تھا کہ پینے کی اشیاء میں اونٹ کا دودھ اور کھانے کی چیزوں میں اونٹ کا گوشت ان کو بہت پسند تھا (لہٰذا صحت کے بعد انہوں نے اپنی منت کے مطابق ان کا استعمال ترک فرمادیا تھا) انہوں نے (یہ جواب سن کر) کہا اے اللہ بے شک یہی بات ہے- آپؐ نے

(۹۷۹) * یہاں یہ بحث کرنی کہ ان امور کا علم خصائص نبوت سے ہوسکتا ہے یا نہیں بالکل غیر متعلق بحث ہے- ہمارا مقصد یہاں لله .....

قَالُوْا اللّٰھُمَّ نَعَمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلَيْهِمْ فَقَالَ فَاَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ اَبْيَضُ وَ اَنَّ مَاءَ الْمَرْاَةِ رَقِيْقٌ اَصْفَرُ فَاَيُّهُمَا عَلَا كَانَ الْوَلَدُ وَ الشَّبَهُ لَهٗ بِاِذْنِ اللّٰهِ قَالُوْا اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ قَالَ اَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ هٰذَا النَّبِيَّ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَ لَا يَنَامُ قَلْبُهٗ قَالُوْا اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ قَالُوْا اَنْتَ الْاٰنَ حَدِّثْنَا مَنْ وَلِيُّكَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَعِنْدَهَا نُجَامِعُكَ اَوْ نُفَارِقُكَ قَالَ وَلِيِّيْ جِبْرَئِيْلُ وَ لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا قَطُّ اِلَّا وَ هُوَ وَلِيُّهٗ قَالُوْا فَعِنْدَهَا نُفَارِقُكَ وَ لَوْ كَانَ غَيْرُهٗ لَاتَّبَعْنَاكَ وَ قَدْ قْنَاكَ قَالَ فَمَا يَمْنَعُكُمْ اَنْ تُصَدِّقُوْا بِهٖ قَالُوْا اِنَّهٗ عَدُوُّنَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اِلٰى قَوْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرہ:٩٧)

(رواہ ابوداؤد الطیالسی)

فرمایا الٰہی تو بھی اس پر گواہ رہ- پھر آپؐ نے فرمایا میں تم کو اس خدا کی ذات کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں' جس نے موسیٰ پر تورات نازل فرمائی- کیا تم یہ نہیں جانتے کہ مرد کی منی سفید رنگ اور گاڑھی ہوتی ہے اور عورت کی زرد اور پتلی اور ان میں جو غالب رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچہ اس کے مشابہ پیدا ہوتا ہے- وہ بولے اے اللہ بے شک یہی بات ہے- آپؐ نے فرمایا اے اللہ تو بھی اس پر گواہ رہ پھر آپؐ نے فرمایا تم کو اس خدا تعالیٰ کی ذات کی قسم جس کے سواء معبود کوئی نہیں اور جس نے موسیٰ پر تورات نازل فرمائی' کیا تم نہیں جانتے کہ اس نبی کی ایک علامت یہ ہے کہ نیند صرف اس کی آنکھوں پر طاری ہوگی اس کے دل پر نہیں وہ اس حالت میں بھی بیدار رہے گا وہ بولے اے اللہ بے شک یہی بات ہے آپؐ نے فرمایا الٰہی تو بھی گواہ رہ اس کے بعد انہوں نے کہا آپ ایک آخری بات اور بتا دیجئے بس اس کے بعد یا تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپ سے علیحدہ ہو جائیں گے اور وہ یہ کہ فرشتوں میں کون فرشتہ آپ کا رفیق کار ہے- آپؐ نے فرمایا میرے ولی اور رفیق کار جبرئیلؑ ہیں اور مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا ہے یہی اس کے رفیق کار رہے ہیں- یہ سن کر وہ بولے بس اسی بات پر ہم آپ سے علیحدہ ہوتے ہیں اگر ان کے سوا آپ کا رفیق کار کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کر لیتے اور آپ کی تصدیق کرتے- آپؐ نے پوچھا ان کی تصدیق کرنے سے تمہیں کیا بات مانع ہے' انہوں نے کہا فرشتوں میں یہ ہمارا دشمن ہے- اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''کہہ دو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہو (وہ ہو) کسی شک کے بغیر انہوں نے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن پاک آپ کے قلب پر نازل کیا ہے جو اس تورات کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے-''

(ابوداؤد طیالسی)

لله ...... صرف اتنا ہے کہ جس امر کو اہل کتاب نبوت کی نشانی سمجھتے چلے آئے تھے اور جو اشیاء ان کے بیان کے مطابق علوم نبوت میں شمار تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں سب موجود تھیں- آپ کے جواب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے پوری دیانت داری کے ساتھ ہر امر کا صاف صاف اعلان کر دیا تھا اور ان کے ایمان کی خاطر اپنے بیان کے کسی پہلو میں ذرا سی لچک پیدا نہیں کی- حضرت جبرئیل علیہ السلام کے معاملہ میں جب انہوں نے اپنی عداوت کا اظہار کیا تو آپ بہت صفائی کے ساتھ یہاں ان سے الگ ہو گئے اور خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن میں بے وجہ سازگاری پیدا کرنے کی کوئی سعی نہیں کی- آپ کے اس بے لاگ اور واضح طرز عمل میں اہل فہم و انصاف کے لیے انبیا علیہم السلام کی شناخت کے لیے ایک بڑی شاہراہ کھلتی ہے-

(۹۸۰) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ حِبْرٌ مِنْ اَحْبَارِ الْيَهُوْدِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ فَدَفَعْتُهُ دَفْعَةً كَادَ اَنْ يُصْرَعَ مِنْهَا فَقَالَ لِمَ تَدْفَعُنِيْ قَالَ قُلْتُ اَلَا تَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّمَا سَمَّيْتُهُ بِاسْمِهِ الَّذِيْ سَمَّاهُ بِهِ اَهْلُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِسْمِيَ الَّذِيْ سَمَّانِيْ بِهِ اَهْلِيْ مُحَمَّدٌ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ جِئْتُ اَسْأَلُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْفَعُكَ شَيْءٌ اِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ اَسْمَعُ بِاُذُنَيَّ فَنَكَتَ بِعُوْدٍ فِيْ يَدِهِ فَقَالَ لَهُ سَلْ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ اَيْنَ النَّاسُ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الظُّلْمَةِ دُوْنَ الْجِسْرِ. قَالَ فَمَنْ اَوَّلُ النَّاسِ اِجَازَةً قَالَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ. فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ فَمَا تُحْفَتُهُمْ حِيْنَ يَدْخُلُوْنَ قَالَ زِيَادَةُ كَبِدِ حُوْتٍ قَالَ فَمَا غِذَاؤُهُمْ عَلٰى اِثْرِهِ قَالَ يُنْحَرُ لَهُمْ ثَوْرُ الْجَنَّةِ الَّذِيْ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ اَطْرَافِهَا قَالَ فَمَا شَرَابُهُمْ عَلَيْهِ. قَالَ مِنْ عَيْنٍ فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ وَجِئْتُ اَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ لَا يَعْلَمُهُ اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اِلَّا نَبِيٌّ اَوْ رَجُلٌ اَوْ رَجُلَانِ قَالَ يَنْفَعُكَ اِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ اَسْمَعُ بِاُذُنَيَّ قَالَ جِئْتُ اَسْأَلُكَ عَنِ الْوَلَدِ قَالَ مَاءُ الرَّجُلِ اَبْيَضُ وَمَاءُ الْمَرْأَةِ

(۹۸۰) ثوبان بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھڑا ہوا تھا کہ یہود کا ایک عالم آیا اور بولا السلام علیک یا محمد - یہ سن کر میں نے اس کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گرنے کے قریب ہوگیا - اس نے کہا تم نے مجھے کیوں دھکا دیا - میں نے کہا اس لیے کہ تو نے یا رسول اللہ کیوں نہیں کہا - وہ بولا میں نے آپ کا وہی نام تو لیا ہے جو آپ کے گھر والوں نے آپ کا رکھا ہے - یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - میرے گھر والوں نے میرا نام محمد ہی رکھا ہے اس کے بعد اس یہودی نے کہا میں آپ سے کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے آیا ہوں - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں تجھ کو وہ باتیں بتا دوں تو تجھ کو کچھ فائدہ ہوگا؟ اس نے کہا میں اپنے کانوں سے سن لوں گا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زمین کریدنے لگے (جیسا کچھ سوچ رہے ہیں) اور فرمایا اچھا پوچھو - یہودی نے کہا (جس دن زمین دوسری صورت میں بدل دی جائے گی اور آسمان' الخ) اس دن بھلا لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا - ایک تاریکی میں ہوں گے جو پل صراط سے پہلے ہو گی - اس نے پوچھا اچھا بتایئے سب سے پہلے پل صراط سے گزرنے والے کون لوگ ہیں؟ آپ نے جواب دیا مہاجرین کے فقیر - یہودی نے پوچھا جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ان کا پہلا ناشتہ کیا ہوگا - آپ نے جواب دیا - مچھلی کے جگر کا جو حصہ بڑھا ہوا ہوتا ہے - اس نے پوچھا اس کے بعد پھر ان کو کیا کھانا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا - ایک بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت کے کناروں میں چرا ہوا ہوگا - اس نے پوچھا اچھا اس کے بعد ان کا پانی کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اس چشمہ کا پانی ہوگا جس کا نام سلسبیل ہے اس کے بعد اس نے کہا بس ایک بات اور پوچھتا ہوں جس کو نبی کے سوا، زمین پر بسنے والوں میں کوئی انسان نہیں جانتا یا ایک دو شخص اور - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں بتا دوں تو تجھ کو کچھ فائدہ بھی ہوگا؟ اس نے کہا میں اپنے کان سے سن تو لوں گا - اس کے بعد اُس نے کہا فرمایئے لڑکا کیسے بنتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَصْفَرُ فَاِذَا اجْتَمَعَا فَعَلَ مَنِیُّ الرَّجُلِ مَنِیَّ الْمَرْأَةِ ذَكَرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اِذَا عَلَامَنِیُّ الْمَرْأَةِ مَنِیَّ الرَّجُلِ اُنْثٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ فَقَالَ الْيَهُوْدِیُّ صَدَقْتَ وَ اِنَّكَ لَنَبِیٌّ ثُمَّ انْصَرَفَ. فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ سَأَلَنِیْ هٰذَا الَّذِیْ سَأَلَنِیْ عَنْهُ وَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا مِنْهُ حَتّٰی اَتَانِیْ بِهِ اللّٰهُ تَعَالٰی.

(رواه مسلم و رواه عبد بن حميد فی تفسيره)

یہ بات تو معلوم ہے کہ مرد کی منی سفید رنگ کی اور عورت کی زرد رنگ کی- جب دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو اگر مرد کی منی غالب رہی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور اگر عورت کی منی غالب ہوئی تو اس کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے- یہودی بولا آپ نے ٹھیک بتایا اور یقیناً آپ سچے نبی ہیں- یہ کہہ کر وہ چلا گیا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو باتیں اس نے مجھ سے دریافت کی تھیں اس کے پوچھنے سے پہلے ان میں کسی ایک بات کا بھی مجھ کو علم نہ تھا یہاں تک کہ (جب اس نے پوچھا) تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان کا علم عطا فرمادیا-

(مسلم شریف)

(۹۸۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ كَانَ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ قِطْرِيَّانِ غَلِيْظَانِ وَ كَانَ اِذَا قَعَدَ فَعَرِقَ ثَقُلَا عَلَيْهِ فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ لِفُلَانِ الْيَهُوْدِیِّ فَقُلْتُ لَوْ بَعَثْتَ اِلَيْهِ فَاشْتَرَيْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ اِلَی الْمَيْسَرَةِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُ مَا تُرِيْدُ اِنَّمَا يُرِيْدُ اَنْ تَذْهَبَ بِمَا لِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبَ قَدْ عَلِمَ اِنِّیْ مِنْ اَتْقَاهُمْ وَ اَدَّاهُمْ لِلْاَمَانَةِ.

(رواه الترمذی و النسائی)

(۹۸۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر دو موٹے موٹے کپڑے تھے جب آپ بیٹھتے اور آپ کو پسینہ آتا تو وہ پسینہ میں بھیگ کر اور بھاری ہو جاتے- حسب اتفاق شام سے فلاں یہودی کا کچھ کپڑا آیا تو میں نے عرض کی کاش آپ اس یہودی کے پاس کسی کو بھیج کر (دو ہلکے ہلکے) کپڑے خرید لیتے اس شرط سے کہ جب آپ کو گنجائش ہوگی تو اس کی قیمت ادا فرمادیں گے- آپ نے اس یہودی کے پاس کہلا بھیجا- اس نے یہ سن کر کہا اچھا میں آپ کا مطلب سمجھ گیا' آپ کا مقصد اس بہانہ سے صرف میرا مال مار لینا ہے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا یہ جھوٹ کہتا ہے' یہ خوب جانتا ہے کہ میں ان سب سے زیادہ متقی ہوں اور سب سے بڑھ کر امانت کا اداء کرنے والا ہوں-

(ترمذی-نسائی)

---

(۹۸۱) * یہودی کی ناہموار فطرت کا تجربہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ہوتا چلا آرہا تھا اس یہودی سے بھلا کیا بعید تھا کہ وہ آپ پر بھی اس قسم کی بہتان طرازی سے کام لیتا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن بلند اخلاق کے مالک تھے کہ پورے اقتدار کے باوجود اس یہودی پر کوئی دفعہ جرم نہیں لگاتے اور صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ میری صفت کتب سابقہ میں موجود ہے جس کو یہ بھی خوب جانتا ہے اس لیے میرے متعلق اس کا یہ بیان کسی غلط فہمی سے نہیں ہے بلکہ صریح کذب پر مبنی ہے- جہاں نبوت اور دلائل نبوت پر کسی نے کوئی حملہ کیا ہے آپ نے وہاں کھلے طور اس کی تردید کی ہے- اخلاق و رواداری اور اعلانِ حق اور اعلانِ حق اور کسی نصب العین کے تحفظ کے حدود اس ایک واقعہ سے سمجھ لینے چاہئیں-

(۹۸۲) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَتْ قُرَيْشُ النَّضْرَ بْنَ الْحَارِثِ وَ عُقْبَةَ بْنَ اَبِیْ مُعَیْطٍ اِلَی اَحْبَارِ یَهُوْدَ بِالْمَدِیْنَةِ فَقَالُوْا لَهُمْ اَسْأَلُوْهُمْ عَنْ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) وَ صِفُوْا لَهُمْ صِفَتَهٗ وَ اَخْبِرُوْهُمْ بِقَوْلِهٖ فَاِنَّهُمْ اَهْلُ الْکِتَابِ الْاَوَّلِ وَ عِنْدَهُمْ عِلْمٌ مَا لَیْسَ عِنْدَنَا مِنْ عِلْمِ الْاَنْبِیَاءِ فَخَرَجَا حَتّٰی قَدِمَ الْمَدِیْنَةَ فَسَأَلُوْا اَحْبَارَ یَهُوْدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ وَصَفُوْا لَهُمْ اَمْرَهٗ وَ بَعْضَ قَوْلِهٖ وَ قَالَا اِنَّکُمْ اَهْلُ التَّوْرَاةِ وَ قَدْ جِئْنَاکُمْ لِتُخْبِرُوْنَا عَنْ صَاحِبِنَا هٰذَا قَالَ فَقَالَتْ لَهُمْ اَحْبَارُ یَهُوْدَ سَلُوْهُ عَنْ ثَلَاثٍ فَامُرُکُمْ بِهِنَّ فَاِنْ اَخْبَرَکُمْ بِهِنَّ فَهُوَ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ وَ اِنْ لَّمْ یَفْعَلْ فَالرَّجُلُ مُتَقَوِّلٌ فَرَوْا فِیْهِ رَأْیَکُمْ سَلُوْهُ عَنْ فِتْیَةٍ ذَهَبُوْا فِی الدَّهْرِ الْاَوَّلِ مَا کَانَ مِنْ اَمْرِهِمْ فَاِنَّهٗ قَدْ کَانَ لَهُمْ (حَدِیْثٌ عَجِیْبٌ وَ سَلُوْهُ عَنْ رَجُلٍ طَوَّافٍ بَلَغَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا مَا

(۹۸۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں، کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ کو مدینہ کے یہودی علماء کے پاس بھیجا اور ان سے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ کی ذرا ان سے تحقیق کریں اور ان کے سامنے ان کی شکل و شمائل بھی بیان کریں اور جو قرآن یہ ہم کو سناتے ہیں اس کی بھی ان کو خبر کر دیں کیونکہ وہ لوگ پہلی کتابوں کے جاننے والے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو معلومات ان کو ہیں وہ ہم کو نہیں ہیں- یہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گئے اور یہود کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تحقیق کرنے لگے، ان سے کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بھی بیان کیے اور کلام پاک کا کچھ حصہ بھی سنایا اور کہنے لگے کہ آپ لوگ تورات کے عالم ہیں ہم اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ ہمارے اس ہم وطن کے متعلق آپ ہم کو صحیح صحیح بات بتا دیں- وہ بولے اس شخص سے جا کر تین باتیں پوچھنا اگر وہ تم کو بتا دیں تو وہ یقینی خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہیں اور اگر نہ بتائیں تو سمجھنا کہ افتراء پرداز آدمی ہے اور پھر جو سلوک تمہاری رائے میں آئے وہ کرنا- پہلی بات تو یہ پوچھنا کہ گذشتہ زمانہ میں نوجوانوں کی جو جماعت اپنے شہر سے باہر چلی گئی تھی ان کا قصہ کیا ہے- کیونکہ ان کا قصہ ایک عجیب قصہ ہے- دوسری بات یہ دریافت کرنا کہ جس شخص نے مشرق و مغرب کی سیاحت کی تھی اس کا قصہ کیا ہے اور روح کے متعلق بھی دریافت کرنا اس کی حقیقت کیا ہے اگر وہ ان

---

(۹۸۲) ٭ حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین ارکان ہیں ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالقیامة - اصحابِ کہف کے اس قصہ میں ایمان کے ان ہر سہ اصول کی دلیلیں موجود ہیں- حسب بیان قرآن چونکہ اصحابِ کہف تین سو سال کی مدت سے زیادہ عالم خواب میں پڑے رہے اس کے باوجود ان کے جسم بدستور صحیح و سالم تھے ان پر تغیر کا ذرا کہیں نام نہ آیا تھا اس سے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے- پھر جب اتنی طویل مدت کے بعد وہ بیدار ہوئے تو اس سے ثابت ہوتا کہ قیامت میں مردوں کا جی اٹھنا بھی حق ہے وہ بھی اسی طرح پھر زندہ ہو سکتے ہیں- اسی لیے اس واقعہ کو بیان فرما کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَکَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا. (الکهف : ۲۱)

اور اسی طرح ہم نے ان کو خبر ظاہر کر دی کہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے- للہ.....

كَانَ نَبَّأَهُ وَ سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ مَا هُوَ فَاِنْ اَخْبَرَكُمْ بِذَالِكَ فَاِنَّهُ نَبِيٌّ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اِنْ هُوَ لَمْ يَفْعَلْ فَهُوَ رَجُلٌ مُتَقَوِّلٌ فَاصْنَعُوْا فِيْ اَمْرِهِ مَا بَدَالَكُمْ فَاَقْبَلَ النَّضْرُ وَ عُقْبَةُ حَتّٰى قَدِمَا مَكَّةَ عَلٰى قُرَيْشٍ فَقَالَا يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ قَدْ جِئْنَاكُمْ بِفَصْلِ مَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَدْ اَمَرَنَا اَحْبَارُ

سب باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دیں تو یقیناً وہ سچے نبی ہیں' ان کی پیروی کرنا اور اگر نہ بتا سکیں تو وہ کوئی افتراء پرداز آدمی ہے پھر اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرنا - نضر اور عقبہ یہ باتیں سن کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے اور جب یہاں پہنچے تو قریش سے کہا - اے قریش ہم تمہارے پاس ایک ایسی بات لے کر آئے ہیں جو تمہارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے - ہم سے یہود کے علماء نے یہ کہا ہے کہ ہم ان سے چند باتیں دریافت کریں اور وہ سب باتیں بیان کیں - اس کے بعد رسول اللہ

ﷺ ..... اور چونکہ اس عجیب در عجیب قصہ کی اطلاع آپ نے کسی سے حاصل کیے بغیر یہود کو دے دی اس لیے آپ کی نبوت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ یہود کو یہ معلوم تھا کہ اس قصہ کی اطلاع یا تو نبی کو ہو سکتی ہے یا اس کو ہو سکتی ہے جس کو نبی اطلاع دے یہ بات تو ظاہر تھی کہ آپ کو کسی اور شخص نے اس کی اطلاع نہیں دی - اب رہا کسی نبی کا براہِ راست آپ کو اطلاع دینا تو اس کا یہاں کوئی امکان ہی نہ تھا - لہٰذا ایک صورت اب بھی باقی رہ گئی تھی کہ وحی الٰہی نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہو - اسی لیے انہوں نے اس کو آپ کی نبوت کا معیار قرار دے دیا تھا -

حافظ سہیلیؒ اصحاب کہف پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کر دینا گویا یہ سب آپ کے چشم دید حالات تھے - حتیٰ کہ ان کے کتے کی نشست کی صورت بھی بالخصوص جب کہ ماحول ایسا ہو کہ ایک بہادر انسان بھی اس کو غور کے ساتھ دیکھ نہ سکتا ہو اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں - (الروض الانف ص ۱۹۲ ج ۱)

اس تاریخی اور اہم واقعہ کے متعلق بعض آزاد خیال مصنفین اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دعوت مسیحی کی ابتدائی صدیوں ہی میں رہبانیت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور کچھ لوگ عبادت کے شوق میں پہاڑوں میں چھپ چھپ کر اپنی عمریں اسی طرح ختم کر دینے کے عادی ہو چکے تھے کچھ عرصہ کے بعد مختلف شکلوں سے جو عبادتیں وہ کرتے اسی حالت میں ان کا انتقال ہو جاتا اور آخر سوکھ سوکھ کر ان کے ڈھانچے اسی شکل پر رہ جاتے - یہ لکھ کر انہوں نے اس واقعہ کا سرا بھی محض اپنی قیاس آرائی سے اس مسیحی رہبانیت سے جا ملایا ہے اور پھر اسی مفروضہ صورت پر قرآنی آیات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اس کو پورے طور پر تاریخی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت تھی - یہاں صاحب معجم کا بیان تو یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بھی چار سو سال قبل کا واقعہ ہے - حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب اس قصہ کا چرچا یہود کے درمیان بھی تھا تو یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے یقیناً قبل کا ہے - لہٰذا بعض مفسرین کا اس کو عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا واقعہ کہنا درست نہیں ہو سکتا - البدایہ والنہایہ ص ۱۱۴ ج ۲ - اسی کے ساتھ انہوں نے عبادۃ بن صامتؓ سے ایک روایت پیش کیا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جب ان کو شاہ روم کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا گیا تو قسطنطنیہ کے ایک پہاڑ میں جا کر انہوں نے بہ چشم خود اصحاب کہف کو دیکھا تھا' پھر ان کا عدد و شمار' ان کی صورتیں اور ان کے لباس کی پوری تفصیل بھی بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک بھی ان کے جسم پورے طور پر محفوظ تھے یہ سب کچھ تحریر فرما کر صاحب معجم لکھتے ہیں "هذا ما نقلته من كتب الثقات و الله اعلم بصحته" معجم البلدان ص ۳۷۴ ج ۴ - ﷺ .....

يَهُوْدَ اَنْ نَسْأَلَهُ عَنْ اُمُوْرٍ فَاَخْبَرُوْهُمْ بِهَا فَجَاءُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ خَبِّرْنَا فَسَأَلُوْهُ عَمَّا اَمَرَ وَهُمْ بِهٖ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُخْبِرُكُمْ وَجَاءَ جِبْرَئِيْلُ مِنَ اللّٰهِ بِسُوْرَةِ الْكَهْفِ فِيْهَا خَبَرُ مَا سَأَلُوْهُ عَنْهُ مِنْ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ان سوالوں کا جواب بتائیے اور وہ سوالات ذکر کیے جو یہود نے ان کو بتائے تھے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان کا جواب دیتا ہوں- اس پر جبرئیل علیہ السلام سورۂ کہف لے کر تشریف لے آئے جس میں ان نوجوانوں کا اور اس سیاح شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آیت بھی نازل ہوئی ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ﴾

ﷺ..... حافظ سہیلیؒ نے ان کے جسموں کی بقاء اور عدم بقاء کے متعلق صرف ابن عباسؓ سے اتنا نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ باقی نہیں رہے تھے- ان حالات میں اس کو مسیحی رہبانیت کا نتیجہ قرار دے دینا اور اصحاب کہف کے اجسام کا عام انسانوں کی طرح سڑ گل کر برابر ہو جانا تاریخی بیان کے سراسر خلاف ہے رہا یہ کہ قرآنی آیات میں اس کے لیے کتنی گنجائش ہے تو اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں- پھر عجائبات قدرت کا صرف اصحاب کہف ہی ایک نمونہ نہ تھے بلکہ اس کی اور بہت مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا. (البقرہ: ۲۵۹)

مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جن کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی وہ بولے بھلا ایسی (برباد شدہ) بستی کو اللہ تعالیٰ پھر کہاں زندہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دے دی- اور وہ سو سال تک اسی طرح مردہ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا بتاؤ تم اس حالت میں کتنی مدت سے ہو؟ انہوں نے عرض کی دن بھر یا صرف چند گھنٹے گذرے ہوں گے- فرمایا نہیں تم پر سو سال اسی حالت میں گذر چکے ہیں اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کو دیکھو اس میں ذرا تغیر نہیں ہوا دوسری طرف اپنے گدھے کو دیکھو (کہ اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہیں) یہ سب اس لیے ہوا کہ ہم نے چاہا کہ تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں اب ان ہڈیوں کو دیکھو کس طرح ہم ان کو اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت پوست چڑھاتے ہیں-

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصحاب کہف کے قصہ میں بھی اپنی نیند کی مدت کے متعلق باہم سوال ہوا تھا "قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ" تم لوگ کتنی مدت اس حالت پر رہے- پھر ان کا جواب یہ تھا قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ - اور یہاں خدا تعالیٰ کے یہ برگزیدہ نبی جب دوبارہ جی اٹھے تو ان سے بھی سوال یہی ہوا "كَمْ لَبِثْتَ" جواب ان کا بھی یہی تھا "لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" (ایک دن یا ایک دن سے بھی کم) فرق یہ ہے کہ اس برگزیدہ رسول کو ان کی موت کی مدت بتا دی گئی اور اصحاب کہف کے متعلق صرف اتنی بات پر اکتفاء کی گئی "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" اسی طرح اصحاب کہف کے ساتھ بھی ایک جانور تھا اور یہاں بھی ایک جانور تھا- فرق یہ ہے ﷺ.....

اَمرِ الْغِیْبَةِ وَ الرَّجُلِ الطَّوَّافِ وَ قَوْلِ اللّٰهِ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ الخ . (ذکرہ محمد ابن اسحق کما فی الجواب الصحیح)

یہ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں- آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے-
(الجواب الصحیح)

(٩٨٣) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا أَرَادَ هُدٰی زَیْدِ ابْنِ سَعْنَةَ قَالَ زَیْدٌ لَمْ یَبْقَ شَیْءٌ مِنْ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا وَ قَدْ عَرَفْتُهَا فِیْ وَجْهِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ نَظَرْتُ اِلَیْهِ اِلَّا اِثْنَتَیْنِ لَمْ اُخْبَرْبِهِمَا مِنْهُ یَسْبِقُ عِلْمُهُ جَهْلَهُ وَ لَا یَزِیْدُهُ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَیْهِ اِلَّا حِلْمًا قَالَ فَکُنْتُ اَتَلَطَّفُ لَهُ لِاَنْ اُخَالِطَهُ

(٩٨٣) عبداللہ بن سلام کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے زید بن سعنہ کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا تو یوں ہوا کہ زید نے (اپنے دل میں کہا) کہ نبوت کی جتنی علامتیں تھیں وہ سب کی سب تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں پہچان چکا ہوں بجز دو علامتوں کے جن کے متعلق مجھ کو (ہنوز) کوئی بات معلوم نہیں ہوئی - ایک تو یہ کہ ان کی بردباری ان کی ترش مزاجی سے بہت بڑھی ہوئی ہوگی دوم یہ کہ جتنا ان کے ساتھ بگڑو گے اتنا ہی ان کی شانِ بردباری اور زیادہ ہوتی جائے گی- وہ کہتے ہیں کہ میں

للہ ..... کہ اصحابِ کہف کا کتا صحیح وسلامت موجود تھا لیکن ان بزرگ نبی کا کھانا تو بدستور تھا مگر ان کا گدھا گل سڑ کر برابر ہوگیا تھا- دونوں واقعات میں اللہ تعالیٰ کی زبردست نشانیاں موجود ہیں-مگر یہ ظاہر کہ جتنا مردہ انسان کا اتنی طویل مدت کے بعد پھر زندہ ہو جانا عجیب ہے چند افراد کا چند صدیاں حالتِ خواب میں رہ کر بیدار ہو جانا اتنا عجیب نہیں- اسی طرح ایک کتے کا اتنی طویل مدت تک صحیح وسالم رہنا اتنا بعید نہیں جتنا بعید کہ کھانے جیسے سریع الفساد چیز کا نہ سڑنا اور گدھے کا آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جانا عجیب ہے-اس لیے فرمایا ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ کَانُوْ امِنْ اٰیَاتِنَا عَجَبًا﴾ (الکهف :٩) کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری نشانیوں میں عجیب تھے- یعنی ہماری نشانیاں اور ہماری قدرت کے کرشمے اس سے بھی زیادہ عجیب درعجیب موجود ہیں- پس اگر ایک اصحابِ کہف کے عجیب قصہ کو دنیا کے واقعات کے عام سطح پر سمجھ لیا جائے تو بھی فائدہ کیا ہے جب تک کہ سارے قرآن کریم ہی کو از اول تا آخر بدلا نہ جائے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے انحطاط کے ہر دور میں دماغ اس کے درپے رہے ہیں کہ اس قسم کی تمام آیات پر بھی ہاتھ صاف کریں اور گویا اس طرح اپنے زعم باطل میں اسلام کو مادی عقول کے فہم کے لیے زیادہ سے زیادہ قریب لے آئیں مگر اس قسم کے واقعات قرآن کریم میں اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ اب تک یہ سعی نافرجام پوری نہیں ہوسکی- اسلام کی اس مزعوم خیر خواہی کے ساتھ ساتھ اس کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالنی بھی ضرور تھی کہ اگر قرآن کریم کے اوراق سے ان سب آیات کو اس طرح مسخ کر دیا گیا تو پھر اس میں دلائل ربوبیت کا حصہ کتنا باقی رہ جاتا ہے- اگر دنیا میں احیاء موتی کی ایک مثال بھی باقی نہیں رہتی تو پھر قیامت کے یقین اور خدا تعالیٰ کے اسم "الحیی" کا ثبوت کیا ہوگا؟

(٩٨٣) * چونکہ زید یہاں ایک معیاری آزمائش کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے انہوں نے آتے ہی ایسی ناشائستہ حرکات اور ایسے نازیبا کلمات منہ سے نکالنے شروع کر دیئے جن کو سن کر ایک مرتبہ تو ٹھنڈے سے ٹھنڈے انسان کی رگِ حمیت بھی بھڑک اٹھے- اوّل تو آتے ہی مجرم کی طرح آپ کو لپٹ گئے پھر کسی گفتگو کے بغیر نہ صرف آپ کی ذات بلکہ آپ کے سارے خاندان پر ایسی بات کا بٹہ لگانے للہ .....

فَاعْرِفُ حِلْمَهُ وَ جَهْلَهُ فَذَكَرَ قِصَّةَ اِسْلَافِهٖ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَا فِيْ ثَمْرَةٍ قَالَ فَلَمَّا حَلَّ الْاَجَلُ اَتَيْتُ فَاَخَذْتُ بِمَجَامِعِ قَمِيْصِهٖ وَ رِدَائِهٖ وَ هُوَ فِيْ جَنَازَةٍ مَعَ اَصْحَابِهٖ وَ نَظَرْتُ اِلَيْهِ بِوَجْهٍ غَلِيْظٍ وَ قُلْتُ يَا مُحَمَّدُ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اَلَا تَقْضِيْنِيْ حَقِّيْ؟ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُكُمْ بَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَمُطْلٌ قَالَ فَنَظَرَ اِلَى عُمَرَ وَ عَيْنَاهُ يَدُوْرَانِ فِيْ وَجْهِهٖ كَالْفَلَكِ الْمُسْتَدِيْرِ. ثُمَّ قَالَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَسْمَعُ وَ تَفْعَلُ مَا اَرٰى فَوَاللّٰهِ الَّذِيْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ لَوْ لَا اُحَاذِرُ لَوْمَهٗ لَضَرَبْتُ بِسَيْفِيْ رَاْسَكَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَى عُمَرَ فِيْ سُكُوْنٍ وَتُؤَدَةٍ وَ تَبَسُّمٍ. ثُمَّ قَالَ اَنَا وَ هُوَ كُنَّا اَحْوَجَ اِلَى غَيْرِ هٰذَا مِنْكَ يَا عُمَرُ اَنْ تَاْمُرَنِيْ بِحُسْنِ الْاَدَاءِ وَ تَاْمُرَهٗ بِحُسْنِ التِّبَاعَةِ اِذْهَبْ بِهٖ يَا عُمَرُ فَاقْضِهٖ حَقَّهٗ وَ زِدْ عِشْرِيْنَ

اس تدبیر میں لگا رہا کہ ذرا ان سے بے تکلفی پیدا کرلوں تو ان کی بردباری اور ترش مزاجی کا بھی کچھ اندازہ لگا لوں- اس کے بعد انہوں نے پھلوں کے معاملہ میں آپ کو کچھ مال قرض دینے کا قصہ ذکر کیا یہ بیان کرتے ہیں کہ جب قرض کی مدت پوری ہوگئی تو میں آپ کے پاس آیا اور میں نے آپ کے قمیص اور چادر کے کنارے پکڑ لیے اس وقت آپ اپنے کسی صحابی کے جنازہ میں جا رہے تھے اور میں نے خوب غصہ کا منہ بنا کر آپ کو دیکھا اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا حق کیوں ادا نہیں کرتے خدا کی قسم جہاں تک میرا تجربہ ہے تم سب عبدالمطلب والوں کی عادت قرض کے معاملہ میں یونہی ٹال مٹول کرنے کی ہے- یہ بیان کرتے ہیں یہ سن کر عمرؓ نے غضب ناک صورت میں میری طرف دیکھا اور مارے غصہ کے اس وقت ان کی آنکھیں چرخ دوار کی طرح تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں- اس کے بعد بولے او خدا کے دشمن تو آپ کی خدمت میں یہ بکواس کر رہا ہے اور میں سن رہا ہوں اور آپ کے ساتھ ایسی گستاخانہ حرکات بھی کر رہا ہے اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے اگر مجھے آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار ابھی تیرے سر پر رسید کرتا- ادھر عمرؓ یہ فرما رہے تھے' ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے سکون و وقار کے ساتھ ان کو دیکھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے- اس کے بعد آپ نے فرمایا تم مجھ کو اور اس کو ان باتوں کی بجائے کچھ اور سمجھاتے تو زیادہ مناسب ہوتا- مجھ سے یہ کہتے کہ اس کا قرض تاخیر کے بغیر پورا پورا ادا کردو'

؀ ...... لگے جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا' مگر جو ذات ہر کسوٹی پر کھری اور ہر امتحان میں پوری اتری تھی وہ یہاں بھی اپنا جوہر دکھائے بغیر نہ رہی یعنی اس سب کے بعد بھی یوں معلوم ہو رہا تھا گویا آپ کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں تھا- عمر رضی اللہ عنہ کی امتیانہ غیرت ہزار جوش مار رہی تھی مگر حلم نبوت کے سامنے کیا تاب و طاقت تھی چہرہ پر بل پر بل آتے رہے مگر نہ ایک قدم اپنی جگہ سے آگے ہلا سکے اور نہ کچھ سخت دست کہہ کر ہی دل کی بھڑاس نکال سکے- فداکاروں کی حالت تو یہ تھی اور جن کی خاطر یہ سارا غصہ تھا ان کی شان حلم یہ تھی کہ چہرہ مسکرا رہا تھا اور اسی حالت میں جو موتی دہن مبارک سے بکھرے وہ آپ کے خزانہ نبوت کے سچے گواہ بن کر بکھرے- سبحان اللہ وہ جماعت کدھر ہے جو کہتی ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے- حقیقت یہ ہے کہ جس کے سامنے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کچھ بھی رہی ہے اس کو آپ کی تصدیق میں کبھی ذرا پس و پیش نہیں ہوا- وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ

صاعا من تمر فاسلم زید بن سعنة و شهد بقیة المشاهد مع رسول الله صلی الله علیه وسلم و توفی عام تبوک رحمه الله تعالی

(رواه ابن کثیر فی البدایة ص ۳۱۰ ج ۲ و ابو نعیم فی الدلائل ابسط منه)

اور اس سے یہ کہتے کہ خوبصورتی کے ساتھ تقاضہ کر۔اے عمر جاؤ اور اس کا قرض ادا کر دو اور کھجور کے بیس صاع اس کو اور دے دینا۔آپ کی بردباری کا یہ نقشہ دیکھ کر زید اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور بقیہ جنگوں میں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہی رہے اور جس سال تبوک کی جنگ ہوئی تھی اس سال میں ان کی وفات ہوگئی۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(دلائل النبوۃ لابی نعیم)

(۹۸۴) عن ابی سلمة بن عبدالرحمن رضی الله تعالی عنه ان جابر بن عبدالله قال کنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم نجنی الکباث و ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال علیکم بالاسود منه فانه اطیبه قالوا اکنت ترعی الغنم قال و هل من نبی الا و قد رعاها.

(رواه البخاری)

(۹۸۴) ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ ایک موقع پر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درخت کے پھل توڑ رہے تھے آپ نے فرمایا دیکھو ان میں سے جو سیاہ ہوں وہ توڑنا کیونکہ وہی بہتر ہوتے ہیں۔اس ذیل میں صحابہؓ نے آپ سے پوچھا کیا آپ نے کبھی بکریاں چرائی ہیں (کیونکہ جنگل کے اس قسم کے پھلوں کا تجربہ بیشتر ایسے ہی لوگوں کو ہوتا تھا جن کو اس سلسلہ سے جنگل میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہو) آپ نے فرمایا ایسا کون نبی گذرا ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔(بخاری شریف)

(۹۸۵) عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال ما بعث الله الا رعی الغنم فقال اصحابه و انت فقال نعم کنت ارعاها علی قراریط لاهل مکة. (رواه البخاری)

(۹۸۵) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا ہے اس نے بکریاں ضرور چرائی ہیں صحابہؓ نے عرض کی کیا آپ نے بھی؟ آپ نے فرمایا جی ہاں میں بھی چند قیراط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(بخاری شریف)

(۹۸۵) * بکریاں چرانی ایک بہت ہی معمولی چیز ہے لیکن تاریخ نبوت میں چونکہ اس کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کا ثبوت بھی ملنا ضروری تھا۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ بکریاں چرانا نبوت کے ایسے لوازم میں سے ہے کہ ہر چرواہا نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو نبی ہوا ہے اس کی زندگی میں یہ جزئی ضرور پیش آئی ہے۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بکریاں چرانا خود قرآن کریم کے اشارات سے ثابت ہے۔اب رہی یہ بحث کہ بکریاں چرانے کی اتنی اہمیت کیا ہے یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔اس پر علماء نے علیحدہ بحث کی ہے۔اتنا سب جانتے ہیں کہ طبیعت کو غم کا خوگر بنانے کے لیے مشکل سے شاید کوئی دوسری ٹریننگ اس سے زیادہ مؤثر ہوتی کہ فارسی زبان میں یہ ایک مثل ہی بن گئی ہے کہ ''غم نہ داری بز بخر'' پھر انجیل میں ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بازبان مبارک سے بنی اسرائیل کو جگہ جگہ بھیڑوں کے لفظ سے خطاب کیا گیا ہے گویا ایک گمراہ امت کا نقشہ سمجھنے کے لیے جو کسی ایسے میدان میں نکل گئی ہو جہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو اور پھر چاروں طرف سے ڈاکوؤں اور قزاقوں میں گھر گئی ہے بکریوں للہ .....

(۹۸۶) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ اَبُوْذَرٍّ خَرَجْنَا مِنْ قَوْمِنَا غِفَارٍ وَ كَانُوْا يُحِلُّوْنَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ فَخَرَجْتُ اَنَا وَ اَخِيْ اُنَيْسٌ. فَنَزَلْنَا عَلٰى خَالٍ لَنَا فَاَكْرَمَنَا وَ اَحْسَنَ اِلَيْنَا فَقَالَ اُنَيْسٌ اِنَّ لِيْ حَاجَةً بِمَكَّةَ فَانْطَلَقَ اُنَيْسٌ حَتّٰى اَتٰى مَكَّةَ فَقُلْتُ مَا صَنَعْتَ قَالَ لَقِيْتُ رَجُلًا بِمَكَّةَ يَزْعُمُ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَهُ قُلْتُ فَمَا يَقُوْلُ النَّاسُ قَالَ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ كَاهِنٌ سَاحِرٌ وَ كَانَ اُنَيْسٌ اَحَدَ الشُّعَرَاءِ قَالَ اُنَيْسٌ لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ فَمَا هُوَ بِقَوْلِهِمْ وَ لَقَدْ وَضَعْتُ قَوْلَهُ عَلٰى اَقْرَاءِ الشُّعَرَاءِ فَمَا يَلْتَئِمُ وَ عَلٰى لِسَانِ اَحَدٍ يَقْرِئُ بَعْدِيْ اَنَّهُ شِعْرٌ وَ اللّٰهِ اِنَّهُ لَصَادِقٌ وَ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ و ذكر القصة و صفة اسلامه. (رواه الشيخان)

(۹۸۶) عبداللہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا میں اور میرے بھائی انیس اپنی قوم غفار کے ساتھ ایک مرتبہ سفر کے لیے نکلے اور اپنے ماموں کے یہاں جا کر مہمان ہوئے' انہوں نے ہمارا بڑا اعزاز و اکرام کیا- انیس نے کہا مجھے مکہ میں کچھ کام ہے یہ کہہ کر انیس چل پڑے یہاں تک کہ مکہ پہنچ گئے (واپسی پر) میں نے کہا آپ نے وہاں کیا کام کیا؟ انہوں نے کہا وہاں میں نے ایک شخص سے ملاقات کی جس کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے میں نے کہا اچھا تو ان کے متعلق لوگوں کا خیال کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے' کاہن ہے' جادوگر ہے' یہ انیس خود بھی شاعر تھے- انیس کہنے لگے- میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ ان کا سا کلام نہیں ہے اور میں نے اس کو شعراء کے اوزان پر بھی رکھ کر دیکھا تو کسی ایک وزن کے رنگ سے میل نہیں کھاتا- خدا کی قسم وہ یقیناً سچے ہیں جو لوگ یہ باتیں بناتے ہیں وہ سب جھوٹ کہتے ہیں- اس کے بعد اپنے مشرف با سلام ہو جانے کا سب قصہ بیان کیا-

(شیخین)

(۹۸۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ الْمَلَاُ وَ اَبُوْ جَهْلٍ لَقَدْ غَلَبَنَا اَمْرُ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَلَوِ الْتَمَسْتُمْ رَجُلًا عَالِمًا بِالشِّعْرِ وَ الْكَهَانَةِ وَ

(۹۸۷) جابر بیان کرتے ہیں کہ ابوجہل اور اس کے سب اہل محفل نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ نے تو ہم کو اب عاجز کر دیا ہے- کوئی آدمی ایسا تلاش کرو جو شعر و سخن' کہانت اور جادو کا ماہر ہو وہ اس کے پاس جائے اور پھر ہم سے آ کر حقیقت حال بیان کرے- اس پر عتبہ نے کہا خدا

لله ...... کے اس گلہ سے زیادہ کوئی اور دوسرا صحیح نقشہ نہیں ہو سکتا جو ایک بے آب و گیاہ میدان میں بھیڑیوں کے بیچ میں جا پھنسا ہو- ظاہر ہے کہ ایک طرف ان کی ناسمجھی' دوسری طرف بھیڑیوں سے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر ان کے بقاء حیات کے لیے ایسے محل میں خورد و نوش کا انتظام کرنا یہ کتنی دردسری' کتنی دردمندی اور کتنے نظم و ہوشیاری کا محتاج ہوگا اس لیے انبیاء علیہم السلام کو انسانوں کے حوالے کرنے سے قبل تھوڑی سی ٹریننگ حیوانات سے شروع کی جاتی ہے تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے پہلے سے خوگر ہو جائیں- وہ اپنی امت کو محرمات کی چراگاہوں سے بچا بچا کر حلال کے میدانوں میں لے جائیں اور جوان سے بھاگ کر محرمات میں منہ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو پکڑ پکڑ کر کھینچ لیں- اس جگہ حدیث نمبر ٦٦ اور اس کا نوٹ جلد اول ''ترجمان السنہ'' میں ضرور ملاحظہ فرمالیں- اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا حال سمجھنے کے لیے چراغ میں جلنے والے پروانوں اور ان کے بچانے والوں کا نقشہ بیان فرمایا گیا ہے اور قابل ملاحظہ ہے-

السِّحْرِ فَاَتَاهُ فَكَلَّمَهُ فَاَتَانَا بِبَيَانٍ مِنْ اَمْرِهٖ قَالَ عُتْبَةُ بْنُ رَبِيْعَةَ وَ اللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ الشِّعْرَ وَ الْكِهَانَةَ وَ السِّحْرَ وَ عَلِمْتُ مِنْ ذٰلِكَ عِلْمًا فَمَا يَخْفٰى عَلَيَّ اِنْ كَانَ ذٰلِكَ فَاَتَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ فَلَمَّا فَرَغَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتَابٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهُ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقَالَ ﴿اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ﴾ (فصلت: ١-١٣) فَاَمْسَكَ عُتْبَةُ عَلٰى فِيْهِ وَ نَاشَدَهٗ بِالرَّحِمِ اَنْ يَكُفَّ وَ رَجَعَ اِلٰى اَهْلِهٖ فَلَمْ يَخْرُجْ اِلٰى قُرَيْشٍ فَاحْتَبَسَ عَنْهُمْ عُتْبَةُ فَقَالَ اَبُوْجَهْلٍ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ وَ اللّٰهِ مَا نَرٰى عُتْبَةَ اِلَّا قَدْ صَبَى اِلٰى مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَاَتَاهُ اَبُوْجَهْلٍ فَقَالَ يَا عُتْبَةُ مَا حَبَسَكَ عَنَّا اِلَّا اَنَّكَ صَبَوْتَ اِلٰى مُحَمَّدٍ فَغَضِبَ وَ اَقْسَمَ اَنْ لَّا يُكَلِّمَ مُحَمَّدًا اَبَدًا وَ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّيْ مِنْ اَكْثَرِ قُرَيْشٍ مَالًا وَ لٰكِنِّيْ وَ قَصَصْتُ عَلَيْهِ الْقِصَّةَ فَاَجَابَنِيْ بِشَيْءٍ وَ اللّٰهِ مَا هُوَ بِشِعْرٍ وَ لَا كَهَانَةٍ وَ لَا سِحْرٍ (رواه ابن مردويه فی کتاب التفسير و يحيی بن معين و ابو يعلی فی مسنده و رواه عبد بن حميد عن شيخ ابی يعلی كما فی الجواب الصحيح ص ٤٥ ج ٤. و راجع قصة ضماد من ترجمان السنة ص ١٦٤ ج ٢)

کی قسم میں نے شعر، کہانت اور سحر سب سنے ہیں اور مجھے ان کا اچھا علم حاصل ہے اگر ان میں سے کوئی بات بھی ہوگی تو وہ مجھ سے چھپ نہ سکے گی۔ عتبہ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا (اور آپؐ سے طرح طرح کی لالچ کی باتیں کرنے لگا۔ آپؐ سب خاموش سنتے رہے) جب وہ سب کہہ چکا تو اس کے جواب میں آپؐ نے سورۂ حم سجدہ کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں یہاں تک کہ جب پڑھتے پڑھتے آپ ان آیتوں پر پہنچے ﴿فَقَدْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ﴾ (فصلت: ١-١٣) (جس میں یہ جتایا گیا تھا کہ اگر باز نہ آؤ گے تو پھر عاد وثمود کی طرح برباد ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ) تو (عتبہ کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ عذاب اب آیا چاہتا ہے) اس نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی قرابت اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا آپ اور آگے نہ پڑھیں وہ اپنے گھر آ کر بیٹھ رہا اور قریش کے پاس ہی نہ گیا اور مدت تک ان سے ملاقات نہیں کی۔ اس پر ابوجہل نے کہا خدا کی قسم ہمارا خیال ہے ضرور عتبہ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ابوجہل اس کے پاس گیا اور کہا۔ عتبہ! کہو ہم سے کیوں نہیں ملتے، یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ تم بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب ڈھل گئے ہو۔ اگر کچھ ضرورت ہو تو ہم تم کو مال جمع کر کے دے دیں تاکہ تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے سے بے نیازی ہو جائے۔ یہ سن کر وہ غصہ میں بھر گیا اور قسم کھائی کہ محمدؐ سے آئندہ کبھی بات چیت بھی نہ کرے گا۔ اور کہا تم جانتے ہو کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مال دار آدمی ہوں لیکن بات یہ ہوئی کہ جب میں ان کے پاس گیا۔ اس کے بعد پورا واقعہ بیان کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھ کو ایسا کلام سنایا جو نہ شعر تھا نہ کہانت اور نہ جادو اور سورۂ حم سجدہ کی آیتیں مجھے سنائیں جب اس میں پہلی قوموں کے عذاب کا ذکر آیا تو میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ان کو اپنی قرابت کا واسطہ دیا کہ بس آگے نہ پڑھیں۔ تم سب جانتے ہو کہ محمدؐ جب کوئی بات منہ سے نکالتے ہیں تو اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ ڈر ہو گیا تھا کہیں تم پر بھی عذاب نہ آئے۔ (تفسیر ابن مردویہ، کذا فی الجواب الصحیح)

(٩٨٨) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَامَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ وَ اللّٰهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ اَمْرٌ مَا ابْتُلِيْتُمْ بِمِثْلِهٖ لَقَدْ كَانَ مُحَمَّدٌ فِيْكُمْ غُلَامًا حَدَثًا اَرْضَاكُمْ فِيْكُمْ وَ اَصْدَقَكُمْ حَدِيْثًا وَ اَعْظَمَكُمْ اَمَانَةً حَتّٰى اِذَا رَاَيْتُمْ فِيْ صُدْغِهِ الشَّيْبَ وَ جَاءَكُمْ بِمَا جَاءَكُمْ بِهٖ قُلْتُمْ سَاحِرٌ لَا وَ اللّٰهِ مَا هُوَ بِسَاحِرٍ قَدْ رَاَيْنَا السَّحَرَةَ وَ نَفْثَهُمْ وَ عُقَدَهُمْ وَ قُلْتُمْ كَاهِنٌ لَا وَ اللّٰهِ مَا هُوَ بِكَاهِنٍ قَدْ رَاَيْنَا الْكَهَنَةَ وَ سَمِعْنَا سَجْعَهُمْ وَ قُلْتُمْ شَاعِرٌ لَا وَ اللّٰهِ مَا هُوَ بِشَاعِرٍ لَقَدْ رُوِّيْنَا الشِّعْرَ وَ سَمِعْنَا اَصْنَافَهٗ كُلَّهَا مَخْرَجَهٗ وَ رَجَزَهٗ وَ قَرِيْضَهٗ وَ قُلْتُمْ مَجْنُوْنٌ وَ لَا وَ اللّٰهِ مَا هُوَ بِمَجْنُوْنٍ لَقَدْ رَاَيْنَا الْمَجْنُوْنَ فَمَا هُوَ بِخَنَقِهٖ وَ لَا تَخْلِيْطِهٖ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اُنْظُرُوْا فِيْ شَانِكُمْ فَاِنَّهٗ وَ اللّٰهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ اَمْرٌ عَظِيْمٌ وَ كَانَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ مِنْ شَيَاطِيْنِ قُرَيْشٍ وَ مِمَّنْ يُؤْذِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَنْصِبُ لَهُ الْعَدَاوَةَ.

(رواه ابن اسحاق كما في الجواب الصحيح)

(٩٨٩) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الْوَلِيْدَ بْنَ الْمُغِيْرَةِ اجْتَمَعَ وَ نَفَرٌ مِنْ قُرَيْشٍ وَ كَانَ ذَاسِنٍّ فِيْهِمْ وَ قَدْ حَضَرَ الْمَوْسِمُ فَقَالَ اِنَّ

(٩٨٨) ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ نضر بن الحارث کھڑا ہو کر بولا! اے جماعت قریش خدا کی قسم تم اس وقت ایک ایسی آزمائش میں پھنس گئے ہو کہ اس سے پہلے کبھی نہ پھنسے تھے- تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ہی میں کے ایک نوجوان شخص ہیں جو تم میں سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر امانت دار شخص تھے یہاں تک کہ جب ان کی عمر پختہ ہوگئی اور ان کی کنپٹیوں میں تم نے بڑھاپے کی سفیدی دیکھ لی اور تمہارے پاس دین لے کر وہ آئے تو اب تم نے ان کو جادوگر کہہ دیا- خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہو سکتے، ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے نہ تو ان کی طرح سے وہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور نہ ان کی طرح گنڈے بناتے ہیں اور کبھی تم نے ان کو کاہن ٹھہرایا خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے کاہن بھی بہت دیکھے ہیں اور ان کی تک بندیاں بھی سنی ہیں اور کبھی تم نے ان کو شاعر کہا خدا کی قسم وہ شاعر بھی نہیں ہمارے سامنے شعر کی روایات بھی ہیں اور ہم نے ان کی سب اقسام سنی ہیں (ان کا کلام نہ تو کاہنوں کے سجع بندیوں سے ملتا ہے نہ شاعروں کے شعروں سے) تم میں کسی نے ان کو مجنون بھی قرار دیا- خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں ہم نے دیوانے بہت دیکھے ہیں، دیوانوں کی ایک علامت بھی ان میں نہیں- نہ ان کی سی بے ہوشی ان پر طاری ہوتی ہے نہ یہ ان کی سی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں- اے قریش کی جماعت اپنے معاملہ میں ذرا پورے غور سے کام لو، بخدا تم بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہو- راوی بیان کرتا ہے یہ نضر بن حارث قریش بھر میں پرلے درجہ کا شیطان شخص تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکالیف دیتا اور آپ کی دشمنی کے سامان تیار کرتا تھا- (محمد ابن اسحٰق)

(٩٨٩) ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ولید بن المغیرۃ اور قریش کے چند افراد ایک جگہ جمع ہوئے حج کا موسم سر پر آ چکا تھا چونکہ یہ ولید بن مغیرہ عمر میں ان سب سے بڑا تھا اس لیے بولا ابھی اب عرب کے لوگ تمہارے پاس ان

(٩٨٩) * بادشاہ، راہب اور اہل کتاب علماء کی چند آراء آپ نے ملاحظہ کرلیں - اب یہ عرب کے چند ہوش مندوں کے واقعات لله .....

وفود العرب ستقدم عليكم فيه و قد سمعوا بأمر صاحبكم هذا فاجمعوا فيه رأيا واحدا و لا تختلفوا فيكذب بعضكم بعضا و يرد بعضكم قول بعض فقالوا فانت يا ابا عبد شمس فقل و اقم لنا رأيا نقوم به فقال بل انتم فقولوا و انا اسمع فقالوا نقول كاهن فقال ما هو بكاهن لقد رأيت الكهان فما هو بزمزمة الكهان فقالوا نقول مجنون فقال ما هو بمجنون ر أينا المجنون و عرفناه فما هو بخنقه و لا تخالجه و لا وسوسته قالوا فنقول شاعر فقال ما هو بشاعر قدعرفنا الشعر برجزه و هجزه و و قريضه و مقبوضه و مبسوطه فما هو بالشعر قالوا فنقول ساحر قال فما هو بساحر قد رأينا السحار و سحرهم فما هو بنفثه و عقده فقالوا ما نقول يا ابا عبد

ایام میں آئیں گے اور یقیناً ان کو تمہارے اس ہم وطن شخص کی خبریں پہنچ گئی ہوں گی تو تم سب مل کر ایک بات طے کر لو ایسا نہ ہو کہ ان کے جواب میں کہیں باہم اختلاف پھیلاؤ اور خود ایک دوسرے ہی کی تکذیب کرنے لگو انہوں نے کہا اے ابوعبد شمس (ولید کی کنیت تھی) پھر آپ ہی ایک آخری رائے بتا دیں ہم سب اسی پر متفق ہو جائیں گے اس نے کہا نہیں پہلے تم ہی بولو اور میں سنوں گا وہ بولے ہم یہ کہیں گے کہ یہ شخص کاہن ہے' وہ بولا کاہن تو نہیں ہے میں نے کاہنوں کو دیکھا ہے ان کا کلام کاہنوں کے منتروں کی طرح نہیں ہے جو یہ لوگ گنگنا گنگنا کر پڑھا کرتے ہیں- وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے وہ دیوانہ ہے اس نے کہا دیوانہ بھی نہیں- ہم نے دیوانوں کو بھی دیکھا ہے اور ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں نہ تو دیوانوں کی طرح ان کا دم بند ہوتا ہے نہ یہ ان کی سی بہکی بہکی بے ربط باتیں کرتے ہیں نہ دیوانوں کی طرح ان کے مزاج میں دسواس ہے' وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے یہ شاعر ہے- اس نے کہا یہ شاعر بھی نہیں- ہم نے شعر کے جتنے اقسام ہیں سب دیکھے ہیں' ان کا کلام شعر کے وزنوں میں سے کسی وزن کے ساتھ نہیں ملتا- وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے یہ جادوگر ہیں- اس نے کہا میں نے بہت سے جادوگر بھی دیکھے ہیں اور ان کے جادو بھی دیکھے ہیں نہ تو ان کی طرح یہ منتر

بقیہ...... ہیں جن سے آپ یہ اندازہ فرمالیں گے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں کوئی دشواری پیش آئی تھی یا کچھ مشکلات تھیں تو آپ کے انکار کرنے میں تھیں- اگر واقعات سے یہی ایک بات ثابت ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت اس درجہ بدیہی ہوتی ہے کہ ان کے انکار کرنے کے لیے کوئی حیلہ بہانہ بنانا بھی آسان نہیں ہوتا تو پھر آپ بھی یہاں عقلی بحث اور خیالی پرواز کو چھوڑ کر تاریخ نبوت کے مطالعہ پر وقت کیوں صرف نہیں فرماتے دیکھئے یہاں مکہ کے مشرک کس صفائی سے کہہ رہے ہیں کہ کاہن اور ساحر کی نوع دنیا میں ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہے ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں- یہ شخص ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے- اگر ہم ان میں سے کوئی بات بھی کہیں گے تو وہ اپنے کذب پر خود شاہد ہو گی کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبوت کا معاملہ کس درجہ واضح اور صاف ہوتا ہے یہاں اگر آپ ان سے سحر کی حقیقت اور کہانت کی ماہیت پر بحث شروع کر دیں تو ان غریبوں کو شاید اس کی ابتدائی معلومات بتانا بھی مشکل ہو جائیں لیکن ساحر اور کاہنوں کو وہ آپ سے زیادہ جانتے پہچانتے تھے- کیونکہ یہ انواع ان کے درمیان ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں اور ان کے ساتھ ان کا قدیم سے تعارف رہا ہے اس لیے نبی اور ساحر کے درمیان ان کو کوئی التباس نہیں ہوا اور ان چند جملوں ہی میں جس سادگی کے ساتھ انہوں نے مجنون' ساحر اور کاہنوں کی خصوصیات ادا کر دی ہیں محض عقلی اعتبار سے ان پر بحث کرنے والے شاید طویل دفتروں میں بھی ان کو ادا نہ کر سکیں-

شَمْسٍ قَالَ وَ اللّٰهِ اِنَّ لِقَوْلِهٖ حَلَاوَةً وَ اِنَّ اَصْلَهٗ لَغَدَقٌ وَ اِنَّ فَرْعَهٗ لَجَنِیٌّ فَمَا اَنْتُمْ بِقَائِلِیْنَ مِنْ هٰذَا شَیْئًا اِلَّا عُرِفَ اَنَّهٗ بَاطِلٌ وَ فِیْ لَفْظٍ اِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَ اِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَ مَا یَقُوْلُ هٰذَا الْبَشَرُ وَ فِیْ لَفْظٍ اِنَّهٗ لَیَعْلُوْ وَ مَا یُعْلٰی وَ اَنَّهٗ لَیَحْطِمُ مَا تَحْتَهٗ. (رواه عبد الرزاق و روى ابن اسحاق قصة النضر بن الحارث نحوه كما سيجيء)

(۹۹۰) عَنْ رُكَانَةَ بْنِ عَبْدِ یَزِیْدَ وَ كَانَ مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ غُنَیْمَةٍ لِاَبِیْ طَالِبٍ نَرْعَاهَا فِیْ اَوَّلِ مَا رَاٰی، اِذْ قَالَ لِیْ ذَاتَ یَوْمٍ هَلْ لَكَ اَنْ تُصَارِعَنِیْ قُلْتُ لَهٗ اَنْتَ قَالَ اَنَا فَقُلْتُ عَلٰی مَاذَا قَالَ عَلٰی شَاةٍ مِنَ الْغَنَمِ فَصَارَعْتُهٗ فَصَرَعَنِیْ فَاَخَذَ مِنِّیْ شَاةً ثُمَّ قَالَ لِیْ هَلْ لَكَ فِی الثَّانِیَةِ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَعْتُهٗ فَصَرَعَنِیْ فَاَخَذَ مِنِّیْ شَاةً فَجَعَلْتُ اَلْتَفِتُ هَلْ

پڑھتے ہیں نہ گنڈے بناتے ہیں- وہ بولے اے ابوعبد شمس تو اب آپ ہی فرمایئے ہم کہیں تو کیا کہیں اس نے کہا خدا کی قسم ان کے کلام میں غضب کی شیرینی ہے' اس کا باطن دیکھو تو چشمہ کی طرح ابل رہا ہے اور ظاہر دیکھو تو پھل دار درخت کی طرح بار آور ہے- ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کہو گے وہ فوراً معلوم ہو جائے گی کہ بالکل غلط ہے' یہ کلام بشر کا ہے ہی نہیں' وہ سب پر غالب آ جاتا ہے اور کسی سے مغلوب نہیں ہوتا' یوں معلوم ہوتا ہے کہ تہ تک اس کے سب تختے پھٹے ہوئے ہیں کہ اس کی تہ کا پتہ ہی نہیں لگتا-

(۹۹۰) رکانہ سے روایت ہے اور یہ لوگوں میں سب سے قوی مشہور تھے کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی چند بکریوں کو چرا رہے تھے- یہ بات آپ کی نبوت کے شروع شروع کی ہے ایک دن آپؐ نے فرمایا کیا مجھ سے کشتی لڑتے ہو؟ میں نے کہا اچھا کیا آپؐ سے؟ آپؐ نے فرمایا جی ہاں مجھ سے- میں بولا اچھا کیا دو گے آپؐ نے فرمایا جو جیتے اس کی ایک بکری- میں نے آپؐ سے کشتی کی آپؐ نے مجھے زیر کر دیا اور مجھ سے ایک بکری لے لی- پھر مجھ سے فرمایا کیا دوبارہ پھر کشتی لڑو گے؟ میں بولا بہت اچھا- میں نے پھر آپؐ سے کشتی کی- آپؐ نے پھر مجھ کو زیر کر دیا اور ایک بکری مجھ سے اور لے لی- اس مرتبہ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہیں

---

(۹۹۰) * ہر صاحب ہنر اپنے ہنر پر نازاں ہوتا ہے اور پھر جتنا اس ہنر میں اس کی فوقیت مسلّم ہوتی ہے اتنا ہی اس پر اس کا ناز بڑھتا چلا جاتا ہے- حتیٰ کہ آخر کار مثل مشہور کے مطابق ہمچو ما دیگرے نیست اس کے دماغ میں اپنی یکتائی کا غرور پیدا ہو جاتا ہے اب سوچئے کہ جس ماحول میں تعلیم و تعلم کا حرف نہ ہو کسی کو متاثر کرنے کے لیے کیا اس سے زیادہ بھی کوئی اور بات مؤثر ہو سکتی تھی- اسی لیے اس کے قلب پر اس کا سکہ اس طرح جم چکا تھا کہ آپ کے دعوئے نبوت کی شہرت کے بعد اس کے دل کا مرہم بن گئی- اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اس تمام معاملہ سے آپ کا اصل مقصد کیا تھا اور جب آپ نے سب سے پہلے اس کی بکریاں اس کے حوالہ کر دیں تو یہ بات پورے طور پر صاف ہو گئی کہ اس ہار جیت کا راز کچھ اور ہی تھا نہ آپ کو اپنی طاقت کا اظہار مقصود تھا اور نہ چند بکریوں کے حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ تھی- اس واقعہ سے عرب کی بلند فطرت کا بھی اندازہ لگانا چاہیے کہ رکانہ کو سب سے بڑا غم یہ تھا کہ مالک کو اس کی بکریوں میں اپنی اس خیانت کا جواب کیا دوں گا یہ قصہ حضرت عباسؓ سے باسناد جید بھی مروی ہے- اس میں اس طرح سے ہے کہ جب تین بار وہ زیر ہو گیا تو اس نے فوراً آپ کی نبوت کا یقین کر لیا تھا- علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصارعت کے چند واقعات اور بھی نقل کیے ہیں- ابو رکانہ' ابو اسد جمحی جیسا کہ سہیلی اور بیہقی اور ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے- (حاشیہ شفاء ص ۶۹)

يَرانِيْ اِنسانٌ فَقَالَ مَالَكَ قُلْتُ لَايَرانِيْ بَعْضُ الرَّعَاةِ فَيَجْتَرِءُوْنَ عَلَيَّ وَ اَنَا مِنْ اَشَدِّهِمْ قَالَ هَلْ لَكَ فِي الصِّرَاعِ الثَّالِثَةِ وَ لَكَ شَاةٌ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَعْتُهٗ فَصَرَعَنِيْ وَ اَخَذَ مِنِّيْ شَاةً فَقَعَدْتُ كَئِيْبًا حَزِيْنًا فَقَالَ مَالَكَ قُلْتُ اِنِّيْ اَرْجِعُ اِلٰى عَبْدِ يَزِيْدَ وَ قَدْ اَعْطَيْتُ ثَلَاثًا مِّنْ غَنَمِهٖ وَ الثَّانِيَةُ اَنِّيْ كُنْتُ اَظُنُّ اَنِّيْ اَشَدُّ قُرَيْشٍ فَقَالَ هَلْ لَكَ فِي الرَّابِعَةِ فَقُلْتُ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَقَالَ اَمَّا لَكَ فِي الْغَنَمِ فَاِنِّيْ اَرُدُّهَا عَلَيْكَ فَرَدَّ عَلَيَّ فَلَمْ يَلْبَثْ اَنْ ظَهَرَ اَمْرُهٗ فَاَتَيْتُهٗ فَاَسْلَمْتُ فَكَانَ مِمَّا هَدَانِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنِّيْ عَلِمْتُ اَنَّهٗ لَمْ يُصْرِعْنِيْ يَوْمَئِذٍ بِقُوَّتِهٖ وَ لَمْ يُصْرِعْنِيْ يَوْمَئِذٍ اِلَّا بِقُوَّةِ غَيْرِهٖ. رواه البيهقي و قد اخرجه من طريق ابن اسحاق عن ابيه و ابي امامة ايضا و اخرجه ابو نعيم ايضا كذا في الخصائص ص ١٢٩ ج ١ قال ابن كثير اخرجه ابو داؤد و الترمذي ثم اخرجه من رواية ابي بكر الشافعي عن ابن عباسؓ بنحوه و قال اسناده جيد. (البداية و النهاية ص ١٠٤ ج ٣)

مجھ کو پچھڑتے ہوئے کوئی دیکھ تو نہیں رہا- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا دیکھ رہے ہو- میں نے کہا یہ دیکھ رہا ہوں میں کہ مجھ کو کہیں کوئی اور بکری چرانے والا دیکھ نہ رہا ہو اور میرے مقابلہ کی اس کو بھی ہمت ہو جائے کیونکہ میں سب سے زوردار آدمی مشہور ہوں- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اچھا تیسری بار پھر لڑتے ہو اور جیتو گے تو ایک بکری ملے گی- میں بولا بہت اچھا- میں نے پھر کشتی کی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر مجھ کو زیر کر دیا اب تو میں غمگین ہو کر بیٹھ گیا- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا غمگین کیوں ہو- میں نے کہا: سب سے پہلے تو اس بات پر کہ جب میں عبد یزید کی بکریاں لے کر واپس ہوں گا تو ان میں تین بکریاں جو میں آپ کو دے چکا ہوں (وہ کم ہوں گی) دوسری بات یہ ہے کہ مجھ کو یہ بڑا گھنڈ تھا کہ قریش میں سب سے زیادہ مضبوط آدمی میں ہوں (مگر آج اس کے خلاف نکلا) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اچھا چوتھی بار پھر کشتی کرتے ہو؟ میں نے کہا کیا اب تین بار پٹ جانے کے بعد بھی- آپؐ نے فرمایا اچھا لو بکریوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ میں تم کو سب واپس کیے دیتا ہوں- چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ سب واپس کر دیں پھر اس کے متصل ہی آپ کی نبوت کا شہرہ ہو گیا اس وقت میں آپ کی خدمت میں آیا اور مشرف با سلام ہو گیا- اور میرے اسلام کا باعث یہی بات تھی کہ میں یقین کر چکا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنی طاقت سے زیر نہیں کیا بلکہ ضرور کسی اور دوسری (الٰہی) طاقت سے زیر کیا ہے-

(بیہقی وغیرہ)

(۹۹۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرِّ النَّاسِ يَمُرُّبِنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَا لِلنَّاسِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُوْلُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَهٗ

(۹۹۱) عمرو بن سلمہ کہتے ہیں- ہم ایک ایسے پانی پر ٹھہرے ہوئے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر واقع تھا- ان کے قافلے ہماری طرف سے گذرتے تو ہم ان سے دریافت حال کے لیے پوچھا کرتے کہ لوگوں کا اب کیا رنگ ہے

---

(۹۹۱) * غیر تعلیم یافتہ اشخاص اکثر بھیڑ چال ہوا کرتے ہیں- ان کا معیار تصدیق ہی کیا- اس لیے عرب کے عام لوگوں نے اپنے نزدیک آپ کی نبوت کے لیے یہی ایک معیار بنا رکھا تھا کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آ گئے تو بس یہی آپ کی صداقت کی سب سے ......

اَوْحیٰ اِلَیْہِ اَوْحیٰ اِلَیْہِ کَذَا فَکُنْتُ اَحْفَظُ ذٰلِکَ الْکَلَامَ فَکَاَنَّمَا یُغْرٰی فِیْ صَدْرِیْ وَ کَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِاِسْلَامِھِمُ الْفَتْحَ فَیَقُوْلُوْنَ اُتْرُکُوْہُ وَ قَوْمَہٗ فَاِنَّہٗ اِنْ ظَھَرَ عَلَیْھِمْ فَھُوَ نَبِیٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا کَانَتْ وَقْعَۃُ الْفَتْحِ بَادَرَ کُلُّ قَوْمٍ بِاِسْلَامِھِمْ وَ بَدَرَ اَبِیْ قَوْمِیْ بِاِسْلَامِھِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُکُمْ وَ اللّٰہِ مِنْ عِنْدِ النَّبِیِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوْا صَلٰوۃَ کَذَا فِیْ حِیْنِ کَذَا وَ صَلٰوۃَ کَذَا فِیْ حِیْنِ کَذَا فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ فَلْیُؤَذِّنْ اَحَدُکُمْ فَلْیَؤُمَّکُمْ اَکْثَرُکُمْ قُرْاٰنًا فَنَظَرُوْا فَلَمْ یَکُنْ اَحَدٌ اَکْثَرَ قُرْاٰنًا مِنِّیْ لِمَا کُنْتُ اَتَلَقّٰی مِنَ الرُّکْبَانِ فَقَدَّمُوْنِیْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَنَا ابْنُ سِتٍّ اَوْ سَبْعِ سِنِیْنَ وَ کَانَتْ عَلَیَّ بُرْدَۃٌ کُنْتُ اِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصَتْ عَنِّیْ فَقَالَتِ امْرَاَۃٌ مِنَ الْحَیِّ اَلَا تُغَطُّوْنَ عَنَّا اِسْتَ قَارِئِکُمْ فَاشْتَرَوْا لِیْ قَمِیْصًا فَمَا فَرِحْتُ بِشَیْءٍ فَرَحِیْ بِذٰلِکَ الْقَمِیْصِ۔

(رواہ البخاری)

اور اس شخص کی کیا خیر خبر ہے۔ لوگ کہتے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے وہ ان پر وحی نازل فرماتا ہے چنانچہ اب ان پر یہ یہ آیتیں تازہ تازہ اتری ہیں۔ میں ان آیتوں کو (سنتا اور) چپکے سے یاد کر لیتا۔ اور وہ مجھ کو اس طرح یاد ہو جاتیں جیسے میرے سینہ میں نقش ہو گئی ہیں۔ ادھر عرب کے لوگ اسلام قبول کرنے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کہتے تھے ابھی ان کو اور ان کی قوم کو نبٹ لینے دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ گئے تو بس جان لو کہ وہ سچے نبی ہیں۔ جب یوں ہوا کہ مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو اب مسلمان ہونے کے لیے لوگ دوڑ پڑے۔ میرے والد اپنی قوم سے پہلے لپک کر مشرف با سلام ہو گئے اور اپنی قوم سے آ کر کہا بخدا میں تمہارے پاس ایک سچے نبی کے دربار سے آ رہا ہوں ان کا حکم یہ ہے کہ فلاں نماز اس وقت میں اور فلاں اس وقت میں پڑھا کرو اور جب نماز کا وقت آ جائے تم میں سے کسی کو اذان دینی چاہیے اس کے بعد پھر جس کو سب سے زیادہ قرآن محفوظ ہو اس کو امام بننا چاہیے۔ چونکہ ان میں مجھ سے زیادہ قرآن کسی اور شخص کو یاد نہ تھا اور اس کا سبب یہی تھا کہ میں پہلے سے قافلہ والوں سے سن کر قرآن شریف یاد کر لیا کرتا تھا اس لیے انہوں نے مجھ کو ہی اپنے آگے بڑھا دیا۔ اس وقت میری عمر کل چھ سات سال کی ہو گی اور میرے جسم پر اس وقت صرف ایک مختصر سی چادر تھی۔ جب سجدہ کرتا تو پیچھے کی جانب سے سکڑ کر جسم کے اوپر کے حصہ پر آ جاتی۔ ہماری قوم کی ایک عورت یہ دیکھ کر بولی اپنے قاری صاحب کے سرین تو ذرا ہمارے سامنے سے ڈھانک لیا کرو۔ یہ سن کر لوگوں نے میرے لیے ایک قمیص خرید لی مجھے اس وقت اس قمیص سے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ کسی چیز سے نہ ہوئی تھی۔ (بخاری شریف)

لله ..... سے بڑی دلیل ہوگی۔ اس کے برخلاف آپ شاہ روم کا حال پڑھ چکے ہیں وہ جب یہ سنتا ہے کہ آپ کو اپنی قوم پر کبھی فتح ہوتی ہے اور کبھی شکست تو وہ اس کے برعکس آپ کی شکست ہی کو حقانیت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ یہاں عمرو بن سلمہ کا گو بچپن ہی میں فرضوں میں امام ہونا ثابت ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ انہی کے بیان سے اس کی وجہ بھی ظاہر ہو چکی ہے کہ اسلام کے بعد یہ ایک ابتدائی واقعہ تھا۔ تفصیلی مسائل رفتہ رفتہ ہی سیکھے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے جب یہ سنا کہ جس کو قرآن شریف کا زیادہ حصہ یاد ہو امامت حق اسی کا ہے اور یہاں پہنچ کر جب دیکھا تو اس معیار پر عمرو بن سلمہ ہی کو اترتے دیکھا اس لیے ان کے لیے لازم ہو گیا کہ ان کو ہی اپنا امام مقرر کریں۔ حدیثوں میں اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں جو ابتدائی حالات میں صرف اجمالی تعلیم کے تحت ہو گئے۔ پھر بعد میں تفصیلی ہدایات کے مطابق ان کو ادا کیا گیا۔ دیکھیے کہ اس امام کے پاس اتنی چادر بھی نہ تھی جو جسم کے مختلف حرکات کے ساتھ ساتھ اس کے ستر کی لله .....

(۹۹۲) عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَنَمًا بَیْنَ جَبَلَیْنِ فَاَعْطَاهُ اِیَّاهُ فَأَتٰی قَوْمَهٗ فَقَالَ اَیْ قَوْمِ اَسْلِمُوْا فَوَاللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا لَیُعْطِیْ عَطَاءً مَا یَخَافُ الْفَقْرَ.

(رواہ مسلم و راجع ترجمان السنہ ص ۱۵۲ ج ۲)

(۹۹۲) انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ سب بکریاں مانگیں جو اس وقت دو پہاڑوں کے درمیان چر رہی تھیں آپ نے اس کو وہ سب کی سب دے دیں (یہ دیکھ کر) وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا اے میری قوم بس اسلام قبول کرلو خدا کی قسم محمدؐ ایسے سخی اور عالی ہمت شخص ہیں کہ بے دریغ مال لٹاتے ہیں اور فقر کا ذرا خطرہ نہیں رکھتے۔ (مسلم شریف) یہ قصہ اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ ترجمان السنہ ص ۱۵۲ ج ۲ پر گزر چکا ہے۔

لله ..... حفاظت کرسکتی۔ مگر یہ بھی ایک بات تھی جو ابتداء میں ہوگئی۔ پھر جب ستر کے مسائل معلوم ہوگئے تو آئندہ انہی کی روشنی میں امت کا عمل بھی ہوتا رہا۔ فقہی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

(۹۹۲) ٭ ہر شخص کے فہم میں میں بلند انسانیت کا ایک جدا معیار رہتا ہے' کسی کے مزاج پر عالی ہمتی اور سخاوت کا اثر پڑتا ہے تو کسی کے مزاج پر ضبط وتحمل کا اثر ہوتا ہے۔ ترجمان السنہ ج ا ص ۳۸۸ میں آپ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت پڑھ چکے ہیں جس میں ایک یہودی نے اپنے قرض کے تقاضے میں آپؐ کے ساتھ ناروا درشتی سے کام لیا تھا لیکن اس پر بھی جب اس نے دیکھا کہ آپ کے ضبط وتحمل میں ذرا فرق نہیں آتا' تو بول اٹھا کہ میرا مقصد آپؐ کو ایذاء رسانی نہ تھا بلکہ صرف آپ کے تحمل کا امتحان کرنا تھا اور جب اس نے اپنے معیار کے مطابق آپؐ کے نبیانہ تحمل کا تجربہ کرلیا تو دوسری ساعت ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اسی طرح کسی کا معیار اس درجہ گرا ہوا تھا کہ اس میں دشمنی کی حقیقت کے سوا فہم کی ذرا سی بو بھی نہیں آتی جیسا بعض یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دے دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس کی اطلاع دے دی تو آپ کے استفسار پر ان کو اس کا اقرار کرتا پڑا اور انہوں نے کہا ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہوں گے تو زہر بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکے گا ورنہ آپ سے ہماری جان چھوٹ جائے گی اس بے جا کجروی کا بھی کوئی علاج ہے۔ کسی کی طبیعت پر اعجوبہ پرستی غالب ہوتی ہے تو وہ ایسی ہی بات رسول کی ذات میں دیکھنی چاہتا ہے جو اس کے نزدیک کسی انسان سے ممکن نہ ہو خواہ اس بات کا کرنا نبی کے لیے لازم ہو یا نہ ہو۔ مثلاً ایک اعرابی آیا اسکی اعجوبہ پسند فطرت کی رغبت اس طرف معلوم ہوئی کہ کھجور کا ایک خوشہ یا کیکر کا درخت آکر آپ کی نبوت کی شہادت دے یہاں ترجمان السنۃ از ص ۱۴۱ تا ص ۱۵۱ ج ۲ ص اور حدیث نمبر ۷۴۲ ص ۱۵۲ ج ۲ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ ہاں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جس کو دلائل پر غور وخوض کیے بغیر ایک ہی نظر میں کھرا کھوٹا صاف نظر آجاتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن سلام جب مدینہ آئے' بس آپؐ کے رخ انور پر نظر پڑی اور بے ساختہ بول اٹھے یہ چہرہ تو کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۶۲ ج ۴۔ کسی کی فطرت میں اپنا ذاتی کوئی کمال ہوتا ہے اور وہ اپنی موٹی عقل کے مطابق اسی کو معیار بنالیتا ہے کہ جو اس کمال میں اس کو شکست دے دے بس یہی اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ جیسا رکانہ پہلوان کا واقعہ ابھی آپ نے پڑھا۔ یہاں اب یہ بحث کرنی کہ نبوت کے لیے یہ معیار بھی کوئی معیار بن سکتا ہے یا نہیں۔ مخاطب کی فطرت پر قبل از وقت ایسا بار ڈالنا ہے جس کو وہ اس حالت میں اٹھا نہیں سکتا اس لیے رحمت جس کے لیے سبقت کرچکی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ گوارا کرلیا جاتا ہے اور ان کی ہر معقول اور نامعقول ضد کو پورا کر کے ان کو آغوشِ اسلام میں زبردستی کھینچ لیا جاتا ہے۔

(۹۹۳) عَنْ اَبِیْ جُرَمِیٍّ جَابِرِ بْنِ سُلَیْمٍ قَالَ اَتَیْتُ الْمَدِیْنَةَ فَرَاَیْتُ رَجُلًا یَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَأْیِهٖ لَا یَقُوْلُ شَیْئًا اِلَّا صَدَرُوْا عَنْهُ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قُلْتُ عَلَیْکَ السَّلَامُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَّتَیْنِ قَالَ لَا تَقُلْ عَلَیْکَ السَّلَامُ عَلَیْکَ السَّلَامُ تَحِیَّةُ الْمَیِّتِ قُلْ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ قُلْتُ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ الَّذِیْ اِنْ اَصَابَکَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَهٗ کَشَفَهٗ عَنْکَ وَ اِنْ اَصَابَکَ عَامُ سَنَةٍ فَدَعَوْتَهٗ اَنْبَتَهَا لَکَ وَ اِذَا

(۹۹۳) جابر بن سلیم بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو یہاں میں نے ایک شخص دیکھے جن کی ہر بات لوگ غور سے سنتے اور جو بات بھی وہ فرما دیتے بس لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے- میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں- میں نے یہ سن کر آپ کو دو بار سلام کیا (اور یوں کہا) علیک السلام یا رسول اللہ- آپ نے فرمایا علیک السلام علیک السلام مت کہا کرو- ''یہ طریقہ (زندوں کے سلام کرنے کا نہیں) یہ تو مردوں کو سلام کرنے کا ہے-'' لہٰذا ''السلام علیک'' کہا کرو- میں نے عرض کی آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اسی خدا کا رسول ہوں جو اگر تم کو کوئی تکلیف ہو اور تم اس سے دعاء مانگو تو وہ اس کو دور فرما دے اور اگر تم قحط سالی میں مبتلاء ہو اور اس سے دعا مانگو تو وہ تمہارے واسطے اس کو

---

(۹۹۳) * آپ کی اس ایک ہی گفتگو میں الٰہیات' معاشیات اور معیشت کے جتنے شعبے تھے سب کے متعلق ایک ایسی مختصر فہرست بیان میں آ گئی ہے کہ اگر آپ کی یہی ایک گفتگو سامنے رکھ کر اس پر غور کیا جائے تو ایک امی زبان سے نکلے ہوئے یہ بیش قیمت علوم ہی آپ کی نبوت کی تصدیق کے لیے کافی ہیں- آپ حدیث کے الفاظ پر ایک بار پھر غور کر کے نظر ڈال لیں اور اپنے دماغ میں خود ان کو پھیلا لیں کہ آپؐ نے ان مختصر جملوں میں کس طرح خدا تعالیٰ کی ان صفات کا تذکرہ فرمایا ہے جو عرب کی فطرت پر خدا تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے لیے سب سے زیادہ اثر انداز ہو سکتی تھیں- اس کے بعد آداب سلام' آدابِ گفتگو' آدابِ لباس اور علم الاخلاق کے کتنے اہم اسباق کی طرف اشارات فرمائے ہیں- جابر بن سلیم کی فطرت کو جس امر نے یہاں سب سے پہلے بیدار کیا تھا وہ آپ کی محفل کا نقشہ تھا' اور درحقیقت رسولوں کی صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی محفل مادیت کے ساز و سامان سے یکسر خالی ہونے کے باوجود اتنی جاذبیت رکھتی ہے کہ سعید نفوس اس کو ایک نظر دیکھتے ہی ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں- خلاصہ یہ کہ عالم میں قدرت نے انسانوں کے مختلف طبقات پیدا فرمائے ہیں ان میں بادشاہ بھی ہیں اور گدا بھی' عالم دقیق النظر بھی ہیں اور ان پڑھ نادان بھی' سلیم الفطرت بھی ہیں اور درشت فطرت بھی لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے بلاتفریق شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب ہی کے لیے رسول بنا کر بھیجا تھا' اس کی ذات میں ہر طبقے کی تصدیق کے لیے قابل اطمینان اور تشفی بخش دلائل سب ہی جمع کر دیئے تھے- آپ نے ان اوراق میں ہر طبقہ کا بیان نمونۃً پڑھا ہے- بادشاہوں نے اپنے شاہانہ مزاج کے موافق آپ کو جانچا' علماء و اہل کتاب نے اپنی کتابوں کے بیان کردہ نقشوں سے ملا ملا کر آپ کو دیکھا' راہبوں نے اپنی فطری رہبانیت سے آپ کی طرف نظر کی قیافہ شناسوں نے اپنے قیافے دوڑائے' کاہنوں نے اپنے علوم کے سب زور صرف کر ڈالے اور سخن شناسوں نے آپ کے قرآن کو اپنے مذاق پر خوب تولا مگر ہر طبقے کے منصف مزاج جس نتیجہ پر پہنچے وہ صرف ایک یہی بات تھی کہ آپ بے شبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

بہار عالم حسنش جہاں را تازہ می دارد   برنگ اصحاب صورت را بیو ارباب معنی را

حیرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک طبقہ کا ہم کو یہ بیان نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو بزورِ شمشیر بھی مسلمان کیا .....

كُنْتَ بِأَرْضٍ قَفْرٍ أَوْ فَلَاةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُكَ فَدَعَوْتَهُ رَدَّهَا عَلَيْكَ قُلْتُ اِعْهَدْ اِلَيَّ قَالَ لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهُ حُرًّا وَ لَا عَبْدًا وَ لَا بَعِيْرًا وَ لَا شَاةً قَالَ وَ لَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَ اَنْ تُكَلِّمَ اَخَاكَ وَ اَنْتَ مُنْبَسِطٌ اِلَيْهِ وَجْهُكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَ ارْفَعْ اِزَارَكَ اِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَاِنْ اَبَيْتَ فَاِلَى الْكَعْبَيْنِ وَ اِيَّاكَ وَ اِسْبَالَ الْاِزَارِ فَاِنَّهَا مِنَ الْمَخِيْلَةِ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيْلَةَ وَ اِنِ امْرُؤٌ شَتَمَكَ وَ عَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيْكَ فَلَا تُعَيِّرْهُ بِمَا تَعْلَمُ فِيْهِ فَاِنَّمَا وَ بَالُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ.

(رواه ابوداؤد و روى الترمذى منه حديث السلام و فى روايته فيكون لك اجر ذلك و وباله عليه)

سبزہ زار کر دے اور اگر تم کسی بیابان جنگل میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے پھر تم اس سے دعاء مانگو تو وہ تمہاری سواری تم کو عطا فرما دے۔ میں نے عرض کی اچھا تو مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا دیکھو! کسی کو برا بھلا نہ کہنا۔ یہ کہتے ہیں آپ کے اس فرمان کے بعد میں نے نہ تو کسی آزاد انسان کو برا کہا اور نہ غلام کو بلکہ کسی بکری اور اونٹ کو بھی برا لفظ نہیں کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور دیکھنا! کسی اچھی بات کو ہرگز حقیر مت سمجھنا اور اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روئی سے گفتگو کرنا کیونکہ یہ بھی ایک نیک کام ہے۔ اور دیکھنا! ٹخنوں سے کپڑا نیچے لٹکانے سے بہت احتراز کرنا کیونکہ یہ خصلت تکبر کی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تکبر بہت ناپسند ہے اور اگر بالفرض کوئی شخص تم کو برا بھلا کہے اور تم کو ایسے عیب کی عار دلائے جو تمہارے اندر موجود ہو تو تم یہ حرکت مت کرنا کہ جو عیب تم اس میں دیکھو تم بھی اس کو اس کی عار دلانے لگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تو اس کا ثواب ملے گا اور اس کی اس حرکت کا وبال اسی پر پڑے گا۔ (ابوداؤد)

لله ...... بنایا تھا۔ پھر معلوم نہیں کہ متاخر مفکرین نے اسلام میں جہاد کے مسئلہ کو ایک ہوا کیوں سمجھ رکھا ہے۔ جہاد خواہ جارحانہ ہوا ہو یا مدافعانہ لیکن اس کا مقصد اشاعت اسلام سمجھنا ہی محل بحث ہے۔ فرض کر لیجئے کہ اگر اسلام میں جہاد جارحانہ بھی ہوا ہے تو کیا یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ اگر یہی مقصد ہوتا تو قانونِ اسلام میں جزیہ کی ایک مستقل دفعہ کیوں رکھی جاتی۔ بہر حال آج مخالفین اسلام کچھ بھی کہیں لیکن جن لوگوں کے سروں پر اسلام کی تلوار چمکی اور جن کے خاندان کے خون بہے ان میں مشرف باسلام ہونے والے بھی ہیں اور اپنے کفر پر قائم رہنے والے بھی مگر کوئی یہ بیان نہیں کرتا کہ اسلام نے یہ جہاد ان کو جبراً مسلمان بنانے کے لیے کیا تھا۔ یہ موضوع اس وقت ہمارا نہیں ہے۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ان جملہ طبقات کا پیچ وتاب کھانا اسی وقت تک ثابت ہوتا ہے جب تک کہ انہوں نے آپ کو متصفانہ نظر سے نہیں دیکھا' لیکن جس ساعت بھی تقدیر نے یہ موقعہ ان کو دے دیا تو پھر وہ اہل کتاب تھے یا مشرکین مکہ کسی کو آپ کی نبوت میں تردد نہیں ہوا اور کیسے ہو سکتا تھا جب کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کے دو چار رسول تو نہیں آئے تھے بلکہ اتنی بڑی تعداد آ چکی تھی کہ ان کے حالات زندگی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک ان کو پہچاننا سب سے واضح مسئلہ بن گیا تھا۔ مشرکین عرب گو رسولوں سے آشنا نہ تھے مگر دعویٰ ان کا بھی یہی تھا کہ ہم ملت حنیفیہ رکھتے ہیں اور اپنی جبلی جہالت پر اتنے معقول پسند وہ بھی تھے کہ اس بارے میں اہل کتاب کی رائے اپنی رائے پر مقدم سمجھتے تھے اور یہ اسی بنیاد پر کہ ان کے نزدیک "لکل فن رجال" کے مطابق نبیوں کو پہچاننا یہ ان کا ہی فن تھا مگر یہ وسوسہ ان کو بھی نہیں گذرا کہ بندہ کی حقیقت صفراء کے مرض یا خواب سے کچھ ملتی جلتی ہے۔ یہ بحث ان ہی کے دماغ میں پیدا ہوئی جن کو انبیاء کی تاریخ مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا بلکہ انہوں نے محض عقلی طور پر اس مسئلہ کو سامنے رکھا اور صرف عقل کی روشنی میں اس کو حل کرنے کی کوشش کی حالانکہ وجدانیات وحسیات اور مشاہدات بلکہ جملہ محسوسات کا تعلق جتنا کہ ذوق صحیح کے ساتھ ہے اتنا دلائل کے ساتھ نہیں۔ آخر عبداللہ بن سلام اپنی یہودیت کے زمانہ میں آپ کے چہرہ پر نظر کرتے ہیں بے ساختہ کس دلیل سے بول اٹھے کہ "هذا الوجه ليس بوجه كذاب" دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۴۸ ج ۲ یہ چہرہ تو جھوٹے کا چہرہ نہیں۔

الانبياء عليهم السلام بينهم اخوة النبوة يعظم اوّلهم اٰخرهُم و اخرهم اولهم و لا يوجد بينهم اختلاف

انبیاء علیہم السلام میں وہ اخوت نبوت ہوتی ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لیے ہمہ تن احترام ہوتا ہے اور ان میں کہیں اختلاف کا نام ونشان نہیں ملتا

(۹۹۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

(۹۹۴) ابو ہریرۂ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ سب سے قریب ترین

---

(۹۹۴) * دنیا میں اخوت کی مختلف قسمیں ہیں انسانی اخوت' ملک و وطن کی اخوت' کسی حرفہ و پیشہ کی اخوت' نسلی اخوت' نسبی اخوت اور عرب میں تو ان کے علاوہ ایک اور اخوت کا بھی رواج تھا جو باہم معاہدہ سے پیدا ہو جاتی تھی ان کے عرف میں اس کا نام ''مواخات'' تھا ہمارے لفظوں میں اس کو منہ بولا بھائی کہنا چاہیے مگر اس کے حقوق ان کے ہاں مثل نسبی اخوت کے سمجھے جاتے تھے- ان تمام اخوتوں کا حاصل درجہ بدرجہ انس ومحبت اور تعاون و تناصر ہے- ایک مشرق کے باشندہ کو اگر مغرب کے باشندہ کی مصیبت پر کسی درجہ کا غم ہوتا ہے تو کیوں؟ صرف اسی انسانی اخوت کی بناء پر اس سے بڑھ کر وطنی اخوت ہے- جب کبھی دو غیر متعارف انسانوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ملک و وطن کے باشندے ہیں تو یہ سنتے ہی ان کے دلوں میں محبت وانس کے جذبات فوراً امنڈنے لگتے ہیں- نسل ونسب کی اخوت اس سے بھی بالاتر ہے' اس کے مقابلہ میں تمام اخوتیں ماند پڑ جاتی ہیں' یہاں ایک انسان بعض مرتبہ حق وناحق کی بحث سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہے' لیکن یہ تمام اخوتیں ذرا ذرا سے عوارض سے بہت جلد ختم بھی ہو جاتی ہیں اور معمولی معمولی باتوں پر حسد ورقابت کے جذبات سے تبدیل ہو جاتی ہے جس کی شہادت کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت کافی ہے' لیکن ان سب اخوتوں سے الگ ایک اخوت اور بھی ہے جو خاص انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں نظر آتی ہے جس کا نام اخوت نبوت ہے' یہ تمام اخوتوں سے بالاتر اخوت ہے یہاں کسی حالت میں بھی ذرا سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی ان میں محبت وانس کے وہ جذبات نظر آتے ہیں کہ اگر بڑے اور چھوٹے کا تفاوت معلوم نہ ہو تو یہ محسوس کرنا ہی مشکل ہے کہ ان میں باہم ایک دوسرے پر کسی کو فوقیت بھی ہے یا نہیں' ہر ایک کے جذبات دوسرے کی تعظیم وتکریم کے لیے وقف ہوتے ہیں پھر یہاں وہ روحانی تناسب موجود ہوتا ہے کہ ہر نبی کو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسی الفت ومحبت ہوتی ہے گویا کہ وہ اب اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ موجود ہیں ایک سعید لڑکا بھی کچھ وقفہ کے بعد اپنے والد کی یاد اس طرح تازہ نہیں رکھ سکتا جس طرح کہ ایک نبی دوسرے گزشتہ نبی کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے' گویا ان کے صرف قالب مختلف ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ سب یک جان ہوتے ہیں اسی لیے کوئی نبی دوسرے نبی کے احترام کے خلاف ایک کلمہ بھی برداشت نہیں کر سکتا بلکہ ہر نبی کی شریعت کی ایک دفعہ ہی یہ ہوتی ہے کہ جو کسی ایک نبی کا منکر ہو وہ خود اس کا بھی منکر ہے- یہی وجہ ہے کہ جب وہ دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو اپنی امتوں میں ایک ایسی اخوت پیدا فرماتے ہیں جو ان کے مابین اخوت سے مشابہ ہوتی ہے اس کا نام ''اخوتِ ایمانی'' ہے- اس اخوت کے مقابلہ میں عام انسانوں کی تمام قسم کی اخوتیں ہیچ ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ آپ نے فرمادیا کہ اخوتِ ایمانی کے بعد اب عقدِ مواخات کرنا اصولاً غلط ہے کیونکہ محبت وانس کے جتنے جذبات ہو سکتے ہیں وہ سب ''اخوتِ ایمانی'' میں پنہاں ہیں- اس لیے آئندہ اب ''مواخات'' کا دستور منسوخ ہے وَ اذْکُرُوْا اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا یعنی اس دور کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے لئے.....

وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَۃِ الْاَنْبِیَاءُ اِخْوَۃٌ مِّنْ عَلَّاتٍ وَ ہوں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سب انبیاء علیہم السلام باہم علاتی (سوتیلے) بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا والد ایک ہوتا ہے اور مائیں

ﷺ..... دشمن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے آ کر تمہارے درمیان وہ الفت پیدا کر دی کہ تم سب بھائی بھائی بن گئے اور اب ایک دوسرے کی خاطر جان نثاری کے لیے تیار ہو گئے۔ آیت بالا میں اسی ''اخوت ایمانی'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں سب مسلمانوں کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح ایک مکان کی اینٹ دوسری اینٹ کے لیے باعث استحکام ہوتی ہے اسی لیے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ہونا چاہیے اب مثال کے طور پر آپ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر آپ کو یہ خطاب فرمایا تھا ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ یعنی جیسا اولوالعزم رسول ہمیشہ صبر کرتے رہے ہیں تم بھی اسی طرح صبر سے کام لو اور صاحب حوت (یعنی یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو۔ اس طرز خطاب سے شاید خطابات ربانی سے کسی ناآشنا شخص کو ایک نبی کے حق میں کسی کوتاہی کا وہم گزر سکتا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کا ازالہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ''مجھ کو یونس نبی پر فضیلت مت دو'' دیکھو ترجمان السنۃ ص ۳۲۲ ج ۲۔ مدتوں اس حدیث کی مراد سمجھ میں نہ آ سکی حتیٰ کہ ترجمان السنۃ میں بھی اس کی وہی مراد درج کر دی گئی جواب تک شارحین کے کلام سے سمجھی تھی۔ جب اس تیسری جلد کا وقت آیا تو اس طرف ذہن متوجہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ انبیاء علیہم السلام میں یہاں خاص حضرت یونس علیہ السلام کا نام لینا ضرور کسی حکمت پر مبنی ہو گا اسی وقت خیال قرآن کریم کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی خاص طور پر ان ہی کا نام لے کر آپ سے کہا گیا تھا کہ تم ان کی طرح بے صبری کا کوئی قدم نہ اٹھانا۔ سبحان اللہ اخوت نبوت بھی کتنی بلند اخوت ہوتی ہے۔ آپ نے فوراً ان ہی کا نام لے کر فرمایا ''تم مجھ کو ان پر فضیلت مت دو'' امت کے جذبات اس قسم کے مواقع پر حدود سے تجاوز کر جایا کرتے ہیں اس لیے بہت اہمیت کے ساتھ ان کو ہدایت فرما دی کہ اس خدائی طرزِ خطاب سے امت کا کوئی فرد بھی ان کے حق میں ادنیٰ سا کسر شان کا کلمہ منہ سے نہ نکالنے پائے یہ خالق کا اپنے رسول سے خطاب ہے یہاں کسی امتی کو مداخلت کرنا خطرناک ہے۔ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کے حق میں ایک موقعہ پر عمرؓ اور صدیق اکبرؓ سے جو تنبیہی حرکات صادر ہوئی تھیں کس کی مجال ہے کہ ان کی نقل اتار سکے یا امہات المؤمنین کی شانِ عالی میں نصف کلمہ بھی زبان پر لا سکے۔ پس جب بندوں کے درمیان مراتب اور حقوق کے لحاظ سے فرق پڑتا ہے تو خالق اور مخلوق کے درمیان جتنا فرق ہونا چاہیے اس کو قیاس کر لیجئے بالخصوص جب کہ مخاطب رسول کی ذات ہو جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش پر سخت سے سخت باز پرس ہوتی ہے۔ اس کے بعد قلب مطمئن ہو گیا اور معلوم ہوا کہ اس حدیث کو جب آیت بالا کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہاں کسی سوال و جواب کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ عقیدہ کا باب نہ تھا بلکہ اخوت نبوت کا کرشمہ تھا۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ ترجمان السنہ ص ۳۲۲ ج ۲ میں گزر چکا ہے وہاں بھی بڑی ناگواری کے انداز میں آپ نے فرمایا تھا تم لوگ مجھ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت مت دو'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا سے کچھ عرصہ کے لیے رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت اپنی امت کے سامنے تسلی کے جو کلمات انہوں نے فرمائے تھے وہ حسب بیان انجیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی عظمت شان ظاہر کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ماضی اور آئندہ آنے والے رسولوں کا اس درجہ احترام انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کہیں نہیں ملتا یہاں ایک لاکھ سے زیادہ کی بڑی جماعت سب میں یہی صفت نظر آتی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح خود ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوتا اسی طرح ان کے اصولی علوم ﷺ.....

اُمَّھَاتُھُمْ شَتّٰی وَدِیْنُھُمْ وَاحِدٌ وَلَیْسَ بَیْنَنَانَبِیٌّ. (متفق علیہ)

مختلف اسی طرح ان سب کا دین یعنی اصولی عقائد ایک ہوتے ہیں اور شریعتیں مختلف مختلف اور میرے اور عیسیٰؑ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۹۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عِفْرِیْتًا مِنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ

(۹۹۵) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا آج کی شب ایک سرکش جن میری ایذاءرسانی کے لیے چھوٹ نکلا

لـــه ..... میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا فروع اور جزئیات میں گو یہاں بھی اختلاف ہو جاتا ہے مگر ایک شریعت نے دوسری شریعت کی کبھی تکذیب و تغلیط نہیں کی بلکہ ہمیشہ پہلی شریعت کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ بعض احکام وقتی ہوتے ہیں اور وہ کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص بھی ہو سکتے ہیں اس لیے مثلاً فلاں فلاں احکام جو گزشتہ دور کے مناسب تھے اب جدید آئین سے خارج کیے جاتے ہیں اور فلاں فلاں احکام کا جدید اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس تغیر و تبدل کو تغلیط نہیں کہا جا سکتا اس کا نام ''نسخ'' ہے۔ یہ رسول کا اپنا فعل ہی نہیں ہوتا یہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ وہ جو احکام چاہتا ہے نسخ فرما دیتا ہے اور جو چاہتا ہے جدید احکامات نازل فرما دیتا ہے' اس لحاظ سے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ رسولوں کے علوم میں مطلقاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا نہ اصول میں اور نہ فروع میں۔ اسی کے ساتھ اگر اس پر بھی غور کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم میں الٰہیات' اور عالم غیب کا ایک بڑا باب ایسا بھی ہوتا ہے جس میں عقل انسانی قطعاً درماندہ اور عاجز ہے اس کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود تک اس میں کہیں ایک نقطہ کا اختلاف نہیں ملتا تو اس سے بداہتہً یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم کا سرچشمہ یقیناً ایک ہی تھا اور یقیناً یہاں جو حضرت آدم علیہ السلام کا معلم تھا وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معلم تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے' ان کی زبانیں اور ان کے بعثت کے مقامات گو کتنے ہی مختلف تھے مگر علوم میں ایک شوشہ کا کہیں اختلاف نہ تھا۔ ان عمیق مسائل پر اگر صرف بزورِ عقل غور کیا جائے تو کیا اتنے کثیر التعداد انسانوں میں جو عالم کے اتنے مختلف خطوں میں اتنے مختلف مختلف زمانوں میں ظاہر ہوئے ہوں اتنا اتحاد عقلاً ممکن ہے؟ پھر خود ان کے درمیان اتنی محبت' اتنی ایک دوسرے کی عظمت اور ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط نظر آ سکتا ہے جس کی مثال دو حقیقی بھائیوں میں بھی نہ مل سکو۔ یہاں حدیث کے الفاظ ''فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ'' خاص طور پر قابل لحاظ ہیں شاید یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری بہ حیثیت آپ کے امتی ہونے کے ابھی باقی ہے اور آپ کی یہ حیثیت لازمی طور پر آخرت میں بھی ظاہر ہوگی ورنہ آپ کی نسبت سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اولویت کی نسبت کی۔ اس کے سوا کوئی وجہ حدیث کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتی۔ اس روایت میں ایک فقرہ اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے ''لَیْسَ بَیْنَنَا نَبِیٌّ'' یعنی ہمارے درمیان کوئی اور نبی نہیں۔ مدت دراز تک اس کی صحیح مرحل نہ ہوسکی اور یہ منکشف نہ ہوسکا کہ اس امر کے بیان فرمانے کی اہمیت کیا ہے۔ اس کے بعد نظر سے گذرا کہ کتب سابقہ میں آپ کی علامت میں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس رسول کے درمیان کوئی اور نبی نہ ہوگا' اس کے بعد سے پھر اس جملہ کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہونے لگا۔ دیکھو حدیث نمبر ۸۸۶ جس میں مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شاہ مقوقس کے دربار میں جانے کا واقعہ مذکور ہے۔

(۹۹۵) ✻ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ہر نبی جس طرح دوسرے نبی کی نبوت کا مصدق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کے معجزات کا بھی مصدق ہوتا ہے اور ان کا بھی پورا پورا احترام کرتا ہے۔ یہ کبھی ثابت نہیں ہوا کہ کسی نبی نے دوسرے نبی کے مقابلہ پر کوئی معجزہ دکھلایا ہو۔ لـــه .....

عَلَى الْبَارِحَةَ اَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا لِيَقْطَعَ عَلَيَّ الصَّلٰوةَ فَاَمْكَنَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ وَ اَرَدْتُ اَنْ اَرْبِطَهُ

تھا تا کہ کسی طرح میری نماز قطع کرا دے مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھ کو قدرت عنایت فرما دی اور میں نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے

لٰلہ..... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو معجزہ ایک نبی کا ہو وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ہی جنس کا معجزہ متعدد نبیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ احیاء موتی۔ گو مشہور یہ ہے کہ یہ معجزہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ یہی معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ (دیکھو کتاب النبوات ص ۱۱۲) لیکن یہاں ہر ایک کا معجزہ جس طرح خود اس کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے اسی طرح گزشتہ نبی کی صداقت بھی دلیل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کاہنوں اور ساحروں کی جماعت ہے یہاں ہمیشہ ایک ساحر دوسرے ساحر کی کاٹ پر نظر آتا ہے اور اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ دوسرے کا عمل باطل کر دے۔

سبحان اللہ! اب آپ حدیث مذکور میں ذرا اخوت نبوت کی اس پاسداری کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ جس خاص تسخیر کے متعلق ایک پیغمبر کی زبان سے یہ دعاء نکل چکی تھی ''پروردگار مجھے وہ بادشاہت دے جو میرے بعد کسی دوسرے کو نہ ملے'' دوسرا پیغمبر اس کا کتنا احترام ملحوظ رکھتا ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود اس کو صرف اس لیے نافذ نہیں کرتا کہ کہیں اس میں دوسرے پیغمبر کی دعاء کے خلاف کا ادنیٰ سا شائبہ پیدا نہ ہو جائے حریفانہ ہمسری سے اتنا احتراز اور اخوت نبوت کا اس درجہ احترام' پس نبوت کا ایک اعجاز سمجھنا چاہیے۔ کیا اتنی بڑی جماعت میں بلا استثناء اس احترام کی مثال دنیا کی کسی دوسری جماعت میں مل سکتی ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسخیر جنات سے بڑھ کر ایک اور نعمت عطا فرمائی تھی اور وہ جنات کے لیے آپ کی بعثت تھی۔ اس لیے آپ کا عام پیغمبرانہ سلوک ان کے ساتھ بھی وہی تھا جو نوع انسانی کے ساتھ تھا' دونوں مخلوق کو آپ نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دی ہے اور مالکانہ تصرف سے ہر جگہ احتراز فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ مالکانہ تسخیر سے دعوت الی الحق کہیں افضل ہے۔ (کتاب النبوت ص ۱۲۶) حافظ سیوطیؒ نے بھی الخصائص الکبریٰ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جس رسول اعظم نے اپنی پسند سے شان عبدیت اختیار فرمائی تھی اس کی فطرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اب کوئی عمل بھی اس سے ایسا سرزد ہو جو عہد سلیمانی کے دور شاہانہ سے ملتا جلتا رہے۔ یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنۃ ص ۳۲۱ ج ۲ حدیث ۱۱۷)

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ شیطان چونکہ یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وہ وسوسہ اندازی سے تو عاجز ہے اس لیے اس نے یہ سعی کی کہ کسی صورت آپ کی نماز ہی میں خلل انداز ہو جائے اور آپ کو عمل کثیر کے لیے مجبور کر دے مگر حق تعالیٰ کے فضل سے اس کو اس پر بھی قدرت نہ ہو سکی آخر کار مایوس ہو کر پھٹکارا ہوا واپس ہو گیا۔ (دیکھو الیواقیت والجواہر: ص ۳۲ ج ۲)

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ یہ شیطان بلی کی شکل پر آیا تھا۔ عالم روحانیات میں صورت کی تبدیلی ممکن ہے اگر کہیں انسان میں اس کی ٹھوس مادیت حائل نہ ہو جاتی تو وہ بھی اپنی صورت بدل سکتا۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل کی تبدیلی کا ذکر بہت سے مواقع میں آیا ہے غالباً یہ بھی ان کے ''روح اللہ'' لقب کے اثرات میں سے ہوگا۔ بہرحال اس بنا پر آپ کا اس کو پکڑ کر ستون سے باندھنا اور بچوں کا اس کو دیکھنا وغیرہ سب معقول ہے۔ روحانیات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب ہمت اپنی قوت ہمت سے کسی روح کو کسی جسم میں مقید کر دے تو پھر وہ اس کو بدل نہیں سکتا اور اسی میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترجمان السنہ جلد دوم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرشتہ کے تھپڑ مارنا اور اس کی آنکھ پھوٹ جانا بھی اس کی نظیر سمجھنا چاہیے اگر وہاں بھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں آتا تو خدا تعالیٰ کا مقدس لٰلہ.....

اِلٰی سَارِیَةٍ مِنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ حَتّٰی تُصْبِحُوْا اَوْ تَنْظُرُوْا اِلَیْهِ کُلُّکُمْ فَذَکَرْتُ قَوْلَ اَخِیْ سُلَیْمَانَ رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ قَالَ رَوْحٌ فَرَدَّهٗ خَاسِئًا. (رواہ البخاری)

کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں یہاں تک کہ صبح کو تم سب کے سب اس کو آنکھوں سے دیکھ لو۔ لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمانؑ کی یہ دعا یاد آ گئی "پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عنایت فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیبا نہ ہو۔ روح (حدیث کا ایک راوی) بیان کرتے ہے کہ (اس وجہ سے آنحضرتؐ نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا) اور اس کے مقصد میں اس کو ناکام واپس کر دیا۔ (بخاری)

(۹۹۶) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ مِنْ دُعَاءِ

(۹۹۶) ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابوداؤد علیہ السلام ایک دعاء یہ بھی فرمایا کرتے

ﷺ..... رسول نہ اس کے تھپڑ مارتا اور نہ اس کی آنکھ ہی پھوٹتی یہ سب بشری صورت میں آنے کے کرشمے تھے۔

حضرت شاہ اہل اللہؒ کا تاریخی واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے تھے پاس قلمدان رکھا ہوا تھا' ایک بار نظر اٹھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھوٹا سا سانپ سامنے موجود ہے۔ آپ نے اپنے اسی انہماک کی حالت میں قلمدان سے چاقو نکال کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور پھر بدستور لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں نظر اٹھی تو اس سانپ کو وہاں نہ پایا اور ایک سپاہی مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا نظر پڑا۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں۔ یہ خالی الذہن اس کے ساتھ ہو لیے۔ جب اس نے جنگل کا رخ کیا تو ان کو کچھ شبہ گذرا یہاں تک کہ اس نے ایک غار میں داخل ہونے کے لیے ان سے کہا۔ اب یہ سمجھ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہے کچھ دور چل کر ان کو شاہی عدالت نظر آئی جہاں ایک شخص مقتول پڑا تھا۔ مدعی نے دعویٰ کیا کہ اس کا قاتل یہ انسان ہے۔ انہوں نے انکار فرمایا۔ بالآخر بادشاہ نے جو دو سفید ریش شخص اس کی دائیں بائیں طرف بیٹھے تھے ان کو دیکھا تو ان میں سے ایک صاحب نے ایک حدیث پڑھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے جو اپنی صورت بدلے اس کو قتل کر دو۔ اس جن نے چونکہ اپنی صورت بدل کر سانپ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا بموجب حدیث مذکور اس کے قاتل پر قصاص واجب نہیں ہوتا۔ شاہ اہل اللہ نے ان کی زبانی یہ کلمات سن کر پوچھا۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پایا۔ انہوں نے جواب دیا ہم جن ہیں اور ہماری عمریں اتنی طویل ہوسکتی ہیں۔ بہرحال جب جن سانپ کی شکل میں آ کر مقتول ہوسکتا ہے۔ اپنی لاعلمی میں حقائق کا صرف استہزاء کرنا علم نہیں۔

(۹۹۶) ⁕ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات سے کچھ یہ اندازہ لگانا چاہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں حب خداوندی کی آگ کس درجہ بھڑکی ہوئی ہوتی ہے مگر محبت کا کمال ہے یہی کہ اگر اس کے شرارے سر بفلک بھی پہنچ رہے ہوں جب بھی ایک محبت کی تمناء یہی ہو کہ کاش یہ آتش محبت اور زیادہ بھڑکتی۔

بشر کی محبت یہ ہے کہ اس کا قدم جتنا محبت الٰہی کی طرف اٹھتا چلا جائے اتنا ہی وہ اس کی عبادت میں تیز گام ہوتا چلا جائے۔ اس لیے ابوالدرداءؓ یہاں وہ کلمات بھی نقل فرماتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے برادر نبوت حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کی شان میں فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ خود عبدیت کا سب سے کامل مظہر تھے اس لیے آپ کی نظروں میں اپنے بھائی داؤد علیہ السلام کی جو ادا سب سے زیادہ پیاری معلوم ہوئی وہ ان کی عبادت ہی تھی پھر آپ کی عبدیت کا دوسرا کمال یہ تھا کہ جب ان کی عبادت کا ذکر فرماتے تو اس طرح فرماتے گویا وہ اپنی نظیر خود ہی تھے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں اپنی شکر گذاری کے لیے ﷺ.....

داؤدَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُکَ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ يُحِبُّکَ وَ الْعَمَلَ الَّذِىْ يُبَلِّغُنِىْ حُبَّکَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِىْ وَ مَالِىْ وَ اَهْلِىْ وَ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِقَالَ وَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَكَرَ دَاوٗدَ يُحَدِّثُ عَنْهُ يَقُوْلُ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ. رواه الترمذى وقال هذا حديث حسن غريب.

تھے- الٰہی میں تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت رکھے اور وہ نیک عمل جو تیری محبت پیدا کر دے- الٰہی میرے دل میں اپنی محبت میری جان و مال' میرے گھر بار اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ پیدا فرما دے- اور یہ بھی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ فرماتے تو یہ بھی فرمایا کرتے تھے'' وہ بہت بڑے عبادت گزار بشر تھے-

(ترمذی شریف)

(۷۹۹) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۷۹۹) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ﷺ ..... حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے خاص طور پر خطاب فرمایا تھا اس لیے انہوں نے بھی عبادتِ الٰہی کا ایک ایسا نظام قائم فرمایا تھا کہ شب و روز میں کوئی ساعت بھی ایسی نہ تھی جس میں کہ ان کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد ان کے عبادت خانہ میں عبادت کرتا ہوا نہ ملتا ہو- ارشاد ہے- ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ (سبا:۱۳)

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی اپنے ان برادر نبوت کا تذکرہ آ جاتا تو آپ ان کی شانِ عبادت کی توصیف میں بے ساختہ رطب اللسان ہو جاتے یہ کون ہیں؟ وہ کہ جن کی عبادت کی فرشتوں میں بھی دھوم مچی ہوئی تھی' حتی کہ خود معبودِ حقیقی نے جو لقب چھانٹ کر ان کو عطا فرمایا تھا وہ بھی عبداللہ کا لقب تھا- سورۂ اسراء میں جب آپ کا تذکرہ فرمایا تو اسی لقب سے ﴿سُبْحَانَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ اور سورۂ والنجم میں جب آسمانوں پر آپ کے ساتھ راز و نیاز کا ذکر کیا تو بھی اسی لقب سے ﴿فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى﴾ یہ ہے اخوت نبوت کہ عبودیت کے اس کمال تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی عبادت کا ایک حرف زبان پر نہیں آتا اور جتنی مدح و ثناء زبان پر آتی ہے وہ اپنے ایک برادر نبوت کی ہے-

(۷۹۹) * حدیث مذکور میں یکجائی طور پر تین نبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے' جس کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نبیانہ اخوۃ دوسرے نبیوں کے عزت و احترام بیان کرنے اور اپنی فروتنی کے اظہار کے لیے گویا بہانہ کی متلاشی رہا کرتی تھی- اگر کہیں اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذرا ذکر آ گیا تو عظمت و برتری کے جتنے زوردار کلمات ہو سکتے تھے وہ ان کے حق میں اور عجز و نیاز کے جتنے کلمات ممکن تھے- وہ سب اپنے حق میں ادا ہونے لگے اور جب کہیں اپنے دوسرے علاتی بھائیوں کی یاد تازہ ہو گئی تو فوراً آپ کے تلطف و ترحم کے سمندر موجزن ہو گئے اور رحمت و رافت سے لبریز دعائیں ان کے لیے زبان سے نکلنے لگیں- پھر یہ سب کچھ محض شاعرانہ اور مبالغہ آمیزی کے طور پر نہیں بلکہ ٹھیک حقیقت پر مبنی-

دیکھئے یہاں جو کلمات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آپ کی زبان مبارک سے نکلے وہ کتنی عمیق حقیقت کے حامل تھے یقیناً اگر کہیں فطرتِ ابراہیمی شک و تردد سے پاک و صاف نہ ہوتی تو ان کے بعد جو حنیف بھی آتا اس میں شک و تردد کے جراثیم ضرور سرایت کر کے رہتے- حضرت آدم علیہ السلام سے سہو و نسیان سے ایک غلطی ہوگئی مگر آخر کار پھر ان کی ذریت کی سرشت میں داخل ہو کر رہی- اور اسی طرح ہر موسس کے نقصان و کمالات اس کے متبعین کے آئینوں میں چمکا کرتے ہیں- پس اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر رب ارنی ﷺ .....

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّکِّ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہم ہوتے (اگر

لِلّٰہ..... کَیْفَ تُحْیِي الْمَوْتٰی کا کلمہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے کہیں از راہِ شک ادا ءہوتا تو پھر شک و تردد ملت حنیفہ کی بنیاد ہی میں داخل ہو جاتا - اس کی بقیہ شرح ترجمان السنہ ص ۲۶ ج ۲ پر ملاحظہ فرمایئے -

حدیث کا دوسرا جملہ ذرا شرح طلب ہے - واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے نے جب انکار وتمرد کی حد کردی اور معاصی وفواحش میں خلاف وضع فطرت عمل کا ایک ایسا باب کھول دیا جس سے دنیا اس سے قبل آشنا نہ تھی تو آخر ان کی ہلاکت کی ساعت سر پر آ گئی اور خدا تعالیٰ کے مقدس ملائکہ خوب صورت لڑکوں کی شکل میں آ پہنچے صورت یہ ہوئی کہ پہلے وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان بن گئے' ان کو ابھی کچھ علم نہ تھا کہ اصل ماجرا ہے کیا' انہوں نے حسب دستور انبیاء علیہم السلام اپنے مہمانوں کو احترام سے لیا' ادھر ان کی قوم کو اس کی خبر لگی تو نشہ معصیت میں مخمور ان کے مکان پر آ چڑھے اور ان کے معزز مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا - اندازہ فرمایئے کہ قوم کے سارے نا ہنجار افراد ایک طرف اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو کا معاملہ ایک طرف' نہ خود اپنے دست و بازو میں ان کی مدافعت کی طاقت نہ قبیلہ ہی اتنا زوردار کہ اس موقع پر ان کی مدد کر سکے - اس حیرت اور مجبوری کے عالم میں ان جاہلوں کو بڑی فہمائش کی اور جو ایک بلند حوصلہ اور بامروت انسان اپنے مہمانوں کی خاطر بڑے سے بڑا ایثار کر سکتا ہے وہ بھی کر گزرے یعنی ابھی تک کفار اور مسلمانوں کے درمیان نکاح درست تھا' خود حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی بھی کافرہ تھی اور ہماری شریعت کے ابتداء میں بھی یہ نکاح درست سمجھا جاتا تھا - لہٰذا انہوں نے خدائی حدود کے تحفظ اور اپنے مہمانوں کے ناموس کی خاطر وہ بات بھی برداشت کر لی جس کو جواز کے باوجود وہ یہ اختیار برداشت نہ فرماتے اور یہ بات کہی کہ تم میری لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہو یہ ایک شرعی راستہ ہے لیکن ایک حرام فعل کا ارتکاب اور وہ بھی میرے گھر پر پھر وہ بھی اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا[1] اس پر ان کی جاہل قوم نے جو فواحش کے خوگر انسانوں کا لِلّٰہ.....

---

[1] اگر یہاں لفظ بنات سے مراد بنات قوم لی جائے تو بے شبہ اس مجازی معنے کا استعمال خلاف محاورہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر پہلے یہ غور کر لینا ضروری ہو گا کہ نبی کی معنوی ابوت کے لحاظ سے عرف قرآن میں کہیں امت کی لڑکیوں پر نبی کی زبان سے ''بناتی'' کا اطلاق ہوا ہے؟ اس وقت ہمارے ذہن میں تو کوئی ایسی آیت نہیں آتی - دوم جب اخوتِ اسلامی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ کو ''ھذہ اختی'' کہنا ایک کذب کی برابر سمجھا ہو تو پھر بالکل اجنبی عورتوں کو کسی معنوی رشتہ سے ''بنات'' کہہ کر پکارنا انبیاء علیہم السلام کے عرف میں کہاں تک قرین قیاس ہو سکتا ہے - سوم ''بناتی'' میں خاص اپنی طرف نسبت کرنے سے جس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے اس کا کوئی نکتہ بھی بیان کرنا ضروری ہو گا بالخصوص جب کہ وہ عورتیں کافرہ تھیں - چہارم یہ کہ قرآن کریم نے کفر کے ساتھ جب اپنے نسبی عزیز کو ''ان ابنی من اھلی'' کہنے کی اجازت نہیں دی بلکہ صاف ''اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ'' فرما دیا تو پھر جن کافرہ عورتوں کے ساتھ نسبی کوئی رشتہ بھی نہ ہو ان کو ''بناتی'' کا پیارا کلمہ کہنا کہاں تک جائز ہو گا - کیا ان کافروں کی اولاد پر جو نبی کی فضیحت کے لیے چڑھ آئے تھے اپنے اس معنوی رشتہ کے اظہار کا یہی محل رہ گیا تھا - پنجم اگر ان مجبور کن حالات میں بھی اپنی حقیقی بنات کی جائز پیشکش قابل اعتراض ہو سکتی تھی تو کیا دوسروں کی لڑکیوں کی پیشکش پھر وہ بھی اسی قابل اعتراض عنوان سے کچھ کم قابل اعتراض ہے کیا نبی کی شان کے یہ مناسب ہو گا کہ وہ اپنی بات ٹالنے کے لیے اپنی امت کی لڑکیوں کی پیشکش کرے اور صرف ''بناتی'' کے ایک محبت آمیز کلمہ کی آڑ لے کر وہی بلا ان کے سر ڈالنے کا ارادہ کر لے - ہمارے نزدیک تو یہ پہلے سے بھی زیادہ ناموزوں ہے -

حقیقت یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام پر اپنے مہمانوں کی اس فضیحت سے اخلاقی طور پر جو ناقابل برداشت دباؤ پڑ رہا تھا اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں لگایا گیا کہ کن حالات میں یہ جائز کلمہ ان کی زبان سے نکلا تھا - ایک بے حیا' بدمعاش اور مضبوط ٹولی کے ہجوم کے سامنے تہذیب و آداب اور مروت ←

مِنْ اِبْرَاهِیْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ یہ سوال انہوں نے از راہ شک کیا ہوتا) جب کہ عرض کیا تھا۔ میرے

ﷺ ...... جواب ہوا کرتا ہے وہی جواب دے دیا اب حضرت لوط علیہ السلام کی اس بے چارگی اور قوم کی اس سرکشی اور فاسد ارادوں کا نقشہ سامنے رکھیے اور اندازہ لگائیے کہ یہ سماں دیکھ کر ایک باعصمت نبی کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی آپ کے دل کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبیانہ اخوت کے سامنے جب یہ نقشہ آیا تو آپ پر اس گزشتہ مصیبت کی ایک تازہ واقعہ کی طرح چوٹ لگی۔ اور بڑے درد کے انداز میں فرمایا' الٰہی میرے بھائی لوط پر بڑی رحمتیں نازل فرما کہ قوم کی نالائقیوں اور ایذاؤں سے تنگ آ آ کر انہیں ان کلمات کے کہنے کی نوبت آ گئی جو فطرتِ بشری سے بدرجہ مجبوری نکلا کرتے ہیں۔ یعنی کاش اس معصیت وفضیحت کا نقشہ بدلنے کی طاقت خود میرے دست وبازو میں ہوتی یا میرا کوئی زوردار قبیلہ[1] ہوتا تو ان ناہنجاروں کو مناسب سزا دی جاسکتی۔ انبیاء علیہم السلام کے مخلصانہ اور عاجزانہ کلمات کبھی خالی نہیں جاتے لہٰذا ان کی یہ آواز بھی آسمانوں پر سنی گئی اور اسی دن کے بعد سے سنۃ الٰہیہ یہی ٹھہر گئی کہ جب کوئی نبی آتا تو ہمیشہ مضبوط قبیلہ کا آتا۔

انسان کا خاصہ ہے کہ جب وہ طرح طرح کی ایذاؤں اور مصائب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے صبر کے لیے اس قسم کے گزشتہ واقعات کا تصور بڑا تسلی بخش ہوتا ہے اس لیے جب آپ بھی مصائب وآلام کے اسی دور سے گزر رہے تھے تو ایک مرتبہ آپ کو اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد بے ساختہ آ گئی پھر کیا تھا ان کی عظمتِ شان بیان کرنے کا گویا پھر ایک بہانہ مل گیا اس لیے فرمایا رحم اللہ موسی لقد او ذی اکثر من ذلک فصبر - خدا تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحمتیں نازل فرما بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں اور ان مصائب سے بھی زیادہ شدید مصیبتیں جھیلیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا۔

آپ نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی اپنے بھائیوں کے شدائد کا نقشہ آیا تو ہمیشہ ان کے حق میں بزرگی اور دعاء کے کلمات ہی نکلے اور ہر ہر موقعہ پر اپنی فروتنی اور تواضع کا ہی اظہار ہوتا رہا اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ سالوں ایک گھاٹی میں بے آب وگیاہ قید رہنے کی حالت میں یا طائف کے میدانوں میں خون سے رنگین ہو جانے یا سر کے زخمی اور دندان مبارک کے شہید ہو جانے کے بعد بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل کبھی یہ کلمہ زبان پر آیا ہو کہ ان مصائب پر جس طرح میں نے صبر کیا مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں کیا۔

تیسرا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ تھا آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان بڑی ہوتی ہے مگر ان کی باز پرس بھی بڑی ہوتی ہے' ان سے مواخذہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک بار یہ کلمہ نکل گیا ''انا اعلم'' اس وقت سب سے زیادہ علم مجھ کو ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی وقت سے زیادہ علم اور کس کو ہوسکتا ہے مگر ان کا یہ کلمہ بھی گرفت میں آ گیا حتی کہ اس ﷺ .....

← کی تجاویز پیش کرنے کا وقت تھا یا کسی بھی صورت سے اپنے معزز مہمانوں کی آبرو بچا لینے کا مرحلہ تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ''بنات'' کے مجازی معنی اختیار کرنے کے لیے اگر صرف یہی عقلی اعتراض داعی ہوا ہے تو اس کی کوئی معقول وجہ اب تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکی۔ مفسرین میں سے جن بعض حضرات نے اس مجاز کو استعمال کیا ہے اس کی وجہ اور ہے' یہ عقلی شبہ نہیں ہے۔ زیادہ تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

[1] جن صاحبان نے ''رُکْنٍ شَدِیْدٍ'' سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے انہوں نے قرآنی آیت ''اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ'' میں او حرف تردید پر غور نہیں کیا اور صحیح بخاری کی ایک لفظ کی مراد بھی خود اسی معنے کی مؤید سمجھ لی ہے حالانکہ اس روایت کا مطلب بھی دوسرا ہے۔ ابن حزم نے ملل ونحل میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ملائکۃ اللہ ہیں۔

الْمَوْتٰی وَ یَرْحَمُ اللّٰہُ لُوْطًا لَقَدْ کَانَ یَأْوِیْ   پروردگار دکھلا دے تو مردہ کیسے زندہ کرتا ہے؟ خدا تعالیٰ لوط علیہ السلام پر

ﷺ ...... کی سرگزشت سورۃ الکہف میں مستقلاً بیان کی گئی جو تا قیامت تلاوت کرنے والوں کی زبانوں پر تازہ ہوتی رہے گی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے اپنی بی بی کے متعلق ایک نازک سے نازک وقت میں "ھذہ اختی" کا کلمہ نکل گیا مگر وہ ہمیشہ اس پر اتنے نادم رہے کہ محشر تک بھی زبان سے اس کی تلخی نہ گئی آخر جب اہل محشر ان سے شفاعت کے لیے عرض کریں گے تو اپنے اسی قسم کے کلمات یاد کر کے فرطِ ندامت سے اپنا سر جھکا لیں گے اور فرمائیں گے کہ میں اس بلند مقام کا اہل نہیں۔ پس اس طرح لفظی گرفت اور اپنی ذرا سی بات پر اس طرح ندامت صرف اسی مقدس گروہ کا خاصہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مقام گو کتنا ہی بلند ہو مگر بشریت پھر ان سے الگ نہیں ہوتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی جب زنانِ مصر کی دعوت کا ہوش ربا منظر آیا اور جیل خانہ کی سخت دھمکی بھی ان کے کانوں نے سنی اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ اب تمہارے لیے صرف دو ہی راستے ہیں یا ان کی دعوت کو قبول کرو یا پھر جیل خانہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا انداز ہ آپ یہاں سے فرمالیجئے کہ نوجوانی کے عالم میں سامنے سے حسن اپنی پوری شوکت و طاقت کے ساتھ خود دعوت دے رہا ہے مگر نبیانہ عصمت ہے کہ پہاڑ کی طرح ذرا متزلزل نہیں ہوتی اور جواب صرف یہ ہے کہ اگر میرے لیے راہیں صرف یہی دو ہیں تو مجھ کو اپنی عصمت کے مقابلہ میں جیل خانہ اختیار کر لینا بخوشی پسند ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جواب زنانِ مصر کے سامنے تو ایک نبی کا نہیں فرشتہ کا جواب تھا' لیکن چونکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر اپنے رب کی طرف اٹھی ہوئی تھی جس نے ان کی تربیت نبیانہ تربیت فرمائی تھی اس لیے یہ بلند جواب بھی گرفت میں آگیا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ (پروردگار! جس بات کی دعوت یہ عورتیں مجھ کو دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں قید میں جانا میرے نزدیک قابل ترجیح ہے۔ ان مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جب معاملہ پروردگار کے سامنے آگیا تھا تو اب یہاں ایک تیسرا راستہ اور بھی تھا اور وہ پوری عافیت تھی یعنی نہ ان کی دعوت کو لبیک کہنا پڑے اور نہ جیل خانہ کی مصیبت سہنی پڑے۔ رب کے سامنے نہ یہ مشکل ہے نہ وہ مشکل ہے اس قسم کی گرفتیں صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے ساتھ ہوتی ہیں اور ان کا مقصد ان کے منصب کی بلندی اور نزاکت کا اظہار اور عام انسانوں کو یہ سبق دینا ہے کہ ضعیف انسان کو کسی موقعہ پر بھی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالنا چاہیے جو اس کے ضعف بشری کے مناسب نہ ہو بلکہ اپنے پروردگار سے ہر حالت میں عافیت ہی عافیت طلب کرنی چاہیے انسان کی استقامت کتنی ہی مضبوط ہو مگر اس کو آزمائش میں ڈالنا کیا ضرور۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہے کہ جتنی آزمائشوں میں وہ پھنستے ہیں اتنے ہی اور کھرے ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کلمہ کو بھی جس صداقت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے منہ سے نکالا تھا پھر آخر دم تک اسی مضبوطی کے ساتھ اس کو نباہا بھی حتیٰ کہ جب ان کو رہائی کی خبر ملی تو جلدی سے فوراً اس طرح باہر نہیں آگئے کہ پہلے جو بات ان کے منہ سے نکل گئی تھی گویا وہ بے سوچے سمجھے نکل گئی تھی یا صرف وقتی جذبات تھے جس پر بعد میں ان کو ندامت ہو سکتی تھی بلکہ بڑی استقامت کے ساتھ فرمایا کہ تم رہائی کا حکم لے کر آئے ہو مگر جس نے اپنی خوشی سے جیل خانہ پسند کیا تھا وہ اس وقت تک اپنی رہائی پسند نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے سر تہمت رکھنے والی عورتیں خود بھی اس کے بے گناہی کا اعتراف نہ کر لیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ نبی کی زبان سے جو کلمہ نکل گیا تھا وہ اس کے قلب کی کس گہرائی سے نکلا تھا اور آخر تک کس شان کے ساتھ اس کو نباہا گیا۔ یہ شان انبیاء علیہم السلام ہے' مگر سنت اللہ یہاں بھی پوری ہو کر رہی۔ آخر ان کے الفاظ کے جو آثار ہونے تھے وہ نمایاں ہو کر رہے' یہ شانِ الٰہی تھی یہ دونوں شانیں اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں اور عام انسانوں کی زندگی کے لیے اہم اسباق ہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے ﷺ ......

اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ وَلَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ — رحمت نازل فرمائے وہ کسی اور اگر کہیں میں حضرت یوسف کی برابر مدت تک

ﷺ..... ان کے اوراق زندگی متحمل نہیں یہ صرف انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں اور عام انسانوں کی زندگی کے لیے اہم اسباق ہیں۔اس کے پڑھنے کے لیے ان کے اوراق زندگی متحمل نہیں یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے صحیفہ حیات میں پڑھے جاسکتے ہیں۔

اس عمیق اور نازک پہلو کو بعض مفکرین نے نہیں سمجھا اور صرف یہ کہہ کر ان مفسرین پر رد کرنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا معاملہ ان مفسرین کے نزدیک گویا صرف ان کی اپنی بدشگونی اور بد فالی کا نتیجہ تھا حالانکہ ان مفسرین کے سامنے اس قسم کی گرفتوں کا ایک پورا باب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک بات جو دو انسانوں کے مابین کتنی بھی معقول سے معقول سمجھی جائے لیکن جب وہی بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان آ جائے تو پھر ضروری نہیں کہ اسی درجہ میں معقول ثابت ہو۔حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر سوال و جواب کیے تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو اتنا معقول جواب دیا کہ آخر ان کو خاموش ہو جانا پڑا۔لیکن جب یہی سوال ان سے پروردگار نے فرمایا تو حضرت آدم علیہ السلام جواب کا ایک حرف زبان پر نہ لا سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب اپنے بھائی یوسف کی اس مصیبت کا نقشہ آیا تو آپ ان کی داد دینے کے لیے یہاں بھی فوراً بے تاب ہو گئے اور صرف اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان کی عزت و احترام کی خاطر تواضع کے ہی کلمات اپنے حق میں استعمال فرما سکتے تھے وہ استعمال فرما لیے۔یہ ہے اخوت نبوت کہ سر پر سرداری کا تاج رکھا ہوا ہے مگر یوں نظر آتا ہے کہ آپ اپنے بھائیوں پر فوقیت کے جذبات سے اتنے خالی ہیں گویا ادھر التفات ہی نہیں ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ ساری داستان صرف ایک ایسے خواب ہی کی بدولت تو پھیلی تھی جس سے ان کی برتری ظاہر ہوتی تھی مگر آپ کی شان یہاں بالکل جدا تھی۔حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کامل کا کمال جتنا بڑھتا جاتا ہے اس کی شان تواضع اتنی ہی اور بڑھتی چلی جاتی ہے اس کے انکسار و تواضع کے کلمات اس کے نقص کا موجب نہیں ہوتے بلکہ اور اس کے کمال کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا نقشہ بار بار آپ کے سامنے آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ قرآن کریم نے خاص طور پر آپ سے خطاب فرمایا تھا **فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل** یعنی جس طرح سب اولوالعزم رسول ہمیشہ صبر کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح تم بھی صبر پر قائم رہنا۔پس چونکہ قرآن کریم ہی نے آپ کے صبر کے لیے انبیاء سابقین کا تصور آپ کے سامنے رکھا تھا اس لیے ہر ہر صبر آزما موقعہ پر آپ صبر فرماتے اور سابق انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ صبر سامنے رکھتے جاتے اور جب یہ صورت حال حسب الاتفاق بیان میں آ جاتی تو ہر جگہ یوں معلوم ہوتا گویا آپ کی نظروں میں صبر کا پلہ ان ہی کا بھاری ہے۔

آپ کی اس شانِ تواضع و انکسار میں بڑا دخل اس کا بھی تھا کہ آپ کی فطرت میں عبدیت اس طرح گوندھی گئی تھی کہ آپ کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست، غصہ و رضاء، مقہوری اور اقتدار کی ہر ہر اداء میں وہ بے اختیار ٹپکتی نظر آتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنی زبان سے جو نکالتے ہیں وہ صرف ان کے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کی فطرۃ کے ترجمان ہوتے ہیں۔حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ابھی آپ پڑھ چکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبدیت کا تذکرہ عنقریب آپ اسی جلد میں پڑھنے والے ہیں پس ایک موقعہ پر آپ نے چونکہ عبدیت کو ملوکیت پر از خود ترجیح دے کر اپنے حق میں عبدیت ہی کو پسند فرما لیا تھا اور اس لیے پسند فرمایا تھا کہ یہ جو ہر روزِ ازل ہی سے آپ کی فطرت میں ودیعت فرما دیا گیا تھا اس لیے عمد و نسیان کے ہر ہر موقعہ پر اختیار و بے اختیار جو کلمات بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلتے وہ ﷺ.....

مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ.

(متفق علیه وراجع ترجمان السنة ج ۱ ص ۱۷)

جیل خانہ میں قید رہتا اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے میرے بلانے کے لیے کوئی شخص آتا تو میں اس کے ساتھ ہو لیتا۔ (متفق علیہ)

الانبياء والرسل عليهم الصلوة والسلام كلهم بشر و كلهم عبادا الله تجرى عليهم سنة الله ماتجرى فى سائر عباده

انبیاء علیہم السلام سب بشر تھے اور سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت نوعِ بشری کے لیے ٹھہر چکی ہے وہ ہمیشہ اُن پر بھی جاری ہوتی چلی آئی ہے

(۹۹۸) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ

(۹۹۸) عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ

لله ...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کے سچے گواہ ہوتے۔ اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات ہر موقع پر کسی خاص ارادہ یا خاص مصلحت ہی سے نکلا کرتے تھے بلکہ عربی کے محاورہ کا مصداق تھے (الاناء تير شيح بما فيه) یعنی برتن سے وہی ٹپک ٹپک کر نکلتا ہے جو اس میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔

اب آپ اس خاص صفت عبدیت کے پیش نظر سوچئے کہ ایک عبد کا نقشہ یہاں کیا ہونا چاہیے کیا یہی نہیں کہ جب اس کا آقا اس کو جیل خانہ میں بھیجے تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ وہ جیل خانہ میں داخل ہو جائے اور جب اس کو باہر آنے کا حکم دے تو اسی طرح خوشی خوشی باہر نکل آئے۔ گویا قید و رہائی کے دونوں معاملے اپنے آقا کے حکم برداری کے سامنے اس کے لیے برابر ہوں۔ اگر آپ کا جواب آپ اس روشنی میں پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو فروتنی کے جملے یہاں آپ کے دہن مبارک سے نکلے رہے تھے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برتری کے سب سے کھلی دلیل تھے۔

آپ نے اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں پانچ مشہور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ کی اخوۃ نبوت ملاحظہ فرمائی۔ اب چند اور واقعات بھی ترجمان السنہ کے ان صفحات پر ضرور ملاحظہ فرما لیجئے: ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۳۱۸ تا ۳۲۳۔ امید ہے کہ اخوۃ نبوت کا مفہوم اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لیے یہ واقعات آپ کے لیے کافی ہوں گے۔ اور اس کے بعد ان احادیث میں جو سوال و جواب کیے گئے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی کوئی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ اگر ان احادیث پر نظر کرنے کے وقت اس طرف بھی خیال کر لیا جاتا کہ یہ الفاظ کن تاثرات کے ماتحت تھے تو ان کی تاویل کی بجائے یہ روشن ہو جاتا کہ اخوت نبوت کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کے اداء کیے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہتا۔

(۹۹۸) * انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا مسئلہ کوئی حدیثی مسئلہ نہیں بلکہ قرآنی مسئلہ ہے' اس نے ان کی بشریت کو جا بجا مسلمات اور بدیہیات کی طرح پیش کیا ہے۔ قاضی عیاض مالکیؒ نے جو توقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑا بلند مذاق رکھتے ہیں اپنی تصنیف ''الشفاء'' میں مسئلہ عصمت پر بحث کرتے ہوئے آخر میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول یقیناً معصوم ہوتے ہیں مگر بشریت سے معصوم نہیں ہوتے وہ بشر کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے جملہ ادوار طفلی' شباب اور شیخوخت سب سے عبور کرتے ہوئے آخر میں ہمیشہ کے لیے اسی طرح زمین میں جا کر مدفون ہو جاتے ہیں جیسا جنس بشری ہمیشہ سے مدفون ہوتی چلی آئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت عام انسانوں کے برخلاف صرف ایک صنف عورت سے ہوئی تھی بس اتنی سی بات سے نصاریٰ نے ان کا رشتہ عالم بشر سے کاٹ کر خالق بشر کے ساتھ جا جوڑا۔ مگر یہاں قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے لیے تو نہ والد تھے نہ والدہ جب وہ لله ......

اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا فَقِيْلَ لَهُ أَزِيْدَ فِي الصَّلٰوةِ فَقَالَ وَ | علیہ وسلم نے سہواً ظہر کی پانچ رکعتیں ادا فرمائیں اس پر آپ سے عرض کیا گیا ظہر کی نمازوں کی رکعتیں کیا بڑھا دی گئی ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا ہوا؟

ﷺ ..... بشر ہی رہے بلکہ ابوالبشر تو یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو تھیں۔ تعجب ہے کہ جن کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور والد ماجد بھی پھر ان کی بشریت سے انکار کی جرأت کیونکر ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل پر جب اہواء وخواہشات کے حجابات پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کا بھی انکار کرنے لگتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جب تمام مخلوقات میں بشر ہی سب سے افضل اور سب سے اشرف مخلوق ہے تو پھر رسولوں کی بشریۃ کا انکار کر کے وہ ان کو آخر اور کس مخلوق میں شامل کرے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خالق کی جانب میں تو کسی امر میں بھی شرکت کی گنجائش نہیں نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ پھر خالق سے ہٹ کر مخلوق ہی کا دائرہ ہے۔ اس میں سب سے افضل واشرف یہی نوع انسانی ہے' اسی کو قدرت نے اپنی خلافت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام کی بشریت سے انکار صرف قرآن وحدیث کا انکار نہیں اپنے مشاہدہ کا بھی انکار ہے' بلکہ اس مقدس گروہ کی سب سے بڑی فضیلت کا انکار ہے۔ تعجب ہے کہ انسان نے مسجود ملائک ہونے کے بعد بھی اپنی شرافت کو نہیں سمجھا اور تاجِ خلافت کے بعد بھی اپنی قدر نہیں پہچانی اگر وہ اسی کی حقیقت سمجھتا تو رسولوں کو بشر کہنا اس کو ہرگز بار نہ گذرتا۔ اس کے برعکس یہاں دوسرا طبقہ وہ ہے کہ جب وہ بشریت کا قائل ہوا تو اس نے رسولوں کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں اس طرح سمجھ لیا کہ پھر ان کے حق میں کسی امتیاز کا قائل ہونا ان کے نزدیک گویا ان کی بشریت ہی کے انکار کے مرادف بن گیا اس لیے اس بدیہی مسئلہ کی تفہیم کے لیے مجبوراً ہمیں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ عالم میں قدرت نے مختلف انواع اور انواع میں مختلف اصناف پھر اصناف میں مختلف استعداد کے افراد پیدا فرمائے ہیں دیکھئے جمادات' نباتات' حیوانات اور انسان۔ یہ مختلف انواع ہیں۔ اور ہر عاقل جانتا ہے کہ ان انواع میں کتنا فرق ہے جمادات بالکل بے حس وشعور نظر آتے ہیں نباتات یہاں کچھ ان سے پیش گام ہیں اور حیوانات کچھ کچھ ادراک وعلم سے بھی فیضیاب معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ جب آخری نوع کا نمبر آتا ہے تو اس کے شعور وحس' علم وادراک کے سامنے دوسری انواع ایک ذرہ بے مقدار نظر آتی ہیں مگر کیا اس کی اس برتری کی وجہ سے دوسری انواع کے ساتھ اس کی مخلوقیت میں شرکت سے کوئی شخص انکار کر سکتا ہے؟ اسی طرح اب اگر اصناف برابر ہیں ان میں باہم کوئی تفاضل نہیں۔ اسی طرح اب اگر ہر صنف کے افراد پر غور کرو تو ہر صنف کے افراد میں بھی فضل وقیمت کا اتنا بڑا تفاوت نظر آئے گا کہ اس کا ضبط واحصاء مشکل ہے لعل وجواہرات کی قیمتوں کے تفاوت پر غور کرو۔ اسی طرح حیوانات میں گھوڑے کی صنف کے افراد کی قیمتوں پر غور کرو تو تم کو یہاں فضیلت کے اتنے درجات نظر آئیں گے کہ صنفی اشتراک کے بعد بھی ان میں گویا کوئی اشتراک ہی نہیں ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کا حال ہے بلکہ یہ نوع جتنی شریف تر ہے اس کے افراد میں تفاوت بھی اتنا ہی بے اندازہ ہے۔ کافر بھی انسان ہی کا فرد ہے اور مسلم بھی' پھر مقبولین کے افراد کو اگر مجملاً ضبط کرو تو قرآن کریم کے الفاظ میں وہ چار طائفہ ہیں انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ ان کے مابین فضائل وکمالات میں بے اندازہ تفاوت ہے' پھر یہی حال ان میں سے ہر طائفہ کا ہے۔ اس لیے کسی صنف یا نوع کے افراد میں ان کے باہم تفاضل کا انکار کرنا نہ تو یہ حقیقت پر مبنی ہے اور نہ ان کے تفاضل کا اقرار کر کے ان کے صنفی یا نوعی اشتراک کا انکار کرنا یہ علم کی بات ہے۔

واضح رہے کہ بشر گو اضعف المخلوقات ہے مگر اس میں ترقی وعروج کی اتنی عظیم صلاحیت موجود ہے کہ ایک انسان ترقی کرتے کرتے ایسے عالی سے عالی مقام تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے جہاں مقرب سے مقرب ملک بھی جانے کی طاقت نہیں رکھتا شب ﷺ .....

مَاذَاکَ قَالُوْ صَلَّیْتَ خَمْسًا فَسَجَدَ سَجْدَ تَیْنِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ انہوں نے عرض کیا' آج آپ نے پانچ رکعتیں ادا فرمائی ہیں- یہ سن کر آپ نے سلام کے بعد سہو کے لیے دو سجدے کیے اور ایک روایت میں ہے

لله ...... معراج کے سارے سفر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے لیکن ایک موقعہ ایسا بھی آیا جہاں سے آگے تجاوز کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور جب ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاقت ترک کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو بڑے خوف کے انداز میں اتنا ہی عرض کر سکے۔

اگر یک سر موئے برتر پرم　　فروغ تجلی بسوزد پرم

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سب کے لیے بس اپنا ایک ایک مقام مقرر ہے- اس لیے اگر میں یہاں سے ایک بال بھر بھی آگے پرواز کروں تو تجلی ربانی میرے بال و پر سب سوخت کر دے- اس تجلی کی تاب و طاقت تھی تو ایک بشر ہی میں تھی آخر وہی آگے بڑھا اور صرف آگے ہی نہیں بلکہ منازل قرب طے کرتے کرتے وہاں جا پہنچا جہاں کا نقشہ اگر الفاظ میں کچھ ادا ہو سکتا ہے تو فکان قاب قوسین ہے اور ابھی اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ اس میں "اَوْ اَدْنٰی" کی گنجائش اور نکل آئی پھر اس کی حد کیا تھی- یہاں پہنچ کر قرآن کریم نے بھی سکوت اختیار کر لیا ہے- پھر کس کی مجال ہے کہ اس کے بعد لب کشائی کر سکے ؏

قلم اینجا رسید و سر بشکست

مگر کیا ان مدارج قرب کے بعد بشر مخلوقیت کے دائرہ سے ایک قدم بھی باہر نکل سکا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ - چنانچہ وہی بشر جو قرب کے اتنے منازل طے کر چکا تھا جب پھر واپس ہوا تو اس پر بشریت کی قباء پہلے سے زیادہ مزین تھی اور اس عظیم الشان قرب کے بعد جو انعام ساتھ لایا وہ عبادت کا خاص طریقہ اور عبدیت کی ایک نرالی شان تھی- ہجرت سے پہلے پہلے ان سارے کمالات سے اس کو نوازا گیا اور ہجرت کے بعد تا وفات اپنی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں جس امر کا اس نے مظاہرہ کیا وہ سر تا پا عبدیت ہی عبدیت تھی- شیخ اکبرؒ لکھتے ہیں کہ مقام عبدیت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مقام ہے ایک مرتبہ مجھ پر سوئی کے ناکہ کی برابر منکشف ہوا تھا تو میں اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور قریب تھا کہ جل گیا ہوتا- سبحان اللہ جہاں جبرئیل علیہ السلام قدم نہ اٹھا سکے وہاں شیخ اکبرؒ کے قدم کیا سنبھلتے-

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں عبداللہ بطور لقب صرف دو نبیوں کی شان میں آیا ہے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے اور دوسری ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ولادت کے بعد جو پہلا کلمہ زبان سے نکالا وہ یہ تھا ﴿اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ﴾ (کسی شبہ و تردد کے بغیر میں اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ہوں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْ ایَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا﴾ (الجن: ۱۹) دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں عبداللہ کا لقب اپنے حق میں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے استعمال کیا ہے اور یہاں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خود حق تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے چنانچہ اسراء کا ذکر شروع فرماتے ہوئے ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ میں آپ کی اسی صفت عبدیت کو ذکر کیا ہے بلکہ اس کو خاص طور پر اپنی طرف منسوب کر کے اور مشرف و مکرم بنا دیا ہے پس معراج کا ثمرہ یہ نہیں تھا کہ آپ کی بشریت کی قباء اتار کر آپ کو کوئی دوسری قباء پہنا دی گئی تھی بلکہ اسی کی اور تکمیل کی گئی تھی- سچ تو یہ ہے کہ مولیٰ کی نوازش جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے عبد کی عبدیت میں اتنا ہی اور اضافہ ہوتا جاتا ہے- اس لیے جس فریق نے انبیاء علیہم السلام کے امتیازات اور فضائل کا باب پڑھ کر ان کے بشر ہونے کا ہی انکار کر ڈالا وہ بھی تاریکی میں لله .....

مِثْلُكُمْ اَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ وَ اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلٰوتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ.

(متفق علیہ)

کہ یہ فرمایا میں بھی ایک بشر ہوں جیسے تم بشر ہو اور بھول بھی جاتا ہوں جیسا تم بھول جاتے ہو اس لیے جب میں بھولا کروں تو مجھے یاد دلا دیا کرو اور ایک مسئلہ یہ اور سن لو کہ جب تم کو نماز میں شک پیش آ جائے تو پہلے کسی ٹھیک بات پر اپنی رائے جمانے کی کوشش کرو پھر اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کر لو پھر سلام پھیر کر سہو کے دو سجدے کر لیا کرو۔ (متفق علیہ)

(۹۹۹) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهٗ وَ يَخِيْطُ ثَوْبَهٗ وَ يَعْمَلُ كَمَا يَعْمَلُ اَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهٖ وَ

(۹۹۹) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چپل کو خود درست فرمالیا کرتے' اپنے کپڑے خود سی لیتے اور اپنے گھر میں اسی طرح سب کام کاج کر لیا کرتے تھے جیسا تم سب لوگ

للہ ..... ہے اور جس نے ان کی بشریت کا اقرار کر کے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا - وہ بھی مقام رسالت سے بڑا بے بہرہ رہا - انبیاء علیہم السلام کا ٹھیک مقام یہ ہے کہ وہ بشر ہوتے ہیں' بلکہ سید البشر ہوتے ہیں - اگر خدا تعالیٰ کے رسول بشر نہ ہوتے تو نوع بشری کے لیے کوئی فضیلت ہی نہ ہوتی بلکہ وہ اسفل السافلین میں پڑی ہوئی نظر آتی - سورۂ والتین کے شروع میں چار بڑی نبوتوں کا تذکرہ فرما کر انسان کا احسن تقویم پر ہونا اس لیے بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی انسان کی اس فضیلت کا ثبوت ملتا ہے ورنہ عام انسان جو نہ تو ایمان سے آشنا ہیں نہ عمل صالح سے ان کا رتبہ خس و خاشاک سے بھی بدتر ہے - ان کو دیکھ کر کون باور کر سکتا ہے کہ انسان سب سے اشرف مخلوق ہو سکتی ہے - جس کو زندگی کے باہم تعلقات میں محارم و غیرہ محارم' حلال و حرام' دغاء و فریب' قتل و غارت' عریانی و ستر' حتی کہ بول و براز تک کی تمیز نہ ہو کیا وہ انسان ہے جس کو دیکھ کر اشرف المخلوقات کہا جا سکتا ہے - معیشت و معاشرت کی یہ سب اصلاحیں صنف بشری میں صرف ان بشر کے ذریعہ ہوتی ہیں جو رسول کہلاتے ہیں - تفصیل کے لیے ترجمان السنہ جلد اول میں ''اسلام میں رسول کا تصور'' کا مضمون دیکھیے -

(۹۹۹) * یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنی چاہیے کہ ہر انسان کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند انسان کیوں نہ ہو بلکہ اس کی اندرونی زندگی میں ایک نہ ایک گوشہ ضرور ایسا ہوتا ہے جو خود اس کی نظروں میں بھی اس کی کمزوری کا ثبوت ہوتا ہے اسی لیے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی اندرونی زندگی کا ہر ہر گوشہ باہر آ جائے لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان بشریت بھی عجیب در عجیب ہوتی ہے ان کی ان دونوں حالتوں میں ذرا فرق نہیں ہوتا بلکہ ان کی اندرونی زندگی بھی اسی طرح شریعت کا ایک جزء ہوتی ہے جیسا کہ بیرونی زندگی اور اسی مقصد کے پیش نظر ازواج کی کثرت ان کے حق میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہوتی ہے - انسانی معیشت کی خوبی یہ ہے کہ اس کو اپنے گھر کے کسی کام سے بھی عار نہ ہو وہ ایک طرف گھر کا آقا بھی ہو اور دوسری طرف اپنی ہر ضرورت کو بے تکلف خود بھی انجام دے لیتا ہو - جو تین کام یہاں حدیث میں مذکور ہیں گو یہ بہت معمولی سے ہیں مگر انسان کی نفسی بشریت کے ثبوت کے لیے بہت اہم ہیں صرف صورت کے بشر تو بہت ہوتے ہیں لیکن جو سیرت میں بھی بشر ہوں وہ کم ہیں - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معمولی اعمال آپ کی بشریت کی تکمیل کے لیے نہ تھے بلکہ جس کامل بشریت کے آپ مالک تھے ان کے طبعی آثار تھے - للہ .....

قَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهُ وَ يَحْلُبُ شَاتَهُ وَ يَخْدِمُ نَفْسَهُ. (رواہ الترمذی)

کر لیتے ہو اور فرماتی تھیں آپ بھی ایک بشر ہی تھے اپنے کپڑوں کی جوئیں تلاش کر لیتے - اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنی ضروریات کو خود انجام دے لیتے - (ترمذی)

(۱۰۰۰) عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلَ نَفَرٌ عَلَى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا لَهُ حَدِّثْنَا اَحَادِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ جَارَهُ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بَعَثَ اِلَيَّ فَكَتَبْتُهُ لَهُ فَكَانَ اِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَ اِذَا ذَكَرْنَا الْاٰخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَ اِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهُ مَعَنَا فَكُلُّ هٰذَا اُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواہ الترمذی)

(۱۰۰۰) خارجہ روایت کرتے ہیں کہ چند لوگ ان کے والد حضرت زید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں سنا دیجئے - انہوں نے فرمایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوسی تھا - جب آپ پر وحی آتی تو آپ مجھے بلا بھیجتے میں جا کر لکھ دیتا تھا اور جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو جاتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرمانے لگتے - پھر جب ہم کھانے پینے کا تذکرہ کرتے تو آپ اس میں بھی شریک رہتے - یہ ساری باتیں میں تم سے آپ ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں - (ترمذی شریف)

ﷺ ...... حدیث مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولوں کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ وہ راہبوں کی طرح ایک راہب بن جائیں' بلکہ ان کے دنیوی مشاغل بھی ان کی عبادت ہی کی ایک دوسری شکل ہوتے ہیں - اگر رسول بشر نہ ہوتے تو ان کی عبادت بھی فرشتوں کی طرح صرف تسبیح و تقدیس میں منحصر ہو کر رہ جاتی لیکن چونکہ وہ بشر ہوتے ہیں اس لیے ان کی عبادت کی ایک مستقل نوع وہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے یکسر نا آشنا ہیں یعنی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق سے تمتع حاصل کرنا مگر شرعی حدود میں رہ کر - پیٹ بھر لینا اور اسی طرح جملہ طبعی حاجات پوری کر لینا تو ایک عام بات ہے لیکن کس طریق پر ان کو پورا کرنا اور کس حد تک پورا کرنا حرام طریقوں سے اعراض کرنا اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ ضعیف اور محتاج بشر کی وہ عبادت ہے جس کا مقابلہ فرشتوں کی تسبیح و تقدیس نہیں کر سکتی - حدیث مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صرف صورت کے بشر نہ تھے بلکہ سیرت کے بھی بشر تھے -

(۱۰۰۰) ٭ اوپر کے نوٹ میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ دنیا کی معمولی باتوں میں شرکت کرنا بھی رسولوں کا ایک کمال ہے اور ایسا کمال ہے جس کی ہر بشر کو ضرورت ہے - زید بن ثابت نے اس سارے بیان میں یہ بتا دیا کہ رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں سننے کے لیے تم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں - تم اگر چاہو تو اپنے روزمرہ کے معمولی امور میں رسول اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یاد تازہ کر سکتے ہو - اگر حضرت زیدؓ چاہتے تو یہاں آپ کی عبادت کا دفتر کھول کر رکھ دیتے مگر ان کو اسی نکتہ پر متنبہ کرنا تھا کہ رسالت کی شان ترکِ دنیا نہیں ہوتی وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کی دنیا میں بھی شریک ہوتے ہیں اور اسی ضمن میں دنیا کو دین بنا دینے کی خُو ان میں پیدا کر دیتے ہیں ان کی دنیا ان کی آخرت سے کسی جگہ بھی علیحدہ نہیں ہوتی اور جب کسی کو دنیا آخرت سے علیحدہ ہونے لگتی ہے تو وہیں وہ سختی کے ساتھ ٹوک دیتے ہیں -

(۱۰۰۱) عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ فِيْ بَيْتِه قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ فِيْ مِهْنَةِ اَهْلِه تَعْنِيْ خِدْمَةَ اَهْلِه فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ خَرَجَ اِلَى الصَّلٰوةِ.

(رواه البخاری. و فی مصنف عبدالرزاق کان یخصف نعله و یخیط ثوبه و یعمل فی بیته کما یعمل احدکم فی بیته)

(۱۰۰۱) اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں آ کر کیا کیا کرتے تھے؟ فرمایا اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری فرماتے تھے، مگر جہاں نماز کا وقت آتا بس اسی وقت نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔

(بخاری شریف)

(۱۰۰۲) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ دُعِيْتُ اِلٰى كُرَاعٍ لَاَجَبْتُ وَ لَوْ اُهْدِيَ اِلَيَّ ذِرَاعٌ لَقَبِلْتُ.

(رواه البخاری راجع ترجمان السنه ص ۳۷۵ ج ۲ و لابد)

(۱۰۰۲) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مجھ کو اگر ذرا سے گوشت پر دعوت دی جائے تو میں اس کو بھی قبول کروں اور اگر میرے سامنے بکری کی ایک دست کا بھی ہدیہ پیش کیا جائے تو میں اس کو بھی قبول کروں گا۔

(رواہ البخاری)

(۱۰۰۳) عَنْ اَبِيْ حَازِمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّمَ رَجُلًا فَاُرْعِدَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوِّنْ

(۱۰۰۳) ابو حازم روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کچھ بات کی تو وہ مارے خوف کے کانپنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میاں گھبراؤ مت میں کوئی بادشاہ تو نہیں، میں تو ایک قریشی

(۱۰۰۱) * بس بشر کی یہی وہ دینا ہے جس کو عبادت بھی کہا جاتا ہے۔ گھر کا کاروبار نہ کرنا کچھ مشکل نہیں مگر اس کاروبار کو چھوڑ کر خدائی عبادت کے لیے طبعی حاجات کی طرح بے تکلیف چل پڑنا بہت مشکل ہے۔ عبد کامل وہ ہے جو بندوں کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے مولیٰ کے حقوق بھی اور جب دونوں میں معاوضہ آ پڑے تو مولیٰ حقیقی کا حکم اس طرح بجالائے گویا اب اس کے سامنے کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ جس رسول اعظم کی تمام زندگی میں دنیا کے حقوق کی اس طرح ادائیگی اور آخرت کے فرائض کی یہ ترجیح ایک غیر متبدل دستور العمل نظر آتا ہو کیا اس کے کمال میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے۔

(۱۰۰۲) * یہ وہ ہیں جنہوں نے وادی میں بھری ہوئی بکریاں لوگوں کو تقسیم کر دی ہیں اور خود دوسروں کے ذرا سے گوشت کی دعوت یا معمولی گوشت کے ٹکڑے کا ہدیہ قبول کرنے میں ذرا عار نہیں رکھتے۔ عبدیت معمولی دعویٰ نہیں اس کا امتحان زندگی کے ہر ہر گوشہ میں ہوتا ہے۔ انسانی ضعف کے نازک مقامات اس کی حیات کے شاندار واقعات نہیں بلکہ روزمرہ کے معمولی واقعات ہیں جہاں اس کو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ میرے امتحان کے یہ بھی کوئی محل ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ ترجمان السنہ ص ۳۲۲ ج ۲ خاص طور پر ملاحظہ فرمایئے۔

(۱۰۰۳) * بادشاہوں کے درباروں میں مخاطبوں پر جو رعب پڑتا ہے وہ ان کی شاہانہ سطوت وشوکت کا اثر ہوتا ہے اور یہاں اس کمال سادگی میں جو رعب تھا وہ آپ کی کمالِ عبدیت کا اثر تھا۔ جب عبدیت کامل ہو جاتی ہے تو اس کا رعب صرف عام انسانوں ہی تک محدود نہیں رہتا وہ بادشاہوں پر بھی پڑتا ہے بلکہ حیوانات پر بھی اس کا اثر پہنچتا ہے۔

عَلَیْکَ فَاِنِّیْ لَسْتُ بِمَلِکٍ اِنَّمَا اَنَا اِبْنُ امْرَءَةٍ مِنْ قُرَیْشٍ کَانَتْ تَاْکُلُ الْقَدِیْدَ.

عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت بھی کھا لیا کرتی تھی۔ (ابن جوزی)

(رواه ابن الجوزی من طرق بعضها متصلا عن ابن مسعود و جریر قال ابن الجوزی و روی متصلا و الصواب ارساله)

(۱۰۰۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَرْکَبُ الْحِمَارَ وَ یَلْبَسُ الصُّوْفَ وَ یُجِیْبُ دَعْوَةَ الْمَمْلُوْکِ وَ لَقَدْ رَاَیْتُهٗ یَوْمَ خَیْبَرَ عَلٰی حِمَارٍ خِطَامُهٗ لِیْفٌ. (رواه ابو داؤد الطیالسی)

(۱۰۰۴) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر بھی سوار ہو جاتے' صوف کا بنا ہوا کپڑا بھی پہن لیتے اور غلام کی دعوت بھی قبول فرما لیتے ۔ جنگ خیبر میں میں نے آپ کو ایک گدھے پر سوار دیکھا جس کی باگ کھجور کی چھال کی بنی ہوئی تھی۔ (ابوداؤد طیالسی)

(۱۰۰۵) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ کَانَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَصْعَةٌ یَحْمِلُهَا اَرْبَعَةُ رِجَالٍ یُقَالُ لَهَا الْغَرَّاءُ فَلَمَّا اَضْحَوْا وَ سَجَدُوْا

(۱۰۰۵) عبداللہ بن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اتنا بڑا پیالہ تھا جس کو چار آدمی اٹھا کر لاتے تھے اس کا نام غراء تھا ۔ ایک مرتبہ جب لوگ چاشت کی نماز ادا کر کے حاضر

(۱۰۰۴) * اللہ تعالیٰ جب کسی کی بشریت میں کمال عطا فرما دیتا ہے تو اس کی نظر لباس اور سواری جیسی معمولی اشیاء سے بلند فرما دیتا ہے' وہ وقت و حاجت اور اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق ہر جائز چیز کے استعمال میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا' وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اگر بشریت کا کمال حاصل ہے تو لباس یا سواری کی کمتری سے وہ کمتر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بشریت کے کمال سے محروم ہے تو صرف لباس یا سواری کی برتری سے برتر نہیں ہو سکتا ۔ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است ۔ نہ ملک کی مروج اشیاء کے استعمال سے پرہیز کرنا کمال ہے اور نہ زمانہ کی ترقیات سے فائدہ نہ اٹھانا کمال ہے' بشر ہونا ضرور ایک کمال ہے مگر بشر کا سارا کمال عبدیت کے ساتھ ہے ۔ جس بشر میں عبدیت کے بجائے فرعونیت ہو وہ صرف صورت کا بشر ہے بلکہ یہ بھی نہیں ۔ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ.

(۱۰۰۵) * پہلے زمانہ میں بڑے بڑے برتنوں کا عام رواج تھا اور اس زمانہ کی صنعت کے لحاظ سے وسیع اور بھاری برتن عمدہ سمجھے جاتے تھے ۔ بالخصوص عرب علیحدہ علیحدہ کھانے کے عادی نہ تھے اس لیے ان کے یہاں مہمانی کے موقعہ پر لکڑی وغیرہ کے بڑے برتن استعمال ہوتے تھے ۔ ثرید عرب میں عمدہ کھانوں میں شمار ہوتا تھا اور طبی لحاظ سے بھی وہ نہایت زود ہضم ہوتا ہے پھر ایسی نوبت شاذ و نادر آتی تھی کہ کبھی اس قسم کا موقع مل جائے' اس لیے جب ایسا موقع مل جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جمع کر لیتے ان میں شہری اور دیہاتی ہر شخص ہوتا ۔ یہ کوئی بادشاہ کا دسترخوان نہ تھا جہاں کسی بے پڑھے دیہاتی کو تاب لب کشائی نہ ہوئی جس کے دل میں جو آتا وہ اپنی زبان سے کہہ گذرتا یہاں بھی ایک دیہاتی نے آپ کی اس نشست کو جب خلافِ معمول دیکھا تو ٹوکا ۔ مگر اس اخلاق پر قربان جایئے کہ آپ کو ذرا نا گوار نہ گذرا بلکہ یہاں بھی دہن مبارک سے نپے تلے وہ کلمات نکلے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا ایک سبق بن گئے یعنی انسانی بندگی اور مزاج کی شرافت یہی ہے کہ ان موقعوں پر دوسروں کا خیال مقدم رکھے آخر اس وقت میں میزبان ہوں جگہ کی تنگی میں بھی اپنی راحت کا خیال رکھنا اور ذرا جنبش نہ کرنا یہ تکبر اور سرکشی ہے ۔ اتنا سا جملہ فرما کر جو دوسری بات دہن مبارک سے نکلی وہ کھانے للّٰہ .....

الضُّحٰى اُتِیَ بِتِلْکَ الْقَصْعَةِ وَ قَدْ ثُرِّدَ فِیْهَا فَالْتَفُّوْا عَلَیْهَا فَلَمَّا کَثُرُوْا جَثَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْرَابِیٌّ مَا هٰذِهِ الْجِلْسَةُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَنِیْ عَبْدًا کَرِیْمًا وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا عَنِیْدًا ثُمَّ قَالَ کُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا وَ دَعُوْا ذِرْوَتَهَا یُبَارَکْ فِیْهَا (رواہ ابوداؤد)

ہوئے تو یہ پیالہ سامنے لایا گیا' اس میں روٹی کے ٹکڑے گوشت کے شوربے میں پکے ہوئے تھے- لوگ اس کے اردگرد بیٹھ گئے' جب مجمع زیادہ ہو گیا تو آنحضرت (جگہ کی تنگی کی وجہ سے) اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اس پر ایک بادیہ نشین شخص نے کہا نشست کا یہ کیا طریقہ ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک شریف بندہ بنایا ہے' متکبر اور سرکش نہیں بنایا- اس کے بعد فرمایا- کنارہ کنارہ سے کھاؤ اور درمیان سے نہ کھاؤ- کھانے میں برکت ہو گی- (ابوداؤد)

(۱۰۰۶) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَ مَعَهٗ صَاحِبٌ لَهٗ فَسَلَّمَ فَرَدَّ الرَّجُلُ وَ هُوَ یُحَوِّلُ الْمَآءَ فِیْ حَائِطٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ کَانَ عِنْدَکَ مَاءٌ بَاتَ فِیْ شَنَّةٍ وَ اِلَّا کَرَعْنَا فَقَالَ عِنْدِیْ مَاءٌ بَاتَ فِیْ شَنٍّ فَانْطَلَقَ اِلَی الْعَرِیْشِ فَسَکَبَ فِیْ قَدَحٍ مَاءً ثُمَّ حَلَبَ عَلَیْهِ مِنْ دَاجِنٍ فَشَرِبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَعَادَ فَشَرِبَ الرَّجُلُ الَّذِیْ جَاءَ مَعَهٗ. (رواہ البخاری)

(۱۰۰۶) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے' آپ کے ہمراہ ایک صحابی اور تھے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا- اس انصاری نے جواب دیا- اس وقت وہ اپنے باغ کو پانی دے رہا تھا- آپ نے فرمایا میاں اگر کسی پرانی مشک میں باسی پانی موجود ہو تو لیتے آؤ ورنہ ہم منہ لگا کر ہی پانی پی لیں گے- اس نے عرض کیا میرے گھر میں پرانی مشک کا باسی پانی موجود ہے یہ کہہ کر وہ اپنے مکان میں گیا اور ایک پیالہ میں پانی نکال کر اس پر گھر کی پلی ہوئی بکری کا تھوڑا سا دودھ دوہا گویا لسی تیار کی- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نوش فرمایا- اس کے بعد وہ پھر گیا اور پھر لسی بنا کر لایا اور جو شخص آپ کے ہمراہ آئے تھے وہ انہوں نے پی- (بخاری شریف)

للہ ..... کے متعلق ایک عام ہدایت تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ قلب مبارک پر اس کا ادنیٰ سا میل بھی نہ تھا- سوچو کہ اگر اس زمانہ میں ایسا واقعہ پیش آ جائے تو محفل اسی گفت وشنید میں تمام ہو جائے- کیا انسانوں میں ہے کوئی اور بندہ جو اس منصب واختیار کے ساتھ اس بزرگی کا مالک ہو اور اپنی اس اعلیٰ بندگی کا ہر مجلس میں اس طرح ثبوت دے سکے-

(۱۰۰۶) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تواضع اور اظہارِ عبدیت کا یہ نقشہ بھی قابل یادداشت ہے کہ اتنی نزاکت ونفاست مزاج کے باوجود جب آپ ایک کسان کے کھیت پر تشریف لاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بھی شاید ان ہی جیسے ایک عام انسان ہیں جنہوں نے پانی پینے کے آداب کا ایک پورا باب سکھایا ہو- آج وہ اس کسان پر باریک آداب کا بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ بڑی سادگی سے فرما دیتے ہیں کہ میاں اگر باسی پانی نہ مل سکے تو ہم تازہ ہی پی لیں گے- اور اگر تمہارے پاس برتن مہیا نہ ہو تو ہمیں عام عرب کے دستور کے مطابق منہ لگا کر پانی پی لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہے- مگر جس کے قلب میں حلاوتِ ایمان رچ چکی تھی وہ اپنے اس سارے جہاں سے معزز مہمان کے لیے وہ تکلف کر کے لایا جو ایک مہذب سے مہذب انسان اس موقعہ پر کر کے لا سکتا تھا ادھر یہاں چونکہ دوسرے کی مہمانی للہ .....

الرسول العظيم كان يبتلى بالجوع كما يبتلى به سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت اسی طرح پیش آئی جیسا عام بشر کو بھی پیش آجاتی ہے

(۱۰۰۷) عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ شَكَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُوْعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِهَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِهِ عَنْ حَجَرَيْنِ.

(رواه الترمذی و قال هذا حديث غريب و الحديث مروی فی البخاری فی غزوة الخندق مع تغير يسير. و راجع ترجمان السنة ص ۴۴۹ ج ۱)

(۱۰۰۷) ابوطلحہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ خندق میں شدتِ بھوک کی شکایت کی اور اپنے اپنے پیٹ کھول کر دکھائے کہ ان پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیٹ جو کھولا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ (بخاری شریف وترمذی شریف)

(یہاں ترجمان السنۃ ص ۴۴۹ جلد اوّل ضرور ملاحظہ فرمالی جائے)

الرسول العظيم لدغته عقرب فاسترقى منه كما يسترقى سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے ایک بار کاٹا اور آپ نے اس پر اسی طرح دم فرمایا جیسا بشر کو دم کرنا چاہیے

(۱۰۰۸) عَنْ عَلِیٍّ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ يُصَلِّیْ فَوَضَعَ يَدَهٗ

(۱۰۰۸) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرمارہے تھے۔ آپ نے اپنا دست مبارک زمین پر رکھا تو کسی

لله ..... تھی اس لیے پہلے آپ نے خود پانی نوش فرمایا پھر اپنے رفیق کو دیا لیکن جہاں آپ خود میزبان کی حیثیت میں ہوتے وہاں پہلے دوسروں کی خاطر فرماتے اور اپنے نفس کو سب کے آخر میں رکھتے کہاں تو یہ شانِ عبدیت اور کہاں لوگوں کے خیالاتِ خام۔

(۱۰۰۷) * شکم سیری اور بھوک بھی انسان کی ضعیف زندگی کا ایک جزو ہیں۔ رسول اس سنت سے بھی مستثنیٰ نہیں ہوتے بلکہ جس طرح ان کی بیماری دوسروں سے شدید تر ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی وہ دوسروں سے پیش پیش نظر آتے ہیں بھوک میں عام طور پر پیٹ میں ایک خاص قسم کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے‘ پتھر باندھنے سے کچھ تو اس کی خنکی سے سکون مل جاتا ہے اور کچھ پیٹ کا خلا پر ہو جاتا ہے اور اس طرح بھوک میں کچھ فائدہ مند ہوتا ہے۔ بہر حال بھوک میں پیٹ سے پتھر باندھنے کا محاورہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اس شدت کی حالت میں جب صحابہؓ نے مضطرب ہو کر اپنی تکلیف اپنے سب سے شفیق و مہربان رسول کے سامنے پیش کی تو معلوم ہوا کہ ان کا رسول دوہری تکلیف میں ان کا شریک تھا۔

(۱۰۰۸) * اگر ایک طرف حیوانات نے آپ کو سجدہ کیا اور پتھروں نے سلام کیا ہے تو دوسری طرف بچھو نے آپ کو کاٹا بھی ہے۔ پہلی صورت اگر آپ کی نبوت کی علامت تھی تو دوسری آپ کی بشریت کی دلیل تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبارک وملعون کی تقسیم حیوانات میں بھی ہے جو حیوانات جبلی طور پر موذی ہیں ان کی ایذاء کے لیے شعور شرط نہیں یہ ان کی فطرت ہے۔ نیش عقرب نہ از پے کین است۔ مقتضائے طبیعتش این است۔ پس جب ایک بے شعور بچھو اپنی فطرت کی وجہ سے ملعون ہو سکتا ہے تو ایک ذی شعور انسان کا اپنے اختیاری فعل پر معذب ہونے میں کیا اشکال رہا۔

علی الارض فلدغتہ عقرب فنا ولھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنعلہ فقتلھا فلما انصرف قال لعن اللہ العقرب ما تدع مصلیا و لا غیرہ او نبیا وغیرہ ثم دعا بملح و ماء فجعلہ فی اناء ثم جعل یصبہ علی اصبعہ حیث لدغتہ و یمسحھا ویعوذھا بالمعوذ تین. (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

بچھو نے آپ کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چپل لے کر اس کو مار دیا جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا خدا تعالیٰ بچھو پر لعنت کرے نہ نمازی کو بخشے نہ غیر نمازی کو یا یہ کہا کہ نہ نبی کو بخشے اور نہ غیر نبی کو اس کے بعد ذرا سا نمک اور پانی منگا کر ایک برتن میں ڈالا اور جس جگہ پر کہ بچھو نے کاٹا تھا اس جگہ اس کو ڈالتے رہے اور معوذتین پڑھ پڑھ کر انگلی پر ہاتھ پھیرتے اور دم کرتے رہے۔

(بیہقی شریف)

الرسول العظیم سحر مرۃ فمرض منہ کما یمرض سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا اور آپ پر بھی اسی طرح چل گیا جیسا عام بشر پر چل جاتا ہے

(۱۰۰۹) عن عائشۃ رضی اللہ تعالی عنھا قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحر حتی کان یری انہ یاتی النساء و لایاتیھن (قال سفیان و ھذا اشدما یکون من السحر اذا کان کذا) قال فانتبہ من نومہ

(۱۰۰۹) حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے اثر سے آپ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسا آپ اپنی بیبیوں کے پاس گئے ہیں مگر آپ کو اس کی قدرت نہ ہوتی تھی (سفیان کہتے ہیں کہ جادو کی یہ سب سے سخت ترقسم تھی) یہ کہتے ہیں ایک دن آپ نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا۔ عائشہؓ جانتی ہو آج اللہ تعالیٰ نے جس

(۱۰۰۹) * جادو کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اس سے کسی کا بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے سورۂ فلق میں جادو کے شر سے استعاذہ کی تعلیم فرمائی گئی ہے گمان ہوسکتا تھا کہ شاید رسول اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے اثبات کے لیے آپ کی حیاتِ طیبہ میں ایک واقعہ آپ پر جادو چل جانے کا بھی دکھلا دے تا کہ خوب معلوم ہو جائے کہ جن چیزوں سے عام انسان متاثر ہوتے ہیں رسول بھی ان سے متاثر ہو سکتے ہیں پھر ان کے رسول ہونے کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ وہ اس کے ازالہ کے لیے خود جادو چلانے کے بجائے ایسے کلمات استعمال فرما لیتے ہیں جو قدرت ان پر نازل فرماتی ہے۔ وہ سحر سے اتنے ممتاز ہوتے ہیں کہ نہ اس میں کہیں ارواحِ خبیثہ سے استمداد کا حرف ملتا ہے اور نہ کلماتِ کفریہ کا کوئی لفظ اور اس طرح یہ بدیہی ہو جاتا ہے کہ یہ دوسروں پر تو جادو چلانا کیا جانتے یہ تو اپنے نفس کو بھی جادو سے بچانا نہیں جانتے حافظ ابن قیمؒ سورۂ فلق کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس تکلیف میں چھ ماہ تک مبتلا رہے۔ جن میں تین دن تو اس کی تکلیف کی شدت رہی اس طویل مدت میں دشمن یوں خوش رہے کہ ان کا جادو چل گیا اور قدرت نے یہ ثابت کر دیا کہ ساحروں کی نوع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی علاقہ نہ تھا اور جب اس کے ازالہ کا وقت مقدر آ گیا تو اپنے رسول کی شفاء کے لیے عالمِ غیب سے فرشتے نازل فرمائے جنہوں نے مرض کی تشخیص، ساحر کا اتہ پتہ اور شفاء کے سب راستے مفصل بیان کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے اس جادو کو نکلوا دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفا عطا فرمائی تو جادوگروں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا وسوسہ بھی نہ آیا کہ آؤ اب ان پر جادو چلایا جائے یا کسی اور تدبیر سے ان کو اس کا بدلہ دے دیا جائے بلکہ خاموش ہو گئے اور ....

ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ يَا عَائِشَةَ (رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا) أَعَلِمْتِ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَفْتَانِيْ فِيْمَا اِسْتَفْتَيْتُهُ فِيْهِ اَتَانِيْ رَجُلَانِ فَقَعَدَ اَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِيْ وَ الْاٰخَرُ عِنْدَ رِجْلَيَّ فَقَالَ الَّذِيْ عِنْدَ رَأْسِيْ لِلْاٰخَرِ مَا بَالُ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوْبٌ قَالَ وَ مَنْ طَبَّهُ قَالَ لَبِيْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ رَجُلٌ مِنْ بَنِيْ زُرَيْقٍ حَلِيْفٌ لِيَهُوْدَ كَانَ مُنَافِقًا قَالَ وَ فِيْمَ قَالَ فِيْ مُشْطٍ وَ مُشَاقَةٍ قَالَ فَاَيْنَ قَالَ فِيْ جُفِّ طَلْعَةِ ذَكَرٍ تَحْتَ رَعُوْفَةِ بِئْرِ ذِيْ اَرْوَانَ قَالَ فَاَتَى الْبِئْرَ حَتّٰى اِسْتَخْرَجَهُ فَقَالَ هٰذِهِ الْبِئْرُ الَّتِيْ اُرِيْتُهَا وَ كَانَ مَاءَهَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَ كَاَنَّ نَخْلَهَا رُؤُسُ الشَّيَاطِيْنِ قَالَ فَاسْتَخْرَجَ قَالَتْ فَقُلْتُ اَفَلَا تَنَشَّرْتَ فَقَالَ اَمَّا اللّٰهُ فَقَدْ شَفَانِيْ وَ اَكْرَهُ اَنْ اُثِيْرَ عَلٰى اَحَدٍ مِنَ النَّاسِ شَرًّا۔

(رواه البخاري)

بات کو میں نے اس سے پوچھا تھا اس کا پتہ دے دیا ہے- اس کی صورت یہ ہوئی کہ دو فرشتے میرے پاس آئے ایک میرے سرہانے بیٹھا اور دوسرا میرے پیروں کی طرف بیٹھ گیا- جو میرے سرہانے بیٹھا تھا اس نے دوسرے سے کہا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو کیا گیا ہے- اس نے کہا کس نے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا لبید بن اعصم نے جو قبیلہ بنی زریق کا ایک آدمی ہے اور یہود کا حلیف ہے- یہ شخص منافق تھا اس نے پوچھا اچھا یہ جادو کس چیز پر کیا ہے؟ اس نے کہا ایک کنگھی اور کنگھی کشیدہ بالوں میں- اس نے پوچھا- اچھا تو وہ ٹونا کہاں ہے اس نے کہا وہ ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں رکھ کر ذی اروان کنوئیں کے اندر کے پتھر کے نیچے ہے چنانچہ آپ اس کنوئیں پر تشریف لائے اور اس جادو کو نکالا اور فرمایا- یہی کنواں تھا جو مجھ کو دکھایا گیا تھا اس کا پانی ایسا تھا جیسا مہندی کا پانی سرخ ہوتا ہے اور اس کے اردگرد درختوں پر ایسی وحشت برستی تھی گویا وہ شیطانوں کے سر ہیں- یہ کہتے ہیں آپؐ نے وہ جادو نکال لیا- حضرت عائشہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ آپؐ نے اس کو کھول کیوں نہیں؟ دیا آپؐ نے فرمایا- مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے شفاء عطاء فرما ہی دی اور اب مجھ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں کسی کو بھی کسی شر میں مبتلا کروں- (بخاری شریف)

لہ ..... عام طور پر لوگوں کے سامنے جادو کی ان اشیاء کو نکال کر دکھانا بھی پسند نہیں فرمایا مبادا مسلمانوں کو ناگواری ہو اور کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو- کیا ہے کوئی بندہ جو ایسی شانِ بندگی دکھا سکے-

واضح رہے کہ حدیث مذکور میں صاف موجود ہے کہ اس سحر کی تاثیر صرف آپ کی ازدواجی حیات تک محدود تھی اور اسی قسم کو سب سے زیادہ سخت جادو مانا گیا تھا- انبیاء علیہم السلام نہ امراض سے مستثنیٰ ہوتے ہیں نہ ایسے کلمات کے اثر سے جو کسی مرض کا سبب بن جائیں- سحر کی تاثیر کے متعلق آج لوگ منکر ہیں مگر یہ ان کی کوئی جدید تحقیق نہیں ہے معتزلہ کی جماعت پہلے سے اس کی منکر ہے لیکن جس امر کا ثبوت تواتر کے ساتھ آنکھیں مشاہدہ کر چکی ہوں دلائل سے اس کی نفی کرنا محض خام خیالی ہے- اس خاص قسم کے سحر کے لیے عرب میں ایک علاج بھی تھا جس کو نشرہ کہتے تھے- حدیث میں علاجاً ان کلمات کی اجازت بھی آئی ہے- حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس علاج کا تذکرہ فرمایا- مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ میرے پروردگار نے مجھ کو سورۂ فلق اور سورۂ والناس کے ذریعہ سے شفاء عطاء فرمادی ہے اس لیے میں یہ علاج نہیں کرتا-

الرسول العظيم سم مرة فتالم كما منه يتا لم منه سائر البشر

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلایا گیا اور اس کے اثر سے آپ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی جیسی بشر کو ہونی چاہیے

(۱۰۱۰) عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ یَهُوْدِیَّةً مِنْ اَهْلِ خَیْبَرَ سَمَّتْ شَاةً مَصْلِیَّةً ثُمَّ اَهْدَتْهَا الرَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الذراع فاکل مِنْهَا وَ اَکَلَ رَهْطٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ مَعَهٗ فقالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِرْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ وَ اَرْسَلَ اِلَی الْیَهُوْدِیَّةِ فَدَعَاهَا فَقَالَ سَمِعْتِ هٰذِهِ الشَّاةَ فَقَالَتْ مَنْ اَخْبَرَکَ قَالَ اَخْبَرَتْنِیْ هٰذِهٖ فِیْ یَدِیْ لِلذِّرَاعِ قَالَتْ نَعَمْ قُلْتُ اِنْ کَانَ نَبِیًّا فَلَنْ تَضُرَّهٗ وَ اِنْ لَمْ یَکُنْ نَبِیًّا اسْتَرَحْنَا مِنْهُ فَعَفَا عَنْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ لَمْ یُعَاقِبْهَا وَ تُوُفِّیَ اَصْحَابُهُ الَّذِیْنَ اَکَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی کَاهِلِهٖ مِنْ اَجْلِ الَّذِیْ اَکَلَ مِنَ الشَّاةِ حجمهٗ اَبُوْهِنْدٍ بِالْقَرْنِ وَ الشَّفْرَةِ وَ هُوَ مَوْلًی لِبَنِیْ بَیَاضَةَ مِّنَ الْاَنْصَارِ۔

(رواہ ابوداؤد و الدارمی)

(۱۰۱۰) جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے ایک بھونی ہوئی بکری زہر ملا کر آپ کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی آپ نے اس میں سے کچھ کھایا اور آپ کے بعض صحابہؓ نے بھی کھا لیا۔ آپ نے فرمایا کھانے سے ہاتھ اٹھا لو۔ اور اس یہودی عورت کے بلانے کے لیے آدمی بھیجا اور اس سے پوچھا تو نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ اس نے کہا آپ کو کس نے بتایا؟ آپ نے دست کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سن کر وہ بولی جی ہاں میں نے اپنے دل میں کہا تھا اگر یہ نبی ہوں گے تو ان کو یہ زہر کیا نقصان دے گا اور اگر نبی نہ ہوں گے تو ان سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودن کو معاف فرما دیا اور اس کو کوئی سزا نہیں دی اور آپ کے جن بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے وہ گوشت کھا لیا تھا ان کا تو انتقال ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس زہر آلود بکری کے اثر سے ہمیشہ اپنے شانوں کے درمیان سینگی لگوا لیا کرتے تھے۔ سینگی لگانے والا ابو ہند انصار کے قبیلہ بنو بیاضہ کا ایک آزاد کردہ غلام تھا۔ اس نے سینگ اور نشتر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینگی لگائی تھی۔

(ابوداؤد۔ دارمی)

(۱۰۱۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ مَرَضِهِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ یَا عَائِشَةُ مَا اَزَالُ اَجِدُ اَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِیْ اَکَلْتُ بِخَیْبَرَ وَ هٰذَا اَوَانُ وَجَدْتُ اِنْقِطَاعَ اَبْهَرِیْ مِنْ ذٰلِکَ السَّمِّ. (رواہ البخاری)

(۱۰۱۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس بیماری میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ہے اس میں آپؐ فرماتے تھے۔ عائشہ! جو زہر آلود کھانا میں نے خیبر میں کھا لیا تھا اس کی تکلیف مجھے ہمیشہ ہی محسوس ہوتی رہی لیکن اب اسی کے زہریلے اثر سے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ (میرا آخر وقت آ گیا ہے اور) میری شہ رگ کٹ گئی ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۰۱۱) * عالم تقدیر نے اس طرح اس یہودی عورت کا عذر بھی زائل کر دیا اور اس کے اس حیلہ کو ناکام بنانے کے لیے ایک مدت تک آپ کو بقید حیات رکھا اور آخر میں جس نوع کی شہادت ختم نبوت کے ساتھ جمع ہو سکتی تھی اس سے نوازنے کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ پھر اسی زہر کا اثر ابھرا اور عالم اسباب میں وہی آپ کی وفات کا سبب بن گیا اور اس طرح آپ کو موت شہادت کی فضیلت بھی میسر آ گئی۔

الرسول العظيم جرح مرة حتى كسرت رباعة فتداوى منه كما يتداوى سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار زخمی ہوئے حتیٰ کہ آپ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے آپ نے اس کا علاج اسی طرح کیا جیسا اور بشر کرتے ہیں

(۱۰۱۲) عَنْ اَبِیْ حَازِمٍ اَنَّهُ سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ وَ هُوَ يَسْأَلُ عَنْ جُرْحِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا وَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَاَ عْرِفُ مَنْ كَانَ يَغْسِلُ جُرْحَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَنْ كَانَ يَسْكُبُ الْمَاءَ وَ بِمَا دُوْوِیَ قَالَ كَانَتْ فَاطِمَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْسِلُهُ وَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَسْكُبُ الْمَاءَ بِالْمِجَنِّ فَلَمَّا رَأَتْ فَاطِمَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ الْمَاءَ لَا يَزِيْدُ الدَّمَ اِلَّا كَثْرَةً اَخَذَتْ قِطْعَةً مِنْ حَصِيْرٍ فَاَحْرَقَتْهَا فَاَلْصَقَتْهَا فَاسْتَمْسَكَ الدَّمُ وَ كُسِرَتْ رُبَاعِيَتُهُ يَوْمَئِذٍ وَ جُرِحَ وَ جْهُهُ وَ كُسِرَتِ الْبَيْضَةُ عَلٰى رَأْسِهِ.

(رواہ البخاری فی المغازی ص ۵۸۴)

(۱۰۱۲) ابو حازم روایت کرتے ہیں کہ سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زخم کے متعلق دریافت کیا گیا جو جنگ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لگا تھا - انہوں نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا یہ جواب خود سنا تھا وہ فرماتے تھے میں خوب جانتا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا دھلانے والا اور اس پر پانی ڈالنے والا کون کون تھا اور وہ دوا بھی کیا تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم پر استعمال کی گئی تھی - یہ کہتے تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تو زخم دھوتی جارہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ڈھال سے پانی لے کر اس پر ڈالتے جاتے تھے لیکن جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیکھا کہ پانی سے تو خون کسی طرح بند ہوتا نہیں بلکہ دونا دونا اور زیادہ ہی ہوتا جارہا ہے تو چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور اس کی راکھ لے کر زخم پر لگائی جب کہیں جا کر خون بند ہوا - اس جنگ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے چار دانت شہید ہوئے، روئے انور زخمی ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر جو خود تھا وہ بھی ٹوٹ گیا -

(بخاری شریف)

(۱۰۱۲) * شکست و فتح کے حالات بھی ایسے ہیں جو مسلم و کافر عام انسانوں میں یکساں رکھے گئے ہیں - ہرقل نے جب ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طویل سوالات کیے تو ان میں ایک سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح و شکست کے متعلق بھی تھا - پھر جب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شکست بھی ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ بول اٹھا کہ رسولوں کی شان یہی ہے - وہ شکست بھی کھاتا ہیں مگر آخر کار بول بالا انہی کا ہوتا ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر احد کے میدان میں یہ سنت بھی پوری ہوگئی اور اس درد آمیز نظر کے ساتھ پوری ہوئی کہ روئے انور زخمی ہے، دانت شہید ہو چکے ہیں اور سر مبارک کا خود چکنا چور ہو گیا ہے - کیا اب بھی اس شبہ کا کوئی موقعہ ہے کہ رسول بشر نہیں ہوتے - رسولوں کی جو سنت نہیں جانتے یہاں ان کو اگر تردد ہو تو ہو مگر جو اس سے واقف تھے ان میں شاہ ہرقل جیسے دانا نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکست ہی کو صداقت کی علامات میں شمار کیا تھا -

الرسول العظيم كان يهمه كما يهم سائر البشر

(۱۰۱۳) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لِنِسَائِهٖ اِنَّ اَمْرَكُنَّ مِمَّا يُهِمُّنِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَ لَنْ يَّصْبِرَ عَلَيْكُنَّ اِلَّا الصَّابِرُوْنَ الصِّدِّيْقُوْنَ قَالَتْ عَائِشَةَ يَعْنِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ثُمَّ قَالَتْ عَائِشَةُ لِاَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ سَقَى اللّٰهُ اَبَاكَ مِنْ سَلْسَبِيْلِ الْجَنَّةِ وَ كَانَ ابْنُ عَوْفٍ قَدْ تَصَدَّقَ عَلٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِحَدِيْقَةٍ بِيْعَتْ بِاَرْبَعِيْنَ اَلْفًا. (رواه الترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان امور کی فکر لاحق ہوتی تھی جن کی فکر بشر کو فطرۃً لاحق ہونی چاہیے

(۱۰۱۳) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیبیوں سے فرمایا کرتے تھے- تمہارا معاملہ بھی ایسا ہے جس کی مجھ کو اپنے بعد فکر ہے اور تمہاری نگرانی میں حصہ لینے والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو بڑے ضبط و ہمت والے ہوں گے- یہ حدیث بیان فرما کر حضرت عائشہؓ ابو سلمہؓ کے لیے دعائیہ کلمات فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے والد کو جنت کے اس چشمہ کے پانی سے سیراب کرے جس کا نام سلسبیل ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد عبدالرحمٰن بن عوف نے امہات المؤمنین کی خدمت میں ایک باغ پیش کیا تھا جو چالیس ہزار درہم میں فروخت ہوا تھا-

(ترمذی شریف)

(۱۰۱۳) * یہ پہلے بار بار گذر چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت ان تمام چیزوں سے متاثر ہوتی ہے جن سے کہ بشری فطرت کو متاثر ہونا چاہیے وہ جس طرح بھوک' پیاس اور سرد و گرم کے احساس میں عام بشر کے شریک ہوتے ہیں- اسی طرح مسرت و غم میں بھی ان کے شریک ہوتے ہیں- آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ غمگین ہوئے اور آپ کی چشم مبارک سے آنسو بہ نکلے- اسی طرح بیبیوں کا بھی معاملہ ہے ان کے متعلق بھی آپ کو اس حد تک فکر تھی جس حد تک بشر کو ہونی چاہیے- ظاہر ہے کہ آپ نے ان کے لیے خاص طور کے متعلق بھی آپ کو اس حد تک فکر تھی جس حد تک بشر کو ہونی چاہیے- ظاہر ہے کہ آپ نے ان کے لیے خاص طور پر مال و اسباب کا کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا تھا' مگر جس امر میں یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کو امتیاز ہوتا ہے وہ ان کے ان صبر آزما حالات میں ان کے استقامت اور شرعی حدود کا پورا پورا تحفظ ہے- وہ بھی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ بڑی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے- ان کے قلب پر اس کا وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ ان حالات میں ان کا قدم حدود شریعت سے سرمو ادھر اُدھر جائے- یہاں جس طرح ان کا احساسِ غم ان کی فطرت ہوتی ہے اس سے بڑھ کر اپنی شریعت کی حدود کا تحفظ بھی ان کی فطرت ہوتی ہے پھر یہ فطری احساسات بھی قدرت ان میں اس لیے ودیعت فرماتی ہے تاکہ وہ عام بشر کے لیے ان حالات کی سنت کا عملی نمونہ پیش کر سکیں- گزشتہ صفحات میں انسانی حیات کے معمولی سے معمولی حوادث آپ نے ملاحظہ فرمائے اور حدیثوں میں اس قسم کے علاوہ بھی اور بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ان تمام مقامات میں آپ اسی سنت اللہ کے ماتحت نظر آئے جو نوع انسانی کے لیے روزِ اوّل سے مقدر ہو چکی ہے- کیا یہ آپ کی بشریت کا قطعی ثبوت نہیں- روایت مذکورہ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امہات المومنین کا مقام حضرت رسالت میں کیا تھا' اسی لیے ائمہ حدیث نے حدیث مذکور کو مناقب کے باب میں ذکر فرمایا ہے- کوئی شبہ نہیں کہ جن نفوسِ طاہرہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول کی ومساوی کے لیے انتخاب فرمایا تھا ان سے رسول کی ذاتِ اقدس کا تعلق بھی اسی دل سوزی کا ہونا چاہیے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات تلطف امہات المؤمنین کی بزرگی و عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں-

الرسول العظیم لحق بالرفیق الاعلی علی سنۃ سائر البشر

(۱۰۱۴) عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ اَنَّ عَائِشَۃَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْہُ قَالَتْ اَقْبَلَ اَبُوْبَکْرٍ عَلٰی فَرَسِہٖ مِنْ مَسْکَنِہٖ بِالسُّنْحِ حَتّٰی نَزَلَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمْ یُکَلِّمِ النَّاسَ حَتّٰی دَخَلَ عَلٰی عَائِشَۃَ فَتَیَمَّمَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ ھُوَ مُسَجًّی بِبُرْدِ حِبَرَۃٍ فَکَشَفَ عَنْ وَجْھِہٖ ثُمَّ اَکَبَّ عَلَیْہِ فَقَبَّلَہٗ ثُمَّ بَکٰی فَقَالَ بِاَبِیْ اَنْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ لَا یَجْمَعُ اللّٰہُ عَلَیْکَ مَوْتَتَیْنِ اَمَّا الْمَوْتَۃُ الَّتِیْ کُتِبَ اللّٰہُ عَلَیْکَ فَقَدْ مُتَّھَا قَالَ اَبُوْ سَلَمَۃَ فَاَخْبَرَنِیْ ابْنُ عَبَّاسٍ اَنَّ اَبَابَکْرٍ خَرَجَ وَ عُمَرُ یُکَلِّمُ النَّاسَ فَقَالَ اجْلِسْ فَاَبٰی فَقَالَ اجْلِسْ فَاَبٰی فَتَشَھَّدَ اَبُوْبَکْرٍ فَمَالَ اِلَیْہِ النَّاسُ وَ تَرَکُوْا عُمَرَ فَقَالَ اَمَّا بَعْدُ فَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) فَاِنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) قَدْ مَاتَ وَ مَنْ کَانَ

بشری سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرآخرت

(۱۰۱۴) ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ یعنی حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان کیا کہ ابوبکرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سن کر) اپنی قیام گاہ مقام سخ سے گھوڑے پر سوار ہوکر تشریف لائے اور یہاں آکر مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات کیے بغیر حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف لے گئے اور سیدھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچے۔ آپؐ پر اس وقت ایک یمنی چادر ڈھکی ہوئی تھی، انہوں نے آپ کے چہرۂ مبارک سے چادر اٹھائی اور جھک کر آپ کو بوسہ دیا اور رو پڑے اور فرمایا یا نبی اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہیں کرے گا، جو موت اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقدر فرمائی تھی وہ تو آپ کو آ چکی ہے۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ اس کے بعد ابوبکرؓ باہر تشریف لائے تو عمرؓ لوگوں سے کچھ فرما رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے فرمایا آپ بیٹھ جائیں لیکن وہ نہ مانے آپ نے ان سے پھر کہا آپ بیٹھ جائیں، مگر انہوں نے پھر انکار کیا۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے خود خطبہ دینا شروع کر دیا لوگ عمر کو چھوڑ کر فوراً ان کی جانب متوجہ ہو گئے انہوں نے حمد وثنا کے بعد فرمایا۔ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تو

(۱۰۱۴) * موت انسان کی بشریت کا آخری ثبوت ہے، جو شخص ولادت اور موت جیسے واضح عوارض کو بھی بشریت کی دلیل نہیں سمجھتا وہ پھر خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھ سکتا۔ اس حدیث سے یہ احکام ثابت ہوتے ہیں۔ وفات کے بعد آپ پر چادر ڈھانکنا۔ آپؐ کے روئے انور کو بوسہ دینا۔ وفات کے بعد آپ کو یا نبی اللہ سے خطاب کرنا۔ آپ کی وفات کا منبر پر اعلان کرنا اور یہ خطبہ دینا کہ عبادت کے قابل صرف وہی ایک ذات ہے جس کو کبھی فنا نہیں وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عرب میں ندا کے بہت سے اقسام ہیں۔ نثر ونظم میں غائب وحاضر اسی طرح حیی ومیت بلکہ جمادات کو ندائیہ کلمہ سے یاد کرنا ان کا عام دستور تھا۔ محض اس لفظ سے عقائد بگاڑ لینے اور کفر کے فتوے لگا دینے دونوں علم سے ناواقفیت اور مبالغہ کی باتیں ہیں، جس کو اپنے ایمان کی قدر ہو اس کو شرکیہ عقائد سے دور دور رہنا چاہیے اور اسی طرح بات بات پر کفر کے فتوے لگانے سے بھی احتراز رکھنا چاہیے۔

يَعْبُدُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اِلَى الشّٰاكِرِيْنَ. وَ اللّٰهِ لَكَاَنَّ النَّاسَ لَمْ يَكُوْنُوْا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَنْزَلَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ حَتّٰى تَلَاهَا اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَتَلَقَّاهَا مِنْهُ النَّاسُ فَمَا يَسْمَعُ بَشَرٌ اِلَّا يَتْلُوْهَا.

(رواه البخاری)

انتقال ہو گیا - اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے' اس کو موت کبھی نہیں آئے گی - اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ...... الشّٰاكِرِيْنَ﴾ تک - یہ خطبہ سن کر لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلاوت فرمانے سے قبل یہ آیت اللہ تعالیٰ نے گویا نازل ہی نہیں فرمائی تھی (اور آج ہی نازل ہوئی ہے) اس کے بعد جس نے بھی اس آیت کو سنا وہی اس کو تلاوت کرتا ہوا نظر آتا تھا - (بخاری شریف)

الانبياء عليه السلام لهم ميزات و مزايا يمتازون بها عن سائر البشر

حضرات انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام نوعِ بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں

(۱۰۱۵) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِي الصَّوْمِ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّكَ تُوَاصِلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اَيُّكُمْ مِثْلِيْ اِنِّیْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَ يَسْقِيْنِيْ. (متفق عليه)

(۱۰۱۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ دو روزے درمیان میں افطار کیے بغیر ایک ساتھ رکھے جائیں - اس پر ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تو ایسا بھی کر لیتے ہیں - آپ نے فرمایا جی ہاں' مگر کیا تم میں کوئی میری طرح ہے؟ میں شب بسر کرتا ہوں اس حالت میں کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے - (متفق علیہ)

(۱۰۱۵) * انبیاء علیہم السلام بشر ضرور ہوتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ بالکل ایسے ہی بشر ہوتے ہیں جیسے کے عام بشر ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے اتنے ممتاز بھی ہوتے ہیں کہ اگر بیک وقت دونوں پر نظر ڈالی جائے تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ علیحدہ علیحدہ دو صنفوں کے افراد ہیں - متنبی مشہور شاعر نے ایک ہی صنف میں اشتراک کے باوجود ان کے افراد میں امتیاز کی معقولیت کو کیا خوب انداز سے ادا کیا ہے وہ کہتا ہے

و ان تفقِ الانام و انت منهم فانّ المسک بعض دم الغزال

اے ممدوح اگر تو مخلوق میں شامل ہو کر پھر ان سب پر فوقیت رکھتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے آخر مشک بھی تو اسی ہرن کے خون کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن پھر ان دونوں میں کیا نسبت وہ متعفن اور یہ معطر' وہ ناپاک اور یہ پاک پس اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی نفس بشریہ میں گو سب انسانوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں لیکن پھر ان سے مشک کی طرح ممتاز بھی ہوتے ہیں' صرف اپنی سیرت میں نہیں بلکہ اپنے جسم و جوارح میں بھی اور ان کے خواص میں بھی انبیاء علیہم السلام کی شانِ رفیع تو بہت بلند ہے - قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیبیاں بھی عام عورتوں سے کچھ علیحدہ شان کی ہوتی ہیں - يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ (اے نبی کی بیبیو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو تمہاری بات ان سے بالکل الگ ہے - پس جس طرح کہ امہات المؤمنین صنف نساء میں شامل ہونے کے بعد پھر احکام میں ان للہ .....

(۱۰۱۶) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ حُدِّثْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوۃِ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلٰوۃِ قَالَ فَاَتَیْتُہٗ فَوَجَدْتُہٗ یُصَلِّیْ جَالِسًا فَوَضَعْتُ یَدِیْ عَلٰی رَأْسِہٖ فَقَالَ مَالَکَ یَا عَبْدَاللّٰہِ بْنَ عَمْرٍو قَالَتُ حُدِّثْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّکَ قُلْتَ صَلٰوۃُ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰی نِصْفِ الصَّلٰوۃِ وَ اَنْتَ تُصَلِّیْ قَاعِدًا قَالَ اَجَلْ وَ لٰکِنِّیْ لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ.

(رواہ مسلم)

(۱۰۱۶) عبداللہ بن عمرو نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بیان کیا گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آدمی کے نوافل کا ثواب جو بیٹھ کر پڑھے جائیں نصف نماز کا ہوتا ہے- یہ کہتے ہیں اتفاق ایسا ہوا کہ میں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ کی بیٹھ کی ہی نوافل پڑھتے پایا- میں نے آپ کے سر مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا آپ نے پوچھا عبداللہ بن عمرو! کہو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ آدمی جو نماز بیٹھ کر پڑھتا ہے اس کا ثواب اس کو نصف ملتا ہے- اور آپ تو بیٹھ کر ہی نماز ادا فرما رہے ہیں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں میں نے یہ ضرور کہا ہے لیکن میری بات اور ہے مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو میں تمہاری طرح نہیں ہوں-

(مسلم)

منها ما يتعلق بيده الكريمة (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۱۷) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی

(۱۰۱۷) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

لله ..... سے ممتاز بھی تھیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام بشر ہو کر ان سے ممتاز بھی ہوتے ہیں- دیکھو اس حدیث میں کس صفائی کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ میری بشریت کے سب خواص وہی نہیں ہیں جو تمہاری بشریت کے ہیں' میری بشریت آب وغذا میں بھی تم سے مختلف ہے- پھر یہاں آب وغذا کی نوعیت جو بھی ہو مگر عبارت کا کتنا حسن ہے کہ آپ نے اس کو بھی شب کے ساتھ مقید فرما دیا ہے' اگر "انـی ابـیـت" کی بجائے "انی اصبح" فرما دیتے - یعنی میں صبح کرتا ہوں اس حالت پر' الخ تو عام انسانوں کے لیے آب وغذا کے ساتھ روزہ کی حقیقت کا قائم رکھنا کتنا بھاری ہو جاتا- یہ علیحدہ بحث تھی کہ جو غذاء آپ کو ملتی تھی روزہ اس سے افطار ہو سکتا بھی ہے یا نہیں- بہر حال اگر ایک طرف انبیاء علیہم السلام میں بشریت کی وہ عام صفات موجود ہوتی ہیں جو ان کی بشریت کا بدیہی ثبوت ہوتی ہیں تو اسی کے ساتھ دوسری طرف ان میں وہ صفات بھی موجود ہوتی ہیں جو عام بشریت سے ان کی فوقیت کا اس سے زیادہ بدیہی ثبوت ہوتی ہیں-

(۱۰۱۶) * جو بات عام طور پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ذہن نشین تھی وہ یہی تھی کہ شرعی احکام میں خدا کے رسول بھی عام بشر کے شریک رہتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ اس کی شرکت کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اب کسی جہت سے کوئی امتیاز ہی نہیں رکھتے وہ عبادت کی شدت اور اس کی خفت دونوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتے ہیں- صوم وصال یعنی افطار کیے بغیر دو یا زیادہ روزے مسلسل رکھنا جس طرح ان ہی کی شان ہوتی ہے' اسی طرح بیٹھ کر نوافل کا پورا ثواب یعنی بیٹھ کر نوافل کا پورا ثواب ملنا بھی ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے- ثواب کا دارو مدار صرف مشقت ہی پر نہیں اس کا انحصار نظر ربوبیت کی پسندیدگی پر ہے- نیز انبیاء علیہم السلام کے عمل سے ہی چونکہ جواز وعدم جواز کا ثبوت ملتا ہے اس لیے جائزات پر عمل کرنے میں بھی ان کو واجبات کا ثواب ملتا ہے-

(۱۰۱۷) * یوں تو آپ کے دست مبارک کے اعجازی کرشمے بہت سی حدیثوں میں آتے ہیں- انگشتانِ مبارک سے چشمے بھی لله .....

اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشۡتَكٰى نَفَثَ عَلٰى نَفۡسِهٖ وَ مَسَحَ عَنۡهُ بِيَدِهٖ فَلَمَّا اشۡتَكٰى وَجۡعَهُ الَّذِىۡ

یہ تھا کہ جب بیمار ہوتے تو پہلے اپنے ہاتھوں پر آپ معوذات پڑھ کر دم کرتے اس کے بعد ان کو اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے - جب ایسا ہوا کہ

لـلہ ..... جاری ہوئے' ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے بھی ہو گئے اور ایک اشارہ سے مدینہ طیبہ سے ہٹ کر بادلوں نے اطراف کا رخ کر لیا وغیرہ وغیرہ - ترجمان ص ۳۷ ج ۲ وص ۲۱ ج ۲ ملاحظہ فرمائیے آپ کو ثابت ہوگا کہ آپ کے دست مبارک کی ایک ضرب سے یقین کی وہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ عالم قدس گویا آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا - لیکن حدیث مذکور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست شفاء میں شفاء کی خاصیت عام معجزات کی طرح وقتی اور غیر اختیاری نہ تھی بلکہ اس کا طبعی اثر تھا - یہاں حضرت عائشہؓ کی فہم کتنی قابل داد ہے کہ وہ اس رمز کو جانتی تھیں اور اس لیے آپ کی بیماری کے معمول کو اس طرح پورا کرتی تھیں کہ جہاں تک معوذات پڑھنے کا تعلق تھا وہ تو خود پڑھ لیتیں اور بیماری میں آپ کو اس کی تکلیف نہ دیتیں لیکن جہاں دیکھتیں کہ اب یہاں وہ نیابت سے قاصر ہیں وہاں مجبور ہو کر آپ ہی کے دست مبارک کو استعمال کرتیں - معلوم ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں کوئی امتیازی خاصیت ہوتی ہے جس میں عام بشر تو کیا امہات المؤمنین بھی شرکت نہیں رکھتیں -

امام رازی نے تفسیر کبیر میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جس طرح عام بشر سے اپنی روحانی قوتوں میں ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح جسمانی طاقتوں میں بھی ممتاز ہوتے ہیں - اپنی سامعہ' باصرہ' شامہ اور ذائقہ سب ہی طاقتوں میں دیکھو تفسیر کبیر ص ۴۵۵ ج ۴ -

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سے پتھروں کے نرم ہو جانے کے متعلق سوال و جواب کی شکل میں تحریر فرماتے ہیں:

هل ورد فى كتب الحديث ان سيدنا ابراهيم على لبينا و عليه افضل الصلٰوة اثرت قدماه فى الحجر الذى كان بنى عليه البيت و هو المقام صغم. و ردذلك. اخرجه الازرقى فى تاريخ مكة من طريق ابى سعيد الخدرىؓ عن عبدالله بن سلام رضى الله تعالى عنه موقوفا عليه بسند صحيح و اخرجه عبد بن حميد فى تفسيره عن قتادة. اما الان الصخرة للنبى صلى الله عليه وسلم فثبت فى حفر الخندق و لم يكتب غير هذا. (الحاوی ج ۲ ص ۱۰۸)

کیا کتب حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ جس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی اس پر آپ کے قدم مبارک کا نشان پڑ گیا تھا - اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک عبداللہ بن سلامؓ سے ازرقی کی تاریخ مکہ میں اس پر ایک روایت بسند صحیح موجود ہے مگر وہ موقوف ہے اور عبد بن حمید نے بھی حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کو نقل کیا ہے - رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پتھر کا نرم ہونا تو وہ صرف غزوہ خندق میں تو ثابت ہے اس کے سواء ثابت نہیں -

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن کے قدم مبارک کی تاثیر کا کرشمہ تو حافظ سیوطی نے تسلیم کیا ہے گو وہ موقوف ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کے متعلق جو عام حکایات مشہور ہیں اس کے بسند صحیح ثبوت کا قطعی انکار کر دیا ہے - واللہ تعالیٰ اعلم - اس جگہ ان ناحق پسندوں کو غور کر لینا چاہیے جو محدثین کو مؤرخین کے درجہ میں بھی رکھنا نہیں چاہتے کہ انکا جو متوسط مزاج طبقہ تھا نقد لـلہ .....

تُوُفِّیَ فِیْہِ کُنْتُ اَنْفُثُ عَلَیْہِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَ اَمْسَحُ بِیَدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.
(متفق علیہ)

آپ کی آخری بیماری ہوئی تو میں یوں کرتی کہ معوذات پڑھ کر دم تو خود کرتی لیکن جب ہاتھ پھیرنے کا نمبر آتا تو خود آپ ہی کا دست مبارک لے کر آپ کے جسم اطہر پر پھیرتی۔ (متفق علیہ)

منھا ما یتعلق بحاسۃ الذوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ذائقہ کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۱۸) عَنْ عَاصِمِ بْنِ کُلَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَنَازَۃٍ فَرَاَیْتُ رَسُوْلَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ عَلَی الْقَبْرِ یُوْصِی الحافِرَ یَقُوْلُ اَوْسِعْ مِنْ قَبَلِ

(۱۰۱۸) ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازہ کی شرکت کے لیے نکلے میں نے دیکھا کہ آپ قبر کے اوپر سے گورکن کو یہ ہدایت فرماتے جاتے تھے دیکھنا ذرا پائنتی کی جانب سے اور کشادہ کرنا ذرا سرا ہنے کی جانب سے اور کشادہ کرنا۔ جب اس کو دفن کر کے آپ واپس ہوئے تو سامنے سے اس کی بیوی کی جانب سے ایک شخص آپ

لله ..... حدیث میں ان کا ذوق بھی کتنا بلند اور منصفانہ تھا۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فضائل کے باب میں خاص طور پر نقد کا معیار سخت نہیں رکھا اس کے باوجود جو فضیلت ان کے علم میں کسی ادنیٰ معیار پر بھی اتر نہیں سکی خواہ وہ کتنی ہی شہرت رکھتی تھی مگر انہوں نے اس کا ثبوت تسلیم نہیں کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اگر اس کو تسلیم بھی کیا ہے تو اس کے مرفوع ہونے کا اقرار نہیں کیا اور صاف تحریر فرما دیا ہے کہ یہ صرف عبداللہ بن سلامؓ اور حضرت قتادہؒ کا بیان ہے۔ پھر یہ کتنا ظلم ہے کہ اتنے محتاط حضرات کو بھی غیر محتاط کہہ دیا جائے اور اپنے خیالات کو ان لوگوں کے اوپر بھی فوقیت دے دی جائے جن کے سامنے حدیثوں کے دفتر ہمہ وقت کف دست رہا کرتے تھے۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی ایک ضرب سے پتھر کا ریزہ ریزہ ہو جانا چونکہ غزوۂ خندق میں بسند صحیح ثابت تھا اس لیے اس کو تسلیم کرلیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کو انبیاء علیہم السلام کے دست مبارک یا قدم مبارک کے اثر سے ایک پتھر کا نرم ہونا قابل تعجب معلوم ہو رہا ہے اور وہاں قرآن کریم حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں لوہے کا نرم ہو جانا نقل کر رہا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ آپ کے نزدیک قرآنی بیان اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت بھی صرف ایک عام محاورہ کے برابر ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ اگر قرآن کریم صرف اس دور کے لیے محدود ہوتا جب کہ لوہے کی زرہ بنانے میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں جب بھی "الانۃ جدید" کو صرف ایک محاورہ سمجھ لینا اس کے سیاق و سباق کے بالکل خلاف تھا مگر جب کہ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن عظیم قیامت تک کے لیے حکمت و موعظت کی کتاب ہے تو انصاف کیجئے کہ آج کی روشنی میں داؤد علیہ السلام کے اس معجزہ کو اگر صرف آپ کے مزعومہ خیال پر رکھا جائے تو اس کے پڑھنے والوں کی نظروں میں اس معجزہ کی حقیقت کتنی مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گی۔

(۱۰۱۸) * تلخ و شیریں کا احساس تو عام بشر کی زبانیں بھی کر لیتی ہیں، مگر نبی و رسول وہ ہوتے ہیں جن کی زبان حلال و حرام کا بھی احساس کرتی ہے۔ سبحان اللہ۔ اسلام کتنا نازک اور کتنا پاکیزہ مذہب ہے کہ اس کے نزدیک ضیافت کا کھانا غیر ذمہ دارانہ اجازت کے بعد بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا وہ ایسے ہی مصرف میں آ سکتا ہے جہاں زیادہ چھان بین کا محل نہ ہو۔ جو لوگ میت کے مال میں قرض اور تقسیم وراثت سے قبل ہی کھانے پکا پکا کر خود کھا لیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس قسم کے کھانے اور اس قسم کے کھانے والوں سے میت کو ثواب ملتا ہے وہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کر لیں۔

رِجْلَيْهِ اَوْسَعُ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ فَلَمَّا رَجَعَ اِسْتَقْبَلَ دَاعِی امْرَأَةٍ فَاَجَابَ وَ نَحْنُ مَعَهٗ فَجِیْئَ بِالطَّعَامِ فَوَضَعَ یَدَهٗ ثُمَّ وَضَعَ الْقَوْمُ فَاَکَلُوْا فَنَظَرْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَلُوْکُ لُقْمَةً فِیْ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ اَجِدُ لَحْمَ شَاةٍ اُخِذَتْ بِغَیْرِ اِذْنِ اَهْلِهَا فَاَرْسَلَتِ الْمَرْأَةُ تَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَرْسَلْتُ اِلَی النَّقِیْعِ وَ هُوَ مَوْضِعٌ یُبَاعُ فِیْهِ الْغَنَمُ لِیُشْتَرٰی لِیْ شَاةٌ فَلَمْ تُوْجَدْ فَاَرْسَلْتُ اِلٰی جَارٍ لِیْ قَدْ اِشْتَرٰی شَاةً اَنْ یُرْسِلَ بِهَا اِلَیَّ بِثَمَنِهَا فَلَمْ یُوْجَدْ فَاَرْسَلْتُ اِلَی امْرَاَتِهٖ فَاَرْسَلَتْ اِلَیَّ بِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَطْعِمِیْ هٰذَا الطَّعَامَ الْاَسْرٰی.

(رواہ ابو داؤد و البیهقی فی دلائل النبوۃ)

کو بلانے کے لیے آیا - آپ اس کے ہمراہ ہو لیے اس وقت ہم بھی آپ کے ساتھ تھے آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا' حسب دستور کھانے کے لیے پہلے آپ نے ہاتھ بڑھایا اس کے بعد صحابہؓ نے ہاتھ بڑھائے اور کھانا شروع ہو گیا - ہم نے دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لقمہ چبار ہے ہیں مگر نگلتے نہیں - اس کے بعد فرمایا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گوشت کسی ایسی بکری کا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کی گئی ہے - میت کی بیوی نے جواباً کہلا بھیجا یا رسول اللہ! واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے مقام نقیع کے بازار میں جہاں بکریاں فروخت ہوتی تھیں ایک آدمی بھیجا تھا تا کہ وہ میرے لیے ایک بکری خرید لائے جب وہاں بکری نہ ملی تو میں نے اپنے ایک پڑوسی کے پاس آدمی بھیجا - اس نے ایک بکری خریدی تھی کہ جس قیمت میں اس نے وہ خریدی ہو اسی قیمت میں وہ مجھے بھیج دے - اتفاقاً وہ نہ ملا پھر میں نے اس کی بیوی کے پاس آدمی بھیجا اس نے مجھ کو یہ بکری بھیج دی ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اس کھانے کو قیدیوں کو کھلا دو -

(ابوداؤد و بیہقی)

منها ما یتعلق بصوته صلی الله علیه وسلم

(۱۰۱۹) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ لِلنَّاسِ اجْلِسُوْا فَسَمِعَهٗ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ رَوَاحَةَ وَ هُوَ فِیْ غَنَمٍ فَجَلَسَ فِیْ مَکَانِهٖ. (رواہ البیهقی و ابو نعیم کما فی الخصائص ج ٦٦ ج ١)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کا ایک کرشمہ

(۱۰۱۹) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن جب منبر پر خطبہ کے لیے بیٹھے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا بیٹھ جاؤ - آپ کی یہ آواز عبداللہ بن رواحہ کے کان میں بھی پہنچ گئی اس وقت وہ بکریوں میں تھے آپ کی آواز کا سننا تھا کہ وہ فوراً وہیں بیٹھ گئے -

(الخصائص)

(۱۰۲۰) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ مُعَاذِ التَّیْمِیِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

(۱۰۲۰) عبدالرحمٰن بن معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں ہمارے سامنے خطبہ دیا تو اس کو سننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے

(۱۰۲۰) * ہوا کی مخالفت و موافقت سے اور آواز کی قدرۃً بلندی و پستی سے دور تک آواز کے پہنچنے نہ پہنچنے کا فرق تو عام بشر میں بھی ہو جاتا ہے مگر ایک ہی انسان میں اس کے معمول کے برخلاف اس کی آواز ہر ہر خیمہ میں اس طرح جا پہنچی جیسے وہ یہاں کھڑا بات کر رہا ہے کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام ہی میں ثابت ہوتا ہے - صحابہ بھی کتنے فہیم' کتنے باایمان اور مستحکم عقیدہ کے لوگ تھے کہ نہ تو انہوں نے آپ کی اس غیر معمولی للہ .....

بِمَعنًى فَفُتِحَتْ اَسْمَاعُنَا وَ فِيْ لَفْظٍ فَفَتَحَ اللّٰهُ اَسْمَاعَنَا حَتّٰى اَنْ كُنَّا لَنَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ وَ نَحْنُ فِيْ مَنَازِلِنَا. (رواه ابن سعد كما في الخصائص)

ہمارے کان اس طرح کھول دیئے تھے کہ ہم تمام حجاج جہاں جہاں تھے بیٹھے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب وہیں سن رہے تھے۔ (خصائص)

منها ما يتعلق بحاسة البصر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۲۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَاَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَ تَرَاصُّوْا فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ. (رواه البخاري وراجع ترجمان السنة ص ٤٣٦ ج ١)

(۱۰۲۱) انس رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اپنا رخ پھیر کر فرمایا۔ اپنی صفیں سیدھی کرو اور خوب مل مل کر کھڑے ہو کیونکہ میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ (بخاری شریف)

(۱۰۲۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۰۲۲) انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ﷺ ..... آواز کو ہوا کی موافقت کا کرشمہ سمجھا اور نہ اس کو غیر معقول تصور کیا بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں حل کر لیا کہ جس قدرت نے ہم کو ایک محدود فاصلہ پر شنوائی کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اسی نے آج اس سے کچھ زیادہ فاصلہ پر شنوائی کی قوت بخش دی ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو اپنے جسمانی خواص میں ممتاز ہوتے ہی تھے' مگر حق یہ ہے کہ ان کے مخاطب بھی ساری مخلوق میں ممتاز صفت ہوتے تھے۔ آواز کی وسعت کا یہ کرشمہ کچھ آپ ہی کے عہد پر ختم نہیں ہو گیا تھا' بلکہ ان کمالات میں سے تھا جس میں آپ کی امت کو بھی حصہ ملا تھا' اس لیے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں عمر رضی اللہ عنہ کی آواز نہاوند کی فوج میں بھی سنی جا چکی ہے۔ جیسا کہ کرامات کے باب میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ غنیمت ہے کہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر نے اب روشن خیالوں کے لیے بھی اس کی وجہ جواز پیدا کر دی ہے۔

(۱۰۲۲) ✽ اپنے سامنے کی چیز دیکھ لینا تو ہر انسان کا خاصہ ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سامنے اور پیچھے دیکھنے کی یکساں طاقت عنایت فرما دیتا ہے۔ اگر آنکھ میں اپنے سامنے دیکھنے کی طاقت عام طور پر نہ ہوتی تو کیا کوئی انسان صرف عقل سے یہ حکم لگا سکتا تھا کہ اس عضو میں دیکھنے کی طاقت ہونی چاہیے پس جس نے اس میں صرف ایک سمت دیکھنے کی طاقت عام طور پر رکھ دی ہے کیا اس کو قدرت نہیں کہ وہ کسی کے حق میں مخالف سمت میں دیکھنے کی طاقت بھی پیدا فرما دے۔ قرآن کریم میں روز محشر انسانی جوارح کی بات چیت کرنا ثابت ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب انسان اپنے خلاف ان کی شہادت سن کر ان سے تعجب سے کہے گا "لم شهدتم علينا" تو اس کے جواب میں وہ بھی کہیں گے "جس نے اور چیزوں کو قوت گویائی عطا فرمائی تھی اس نے آج ہم کو بھی یہ طاقت عطا فرما دی۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ہم اپنے سامنے رکھے ہوئے کھانے کی تسبیح خود سنتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کھانے میں سے بکری کی دست اٹھا کر یہود سے فرمایا تھا کہ کھانے میں زہر ملانے کی خبر مجھ کو اس نے دی ہے۔ جب ان اعضاء میں نطق کی طاقت پیدا ہو جانا ممکن ہوا تو آنکھ میں صرف بینائی کی طاقت کا اور ترقی کر جانا ناممکن کیوں سمجھا جائے۔ یہاں آپ کے قسم کھانے کے بعد بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے تو اس کے لیے اب اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ یہاں ترجمان السنۃ ج ا نوٹ حدیث نمبر ۱۸ ضرور ملاحظہ فرما لیجئے۔

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِسْتَوُوْا اسْتَوُوْا اسْتَوُوْا فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ خَلْفِيْ كَمَا اَرَاكُمْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ. (رواہ ابوداؤد)

فرمایا کرتے تھے (جماعت میں) سیدھے سیدھے کھڑے ہو جاؤ' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تم کو اپنی پشت کی جانب سے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسا کہ اپنے سامنے کی جانب سے۔ (ابوداؤد)

(۱۰۲۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَ فِيْ مُؤَخَّرِ الصُّفُوْفِ رَجُلٌ فَاَسَاءَ الصَّلٰوةَ فَلَمَّا سَلَّمَ نَادَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا فُلَانُ اَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ اَلَا تَرٰى كَيْفَ تُصَلِّيْ اِنَّكُمْ تَرَوْنَ اَنَّهٗ يَخْفٰى عَلَيَّ شَيْءٌ مِّمَّا تَصْنَعُوْنَ وَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَرٰى مِنْ خَلْفِيْ كَمَا اَرٰى مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ. (رواہ احمد)

(۱۰۲۳) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی - اس میں ایک شخص نے جو آخری صف میں شامل تھا نماز میں کچھ کوتاہی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلام پھیرا تو اس کو آواز دے کر فرمایا اے فلاں' اللہ سے ڈرتا نہیں؟ دیکھتا نہیں کیسی نماز پڑھتا ہے -تم لوگوں کا خیال شاید یہ ہوگا کہ جو حرکتیں تم کرتے ہو وہ مجھ سے پوشیدہ رہتی ہیں' بخدا جیسا میں اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں - (رواہ احمد)

منها ما يتعلق بحاسة السمع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۲۴) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهٗ وَ نَحْنُ مَعَهٗ اِذْ حَادَتْ بِهٖ دَابَّتُهٗ فَكَادَتْ تُلْقِيْهِ وَ اِذَا اَقْبُرٌ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ اَصْحَابَ هٰذِهِ الْاَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتٰى مَاتُوْا قَالَ فِي الشِّرْكِ

(۱۰۲۴) زید بن ثابتؓ بیان فرماتے ہیں ایسا اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو النجار کے کسی باغ میں ایک خچر پر سوار تھے اس وقت ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ حاضر تھے کہ دفعتہً آپ کی سواری اس زور سے بدکی قریب تھا کہ آپ گر جاتے - دیکھا تو وہاں پانچ یا چھ قبریں تھیں - آپ نے پوچھا کوئی ہے جو ان مدفون شخصوں کو پہچانتا ہو ایک شخص بولا میں پہچانتا ہوں - آپ نے پوچھا یہ مردے کس زمانے کے ہیں - اس نے جواب دیا

(۱۰۲۳) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی یہ صفت بھی مختلف صحابہؓ سے مختلف طور پر روایت کی گئی ہے اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ظہر کی نماز کا تھا - جو شخص اس ارشاد کا باعث بنا وہ سب سے آخر صف میں شامل تھا یہاں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ نمازوں میں تمہاری ہر ہر حرکت کا مجھے علم ہو جاتا ہے وہ بھی کسی اور ذریعہ سے نہیں بلکہ خاص دیکھ کر اور اس لیے آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جس طرح میں اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں - راہ اعتدال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو صفات جس حد تک ثابت ہوں ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے نہ ان میں تاویلات کی جائیں اور نہ ان میں اپنی جانب سے مبالغے کیے جائیں -

(۱۰۲۴) * بیمار اور غم رسیدہ انسانوں کی آہ و بکا تو ہر بشر سنتا ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جو مردہ انسانوں کے نالہ و فریاد بھی سن لیتے ہیں چونکہ ان کے یقین کے عالم میں عقیدہ اور چشم دید حالت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا اس لیے جو باتیں وہ جانتے ہیں اس کو دیکھنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں عام انسانوں میں یہ بات نہیں ہوتی اس لیے بعض شنیدہ واقعات کے دیکھنے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی - یہاں آپ نے مستقبل ہولناک حوادث میں سے سب سے پہلے عذاب دوزخ کی یاد دلائی اور سب سے آخر میں ایک ایسے فتنہ کی یاد تازہ کی جو امت میں سب سے زیادہ ہولناک ہوگا - بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے ہولناک فتنہ کا اثر بعض اہل قبور پر بھی ہوگا - اس لیے اس موقعہ پر .....

فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰى فِىْ قُبُوْرِهَا فَلَوْ لَا اَنْ لَا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِىْ اَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (رواہ مسلم)

شرک کے زمانے کے اس پر آپ نے فرمایا اس امت کا قبر میں امتحان ہوتا ہے- اگر کہیں یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مارے دہشت کے تم دفن کرنا ہی بھول نہ جاؤ گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا کہ جو عذابِ قبر میں سنتا ہوں وہ تم کو بھی سنا دے- پھر آپ نے ہماری طرف رخ بدل کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے سامنے عذابِ دوزخ سے پناہ مانگو- لوگوں نے فوراً کہا ہم اللہ کے سامنے عذابِ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں- پھر فرمایا عذابِ قبر سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً اللہ تعالیٰ سے عذابِ قبر سے پناہ مانگی اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا تمام فتنوں سے بھی پناہ مانگو ظاہر ہوں یا پوشیدہ- ہم نے فوراً کہا ہم اللہ تعالیٰ سے تمام قسم کے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں- آخر میں آپؐ نے فرمایا کہ دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً دعاء مانگی- ہم اللہ تعالیٰ سے دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگتے ہیں- (مسلم)

منها ما يتعلق بريقة صلى الله عليه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لعابِ دہن کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۲۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ اِذَا اشْتَكَى الْاِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ اَوْ كَانَتْ بِهٖ قَرْحَةٌ اَوْ جُرْحٌ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَصْبَعِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا لِيُشْفٰى سَقِيْمُنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا. (متفق علیہ)

(۱۰۲۵) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں- جب کوئی شخص بیمار پڑ تایا اس کے جسم میں کہیں زخم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مٹی میں ذرا سا اپنا لعابِ مبارک ڈال کر انگلی سے ملاتے جاتے اور یہ کلمات پڑھتے جاتے بسم اللہ الخ یعنی یہ ہماری زمین کی مٹی اور ہمارا لعاب دہن ہے ہم اس کو ملا کر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لگاتے ہیں تاکہ ہمارے رب کے حکم سے ہمارا بیمار شفاء یاب ہو جائے-

---

لله ..... پر اس سے بھی تعوذ کی تعلیم فرمائی گئی ہے- افسوس ہے کہ آنحضرتؐ نے کس کس طرح ہر ہر موقعہ پر جن فتنوں کی یاد دہانی فرمائی تھی امت کے ناخلف افراد آج یا تو ان کا صاف انکار کر رہے ہیں' ورنہ تاویل پر آمادہ ہیں-

(۱۰۲۵) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات میں یہاں آپ کے لعاب دہن کا تذکرہ ہے اس کے معجزانہ کرشمے تو آپ کے سامنے معجزات کی بحث میں آئیں گے- ان شاء اللہ تعالیٰ کسی کی آنکھ کا آشوب اس طرح صاف ہو گیا جیسے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ تھی' کسی کی شکستہ ہڈی اس طرح جڑ گئی جیسے کبھی اس میں کوئی نقصان ہی نہ ہوا تھا- یہاں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے سامنے مرہم شفاء کا یہ ایک عام نسخہ بھی تھا- سبحان اللہ کیا کمال تھا' پھر اس کمال کے ساتھ کتنی فروتنی تھی اور اس فروتنی میں کتنی حقیقت تھی کہ اس مرہم کی ساری شفاء کا تصور آپ اسی کے نام کی برکت کے ساتھ وابستہ فرماتے ہیں جو ربِّ محمد ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِكْ عَلَيْهِ كَمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى -غور فرمائیے کہ رسول کس طرح ہر ہر موقعہ پر انسانی نفع وضرر کا رشتہ ایک اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں- کون تھا جس کو شفاء تو اس کیمیاوی نسخہ سے ہوتی مگر اس کے سامنے تصور یہ ہوتا کہ یہ ساری شفاء ہے سب حکم ربانی کے تحت- اس لیے انسان کی کمزور فطرت کے لیے اس جملہ کا ہر ہر کلمہ میں اس حقیقت پر تنبیہ ضروری سمجھی گئی آپ کا یہ مختصر جملہ کیا تھا گویا شفاء کا تعویذ بھی تھا اور رسالت و توحید کا ہدایت نامہ بھی- آج اصول طب کے لحاظ سے بھی مٹی میں بہت سے امراض کے لیے شفاء مسلّم ہو چکی ہے-

منها ما يتعلق بالنوم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی خصوصیت

(۱۰۲۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَتَنَامُ قَبْلَ اَنْ تُوْتِرَ فَقَالَ يَا عَائِشَةَ اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَ لَا يَنَامُ قَلْبِيْ. (رواه الشيخان راجع ترجمان السنة ص ٤٣٢ ج ١)

(۱۰۲۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا نمازِ وتر پڑھنے سے قبل آپ سو سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا عائشہ! صرف میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا وہ بیدار رہتا ہے۔ (شیخین)

(۱۰۲۷) عَنْ عَطَاءٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ تَنَامُ اَعْيُنُنَا وَ لَا تَنَامُ قُلُوْبُنَا. (اخرجه ابن سعد كذافي الخصائص)

(۱۰۲۷) عطاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ہم لوگ جو انبیاء ہوتے ہیں ہماری صرف آنکھیں ہی آنکھیں سوتی ہیں، ہمارے دل نہیں سوتے۔ (خصائص الکبریٰ)

(۱۰۲۶) ٭ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ سونے سے وضوء جاتا رہتا ہے۔ اس لیے جو شخص سو کر اٹھے اور نماز کا ارادہ ہو تو اس کو وضوء کرنا لازم ہے مگر جب یہاں انہوں نے دیکھا کہ آپ سو جاتے ہیں اور پھر وضوء کیے بغیر وتر پڑھ لیتے ہیں۔ تو آپ کی فہم پر قربان کہ یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے وضوء کیوں نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کیا آپ نماز سے قبل سو جاتے ہیں یعنی پھر اٹھ کر وضوء کیے بغیر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اب تک گو آپ کی نیند کی خصوصیت نہ جانتی ہوں مگر اتنا جانتی تھیں کہ نبی اپنی بہت سی باتوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے یہ صورت بھی ضرور کسی امتیاز ہی پر مبنی ہوگی۔

(۱۰۲۷) ٭ بیداری کی حالت میں تو عام بشر کے قلوب بھی بیدار رہتے ہیں مگر رسول وہ ہوتے ہیں جن کے قلوب سونے میں بھی بیدار رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہ بیداری نہیں ہے جس کا آپ ادراک کر سکیں۔ یہ وہ بیداری ہے جس کے سامنے عالم غیب سب کھلا ہوا ہوتا ہے۔ عام بشر جس طرح بیداری میں عالم شہادت کا ادراک کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام حالتِ خواب میں بھی اس سے بڑھ کر عالمِ غیب کا ادراک فرما لیتے ہیں گویا عام بشر پر جن حالات میں پوری غفلت طاری ہوتی ہے وہ ان حالات میں بھی پورے ہوشیار رہتے ہیں پھر ان کے ادراک کی نوعیت بھی ہمارے ادراک سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کی حقیقت سمجھنے سے بھی وحی کی ایک قسم شمار کیا گیا ہے ایک واقعہ میں جو 'لیلۃ التعریس'' کے نام سے مشہور ہے حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں وكنا لا نوقظ نبی الله صلی الله علیه وسلم من منامة اذا نام حتی یستیقظ. (مسلم شریف ج ۱ ص ۲۴۰) یعنی صحابہؓ کا دستور یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوابِ استراحت میں ہوتے تو ہم آپ کو اس وقت تک بیدار نہ کرتے جب تک کہ آپ از خود بیدار نہ ہو جائیں۔ بخاری شریف (ص ۶۸۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلتے چلتے ٹھیک منزل مقصود پر پہنچ گئے تو ان کی آنکھ لگ گئی مگر حضرت یوشع نے جو ان کے رفیق سفر تھے فرمایا "لااوقظه" میں آپ کو بیدار نہیں کروں گا اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام خود بیدار ہوئے تو وہ مچھلی کے عجیب واقعہ کا ذکر کرنا ان سے بھول گئے اور آگے چل پڑے الی آخر القصة۔

پھر جب ان کی نیند صرف آنکھوں تک محدود ہوتی ہے تو اسی سے ان کی موت کا بھی کچھ اندازہ کر لینا چاہیے، کیونکہ "النوم اخ الموت" مشہور ہے وہ بھی نیند کی طرح ان پر طاری ضرور ہوتی ہے مگر عام بشر کی موت کی طرح نہیں یہاں بھی ان کو بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ حتی کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر زندہ کا اطلاق آیا ہے۔ لله .....

منها تخييرهم قبل الوفاة

وفات سے قبل انبیاء علیہم السلام کو اپنی حیات و موت میں اختیار ملنے کی خصوصیت

(۱۰۲۸) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ اِنَّ عَبْدًا خَیَّرَهُ اللّٰهُ بَیْنَ اَنْ یُّؤْتِیَهٗ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْیَا مَاشَاءَ وَ بَیْنَ مَا عِنْدَهٗ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهٗ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ فَدَیْنَاکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاٰبَائِنَا وَ اُمَّهَاتِنَا قَالَ فَعَجِبْنَا فَقَالَ النَّاسُ اُنْظُرُوْا اِلٰی هٰذَا الشَّیْخِ یُخْبِرُ

(۱۰۲۸) ابوسعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دے دیا ہے اگر وہ چاہے تو دنیا کے مال و دولت کی رونق جیسی وہ چاہتا ہے اس کو عطا فرما دے اور اگر چاہے تو جو انعامات و اکرام حق تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے تیار ہیں ان کو اختیار کر لے اللہ تعالیٰ کے اس بندہ نے ان دونوں میں سے ان انعامات ہی کو پسند کر لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہیں- یہ سن کر ابوبکرؓ بے ساختہ بول اٹھے یا رسول اللہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں- ابوبکرؓ کے اس فرمانے سے ہم کو تعجب ہوا اور

لله ..... قرآن جب شہداء کی موت کے متعلق صرف اس پر کفایت نہیں کرتا کہ تم ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان کو مردہ کہو بھی مت اور اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے' گویا جس کو رزق تک ملے وہ مردہ کہاں ہیں- تو اب انبیاء علیہم السلام جو شہداء سے کہیں اونچا مقام رکھتے ہیں ان کی موت کو عام انسانوں کی طرح کہہ دینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے' مگر یہ ظلم بھی کتنا بڑا ظلم ہے کہ صرف اس امتیاز کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو جنس بشر ہی سے خارج سمجھ لیا جائے- خوب یاد رکھو رب العالمین کی بارگاہ بلند وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے لاتأخذہ سنة و لانوم وہ ایسا زندہ ہے جس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے- پھر جس کو نیند بھی آتی ہو اور جو موت سے بھی مستثنیٰ نہ رہے اس کو خدا تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک کر دینا کتنا بڑا شرک ہوگا- بشر کو خالق سے ممتاز کرنے کے لیے صرف اس کی مخلوقیت کی بیچارگی ہی بہت کافی ہے- اس جگہ ترجمان السنہ ۳۹۱ ج ۱ کا نوٹ ضرور ملاحظہ فرما لیا جائے-

(۱۰۲۸) * حدیث مذکور میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص امتیازی صفت کا ذکر آیا ہے' اسی کے ساتھ صدیق اکبرؓ کے متعلق بھی ایک خاص امتیازی نوازش کا ذکر آ گیا ہے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری تو امت کے سامنے ایک بدیہی مسئلہ تھا- پھر آپ کی شانِ عبدیت نے نام لے کر اس کو صاف صاف بیان کرنا پسند نہ کیا مگر اپنی وفات کے ساتھ ساتھ جس امر کا وضاحت کے ساتھ ذکر فرمانا احکام و مسائل کی طرح امت کے سامنے ضروری سمجھا وہ ابوبکر صدیقؓ کی ایک امتیازی شان تھی- اس پر بحث کرنا بہت نامناسب ہے کہ خلت کی حقیقت کیا ہے جس میں کسی کے لیے بھی شرکت کی گنجائش نہیں نکل سکتی مگر اتنا آپ کی زبان مبارک سے پھر نکل گیا کہ اگر اس میں شرکت کا کوئی امکان ہوتا تو اس کے حق دار بھی سب سے پہلے صدیق اکبرؓ ہوتے اور اس کی بنیاد اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ اسلام کے لیے جان و مال کی جو قربانی اور جتنی برمحل انہوں نے پیش کی اس میں دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں تھا- آپ کے بیان میں ان کے حق میں جو بلند سے بلند کلمات آ سکتے تھے وہ بھی آ گئے اور اسی کے ساتھ عملی لحاظ سے "فتح خوخة" یعنی مسجد کی جانب صرف ایک ان کا دروازہ کھلا رکھنے کی اجازت اور دوسروں کے تمام دروازوں کے بند ہونے کا حکم بھی صادر ہو گیا- ادھر آپ کی عمر بھر کے صحبت یافتہ صحابہ کی زبانوں سے لله .....

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَبْدٍ خَیَّرَہُ اللّٰہُ اَنْ یُّؤْتِیَہٗ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا مَا شَاءَ وَ بَیْنَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ وَ ھُوَ یَقُوْلُ فَدَیْنَاکَ بِاٰبَائِنَا وَ اُمَّھَاتِنَا فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ الْمُخَیَّرَ وَ کَانَ اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ھُوَ اَعْلَمُنَا بِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اٰمَنِّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَ مَالِہٖ اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ وَ لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ خَلِیْلًا وَ لٰکِنْ اُخُوَّۃَ الْاِسْلَامِ لَا تُبْقَیَنَّ فِی الْمَسْجِدِ خَوْخَۃٌ اِلَّا خَوْخَۃُ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ.

(رواہ الترمذی و قال ھذا حدیث صحیح)

لوگوں نے کہا ان بزرگ کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندہ کا حال نقل فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار دے دیا ہے اگر وہ چاہے تو جتنی وہ چاہے اس کو دنیا کی زیبائش وآرائش مرحمت فرمادے اور اگر چاہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کے انعامات واکرام پسند کرلے- اس پر یہ بزرگ کیا فرما رہے ہیں کہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں- پھر بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جس بندہ کو اختیار دیا گیا تھا وہ تو خود آپ ہی کی ذاتِ گرامی تھی- حقیقت یہ ہے کہ ہم سب میں اس راز کو زیادہ سمجھنے والے ابوبکرؓ ہی تھے اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا- جس کی رفاقت اور جس کے مال کا احسان مجھ پر سب سے زیادہ ہے وہ ابوبکر کی ذات ہے اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو صرف ابوبکرؓ ہی کو بناتا (لیکن میرا یہ تعلق صرف ایک ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے) اب ایک اخوتِ اسلامی باقی ہے لہٰذا مسجد کی جانب کی جتنی کھڑکیاں ہیں ان میں سے کوئی کھلی نہ رہے بس صرف ایک کھڑکی ابوبکرؓ کے گھر کی کھلی رہے (کہ میرے بعد خلافت کی ذمہ داری کی وجہ سے ان کو آمدورفت کی ضرورت زیادہ ہوگی) (ترمذی شریف)

منھا ما یتعلق بتخییرھم عند الوفاۃ

وفات کے وقت انبیاء علیہم السلام کو پھر اختیار ملنے کی خصوصیت

(۱۰۲۹) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَ ھُوَ صَحِیْحٌ اِنَّہٗ لَنْ یُّقْبَضَ نَبِیٌّ حَتّٰی یُرٰی مَقْعَدُہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ ثُمَّ یُخَیَّرُ قَالَتْ عَائِشَۃُ فَلَمَّا نَزَلَ بِہٖ وَ رَاْسُہٗ عَلٰی فَخِذِیْ غُشِیَ عَلَیْہِ ثُمَّ اَفَاقَ فَاَشْخَصَ بَصَرَہٗ اِلَی سَقْفٍ ثُمَّ قَالَ اللّٰھُمَّ

(۱۰۲۹) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بالکل تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کسی نبی کی وفات نہیں ہوتی جب تک کہ جنت میں اس کا مقام اس کو دکھا نہیں دیا جاتا اس کے بعد پھر اس کو یہ اختیار بھی دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے پسند کرلے- جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اس وقت آپ کا سر مبارک میری ران پر رکھا ہوا تھا تو آپ کے اوپر بے ہوشی طاری ہوگئی اس کے بعد جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو

لله ..... ضمنی طور پر جو کلمہ یہاں نکل گیا اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رفیق غار کے علم وفہم میں برتری کا مسئلہ ان کے درمیان ایک مسلّم مسئلہ تھا پھر اس کا بھی جس طرح عملی ظہور ہوا وہ صدیق اکبرؓ کے خطبہ سے ظاہر ہے- اب جس کے متعلق صحابہ کی شہادت یہ ہو اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز وتکریم کے کلمات یہ ہوں ان کے متعلق اب امت کا عقیدہ کیا رہنا چاہیے-

(۱۰۲۹) ✽ ترجمان السنہ ص۸۲ ج۲ میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اسی ضابطہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اختیار دیا گیا تھا- اگر وہ ابھی دنیا میں اور جینا پسند کرتے ہیں تو جتنا چاہیں اور جی سکتے ہیں لیکن اس اختیار کا منشاء چونکہ صرف ان کی تشریف وتکریم تھا لله .....

الرَّفِيْقُ الْاَعْلٰى قُلْتُ اِذَنْ لَا يَخْتَارُنَا قَالَتْ وَ عَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَدِيْثُ الَّذِىْ كَانَ يُحَدِّثُنَا بِهٖ وَ هُوَ صَحِيْحٌ فِىْ قَوْلِهٖ اَنَّهُ لَنْ يُقْبَضَ نَبِىٌّ قَطُّ حَتّٰى يُرٰى مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا فَكَانَ اٰخِرُ كَلِمَةٍ تَكَلَّمَ بِهَا النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْلَهُ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى.

(متفق علیہ)

آپ نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھا کر فرمایا- الٰہی میں سب سے بڑے رفیق کو اختیار کر چکا میں اسی وقت سمجھ گئی کہ اب آپ ہم کو اختیار نہیں کریں گے اور اب یہ وہی وقت ہے جس کو آپ صحت کی حالت میں ہم سے بیان فرمایا کرتے تھے اور بے شک آپ اپنے بیان میں بالکل سچے تھے- جب تک نبی کو اس کا جنت کا مقام دکھایا نہیں جاتا اس کی وفات بھی نہیں ہوتی اس کے بعد پھر اس کو اختیار دے دیا جاتا ہے- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کی زبانِ مبارک سے جو آخری کلمہ نکلا تھا وہ یہ حرف تھے- الٰہی میں سب سے بڑے رفیق کو اختیار کر چکا- (متفق علیہ)

(۱۰۳۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ سَحْرِىْ وَ نَحْرِىْ فَلَمَّا خَرَجَتْ نَفْسُهٗ لَمْ اَجِدْ رِيْحًا قَطُّ اَطْيَبَ مِنْهُ. (اخرجه البزار و البيهقى بسند صحيح)

(۱۰۳۰) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال میری ٹھوڑی اور سینہ کے درمیانی حصہ میں ہوا ہے- جب آپ کی روح عالم قدس کی طرف پرواز کرنے لگی تو میں نے ایک ایسی خوشبو محسوس کی جو پھر کبھی محسوس نہ کی- (بزار)

لله ..... اس لیے ان کا دل اسی طرف مائل ہوگیا جو عالم تقدیر میں ان کے لیے مقرر ہو چکا تھا- پس موت انبیاء علیہم السلام کو بھی آتی ہے مگر عام بشر کی طرح اچانک نہیں بلکہ اطلاع کے بعد اور روح ان کی بھی قبض کی جاتی ہے مگر ان کی بلا اجازت نہیں بلکہ اجازت کے بعد- پھر جس طرح با نصیب امتی اپنے انبیاء کے کمالات میں حصہ رسد شریک ہو جاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی ان کو اتنا حصہ مل جاتا ہے کہ جبر و اکراہ سے ان کو بھی موت نہیں آتی بلکہ عالم تکوین میں قدرت کچھ ایسے سامان پیدا فرما دیتی ہے کہ وہ موت سے پہلے دنیا کو بخوشی چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں- دیکھو ترجمان السنہ ص ۲۸۸ ج ۱- مذکورہ بالا حدیث کو ترجمان السنہ کی ان دونوں حدیثوں کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی وحی انسانی خیالات سے کتنی بلند ہوتی ہے جس میں کہیں اختلاف و انتشار کا نام نظر نہیں آتا- ان کے کسی زمانہ کسی محل اور کسی حالت کے کلام کو ملا لیا جائے ان میں کہیں سرمو اختلاف نہیں ملتا- ہر جگہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں- انبیاء علیہم السلام کا اس تخییر کے مسئلہ پر ہی غور کر لیجئے- جو بات کبھی صحت میں آپ کی زبان مبارک سے نکلی تھی اور جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو اس غیر اختیاری حالت میں بھی وہی حقیقت ثابت ہوئی اس لیے اختیاری اور غیر اختیاری حالتوں میں وحی کی یہ تعجب انگیز حقیقت دیکھ کر حضرت عائشہؓ کی زبان سے بے ساختہ آپ کی صداقت کی داد نکل گئی-

اس جگہ انبیاء علیہم السلام کی خلوت و جلوت کا کچھ اندازہ بھی کرنا چاہیے کہ جو ابھی ابھی تمام تر امت کی طرف مخاطب تھے اور اپنی کرب و بے چینی کی حالت میں بھی ان کی نصیحت و خیر خواہی کے لیے گھلے جا رہے تھے- جب رفیق اعلیٰ کی جانب سے ان کو دعوت نامہ پہنچ گیا تو اتنے یکسو ہو کر سب سے بیگانہ بن گئے کہ سب سے محبوب بی بی بھی مایوس ہو کر بڑی حسرت کے لہجہ میں فرماتی ہیں میں سمجھ گئی اب آپ ہم کو اختیار نہیں فرمائیں گے-

(۱۰۳۱) عَنْ اُمِّ سَلِمَةَ قَالَتْ وَضَعْتُ يَدِیْ عَلٰی صَدْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ مَاتَ فَمَرَّ بِیْ جُمَعٌ اٰكُلُ وَ اَتَوَضَّأُ مَا يَذْهَبُ رِيْحُ الْمِسْكِ مِنْ يَدِیْ. (اخرجه البيهقي كما في الخصائص ص ۲۷٤ ج ۲)

(۱۰۳۱) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا روایت فرماتی ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر رکھ کر آپ کو دیکھا تھا - بس کیا کہوں کئی جمعے گزر چکے ہیں - کھاتی بھی ہوں اور وضو بھی کرتی ہوں مگر وہ مشک کی سی خوشبو میرے ہاتھوں سے نہیں جاتی -

منها ما تتعلق بتجريده صلى الله عليه وسلم عن ثيابه عند غسله

بعد وفات آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی خصوصیت

(۱۰۳۲) عَنْ عَائِشَةَ لَمَّا اَرَادُوْا غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا وَ اللّٰهِ مَا نَدْرِیْ اَنُجَرِّدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ثِيَابِهٖ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا اَمْ نَغْسِلُهٗ وَ عَلَيْهِ ثِيَابُهٗ فَلَمَّا اخْتَلَفُوْا اَلْقَی اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّوْمَ حَتّٰی مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ اِلَّا وَ ذَقْنُهٗ فِیْ صَدْرِهٖ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ مُكَلِّمٌ مِنْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ لَا يَدْرُوْنَ مَنْ هُوَ اَنْ اغْسِلُوا النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِ ثِيَابُهٗ. (اخرجه ابن سعد و ابوداؤد والحاكم و البيهقي و صححاه و ابو نعيم كما في الخصائص ص ۲۷۵ ج ۲. و اخرج ابن ماجة عن بريدة و ابن بريدة و ابن سعد و الطبراني عن ابن عباس نحوه)

(۱۰۳۲) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بیان فرماتی ہیں جب لوگوں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو باہم یہ گفتگو ہونے لگی بخدا ہم کو اس کا علم نہیں کہ جس طرح ہم اپنے مردوں کے جسم کے کپڑے اتار لیتے ہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کے کپڑے بھی اتار لیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کپڑوں ہی میں غسل دے دیں - جب اختلاف زیادہ ہونے لگا تو اللہ تعالی نے ان پر ایسی نیند غالب کی کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ بچا جس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا نہ لگی ہو پھر گھر کے ایک گوشہ سے کسی کہنے والے نے کہا معلوم نہیں وہ تھا کون ''آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں ہی میں غسل دے دو -

منها ماتتعلق بالصلوة صلى الله عليه وسلم

آنخضرت پر نماز جنازہ کی ایک امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۳) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ

(۱۰۳۳) حضرت ابن مسعودؓ روایت فرماتے ہیں جب آنخضرت صلی اللہ

(۱۰۳۲) ✽ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل کی سنت میں یہاں عام بشر کے شریک بھی ہیں مگر اتنے ممتاز بھی ہیں کہ صحابہؓ آپ کے غسل میں متحیر کھڑے ہیں اور یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ جس طرح عام انسانوں کے کپڑے اتار لیے جاتے ہیں اسی طرح آپ کے کپڑے بھی اتار لیے جائیں پھر یہاں ندائے غیبی سے اس صورت پر عمل کر لیا جاتا ہے جو خود بھی قرین قیاس نظر آ رہی تھی - خدا تعالی کی اس حکمت کے قربان کہ دین کامل بھی ہوا مگر پھر بہت سے معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہا اور اس طرح جس امت میں اب کوئی جدید رسول آنے والا نہ رہا تھا اس کے لیے بڑی سہولت اور وسعت پیدا ہو گئی -

(۱۰۳۳) ✽ اللہ اکبر انبیاء علیہم السلام کی ہر ہر بشری عوارض میں شرکت بھی اور قدم قدم پر ان کے امتیازات بھی کس طرح ثابت للہ .....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا مَنْ يَغْسِلُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رِجَالٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِي الْاَدْنٰى فَالْاَدْنٰى مَعَ مَلَائِكَةٍ كَثِيْرَةٍ يَرَوْنَكُمْ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ قُلْنَا مَنْ يُصَلِّيْ عَلَيْكَ قَالَ اِذَا اغْتَسَلْتُمُوْنِيْ وَ حَنَطْتُمُوْنِيْ وَ كَفَنْتُمُوْنِيْ فَضَعُوْنِيْ عَلٰى سَرِيْرِيْ هٰذَا عَلٰى شَفِيْرِ قَبْرِيْ ثُمَّ اَخْرُجُوْا عَنِّيْ سَاعَةً فَاِنَّ اَوَّلَ مَنْ يُصَلِّيْ عَلَيَّ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ مِيْكَائِيْلُ ثُمَّ اِسْرَافِيْلُ ثُمَّ مَلَكُ الْمَوْتِ مَعَ جُنُوْدٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ ثُمَّ لِيُصَلِّ عَلَيَّ اَهْلُ بَيْتِيْ ثُمَّ ادْخُلُوْا عَلٰى اَفْوَاجًا وَ فُرَادٰى قُلْنَا فَمَنْ يَدْخُلُ قَبْرَكَ قَالَ اَهْلِيْ مَعَ مَلَائِكَةٍ كَثِيْرِيْنَ يَرَوْنَكُمْ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ. اخرجه ابن سعد و ابن منيع و الحاكم و البيهقی و

علیہ وسلم کی علالت زیادہ بڑھ گئی تو ہم لوگوں نے آپؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو غسل کون دے؟ آپ نے فرمایا میرے گھر کے وہ آدمی جو نسب میں مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب تر ہوں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اور فرشتے بھی شامل ہوں گے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے - پھر ہم نے عرض کی اچھا آپؐ کی نماز کون پڑھائے؟ فرمایا جب تم مجھے غسل دے کر، خوشبو لگا کر اور کفن پہنا کر فارغ ہو جاؤ تو مجھ کو میری اس چارپائی پر رکھنا اور اس کو میری قبر کے کنارہ رکھ دینا - پھر تھوڑی دیر کے لیے تم سب باہر ہو جانا کیونکہ سب سے پہلے جو مجھ پر نماز پڑھیں گے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں اور اس کے بعد پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر ملک الموت اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہوں گے اس کے بعد میرے اہل بیت مجھ پر نماز پڑھیں اس کے بعد تم لوگ جماعتیں جماعتیں اور علیحدہ علیحدہ داخل ہونا - ہم نے پوچھا اچھا تو آپ کو قبر میں کون اتارے؟ آپ نے فرمایا میرے گھر کے مرد اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہوں گے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے - (خصائص الکبریٰ)

الطبرانی فی الاوسط قال البیهقی تفردبه سلام الطویل عن عبد الملك بن عبدالرحمن و تعقبه ابن حجر فی المطالب العالیه بان ابن منیع اخرجه من طریق مسلمة بن صالح عن عبدالملك به فهذه متابعة لسلام الطویل و اخرجه البزار من وجه اخر عن ابن مسعود و اخرجه البیهقی و غیره عن ابن عباس ان الناس صلوا علیه بغیر امام ارسالا كذا فی الخصائص ص ۲۷۶ ج ۲ و قد تکلم فی اسناده الحافظ ابن کثیرؒ فی البدایة و النهایة ص ۲۵۴ ج ۵ و ذکر فی ص ۲۶۵ ج ۵ ان فی صحته نظرا و معهذا قال ان صلاتهم علیه فرادی لم یؤمهم احد علیه امر مجمع علیه لا خلاف فیه.

لله ..... ہوتے چلے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود بعض نادان ان کا صحیح مقام سمجھنے میں پھر مغالطہ کھاتے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ بخدا وہ بشر ہوتے ہیں بلکہ افضل البشر ہوتے ہیں اور ابو البشر کی ذرّیت کو بھی اگر بشر نہ کہا جائے تو بولو اور کیا کہا جائے ان کے امتیازی صفات میں ایک صفت بھی ایسی نہیں ہوتی جو بشریت کی صفت نہ ہو ان صفات سے جتنا ان میں اور عام بشر میں امتیاز ہو جاتا ہے اس سے زیادہ امتیاز ان میں اور رب العالمین میں بدیہی بن جاتا ہے - خود قرآن کریم نے اپنے سب سے مقرب اور محبوب رسول کے ساتھ جو خاص خاص مواقع پر اندازِ خطاب اختیار فرمایا ہے وہ اس لیے ہے کہ ہر ہر جگہ یہ واضح ہوتا رہے کہ قرب و بلندی کے سارے مقامات طے ہو جانے کے بعد بھی رب العالمین کے سامنے کسی کی ہستی بندگی سے آگے نہیں جاتی -

﴿ سُبْحَانَهٗ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴾

منها ما تتعلق تبعزية النبی صلی الله علیه وسلم

(۱۰۳۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَزَّتْهُمُ الْمَلَائِکَةُ یَسْمَعُوْنَ الْحِسَّ وَ لَا یَرَوْنَ الشَّخْصَ فَقَالَتْ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُهُ اِنَّ فِیْ اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ کُلِّ مُصِیْبَةٍ وَ خَلَفًا مِنْ کُلِّ فَائِتٍ فَبِاللّٰهِ فَثِقُوْا وَ اِیَّاهُ فَارْجُوْا فَاِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ وَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُهُ.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کی غیبی تعزیت کی خصوصیت

(۱۰۳۴) جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تو آپ کے اہل بیت کی تعزیت ملائکہ نے بھی کی صرف ایک آواز آتی تھی مگر کوئی شخص نظر نہ آتا تھا اور تعزیت کے الفاظ یہ تھے ''اے اہل بیت السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ- ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک صبر کا سبب ہے اور ہر چیز کا جو ہاتھوں سے نکل جائے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بہتر جانشین ہے (اس کا بدل دے دیتا ہے) لہٰذا صرف اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو اور اسی سے اُمید لگائے رکھو کیونکہ محروم صرف وہ کہا جاتا ہے جو ثواب سے بھی محروم ہو جائے (تم کو صبر کا ثواب ملے گا تم محروم نہیں) السلام علیکم ورحمۃ اللہ. (خصائص الکبریٰ)

(اخرجه الحاکم و صححه و البیهقی و رویاه عن انس و اخرج ابن ابی حاتم و ابو نعیم عن علی و سیف بن عمر عن ابن عمر نحوه کذا فی الخصائص ص ۲۷۹ ج ۲ . و فی مشکوٰة المصابیح نحوه. و ذکر البیهقی له اسنادًا اخر و قال و هذان و ان کانا ضعیفین فاحدهما یتا کدبا لاخرو یدل علی ان له اصلا. البدایة و النهایة ص ۲۷۷ ج۵)

(۱۰۳۴) * جن اہل بیت کی شان میں اور جن کے گھروں میں کبھی وحی ربانی اترا کرتی ہو ان کے گھروں میں صرف ایک غیبی آواز پر تعجب کیا ہے- عام بشر کی تعزیت عام بشر کر لیتے ہیں- مگر رسول وہ ہیں جن کے گھر والوں کی تعزیت میں خدا کے مقدس فرشتے بھی شریک رہتے ہیں-

واضح رہے کہ اس حدیث کے بعض طریقوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ غائب شخص خضر علیہ السلام تھے مگر حافظ ابن کثیرؒ نے ان سب روایتوں کی سخت تضعیف کی ہے دیکھو البدایہ والنہایہ ص ۲۹۹ و ۳۳۱ و ۳۳۲ ج ۱ اس کے بعد کتاب مذکور کے ص ۳۳۶ ج ۱ پر حافظ سہیلیؒ کی مندرجہ ذیل رائے نقل کی ہے-

و رجح السهیلی رحمة الله تعالٰی علیه بقاء ه و حکاه عن الاکثرین قال و اما اجتماعه مع النبی صلی الله علیه وسلم و تعزیته لاهل البیت بعده فمردی من طریق صحاح ثم ذکر ما تقدم مما ضعفناه و لم یورد اسانیدها و الله و اعلم.

حافظ سہیلیؒ نے خضر علیہ السلام کی حیات اور ان کی بقاء کو ترجیح دی ہے اور اکثر علماء کا یہی قول نقل کیا ہے- اور فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ملاقات اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے اہل خانہ کی ان کی تعزیت کرنا صحیح طریقوں سے مروی ہے- اس کے بعد وہ روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم ضعیف قرار دے چکے ہیں- حافظ سہیلیؒ نے ان کی اسادیں نقل نہیں کیں-

منها ما يتعلق بالدفن

(۱۰۳۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَلَفُوْا فِيْ دَفْنِهٖ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا فِي الْمَوْضَعِ الَّذِيْ يُحِبُّ اَنْ يُدْفَنَ فِيْهِ اِدْفِنُوْهُ فِيْ مَوْضَعِ فِرَاشِهٖ. (رواه الترمذی)

(۱۰۳۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِيْ دَخَلَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ اَضَاءَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ اَظْلَمَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ وَ مَا نَفَضْنَا اَيْدِيَنَا عَنِ التُّرَابِ وَ اِنَّا لَفِيْ دَفْنِهٖ حَتّٰى اَنْكَرْنَا قُلُوْبَنَا. (رواه الترمذی و قال هذا حديث صحيح غريب و قد صححه ابن كثير كما فی البداية و النهاية ص ۲۷٤ ج ۵)

انبیاء علیہم السلام کے دفن میں امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۵) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوگئی تو آپ کے دفن کے متعلق لوگوں کی رائیں مختلف تھیں، اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات خود سنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو وفات نہیں دی مگر اسی مقام پر جہاں وہ چاہتا ہے کہ اس کو دفن کیا جائے لہٰذا آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ کا بچھونا تھا۔ (ترمذی شریف)

(۱۰۳۶) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو تمام مدینہ جگمگا اٹھا اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو تمام مدینہ تاریک تھا، اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی دے کر ابھی اپنے ہاتھ جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ اپنے قلوب کی حالت دیکھی تو دگرگوں تھی۔

(ترمذی شریف)

(۱۰۳۵) * خدا تعالیٰ کے رسول بھی دفن ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کی ولادت اور موت کے حالات میں امتیاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے دفن کے حالات میں بھی امتیاز ہوتا ہے وہ عام دستور کے مطابق ہر جگہ دفن نہیں ہوتے بلکہ وہیں دفن ہوتے ہیں جہاں ان کی تمنا ہوتی ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہوئی اس لیے یہ اس کی دلیل تھی کہ اسی جگہ دفن ہونے کی آپ کی تمنا تھی لہٰذا آپ وہیں دفن کیے گئے۔ گویا جو آپ کی قیام گاہ تھی وہی آپ کا مدفن رہا۔ اب غور فرمائیے وہ بشر کیسے بشر ہوں گے جن کی وفات کے بعد محل رہائش کا بھی فرق نہیں پڑا صرف اس کی صورت ذرا بدل گئی اور جب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو حدیثیں پتہ دیتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے جسم زندوں کی طرح زمین کے تخریبی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر اس سے ذرا اور آگے قدم اٹھائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر پھر ان سب فضائل سے ان کی بشریت اور عبدیت ہی کا ثبوت ملتا ہے۔ جب دنیا میں ایک محسوس حیات کے مالک ہو کر وہ بشر ہی رہے تو وفات کے بعد ان کی غیر محسوس حیات سے آپ اپنا عقیدہ کیوں خراب کرتے ہیں۔

(۱۰۳۶) * جس ذات کو مجسم نور بنایا گیا اور جن کا لقب قمر منیر رکھا گیا تھا اگر حقیقت میں نظروں کے سامنے ان کی آمد سے نور اور ان کے دفن کے بعد تاریکی چھا گئی تو کیا تعجب ہے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی روایت گذر چکی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کی صحبت سے ذرا الگ ہوتے تھے تو ہماری قلبی کیفیت بدل جاتی تھی پھر جب کہ عالم کا تفاوت ہو گیا ہو تو بولو قلبی کیفیات کیوں نہ بدل گئی ہوں گی۔ یہ عقیدت نہیں حقیقت تھی مگر جو انبیاء علیہم السلام کی شانِ رفیع کو نہیں پہچانتے وہ ان حقائق کو سمجھ نہیں سکتے۔ مثل مشہور ہے: من لم يذق لم يدر

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

منها انهم لایورثون

(۱۰۳۷) عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاهُ صَدَقَةٌ. (متفق علیه)

انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۷) حضرت ابوبکرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم جو انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہوتے ہیں ہمارا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ سب راہ خدا میں صدقہ ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)

منها مناجاتهم مع الملائکة

(۱۰۳۸) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَکَلَ ثُوْمًا اَوْ بَصَلًا فَلْیَعْتَزِلْنَا اَوْ

فرشتوں کے ساتھ آپ کی ہم کلامی کی خصوصیت

(۱۰۳۸) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جو کچا لہسن یا کچی پیاز کھائے وہ ہم سے علیحدہ رہے یا یہ لفظ فرمائے کہ ہماری مسجد سے علیحدہ رہے (راوی کو ان الفاظ میں شک ہے) اس کو چاہیے

(۱۰۳۷) * عام بشر جب مر جاتے ہیں تو ان کا ترکہ ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو جاتا ہے' مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں بھی مختلف نظر آتی ہے ان کی میراث کسی کو نہیں ملتی وہ سب راہ خدا میں صرف کی جاتی ہے سبحان اللہ جو ہستیاں اپنی حیات میں دنیوی طمع کا کوئی داغ اپنے دامن پر لگنا گوارا نہیں کرتیں' ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر اس داغ کے لگانے کی کوئی دشمن جرأت کر سکے اسی لیے ان کی خاص ذریت کے حق میں زکوٰۃ کا مال حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اب اندازہ کر لینا چاہیے کہ ان کی موت عام بشر تو درکنار شہداء سے بھی کتنی ممتاز ہوتی ہے شہداء کے حق میں قرآن کریم نے حیات کا لفظ کو استعمال فرمایا ہے اور ان کو بھی رزق ملنے کی بشارت دی ہے مگر ان کا ترکہ پھر عام انسانوں کی طرح ان کے عزیزوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی بھی اجازت نہیں بلکہ آپ کی ازواج کو آئندہ ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ شہداء ہوں یا بڑے سے بڑا بزرگ کسی کی ازواج کو بھی شوہروں کی وفات کے بعد نکاح کرنے سے روکا نہیں گیا مگر نبی کے حق میں اس کو اتنا اہم سمجھا گیا ہے کہ اس دفعہ کا خود قرآن کریم نے اعلان فرمایا ہے۔ مگر ان کے حق میں یہ سخت دفعہ ان کی مرضی کے بغیر لگائی نہیں گئی۔ بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا وہ چاہیں تو دنیا کو اختیار کر لیں اور چاہیں تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کو اختیار کر لیں گویا اس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی تو پھر آئندہ نکاح کا ان کو کوئی حق نہیں رہے گا' یہی وجہ تھی کہ آپ نے اس کی بڑی اہمیت محسوس کی اور سب بیویوں کو خود جا جا کر یہ پیغام سنا دیا اور جب ان میں سب سے پہلے حضرت عائشہؓ نے یہ جواب دے دیا کہ یہ بات نہ استخارہ کی محتاج ہے نہ کسی سے مشورہ کرنے کی ہم ایک طرف ہو کر آخرت اختیار کرتے ہیں تو گویا یہ بات برضاء و رغبت خود اختیار کر لی گئی تھی دیکھو ترجمان السنہ ص ۷۹ و ۸۰ ج ۲۔ اس میں رسول کا احترام بھی ملحوظ تھا۔ باپ کی منکوحہ جو اپنی والدہ نہ ہو وہ بھی اولاد پر حرام ہے زمانہ جاہلیت میں وہ سب سے بڑی اولاد کے نکاح میں آ سکتی تھی مگر اسلام نے اس کو والد کے احترام کے خلاف سمجھا اور ہمیشہ کے لیے اس کو اولاد پر حرام کر دیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ابوت چونکہ ساری امت کے ساتھ تھی اس لیے یہاں تمام امت کے حق میں اس احترام اور حرمت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کی حیات کا مسئلہ سب سے ممتاز رکھا گیا تھا تو وفات کے بعد اس صفت میں بھی ان کو عام بشر سے ممتاز رکھا گیا۔

(۱۰۳۸) * اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک چیز حلال ہوتی ہے مگر کبھی مخاطب کی خاطر اس کا استعمال ترک کیا جاتا ہے فرشتے ..... لله

لِيَعْتَزِلْ مَسْجِدَ نَا وَ لْيَقْعُدْ فِيْ بَيْتِهٖ وَ اَنَّهٗ اُتِيَ بِبَدْرٍ قَالَ ابْنُ وَهْبٍ يَعْنِيْ طَبَقًا فِيْهِ خَضِرَاتٌ مِنْ بُقُوْلٍ فَوَجَدَلَهَا رِيْحًا فَسَأَلَ عَنْهَا فَاُخْبِرَ بِمَا فِيْهَا مِنَ الْبُقُوْلِ فَقَالَ قَرِّبُوْهَا اِلٰى بَعْضِ اَصْحَابِهٖ كَانَ مَعَهٗ فَلَمَّا رَاٰهُ كَرِهَ اَكْلَهَا قَالَ كُلْ فَاِنِّيْ اُنَاجِيْ مَنْ لَا تُنَاجِيْ. (رواہ البخاری)

کہ وہ اپنے گھر بیٹھا رہے- ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طشت پیش کیا گیا جس میں کچھ سبزی تھی آپ نے ان کی بومحسوس کی تو پوچھا یہ کیا ہے؟ فوراً عرض کیا گیا کہ اس میں لہسن یا پیاز ہے آپ نے جو صحابی آپ کے ہمراہ تھے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ ان کے سامنے رکھ دو مگر جب آپ نے دیکھا (کہ آپ کے انکار کی وجہ سے) وہ بھی اس کا کھانا پسند نہیں کرتے تو فرمایا تم کھالو میں تو اس لیے نہیں کھاتا کہ میں اس مخلوق کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہوں جس سے تم نہیں ہوتے- (بخاری شریف)

لے ..... چونکہ نورانی مخلوق ہیں مادیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں اس لیے جس طرح ان کو کفر وشرک بلکہ ہر معصیت سے نفرت ہے اسی طرح بدبو اور نجاست وغیرہ سے بھی نفرت ہے- خدا تعالیٰ کی یہ مقدس مخلوق انبیاء علیہم السلام کی محفل کی ہمہ وقت حاضر باش ہوتی ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام اپنے اہل محفل کی خاطر خود بھی اس قسم کی اشیاء سے احتراز کر لیتے ہیں- اسی طرح مسجدیں بھی خاص طور پر ان کا محل ہیں- یہاں بھی ان کی رعایت کی گئی ہے- چونکہ عام انسانوں کو یہاں صرف کچھ وقت کے لیے دعوت دی جاتی ہے- اس لیے ان کو یہ ہدایت بھی کردی گئی ہے کہ جب وہ کسی کی خاص رہائش کی جگہ جائیں تو ان کو چاہیے کہ یہاں وہ تھوڑے ضبط نفس سے کام لیں اور ایسی اشیاء سے پرہیز رکھیں جو اس مقدس مقام کے ساکنوں کے لیے موجب اذیت ہو- اگر مسجدوں میں فرشتوں کا یہ احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو وہ بھی اپنے ان بشری مہمانوں کی دعاء خیر سے خوب تواضع کرتے ہیں اور اس طرح عام بشر کے مسجد میں بلانے کا جو اہم مقصد تھا وہ اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے- ظاہر ہے کہ گناہگاری جس مخلوق کے ضمیر کا جزء ہو اس کے لیے اس مخلوق کی صحبت کتنی ضروری ہوگی جو صرف معصیت سے بھی آشنا نہیں ہے- خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایک بڑی عمیق حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے یعنی بشر کے ملکوتی صفات سے انصباغ تکوینی نظم ونسق کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس انعکاس وانصباغ کی صورت صحبت سے زیادہ موثر اور کوئی نہیں ہوسکتی اس لیے کبھی تو فرشتوں کو مومنوں کے گھروں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی صحبت سے ان میں معصومیت کی صفت پیدا ہوتی چلی جائے اور اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ کوئی حرکت ہم ایسی نہ کریں جو ان کے آمد وشد کے لیے مانع ہو- مثلاً کتا گھروں میں نہ رکھیں نجاست نہ رکھیں اور اسی طرح تصاویر نہ لٹکائیں کیونکہ یہ سب باتیں ان کے آنے سے مانع ہوجاتی ہیں- اسی طرح کبھی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم خود ان کے مستقر پر جاکر ان کی شرف صحبت سے مستفید ہوں اور ان کا سب سے بڑا مستقر مساجد ہیں اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہاں جاکر جو چیز ان کے لیے طبعاً قابل نفرت ہے اس کا استعمال نہ کریں اور شب وروز کی ان صحبتوں سے معصیت سے نفرت اور عبادت کی رغبت کا جو اہم مقصد ہے وہ عاصی انسانوں میں بھی فرشتوں کی طرح پیدا ہوجائے جو شریعت کے ان اسرار کو پیش نظر نہیں رکھتے ان کی عبادتیں بھی صرف عبادت کا ایک بے روح خاکہ بن کر رہ جاتی ہیں- صفت احسان میں ان کا کوئی حصہ نہیں- اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ عام بشر کو انبیاء علیہم السلام سے کیا نسبت یہ اگر کچھ دیر کے لیے ان کی ہم نشینی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو خود ان کے مقام پر جاکر وہ بھی طفیل ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام ہی کا اور رسول وہ ہوتے ہیں جن کی محفل میں خود ملائکۃ اللہ حاضر ہوکر ان کے شرف صحبت سے مستفیض ہوتے ہیں- اہل جنت کو جس نوعیت کا مکالمہ اور صحبت فرشتوں کے ساتھ جنت میں جاکر نصیب ہوگی انبیاء علیہم السلام کو وہ اسی عالم میں میسر ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر-

(۱۰۳۹) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا عَنْ مَیْمُوْنَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَصْبَحَ یَوْمًا وَ اَجِمًا وَ قَالَ اِنَّ جِبْرَئِیْلَ کَانَ وَ عَدَنِیْ اَنْ یَلْقَانِی اللَّیْلَۃَ فَلَمْ یَلْقِیْ اَمَ وَ اللّٰہِ مَا اَخْلَفَنِیْ ثُمَّ وَ قَعَ فِیْ نَفْسِہٖ جِرْوُ کَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَہٗ فَاَمَرَ بِہٖ فَأُخْرِجَ ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِہٖ مَاءً فَنَضَحَ مَکَانَہٗ فَلَمَّا اُمْسٰی لَقِیَہٗ جِبْرَئِیْلُ فَقَالَ لَقَدْ کُنْتُ وَ عَدْتَنِیْ اَنْ تَلْقَانِیْ الْبَارِحَۃَ قَالَ اَجَلْ وَ لٰکِنَّا لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَ لَا صُوْرَۃٌ فَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَئِذٍ فَاَمَرَ بِقَتْلِ الْکِلَابِ حَتّٰی اَنَّہٗ یَأْمُرُ بِقَتْلِ کَلْبِ الْحَائِطِ الصَّغِیْرِ وَ یَتْرُکُ کَلْبَ الْحَائِطِ الْکَبِیْرِ. (رواہ مسلم)

(۱۰۳۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں - ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مغموم تھے اور فرماتے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام نے آج کی شب مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا مگر آئے نہیں خدا کی قسم وہ مجھ سے وعدہ خلافی تو نہیں کر سکتے - پھر آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت کے نیچے کتے کا پلہ ہے آپ نے حکم دیا وہ فوراً نکال دیا گیا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے پانی لے کر اس جگہ پر چھڑکا - جب شام ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے آپؐ نے فرمایا - آپ نے تو گزشتہ شب میں مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا - انہوں نے کہا جی ہاں لیکن جس گھر میں کتا یا تصویر ہوتی ہے ہم جو فرشتوں کی جماعت ہیں اس گھر میں داخل نہیں ہوا کرتے - اسی دن صبح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ کتے مار دیئے جائیں اور اس تاکید سے حکم دیا کہ اگر کسی کا باغ چھوٹا ہو اور وہ خود اس کی حفاظت کر سکتا ہو تو جو کتا اس کی نگرانی کے لیے ہو وہ بھی مار دیا جائے' ہاں اگر باغ بڑا ہو تو اس کی نگرانی کا کتا چھوڑ دیا جائے - (مسلم شریف)

(۱۰۳۹) ٭ کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی فطرت کو شیاطین سے مناسبت ہے اور تصویر خالق حقیقی کی نقالی کا بدترین مظاہرہ ہے اس لیے فرشتے ان دونوں سے بیزار ہوتے ہیں - نبی و رسول کا گھر گو ان کے لیے مرکز ثقل کی سی کشش رکھتا ہے مگر جس طرح آب و آتش کا اجتماع فطرۃً ناممکن ہے اسی طرح ملائکۃ اللہ اور خبائث کا اجتماع بھی ان کی فطرت کے خلاف ہے - ظاہر ہے کہ اس جلیل القدر فرشتے کی آمد کے لیے جو امر مانع بن گیا ہو اور وقتی طور پر آپ کو بھی کتنا شاق گذرا ہو گا - کتا باغات کی حفاظت کے لیے اس وقت بہت ضروری چیز سمجھا جاتا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اس کی مضرت ذہن نشین کرنے کے لیے کچھ مدت کے لیے ایسا حکم نافذ کر دیا جائے کہ پھر اس کا استعمال مجبوری کے درجہ ہی میں محدود ہو جائے - افسوس ہے کہ جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک گھر میں فرشتوں کی آمد کی مانع ہوگئیں آج وہی ہمارے گھروں کی سب سے بڑی زینت بنی ہوئی ہیں - اب یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ جب فرشتوں کی آمد کے لیے لاعلمی میں بھی صرف ایک کتے کا وجود مانع بن سکتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ان کی آمد کے لیے مانع نہ ہو گی - خوب یاد رکھیے کہ فرشتوں کو جس طرح نجاسات اور خبائث سے بالطبع نفرت ہوتی ہے - اسی طرح خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے بھی ان کو شدید نفرت ہوتی ہے - ترجمان السنہ ص ۴۱۵ ج ۲ - میں آپ ملاحظہ فرما چکے کہ جھوٹ کی بدبو سے فرشتے ایک میل دور نکل جاتے ہیں - جاندار کی تصویر دیکھنا وہ برداشت نہیں کرتے لہسن و پیاز کی بدبو سے ان کو سخت ایذاء ہوتی ہے - اگر العیاذ باللہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہ ہوں تو کیا محفل کی حضوری اور ہر ہر مقامات میں ان کی بلکہ ان کی امتوں کی اعانت وہ اپنی سعادت تصور کر سکتے ہیں -

منها صلوة النبی صلی الله علیه وسلم علی الجنائز فانها کانت نورًا لاهل القبور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ جنازہ کی ایک خصوصیت

(۱۰۴۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ اِمْرَءَةً سَوْدَاءَ کَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِد اَوْشَابٌّ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا اَوْ عَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ قَالَ اَفَلَا کُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِیْ قَالَ فَکَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهٗ فَقَالَ دُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِهٖ فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰی اَهْلِهَا وَ اِنَّ اللّٰهَ یُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلٰوتِیْ عَلَیْهِمْ.

(متفق علیه و اللفظ لمسلم)

(۱۰۴۰) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا وہ کوئی نوجوان مرد تھا (راوی کو اس میں شک ہے) ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ دیکھا تو اس کے متعلق دریافت فرمایا-لوگوں نے کہا اس کا تو انتقال بھی ہوگیا-آپؐ نے فرمایا تم نے مجھ کو اس کی خبر کیوں نہیں کی؟ راوی کہتا ہے گویا لوگوں نے ایسی عورت کی موت کا معاملہ بہت معمولی سمجھا-اس پر آپؐ نے فرمایا مجھے بتاؤ اس کی قبر کہاں ہے؟ چنانچہ آپ کو قبر بتائی گئی-آپؐ نے اس پر نماز ادا کی اس کے بعد ارشاد فرمایا یہ جو مردوں کی قبریں ہیں یہ تاریکی در تاریکی سے بھری ہوئی ہیں میری نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو روشن اور منور فرمادیتا ہے- (متفق علیہ)

منها تمثل الجنة و النار صلی الله علیه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ کی تمثل کی خصوصیت

(۱۰۴۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَسَفَتِ

(۱۰۴۱) ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات

(۱۰۴۰) * نبی کی نماز، اس کی امامت اور اس کی اقتداء کے مسائل بھی سب سے ممتاز ہوتے ہیں فضائل کے یہ سب گوشے چونکہ صرف آپ کی ذات سے متعلق تھے اس لیے وہ کسی تقریب سے بیان میں آگئے ہیں-دنیا میں مسلمانوں پر ہمیشہ جنازہ کی نمازیں پڑھی جائیں گی مگر کیا ہے کوئی جس کی نماز تاریک قبروں کو منور کرنے کے لیے قطعیت کے ساتھ ضامن ہو سکے-

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ کی غیر حاضری میں امام بن گئے تھے اتفاق سے آپ عین نماز کی حالت میں تشریف لے آئے-ابوبکرؓ نے یہ محسوس کرنے کے ساتھ ہی امامت کے مصلے سے فوراً اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے آپؐ نے اشارہ سے فرمایا بھی کہ نماز پوری کرلو مگر حضرت ابوبکرؓ سے نہ ہو سکا اور بعد میں یہ عذر بیان کیا یا رسول اللہؐ ابوقحافہ (ان کے والد کی کنیت ہے) کے بیٹے کی مجال کہ جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہوں وہاں اس کا قدم آگے نظر آئے-علماء نے لکھا ہے کہ نبی کی امامت اس کے اذن کے بغیر جائز نہیں-غالبًا آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے جنازے کی نماز امام کے بغیر اسی نکتہ کی بناء پر ادا کی گئی تھی اور اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد امام مہدی نماز کے مصلے سے پیچھے ہٹ آئیں گے اور آئندہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مستقل امام ہوں گے-

(۱۰۴۱) * انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اولیاء کرام کو بھی کبھی کبھی جنت و دوزخ کا مشاہدہ ہو جاتا ہے مگر یہ مشاہدہ صرف اسی حد تک ہوتا ہے کہ ان کو یہ وسوسہ بھی نہیں گزرتا کہ وہ جنت کی کوئی چیز اٹھا لیں-مگر آپؐ کا یہ مشاہدہ اس درجہ پر حقیقت تھا کہ اس کے اظہار کے لئے .....

الشَّمْسُ عَلٰی عَهْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَأَیْنَاکَ تَنَاوَلْتَ شَیْئًا فِیْ مَقَامِکَ ثُمَّ رَأَیْنَاکَ تَکَعْکَعْتَ فَقَالَ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَ لَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَ کَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا.

(رواه البخاری فی باب رفع البصر الی الامام فی الصلوة راجع ج ۱ ص ٤٣٤ ترجمان السنة و فیه قصة رؤیة امرئة فی النار دخنتها فی هرة کما فی البخاری ص ۱۰۳ قالت عائشةؓ ان المرئة کانت کافرة الخ کما فی المجمع)

میں ایک بار سورج گہن ہوا تو آپ نے صلوٰۃ الکسوف اداء فرمائی۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا تھا جب آپ نماز کے لیے کھڑے تھے تو آپ نے کوئی چیز سامنے سے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا' اس کے کچھ بعد ہم نے یہ دیکھا تھا کہ آپ اپنے پیچھے کی جانب ہٹے تھے (یہ کیا بات تھی) آپ نے فرمایا جب میں سامنے کی جانب بڑھا تھا تو اس وقت میں نے جنت دیکھی تھی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں اس میں سے ایک خوشہ لے لوں اور اگر کہیں میں لے لیتا تو تم اس کو کھاتے رہتے جب تک دنیا باقی رہتی (اور وہ ختم نہ ہوتا) اور جب پیچھے کی جانب ہٹا تھا تو اس وقت دوزخ دیکھی تھی۔ (بخاری شریف)

(۱۰۴۲) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ صَلّٰی لَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَقِیَ الْمِنْبَرَ فَاَشَارَ بِیَدَیْهِ قِبَلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ

(۱۰۴۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی پھر منبر پر تشریف لا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے قبلہ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا۔ میں نے ابھی ابھی جب تم کو

ﷺ ..... لیے سب سے مناسب تعبیر وہی ہوسکتی تھی جو حدیث مذکور میں آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ ظاہر ہے کہ خود جنت بھی غیر فانی ہے اس لیے اس کی جو چیز ہو وہ بھی غیر فانی ہونی چاہیے۔ یقیناً اگر آپ اس کے باغات کا کوئی خوشہ لے لیتے تو رہتی دنیا تک وہ بھی فنا نہ ہوتا۔ آپ نے اس حقیقت کو واضح کر کے یہ سمجھا دیا کہ آپ نے بعینہٖ جنت ہی کو دیکھا تھا اور اسی لیے ایک قدم آگے بڑھایا تھا مگر چونکہ فانی غیر فانی لذتوں سے موت سے قبل متمتع نہیں ہوسکتا اس لیے صرف ایک قدم اٹھا کر آپ رک گئے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے مشاہدات کی حقیقت خواب وخیال کی برابر سمجھے تو اس کی کج فہمی کا کیا علاج۔ اسی واقعہ میں آپ نے ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلّی کو باندھ کر پھر اس کے آب ودانہ کی خبر نہ لی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ عورت کافرہ تھی یہ عذاب اس کو اسی لیے ہوا تھا۔ کما فی مجمع الزوائد۔

(۱۰۴۲) ٭ عام عبادت کی حالت میں بھی اور بالخصوص نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رفیع خدا ہی جانے کتنی بلند ہو جاتی تھی گویا اس جہان میں بس آپ کا جسم ہی جسم رہ جاتا تھا روح مبارک عالم بالا سے جا ملتی تھی۔ حضوری بھی وہ حضوری میسر آتی تھی کہ ملکوت و جبروت کے عجائبات طرح طرح سے سب کھلے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ رسولِ اعظم کی یہ شان بھی کتنی نرالی تھی کہ کبھی عالم غیب خود ایک صورت بن کر یعنی عالم مثال میں ان کے سامنے آجاتا تھا اور کبھی وہ خود بنفس نفیس عالم غیب میں جا کر اس کی سیر کر آتے تھے اُن کے لیے نہ یہ مشکل تھا نہ وہ مشکل تھا۔

اس حدیث میں جنت ودوزخ کے عینی مشاہدہ کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے ﷺ .....

رَأَیْتُ الاٰنَ مُنْذُ صَلَّیْتُ لَکُمُ الصَّلٰوۃَ الْجَنَّۃَ وَ النَّارَ مُمَثَّلَتَیْنِ فِیْ قِبْلَۃِ ھٰذَا الْجِدَارِ فَلَمْ اَرَ کَالْیَوْمِ فِی الْخَیْرِ وَ الشَّرِّ ثَلاثًا. (رواہ البخاری قلت و ھذا فی واقعۃ الظھر کما یعلم مما عند البخاری فی باب وقت الظھر عند الزوال ج ١ ص ٧٧ و فیہ واقعۃ سوال حذیفۃ "من ابی")

نماز پڑھا رہا تھا تو جنت اور دوزخ کو اس قبلہ والی دیوار کی طرف دیکھا تھا کہ وہ متمثل ہو کر میرے سامنے ہیں کیا پوچھتے ہو کہ خوف و خوشی کا جیسا منظر آج میں نے دیکھا تھا ایسا عمر بھر کبھی نہیں دیکھا۔

(بخاری شریف)

منھا رؤیۃ صلی اللہ علیہ وسلم الی الجنۃ و النھار بعینھما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت دوزخ مشاہدہ فرمانے کی خصوصیت

(١٠٤٣) عَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

(١٠٤٣) بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ صبح کے

ﷺ ..... دو وجود ہیں ایک خارجی دوم مثالی یعنی جیسا خارج کا عالم ایک عالم ہے اسی طرح عالم مثال بھی مستقل ایک عالم ہے خارجی عالم میں اس شئے کا مادہ اور اس کی مقدار و کیفیت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ عالم مثال میں صرف اس کی مقدار اور کیفیت ہی محفوظ رہتی ہے اس کا مادہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے عالم مثال خارجی عالم سے زیادہ قوی مانا گیا ہے۔ عالم مثال خواب کے عالم سے بالکل مختلف ہے لیکن بطور نظیر کے اس کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ایک خوابیدہ شخص بحالت خواب آسمان و زمین کا کتنا وسیع احاطہ دیکھ لیتا ہے جو اپنی وسعت میں عالم خارجی کے آسمان و زمین سے کسی طرح کم نہیں ہوتا مگر اتنا وسیع عالم پھر اس کے عالم خیال میں سمٹ کر اس طرح آجاتا ہے کہ اس سارے عالم کی سمائی کے بعد بھی خیالی وسعت میں پھر گنجائش رہتی ہے' اسی طرح جنت و دوزخ کی وسعت اتنی ہے کہ سبع سماوات معہ زمینوں کے اس کے ایک گوشہ میں ہیں لیکن عالم مثال دوسرا عالم ہے اس کی یہ ساری وسعت بآسانی اس عالم کے کسی گوشہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس عالم کا اس عالم سے علاقہ نہ ظرف و مظروف کا ہے نہ داخل و خارج کا اس لیے وہاں یہ سوالات ہی پیدا نہیں ہو سکتے جو اس عالم کے اشیاء کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن کریم تک بھی سرایت کر گئی ہے۔ حضرت مریمؑ کے قصہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا.

اب سوچئے کہ جبرئیل علیہ السلام کی یہ آمد کتنی پر از حقیقت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سارا واقعہ اسی آمد کے ساتھ مربوط ہے لیکن جبرئیل علیہ السلام کی اس آمد کی بھی بلفظ تمثل ہی ادا فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ بشر کی صورت میں متمثل ہو کر نہ آتے تو ان کے دیکھنے کی تاب حضرت مریم علیہا السلام میں کہاں تھی پھر خدا تعالیٰ کا اتنا عظیم فرشتہ جب متمثل ہو کر آیا تو وہ اتنا ہی مختصر نظر آ رہا تھا جیسا عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر جنت و دوزخ اپنی وسعت کے باوجود صرف قبلہ کی دیوار میں سمٹ کر آپؐ کو نظر آ گئی تو اس کو ایک کشف یا خیال تصور کرنا قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا عالم غیب کے ساتھ علاقہ کتنا قوی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا تصور ہو جائے تو پھر ان امور کے یقین آنے میں کوئی دیر نہیں۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے جو معاملات اہل جنت کے حق میں فرمائے قیامت کے بعد قابل تصدیق ہیں وہ اس مقدس گروہ کے حق میں آج بھی لائق ایمان ہیں شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جسم کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام اسی جنتی جسم کو لے کر اس زمین پر اترے تھے۔ پس ثابت یہی ہوتا ہے کہ ان کے جسم دنیا میں بھی اہل جنت کے سے خواص رکھتے ہیں۔ ان کے حق میں یہاں بھی وہ گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے۔

(١٠٤٣) * مذکورۂ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں داخل ہونے کا اکثر اتفاق ہوا کرتا ﷺ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ بِمَا سَبَقْتَنِيْ اِلَى الْجَنَّةِ مَادَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَطُّ اِلَّاسَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ اَمَامِيْ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَذَّنْتُ قَطُّ اِلَّا صَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ وَ مَا اَصَابَنِيْ حَدَثٌ قَطُّ اِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَهٗ وَ رَأَيْتُ اَنَّ لِلّٰهِ عَلَيَّ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِمَا. (رواہ الترمذی و عند البخاری نحوہ فی باب فضل الطھور باللیل و النھار و فضل الصلوۃ بعد الوضوء)

وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور پوچھا تم کس عمل کی وجہ سے مجھ سے بھی پہلے جنت میں جا پہنچے۔ میں جب بھی جنت میں داخل ہوتا ہوں تمہارے پیروں کی آہٹ اپنے آگے آگے سنتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جب اذان دیتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں اور جب وضوء کی ضرورت ہو جاتی ہے تو فوراً وضوء ضرور کرتا ہوں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی یہ دو رکعتیں میں نے اپنے لیے فرض سمجھ لی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی بات ہے۔

(ترمذی شریف)

(۱۰۴۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱۰۴۴) جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لله ..... تھا اور بلال رضی اللہ عنہ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ آج ان کا تذکرہ بیان میں بھی آ گیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنے فرائض کا پابند رہے تو بعض مرتبہ اس کے خیال میں جو معمولی اعمال ہوتے ہیں وہ اس کے حق میں کسی بلند مرتبہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہاں تحیۃ الوضوء کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے' مگر اصولاً نوافل ادا کرنے کا فائدہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہاں آپ نے صرف اپنا مشاہدہ نقل نہیں فرمایا بلکہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اس مشاہدہ کا ذکر کیا ہے اب اس دخول کی نوعیت کیا تھی اس پر بحث کرنا ہمارے دائرہ علم سے باہر بات ہے اس قسم کے کئی واقعات حدیثوں میں آتے ہیں اور قیاس نہیں کہتا کہ وہ سب کے سب خواب کی حالت کے واقعات ہوں گے اور جب تک حدیث میں اس کی تصریح نہ آ جائے اس وقت تک کسی کو اپنی جانب سے اس کا حق بھی نہیں ہے بالخصوص ان کے حق میں جن کا اسی جسم کے ساتھ ایک مرتبہ آسمانوں اور جنت کی سیر کرنا بلکہ دیدار الٰہی سے مشرف ہونا بھی امت کے نزدیک مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں ترجمان السنہ ص ج اص ۱۴۱ ملاحظہ فرمالیجئے۔ غالباً یہ خواب اور شب معراج کے علاوہ کوئی اور صورت ہوگی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

(۱۰۴۴) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو یہ سارے نظارے اب ہو رہے تھے لیکن جن کے حق میں یہ نظارے ہو رہے تھے ان کے لیے اس کے ظہور کا وقت فردائے قیامت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دوربیں نے تو وہ سب اہم واقعات جوامت میں گزرنے والے تھے وہ بھی بہت پہلے دیکھ لیے تھے۔ جنت تو آپ کے نظارہ کی مخصوص جگہ تھی اس کے نہ معلوم کتنے عجائبات آپؐ نے اور دیکھیں ہوں گے جو بیان میں نہیں آئے یہ ان تین مقدس ہستیوں کا نصیب تھا کہ ان کے حتمی طور پر جنتی ہونے کی بشارت اس زبان سے نکل گئی جو سب سے بڑھ کر راست گو تھی۔ پھر بشارت بھی وہ جو چشم دید تھی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری دیکھیے کہ دہاں بھی اپنے جاں نثار کی خاطر گو قلبی تقاضہ تو رہا کہ ان کے جنت کی زیب و زینت اندر جا کر تفصیلاً بھی دیکھ آتے مگر پھر ان کی غیور طبیعت کا خیال اس سے مانع آ گیا۔ ادھر اس جاں نثار کا جذبہ دیکھیے کہ جو شرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جانے سے اس کو نصیب ہوتا اس کی محرومی پر وہ ایک حسرت بھرا کلمہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَإِذَا أَنَا بِالرُّمَيْصَاءِ امْرَءَةِ أَبِي طَلْحَةَ وَ سَمِعْتُ خَشْفَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا فَقَالَ هٰذَا بِلَالٌ وَ رَأَيْتُ قَصْرًا بِفِنَائِهٖ جَارِيَةٌ فَقُلْتُ لِمَنْ هٰذَا فَقَالُوا الِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَدْخُلَهٗ فَانْظُرَ إِلَيْهِ فَذَكَرْتُ غَيْرَتَكَ فَقَالَ بِأَبِيْ أَنْتَ وَ أُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَعَلَيْكَ أَغَارُ.

(متفق عليه)

میں جنت میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ابوطلحہؓ کی بیوی رمیصاء موجود ہیں (انس کی والدہ ام سلیم کا نام تھا) پھر میں نے پیروں کی آہٹ سنی تو پوچھا یہ کون؟ کسی نے کہا کہ یہ بلالؓ ہیں- اس کے بعد میں نے ایک محل دیکھا اس کے آنگن میں ایک جاریہ نظر آئی میں نے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے بتایا عمرؓ کا- میں نے ارادہ کیا کہ اندر داخل ہو کر بھی ذرا اس کو دیکھوں فوراً مجھے تمہاری طبعی غیرت کا خیال آ گیا- یہ سن کر عمرؓ بے اختیار بول اٹھے میرے ماں باپ آپؐ پر قربان یا رسول اللہ کیا میں آپؐ کے داخل ہونے پر بھی غیرت کرتا- (متفق علیہ)

من أجل ميزات الانبياء عليهمُ السلام وحى النبوّة و قد انقطع بعد نبيّنا و سيّدنا محمد صلى الله عليه وسلم

انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز خصوصیت وحی نبوت ہے اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے

(١٠٤٥) عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ أَبُوْبَكْرٍ لِعُمَرَؓ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْطَلِقْ بِنَا إِلٰى أُمِّ أَيْمَنَؓ نَزُوْرُهَا كَمَا كَانَ

(١٠٤٥) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا آؤ بھئی جس طرح کبھی آنحضرت صلی اللہ

(١٠٤٥) * وحی کیا ہے؟ خدا تعالیٰ سے قطعی ہم کلامی کا ایک شرف ہے جو نوع بشری میں خاص قسم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے' قرآن کریم نے آپ کی شانِ بشریت کے ساتھ آپ کی اسی امتیازی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے- ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (فصلت: ٦) یعنی میں بھی یقیناً ایک بشر ہوں مگر میرا امتیاز یہ ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور اس کا سب سے اہم سبق توحید الٰہی ہے- ہر بشر میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ بلا واسطہ ہم کلامی سے مشرف ہو سکے اس لیے قدرت اپنی جانب سے اس صلاحیت کے چند افراد منتخب فرمالیتی ہے پھر ان کے ذریعہ سے عام بشر تک اپنے احکام پہنچا دیتی ہے اگر وہ چاہتی تو عام بشر میں بھی یہ استعداد پیدا فرما دیتی مگر یہ اس کی حکمت کا تقاضہ نہ تھا اس کو عالم میں کافر و مسلم' مطیع و عاصی کی تقسیم پیدا فرما کر اپنے قہر و مہر کے کمالات کا اظہار بھی منظور تھا اس لیے اگر وہ سب افراد اسی صلاحیت کے پیدا فرما دیتی تو انکار و نافرمانی کا تخم دنیا سے نیست و نابود ہو جاتا پھر اس کی طاعت کے لیے فرشتوں کی مخلوق ہی کیا کم تھی- دنیوی بادشاہوں کا دستور بھی یہی ہے کہ وہ اپنی رسالت کے لیے مخصوص صفات کے افراد ہی کا انتخاب فرماتے ہیں اور اپنی رعایا میں ہر ہر شخص سے خود ہمکلام ہونا نہ اپنی ہی شانِ ملوکیت کے مناسب سمجھتے ہیں اور نہ ان کی شانِ رعیت کے واللہ سبحانہ اعلیٰ و اجل۔

یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مولات یعنی آزاد کردہ باندی تھیں- محمد علان شافعی ریاض الصالحین کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد کے ترکہ میں ملی تھیں اور ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلك .....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزُوْرُهَا فَلَمَّا انْتَهَيَا اِلَيْهَا بَكَتْ فَقَالَا لَهَا مَا يُبْكِيْكِ اَمَا تَعْلَمِيْنَ اَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنِّيْ لَا اَبْكِيْ اِنِّيْ لَا اَعْلَمُ اَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لٰكِنْ اَبْكِيْ اَنَّ الْوَحْيَ قَدْ اِنْقَطَعَ مِنَ السَّمَاءِ فَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَاءِ فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا.

(رواه مسلم و اخرجه صاحب مشكوٰة فى باب وفاة النبى صلى الله عليه وسلم)

علیہ وسلم ام ایمن کی ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے ہم بھی ان کی ملاقات کے لیے چلیں جب یہ دونوں حضرات ان کے گھر پہنچے تو ان کو دیکھ کر بے ساختہ ان پر گریہ طاری ہوگیا - انہوں نے فرمایا آپ روتی کیوں ہیں کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عیش و آرام کے سامان موجود ہیں - انہوں نے فرمایا میں اس پر تو نہیں روتی کہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہتر سے بہتر راحتیں مہیا ہیں - رونا اس پر ہے کہ اب آسمان سے وحی کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا - یہ کہہ کر ام ایمن نے ان دونوں حضرات کو بھی خوب رلایا اور یہ بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگے -

(مسلم شریف)

ﷺ ..... کی خدمت آیا کی طرح انجام دیا کرتی تھیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں کی طرح ان کا اکرام فرماتے تھے اور ان کی ملاقات کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے (دلیل الفالحین ص ۲۵۰ ج ۳) کتنی خوش نصیب تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے تھے - کتنی فہیم تھیں کہ خالق اور اس کی مخلوق کے مابین سلسلہ گفت وشنید کی اہمیت کو پورا پورا سمجھ چکی تھیں اور کتنی باایمان بی بی تھیں کہ اس نعمت عظمیٰ کے گم ہو جانے کے غم میں کس طرح گھلی جارہی تھیں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی کسی کی یاد تازہ کرنے کے لیے جارہے تھے - لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں جب ام ایمن کا دل پارہ پارہ ہو تو یہ حضرات اس غم سے کب خالی رہ سکتے تھے گو بڑے بہادر اور بڑے متحمل تھے - لیکن دکھے ہوئے دلوں کا چھیڑ دینا ہی کافی ہوتا ہے - ام ایمن کی زبان سے ایک فقرہ سننا تھا کہ ان کا پیمانہ صبر بھی چھلک پڑا اور بے اختیار اشکہائے غم ان کی آنکھوں سے بھی بہہ نکلے ابھی ابھی یہ محفل یا تو مسرت و ملاقات کی ایک محفل تھی یا ذرا سی دیر میں بے ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں گریہ وزاری کی ایک مجلس بن گئی - حقیقت یہ ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ و التحیہ کو ہر طرح مکمل ہو چکی تھی مگر اپنے خالق کے ساتھ ہم کلامی گو بالواسطہ سہی ایسا شرف نہ تھا جس سے محرومی باایمان قلوب کے لیے غم کا پہاڑ نہ بن جاتی -

دیکھئے صحابہ اکرام کی ہر ہر گفتگو میں جہاں ذرا بھی موقعہ ہوتا ہے یہ بات کس طرح نکلتی چلی آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے نزدیک نبوت کا انقطاع کیسا متفقہ اور یقینی عقیدہ تھا یہاں کسی کے دل میں وحی کی کسی قسم کے بقاء کا وسوسہ بھی نہ تھا خواہ وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی - اس حدیث کے فوائد میں ایک یہ ہے کہ خالق ومخلوق کے مابین ہم کلامی گو بالواسطہ ہو انسانیت کا بڑا اشرف ہے اور یہ کہ جب دنیا کی عمر آخر ہوئی تو یہ شرف بھی ختم ہوگیا اور یہ کہ باہم مسلمانوں کی ملاقات سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور یہ کہ بڑا بھی چھوٹے کی ملاقات کے لیے جاسکتا ہے اور یہ کہ بڑوں کی یاد تازہ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے بعد ان کے مراسم موذت ومحبت کو نبھایا جائے - اس ایک حدیث میں اخلاقیات و معاشرت زندگی کے یہ کتنے اہم اسباق ہیں -

(۱۰۴۶) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ اِبْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ لِعُثْمَانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا اَقْضِيْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ قَالَ فَاِنَّ اَبَاکَ كَانَ يَقْضِيْ فَقَالَ اِنَّ اَبِيْ لَوْ اَشْكَلَ عَلَيْهِ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَوْ اَشْكَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ سَأَلَ جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامِ وَ اِنِّيْ لَا اَجِدُ مَنْ اَسْأَلُهٗ وَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ

(۱۰۴۶) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ (کے فرمان پر ان) سے (معذرت کی اور) کہا کہ میں دوشخصوں کے معاملہ کا فیصلہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا انہوں نے فرمایا آخر کیوں تمہارے والد ماجد تو فیصلے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عرض کی میرے والد کو اگر مشکل پیش آتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر اس کو حل کر لیتے تھے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مشکل پیش آجاتی تو آپ جبرئیل علیہ السلام سے معلوم کر لیتے تھے میرے پاس کون ہے جس سے دریافت کر کے میں اپنی مشکلات حل کر سکوں گا (اب عرض یہ ہے کہ) میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جس نے

(۱۰۴۶) * دیکھیے یہاں ابن عمر بھی اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ جزم و یقین اور حقیقت رسی کی راہ صرف وحی کی راہ ہے اور اب وہ بند ہو چکی ہے فہم انسانی خواہ کتنی بھی عالی ہو اور اس کے ذرائع تحقیق و تفتیش خواہ کتنے بھی وسیع ہوں مگر اس کے باوجود حقیقت رسی اور جزم و یقین کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے جہل کی بناء ظن کو یقین اور کجروی کو صراط مستقیم سمجھ بیٹھے یہی وجہ ہے کہ عقلاء ہمیشہ باہم اختلاف و نزاع کے گرداب میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ اگر عقل انسانی حقیقت تک رسائی کی ضامن بن جاتی تو بھلا حقیقت میں اختلاف کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے۔ اسی لیے مشہور ہے ۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

پس کسی جد و جہد کے بغیر حقیقت تک رسائی کا یہ انعام قدرت کا سب سے بڑا انعام تھا' کاش انسان اس کی قدر کرتا۔ یہاں ابن عمرؓ خدا تعالیٰ کی اس نعمت اور اپنے اسی نقصان پر تنبیہ فرما رہے ہیں کہ میرے پاس نہ تو خود حقیقت تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ دوسرے کسی واسطہ سے اس کے حصول کا اب کوئی امکان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت تک رسائی اوّل تو بلا واسطہ تھی اور اگر کوئی واسطہ تھا تو جبرئیل امین کا تھا' جن کی حقیقت تک رسائی بلا واسطہ تھی اسی لیے آپ کے علوم سب حقیقت ہی حقیقت کے ترجمان تھے اور ان میں کوئی شک و تردد بھی نہ تھا۔ قرآن پاک نے جو اپنی پہلی صفت بیان فرمائی ہے وہ یہی ہے "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ" پس علوم کا کمال یہی ہے کہ ان میں شک و تردد نہ ہو اور یہ صفت وحی کے بغیر پیدا ہونی مشکل ہے۔ رہا عالم غیب وہ تو عقل کی دسترس ہی سے بالاتر ہے' اس میں تو عقل انسانی کا غور و خوض کرنا ہی سرتا سر ظلم ہے۔ ابن عمرؓ نے اپنی فطری شدت پسندی کی بناء پر اس کو یہاں ایسے محل پر گلوخلاصی کا بہانہ بنایا جہاں انسان صرف ظن ہی کی تحصیل کا مکلّف ہے لیکن جب انسان پر خوف و خشیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اس قسم کے امور کو اپنی جان بچانے کا آلہ بنا لیا کرتا ہے۔ شرعیات میں شدت پسندی کا ذوق بھی عیب ذوق ہے ۔

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

حضرت عثمانؓ چونکہ ان کے فطری تاثرات پہچان چکے تھے اس لیے انہوں نے اب زیادہ اصرار کرنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ زبردستی کسی پر اس ذمہ دار عہدہ کا بار ڈالنا بھی غیر ذمہ دارانہ فعل تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ فہمائش بھی کر دی کہ آئندہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ ہو ورنہ ہر شخص.....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَقَدْ عَاذَ بِعَظِيْمٍ وَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ وَ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَجْعَلَنِيْ قَاضِيًا فَاَعْفَاهُ وَ قَالَ لَا تُخْبِرْ اَحَدًا

(رواه رزين و روى الترمذي نحوه)

اللہ تعالیٰ کی پناہ لی اس نے سب سے بڑے کی پناہ لے لی اور میں نے آپ ؐ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر پناہ مانگے اس کو پناہ دے دو لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کے نام کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ آپ مجھے قاضی بنائیں - یہ سن کر عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پھر اصرار نہیں کیا اور یہ بھی فرما دیا دیکھو اس معاملہ کی خبر کسی کو بھی نہ کرنا - (رزین - ترمذی)

بدء تعارف النبيؐ مع عالم الغيب

(۱۰۴۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ خَمْسَ عَشَرَةَ سَنَةً يَسْمَعُ الصَّوْتَ وَ يَرَى الضَّوْءَ سَبْعَ سِنِيْنَ وَ لَا يَرٰى شَيْئًا وَ ثَمَانَ سِنِيْنَ يُوْحٰى اِلَيْهِ وَ اَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا وَ تُوُفِّيَ وَ هُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَ سِتِّيْنَ سَنَةً. (متفق عليه)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب سے تعارف کی ابتداء

(۱۰۴۷) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں پندرہ سال قیام پذیر رہے جن میں سات سال تک آپؐ صرف روشنی دیکھا کرتے اس کے علاوہ فرشتہ وغیرہ کچھ نہ دیکھتے اور آٹھ سال آپؐ پر وحی نازل ہوتی رہی اس کے بعد آپؐ نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور پینسٹھ سال کی عمر میں وفات فرمائی -

(متفق علیہ)

لله ..... شخص یہی بہانے کر کے اپنی جان بچالے گا اور مسلمانوں کے لیے یہ اہم عہدہ آخر خالی ہی پڑا رہے گا - اب آپ ہی ذرا انصاف کے ساتھ اندازہ لگا لیجئے کہ جس دور میں مسلمانوں کے صرف ایک قاضی بننے کے متعلق احساسات یہ ہوں وہاں امیر یا خلیفہ بننے کے جذبات بھلا کیا ہوں گے - اگر تاریخ میں اس قسم کے نزاعات کا کہیں اثر ملتا ہے تو اس کو ٹھیک ایسا ہی سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ فرشتوں نے اپنی بالاتفاق معصومیت کے باوجود اپنی خلافت کے سلسلہ میں کچھ کلمات کہہ دیئے تھے - کیا ان کے ان کلمات کی بناء پر جو قرآن کریم میں ان کی جانب سے مذکور ہیں ان کو ادنیٰ سا بھی متہم کیا جا سکتا ہے - حالانکہ خلافتِ ارضی امارتِ ملکی سے کہیں بالاتر مقام تھا' ہرگز نہیں -

اسی طرح اگر کسی دور میں صحابہؓ کے مابین بھی اس قسم کا کوئی نزاع نظر پڑتا ہے تو محض جلد بازی کی بناء پر ان کی پاک نفسی کو متہم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے وہاں بھی تاریخ صحیح صحیح حالات کا پتہ دیتی رہی ہے بشرطیکہ کسی جماعت سے خداواسطے کی بدظنی عقیدہ کا جزء نہ بن چکی ہو -

یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ جو عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب جبرئیل علیہ السلام کا نزول بھی منقطع ہو گیا ہے یہ بالکل بے اصل بات ہے - حافظ سیوطی نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی ہے - چونکہ صاحب وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں اس لیے وحی نبوت کے انقطاع سے ان کے نفس نزول کی شہرت بے وجہ اڑ گئی ہے - اس لیے اگر جبرئیل علیہ السلام خدا کی رحمتوں کی بارشیں لے کر شب قدر اور اس کے سواء دوسرے اوقات میں جب بھی نازل ہوں یہ سب ممکن ہے' ہاں چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے اس لیے وحی نبوت کا بند ہونا بھی لازمی ہے - حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک جلیل القدر فرشتہ ہیں اور نبوت کے ختم ہونے سے فرشتوں کے نزول کا انقطاع سمجھ لینا یہ صرف وہم کا فیصلہ ہے -

(۱۰۴۷) * یہاں عالم غیب سے آپ کے تعارف کی پہلی صورت ''نور'' سے معلوم ہوتی ہے اور ایک نورانی عالم کا تعارف نور سے لله ....

(۱۰۴۸) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ اُبْعَثَ اِنِّیْ لَاَعْرِفُهُ الْاٰنَ. (رواه مسلم قال ابو شامة و قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرى عجائب قبل بعثته كذا فى البداية)

(۱۰۴۸) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے قبل مجھ کو سلام کیا کرتا تھا میں اب بھی اس کو خوب پہچانتا ہوں۔ (مسلم شریف)

(۱۰۴۹) عَنِ الشَّعْبِیِّ اُنْزِلَتْ عَلَيْهِ النُّبُوَّةُ وَ هُوَ ابْنُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَقُرِنَ بِنُبُوَّتِهٖ اِسْرَافِيْلُ ثَلَاثَ سِنِيْنَ فَكَانَ يُعَلِّمُهُ الْكَلِمَةَ وَ الشَّیْءَ وَ لَمْ يَنْزِلِ الْقُرْاٰنُ فَلَمَّا مَضَتْ ثَلَاثُ سِنِيْنَ قُرِنَ بِنُبُوَّتِهٖ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَزَلَ

(۱۰۴۹) شعبی روایت کرتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی ابتداء نبوت میں تین سال تک اسرافیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہے اور کبھی ایک کلمہ کبھی کوئی بات آپ پر القاء فرماتے رہتے، مگر قرآن ہنوز نہیں اترا تھا۔ جب تین سال کی مدت گذر گئی تو اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہنے لگے پھر ان کی معرفت بیس سال تک آپ پر قرآن

لله ..... شروع ہونا ہی مناسب بھی تھا۔ اس حدیث میں راوی نے آپ کی عمر پینسٹھ سال بیان کی ہے اور کسی روایت میں تریسٹھ سال بھی ہے۔ اگر وفات و ولادت کے ناتمام سالوں کو شمار کر لیا جائے تو پینسٹھ ورنہ تریسٹھ سال ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں باتوں میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔

(۱۰۴۸) * جس طرح عام دستور کے خلاف روشنی کا دیکھنا عالم غیب سے تعارف کا ذریعہ بنا اسی طرح پتھر جیسی غیر ذی شعور چیز سے سلام کی آواز بھی اس کا ایک ذریعہ بن گئی اور اس پیرایہ سے آپ کو اس عالم کا رفتہ رفتہ تعارف پیدا ہوتا رہا جو عالم اسباب سے بالاتر ہے۔ انبیاء علیہم السلام گو عالم غیب سے تعارف پیدا کرانے کے لیے ہی مبعوث ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کا جسم عنصری عام انسانوں کی طرح عالم شہادت میں پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کو عالم غیب کا فرد بنانے کے لیے قدرت ان کی بھی تدریجی تربیت فرماتی رہتی ہے اور اس تربیت کے بعد پھر عالم غیب بھی ان کے لیے اسی طرح قطعی ہو جاتا ہے۔ جیسا عالم شہادت بلکہ ان کی صحبت میں جو آ بیٹھتا ہے صدق و یقین سے اس کا قلب بھی ایسا جگمگا اٹھتا ہے کہ اس کو بھی عالم غیب گویا عالم شہادت کی طرح سامنے نظر آنے لگتا ہے جب تک عالم غیب پر یہ یقین نصیب نہ ہو اس کی برکات سے پورا استفادہ نہیں ہو سکتا حضرت حنظلہ کی حدیث آپ ترجمان السنہ جلد دوم میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور حدیث جبرئیل (علیہ السلام) میں اسی کا نام احسان رکھا گیا ہے۔

(۱۰۴۹) * کہتے ہیں کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو ارواح کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے ''نفخ صور'' کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اس مدت میں قدرت کو منظور تھا کہ آپ کی روحانیت اور بلند سے بلند مراتب طے کر لے اور آئندہ آپ میں اس قرآن کریم کے نزول کے تحمل کی صلاحیت اور مکمل ہو جائے جس کے تحمل کی طاقت پہاڑوں میں نہیں ہے۔ سبحان اللہ کلام الٰہی بھی کیا پر عظمت کلام ہے جس کے نزول کے لیے کتنی تمہیدیں ہو رہی ہیں۔ کبھی جمادات سلام کرتے ہیں، کبھی صرف غیبی آواز آتی ہے، ایک مدت مسلسل سچے خواب دکھائے جا رہے ہیں اور اسی حد پر خاتمہ نہیں بلکہ ایک فرشتہ بھی ایک ایک کلمہ القاء کر کر کے اس صلاحیت میں اضافہ کر رہا ہے لله .....

اَلْقُرْاٰنُ عَلٰی لِسَانِہٖ عِشْرِیْنَ سَنَۃً عَشْرًا بِمَکَّۃَ وَ عَشْرًا بِالْمَدِیْنَۃِ فَمَاتَ وَ ھُوَ ابْنُ ثَلٰثٍ وَ سِتِّیْنَ سَنَۃً. (رواہ احمد باسناد صحیح قت و قد وقع فی نقلہ سھواً من النساخ فی بعض نسخ فتح الباری فایتنبہ و راجع البدایۃ و النھایۃ ص ٤ ج ۳)

شریف اترتا رہا' دس سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ طیبہ میں اس حساب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔
(مسند احمد)

انواع الوحی و ایّھا کان اشدّ علی النبّی صلی اللہ علیہ وسلم و کیف کان صوت الوحی

وحی کے اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید تر وحی اور وحی کی آواز

(۱۰۵۰) عَنْ عَائِشَۃَ ؓ اَنَّ الْحَارِثَ بْنَ ھِشَامٍ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ یَاْتِیْکَ الْوَحْیُ فَقَالَ

(۱۰۵۰) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ؟ آپؐ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور

ﷺ ..... لیکن اتنی تمہیدات کے بعد بھی جب قرآن کریم کے نزول کے لیے اصل مقرر شدہ فرشتہ ظہور فرماتا ہے تو آپ کی بشریت کاملہ کی بنیاد پھر متزلزل ہونے لگتی ہے۔ یہاں سے ان دو کلاموں کی حقیقت پر غور کرو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کان میں ڈالا گیا تھا اور جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل فرمایا گیا۔ کیا وحی کی اتنی عظیم الشان حقیقت کو بھی خواب وخیال کے برابر کہا جا سکتا ہے اگر انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے مطالعہ کے بعد بھی خواب وخیال اور نبوت کے درمیان فرق واضح نہیں ہوتا تو پھر ہمارے نزدیک دنیا میں کوئی حقیقت ایسی نہیں ہوگی جس پر ہم پورا اعتماد کرسکیں ہر گہری سے گہری حقیقت کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ بھی صرف ایک خواب وخیال ہے جو ہم کو سونے والے کے خواب کی طرح پراز حقیقت نظر آ رہی ہے۔

(۱۰۵۰) ٭ حافظ ابن تیمیہؒ نے ''کتاب الایمان'' میں ایک ضروری تنبیہ فرمائی ہے اور وہ یہ کہ بعض الفاظ جب شریعت کی اصطلاح میں کسی خاص معنی کے لیے مخصوص ہو جائیں تو اب قرآن وحدیث میں ان کے لغوی یا عام معنی مراد لینا صحیح نہیں مثلاً صلوٰۃ ایمان اور اسلام کے الفاظ۔ یہ سب الفاظ شریعت کی اصطلاح میں خاص خاص معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں اس لیے اب قرآن وحدیث میں عام طور پر اس کے وہی معنی مراد ہوں گے جو شرعی استعمال سے ایک مرتبہ متعین ہو چکے ہیں مثلاً لفظ ایمان لغت میں گو مطلقاً تصدیق کے معنی میں آتا ہے لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس کا عام استعمال صرف عالم غیب کی تصدیق میں آیا ہے اس لیے اس کے جو معنی اب شرعی اصطلاح قرار پا چکے ہیں قرآن وحدیث میں وہی معنی مراد لیے جائیں گے۔ اسی طرح ''وحی'' کا لفظ ہے۔ لغت میں وہ کس معنی کے لیے ہے اب اس پر بحث کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم میں جب اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے دائرہ میں ہوا ہے تو اس کے معنی بندہ اور حق تعالیٰ کے مابین ہم کلامی کے ہوئے ہیں اس لیے اب جب کہیں وحی کا لفظ انبیاء ورسل کے بارے میں مستعمل ہوگا تو اس کے یہی معنی مراد لیے جائیں گے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ نہیں ہے کہ شرعی استعمال لغت کے برخلاف ہوتا ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص استعمال میں جب کسی لفظ میں کوئی تخصیص پیدا ہو جائے تو اب لغت میں عموم کی وجہ سے اس کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کی جائے گی۔ اب دیکھئے کہ لغت میں وحی کا لفظ خفیہ اشاروں میں بات چیت کے لیے آیا ہے۔ یرمون بالخطب الطوال وتارۃً ::: وحی الملاحظہ خیفۃ الرقباء کبھی تو یہ لمبی لمبی تقریریں اور کبھی رقیبوں کے ڈر سے چپکے چپکے صرف آنکھوں کے اشارے۔ اس لحاظ سے ہر خفیہ اشارہ ﷺ .....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْيَانًا يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَ هُوَ اَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصِمُ عَنِّيْ وَ قَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَ اَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَ لَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيُفْصِمُ عَنْهُ وَ اِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا. (متفق علیه)

یہ قسم مجھ پر سب سے دشوار تر ہوتی ہے اس کے بعد جب وہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو وحی میں ارشاد ہوا تھا وہ مجھ کو محفوظ ہو جاتا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ فرشتہ خود کسی شخص (دحیہ کلبیؓ) کی صورت بن کر میرے سامنے آ جاتا ہے اور مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے سخت جاڑوں کے موسم میں آپ کو بچشم خود دیکھا ہے کہ جب آپؐ پر وحی آ کر تمام ہو جاتی تو آپؐ کی پیشانی مبارک پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۰۵۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ سُمِعَ عِنْدَ وَجْهِهٖ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَاُنْزِلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثْنَا سَاعَةً فَسُرِّيَ عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَ رَفَعَ يَدَيْهِ وَ قَالَ اللّٰهُمَّ زِدْنَا وَ لَا تَنْقُصْنَا وَ اَكْرِمْنَا وَ لَا

(۱۰۵۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوا کرتی تھی جیسی شہد کی مکھیوں کے گنگنانے کی ہوتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ آپ پر وحی آئی تو ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے جب وحی کے آنے کی کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے جاتی رہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ دعاء کے

لله ..... اور خفیہ بات چیت پر وحی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال حیوانات اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی ہوا ہے' لیکن جب اس کا استعمال خاص رسولوں میں ہوا ہے تو پھر شریعت کی اصطلاح میں صرف اس کلام کو وحی کہا گیا ہے جو رسول اور حق تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے اس تخصیص کے بعد بھی لغت کے اصل معنی یہاں ملحوظ رہتے ہیں کیونکہ یہاں بھی متکلم اور اس کا کلام دونوں اتنے خفیہ ہوتے ہیں کہ اس کی اطلاع سوائے رسول کے اس کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی نہیں ہوتی خلاصہ یہ ہے کہ اب وحی کے مختصر معنی یہ ہیں کہ وہ رسول اور خدا تعالیٰ کے مابین کلام کا نام ہے اب اس کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ وحی کے اقسام اور اس کی کیفیات کے معلوم کرنے سے جتنا اجمالاً حل ہو سکتا ہے بس اسی حد تک اس کو حل شدہ سمجھنا چاہیے اس سے زیادہ بحث کرنا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور ہمارے لیے غیر ضروری بھی ہے۔

(۱۰۵۱) * اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی کسی قسم میں کبھی ایسی آواز بھی ہوتی تھی جس کو کبھی کوئی بلند فطرت صحابی بھی سن لیا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا ادراک صرف ایک غیبی صوت کے سواء کچھ نہ ہوتا نہ تو اس کے حروف مسموع ہوتے نہ معنے مفہوم ہوتے بلکہ صرف ایک بسیط آواز ہوتی۔ عجیب بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس آواز کو تشبیہ دی تو گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی اور یہاں جب حضرت عمرؓ نے اس کو تشبیہ دی تو دوی نحل یعنی شہد کی مکھی کی آواز سے تشبیہ دی ہے علماء نے لکھا ہے کہ گھنٹے کی آواز گو شرعاً ناپسندیدہ ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ اس لحاظ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بسیط آواز ہوتی ہے اور بے جہت مسموع ہوتی ہے۔ مکھیوں کی مسلسل جھنجھناہٹ سے بھی اس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا مبدأ د مقطع بھی معلوم نہیں ہوتا صرف گھنٹے کی طرح ایک بسیط آواز لله .....

تُهِنَّا وَ اَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَ اٰثِرْنَا وَ لَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَ اَرْضِنَا عَنْكَ وَ ارْضَ عَنَّا ثُمَّ قَالَ اُنْزِلَ عَلَيَّ عَشْرُ اٰيَاتٍ مَنْ اَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى خَتَمَ عَشْرَ اٰيَاتٍ. (رواه احمد و الترمذی فی تفسیر سورة المؤمنین و تکلم فی اسناده فلیراجع و رواه النسائی ثم قال النسائی منکر لا نعرف احدًا رواه غیر یونس بن سلیم و لا نعرفه. کذافی البدایه والنهایه ص ۲۱ ج ۳)

لیے اٹھائے اور یہ دعاء فرمائی اے اللہ ہمیں اور زیادہ کر اور گھٹا مت، ہمیں اور شرف عطا فرما اور ذلیل نہ فرما، ہمیں اور زیادہ دے اور محروم نہ رکھ، ہمیں دوسروں پر ترجیح دے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح نہ دے اور ہم کو اپنے سے راضی رہنے کی توفیق بخش اور تو ہم سے راضی ہو جا- اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر دس آیتیں اتری ہیں جو شخص ان پر پورا پورا عمل پیرا ہوگا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا- پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دس آیتیں آخر تک پڑھیں ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ الخ. یقیناً وہ مؤمن کامیاب ہو گئے' الخ-

(احمد-ترمذی)

(۱۰۵۲) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ يَبْلُغُ بِهِ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَضَى اللّٰهُ الْاَمْرَ فِی

(۱۰۵۲) ابو ہریرہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب آسمان پر کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اس فرمان کی عظمت و دہشت سے اپنے پر

ﷺ ..... معلوم ہوتی ہے ان دونوں تشبیہوں پر اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں فرق ہو تو شاید صرف اتنا ہی ہو کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ زیادہ تیز محسوس ہوتی ہو اس لیے آپؐ نے اس کو 'صلصلۃ' یعنی گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی ہو اور سامعین میں جس کو اس غیبی صوت کا سننا نصیب ہوتا ہو اس کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہو اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے- عالم رؤیا کا سارا تماشہ صرف سونے والے کے سامنے ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی بقیہ سامعین پر بھی درجہ بدرجہ نمودار ہوتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا- ابھی آپ کے سامنے آنے والا ہے کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو متاثر ہوتے ہی تھے لیکن اس حالت میں اگر آپ کا جسم اطہر کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ ذرا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی عظمت سے پس پس جاتا تھا- اب مختلف صحابہؓ کے ان مختلف احساسات کے بعد بھی کیا وحی کو محض ایک دماغی تخیل کہا جا سکتا ہے- والعیاذ باللہ-

(۱۰۵۲) * اس حدیث میں وحی کے وقت ایک تیسری قسم کی آواز کا بھی ذکر ہے لیکن ان تینوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے- پتھر پر زنجیر کی آواز بھی گھنٹہ کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہے اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبدأ ومقطع یعنی شروع اور خاتمہ علیحدہ علیحدہ ممتاز محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک بسیط اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور بس- شارحین حدیث میں اس آواز کے متعلق اختلاف ہے- کوئی کہتا ہے کہ یہ خود اس وحی کی آواز ہوتی ہے اور کسی کا خیال ہے کہ یہ فرشتے کے پروں کی آواز ہوتی ہے- ہم اس قسم کی بحثوں کا فیصلہ کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں اور غیر مفید بھی- فلاسفہ قدیم کو عام انسانی آواز کی سماع کی حقیقت میں اختلاف رہا ہے پھر ہمارا کیا حوصلہ ہے کہ ہم وحی کی آواز کی حقیقت میں لب کشائی کر سکیں- غائبات یعنی عالم غیب کے متعلق سب سے صحیح اور آسان راستہ یہی ہے کہ اس پر یقین رکھا جائے اور اس کا اعتراف کر لیا جائے ﷺ .....

السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَأَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلَى صَفْوَانٍ وَ قَالَ غَيْرُهُ صَفْوَانٌ يَنْفُذُهُمْ ذٰلِكَ فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوْا مَا ذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا

اس طرح مارتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر لگتی ہے اور اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے- یہاں بعض راویوں نے یہ اور اضافہ کیا ہے کہ وہ آواز ان کے آر پار ہو جاتی ہے- جب خوف و دہشت کی یہ کیفیت ان کے قلوب سے دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں ''پروردگار نے کیا حکم دیا''

ﷺ ...... اور بس- اگر وہ ہمارے دائرہ ادراک کی چیز ہوتی تو پھر اس کو عالم غیب کہنا ہی کیونکر درست ہوتا- عالم غیب ہے وہی جو ہمارے حواس و ادراکات کے دسترس سے باہر ہو- اسی لیے اس کی اطلاع کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں اور ان ہی کے اعتماد پر اس پر یقین کرنے کے لیے ہم مکلف بنائے گئے ہیں- لیکن صرف ایک نظیر کے طور پر ٹیلیگراف یعنی تار کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے- یہاں بھی عام سامعین کو صرف ایک کھٹکے کی بے معنی آواز آتی ہے لیکن جو اس کا رمز شناس ہوتا ہے وہ اس آواز کو اسی طرح سمجھ لیتا ہے جس طرح کہ آپ عام بات چیت کو سمجھ لیتے ہیں- اسی طرح آپ بھی وحی کی آواز صلصلة الجرس کی طرح سنتے اور اس کا مطلب پورا پورا سمجھ لیتے یا دوسری شکل ٹیلیفون کی ہے جس میں خود متکلم باتیں کرتا ہے مگر یہاں بھی مخاطب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس آواز کو نہیں سنتا لیکن جو نہیں سنتا وہ سننے والے کے اعتماد پر ٹیلیفون کی تمام خبروں کا پورا یقین کر لیتا ہے اور اپنے دل میں دروغ بیانی یا اس کے وہم و خیال ہونے کا کوئی احتمال بھی نہیں لاتا- فرق ہے تو بس اتنا ہے کہ یہاں اس کو یہ اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس آواز کو ہر انسان سن سکتا ہے اور اگر چاہے تو وہ خود بھی سن سکتا ہے، مگر وحی نہ ہر انسان پر آتی ہے اور نہ ہر انسان اس کی آواز سن سکتا ہے مگر کسی بات پر یقین کرنے کے لیے کیا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ جب تک خود اس بات کو بلا واسطہ معلوم نہ کر لیا جائے اس کا یقین نہ کیا جائے- پھر کیا بنی اسرائیل کی ضدی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی فرمائش نہیں کی تھی کہ جب تک ہم رب العزت کا کلام خود بلا واسطہ نہ سن لیں اس وقت تک محض آپ کے بیان پر یقین نہیں لا سکتے- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاطر آخر ان کی یہ ہٹ بھی پوری کی گئی- لیکن جن کو نہیں ماننا تھا وہ اس پر بھی نہ مانے اور ایک یہ حیلہ اور نکال کھڑا کیا کہ جب تک متکلم خود ہمارے سامنے آ کر بالمشافہ آمنے سامنے گفتگو نہ کرے ہمیں اس پس پردہ گفتگو پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا گویا اس قوم کا مطالبہ یہ تھا کہ جو بات خود ان کے نبی کے لیے ممکن نہ تھی وہ ان کے لیے ممکن ہو جائے اور اگر بالفرض یہ بھی ہو جاتا تو یقیناً وہ کوئی اور تیسرا بہانہ نکال لیتے- پس نبوت، وحی اور عالم غیب کے ہر ہر جزئی کے لیے علیحدہ علیحدہ دلائل کی فکر میں نہ پڑیے اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لے آنے کے بعد جو بات وہ کہتے ہیں ان کے اعتماد پر آپ اس کو مان لیجئے- وحی کے باب کی حدیثیں، اس کی کیفیات اور دوست و دشمن کے سامنے اس کے نزول کے معتدد حالات آپ کے سامنے ہیں- ان کو بار بار خالی الذہن ہو کر پڑھیے تو آپ اس فیصلہ پر مجبور ہوں گے کہ ضرور یہ کوئی قطعی حقیقت ہے، خیالی افسانہ نہیں والعیاذ باللہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کا اثر نہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود رہتا بلکہ سعید اہل مجلس پر بھی ہوتا اور پڑھے ہوئے اور ان پڑھ جو بھی اس وقت وہاں موجود ہوتے وہ وحی کا نزول اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور یہ یقین کر لیتے کہ ضرور یہ کوئی ایسی بلند حقیقت ہے جس سے ہر بشر آشنا نہیں ہو سکتا- یہاں نزول وحی کی دوسری ساعت بعد ہی خفیہ سازشیں سب عریاں ہو جاتی تھیں- ہر سائل اپنے مشکل سے مشکل سوال کا جواب پا لیتا تھا، تشنگانِ ہدایت کے لیے وہ وہ ہدایات نصیب ہو جاتی تھیں جن سے صحف سماویہ اب تک خالی تھیں اور عقل انسانی آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے- اگر آپ کو یہاں علمی مباحث کا شوق ہو تو تفسیر رازی ص ۴۰۷ ج ۷- التفسیر القیم سورۂ فاتحہ کی تفسیر زیر لفظ ہدایت، اور الروض الانف اور شروح حدیث ملاحظہ فرمائیے- ﷺ .....

لِلَّذِیْ قَالَ الْحَقُّ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ. (رواہ البخاری ص ۷۰۸ و ۱۱۱۴)

تو جو ان میں مقرب ہیں وہ جواب دیتے ہیں- وہی حکم دیا جو درست و مناسب تھا اور وہ بڑا عالیشان اور سب سے بڑا ہے- (بخاری شریف)

النفثُ فِی الروع

فرشتہ کا غیبی طور پر قلب میں کوئی بات ڈالنا

(۱۰۵۳) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّھَا النَّاسُ لَیْسَ

(۱۰۵۳) ابن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا- لوگو! جو بات بھی تم کو جنت سے قریب

لله ..... پھر جب وحی کی حقیقت ہی ایک غیبی حقیقت ہے تو اس کے اقسام میں بھی یقیناً یہی صفت ہونی چاہیے- اس لیے ہم اس پر بھی کچھ زیادہ کلام کرنا نہیں چاہتے- جتنا قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وحی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ خود نبی کے باطن میں کوئی بات القاء فرما دے نہ کوئی آواز مسموع ہو اور نہ فرشتے کا واسطہ ہو- دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی پر کچھ القاء فرمائے مگر پس پردہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوہ طور پر تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آئے اور اس کے ذریعہ سے وحی نازل ہو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ فرشتہ خود انسانی صورت میں متمثل ہو کر آئے دوم یہ کہ نبی کے باطن میں تصرف کر کے اس کو ملکوتیت کے قریب کر دیا جائے- اس دوسری صورت میں چونکہ خود آپ کی ذاتِ قدسی صفات میں تصرف کیا جاتا تھا- اس لیے وحی کی یہ قسم آپ پر شدید ہوتی تھی یوں تو وحی کی جو قسم بھی تھی وہ شدید ہی تھی- مگر اس قسم میں اس تصرف کی وجہ سے اس کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا- اس کے علاوہ وحی کی جتنی قسمیں ہیں وہ سب ان ہی میں سے کسی نہ کسی قسم میں داخل ہیں-

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ. (الشوریٰ : ۵۱)

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کرے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیجے پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں جو اس باب میں سب سے پہلے ذکر کی گئی ہے تیسری قسم ہے دوسری قسم کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس کا وجود ہی نادر تھا- وحی کی یہ صورت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر پیش آئی تھی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شبِ معراج میں پیش آئی- حضرت استاذ مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ کا مختار یہ تھا کہ شبِ معراج میں نوازش کی ابتداء مکالمہ اور وحی سے شروع ہوئی تھی اور رویۃ پر جا کر منتہی ہو گئی تھی- یعنی شروع میں مکالمہ ہوتا رہا مگر اس وقت تک رویت نہ ہوئی اور جب مکالمہ ختم ہو گیا تو رب السمٰوات والارضین نے اپنے دیدار سے آپ کو مشرف فرمایا- فسبحان من منعم مفضال.

(۱۰۵۳) ❊ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتہ کا براہ راست نبی کے قلب میں کوئی بات ڈال دینا بھی وحی کی ایک قسم ہے لیکن وحی ربانی شک و تردد سے کتنی پاک و صاف ہوتی ہے- اسی لیے اس کی ہر نوع صاحب نبوت کے لیے روشن ہوتی ہے اور امت کے لیے اس پر ایمان لانا پہلا فرض ہوتا ہے- سیرت کے پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ حالات کی پوری نامساعدت کے باوجود خدا کے رسولوں کو خدائی وعدہ میں کبھی ذرا تردد پیش نہیں آیا- صلح حدیبیہ کی صلح کتنی دب کر کی گئی تھی جس کی ہر ہر دفعہ مسلمانوں کے ضعف و کمزوری کی گویا ایک ایک دلیل تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی مخلص نے سوال کیا تو آپ نے کسی تردد کے بغیر اسی صلح نامہ کو مسلمانوں کی فتح سے تعبیر کیا چنانچہ بہت ہی قلیل مدت کے بعد واقعات نے اس کی تصدیق کی اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا- یہاں رزق کا معاملہ بھی جس جزم لله .....

مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ اِلَی الْجَنَّةِ وَ یُبَاعِدُکُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُکُمْ بِهٖ وَ لَیْسَ مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ مِنَ النَّارِ وَ یُبَاعِدُکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا قَدْ نَهَیْتُکُمْ عَنْهُ وَ اِنَّ الرُّوْحَ الْاَمِیْنَ وَ فِیْ رِوَایَةٍ وَ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ لَا یَحْمِلَنَّکُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِی اللّٰهِ فَاِنَّهٗ لَا یُدْرَکُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ.

(رواہ فی شرح السنة و البیهقی فی شعب الایمان)

کرنے والی اور آتشِ دوزخ سے دور کر دینے والی تھی میں تم کو اس کا حکم دے چکا ہوں اور جو بات بھی تم کو آتشِ دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کر دینے والی تھی اس کے کرنے سے میں تم کو روک چکا ہوں- اس سلسلہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ بات بھی القاء فرمائی ہے کہ کوئی نفس جب تک کہ وہ اپنے مقدر کا رزق پورا نہ کر لے ہرگز مر نہیں سکتا' لہٰذا خبردار اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ذرا صبر کے ساتھ رزق طلب کرو اور اگر مقدر کا رزق ملنے میں کچھ تاخیر ہو تو اس کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کے ذریعہ سے حاصل کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جایا کرو- کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو رزق دستِ قدرت میں ہے وہ صرف اس کی حکم برداری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے- (شرح السنہ بیہقی)

الرؤیا

خواب

(۱۰۵۴) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِیْ مَیْمُوْنَةَ لَیْلَةً فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ

(۱۰۵۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شب میں اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے گھر رہا جب کچھ شب گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ

لله ..... ویقین کے ساتھ ادا کیا گیا ہے وہ لفظ ''لـــن'' سے ظاہر ہے- عربی میں یہ لفظ تاکید کے لیے آتا ہے- کیا خواب اور صفراء کے تخیلات اور وحی میں اب بھی کوئی التباس ہو سکتا ہے-

انسان کی کمزور فطرت رزق کو انسانی جدوجہد کے تابع سمجھتی ہے' مگر وحی کہتی ہے کہ یہ معاملہ صرف تقدیر کے تابع ہے اور مشکوک نہیں یقینی ہے اور اتنا یقینی ہے کہ موت جیسی یقینی چیز بھی اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک کہ انسان اپنے مقدر کا رزق پورا پورا حاصل نہ کر لے- انسان سمجھتا ہے کہ رزق آزاد ذرائع سے بآسانی اور وسعت سے حاصل ہوتا ہے حدیث یہ سمجھاتی ہے کہ یہ خیال غلط ہے رزق صرف خدا تعالیٰ کی حکم برداری سے مل سکتا ہے اور اس کو یوں آسان طریقہ سے دلنشین کرتی ہے کہ رزق خدا تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے اور جب یہ ہے تو پھر بھلا اس کی نافرمانی کر کے رزق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے- اس سے آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ حدیث میں کسب واکتساب کی ممانعت نہیں بلکہ حرام ذرائع کی ممانعت ہے- انسان یہ سوچتا ہے کہ سود' لوٹ مار' دغا و فریب اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز ذرائع سے اس کو مال حاصل کرنا کچھ عیب نہیں- حدیث کہتی ہے یہ صرف اس کی ایمانی کمزوری ہے اس کو حلال ذرائع سے جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جو رزق اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ اس ذریعہ سے بھی پہنچ کر رہے گا- رزق کو مقصد زندگانی بنانا بلند خیالی نہیں ہے- انسانی خلقت کا اصل مقصد خلافت کے فرائض کے انجام دہی ہے- لہٰذا یہ ضروریات ضمنی ہی رہنی چاہئیں-

(۱۰۵۴) * عالم نبوت سے ناآشنا تو یہ کہتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت عالم خواب کی طرح بے حقیقت ہوتی ہے اور جو اس سے آشنا ہیں وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے عالم خواب کے ادراکات دوسروں کی بیداری کے ادراکات سے بھی کہیں بڑھ کر پراز حقیقت اور قطعی لله .....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا كَانَ فِيْ بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ مِنْ عَنْ مُعَلَّقٍ وَضُوْءً خَفِيْفًا يُخَفِّفُهُ عَمْرٌو وَ يُقَلِّلُهُ جِدًّا ثُمَّ قَامَ يُصَلِّيْ فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ نَحْوًا مِمَّا تَوَضَّأَ ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَحَوَّلَنِيْ فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ صَلّٰى مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ فَاَتَاهُ الْمُنَادِيْ يُؤْذِنُهٗ بِالصَّلٰوةِ فَقَامَ مَعَهٗ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ قُلْنَا لِعَمْرٍو اِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

علیہ وسلم اٹھے اور ایک مشک سے جو لٹکی ہوئی تھی وضوء فرمایا حدیث کا راوی عمرو کہتا ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کم پانی صرف کیا اس کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے - جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیسا وضوء آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اسی طرح میں نے بھی کیا پھر آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بدل کر اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا اس کے بعد جتنی رکعتیں اللہ تعالیٰ کو منظور تھیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائیں پھر آپ آ کر لیٹ گئے - یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے کی آواز آنے لگی مؤذن حاضر ہوا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دی آپ اٹھ کر یوں ہی اس کے ساتھ نماز کو تشریف

لله ..... ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی وحی ربانی کی ایک قسم شمار ہوتے ہیں - دیکھیے بیٹے کے ذبح کرنے کا معاملہ کتنا اہم معاملہ تھا جس کی اجازت نہ شرعاً ہے نہ عقلاً مگر جب خدا تعالیٰ کا برگزیدہ نبی اپنے خواب میں یہ دیکھ لیتا ہے تو اس کو پورا کرنے میں ذرا تردد نہیں کرتا اور فوراً اس کی تیاری شروع کر دیتا ہے' پھر جو بیٹا نبی اولوالعزم ہونے والا تھا اس کی فطری استقامت بھی کتنی حیرت انگیز ہے کہ حکم رب کے سامنے جس مسرت اور رضامندی کے ساتھ وہ سر جھکا رہا ہے اس کی مثال نوع بشر میں ملنی مشکل ہے - عام انسانوں کے خواب کے ادراکات چونکہ حواس کے تعطل اور قوتِ واہمہ کے غلبہ کی حالت میں ہوتے ہیں اس لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی جاتی انبیاء علیہم السلام کی نیند ان دونوں علتوں سے بالاتر ہوتی ہے - وہ عین خواب میں بھی اپنی بیداری کی طرح عالم غیب سے خبردار رہتے ہیں اس لیے ان کی نیند کے عوارض صرف وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق اس آنکھ کے ساتھ ہوتا ہے - یعنی وہ انسانوں کی آوازیں نہیں سنتے ان کی صورتیں نہیں دیکھتے اور اسی طرح دوسرے امور جن کا تعلق صرف ظاہری حواس کے ساتھ ہوتا ہے ان سے معطل ہو سکتے ہیں مگر عالم غیب جس کا تعلق دراصل ان حواسِ ظاہری کے ساتھ نہیں ہوتا اس سے وہ کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے اس لیے ان کے خواب کے ادراکات کی حیثیت وہی رہتی ہے جو ان کی بیداری کے ادراکات کی ہوتی ہے - واللہ تعالیٰ اعلم -

حضرت ابن عباسؓ اپنی اس نوعمری میں بھی کتنے فہیم تھے - اسی غرض کے لیے یہاں ایک شب گذارنے آئے کہ آپ کی شب کی عبادت کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں ابھی بچپن کی عمر ہے مگر معلوم نہیں کہ اس شوق میں کیا تمام شب جاگ کر ہی کاٹ دی تھی کہ ادھر آپ کے اٹھنے کی آہٹ ہوئی اُدھر جھٹ ان کی آنکھیں اپنے مقصد پر جا لگیں کتنے باادب تھے کہ سب کچھ دیکھتے رہے مگر اس طرح خاموش پڑے رہے گویا بےخبر سو رہے ہیں - جب دیکھ لیا کہ آپ عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے تو اب خود بھی اٹھے اور مو بمو اسی طرح نقل کرنے کی کوشش کی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا - ابھی ذرا سی عمر تھی مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے بائیں طرف آ کر آپ کی نماز میں شامل ہو گئے' لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے لیل و نہار میں صغیر و کبیر کے لیے معلم بنا کر بھیجا تھا اس نے ذرا توقف نہ کیا اور لله .....

تَـنَـامُ عَيْـنُهُ وَ لَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْـدَ بْـنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ اِنَّ رُؤْيَا الْاَنْبِيَاءِ وَحْیٌ ثُمَّ قَرَأَ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ.

(رواه البخاری فی باب التخفیف فی الوضوء ص ۲۵ و فی باب وضوء الصبیان ص ۱۱۹ ج ۱ و عند الترمذی فی مناقب عمر و یروی عن ابن عباس انه قال رؤیا الانبیاء وحی ص ۲۰۹ ج ۲)

لے گئے اور نماز اداء فرمائی اور وضوء نہیں کیا - ہم نے عمرو راوی حدیث سے پوچھا لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف آنکھیں ہی آنکھیں سوتی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اس حالت میں بھی بیدار رہتا تھا - عمرو کہتے ہیں میں نے عبید بن عمیر کو یہ کہتے خود سنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے - اس پر قرآن کریم کی یہ آیت دلیل کے طور پر پڑھی اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ الخ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام سے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں - (بخاری شریف)

الرسول العظیم و مشهده عند نزول الوحی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کا ایک منظر

(۱۰۵۵) اِنَّ صَـفْـوَانَ بْنَ يَعْلٰی اَخْبَرَهُ اِنَّ يَعْلٰی اَخْبَـرَهُ قَـالَ لِعُـمَرَ اَرِنِی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّـمَ حِيْنَ يُوْحٰی اِلَيْهِ قَالَ فَبَيْنَمَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْـهِ وَسَلَّـمَ بِـالْـجِعِرَّانَةِ وَ مَعَهُ نَفَرٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَـرٰی فِـیْ رَجُـلٍ اَحْـرَمَ بِـعُمْرَةٍ وَ هُوَ مُتَضَمِّخٌ بِطِيْبٍ فَسَكَـتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَـاعَةً فَـجَـاءَهُ الْـوَحْـیُ فَاَشَارَ عُمَرُ اِلٰی يَعْلٰی فَـجَـاءَ يَعْلٰی وَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّـمَ ثَـوْبٌ قَـدْ اُظِـلَّ بِـهٖ فَاَدْخَلَ رَاْسَـهٗ فَاِذَا

(۱۰۵۵) صفوان بن یعلی بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد یعلی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آئے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا مجھے بھی دکھائیے گا - راوی کہتا ہے ایسا اتفاق ہوا کہ آپ مقام جعرانہ میں تھے اور صحابہ کی ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ مسئلہ پوچھا یا رسول اللہ ایک شخص خوشبو میں لت پت ہو رہا تھا اور اسی حالت میں اس نے عمرہ کا احرام باندھ لیا اب وہ کیا کرے آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ایک کپڑا اڈھا نک دیا) اور یعلی کو اشارہ کیا آگے آ وہ آ گئے اس وقت آپ کے چہرۂ مبارک پر کپڑا پڑا ہوا تھا انہوں نے اپنا سر اس

لله ...... نماز ہی کی حالت میں ان کو اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا جو درحقیقت تنہا مقتدی کا صحیح مؤقف تھا - اس سے معلوم ہوا کہ اگر نماز کی حالت میں کوئی مکروہ فعل پیش آ جائے تو اسی وقت اس کی اصلاح کر لینی چاہیے - اس کے بعد جو عجیب بات انہوں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھی طرح سو گئے تھے لیکن اس کے باوجود جب نماز کا وقت آیا تو اپنے پہلے وضوء سے ہی نماز ادا فرمائی گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقص وضوء نہ تھی - خدا ہی جانے اس بیداری کا عالم کیا ہو گا جس میں اپنی طہارت اور غیر طہارت کا ادراک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم خواب میں بھی رہتا تھا -

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُحْمَرُّ الْوَجْهِ وَ هُوَ يَغِطُّ ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ فَقَالَ اَيْنَ الَّذِىْ سَأَلَ عَنِ الْعُمْرَةِ فَاُتِيَ بِرَجُلٍ فَقَالَ اِغْسِلِ الطِّيْبَ الَّذِىْ بِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَ انْزِعْ عَنْكَ الْجُبَّةَ وَ اصْنَعْ فِىْ عُمْرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِىْ حَجِّكَ فَقُلْتُ لِعَطَاءٍ اَرَادَ الْاِنْقَاءَ حِيْنَ اَمَرَهُ اَنْ يَغْسِلَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ نَعَمْ.

(رواه البخاری فی باب غسل الخلوق ثلاث مرات ص ۲۰۸ ج ۱ – و فی باب یفعل بالعمرة ما یفعل فی الحج فانزل الله علی النبی صلی الله علیه وسلم فستر بثوب)

کے اندر داخل کیا - کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور وحی کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپؐ کا دم گھٹ رہا ہو اس کے بعد جب وہ کیفیت جاتی رہی تو آپؐ نے فرمایا وہ عمرہ کا مسئلہ دریافت کرنے والا شخص کدھر گیا - اسی وقت اس کو آپؐ کی خدمت میں حاضر کیا گیا آپؐ نے اس سے فرمایا جو خوشبو تیرے جسم پر لگی ہوئی ہے اس کو تین بار دھو ڈال اور اپنا جبہ اتار دے اور پھر جیسے اپنا حج کرتا تھا اسی طرح عمرہ اداء کر لے میں نے عطاء راوی سے پوچھا - تین مرتبہ خوشبو کے دھونے سے آپؐ کی غرض یہی ہوگی کہ وہ خوب صاف ہو جائے - انہوں نے کہا جی ہاں - (بخاری شریف)

(۱۰۵۶) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ يَتَحَدَّثُ يُكْثِرُ اَنْ يَّرْفَعَ طَرْفَهُ اِلَى السَّمَاءِ.

(رواه ابوداؤد)

(۱۰۵۶) عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھے ہوئے باتیں کرتے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے -

(رواہ ابوداؤد)

(۱۰۵۷) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْىُ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَ تَرَبَّدَ وَجْهُهُ وَ فِىْ رِوَايَةٍ نَكَسَ رَأْسَهُ وَ نَكَسَ اَصْحَابُهُ رُؤُسَهُمْ فَلَمَّا اُتْلِيَ عَنْهُ رَفَعَ رَأْسَهُ. (رواه مسلم)

(۱۰۵۷) عبادۃ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو اس کی شدت سے آپؐ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ چہرۂ مبارک تک متغیر ہو جاتا - ایک روایت میں اتنا اضافہ اور ہے کہ آپؐ اپنا سر مبارک جھکا لیتے اور آپؐ کے صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے پھر جب وحی کا نزول ختم ہو جاتا تو آپؐ اپنا سر اٹھا لیتے - (مسلم شریف)

(۱۰۵۸) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَأَلْتُ

(۱۰۵۸) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے

(۱۰۵۶) * یہ نظروں کا اٹھانا وحی کے انتظار میں ہوتا تھا جیسا کہ تحویل قبلہ کے وقت بھی آپؐ کا نظریں اٹھا اٹھا کر وحی کا انتظار کرنا قرآن شریف میں مذکور ہے ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (البقرة: ۱۴۴)

(۱۰۵۸) * تعجب ہے کہ جب سب سے پہلی بار آپؐ پر قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تھا تو اس وقت بھی حضرت خدیجہؓ کے پاس آ کر جو الفاظ آپؐ نے فرمائے تھے وہ بھی یہی تھے "لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِىْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا اہل اہواء نے آپؐ کے اس لفظ کو لے کر اس پر اتنا طومار باندھا کہ استغفر اللہ اگر کاش ان کو وحی کی حقیقت کا علم ہوتا پھر قرآن کریم کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوتا - اس کے بعد آپ کی آخر عمر تک نزول وحی کے وقت آپ کے حالات دیکھنے کی فرصت ہوتی تو جو بات ان کی عقول کے لیے پہاڑ بن گئی تھی وہی بات سب سے آسان بن جاتی - اس باب کی پہلی حدیث جعرانہ کا واقعہ ہے مگر آپؐ پر وحی کی شدت کا عالم قریب قریب وہی نظر آ رہا تھا جو روز للہ .....

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ تُحِسُّ بِالْوَحْيِ فَقَالَ اَسْمَعُ صَلَاصِلَ ثُمَّ اَسْكُتُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَمَا مِنْ مَرَّةٍ يُوْحٰى اِلَيَّ اِلَّا ظَنَنْتُ اَنَّ نَفْسِيْ تُقْبَضُ. (رواہ احمد)

(۱۰۵۹) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَزَلَ جِبْرَئِيْلُ بِالْوَحْيِ وَ كَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ بِهٖ لِسَانَهٗ وَ شَفَتَيْهِ فَيَشْتَدُّ عَلَيْهِ وَ كَانَ يُعْرَفُ مِنْهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ الْاٰيَةَ الَّتِيْ فِيْ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ قَالَ عَلَيْنَا اَنْ نَجْمَعَهٗ فِيْ صَدْرِكَ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جب آپ پر وحی آتی ہے تو آپ کو وہ محسوس ہوتی ہے؟ فرمایا پہلے میں گھنٹیوں کی سی آواز سنتا ہوں پھر اس وقت بالکل خاموش ہو جاتا ہوں اور جب کبھی مجھ پر وحی آتی ہے تو مجھ کو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ میری جان اب نکلی۔ (مسند احمد)

(۱۰۵۹) سعید بن جبیر آیۃ لاتحرک بہ لسانک کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ پہلے یوں ہوتا تھا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے تو آپؐ اس کے یاد کرنے کی فکر میں وحی کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹ اور زبان ہلاتے جاتے۔ اس کی وجہ سے آپؐ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ سب کو اس کا احساس ہوتا اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ لا اُقسم کی یہ آیت نازل فرمادی کہ جلدی سے یاد کرنے کی فکر میں آپؐ نزول وحی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان نہ ہلایا کریں' قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے تھے مطلب یہ تھا کہ آپ کے سینہ مبارک میں اس کا محفوظ کر دینا پھر اس کا پڑھوانا یہ دونوں باتیں ہمارے ذمہ ہیں اس کے بعد آئندہ

..... اول تھا اس کے بعد حضرت عبادہؓ بن صامت اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیثیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان تمام حدیثوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ نزولِ وحی کی شدت آپؐ ہمیشہ ہی محسوس فرمایا کرتے تھے تو پھر اس وقت جب کہ آپ کو اس سے قبل نزول وحی سے کوئی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا' اگر اس شدت کا احساس ہوا اور آپؐ کی زبان مبارک سے خوف کے وہی کلمات نکلے جو اس پر شوکت کلام کے نزول سے نکلنے چاہئیں تھے تو یہ آپؐ کی اور زیادہ تصدیق کا سبب ہونے چاہئیں تھے نہ کہ برعکس تکذیب کا چنانچہ جب حضرت خدیجہؓ نے ان کو سنا تو فوری طور پر گو وہ کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں دے سکیں مگر یہ اندازہ انہوں نے بھی اچھی طرح لگا لیا کہ ہے ضرور یہ کوئی ربانی معاملہ عرب نبوت اور وحی کی صفات سے کوسوں دور پڑا ہوا تھا لہٰذا فوراً آپؐ کو لے کر ورقہ کے پاس پہنچیں انہوں نے واقعہ کی اجمالی صورت سنتے ہی حقیقت حال معلوم کر لی اور آپؐ کی رسالت کی تصدیق کر کے دنیا سے رخصت ہوگئے واقعہ کی تفصیلات اسی جلد میں پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں۔

(۱۰۵۹) * اس جگہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر میں راوی نے جو الفاظ نقل کیے ہیں اس سے زیادہ واضح الفاظ وہ ہیں جو کتاب التفسیر میں موجود ہیں اس لیے علماء کو چاہیے کہ یہاں ان الفاظ پر ہی اعتماد کریں۔

ان احادیث کے پیش نظر اب یہ فیصلہ فرمائیے کہ وحی کا نزول جب اس میں جلالت وعظمت کے ساتھ ہوتا تھا۔ خود آپ کا معاملہ بھی وحی کے ساتھ وہ نہ تھا جو انسان کے اپنے خیالات اور مدرکات کے ساتھ ہوا کرتا ہے' وحی کے ذریعہ جو جو انکشافات ہوتے وہ ہو بہو واقعہ کے مطابق اور انسانی علوم سے مختلف ہوتے تو کیوں اس کو ادراک کا ایک علیحدہ سبب تسلیم نہ کیا جائے۔

فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا اَنْزَلْنَاهُ فَاسْتَمِعْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ عَلَيْنَا اَنْ نُبَيِّنَهٗ بِلِسَانِكَ قَالَ فَكَانَ اِذَا اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَطْرَقَ فَاِذَا ذَهَبَ قَرَأَهٗ كَمَا وَعَدَهُ اللّٰهُ.

(اللفظ للبخاری)

آپ یوں کیا کیجئے کہ جب ہم آپ پر قرآن نازل فرما چکیں تو نزول کے وقت تو آپ صرف سنا ہی کیجئے اس کے بعد خود پڑھ لیا کیجئے اس کے بعد اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے- ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کے بعد جب جبرئیل تشریف لاتے تو آپ اپنا سر مبارک جھکا لیتے - جب وہ تشریف لے جاتے تو حسب وعدہ الٰہی جیسا قرآن شریف اترتا اسی کے موافق پڑھتے -(بخاری شریف)

(۱۰۶۰) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ فَبَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ قِبَلَ السَّمَاءِ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَنِيْ بِحِرَاءَ قَاعِدٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ حَتّٰى هَوَيْتُ اِلَى الْاَرْضِ فَجِئْتُ اَهْلِيْ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ اِلٰى قَوْلِهٖ فَاهْجُرْ قَالَ اَبُوْ سلمة فَاهْجُرِ الْاَوْثَانِ ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَ تَتَابَعَ.

(و اللفظ للبخاری)

(۱۰۶۰) جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس زمانہ کا تذکرہ جس میں آپ پر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہوگئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی خود سنی ہے- آپؐ فرماتے تھے کہ میں جا رہا تھا اچانک آسمان کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی میں نے فوراً آسمان کی طرف نظر اٹھائی - کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حراء میں آیا تھا بڑی ہیبت و جلال کے ساتھ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر معلق بیٹھا ہوا ہے اس حالت کو دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر پڑا اور اپنی اہلیہ کے پاس آیا اور میں نے کہا مجھے کمبل اڑھاؤ مجھے کمبل اڑھاؤ - اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی یَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے فَاهْجُرْ تک ابوسلمہ کہتے ہیں کہ فَاهْجُرْ کا مطلب یہ تھا کہ بتوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو اس کے بعد پھر وحی گرما گرمی کے ساتھ پے در پے نازل ہونے لگی - (بخاری شریف)

الوحی و ثقله علٰی بعض اصحابه

وحی اور اس کا وزن آپؐ کے بعض صحابہ پر

(۱۰۶۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِيِّ اَنَّهٗ رَاٰى مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ فِي الْمَسْجِدِ فَاَقْبَلْتُ حَتّٰى جَلَسْتُ اِلٰى جَنْبِهٖ فَاَخْبَرَنَا اَنَّ

(۱۰۶۱) سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ انہوں نے مروان بن حکم کو مسجد میں دیکھا تو میں ان کے پاس آیا اور ان کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا انہوں نے ہم سے کہا کہ زید بن ثابت نے ان سے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے آیت لا یستوی

(۱۰۶۰) * اس روایت سے ظاہر ہے کہ اس مرتبہ آپؐ نے جبرئیل علیہ السلام کو کسی خاص ہیبت میں دیکھا تھا اب وحی کی عظمت ایک طرف اور فرشتے کی ہیبت ایک طرف عام بشر کی کیا مجال کہ اس عظمت و ہیبت کی تحمل کر سکے- یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ تھی کہ ان کو سنبھالا اور اس مرتبہ بھی گو آپؐ پر اثر تو ضرور ہوا مگر اتنا نہیں اسی لیے آئندہ تسلسل کے ساتھ وحی کا نزول شروع ہو گیا -

(۱۰۶۱) * سبحان اللہ صرف ایک کلمہ کا وزن جب زید بن ثابت کو اتنا محسوس ہوا تو جن پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوا ہوگا - اب اندازہ کر لینا چاہیے کہ جن پر قرآن کریم پورا کا پورا نازل ہوا تھا عام بشر سے ان کو کتنا امتیاز ہوگا -

زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْلٰى عَلَيْهِ لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَجَاءَهُ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ وَ هُوَ يُمِلُّهَا عَلَىَّ قَالَ وَ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَسْتَطِيْعُ الْجِهَادَ لَجَاهَدْتُ وَ كَانَ اَعْمٰى فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ فَخِذُهٗ عَلٰى فَخِذِىْ فَثَقُلَتْ عَلَىَّ حَتّٰى خِفْتُ اَنْ تُرَضَّ فَخِذِىْ ثُمَّ سُرِّىَ عَنْهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ غَيْرَ اُوْلِى الضَّرَرِ.

(رواه البخاری)

الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ (مؤمنوں میں جولوگ جہاد سے بیٹھ رہے اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا برابرنہیں ہو سکتے) زید بن ثابت سے قلم بند کرائی ابھی آپ اس کوقلم بند کرا ہی رہے تھے کہ آپ کی خدمت میں ابن ام مکتوم آ گئے انہوں نے کہا یا رسول اللہ بخدا اگر میں جہاد کرسکتا تو ضرور جہاد کرتا - بات یہ تھی کہ یہ نابینا تھے ان کے عذر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی نازل فرمائی اس وقت آپ کی ران میری ران کے اوپر رکھی ہوئی تھی (یعنی بے تکلفی کے ساتھ گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملائے بیٹھے تھے) تو میری ران پر اتنا وزن پڑا یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب چورا چورا ہوئی - اس کے بعد جب وحی کی کیفیت آپ سے دور ہوگئی تو جوکلمہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا وہ صرف یہ تھا "غَيْرَ اُوْلِى الضَّرَرِ" (یعنی یہ حکم ان کا ہے جومعذور نہ ہوں) (بخاری شریف)

(۱۰۶۲) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُوْحِىَ اِلَيْهِ لَمْ يَسْتَطِعْ اَحَدٌ مِنَّا يَرْفَعُ طَرْفَهٗ اِلَيْهِ حَتّٰى يَنْقَضِىَ الْوَحْىُ. (اخرجه مسلم و الحاكم و صححه)

(۱۰۶۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی تو جس وقت تک تمام نہ اتر لیتی کس کی مجال تھی کہ وہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا -

(مسلم - حاکم)

الوحىُ وَثِقْله عَلى الناقة

نزولِ وحی کے وقت آپ کی اونٹنی کی بے چینی

(۱۰۶۳) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اُوْحِىَ اِلَيْهِ وَ هُوَ عَلٰى نَاقَتِهٖ وَ ضَعَتْ جِرَانَهَا فَمَا تَسْتَطِيْعُ اَنْ تَتَحَوَّلَ حَتّٰى يُسَرّٰى عَنْهُ وَ تَلَتْ اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا.

(رواه احمد و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن نصر و الحاكم و صححه و قال الهيثمى رجاله رجال الصحيح)

(۱۰۶۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر ہوتی تو وحی کے وزن سے وہ بھی اپنی گردن نیچے ڈال دیتی تھی اور جب تک وحی کی آمد ختم نہ ہو لیتی اپنی جگہ سے گردن ہلا نہ سکتی تھی اس کے بعد اس مضمون کی تصدیق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی - اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ الخ ہم آپ پر ایک بہت وزنی کلام اتارنے والے ہیں -

(احمد - عبد بن حمید ابن جریر - ابن نصر - حاکم) (كذافى الدر المنثور)

(۱۰۶۳) * اس روایت سے معلوم ہوا کہ وحی کے بار کا احساس صرف انسانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ حیوانات کو بھی ہوتا تھا -

(۱۰۶۴) عَنْ اَبِیْ اَرْوَی الدَّوْسِیِّ قَالَ رَاَیْتُ الْوَحْیَ یَنْزِلُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ اِنَّهٗ عَلٰی رَاحِلَتِهٖ فَتَرْغُوْ وَ تَفْتِلُ یَدَیْهَا حَتّٰی اَظُنُّ اَنَّ ذِرَاعَیْهَا تَنْفَصِمُ فَرُبَّمَا بَرَکَتْ وَ رُبَّمَا قَامَتْ مُوْتِدَةً یَدَیْهَا حَتّٰی یُسَرّٰی عَنْهُ مِنْ ثِقْلِ الْوَحْیِ وَ اِنَّهٗ لَیَنْحَدِرُ مِنْهُ مِثْلُ الْجُمَانِ. (رواه ابن سعد کما فی الخصائص ص ۱۱۹ ج ۱)

(۱۰۶۴) ابواروی دوسی کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتے اس وقت دیکھا ہے جب آپ اپنی سواری کے اوپر تھے کہ وحی کے وزن سے آپ کی اونٹنی آواز کرتی تھی اور اپنے دونوں پیر اس طرح ادلتی بدلتی تھی کہ مجھ کو یہ گمان ہوتا تھا گویا اس کے بازو ٹوٹے جاتے ہیں کبھی بیٹھتی اور کبھی اپنے پیروں پر سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی - وحی کے وزن سے اس کی یہی کیفیت رہتی تھی یہاں تک کہ وحی کی آمد ختم نہ ہو جاتی ادھر آپ کی پیشانی مبارک سے موتی کی طرح پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے-

(خصائص الکبری)

الرسول العظیم کان یعرف عند نزول الوحی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تو یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ آپ پر وحی آرہی ہے

(۱۰۶۵) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ بَیْنَمَا اَنَا اَمْشِیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ بَعْضِ حَرْثٍ اَوْخَرِبِ الْمَدِیْنَةِ وَهُوَ یَتَوَکَّأُ عَلٰی عَسِیْبٍ مَعَهٗ فَمَرَرْنَا عَلٰی نَفَرٍ مِنَ الْیَهُوْدِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْاَلُوْهُ اَنْ یَجِیْٔ فِیْهِ بِشَیْءٍ تَکْرَهُوْنَهٗ فَقَالَ بَعْضُهُمْ وَ لَنَسْاَلَنَّهٗ فَقَامَ اِلَیْهِ رَجُلٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ یَا اَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوْحُ فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَعَلِمْتُ اَنَّهٗ یُوْحٰی اِلَیْهِ فَقَالَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَا اُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا قَالَ الاعمش هکذا فی قرائتنا.

(و البخاری ص ۱۱۱۱ و رواه الترمذی فی سورة بنی اسرائیل و فیه لفظ حتی انوحی صعد)

(۱۰۶۵) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک بار میں آپ صلی علیہ وسلم کی ہمراہی میں مدینہ کے کھیت یا کسی ویرانہ میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک شاخ پر سہارا دے کر کھڑے ہوئے تھے اتنے میں ہمارا گذر یہود کی ایک جماعت پر ہوا انہوں نے باہم ایک دوسرے سے کہا اس شخص سے روح کے متعلق دریافت کر کے دیکھو اس پر کسی نے یہ مشورہ دیا کہ نہ پوچھو کہیں وہ ایسا جواب نہ دے دیں جو تمہارے لیے اور کوفت کا سبب ہو- اس پر دوسرے لوگ بولے واہ ہم ضرور پوچھیں گے چنانچہ ان میں ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا اے ابوالقاسم (آپ کی کنیت تھی) روح کے متعلق کچھ فرمایئے؟ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے- میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے چنانچہ ان کے جواب میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی- یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ - یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے اور جتنا حصہ علم کا ان کو دیا گیا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے اگرچہ وہ نادانی سے اس کو بہت سمجھیں) اعمش کہتے ہیں کہ ہماری قرأۃ میں اس آیۃ میں او تیتم کی بجائے او تو اکا ہی لفظ ہے-

(۱۰۶۵) * خلاصہ یہ ہے کہ وحی کی حقیقت خواہ کتنی ہی دقیق کیوں نہ ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول دیکھتے تھے للہ .....

و مـن ميزات الانبياء عَلَيْهِم السَّلام لنَّ لهمُ فـى الـدُ نَيا خَواص اهل الجَنَّة و من تلك الـخَواص انَّ اجْسَادهمُ لاتبلى و لا تفنى

انبیاء علیہم السلام کو اپنی صفات میں اہل جنت کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے- ان کے جسم تغیر سے محفوظ رہتے ہیں

(١٠٦٦) عَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

(١٠٦٦) اوس بن اوس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ﷺ ..... وہ اتنی واضح ہو چکی تھی کہ جو آپ کے رفقاء تھے وہ اس کو فوراً پہچان لیتے تھے- مشکل جو کچھ بھی ہے وہ ان کے لیے ہے جنہوں نے وحی کا نزول خود تو دیکھا نہیں اور بدقسمتی یہ کہ جنہوں نے دیکھا تھا ان کے بیان پر ان کو اعتماد نہیں آتا-

اس روایت میں امام ترمذی نے ایک خاص لفظ روایت کیا ہے اور وہ "حتی صعد الوحی" یعنی میں سمجھ لیتا تھا کہ اب آپ پر وحی آ رہی ہے یہاں تک کہ وحی چڑھ جاتی- وحی کے بارے میں نزول کا لفظ تو عام روایات میں آتا ہے لیکن اس روایت میں "صعود" کا لفظ بھی آ گیا ہے اور بظاہر اس سے مراد صاحب وحی یعنی فرشتہ کا صعود ہے-

(١٠٦٦) * حدیث مذکور الصدر میں انبیاء علیہم السلام کے ایک جسمانی امتیاز کا تذکرہ ہے- یعنی یہ کہ عام انسانوں کے جسم میں تو صرف ایک جزء ایسا ہوتا ہے جو تمام جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتا جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا- لیکن انبیاء علیہم السلام کے پورے کے پورے عنصری اجسام کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ زمین کے تخریبی اثرات سے بالکل محفوظ رہتے ہیں- یوں تو ادویات کے ذریعہ سے اجسام کا محفوظ رکھنا مصر کی عام صنعت تھی اور اسی صنعت کی بدولت آج عجائب گھروں میں ہزاروں سال کی لاشیں آپ کو موجود نظر آتی ہیں اور آج کی ایجادات میں بھی ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعہ پانی اور آگ کے اثرات سے کافی حفاظت ہو جاتی ہے- واٹر پروف' فائر پروف کا استعمال عام طور پر ہمارے زمانہ میں سب جانتے ہیں- تھرماس میں برف جیسی جلد گھل جانے والی چیز بے تامل چوبیس چوبیس گھنٹے تک محفوظ رہ سکتی ہے' اس لیے انبیاء علیہم السلام کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی کوئی بہت بعید از قیاس بات تو نہ تھی بالخصوص جب کہ تاریخی واقعات سے بعض صحابہؓ کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہو لیکن ہم صرف آپ کی تسکین خاطر کی خاطر کچھ مزید وضاحت بھی کیے دیتے ہیں-

اصل یہ ہے کہ جس طرح عناصر کی تلطیف و تکثیف سے کون و فساد ہو سکتا ہے اسی طرح مرکبات عناصر میں بھی تلطیف و تکثیف سے مادیت و روحانیت کا تغیر ہو سکتا ہے دیکھئے پانی کو اگر آگ پر رکھا جائے تو وہ ایک دوسرے لطیف تر عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی ہوا بن جاتا ہے پھر اس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں' اسی طرح بھاپ کو اگر ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر وہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو اس سے کثیف عنصر ہے- یہاں بھی اب اس کے خواص میں تبدیلی ہو جاتی ہے- اسی طرح انسانی جسم جو عناصر اربعہ کا مرکب ہے اس میں بھی ریاضت و معصیت کے اثرات سے لطافت و کثافت کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے- مسلمانوں میں طبقہ صوفیاء نصاریٰ میں راہبین اور ہندوؤں میں جوگیوں کی تاریخ پڑھنے سے یہ حد یقین تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کے ظاہری اجسام ریاضات کے اثرات سے اتنے لطیف ہو جاتے تھے کہ عام جسمانی انقلابات ان پر کم اثر انداز ہوتے تھے اس کے برعکس جو جماعت تن پروری کی ریاضت میں منہمک ہے ان کے اجسام بھی اسی قدر کثیف ہو جاتے ہیں آج کل کی اصطلاح میں اس مسئلہ کا نام "تجسد ارواح اور تروح الاجساد" ہے- یعنی روحوں میں یہ طاقت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی جسم کی صورت اختیار کر لیں اور جسم لطیف ہو کر روح کے خواص پیدا کر لے- انبیاء علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ﷺ .....

اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَ فِيْهِ قُبِضَ وَ فِيْهِ النَّفْخَةُ وَ فِيْهِ الصَّعْقَةُ فَاَكْثِرُوْا

فرمایا تمہارے سب دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے- اسی دن میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے- اسی میں ان کی وفات ہوئی' اسی میں صور پھونکا جائے گا اور اسی میں صور کی آواز سے لوگوں پر بے ہوشی

للہ ..... کی پیدائش چونکہ عام دستور کے خلاف صرف نفخہ جبرئیلی سے ہوئی تھی اس لیے ان کے جسم عنصری میں بھی روح کے خواص اتنے نمایاں تھے کہ موجودہ انجیل کے بیان کے مطابق بعض مرتبہ بات کرتے کرتے ان کی شکل مبارک تبدیل ہو جایا کرتی تھی اور ہماری شریعت میں بھی ان کا لقب ''روح اللہ'' رکھا گیا ہے- ان کا آسمانوں پر جانا اور پھر اترنا بھی اسی کے اثرات میں سے ہے اسی طرح ان کے معجزات میں احیاء موتی کا ایک معجزہ سونا بھی ان کے ''روح اللہ'' ہونے کے مناسبات میں سے تھا-

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ معصیت کا اثر مادیت میں ترقی ہے اور طاعات کا اثر روحانیت میں اضافہ' اس لیے اہل جہنم پر مادیت غالب کر دی جائے گی اور ان کی جسامت دنیوی جسامت سے سینکڑوں گنا بڑھا دی جائے گی تاکہ ایک طرف ان کے عذاب میں شدت ہو اور دوسری طرف جہنم کے بھرنے کا جو وعدہ گزر چکا ہے وہ تکثیر افراد کی بجائے ایک ایک فرد کی جسامت میں اضافہ کر کر کے پورا کر دیا جائے- اس کے برخلاف اہل جنت پر روحانیت غالب ہو جائے گی اور اس وجہ سے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوزی اور پروردگار عالم کی رویت جو عالم مجردات سے بھی وراء الوراء ہے ان کے لیے آسان ہو جائے گی- بے شک جو اجسام اپنی ساری عمر ریاضت و عبادت میں صرف کر کے یہاں بھی روح کے کچھ خواص حاصل کر چکے تھے جنت میں پہنچ کر ان کی اس صفت میں اور ترقی ہو جانی چاہیے- حیرت ہے کہ جب اس دنیا میں بھی موسم' زمین کے شور ہونے نہ ہونے اور خود جسم کے بلغمی غیر بلغمی ہونے کے اختلاف سے لاش کے بگڑنے اور نہ بگڑنے میں فرق آ سکتا ہے تو معصیت و طاعت کے اثرات سے بھی اگر یہ اختلاف رونما ہو تو اس کا انکار کیوں کیا جائے- اگر مشاہدہ اور کچھ واقعات وہاں تصدیق کے لیے مجبور کرتے ہیں تو یہاں بھی اس سے زیادہ قوی ثبوت کے ساتھ مشاہدہ موجود ہے جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا-

اب تک جو ہم نے بیان کیا یہ تو کسب و اکتساب کے اثرات و نتائج تھے- انبیاء علیہم السلام کی جماعت چونکہ صفت اصطفاء و اجتباء کے ماتحت ہوتی ہے اس لیے ان کے اجسام کے ابتدائی نہاد ہی ان کمالات سے بالاتر ہوتی ہے جو کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں- قالب انسانی ان کو بھی ملتا ہے مگر وہ قالب جو منور ہو' روح بشری ان میں بھی ہوتی ہے اگر روح جو نشہ عبودیت میں سرشار ہو اور اس طرح وہ ظاہر و باطن منور ہستیاں جب عالم میں ظاہر ہوتی ہیں تو کفر کا تیرہ و تاریک عالم ان کے وجود سے منور ہو جاتا ہے- پسینہ ان کو بھی آتا ہے مگر وہ پسینہ نہیں جو دماغ کو متعفن کر دے بلکہ وہ جو مشام جان کو معطر کر دے' سوتے وہ بھی ہیں مگر وہ نیند نہیں جو دل کو غافل کر دے' کھاتے وہ بھی ہیں مگر وہ کھانا نہیں جس کی احتیاج عام انسانوں کی طرح ہو بلکہ عین نیند کی حالت میں ان کے دل دوسرے تمام بیداروں سے زیادہ بیدار ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کا خواب وحی ہوتا ہے اور ان کی نیند ناقض وضوء نہیں ہوتی- وہ روزہ رکھتے ہیں تو کئی کئی دن کھانے کے قریب نہیں جاتے پھر اس وجہ سے ان کو کوئی ضعف بھی لاحق نہیں ہوتا- اس پر جب آپ کے فداکار آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ بڑی شفقت کے انداز میں ان سے یہ فرما دیتے ہیں کہ تم میری طرح نہیں ہو- میں اگر جسمانی غذاء ترک کرتا ہوں تو میرا پروردگار مجھے روحانی غذا سے سرفراز فرماتا ہے- تم لہسن' پیاز سب کھا سکتے ہو مگر میں نہیں کھا سکتا کہ میرے اصحاب محفل تمہارے علاوہ نوح ملائکہ بھی ہے' نکاح وہ بھی کرتے ہیں مگر وہ نکاح نہیں جس سے مقصود کسی درجہ میں بھی تلذذ ہو بلکہ وہ نکاح جس کا مقصد صرف عبادت و تقرب ہو- قوت باصرہ' سامعہ' للہ .....

عَـلَيَّ مِنَ الصَّلٰوةِ فِيْهِ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ كَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَـا عَـلَيْكَ وَقَدْ اَرِمْتَ يَقُوْلُوْنَ بَلِيْتَ

طاری ہوگی تو اس دن میں تم لوگ مجھ پر بہ کثرت درود بھیجا کرو کیونکہ تمہاری درود میرے سامنے پیش کی جاتی ہے- راوی کہتا ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے تعجب سے دریافت کیا یا رسول اللہ ہماری درود بھلا آپ صلی اللہ

ﷺ ..... ذائقہ وہ بھی رکھتے ہیں مگر وہ قوت نہیں جو صرف عالم مادیت تک محدود ہو بلکہ وہ جو ماوراء مادیات کو بھی نفوذ کر جائے- زبانیں اگر صرف خوش مزہ اور بدمزہ کا ادراک کرتی ہیں تو ان کی زبان حرام وحلال غذاء کا بھی ادراک کر لیتی ہو-حتیٰ کہ بول و براز میں وہ بھی عام انسانوں کے شریک نظر آئیں مگر یہاں اس کے متعلق جذب کر لینا بھی منقول ہو اور سب سے آخر میں موت کا فرشتہ ان کے پاس بھی آئے مگر اجازت کے بغیر جبر واکراہ سے نہیں بلکہ اذن واجازت سے اور دفن اگر چہ وہ بھی ہوں مگر یہاں بھی اپنی جائے وفات میں مدفون ہونے کا امتیاز باقی رہے- اب سوچئے کہ اگر ان کے جسم عنصری ہی میں کوئی امتیاز وخصوصیت نہیں ہوتی تو جس غذاء کے اثر سے دوسرے جسموں کو متعفن پسینہ آتا ہے وہ ان کو کیوں نہیں آتا' وہ عام انسانوں کی طرح غذاء کے محتاج کیوں نہیں ہوتے' ان کے حواس کے ادراک کا دائرہ عام انسانوں سے بالاتر کیوں ہوتا ہے اور کیوں ان کی نیند عام انسانوں کی سی نیند نہیں ہوتی - دنیا میں غفلت کی نیند صحت کی علامت ہو اور ان کے یہاں تیقظ کی نیند موجب کمال ہو- کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اجسام عنصریہ کی نہاد ہی کچھ عام اجسام سے نرالی ہوتی ہیں بعض ضعیف حدیثوں میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل جنت کی غذاء کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ معطر پسینہ بن کر ختم ہو جائے گی اس سے فضلہ نہیں بنے گا- اگر کہیں غذاء کی اذیت حائل نہ ہو جاتی تو شاید انبیاء علیہم السلام کا فضلہ اس عالم میں بھی پسینہ بن کر رہ جاتا گویا فرق اگر کچھ رہا تو وہ صرف غذاء کی نوعیت کے فرق سے رہا ورنہ بلحاظ خواص جسم کا جو خاصہ اہل جنت کے جسم میں تھا وہی یہاں ہے-حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کے جب غذاء کھائی تو وہی جسم جو فضلہ کا محتاج نہ تھا اب فضلہ دفع کرنے کے لیے مجبور ہو گیا - پس جسم ایک ہی تھا فرق جو ہوا وہ غذاء کی نوعیت سے پیدا ہوا- حضرت آدم علیہ السلام جنتی جسم لے کر اس جہان کی آبادی کے لیے تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا بھی جسم عنصری لے کر خدا تعالیٰ کے دیدار کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جسم اطہر کے ساتھ جنت کو شرف قدوم سے نوازا- پس کیا شبہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں' اگر ان کا قالب عنصری بھی اہل جنت کی طرح کون وفساد کے اثرات سے آزاد ہو تو بعید کیا ہے- پھر اس پر بھی ذرا غور کرنا چاہیے کہ انسانی زندگی میں عام انسانوں کے اجسام کے بگڑنے سے کیا چیز مانع ہے تو ظاہر ہوگا کہ وہ علاقہ روح یعنی حیات ہے اِدھر روح نے جسم سے پرواز کی اُدھر جسم کے اندر تغیر شروع ہوا- اگر انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا ان کے جسموں کے ساتھ علاقہ شہداء سے کچھ زیادہ تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر بھی ان کے جسموں کے محفوظ رہنے میں کوئی وجہ اشکال ہو سکتی ہے- امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

و اعـلـم ان تـمام الكلام فی هذا الباب ان النفس القدسية النبوية مـخـالـفة بـمـا هيتهـا لسـائر النفوس و من لوازم تلک النفوس الـكـمال فی الذكاء و الفطنة و الحرية و الا ستعلاء و الترفع عن الـجسـمـانيات و الشهوات فاذا كـانـت الـروح فی غدية

یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ عام انسانوں سے اپنی ماہیت میں ہی مختلف ہوتے ہیں ان نفوس میں فہم وفراست اور جسمانیات وشہوات سے ایک عجب قسم کی برتری ہوتی ہے جب ایک طرف روح کی ﷺ .....

فَقَالَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ. (رواه ابوداؤد و النسائی و الدارمی و البیهقی فی الدعوات الکبیر و احمد و ابن حبان و الحاکم. قال الحاکم هذا حدیث صحیح علی شرط البخاری و لم یخرجاه و کذا صححه النووی فی الاذکار و قال الحافظ عبدالغنی النابلسی انه حسن صحیح و قال المنذری انه حسن و قال ابن دحیة انه صحیح محفوظ و اجاب الحافظ ابن القیم مما ذکر فیه من العلة فراجع جلاء الافهام ص ۴۲ و ص ۴۳ و رواه ابن ماجه عن ابی الدرداء قال الحافظ المنذری اسناده جید)

علیہ وسلم کے سامنے کس طرح پیش ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر تو اس وقت تک مٹی میں مل چکا ہوگا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام پر کوئی اثر کر سکے-

(ابوداؤد-نسائی-ابن ماجہ-دارمی-بیہقی)

(۱۰۶۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ تَأْكُلُهُ الْاَرْضُ اِلَّا عَجْبُ

(۱۰۶۷) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ابن آدم کا سب جسم زمین کھا لیتی ہے صرف اس کی ریڑھ کی

؎..... الصفاء و الشرف و کان البدن فی غایة الناتار و الطهارة کانت هذه القوی المحرکة و المدرکة فی غایة الکمال لانها جاریة مجری انوار فائضة من جوهر الروح واصلة الی البدن و متی کان الفاعل و القابل فی غایة الکمال کانت الآثار فی غایة القوة و الشرف و الصفاء.

(تفسیر کبیر ص ۴۵۶ ج ۲)

پاکیزگی و شرف کا یہ عالم ہو دوسری طرف جسم بھی غایۃ درجہ پاک و صاف ہو تو لازمی طور پر ان کے قویٰ محرکہ اور مدرکہ بھی انتہاء درجہ کامل ہوں گے کیونکہ جب فاعل اور قابل دونوں کامل ہوں تو پھر اس کے آثار قوت و شرف و پاکیزگی میں کیوں کامل نہ ہوں-

(تفسیر کبیر)

مگر ان تمام کمالات کے بعد بھی کیا انبیاء علیہم السلام کا قدم سرمو بھی بشریت سے باہر گیا - ہرگز نہیں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکر ہیں ان کو نہ تو بشریت کے کمالات سے آگاہی ہے نہ خدائی صفات کا اندازہ ہے ان جملہ کمالات میں سے ایک کمال بھی ایسا نہیں جو بشر کو خدا تعالیٰ کی کسی ایک صفت میں بھی شریک و سہیم بنا سکے - انسانی سارے کمالات کے بعد بھی قباء بشریت پر حدوث و امکان کا ایک ہی داغ اس کو خالق بشر سے ممتاز کر دینے کے لیے کافی ہے - انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں خواہ کتنی بھی خصوصیات ہوں مگر وہ پھر جسم کی خصوصیات ہوں گی جو ان کے عام اجسام سے بالاتر ہونے کی دلیل تو بن سکتی ہیں مگر جو ذات کہ جسم و جسمانیات سے ہی بالاتر ہو بھلا اس کے ساتھ کوئی ادنیٰ سا اشتراک کیسے پیدا کر سکتی ہے انصاف کیجئے کہ جسم کی پیدائش خواہ کتنی بھی نرالی ہو پسینہ خواہ کتنا ہی معطر سے معطر ہو بول و براز کی خصوصیات خواہ کتنی ہی عجیب در عجیب ہوں' موت و دفن کے واقعات اور سلامتی جسم کی حقیقت خواہ کتنی ہی حیرت انگیز ہو اگر کیا ان عوارض یا ان سے بھی برتر عوارض کے ساتھ کسی انسان کو اس ذات اقدس کے ساتھ کوئی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے جو ان صفات کی خالق ہے اور ان میں سے ہر صفت جس کے لیے نقص در نقص اور عجیب در عجیب ہے پس نہ تو آپ کے کمالات بشریت کے اقرار سے خدائی توحید کو مکدر کرنا چاہیے اور نہ خدائی توحید کا کمال آپ کے کمالات بشریت کے انکار میں مضمر سمجھنا چاہیے-

(۱۰۶۷) * جدید تحقیق کے بموجب انسانی پیدائش کی ابتداء سلس (Sells) قرار دی گئی ہے جو قدرت الٰہی سے نہیں بلکہ اپنی فطرت سے ارتقاء کرتے کرتے انسانی صورت اختیار کر گئے ہیں - یہاں حدیث یہ کہتی ہے کہ انسانی جسم کی بنیاد ہڈی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے ؎ .....

الذَّنَبِ. مِنْهُ خُلِقَ وَ فِيْهِ يُرَكَّبُ. (رواہ مالك و الحاكم فى مستدركه و صححه و قراه الذهبى

ہڈی کا ایک حصہ نہیں کھاتی - اسی سے اس کی پیدائش کی ابتداء ہوئی تھی اور اسی سے وہ پھر بنایا جائے گا - (مالک - حاکم)

والحديث مروى عند الشيخين و لكنه جزء من الحديث الذى جاء فى المدة بين النفختين)

(۱۰۶۸) مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِىْ صَعْصَعَةَ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عَمْرُو بْنَ الْجَمُوْحِ وَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرو الْاَنْصَارِيَّيْنَ ثُمَّ السُّلَمِيَّيْنِ كَانَا قَدْ حَفَرَ السَّيْلُ مِنْ قَبْرَيْهِمَا وَ كَانَا قَبْرَاهُمَا يَلِى السَّيْلُ وَ كَانَا فِىْ قَبْرٍ وَاحِدٍ وَ هُمَا مِمَّنْ اُسْتُشْهِدَ يَوْمَ اُحُدٍ فَحُفِرَ عَنْهُمَا لِيُغَيَّرَا مِنْ مَكَانِهِمَا فَوَجَدَ الَمْ يَتَغَيَّرَا كَاَنَّهُمَا مَاتَا بِالْاَمْسِ وَ كَانَ اَحَدُهُمَا قَدْ جُرِحَ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى جُرْحِهٖ فَدُفِنَ وَ هُوَ كَذٰلِكَ فَاُمِيْطَتْ يَدُهٗ عَنْ جُرْحِهٖ ثُمَّ اُرْسِلَتْ فَرَجَعَتْ كَمَا كَانَتْ وَ كَانَ بَيْنَ اُحُدٍ وَ بَيْنَ يَوْمَ حُفِرَ عَنْهُمَا سِتٌّ وَ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً.

(رواه مالك فى الموطا من او اخر ابواب الجهاد)

(۱۰۶۸) مالک عبدالرحمٰن سے نقل کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عمرو بن الجموح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو انصار میں سے تھے ان کی قبریں سیل (رو) کے متصل واقع ہوئی تھیں ایسا اتفاق ہوا کہ سیل آئی اور اس نے ان کی قبریں کھود ڈالیں - یہ دونوں انصاری غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے اور ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا جب دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبروں کو کھودا گیا - دیکھا تو ان میں ذرا بھی تغیر نہ تھا' یوں معلوم ہوتا تھا کل دفن کیے گئے ہیں - ان میں سے ایک صاحب جب زخمی ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا اور اتفاق سے اسی طرح ان کو دفن کر دیا گیا تھا - قبر سے نکالنے کے بعد ان کا ہاتھ جب زخم سے علیحدہ کر کے چھوڑا جاتا تو پھر اسی طرح زخم پر جا چمٹتا حالانکہ غزوۂ احد اور جس دن ان کی قبریں کھودی گئی تھیں ان کے درمیان چھیالیس سال کی مدت گذر چکی تھی -

(مؤطا مالک)

(۱۰۶۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا حَضَرَ اُحُدٌ دَعَانِىْ اَبِىْ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ مَا اَرَانِىْ اِلَّا مَقْتُوْلًا فِىْ اَوَّلِ مَنْ يُقْتَلُ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِىِّ

(۱۰۶۹) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب غزوۂ احد سامنے آیا تو میرے والد ماجد نے مجھے شب کے وقت بلا کر فرمایا - میرا خیال ہے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں جو شہید ہونے والے ہیں

ﷺ ..... جو دم علقہ اور مضغہ کی جملہ ارتقائی صورتوں میں محفوظ رہتا ہے حتیٰ کہ جب جسم کے سب اجزاء فناء ہو جاتے ہیں وہ اس وقت بھی فناء نہیں ہوتا مگر یہ تمام سلسلہ ہوتا ہے سب قدرت کے ماتحت جس نے ایک بار پہلے اس ارتقائی سلسلہ سے اس کو بنایا تھا دوسری بار پھر اس ارتقاء کے بغیر وہی اس کو بنا کر کھڑا کر دے گی -

[1] جس حدیث کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے -

(۱۰۶۹) ✽ یہ چند واقعات تو خود اسی امت کے ہیں اور بسند صحیح ثابت ہیں' ان کے علاوہ اس امت کے کچھ اور واقعات اور پہلی امت کا ایک واقعہ ابھی آئندہ حدیث کے ذیل میں آپ کے سامنے آنے والا ہے اس لیے یہ ناگزیر طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ موت اور دفن کے بعد بھی جسم انسانی تغیرات سے محفوظ رہ سکتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو بیان حدیث مذکورۂ بالا میں ﷺ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اِنِّيْ لَا اَتْرُكُ بَعْدِيْ اَعَزَّ عَلَيَّ مِنْكَ غَيْرَ نَفْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اِنَّ عَلَيَّ دِيْنًا فَاقْضِ وَ اسْتَوْصِ بِاَخَوَاتِكَ خَيْرًا فَاَصْبَحْنَا فَكَانَ اَوَّلَ قَتِيْلٍ وَ دُفِنَ مَعَهٗ اٰخَرُ فِيْ قَبْرِهٖ ثُمَّ لَمْ تَطِبْ نَفْسِيْ اَنْ اَتْرُكَهٗ مَعَ اٰخَرَ فَاسْتَخْرَجْتُهٗ بَعْدَ سِتَّةِ اَشْهُرٍ فَاِذَا هُوَ كَيَوْمٍ وَ ضَعْتُهٗ هُنَيَّةً غَيْرَ اُذُنِهٖ. (رواه البخاری و ذکر الحافظ ابن حجرؒ من فوائد

ان سب میں پہلے میں مقتول ہوں گا اور دیکھو میرے بعد ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مستثنیٰ کر کے تم سے بڑھ کر مجھ کو کوئی اور پیارا نہیں ہے۔ دیکھو میرے اوپر قرض ہے اس کو ادا کر دینا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا۔ جب صبح ہوئی، تو سب سے پہلے میرے والد ماجد ہی شہید ہوئے اور (شہداء کی کثرت کی وجہ سے) ایک صحابی اور ان ہی کے ساتھ دفن کر دیئے گئے مگر میرے دل کو یہ گوارا نہ ہو سکا کہ ان کے اس لیے چھ ماہ کی مدت کے بعد میں نے ان کو نکالا تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ان کو دفن کیا تھا صرف ان کے کان پر ذرا سا اثر آ یا تھا۔

(بخاری شریف)

الحدیث کرامته بکون الارض لم تبل جسده مع لبثه فیها. و قد ذکر السهیلی فی الروض الانف ص ٣٤ و ما وجد فی صدر هذه الامة من الشهداء احد و غیرهم علی هذه الصورة لم یتغیروا بعد الدهور الطویلة کحمزة بن عبدالمطلب فانه وجد حین حفر معاویة العین صحیحًا لم یتغیر و اصابت الفأس اصبعه فدمیت و کذلك ابو جابر عبدالله بن حرام (و عمرو بن الجموح) و طلحة بن عبیدالله رضی الله تعالی عنهم استخرجته بنتهٗ عائشة (من قبره) حین رأتهٗ فی المنام فامرها ان تنقله من موضعه فاستخرجته من موضعه بعد ثلاثین سنة لم یتغیر ذکره ابن قتیبة فی المعارف و الا خبار بذلك صحیحة ثم ذکر قصة الغلام و اصحاب الاخدود ذکر انه اخرج فی زمن عمرؓ بن الخطاب و اصبعه علی صدغه کما وضعها حین قتل کما رواه الترمذی قلت نعم و للارض من کأس الکرام نصیب)

ﷲ ..... آپ پڑھ چکے ہیں اس میں ذرا سا بھی تردد کیا جا سکے۔ پھر جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اتنی طویل مدت کے بعد بھی مردہ جسم سے خون کیونکر برآمد ہوا تو شہداء کی حیات کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے مگر وہ ایسی حیات نہ ہو جس کی جملہ کیفیات کا ہم ادراک کر سکیں مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ عام مردوں سے ان کو امتیاز ضرور ہوتا ہے کہ ان کی مردہ نعشوں میں سالوں کے بعد بھی خون کا اثر موجود ہو سکتا ہے اب ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس کا جواب ہم صرف یہی دے سکتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ وہ کسی درجہ میں حیات رکھتے ہیں۔ رہا یہ کہ اس کی تفصیلات کیا ہیں تو ہم یہاں اپنے جہل کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم تو ابھی یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ بیداری اور سونے کی حالتوں میں ہماری روح اور جسم کے تعلق میں پورا فرق کیا ہے حالانکہ یہ دونوں حالتیں ہر شخص پر اس کی حیات کی حالتیں ہیں اور سالہا سال اس پر گذرتی ہیں لہٰذا اگر اس حالت کا ہم پتہ نہ دے سکیں جو موت کے بعد کی ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

جب شہداء کے حیات کی کیفیات یہ ہیں تو انبیاء علیہم السلام جن کے رتبے ان سے کہیں بالاتر ہیں ان کی حیات کی نوعیت کیا ہوگی اس سے اس کا کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔ یہاں ان مشاہدات کے بعد محض اپنے خیالات سے نہ تو اس کا انکار کر ڈالنا مناسب ہے اور نہ اس پر ہزار خرافات کا اور اضافہ کر کے اصل حقیقت کا بھی گم کر دینا عقل کی بات ہے، ظاہر ہے کہ جو بشر دنیا میں ایک مشاہد حیات کے مالک رہ چکے ہیں اگر وفات کے بعد کسی غیر مشاہد حیات کے مالک بن گئے ہیں تو اس سے ان کی بشریت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے اور کیوں۔ لہٰذا ﷲ .....

(۱۰۷۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّ خَرْبَةً اُخْتُصِرَتْ فِیْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَوَجَدُوْا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ تَامِرٍ وَاضِعًا یَدَهٗ عَلٰی ضَرْبَةِ رَأْسِهٖ اِذَا اُمِیْطَتْ یَدُهٗ عَنْهَا انْبَعَثَتْ دَمًا وَ اِذَا تُرِکَتْ ارْتَدَّتْ مَکَانَهَا وَ فِیْ یَدِهٖ خَاتَمُ حَدِیْدٍ فِیْهِ مَکْتُوْبٌ رَبِّیَ اللّٰهُ فَبَلَغَ ذٰلِکَ عُمَرَ

(۱۰۷۰) عبداللہ بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک اجاڑ زمین کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش نکلی کہ اپنے سر کے زخم پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں' جب اس زخم سے ان کا ہاتھ جدا کر لیا جاتا ہے تو خون بہنے لگتا ہے اور جب اس کو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر اپنی جگہ جا چمٹتا ہے- ان کے ہاتھ میں لوہے کی ایک انگوٹھی تھی اس پر ''ربی اللہ'' کا نقش کندہ تھا- جب یہ اطلاع حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملی تو آپ نے لکھ بھیجا تم نے

للہ ...... انبیاء علیہم السلام اور شہداء کرام کی حیات تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان کے بارے میں کسی ایک بات کا اضافہ کر دینا جو انہوں نے اپنی حسی حیات میں نہیں فرمائی بلکہ اس سے روکا ہے- جہاں دین پر افتراء ہے اسی طرح خود ان کی ذاتوں پر بھی افتراء ہوگا-

(۱۰۷۰) * امام قریشی نے اصحاب اخدود کے قصہ کے ساتھ بعض اور واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں:

و قال الامام القرطبی و کان اصحاب الاخدود فی ایام الفترة بین عیسٰی و محمد صلی اللّٰه علیه وسلم کما فی صحیح مسلم و روی نقلة الاخبار ان معاویةؓ لما اجری العین التی استنبطها بالمدنیة وسط البقرة و امر الناس بتحول موتاهم و ذلک فی ایام خلافه و بعد احد من نحو خمسین سنة فوجد و اعلی جالهم حتٰی ان الناس رؤا السحاة اصابت قدم حمزةؓ بن المطلب فسال الدم منها وروی کافة اهل المدینة ان جدار قبر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم لما انهدم ایام خلافة الولید بن عبدالملک بن مروان و لایة عمر بن عبدالعزیز علی المدینة مدت لم قدم فخافوا ان تکون قدم النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فجزع الناس حتٰی روی لهم سعید بن المسیب ان جثة الانبیاء علیهم السلام لاتقیم فی الارض اکثر من اربعین یوما ثم ترفع و جاء سالمؒ بن عبداللّٰهؓ بن عمرؓ بن الخطاب و عرف الناس انها قدم جده عمرؓ بن الخطاب.

(مختصر تذکرۃ القرطبی ص ۴۰)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ حسب بیان صاحب مسلم اصحاب اخدود کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی درمیانی مدت کا تھا- اس سلسلہ میں مؤرخین سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ میں نہر نکالنے کا ارادہ فرمایا تو اس کی گذر گاہ حسب الاتفاق قبرستان احد کے درمیان تھی لہٰذا انہوں نے اعلان کر دیا کہ لوگ اپنے اپنے مردے یہاں سے اٹھا کر دوسرے جگہ دفن کر دیں جب مردے اس غرض کے لیے نکالے گئے تو بالکل اپنی اصلی حالت پر تر و تازہ معلوم ہوتے تھے حتیٰ کہ کھودنے میں کدالی حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیر میں جا لگی تو اسی وقت اس سے خون جاری ہو گیا- یہ واقعہ احد سے پچاس سال بعد کا ہے- اس کے علاوہ عام اہل مدینہ اس واقعہ کے ناقل ہیں کہ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جانب والی دیوار خستگی کی وجہ سے گر گئی تو ایک قدم نظر آیا جس کے متعلق لوگ پریشان ہوئے مبادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم نہ ہو یہاں تک کہ سالم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آ کر اس کو پہچانا اور کہا یہ تو میرے دادا حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا قدم ہے-

(مختصر تذکرہ قرطبی ص ۴۰)

فکتب اَنْ اَعِیْدُوْا عَلَیْهِ الَّذِیْ وَجَدْتُمْ عَلَیْهِ. جس حال پر ان کو پایا ہے ان کو اسی حالت پر دفن کردو۔ (تفسیر خازن)

(رواہ محمد بن اسحاق فی تفسیر الخازن. و محمد بن اسحاق موثوق به فی الاخبار و ان تکلم فیه فی باب الاحادیث و معذلك فقد روی عنه الائمة فی باب الاحکام ایضًا)

منها حیاتهم و شغلهم بالعبادات

اہل جنت سے دوسری مشابہت ان کی دائمی حیات اور دائمی عبادت ہے

(۱۰۷۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ. (رواہ ابو یعلی و البزار قال الهیثمی و رجال ابی یعلی ثقات کما فی المجمع و عزاہ السهیلی فی المسند کما فی الروض و قال انفردبه ثابت البنانی عن انس و قدروی ان ثابتا التمس فی قبرہ بعد ما دفن فلم یوجد فذکر ذلك لبنته فقالت کان یصلی فلم تروہ لانی کنت اسمعه اذا تهجد باللیل یقول اللهم اجعلنی ممن یصلی فی قبرہ بعد الموت و قد صنف البیهقی فی حیاۃ الانبیاء رسالة مستقلة)

(۱۰۷۱) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ (ابو یعلی)

(۱۰۷۲) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکْثِرُوْا عَلَیَّ الصَّلٰوۃَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاِنَّهٗ یَوْمٌ مَشْهُوْدٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِکَةُ وَ اَنَّ اَحَدًا لَا یُصَلِّیْ عَلَیَّ اِلَّا عُرِضَتْ عَلَیَّ صَلٰوتُهٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْهَا قَالَ قُلْتُ وَ بَعْدَ الْمَوْتِ؟ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰهِ حَیٌّ یُرْزَقُ. (رواہ ابن ماجة قال السخاوی و رجاله ثقات لکنه منقطع)

(۱۰۷۲) ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجا کرو کیونکہ اس دن کا لقب مشہور ہے کیونکہ اس میں فرشتوں کی بکثرت آمد ہوتی ہے اور جو شخص اس دن مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کی درود جب تک وہ اس میں مشغول رہتا ہے میرے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا موت کے بعد بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر یہ بات حرام کردی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو گلا سڑا دے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کا نبی زندہ ہی رہتا ہے اور اس کو رزق بھی دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

(۱۰۷۲) ٭ اہل جنت کی حیات اور دائمی عبادت ذکر حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی وفات کے بعد بھی عبادات اور نیک اعمال سے معطل نہیں رہتے بلکہ دوسروں کی درود بھی ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے ان کے جسموں کو زمین نقصان نہیں پہنچاتی اور ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ جملہ صفات حیات کی صفات ہیں اس لیے ان کی حیات اور عبادت اس عالم میں بھی اہل جنت کی حیات اور عبادت کی شان رکھتی ہے۔ لہٰذا جب اس مسئلہ پر غور کرنا ہو تو احادیث کی روشنی میں کرنا چاہیے یہاں صرف اتنی ہی باتوں کو سامنے رکھنا حیات کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہے اس سے زیادہ اپنی جانب سے محض قیاس آرائیاں کرنا بے وجہ عقائد کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور ان کی موت کو بالکل عام انسانوں جیسی موت سمجھنا بھی محدثین علماء کے خلاف ہے جب کہ حدیث میں ان کے غسل، ان کے دفن ان کی نماز، ان کے ترکہ اور ان کی بیویوں سے حرمت نکاح کے مسائل صاف صاف موجود ہیں تو ان کے حق میں بالکل عام موت کا عقیدہ رکھنا بھی کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

(۱۰۷۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّارَدَّ عَلَیَّ اللّٰهُ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ. (رواہ ابوداؤد)

(۱۰۷۳) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جب کوئی شخص مجھ کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور میری روح کو اس طرف متوجہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو جواب بھی دیتا ہوں۔ (ابوداؤد)

(۱۰۷۳) * اس مقام پر حافظ سیوطی نے اپنے فتاوی میں بڑی طویل بحث کی ہے اور لفظ "رد علی روحی" کے جملہ کی بہت مفصل شرح فرمائی ہے اور اس کی تقریر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

ان قوله رد اللّٰه علی روحی جملة حالیة و قاعدة العربیة ان جملة بحال اذا وقعت فعلاً ماضیًا قدرت فیه قد کقوله تعالٰی اوجاؤ کم حصرت صدورهم ای قد حصرت... ولو اخذ یمعنی الحال اوالا ستقبال لزم تکرره عند تکرر سلام المسلمین... ثم بعد ذلک رائیت الحدیث المسئول عنه مخرجًا فی کتاب حیا ة الانبیاء للبیهقی بلفظ الاو قد رد اللّٰه علی روحی فهواقوی الاجوبة عندی و مرا و الحدیث علیه الاخباره بان اللّٰه یر دالیه روحه بعد الموت فیصیر حیًا علی الدوام حتٰی لو سلم علیه احد رد علیه السلام لوجود الحیات ص ۱۵۴ ج ۲ من الفتاوی و قال حیاة النبی فی قبره و سائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیًا لما قام عند نامن الادلة فی ذلک وتواترت به الاخبار و قد الف البیهقی جزء فی حیاة الانبیاء فی قبورهم... و نقل عنه من کتابه فی الاعتقاد الانبیاء علیهم السلام بعد ما قبضوا ردت الیهم ارواحهم فهم احیاء عند ربهم کا لشهداء و قد افرونا لاثبات حیاتهم کتابًا وقد نقل عن القرطبی من تذکرته فی حیاتهم ان موتهم انما هو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لاندر کهم... کا لحال فی الملائکة. (ص ۱٤۷ ج ۲)

آپ کا فرمان "رد اللہ علی روحی" یہ جملہ حالیہ ہے اور عربی قاعدہ ہے کہ جملہ حالیہ جب فعل ماضی ہو تو وہاں لفظ "قد" مقدر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول او جاؤ کم حصرت صدورھم میں لفظ "قد" مقدر ہے اور مطلب یہ ہے کہ "قد حصرت" اگر یہاں آپ کے قول کے معنی ماضی کے بجائے حال یا استقبال کے لیے جائیں تو لازم آئے گا کہ ہر بار جب کوئی شخص آپ کو سلام کرے تو آپ کی روح کا بدن سے تعلق ہو اور ہر بار یہ تعلق پھر بدن سے جدا ہوا کرے اس کے کچھ زمانہ کے بعد میں نے بیہقی کی کتاب "حیات الانبیاء" میں دیکھا۔ انہوں نے ایک روایت ہی صراحۃً لفظ "قد" کے ساتھ پیش کی ہے اس لیے اب میرے نزدیک سب جوابوں سے یہی جواب زیادہ قوی ہے اور اس بناء پر حدیث کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وفات دینے کے بعد آپ کو پھر حیات دائمی عطا فرما دی ہے اس لیے جو شخص آپ کو آ کر سلام کرتا ہے آپ خود اس کا جواب دیتے ہیں۔ غرض آپ کی اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی قبر میں حیات کا دلائل کے ساتھ ہم کو قطعی علم ہے اور اس بارے میں تواتر کے درجہ کو حدیثیں پہنچ چکی ہیں امام بیہقی نے اس پر ایک مستقل تصنیف لکھی ہے اور اس میں یہ تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح قبض کرنے کے بعد پھر واپس کر دی جاتی ہیں اس لیے وہ شہداء کی طرح اپنے پروردگار کی حضوری میں زندہ رہتے ہیں۔ نیز امام قرطبی سے نقل کیا ہے کہ ان کی موت کا حاصل اتنا سمجھو کہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسا فرشتوں کا۔ ہم نہ ان کا ادراک رکھتے ہیں نہ ان کا۔

(۱۰۷۴) عَن ابنِ مَسعُودٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِکَةً سَیَّاحِینَ فِی الْاَرضِ یُبَلِّغُونِّی عَنْ اُمَّتِی السَّلَامَ.

(اخرجه احمد و النسائی و الحاکم و صححه والبیهقی فی الشعب و البزار و اخرج ابن عدی عن ابن عباس مثله. راجع ترجمان السنة ص ٤٣٦ ج ٢ حدیث نمبر ٨٠٧)

(۱۰۷۴) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ نے کچھ فرشتے مقرر فرما دیئے ہیں جو زمین پر گشت لگاتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام میرے پاس پہنچا دیتے ہیں۔

(احمد' نسائی' مستدرک حاکم' بیہقی' ابن عدی)

(۱۰۷۵) عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ سِرْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ بَیْنَ مَکَّةَ وَ الْمَدِیْنَةِ فَمَرَرْنَا بِوَادٍ فَقَالَ اَیُّ وَادٍ هٰذَا قَالُوْا وَادِی الْاَزْرَقِ قَالَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی فَذَکَرَ مِنْ لَوْنِهٖ وَ شَعْرِهٖ شَیْئًا وَ اضِعًا اِصْبَعَیْهِ فِیْ اُذُنَیْهِ لَهٗ جُوَارٌ اِلَی اللّٰهِ بِالتَّلْبِیَةِ

(۱۰۷۵) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے پوچھا اس وادی کا کیا نام ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یہ "وادی ازرق" ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں اپنی آنکھوں سے یہاں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ فرما کہ آپ نے ان کا رنگ اور بالوں کا کچھ نقشہ بیان فرمایا کہ وہ اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں دیئے ہوئے ہیں اور اپنے رب کے نام کا تلبیہ زور زور سے پڑھتے

(۱۰۷۴) * جو لوگ خود حاضر ہو کر آپؐ پر درود و سلام پیش کرتے ہیں وہ تو آپؐ بنفس نفیس خود سنتے ہیں اور جو دور سے درود و سلام پڑھتے ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے معین فرما دیئے ہیں وہ اس کو آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہی طریقہ دنیا میں ہے اپنی موجودگی میں سلام کی سنت آپؐ خود ادا کرتے ہیں اور غائب ہو کر کسی دوسرے شخص کی معرفت اپنا سلام بھیجتے ہیں۔ چونکہ وفات کے بعد یہ طریقہ قائم نہیں رہ سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے اس خدمت کے لیے یہاں ملائکۃ اللہ مقرر فرما دیئے ہیں جو اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ اگر انبیاء علیہم السلام میں آثار حیات نہیں تو پھر یہ کس لیے ہوتا ہے اور اگر یہاں حضور و غیبت کا کچھ فرق نہیں تو پھر فرشتوں کا یہ تقرر کس لیے ہے۔ اس لیے نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی حیات کو عام لوگوں کی حیات کے برابر سمجھا جائے اور نہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اتنے مبالغہ کی ضرورت ہے کہ العیاذ باللہ حاضر و ناظر کی صفت ان کے لیے ثابت کر دی جائے۔ دین میں افراط و تفریط کی گنجائش کہیں نہیں اعتدال کا راستہ یہی صراط مستقیم ہے۔ فاتبعوہ۔ اس جگہ ترجمان السنہ ص ۴۳۷ ج ۲ حدیث نمبر ۸۰۷ کا تشریحی نوٹ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱۰۷۵) * ان احادیث صحیحہ سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع کیا ہوتی ہے۔ ان کی موت کیا عام بشر ہی کی موت کی طرح ہے یا جس طرح وہ بحالت حیات حج و نماز میں مشغول رہا کرتے تھے اسی طرح وہ اپنی وفات کے بعد بھی ان میں مشغول رہتے ہیں پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ بالکل بیداری کا ایک مشاہدہ تھا اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مبارک ہستیوں کو دیکھا تھا۔ لہٰذا یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا بحالت بیداری بھی مشاہدہ ہو سکتا ہے اس بناء پر اگر اولیاء کرام اپنی بیداری کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نقل کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کا انکار کر دیں۔ جن علماء نے بحالت بیداری آپؐ کے مشاہدہ کا انکار کر دیا ہے ہماری رائے یہاں ان کے ساتھ متفق نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل آئندہ مذکور ہو گی۔

مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِیْ قَالَ ثُمَّ سِرْنَا حَتّٰی اَتَیْنَا عَلٰی ثَنِیَّةٍ قَالَ اَیُّ ثَنِیَّةٍ هٰذِهٖ قَالُوْا هَرْشٰی اَوْ لِفْتٌ فَقَالَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی یُوْنُسَ عَلٰی نَاقَةٍ حُمْرَاءَ عَلَیْهِ جُبَّةُ صُوْفٍ خِطَامُ نَاقَتِهٖ خُلْبَةٌ مَارًّا بِهٰذَا لْوَادِیْ مُلَبِّیًا. (رواہ مسلم)

ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں- راوی بیان کرتا ہے پھر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک گھاٹی اور آئی آپ نے پوچھا اس گھاٹی کا کیا نام ہے لوگوں نے عرض کیا یہ ''ہرشیٰ'' ہے یا ''لفت'' کہا- آپ نے فرمایا گویا میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یونسؑ ایک سرخ اونٹنی پر ہیں ان کا جبہ اون کا ہے اور اس اونٹنی کی مہار درخت کی چھال کی ہے وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے اس وادی سے گذر رہے ہیں- (مسلم شریف)

(۱۰۷۶) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ حَجَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اَتٰی وَادِیْ عُسْفَانَ قَالَ یَا اَبَا بَکْرٍ اَیُّ وَادٍ هٰذَا قَالَ هٰذَ اوَادِیْ عُسْفَانَ قَالَ لَقَدْ مَرَّ بِهٰذَا الْوَادِیْ نُوْحٌ وَ هُوْدٌ وَ اِبْرَاهِیْمُ عَلٰی بَکَرَاتٍ لَهُمْ حُمْرٍ خُطُمُهُمُ اللِّیْفُ اُزُرُهُمُ الْعَبَاءُ وَ لَدِیْتُهُمُ النِّمَارُ یَحُجُّوْنَ الْبَیْتَ الْعَتِیْقَ. (رواه الحافظ ابو یعلی) قال الحافظ ابن کثیر فی

(۱۰۷۶) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وادی عسفان میں پہنچے تو فرمایا ابوبکر! اس وادی کا کیا نام ہے؟ انہوں نے عرض کی اس کا نام وادی عسفان ہے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وادی سے حضرت نوح علیہ السلام ہود علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام گزرے جو سرخ اونٹوں پر سوار تھے ان کی مہاریں کھجور کی چھال کی ان کی لنگیاں' عباء' اور ان کی چادریں اون کی تھیں' خدا تعالیٰ کے قدیم بیت کا طواف کرنے جا رہے تھے-

(ابو یعلی والطبرانی ومسند امام احمد)

البدایة فیه غرابة ج ۱ ص ۱۱۹ و اخرجه عن مسند الامام احمد عن ابن عباس بنحوه و فیه ذکر هود و صالح علیهما السلام و لیس فیه ذکر نوح و ابراهیم علیهما السلام و قال هذا اسناد حسن کما فی البدایة ج ۱ ص ۱۳۸)

(۱۰۷۷) عَنْ سَعِیْدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ قَالَ لَمَّا کَانَ اَیَّامَ الْحَرَّةِ لَمْ یُؤَذَّنْ فِیْ مَسْجِدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثًا وَ لَمْ یَقُمْ وَ لَمْ یَبْرَحْ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیِّبِ الْمَسْجِدَ وَ کَانَ لَا یَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلٰوةِ اِلَّا بِهَمْهَمَةٍ یَسْمَعُهَا مِنْ قَبْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ. (رواه الدارمی)

(۱۰۷۷) سعید بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ جب حرہ کا واقعہ پیش آیا ہے تو تین دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں اذان نہیں دی گئی اور سعید بن مسیّب ان ایام میں بھی مسجد سے نہیں نکلے اور نماز کے اوقات صرف ایک گنگناہٹ کی آواز سے پہچانا کرتے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے سنا کرتے تھے-

(الدارمی شریف)

(۱۰۷۸) عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ قَالَ لَمْ اَزَلْ اَسْمَعُ الْاَذَانَ وَ الْاِقَامَةَ فِیْ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیَّامَ الْحَرَّةِ حَتّٰی عَادَ النَّاسِ. (کذا فی الخصائص ص ۲۸۱ ج ۲)

(۱۰۷۸) سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ جنگ حرہ کے زمانہ میں اذان اور اقامت ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے سنا کرتا تھا یہاں تک کہ لوگ پھر جماعت میں آنے لگے تھے-

(خصائص الکبریٰ)

(۱۰۷۹) عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنِيْ لَيَالِيَ الْحَرَّةِ وَ مَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرِيْ وَ مَايَأْتِيْ وَقْتُ صَلٰوةٍ اِلَّا سَمِعْتُ الْاَذَانَ مِنَ الْقَبْرِ.

(رواه ابو نعيم كذافي الخصائص ج ۲۸۰ ج ۲)

(۱۰۷۹) سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ جنگ حرہ کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد شریف میں میرے سواء اور کوئی نہ تھا جب نماز کا وقت آتا تو میں ہر نماز کے لیے قبر مبارک سے اذان کی آواز سنا کرتا۔

(ابونعیم)

(۱۰۸۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ. (رواه مسلم)

(۱۰۸۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔

(مسلم)

(۱۰۷۹) * جنگ حرہ کا واقعہ تاریخی واقعہ ہے۔ حدیثوں میں اس کے متعلق پہلے پیشگوئی موجود تھی۔ جس طرح اس کی ہولناکی کا نقشہ حدیثوں میں کھینچا گیا تھا اپنے وقت پر ٹھیک وہ اسی طرح نکلا۔ جہاں مخلوق خدا کا خون پانی کی طرح بہا بہا پھر رہا ہو وہاں مسجد شریف میں حاضری کی ہمت کسے تھی مگر سعید بن المسیب خود بھی اور سعید بن عبدالعزیز بھی ان کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ یہ مرد خدا اس حالت میں بھی مسجد شریف سے جدا نہ رہے اور برابر نمازیں اپنے وقت پر وہیں ادا کرتے رہے۔ یہاں یہ سوال طبعًا پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں نماز کے اوقات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا تھا۔ یہ صاحب واقعہ کا خود اپنا بیان ہے کہ وہ قبر مبارک سے اذان سنا کرتے تھے اور اسی پر اپنی نماز ادا کر لیتے تھے۔ کئی دن تک مسلسل ٹھیک اوقات پر اذان کی آواز سننا اور امن کے بعد پھر فوراً اس آواز کا منقطع ہو جانا یہ کسی وہم وخیال پر مبنی نہیں ہوسکتا۔

(۱۰۸۰) * اس حدیث کی شرح میں مختلف اقوال ہیں لیکن سب سے صحیح بات وہ ہوگی جس کی واقعات بھی شہادت دیں۔ کتاب الدعوات اور کتاب الاذکار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیل ونہار میں جتنے مختلف جدا ہوتے پیش ہوتی تو جدا ہوتے' قضاء حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو تعوذ کے خاص کلمات پڑھتے اور جب فارغ ہوکر باہر تشریف لاتے تو خاص انداز کا شکر ادا فرماتے۔ اسی طرح کھانے پینے' سونے جاگنے' گھر میں داخل ہونے اور گھر سے نکلنے غرض کہ انسانی زندگی کے جتنے مختلف شعبے ہیں سب کے متعلق آپ کے مقدس کلمات حدیثوں میں مدون موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی شریعت میں ایک باب ایسا بھی ملتا ہے کہ اگر انسان اس پر مداومت کے ساتھ عمل پیرا رہے تو اس کی نیند بھی عبادت میں شمار ہو جاتی ہے پھر کچھ کلمات ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کو پڑھ لیا جائے تو اگر مخصوص اوقات کے اذکار کی ادائیگی میں غفلت ہو جائے تو ان کے پڑھنے سے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی تمام زندگی گویا ذکر اللہ ہی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک حالت میں بھی گو آپ کی زبان مبارک سے مختلف اذکار ثابت ہوتے ہیں مگر بظاہر حدیث کی مراد وہی مختلف حالات ہیں جو انسانی زندگی میں مختلف طور پر پیش آتے ہیں۔ اہل جنت کی جنت میں یہی صفت ہوگی۔ وہ بھی ہمہ وقت خدا تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں مشغول رہیں گے۔ انبیاء علیہم السلام میں دوام ذکر کی یہ صفت اسی عالم میں موجود ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی امت کو بھی اس صفت کے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ میں انسان کے ان ہی مختلف اوقات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ حدیث مذکور اسی قسم کی آیتوں کی شرح سمجھنی چاہیے۔

منهَا ما يتعلقُ بفضُلا تهم عليهم الصلوة و السّلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی فضلات میں اہل جنت سے مشابہت

(۱۰۸۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرَاکَ تَدْخُلُ

(۱۰۸۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھا کرتی ہوں کہ آپ

(۱۰۸۱) * انسانی فضلات میں اس کے بول و براز کا درجہ سب سے گرا ہوا ہے مگر اس میں بھی انسانی غذاء اور اس کی جسمانی صحت کے فرق سے کیفیات کا بلکہ مقدار کا بھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اس بشری صنف سے مستثنیٰ نہیں ہوتے مگر چونکہ ان کے جسمانی خواص عام انسانوں سے کہیں بالاتر ہوتے ہیں' چنانچہ ان کے جسم اور جسم کا پسینہ خوشبودار ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے' اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے یہ فضلات بھی بعض احکام میں عام انسانوں سے ممتاز ہوں۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضلات کو زمین فوراً جذب کر لیتی تھی۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے اگر کہیں غذاء کی مادیت حائل نہ ہو جاتی تو یہ بھی ممکن تھا کہ اہل جنت کی طرح آپ کی غذاؤں کا فضلہ بھی محض پسینہ کی راہ سے خارج ہو جاتا۔ شیخ بدرالدین عینی نے صحیح بخاری کی شرح میں حنفیہ کی طرف اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے بعض کبار علماء کی طرف آپؐ کے فضلات کے متعلق طہارت کا قول بھی نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور کا روایتی پہلو گو کمزور ہے مگر یہ مسئلہ کوئی عقائد یا عمل کا مسئلہ تو نہیں جس کے متعلق اعلیٰ درجہ کی صحت درکار ہو صرف ایک فضیلت کا باب ہے اور وہ بھی زندگی کے ایک ایسے شعبہ سے متعلق ہے جس کی عوام کو اطلاع نہیں ہوسکتی۔ نیز ان امور تبلیغیہ میں داخل بھی نہیں ہے جن کا تعلق امت کے ساتھ وابستہ ہو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذاتی خصوصیت ہے جس پر ایمان لانے کی کسی کو دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص حیات کا کوئی مستور گوشہ ضعیف اسناد کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے تو اسی درجہ میں اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ یہاں اگرچہ ثبوت ضعیف ہے مگر اس کے خلاف کوئی ضعیف سے ضعیف دلیل بھی موجود نہیں ہے نہ اس امر کے تسلیم کر لینے میں کسی عقیدہ پر کوئی زد پڑتی ہے پھر وہ علماء اور محدثین کے درمیان ہمیشہ نقل بھی ہوتا چلا آیا ہے حتیٰ کہ بعض ائمہ اس کے طہارت کے بھی قائل ہو چکے ہیں ان وجوہات کی بناء پر یہاں قطعیت کے ساتھ اس کا انکار کر ڈالنا قطعاً بے احتیاطی ہے۔

جامع ترمذی میں بہت سے ابواب کے تحت ایسی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جن پر امام موصوف نے خود ضعف کا حکم لگایا ہے اگرچہ وہ دوسری کتب حدیث میں اچھی اسانید کے ساتھ بھی مل جاتی ہیں لیکن امام موصوف نے اسی ضعیف اسناد کو ذکر فرما کر اس پر عمل کرنے والے صحابہ و تابعین کے اسماء گرامی کی ایک ایک فہرست پیش کر دی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض مرتبہ حدیث کا اسنادی پہلو کسی خاص سبب کی بناء پر گو ضعیف ہوتا ہے مگر وہاں خارجی قرائن اور متواتر عمل یا دوسری وجوہات کی بناء پر اس کی اصلیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اعلیٰ درجہ کی اسنادی ثبوت نہ ملنے کے باوجود پھر وہ کسی مرتبہ میں معمول بہ رہتی ہے' حتیٰ کہ شیخ ابن ہمامؒ نے باب الصلوٰۃ علی المیت کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ الاستحباب يثبت بالحديث الضعيف غير الموضوع (ص ۶۴ ج ۲ فتح القدیر) یعنی اگر حدیث موضوع نہ ہو تو بھی ضعیف حدیث سے بھی استحباب ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دلیل اگر ضعیف ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی ضعیف ہی رہتا ہے.....

الْخَلاءَ ثُمَّ يَجِیُٔ الَّذِیْ بَعْدَکَ فَلایَرٰی لِمَا یَخْرُجُ مِنْکَ اَثَرًا فَقَالَ یَا عَائِشَۃُ اَمَا عَلِمْتِ

صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں تشریف لے جاتے ہیں پھر وہاں سے واپس آتے ہیں اس کے بعد جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاتا ہے وہ آپ

ﷺ ..... ہے' فرائض اور واجبات اس سے ثابت نہیں ہو سکتے یہ بھی اس وقت جب کہ خارجی قرائن اس کی تائید میں ہوں' لیکن اگر خارجی قرائن ساتھ نہ دیں اور ضعف بھی شدید ہو تو پھر وہ حدیث معطل ہو جاتی ہے' یعنی اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا' اور اگر اس کے خلاف ثبوت موجود ہے تو پھر اس کو رد بھی کیا جا سکتا ہے- حافظ ابن القیمؒ نے امام احمدؒ کے فقہ کی ایک اصل ہی حدیث ضعیف پر عمل کرنا قرار دی ہے بشرطیکہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری حدیث نہ ہو' اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک بھی یہی قرار دیا ہے- دیکھو اعلام الموافقین -ص ۲۵ ج ۱-[۱]

مزید وضاحت کے لیے ہم آپ کے سامنے بعض مسائل پیش کرتے ہیں جن میں نقل کی بہت قلت نظر آتی ہے- مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے مسائل چونکہ یہ مسائل بھی وقتی اور خاص آپ کی ذات سے متعلق تھے ادھر جہاد کے معرکہ ہمہ وقت گرم رہا کرتے تھے ان سے فرصت ملی تو تازہ تازہ احکام اتر رہے تھے اس لیے عام صحابہؓ کے افکار اس طرف متوجہ نہ ہو سکے جب یہ حادثہ جانکاہ رونما ہوا تو اب آپؐ کے غسل' صلوٰۃ جنازہ' اور دفن کے خصوصی مسائل سامنے آ گئے آخر رفیق غار صدیق اکبرؓ نے اس طرف راہبری کی اور فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دفن کے لیے سب سے پسندیدہ مقام وہی ہوتا ہے جہاں ان کی وفات ہوتی ہے- کسی بحث کے بغیر سب نے فوراً اسی وقت اس پر عمل کر لیا اور کسی نے خلاف کی ایک آواز بھی نہیں نکالی- اسی طرح ایک غیبی آواز پر غسل کے وقت آپ کی قمیص جسم اطہر سے نہیں اتاری گئی اور قبر کی نوعیت کا فیصلہ بھی قدرت کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ جب لحد کھودنے والا شخص پہلے آ گیا تو سب کی رائے یہی قائم ہوگئی کہ آپؐ کے حق میں قدرت کو لحد ہی پسند ہے- اس کے برخلاف وہ مسائل تھے جن کا تعلق عام امت کے ساتھ تھا وہاں خوب گرم و نرم بحثیں ہوتیں اور جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا تو ہر شخص اپنی رائے پر مختار چھوڑ دیا جاتا یہی راز تھا کہ مسائل صلوٰۃ اس نقد و تبصرہ کے باوجود بعض جگہ مختلف فیہا باقی چلے جاتے ہیں-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضلات کا مسئلہ تو آپؐ کی ان خصوصیات میں سے تھا جس کا امت کے ساتھ کسی لحاظ سے بھی کوئی تعلق نہ تھا- اگر حضرت عائشہؓ اپنی فطری ذہانت اور دانائی کی بناء پر اس طرف توجہ نہ فرماتیں تو شاید آپؐ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کسی ضعیف حدیث میں بھی آپ کے سامنے نہ آتا- آپؐ کے سایہ نہ ہونے کا مسئلہ اس سے ذرا مختلف ہے کیونکہ یہ ہمہ وقت سب کی آنکھوں کے سامنے تھا- عقل یہ باور نہیں کرتی کہ اگر صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی اس فضیلت کو ہمہ وقت اپنی آنکھوں کے سامنے درخشاں دیکھا ہوتا تو وہ اس کے بیان سے سکوت اختیار کر سکتے تھے یقیناً وہ بھی آپ کے جسم اور آپ کے پسینہ کی خوشبو کی طرح روایات و حکایات میں مہک اٹھتا- آپ کے قد و قامت کی غیر معمولی صفت بھی چونکہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھی اس لیے عام طور پر یہ چرچا رہا کرتا تھا کہ رسول خدا صلی ﷺ .....

---

[۱] الاصل الرابع الاخذ بالمرسل و الحدیث الضعیف اذالم یکن فی الباب شیء یدفعه و هوالذی رجحه علی القیاس و لیس المراد بالضعیف الباطل و لا المنکر و لا فی روایة من هو مهتم بحیث لایسوغ الذهاب الیه و لیس احد من الائمة الاوهو موافقه علی هذا الاصل. اعلام الموقعین (اعلام الموافقین) ج اص ۲۵ و ج اص ۲۶ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ نے اور ان کی اتباع میں بعض علماء نے جو تاویل کی ہے اس کی تصدیق خود امام احمدؒ کے مسند سے نہیں ہوتی اس لیے ہمارے نزدیک امام کے مختار کی وہ تاویل قرار نہیں دی جا سکتی ہاں خود ان کا اپنا مسلک وہ ہو تو ہو-

صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلہ کا کوئی نشان تک نہیں پاتا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عائشہ! کیا تم نہیں جانتیں اللہ تعالی نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ اَنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْاَرْضَ اَنْ تَبْتَلِعَ مَا خَرَجَ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ. (رواہ السیوطی فی الخصائص

ﷺ ..... اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بھی کتنی عجیب ہے کہ جب تنہا ہوتے ہیں تو نہایت میانہ قد نظر آتے ہیں اور جہاں مجمع میں آ گئے تو یوں معلوم ہونے لگا کہ سب سے دراز قامت آپ ہی ہیں - آپ کے بول و براز کا معاملہ ایسا نہیں ہے اس لیے اگر محدثین اس کو نقل کرتے ہیں تو اس کو مان لینا آپؐ کی محبت کا تقاضا ہونا چاہیے - اس کا بلند آہنگی سے انکار آپؐ کی محدثی کا ثبوت تو نہیں مگر آپؐ کی بے عملی کا ثبوت ضرور ہے -

اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک بہت مفید تنبیہ فرمائی ہے جو اس قسم کے مواضع میں محدثین کا نظریہ سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے:

الخبر ان قام دلیل علی صدقه او کذبه و الابقی ممالم تصدقه و لم نکذبه و اهل العلم بالحدیث اذقالوا هذا الحدیث رواً فلان و هو مجروح او ضعیف اوسئی الحفظ او ممن لاتقبل روایته و نحو ذلک فهو کقول القائل هذا الشاهد مجروح اوسئی الحفظ او ممالم تقبل شهادته و هذا یفیدانه لا یحکم به و لا یفید الحکم بانه کاذب بل قد یمکن انه صادق فلا یقال انه کاذب الابحجة و ان قالوا فی الحدیث انه ضعیف فهذا مراد هم هے انه لم یثبت و لا یحتج به و لا یجوز الحکم بصدقه لیس مراد هم انه بمجرد ذلک یحکم بکذب الناقل و ینفی انقله و یقول ان هذالم یکن من غیر علم منا بهذا النفی بل ان قام دلیل علٰی انتفاء اخبربه حکمنا بذلک والا سکتنا لم تنفه و لم متبته فهذا اصل یجب معرفته فان کثیراً من الناس لایمیز بین ماینفیه لقیام الدلیل علی نفسیه وسیں مالم شیبة لعدم دلیل اثباته بل ترون نیفون ما لم یعلموا اثباته فیکونون قد نفوا مالیس لهم به علم و قالوا بافوا ههم مالیس لهم به علم. (الجواب الصحیح ص ۲۹٦ ج ٤)

کسی خبر کے صدق و کذب کا اگر ثبوت مل جائے جب تو اس پر صادق یا کاذب ہونے کا حکم لگا دینا صحیح ہے ورنہ ہم اس کی نہ تصدیق کریں گے نہ تکذیب - محدثین جب کسی حدیث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کو فلاں شخص نے روایت کیا ہے اور وہ مجروح یا ضعیف ہے تو اس کا مطلب ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کوئی شخص یہ کہے کہ یہ شاید مجروح یا ضعیف ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس جرح کی وجہ سے اس پر کاذب ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ نفس الامر میں صادق ہو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کو صادق نہیں کہا جائے گا اور بس اب رہا یہ کہ اس کو کاذب بھی کہہ دیا جائے تو یہ حکم کسی دلیل کے بغیر لگانا صحیح نہیں ہے - ایسا ہی جب کسی حدیث کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے تو ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اس پر صدق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اس کی یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ بس صرف اتنی بات سے اس کے راوی پر کذب کا حکم لگا دیا جائے یا جو مضمون اس نے نقل کیا ہے اس کی نفی کر دی جائے اگر چہ اس کی نفی کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل بھی نہ ہو - لہٰذا اس قسم کے مقامات پر ہم سکوت کریں گے نہ اس کا اثبات کریں گے اور نہ نفی - اس قاعدہ کو یاد رکھنا اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ بہت سے لوگ کسی بات کی مدلل نفی کرنے میں اور بے دلیل بات پر ثبوت کا حکم نہ لگانے میں کوئی فرق ہی نہیں کرتے اور ہر ایسی بات کی نفی کر ڈالتے ہیں جس کا ثبوت ان کے علم میں نہیں ہوتا اور لَا تَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ کا خلاف کرتے ہیں -

ثم قال و ما کان من الامور مستلزمًا لوازم لو کان موجودًا فانه یستدل بانتفاء الازم علی انتفاء الملزوم ﷺ .....

الکبریٰ من سبع طرق و قال ھذا من انبیاء علیہم السلام کے خارج شدہ فضلہ کو جذب کر لے-
اقولھاو نقل عن ابن دحیۃ انہ سند ثابت و فی طرقہ انا معاشر الانبیاء تنبت اجسادنا علی ارواح اھل الجنۃ
واعلم ان الحدیث الضعیف اذالم یکن مخالفا لنص او حدیث صحیح او عقیدۃ مجمعۃ علیہا

ﷲ ..... کا لامور التی لو کانت موجودۃ لوجب ان ینقل نقلاً متواتراً شائعًا کما لو قال قائل انہ بنی بین العراق و الشام مدینۃ اعظم من بغداد و الموصل ... و نحو ذلک فانہ یعلم کذبہ فان ھذا مما تتوفر ھمم الناس علی نقلہ لو کان موجودًا. (الجواب الصحیح ص ۲۹۷ ج ٤)
اس کے بعد لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ موجود ہوں تو یقینی طور پر ان کے یہ لوازم ہوں گے اس قسم کے مقام پر اگر یہ لوازم موجود نظر نہ آئیں تو ملزوم کے نہ ہونے کا بھی حکم لگانا صحیح ہوگا- مثلاً اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ عراق اور شام کے درمیان بغداد اور موصل سے بھی بڑا ایک اور شہر ہے اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً لوگ اس کو نقل کرتے اس کے باوجود جب ایک شخص بھی ان دونوں شہروں کے درمیان اتنی بڑی بستی کا وجود بیان نہیں کرتا تو اس کے غلط کا حکم لگا دینا بالکل صحیح ہے-
ثم قال... ثم ھذہ اللوازم منھا جلی و منھا خفی یعرفہ الخاصتہ فلمذا کان اھل العلم باحوال الرسول بقطون بکذب احادیث لا بقطع غیر ھم بکذبھا لعلمم بلوازم تلک الاحادیث و انتفاء لوازمھا.... و ھکذا یعلمون ان فلانا اخطاء فی ھذا الحدیث علی فلان لانھم قد علموا من وجوہ ثابتۃ ان ذلک الحدیث انما رواہ علی صورۃ معینۃ فاذا روی غیر الثقۃ ماینا قض ذلک علموا بطلان ذلک و انہ اخطاء او تعمد الکذب. (ص ۲۹۸ و ۲۹۹ ج ٤)
پھر لکھتے ہیں کہ یہ لوازم کبھی تو بالکل واضح ہوتے ہیں اور کبھی دقیق ہوتے ہیں جن کو خاص خاص لوگ ہی جانتے ہیں ہر شخص ان کو نہیں جانتا- یہی وجہ ہے کہ بعض حدیثوں پر محدثین تو قطعی طور پر کذب کا حکم لگا دیتے ہیں مگر جو ان دقیق لوازم کو نہیں پہچانتا وہ یہاں قطعی حکم نہیں لگاتا.....اسی طرح محدثین یہ بھی جانتے ہیں کہ اس حدیث میں فلاں شخص نے فلاں موقعہ میں غلطی کی ہے کیونکہ ان کو مستند طریقوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث دراصل اس خاص صورت پر روایت کی گئی ہے لہٰذا جب کوئی غیر ثقہ راوی اس کے خلاف روایت کرتا ہے تو وہ اس کے بطلان کا حکم لگا دیتے ہیں-
فالصدق لہ دلائل مستلزمۃ لہ تدل علی الصدق و الکذب لہ دلائل مستلزمۃ لہ تدل علی الکذب.... و ما لم یعلم صدقہ و لا کذبہ و لا ثبوتہ و لا انتفاۂ و فانہ یجب الامساک عنہ و یقول القائل ھذا لم اعلمہ و لم یثبت عندی و لا اجزم بہ و لا احکم بہ و لا استدل بہ و لا احتج بہ و لا ابنی علیہ مذھبی و اعتقادی و عملی و نحو ذلک. لا یقول ھذا اقطع بکذبہ و انتفائہ... فالقطع بجھل مشبتہ المعتقدلہ غیر القطع بانتفائہ فمن قطع بشیء بلا دلیل یوجب القطع قطعنا بجھلہ و ضلالہ و خطأہ. (الجواب الصحیح ص ۳۰۰ ج ٤)
خلاصہ یہ ہے کہ جس بات کے صدق یا کذب کی دلیل معلوم نہ ہو اس کے متعلق بس اتنا ہی کہنا مناسب ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا یا میرے علم میں یہ بات ثابت نہیں ہوئی یا مجھے اس بات کا یقین نہیں- وغیرہ وغیرہ- یہ کہنا کہ مجھے اس کے ثبوت کا یقین حاصل نہیں ہوسکا اور بات ہے اور یہ کہنا کہ اس کے نہ ہونے کا مجھ کو یقین حاصل ہے بالکل اور بات ہے- لہٰذا جو شخص دلیل کے بغیر کسی ایک بات کا حکم بھی قطعیت کے ساتھ لگائے گا ہم بھی اس پر قطعیت کے ساتھ جہل کا حکم لگا دیں گے- ﷲ .....

ولم يكن يتعلق بامر كثير الوقوع و يكون من خصوص الاحوال التى لا يطلع عليها احدفانه لا حيلة لردها سيما اذا كان من باب الفضائل و المزايا اللازمة)

ﷺ ..... لايجوز للانسان ان نيفى علم غيره و قطع غيره من غير علم منه بالاسباب التى يعلم بهاو يخبر فانه كثير اما يكون للانسان دلائل كثيرة تدل علٰى صدق شخص معين و ثبوت امر معين و ان كان غيره لا يعرف شيئا من تلك الدلائل و هذا ايضًا مما يغلط فيه كثير من الناس نيظرون فى انفسهم و مبلغ علمهم فاذا لم يجدوا عندهم ما يوجب العلم بذلك الامر جعلوا غير هم كذلك من غير علم منهبانتفاء اسباب العلم عند ذلك الغير و قد يقيمون حججًا صفيفة على ان غير هم لا يعلم ذلك مثّل ما يفعله كثير من الناس بالنظر و الاستدلال و الاعتبار و من لم يساويهم فى نظر هم و ادلتهم و قوة اذهانهم لا يعلم ما علموه' و كثير من الناس يعلم بالاخبار و النقل و الا ستدلال بذلك امورًا كثيرة و من لم يشار كهم فيما سمعوه و فيما عرفوه من احوال المجزين و المخبربه و كمال معرفتهم بذلك لا يعلم ما علموه فلهذاكان لاهل النظر العقلى طرق لايعرفها اهل الاخبار ولاهل الاخبار السمعية طرق لاتعرف بمجرد العقول و لهذا كان لهولاء من الطرق الدالة على صدق الرسول و نبوته و الاستدلال على ذلكؔ امور كثيرة لايعرفها اهل الحديث و الآثار و عند هؤلاء من الاحديث المتواترة عند هم و الآثار المستفيضه عندهم ما يعلمون بها صدق الرسول و ان كان اولئک لا يعرفونهابل طرق معرفة الصانع و تصديق رسوله قد يكون لكل قوم منها طريق او طرق لا يعلمها آخر ون وهم مشتركون فى الاقرار باللّٰه و رسوله..... بل ماتواتر عندهم من احوال الرسول قد يكون المخبرون لهٰؤلاء الذين تواتر عندهم ما اخبروهم به من آياته و شرائعه غير المخبرين لاولئک كما كان الصحابة المخبرون لاهل الشام بآيات الرسول و بالقران و شرائع الاسلام غير الصحابة المخبرين لاهل العراق و لكن خبر هؤلاء يصدق هؤلاء و ان كان كل من الطائفتين لايعلم اعيان اولئک الذين اخبروا اولئک و عامة ما يعلمه الناس بالحس هو من هذا الباب فان الانسان يحس باحوال نفسه من جوعه و عطشه و شبعه و ريه و جسد بغضه و شهوته و نفرته و المه و لذته بل يحس باعضائه كبطنه و فرجه و لا يحس باحوال غيره و لكن يشتركان فى الجنس العام خيشتر كون فى جنس الاحساس بجوعهم و شبعهم. (ص ۳۰۲ و ۳۰۳ الجواب الصحيح جلد ٤)

اسی طرح یہ بات بھی کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ جب تک اس کو ان اسباب کا علم حاصل نہ ہو جائے جن سے کہ وہ خبر معلوم ہوئی ہے تو وہ دوسرے شخص کے علم کی نفی کر ڈالے- کیونکہ بسا اوقات کسی بات کے ثبوت کے لیے ایک شخص کے پاس بہت سے دلائل موجود ہوتے ہیں جن کو دوسرا شخص نہیں جانتا یہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ بہت سے لوگوں کو جب خود ان اسباب کا علم نہیں ہوتا تو جس کو ان اسباب کا علم ہوتا ہے وہ اس کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اتنی بات معلوم کر لیں کہ اس خبر کے معلوم ہونے کے جو ذرائع اور اسباب ہیں وہ اس شخص کو معلوم ہیں یا نہیں- اگر معلوم ہیں تو اس کو لاعلم سمجھنا کیونکر صحیح ہے چنانچہ بہت سے لوگوں کو دنیا کے واقعات اور اس کے بیان کرنے والوں کے وہ حالات معلوم نہیں ہوتے جو مؤرخین کو معلوم ہوتے ہیں- اس کی وجہ یہی ہے کہ ان واقعات کے علم کے جو اسباب ہیں ان کو مؤرخ تو جانتا ہے اور یہ نہیں جانتے اور جب ان اسباب ہی کو نہیں جانتے تو پھر ان کو ان واقعات کا علم کیونکر ہو سکتا ہے- یہی وجہ ہے کہ ﷺ .....

(۱۰۸۲) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ اَسِيْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُدْنُ مِنِّىْ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَمَا شَمَمْتُ مِسْكًا وَ لَا عَنْبَرًا اَطْيَبَ مِنْ رِيْحِ رَسُوْلِ اللّٰهِ. (رواه البزار كما في الخصائص. و اخرج الشيخان نحوه)

(۱۰۸۲) معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا میرے قریب آنا میں قریب گیا تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی خوشبو نہ تو مشک میں دیکھی نہ عنبر میں۔

(بزار)

(۱۰۸۳) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيْقًا فَيَتْبَعُهُ اَحَدٌ اِلَّا عَرَفَ اَنَّهُ قَدْ سَلَكَهُ مِنْ طِيْبِ عَرْفِهِ اَوْقَالَ مِنْ رِيْحِ عَرَقِهِ. (رواه الدارمی)

(۱۰۸۳) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستہ پر جاتے پھر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص اسی راستہ پر جاتا تو وہ ضرور پہچان لیتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر اس طرف سے ہوا ہے کیونکہ آپ کی خوشبو سے راستہ مہکا ہوا ہوتا تھا۔ (دارمی)

للہ ..... اہل نظر وعقل کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کو مؤرخ نہیں جانتا اور محدثین کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کا علم صرف عقل سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہذا صداقت رسول کے بہت سے وہ دلائل جو اہل نظر کو معلوم ہوتے ہیں ان کا اہل حدیث کو کوئی علم نہیں ہوتا بہت سے ایسے واقعات جو اہل حدیث کے نزدیک تواتر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں جن سے کہ صداقت رسول ثابت ہوتی ہے ان کا اہل نظر کو کوئی علم نہیں ہوتا' یہاں کسی فریق کے لیے بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ ان دلائل اور اسباب کے علم کے بغیر وہ اس خبر کا انکار کر ڈالے گاہ گاہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسول کے ان احوال متواترہ کے بیان کرنے والے مختلف جماعتوں کے سامنے مختلف لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ وہ صحابہ جو اہل الشام کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور قرآن کریم اور دینی احکام کے ناقل تھے اور تھے اور وہ جو اہل عراق کے سامنے ناقل تھے اور تھے لیکن پھر ان دونوں جماعتوں کے بیانات ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے مصدق تھے اگرچہ ان میں ایک جماعت کو دوسری جماعت کا کوئی علم نہ تھا۔ یہاں ان راویوں کا صرف کسی خبر میں مشترک ہونا کافی سمجھا جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس خبر کا بیان کرنے والا ایک ہی گروہ ہو تمام حیات و وجدانیات کا حال یہی ہے ایک انسان اپنے حالات مثلاً بھوک' پیاس' محبت' عداوت اور تکلیف ولذت وغیرہ کا خود تو احساس رکھتا ہے مگر دوسروں کے ان حالات کا احساس نہیں رکھتا لیکن چونکہ وہ جنس عام میں ان کا شریک ہوتا ہے لہٰذا وہ دوسروں کے متعلق بھی یہ حکم لگا دیتا ہے کہ ان کو بھی ہماری طرح ان حالات کا احساس ہوتا ہے۔

(۱۰۸۲) * حضرت معاذ بن جبلؓ یہاں آپ کے پسینہ کی ایک خصوصیت بیان فرما رہے ہیں اور اس کو جس انداز سے نقل فرما رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف ان کی حسن عقیدت کی بات نہ تھی بلکہ سرتاسر حقیقت تھی۔ آپ کے اس عطر بیز پسینہ کا راوی ایک صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اور صحابہ بھی ہیں پھر ہر ایک نے اس کو مختلف صورتوں اور مختلف محل پر اس طرح نقل کیا ہے جس سے آپ کے فضلات کی برتری کا اعتراف کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے اس کی چند مثالیں ذیل کی احادیث میں آپ کے سامنے ہیں۔

(۱۰۸۳) * دیکھئے یہاں راوی معاذؓ کی بجائے حضرت جابرؓ ہیں اور وہ آپ کی اس خوشبو کا حال استدلالی رنگ میں بیان فرما رہے ہیں اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ اس میں کسی خاص یا عام شخص کی کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ آپ کے راستے سے جو شخص بھی گذرتا وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے یہ پہچان لیتا تھا کہ یہ آپ ہی کی مہک ہے۔

کہے دیتی ہے خوشبو جسم و جان کی ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

(۱۰۸۴) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدَنَا فَعَرِقَ وَ جَاءَ تْ اُمِّيْ بِقَارُوْرَةٍ فَجَعَلَتْ تَسْلِتُ الْعَرَقَ فَاسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ مَا هٰذَا الَّذِيْ تَصْنَعِيْنَ قَالَتْ هٰذَا عَرَقٌ نَجْعَلُهُ لِطِيْبِنَا وَ هُوَ اَطْيَبُ الطِّيْبِ. (رواه مسلم وَ فِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرْجُوْ بَرَكَتَهُ لِصِبْيَانِنَا قَالَ اَصَبْتِ.

(و روی البخاری نحوه)

(۱۰۸۴) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور ایسا ہوا کہ دو پہر میں آپ نے ہمارے ہی گھر استراحت فرمائی آپ کو پسینہ آیا تو میری ماں ایک شیشی لائیں اور آپ کا پسینہ پوچھ پوچھ کر اس میں ڈالنے لگیں آپ بیدار ہو گئے اور پوچھا اے ام سلیم یہ کیا کر رہی ہو- انہوں نے عرض کیا یہ آپ کا پسینہ ہم اپنے عطروں میں اس کو ملا لیتے ہیں اور یہ عطر ہمارے یہاں سب سے زیادہ خوشبو دار ہو جاتا ہے- (مسلم شریف) ایک روایت میں اتنا اور ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا ہمیں امید ہے کہ اس کی برکت ہمارے بچوں کو بھی لگ جائے- آپ نے فرمایا تم نے درست کہا-

(۱۰۸۵) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ

(۱۰۸۵) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز اداء کی پھر آپ اپنے گھر کی طرف چلے تو

(۱۰۸۴) * یہ آپ کی خوشبو کے بیان کا تیسرا انداز ہے اور اس سے بہت روشن طریق پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی یہ خوشبو اس لیے نہ تھی کہ آپ خوشبو کا استعمال زیادہ فرمایا کرتے تھے- بلکہ یہ آپ کے ان فضلات کی ہی خوشبو تھی- ظاہر ہے کہ عرب میں جو خوشبوئیں مستعمل تھیں وہ بھی یقیناً بہتر ہی ہوتی ہوں گی مگر ان میں آپ کے پسینہ کے قطروں کو اس جانفشانی سے جمع کر کر کے ڈالنا اور یہ تصریح کرنا کہ ہمارے جس عطر میں آپ کا یہ عطر بیز پسینہ شامل ہو جاتا ہے وہ سب سے مہک دار اور عمدہ سمجھا جاتا ہے اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ راویوں کا یہ بیان صرف حقیقت ہی حقیقت تھا- خلاصہ یہ کہ پسینہ جسم کے ان فضلات میں سے ہے جس میں کہ عام طور پر بدبو ہوتی ہے مگر یہ وہ رسول اعظم تھے جن کا پسینہ بھی عرب کے عطروں کو شرمندہ کرتا تھا-

(۱۰۸۵) * آپ کے پسینہ کی بجائے اس حدیث میں آپؐ کے جسد اطہر کی خوشبو کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک آپؐ کا جسم مبارک معطر نہ ہو اس کا پسینہ کیسے معطر ہو سکتا ہے ان سب راویوں کے ان سب مختلف بیانوں کو سامنے رکھ کر انصاف کیجئے کہ کیا یہاں کسی شاعرانہ مبالغہ آمیزی کا احتمال ہو سکتا ہے یا بات یہ ہے کہ نبی اپنے جسم اور اس کے فضلات میں بھی عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے-

صحیح مسلم میں جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنتی کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی مگر نہ تھوکیں گے اور نہ ان کو پیشاب پاخانہ کی حاجت ہوگی اور نہ وہ ناک صاف کریں گے صحابہؓ نے عرض کی پھر ان کا یہ کھانا پینا کیا ہوگا- آپ نے فرمایا کہ خوشبو دار ڈکار اور مشک بیز پسینہ کی راہ سے خارج ہو جائے گا اور خدا کی تسبیح و تحمید ان کے لیے اس طرح غیر اختیاری ہو جائیں گی جیسا کہ سانس لینا غیر اختیاری فعل ہوتا ہے-

اس حدیث میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی جنت صرف روحانی اور خیالی نہیں اس میں کھانا پینا بھی ہے مگر مادیت کے جو کثیف اور فانی اجزاء دنیا میں ہیں وہ ان میں نہیں- مثلاً تھوک، سنک اور دوسرے گندے اجزاء یہ سب کے سب چونکہ اس کثیف للہ .....

الْاُوْلٰی ثُمَّ خَرَجَ اِلٰی اَھْلِہٖ وَ خَرَجْتُ مَعَہٗ فَاسْتَقْبَلَہٗ وِلْدَانٌ فَجَعَلَ یَمْسَحُ خَدَّیْ اَحَدِھِمْ وَاحِدًا وَاحِدًا وَ اَمَّا اَنَا فَمَسَحَ

میں بھی آپؐ کے ساتھ ہولیا سامنے سے کچھ بچے آ نکلے آپؐ نے ازراہِ محبت ان سب کے ایک ایک رخسار پر ہاتھ پھیرا - جب میرا نمبر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دونوں رخساروں پر ہاتھ پھیرا اس وقت میں نے آپ

للہ ..... مادہ کے خصائص میں سے ہیں اس لیے وہ جنت میں نہ ہوں گے اور نہ ہونے چاہئیں - اس پر صحابہؓ نے نہایت معقول سوال کیا کہ پھر یہ غذائی اجزاء جسم سے کس طرح خارج ہوں گے - معلوم ہوا کہ معقول سوال ان کے دماغوں میں بھی پیدا ہوتے تھے اور ان کا کبھی کبھی وہ حل بھی دریافت کر لیتے تھے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو جواب ان کو ملا وہ کتنا معقول تھا کہ جنت کی غذاء کا تو پوچھنا ہی کیا ہے جب دنیوی غذاؤں کے فرق سے انسانی فضلات کی کثافت اور لطافت بلکہ ان کی کمیت اور مقدار میں بھی فرق ہوسکتا ہے تو آخرت میں اگر فرق ہو تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے - اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ ان کی غذا معطر پسینہ کی شکل سے خارج ہو جایا کرے گی' دوم یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی عبادت دائمی ہوگی اور سانس کی طرح غیر اختیاری بھی ہوگی - انبیاء علیہم السلام میں یہ دونوں صفتیں اسی جہان میں نظر آتی ہیں یعنی ان کے فضلات کا خوشبودار ہونا اور سونے کی حالت میں بھی ان کی قلبی بیداری اور بیداری کے تمام حالات میں ذکر اللہ اور وفات کے بعد بھی عبادات میں مشغولی یہ سب ان کی دائمی صفات ہوتی ہیں علماء حقائق کا خیال ہے کہ مرکزِ حیات ذکر اللہ ہے چونکہ جنتیوں کی حیات دائمی ہوگی اس لیے ان کو اس معنی سے موت نہیں آتی جس سے کہ عام بشر کو آتی ہے - دوام ذکر کے ساتھ موت یعنی عبادت الٰہی سے تعطل کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا - اسی لیے حدیثوں میں انبیاء علیہم السلام کو زندہ کہا گیا ہے اور اس کی حقیقی حیات ہونے کی طرف زندگی کی دو اہم خصوصیات بتا کر تنبیہ کی گئی ہے ایک عبادت اور دوم رزق یعنی وفات کے بعد وہ عبادت بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کو رزق بھی ملتا رہتا ہے - ظاہر ہے کہ رزق روح کی صفت نہیں اس کے لیے جسم کی ضرورت ہے - پس جب کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے تو یقیناً جسم کے ساتھ بھی ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ قائم ہونا چاہیے - مگر جب اس جہان کے رزق کی کیفیت بھی مختلف ہے تو اس کی حیات کی کیفیات بھی ضرور مختلف ہوں گی - اس کو اس جہان کی کیفیات پر قیاس کرنا غلط ہے اس سے زیادہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنی اپنی مقدارِ علم نہ جاننے کی بات ہے - ظاہر ہے کہ اگر ان کی حیات تسلیم کر لی جائے تو اس سے ان کی بشریت کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی بات نہیں نکلتی - کیونکہ جب وہ اس دنیا میں ایک محسوس اور مشاہد حیات کے مالک ہو کر بھی بشر ہی تھے تو وفات کے بعد اگر ان میں آثار حیات ثابت ہوں تو اس غیر محسوس حیات سے اور کیا نئی بات ثابت ہوسکتی ہے - جس جماعت نے انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت کو توحید کے خلاف سمجھ کر ان کو مضمحل بنانے کی سعی کی ہے یہ محض عبث سعی ہے - اگر کسی انسان میں عام بشریت کے خلاف ایک ہزار خصوصیات بھی موجود ہوں تو بھی اس کا مخلوق ہونا ہی ایک ایسا بڑا داغ ہے جو تنہا بارگاہ الوہیت سے اس کو ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے - عیسائیوں نے جب خدائی توحید میں شرک کی آمیزش شروع کی تو قرآن کریم نے ایک ہی کلمہ سے ان کا رد کر دیا یعنی "بل لہ ما فی السمٰوات و الارض" یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابنیت کا عقیدہ اس لیے باطل ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اس کی مملوک ہے اور مملوک ہونے کا ایک ہی عیب ایسا ہے جو ابنیت کی تردید کے لیے کافی ہے - اسی لیے ہمارے فقہاء نے یہاں سے اس مسئلہ کا استنباط فرمایا ہے کہ اگر والد اپنی اولاد کو کسی سے خرید لے تو وہ لڑکا والد کے اختیار کے بغیر خود بخود آزاد ہو جائے گا کیونکہ بیٹا باپ کا مملوک نہیں ہوسکتا - پس جب عیسیٰ علیہ السلام اس کے مملوک ہیں تو ان کو بیٹا کیسے کہا جا سکتا ہے - لہٰذا جب کہ صرف ملکیت کا للہ .....

خَدَّيَّ فَوَجَدْتُ لِيَدِهٖ بَرْدًا اَوْ رِيْحًا كَاَنَّمَا اَخْرَجَهَا مِنْ جُوْنَةِ عَطَّارٍ۔ (رواه مسلم)

صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی خنکی محسوس کی اور اس کی خوشبو سونگھی ایسا مہک رہا تھا جیسا ابھی عطر فروش کے ڈبہ سے نکالا ہے۔ (مسلم)

منها جواز مكثهم فى المسجد جُنبًا

بحالتِ جنابت آپ کے لیے مسجد میں قیام کی اجازت اور اس میں اہل جنت سے ایک مشابہت

(۱۰۸۶) عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱۰۸۶) حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

لـ...... ایک علاقہ ہی توحید کو نکھارنے کے لیے کافی ہے تو مخلوقیت کا داغ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے اس لیے اگر انبیا علیہم السلام کی حیات محدثین کے نزدیک بھی ثابت شدہ حقیقت ہے تو اس کو توحید کے خلاف سمجھنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کو پرورش کرتے کرتے سو طرح کے اور برگ و بار اپنی طرف سے اس پر لگا دینا بھی خطرناک راستہ ہے یہی وجہ ہے کہ سلف اس بحث میں نہیں پڑے۔ نہ اس کے اثبات میں انہوں نے غلو کیا نہ اس کی نفی کا کوئی اہتمام محسوس کیا۔ اس قسم کی مباحث ارباب حقائق نے شروع کیں پھر علماء شریعت نے ان کو نکھارا پھر شدہ شدہ وہ نااہلوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر خطرناک مسائل بن گئے۔ ہم نے بھی گو جا بجا اس پر تنبیہ کی ہے مگر ان کے زیر بحث آ جانے کے بعد اور وہ بھی بدرجہ مجبوری' مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان مسائل میں جس حد تک حدیث نے تفصیل فرمادی ہے اسی پر قناعت کر لینی چاہیے۔ و اللّٰه الموفق۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے اس موضوع پر ''آبِ حیات'' ایک مستقل ضخیم رسالہ لکھا ہے۔ ہم نے اپنی استعداد کے موافق اس کا مطالعہ بھی کیا ہے اور کچھ سمجھا بھی ہے مگر اس کا اقتباس نقل کرنا بھی عوام کے فہم سے بالاتر معلوم ہوا' اس لیے اس کا خلاصہ نقل کرنے سے بھی ہم نے عنان قلم کو روک لیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت علیؓ سے مروی ہے ''حدثوا الناس بما يعرفون اتحبون ان يكذب اللّٰه و رسوله'' (آخر کتاب العلم) یعنی لوگوں کے سامنے بس وہی باتیں بیان کیا کرو جو ان کے اندازۂ فہم کے مناسب ہوں ورنہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ان باتوں کو سمجھیں گے نہیں اور اپنے جہل کی بناء پر اس کی تکذیب کریں گے اور اس طرح خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے بلند علوم کی تکذیب کا باعث تم بنو گے۔ امام بخاریؒ نے اس کی اتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے کہ اس پر مستقل ایک عنوان ہی قائم کر دیا ہے۔ اس زمانہ میں مصنفؒ کی اس احتیاط کی قدر ہوتی ہے۔

(۱۰۸۶) * اس استثناء کی ایک ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ مسجد شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کا مقام ہی تھا ہر وقت آپؐ کی وہاں آمد و رفت رہتی تھی اس لیے آپؐ کے حق میں بحالت جنابت اس میں گزر جانے اور قیام کرنے کی گنجائش بھی دے دی گئی تھی مگر اس گنجائش سے آپؐ نے کتنا فائدہ اٹھایا یہ مشکل سے کوئی واقعہ نکل سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مساجد چونکہ عرف شریعت میں ریاض جنت کہلاتی ہیں اور غالبًا یہ سب ٹکڑے محشر میں جنت ہی میں لے لیے جائیں گے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے جس طرح اہل جنت اپنی ہر حالت میں جنت ہی میں رہیں گے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم میں بھی اس کی اجازت حاصل تھی۔ نہ عام بشر کی دنیا میں یہ صفت ہے نہ ان کو اس حالت میں مسجد میں رہنے کی اجازت ہے۔ رہا حضرت علیؓ کا استثناء تو چونکہ ان کا راستہ بھی اسی طرف سے تھا اس لیے ان کو بھی اس اجازت میں تبعاً داخل کر لیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت آئندہ حدیث کے نوٹ میں آتی ہے۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ لَايَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يُجْنِبَ فِيْ هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرِيْ وَ غَيْرُكَ.
اخرجه الترمذي و البيهقي و البزار عن سعد و ابو يعلى عن عمر بن الخطاب و البيهقي عن ام سلمة.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس مسجد میں میرے اور تمہارے سواء کسی کو جنابت کی حالت میں رہنا درست نہیں ہے۔

(ترمذی۔بیہقی۔ابویعلی۔بزار)

(۱۰۸۷) عَنْ اَبِیْ حَازِمِ الْاَشْجَعِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ مُوْسٰى اَنْ يَّبْنِيَ مَسْجِدًا طَاهِرًا لَايَسْكُنُهُ اِلَّا هُوَ وَ هَارُوْنُ وَ اِنَّهُ اَمَرَنِيْ اَنْ اَبْنِيَ مَسْجِدًا طَاهِرًا لَا يَسْكُنُهُ اِلَّا اَنَا وَ عَلِيٌّ وَ اَبْنَا عَلِيٍّ. (و اخرجه ابن عساكر نحوه عن جابرؓ و ابن عساكر عن ام سلمة و البيهقي عن عائشةؓ كما في الخصائص)

(۱۰۸۷) ابو حازم اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک پاک و صاف مسجد بنائیں جس میں ان کے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو سکونت کا حق نہیں ہوگا اور مجھ کو بھی اس کا حکم دیا ہے کہ میں بھی ایک پاک وصاف مسجد بناؤں اور اس میں بھی میرے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے فرزندان کے علاوہ کوئی اور شخص سکونت کا حق نہیں رکھے گا۔

(ابن عساکر۔بیہقی)

(۱۰۸۷) * اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جائے عبادت اور جائے سکونت ایک ہوسکتی ہے۔ جب فقہاء نے قرآن شریف پڑھنے والے بچوں کو وضوء کیے بغیر قرآن شریف چھونے کی اجازت دے دی تو پھر رسولوں کی ہمہ وقت آمد و رفت کی وجہ سے اگر مسجد کو ان کا بیت سکونت بھی قرار دے دیا جائے تو اس میں اشکال کیا ہے اور کیوں۔ ادھر ترجمان السنہ ص ج امیں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بحق حضرت علیؓ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ تمہاری اور میری وہ نسبت ہے جو حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کے مابین تھی۔ اس نسبت کی حقیقت صرف اسی پر ختم نہیں ہوگئی کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جانشینی کے فرائض انجام دیئے تھے اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی جانشینی کی خدمت انجام دی تھی بلکہ اس کا اثر یہاں تک بھی پھیلا کہ ایک روز مزید خصوصیت جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاصل تھی وہ بھی ان کو نصیب ہوگئی اور اس بناء پر ان کے استثناء میں ایک بڑی حقیقت پنہاں منکشف ہوگئی۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام کے دہن مبارک سے جو تشبیہات بھی نکلتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی لبریز ہوتی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ یہ پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک جزئی واقعہ پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دلشکنی کی تسلی کے لیے ارشاد ہوا ہے مگر یہاں بھی آپؐ نے یہ بات صاف کردی تھی کہ اس نسبت سے نبوت کا کوئی تعلق نہیں یہ منصب میرے بعد ختم ہو چکا ہے اس لیے نبی نہ تم ہو نہ کوئی اور اس کے بعد بھی اگر دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر کسی کو نبی بنالے تو شقاوت ازلیہ کے سواء اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ نیز حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات ہی میں وفات پاچکے تھے لہٰذا اس حدیث کو مسئلہ خلافت سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف ایک خاص موقعہ پر ایک ایسی نیابت تھی جس میں دوسرے مواقع پر آپؐ کے دوسرے صحابہ کو بھی شرکت کا شرف کسی حد تک حاصل ہو چکا ہے لہٰذا اس حدیث کو آپؐ کے بعد خلافت کے مسئلہ میں کھینچنا غلط ہے۔

و من خواص اهل الجنة كثرة الازواج

کثرتِ ازواج میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت سے مشابہت

(۱۰۸۸) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۰۸۸) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی

(۱۰۸۸) ٭ شریعت میں عام طور پر ایک مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مرد میں یقیناً اتنی طاقت بھی ضرورت ودیعت فرمائی گئی ہے- انبیاء علیہم السلام کا معاملہ جسمانی اور روحانی طاقتوں میں عوام سے کہیں اونچا ہوتا ہے' اگر ان کی جسمانی طاقتیں بھی ان کے منصب کے بقدر زیادہ نہ ہوں تو ان کو امت کی جفا کاریوں پر صبر اور دوسری طرف بار وحی کا تحمل کرنا ناممکن ہو جائے' اس لیے حکمت ایزدی نے ان کی جسمانی قوتیں بھی عام انسانوں سے کہیں زیادہ قوی بنائی ہیں' اسی لیے نکاح میں بھی ان کے لیے عوام سے زیادہ وسعت دی گئی ہے- لیکن اس کمال طاقت وقوت کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی ساری طاقتیں صرف تبلیغ دین اور خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب وآلام کے جھیلنے میں ہی صرف ہوگئی ہیں- سیرت پڑھنے والے حضرات خوب جانتے ہیں کہ ان کی طاقت وقوت کی یہ بہتات کسی ایک ہی جانب میں نہ تھی بلکہ غزوۂ خندق میں جب ایک موقعہ پر ایک سخت پتھر کسی کی کدال سے ٹوٹ نہ سکا تو اس وقت جس کی کدال نے اس کو ریزہ ریزہ کر ڈالا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی قوت بازو کا کرشمہ تھا- یہ آپ کی طبعی طاقت تھی یا معجزہ تھا مگر اس کا تعلق تھا تو آپ کی قوت جسمانی ہی کے ساتھ- رکانہ جیسے مشہور پہلوان سے کشتی لڑی اور اس کو تین بار زیر کیا یہ کرشمہ بھی آپ کی قوت جسمانی کا تھا (کمافی الخصائص) ایک مرتبہ جب صحابہ کرامؓ نے اپنی بھوک کی بے تابی اپنے پیٹوں سے پتھر بندھے ہوئے دکھا کر ظاہر کی تو اس وقت معلوم ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ سے دو پتھر بندھے ہوئے تھے- ایک موقعہ پر سواریوں کی قلت کی وجہ سے ایک ایک سواری دو دو شخصوں میں تقسیم کی گئی ہر شخص کچھ دور پیادہ پا چلتا اور پھر اس لیے آپؐ کے حصہ میں بھی ایک مشترک سواری آئی- آپؐ کے جاں نثار شریک نے ہزار سر پٹکا کہ آپ سوار رہیں اور وہ آپ کے عوض بھی پیادہ پا چل لے گا لیکن اس کے جواب میں اس خلق عظیم والے رسول کا جواب یہ تھا "ما انت بالتحوی منی و ما اما باغنی عن الاجر منک" (اَوْ كَمَا قَالَ) تو مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تجھ سے زیادہ ثواب آخرت سے بے نیاز نہیں یعنی اس کی ضرورت مجھ کو بھی ہے- یہاں آپؐ کے پہلے جملوں پر غور کیجئے-

دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک شعبہ صحابہ کرامؓ کے سامنے آتا تھا اور کیونکر نہ آتا جس کی ذات کو مجسم "اسوہ حسنہ" اور نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا ضرور تھا کہ اس کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اندرونی بھی اور بیرونی بھی سب کا سب سامنے آجاتا اس لیے حسب الاتفاق یہ ایک واقعہ بھی معمول کے مطابق ضمنی طور پر ذکر میں آگیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر چونکہ اب ایک مدت کے لیے احرام وحج کے مشاغل درپیش تھے اس لیے آپؐ نے مناسب سمجھا کہ ایک بار جملہ ازواج کے یہاں شب باش ہو جائیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر کی سنت ہمیشہ شب باشی میں تقسیم ہی رہی ہے پس چونکہ یہ ایک ہی واقعہ تھا جو آپ کے عام طریق کے خلاف پیش آیا تھا اس لیے صحابہ کرامؓ کے مابین اس کا تذکرہ بھی آگیا اور اس ضمن میں آپؐ کی جسمانی طاقت کا تذکرہ بھی ہو گیا' ورنہ احادیث کے دفتر آپؐ کے سامنے کھلے پڑے ہیں جس میں ہر رطب و یابس بھی جمع کر دیا گیا ہے آپؐ اس پر ایک بار گذر جائیے اور پوری تنقید کے ساتھ ملاحظہ فرمالیجئے کہ کیا اس رسول عظیم کی جسمانی طاقتیں صرف جہاد' مصائب وآلام کے تحمل اور تبلیغ دین میں دشمنوں کی جفائیں سہنے کے سوا کسی اور جانب بھی صرف ہوئی ہیں- آپؐ کی سب سے مقرب بی بی حضرت عائشہ کو ایسی نوبت للہ .....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدُوْرُ عَلَى نِسَائِهِ فِي السَّاعَةِ الْوَاحِدَةِ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُنَّ اِحْدٰى عَشَرَةَ قُلْتُ لِاَنَسٍ اَوْ كَانَ يُطِيْقُهُ قَالَ كُنَّا نُتَحَدَّثُ اَنَّهُ اُعْطِيَ قُوَّةَ ثَلَاثِيْنَ. (اخرجه البخاری و من طریق عبادة کذافی الخصائص)

اللہ علیہ وسلم نے شب و روز میں کبھی بیک وقت بھی سب بیبیوں کے ساتھ شب باشی کی ہے' حالانکہ آپ کی گیارہ بیبیاں تھیں- میں نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی طاقت تھی- انہوں نے جواب دیا ہمارے درمیان تو یہاں تک تذکرہ ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس مردوں کے برابر طاقت دی گئی تھی- (بخاری شریف)

ﷺ ..... بھی آئی ہے کہ وہ آپ کو بستر پر نہ دیکھ کر جوش غیرت میں آپ کی تلاش کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہیں لیکن جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے سامنے سربسجود پڑے ہیں تو متحیر ہو کر بول اٹھیں یا رسول اللہ میں کس خیال میں تھی اور آپ کس جہان میں ہیں- اس عمر بھر میں ایک واقعہ پر نظر کرنے والے تریسٹھ سال کی اس زندگی سے کیسے چشم پوشی کر لیتے ہیں جس میں آپ کی عبادت و زہادت صحراؤں اور غاروں میں طویل طویل مدتوں کی اقامت اور ساری عمر روزہ کی وہ کثرت جس کا مادی عقول کو تصور کرنا بھی مشکل ہے- یہ سب اس کثرت اور تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ معتدل مزاج دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اگر محض اپنی ہوس رانی کے مذاق کی بناء پر صحیح احادیث کا انکار کر دینا معیار تحقیق ہے تو بس دین کا اللہ تعالیٰ ہی حافظ و محافظ ہے- مجھے معلوم نہیں کہ اس صحیح حدیث پر تنقید کرنے والے کیا دشمنوں کو طرح آپ کے تعداد ازدواج پر بھی اعتراض کر دیں گے یا اس واقعہ کا بھی انکار کر جائیں گے- خوب یاد رکھو کہ اگر اپنی ذہنیت صاف ہے تو نہ اس ایک واقعہ میں کوئی اشکال ہے اور نہ ان جیسے دوسرے واقعات میں ہی وجہ ہے کہ یہی واقعات صحابہ کرام کے مابین بھی تذکرہ میں آئے اور ان کے قلوب مطہر میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ادنیٰ شبہ نہیں گذرا اور یہی واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو اگر چہ ان کی اسانید کتنی بھی صحیح ہوں مگر ہماری ذہنی ظلمت و کثافت ان کو جس نظریہ سے دیکھتی ہے پھر وہ اس کو انکار یا تاویل کیے بغیر نہیں رہ سکتی-

حقیقت حال یہ ہے کہ جیسا آپ پڑھ چکے ہیں انبیاء علیہم السلام کے جسم دنیا میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں آخرت میں پہنچ کر ان کے مراتب کے مناسب ان میں بھی اسی طرح اور اضافہ ہو جائے گا جیسا کہ عوام امت کے لیے اپنے اپنے اعمال کے مطابق ان میں اضافہ ہوگا- آپ پڑھ چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام اہل جنت کی طرح کون وفساد سے محفوظ رہتے ہیں- ان کے فضلات اہل جنت کی طرح معطر ہوتے ہیں- ان کا سونا اہل جنت کی طرح غفلت کی نیند نہیں ہوتا' اسی طرح ان کی دوسری طاقتیں بھی اس جہان میں اہل جنت کی طرح ہوتی ہیں' اگر طبیعت میں گنجائش ہو تو تعدد ازدواج کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھ لیجئے- پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حسب بیان قرآن کریم امت کے حق میں چار بیبیوں کی قید اس لیے ہے کہ ان سے ان کے حقوق کی ادائیگی بھی مشکل ہے جہاں حق تلفی کا کوئی احتمال نہیں وہاں اس تحدید کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں- میرا مقصد یہ ہے کہ ان کی حیات طیبہ اہل جنت کی حیات کا ایک نمونہ ہوتی ہے وہ اسی حیات میں اپنے رب سے ہم کلام ہوتے ہیں' خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے ان کی مجلسوں میں آتے جاتے ہیں- جنت و دوزخ کا ان کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور کسی کو تو دیدار الٰہی جیسی عظیم الشان نعمت سے بھی نوازا دیا جاتا ہے تو کیا اب بھی اس پاک باز ہستی کے متعلق اس ایک واقعہ میں آپ کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے- یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خود نہیں ہے بلکہ آپ کے ایک واقعہ پر صرف صحابہ کرام کا باہم تذکرہ ہے گو وہ کتنی ہی حقیقت پر مبنی ہو لیکن پھر آپ کے اپنے بیان اور صحابہ کے باہم تذکروں میں مسئلہ کی اہمیت اور غیر اہمیت کا بڑا فرق پڑ جاتا ہے- اب یہ نکتہ چینی ان پر کیجئے کہ انہوں نے آپ کے متعلق ایسا خیال کیوں قائم کر لیا- اگر یہاں عرب ﷺ .....

(۱۰۸۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سُلَیْمَانُ لَاَطُوْفَنَّ اللَّیْلَةَ عَلٰی تِسْعِیْنَ اِمْرَءَ ةٍ وَ فِیْ رِوَایَةٍ بِمِأَةٍ

(۱۰۸۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا آج کی شب میں اپنی حرم سرائے میں نوے اور ایک روایت میں سو بیبیوں کے پاس جاؤں گا اور

بقیہ ..... کے اس عام ماحول کا بھی لحاظ کرلیا جاتا جو اس وقت کی عام تاریخوں سے ثابت ہے تو جبر و مقابلہ کے بے وجہ حسابات جو یہاں شروع کر دیئے گئے ہیں وہ شروع نہ کیے جاتے۔ اسی کے ساتھ جس بشر کا تعلق تمام امت کے ساتھ ہو اس کے لیے نسوانی احکام کی تعلیم و تفہیم کے لیے ازواج کی کثرت کتنی اہم ہوگی یہ سوال بھی قابل غور ضرور ہے۔

تنبیہ: یہ یاد رہے کہ صرف قواعد پر چلنے والے یہاں لفظ ''کان'' میں ضرور کچھ الجھیں گے مگر حقیقت شناس اور واقعات پر نظر رکھنے والے کسی راوی کے ایک لفظ سے تاریخ کے اوراق پر بھی پانی نہیں پھیر سکتے۔

(۱۰۸۹) * سہو و نسیان کے واقعات خال خال انبیاء علیہم السلام کے زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں اور یہ بڑی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صرف ان محیر العقول ہستیوں کی بشریت کی طرف اشارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے مقام کی بلندی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ہستیاں وہ ہیں جن کا سہو و نسیان بھی دوسرے انسانوں کی ارادی خطاؤں کی طرح قابل گرفت ہوتا ہے اب یہ اندازہ فرمالیجئے کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہی نہیں ہوتے یا ایسے کامل بشر ہوتے ہیں جن سے مواخذہ کے شرائط عام انسانوں سے کہیں شدید تر ہیں۔ جب اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ یہ آیت پڑھیں گے تو اس کی پوری تفصیل آپ پر کھل جائے گی:

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ. (الکھف:۲۳-۲۴)

اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا۔ مگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ لینا۔

سرسری نظر میں آیت بالا کو آپ صرف ایک علمی اصلاح اور عقیدہ کا مسئلہ سمجھتے ہوں گے اب آپ کو اس واقعہ کی روشنی میں اس کی اہمیت کا عملاً بھی کچھ اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کے دوہرانے سے قرآن کریم کا مقصد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک نقصانات کے باریک سے باریک پہلو ایک ایک کر کے سامنے نہ آجائیں کسی کمال کی معراج حاصل ہونا ممکن نہیں۔ لیکن ان باریکیوں کا میدان عام انسانوں کی زندگی بنائی نہیں جاسکتی۔ اس لیے تقدیر نے کچھ ہستیاں اتنی بلند پیدا فرمائی ہیں جن کی درخشاں زندگی میں سہو و نسیان کے اثرات کا نمایاں ہونا بھی ان کے رتبہ سے بعید ہوتا ہے اس لیے پھر اس پر ان سے مواخذہ فرمانا بھی بالکل موزوں نظر آتا ہے۔ جس امت کو خیر امت بنانا منظور تھا اس کے سامنے یہ تمام سرد و گرم سرگزشتیں اس لیے رکھ دی گئی ہیں کہ ان کے معراج کمال تک پہنچنے کے اسباق ہی ہیں۔ یہ واقعہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں ایک ہی واقعہ ہے اور جب ان کو شاہی بھی وہ شاہی عطا ہوئی تھی جو رہتی دنیا تک کسی کو نصیب نہ ہوسکے یعنی جن و ملک حتیٰ کہ ہوا پر بھی ان کی قاہرانہ حکومت قائم تھی۔ تو اس شان و شکوہ کے ساتھ کثرت ازواج جو اس دور میں ظاہری ملوکیت کے لیے لازم تھی اگر مرحمت فرمادی گئی تو اس پر اعتراض کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک واقعہ میں ان کی تمناء کیا تھی وہ خود حدیث میں موجود ہے۔ پھر اس پاکیزہ قصد میں ذرا سے نسیان کا نتیجہ کیا نکلا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ فرشتہ کی یاد دہانی کے باوجود پھر نسیان ہونا اس کی دلیل ہے کہ جو بات تقدیر میں طے ہو جاتی ہے وہ اپنے اسباب کے ساتھ طے ہوتی ہے پس جس طرح ان کا ظہور قطعی اور یقینی ہوتا ہے اسی طرح ان اسباب کا پیش آنا بھی قطعی و ضروری ہوتا ہے۔ بقیہ .....

امْرءَ ۃٍ کُلُّھُنَّ تَاْتِیْ بِفَارِسٍ یُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَقَالَ لَہُ الْمَلَکُ قُلْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ فَلَمْ یَقُلْ وَ نَسِیَ فَطَافَ عَلَیْھِنَّ فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْھُنَّ اِلَّا امْرَءَ ۃٌ وَاحِدَۃٌ جَاءَ تْ بِشِقِّ رَجُلٍ وَ ایْمُ الَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْقَالَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فُرْسَانًا اَجْمَعُوْنَ.

(متفق علیہ)

سب کی سب کے یہاں ایک ایک بچہ ایسا پیدا ہوگا جو راہ خدا میں جہاد کرے گا اس پر فرشتے نے کہا ان شاء اللہ تو کہہ لیجئے تقدیری بات کہ وہ یہ کلمہ کہنا بھول گئے جب زنان خانہ تشریف لے گئے تو صرف ایک بی بی حاملہ ہوئیں اور اُن کے بھی ایک ناتمام بچہ پیدا ہوا' اس کے بعد آپ نے فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر وہ ان شاء اللہ کہہ دیتے تو سب کے بچے ہوتے اور سب گھوڑوں پر سوار ہوکر راہ خدا میں جہاد کرتے۔ (متفق علیہ)

ﷺ ..... کثرت ازواج کے متعلق ایک بدیہی مگر اہم تنبیہ: جن اعدادِ اسلام کی نظروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج کی کثرت باعث اعتراض بنی ہوئی ہے ان کی نظریں کبھی اس طرف نہیں گئیں کہ ازدوج کی کثرت کن حالات میں سامان عیش وعشرت ہوسکتی ہے۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے آپ کو معلوم ہوگا کہ جس طبقہ کا نصب العین تعیش بن گیا ہے پھر اس کا ماحول کیا تھا' نیز اس کے اثرات اس کی زندگی' اس کے ہم جنسوں' اس کی محکوم رعایا بلکہ بعد کے دور تک بھی کتنی کتنی دور تک پھیل گئے ہیں۔ اس جگہ ہمیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن بتانا صرف یہ ہے کہ صورت حال یہاں کیا تھی۔ یہاں اگر گھر کا جائزہ لیجئے تو اس کی بے سروسامانی کا نقشہ دیکھ دیکھ کر عمرؓ جیسے مخلص کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے ہیں آخر جب ان سے رہا نہ گیا تو یہ درخواست کر ہی بیٹھے یا رسول اللہؐ دعاء فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی امت پر وسعت فرمادے یہ ہمت تو کہاں تھی کہ خود آپؐ ہی کے متعلق یہ درخواست کرتے کیونکہ جب نظر اٹھا کے دیکھا کہ ایک خشک چٹائی جو آپؐ کے جسم نازک میں گھسی جارہی تھی' آپؐ کا بچھونا تھی اور ایک آدھا خشک مشکیزہ لٹکا ہوا نظر آرہا تھا یہ پانی کا سامان تھا اور بس۔ کھانے کے تکلفات کا ذکر ہی کیا ہے' مہینوں گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہ آتی' لباس کی یہ حالت کہ عائشہؓ نے آپؐ کی وفات کے بعد وہ پیوند لگی ہوئی موٹی چادریں نکال کر دکھائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کپڑوں میں ہوئی ہے۔ گھر اتنا سادہ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے نقشین چادر آپؐ کی زینت کے خیال سے لے کر لٹکادی تو آپؐ گھر میں داخل نہ ہوئے جب تک کہ اس کو پھاڑ کر اس کے تکیے نہ بنا دیئے گئے کہ زمین پر پڑے رہیں۔ بیبیوں کے درمیان وہ انصاف کہ مجال کیا کسی کا دل ذرا میلا ہوجائے۔ شب باشی میں تقسیم آپ پر واجب نہ تھی مگر پھر اس کی اتنی رعایت کہ ہر ہر بی بی کے ہاں رہنے کا دن مقرر رہتی کہ سفر بھی قرعہ اندازی کے بعد ہوتا۔ پھر جب آپؐ کے شب کے حالات کے کھوج لگایئے تو خود حضرت عائشہؓ کا بیان یہ ہے کہ ایک شب اپنی باری میں جب میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ دیکھا تو طرح طرح کے وہموں نے مجھ کو گھیر لیا جب تلاش میں نکلی تو آپ کو سربجود دعاء میں مشغول دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی۔ آپ کی صلوٰۃ لیل اور صیام کی بہت سی حدیثوں کا ذخیرہ ان ہی امہات المؤمنین کے ذریعہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اگر آپؐ کے ہم جنسوں کا حال دیکھنا ہو تو جس جماعت میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے تو ان کا تعیش ضرب المثل تھا اور جب وہ کچھ مدت آپ کی صحبت سے مستفیض ہوچکے تو ان کا زہد ضرب المثل تھا۔ پھر کون نہیں جانتا کہ جہادی زندگی تعیش کی زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ پھر جہاں ہمہ وقت جہاد سامنے ہو وہاں تعیش کا تصور کیسے آسکتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے نہیں تھا کہ سامان تعیش جمع نہ ہوسکتے تھے۔ نہیں نہیں فتوحات پر فتوحات ہوچکی تھیں' لیکن جو کچھ ہاتھ آتا وہ سب غرباء ومساکین اور دوسرے مسلمانوں پر تقسیم کے لیے تھا' اپنے گھر میں جمع کرنے کے لیے ﷺ .....

بَعْضُ الاسرار فی انکحۃ النبی صَلی اللّٰہُ علیہ وسلم

(۱۰۹۰) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْاَسْوَدِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَتْ عَائِشَۃُؓ مَا تَزَوَّجَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَتَاہُ جِبْرَئِیْلُ بِصُوْرَتِیْ وَ قَالَ ھٰذِہٖ زَوْجَتُکَ وَ تَزَوَّجَنِیْ وَ اِنِّیْ لَجَارِیَۃٌ عَلٰی حَرْفٍ فَلَمَّا تَزَوَّجَنِیْ اَلْقَی اللّٰہُ عَلٰی حَیَاءٌ وَ اَنَا صَغِیْرَۃٌ. (رواہ الحاکم فی المستدرک و صححہ الذھبی)

(۱۰۹۱) قَالَ قَالَتْ جُوَیْرِیَّۃُ بِنْتُ الْحَارِثِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں قدرت کے بعض تکوینی اسرار

(۱۰۹۰) عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجھ سے نکاح فرمانے سے قبل ہی حضرت جبرئیلؑ نے میری صورت لاکر آپ کو دکھادی تھی اور فرمایا تھا یہ آپ کی بی بی ہیں- مجھ سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا ہے تو اس وقت میں بالکل لڑکی تھی- پھر جب آپ نے عقد فرمالیا تو نوعمری میں ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حیاء وشرم غالب فرمادی تھی-
(مستدرک)

(۱۰۹۱) حضرت جویریہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

لله...... کچھ نہ تھا- اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ عسرت درعسرت میں کثرت ازواج امتحان وابتلاء کی منزل تھی یا سامان تعیش آج بھی اگر عسرت میں اولاد کی کثرت شروع ہو جاتی ہے تو ان لخت ہائے جگر کے لیے بھی زیادتی کے بجائے انسان موت کی تمناء کرنے لگتا ہے پس اعتراض کرنے والے صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں کاش اگر آپ کی پوری زندگی سامنے رکھ لیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ نبی کے مجاہدات میں سے ایک بڑا مجاہدہ کثرت ازواج بھی تھا- عام مسلمانوں کو چار ازواج کی گنجائش دی گئی مگر اس تنبیہ کے ساتھ کہ ان کے درمیان عدل و انصاف پورا پورا کرنا ہوگا- اور یہ منزل اتنی کٹھن ہے کہ تم شاید بمشکل ہی اس سے عبور کرسکو گے- لیکن جن کو تمام جہان میں عدل و انصاف قائم کرنا کچھ دشوار نہ تھا ان کو چند ازواج کے درمیان انصاف قائم رکھنا کیا مشکل ہوتا-

(۱۰۹۰) * جس ذات قدسی صفات کو رسولوں میں بھی منتخب رسول فرمایا گیا تھا جس کا محل ولادت، مقام ہجرت، جس کے ہم جلیس صحابہ اور جس کے خلفاء بھی پہلے سے سب منتخب ہو چکے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ عالم تقدیر میں اس کی زوجیت کے لیے عورتوں کا انتخاب پہلے نہ ہو چکا ہوتا- جب قرآن کریم اپنا عام اعلان یہ کرتا ہے اَلطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ. تو یہ کیونکر ہوتا کہ سارے جہان میں جو سب سے زیادہ طیب تھے ان کے لیے تمام جہاں سے بڑھ کر طیبات انتخاب نہ کی جاتیں- اس لیے قدرت نے آپ کی خاص زوجیت کے لیے نبیوں کے بعد سب سے اشرف انسان یعنی صدیق اکبرؓ کی سب سے اشرف صاحبزادی کو منتخب کیا اور عالم رؤیا میں یہ راز کھول بھی دیا کہ ہم نے ان کو شروع سے آپ کی زوجیت کے لیے منتخب کرلیا تھا مقصد یہ ہے کہ نکاح انبیاء علیہم السلام بھی کرتے ہیں مگر صرف ان سے کرتے ہیں جو ان کے حق میں پہلے سے منتخب شدہ بیبیاں ہوتی ہیں- اگر یہاں صرف صورت اور ظاہری عادات ہی دیکھی جاتیں تو ممکن تھا کہ بعض دوسری عورتیں بھی ان اوصاف میں مشترک مل جاتیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام صفات کے سواء آپ کی دائمی رفاقت کے لیے اندرونی طور پر کچھ اور خصوصی شرائط بھی ضرور مرعی تھیں- سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام بھی کیسے کامل بشر ہوئے ہیں-

(۱۰۹۱) * حضرت جویریہؓ کا یہ نکاح کتنے کثیر التعداد نفوس کی آزادی کا سبب بنا یہ اپنی جگہ خود ایک بڑی حکمت ہے لیکن ہمیں تو یہاں لله......

رَأَيْتُ قَبْلَ قُدُوْمِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِثَلَاثِ لَيَالٍ كَانَ الْقَمَرَ اَقْبَلَ يَسِيْرُ مِنْ يَثْرِبَ حَتّٰى وَقَعَ فِيْ حَجْرِيْ فَكَرِهْتُ اَنْ اُخْبِرَبِهَا اَحَدًا مِنَ النَّاسِ حَتّٰى قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سُبِيْنَا رَجَوْتُ الرُّؤْيَا فَلَمَّا اَعْتَقَنِيْ وَ تَزَوَّجَنِيْ وَ اللّٰهِ مَا كَلَّمْتُهُ فِيْ قَوْمِيْ حَتّٰى كَانَ الْمُسْلِمُوْنَ هُمُ الَّذِيْنَ اَرْسَلُوْهُمْ وَ مَا شَعُرْتُ اِلَّا بِجَارِيَةٍ مِّنْ بَنَاتِ عَمِّيْ تُخْبِرُنِى الْخَبَرَ فَحَمِدْتُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ. (رواه الحاكم فى المستدرك ج ٤ ص ٢٧ و الحاكم فى الاكليل كما فى العمدة ص ١٠٢ ج ٥)

تشریف آوری سے تین شب قبل میں نے خواب میں ایسا دیکھا تھا کہ چاند یثرب کی جانب چلتا آ رہا ہے یہاں تک کہ میری گود میں آ گیا ہے- میں نے کسی شخص کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا' یہاں تک کہ آپ تشریف لے آئے تو اتفاق ایسا ہوا کہ ہم لوگ قید کر لیے گئے تو مجھے اب اپنے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی امید ہوئی اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرما لیا تو بخدا میں نے اپنی قوم کی آزادی کے معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حرف بھی نہیں کہا بلکہ خود مسلمانوں نے ہی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رشتہ کی خاطر) ان سب کو رہا کر دیا اور مجھ کو تو اس واقعہ کی خبر بھی جب ملی ہے جب کہ میری ایک چچا زاد بہن نے آ کر مجھ کو اس کی اطلاع دی- میں نے اس احسان پر حق تعالٰی کا شکر ادا کیا-
(مستدرک)

(۱۰۹۲) عَنْ زَيْنَبَ اَنَّهَا كَانَتْ عِنْدَ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ فَفَارَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ فِيْهَا نَزَلَتْ فَلَمَّا قَضٰى

(۱۰۹۲) حضرت زینب رضی اللہ تعالٰی عنہا بیان فرماتی ہیں کہ وہ حضرت زید کے نکاح میں تھیں (ان کے طلاق کے واقعہ کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عقد فرما لیا تھا- قرآن کریم کی یہ آیت فَلَمَّا قَضٰى

لله ...... یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کس طرح پہلے سے عالم تقدیر میں منتخب ہو چکی تھیں یہ بیان کسی غیر کا نہیں ہے بلکہ خود ان ہی کا ہے جو آپ کے شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں- ان کی خودداری دیکھئے کہ وہ اپنی قومی آزادی کا بار بھی اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتیں اور بڑی صفائی کے ساتھ یہ فرما دیتی ہیں کہ میں نے اس معاملہ میں زمانہ کے عام دستور کے مطابق آپ سے سفارش کا ایک کلمہ تک منہ سے نہیں نکالا' لیکن یہ میری قوم کا نصیب تھا اور مسلمانوں کی اولوالعزمی اور اپنے رسول کا احترام کہ انہوں نے اس رشتہ کے بعد خود یہ ایثار کیا-

(۱۰۹۲) * حضرت زینبؓ کے نکاح پر تو خود قرآن کریم نے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر نبی کا مسئلہ خود رسول کی زندگی میں اس طرح عملاً نہ دکھا دیا جاتا تو قلوب میں اس کی طرف سے پوری صفائی کی کوئی شکل ہی نہ تھی ورنہ حضرت زینبؓ وہی تھیں جن کو آپ ہمیشہ سے جانتے پہچانتے تھے' آپ ہی نے حضرت زید کے ساتھ ان کا عقد کیا تھا اور جب آپ کو ان کی باہم ناچاقی کا علم ہوا تو آپ نے حضرت زید کو بہت سمجھایا بھی مگر جو امر کہ عالم تقدیر میں طے پا چکا تھا آخر کار اس کے لیے ایسے ہی اسباب بن گئے کہ حضرت زینبؓ آپؐ کے نکاح میں آ کر رہیں- پھر تاریخ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان حضرت زینب کی طرف کچھ غیر معمولی تھا' بلکہ اس سے قبل جس طرح حضرت عائشہؓ آپ کی خاص مقرب تھیں اسی طرح وہی اس کے بعد بھی مقرب رہیں- یہاں دشمنان دین کی لله ......

زَيْدٌ مِّنْهَا وَ طَرًا زَوَّجْنَا كَمَا قَالَ فَكَانَتْ تَفْخَرُ عَلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقُوْلُ زَوَّجَنِيَ اللّٰهُ مِنْ رَسُوْلِهٖ وَ زَوَّجَكُنَّ اٰبَاؤُكُنَّ وَ اَقَارِبُكُنَّ.

(رواه الحاكم في المستدرك)

زَيْدٌ مِّنْهَا وَ طَرًا الخ ان ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی راوی کہتا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوسری بیبیوں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ یہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ میرا نکاح تو اپنے رسول کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے پڑھایا ہے اور تمہارا نکاح تمہارے باپ اور دوسرے عزیزوں نے پڑھایا ہے- (مستدرک)

(۱۰۹۳) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ وَقَعَتْ جُوَيْرِيَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ بْنِ الْمُصْطَلِقِ فِيْ سَهْمِ ثَابِتِ بْنِ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ اَوْ اِبْنِ عَمٍّ لَهٗ فَكَاتَبَتْ عَلٰى نَفْسِهَا وَ كَانَتْ اِمْرَءَةً مَلَاحَةً تَأْخُذُهُ الْعَيْنُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَجَاءَتْ تَسْأَلُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كِتَابَتِهَا فَلَمَّا قَامَتْ عَلَى الْبَابِ فَرَأَيْتُهَا كَرِهْتُ مَكَانَهَا وَ عَرَفْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَرٰى مِنْهَا مِثْلَ الَّذِيْ رَأَيْتُ فَقَالَتْ يَا

(۱۰۹۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ جنگ میں آ گئی تھیں اور انہوں نے ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عقد کتابۃ کرلیا تھا یعنی اتنی رقم آپ کو ادا کرکے میں آزاد ہوں- یہ بڑی حسین اور جاذب نظر تھیں- عقد کتابت کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں- جب میں نے ان کو دروازہ پر کھڑا دیکھا تو ان کا آنا مجھ کو پسند نہ آیا اور میں نے سمجھا کہ جو جاذبیت میں نے ان میں دیکھی ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں آئے گی- بہر حال انہوں نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا نام جویریہ

ﷺ ..... بے وجہ رنگ آمیزیاں ان حقائق کی روشنی میں کیا قابل التفات ہوسکتی ہیں-

حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا یہ نقشہ بھی محو ہونے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ عقد کرنے کا بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ڈالا گیا بلکہ وہ خود ہی اس کا متکفل ہوگیا اور معاملہ کی نزاکت کی ایک بڑی مشکل خود اس نے حل فرمادی-

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس اہم تشریع کے لیے بھی یہ صورت اختیار نہیں کی گئی کہ پہلے نکاح کے قائم رہتے ہوئے ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوجیت میں منتقل کردیا جاتا اور نہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف ان پر اس کا زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دے دیں بلکہ جب خود بخود واقعات اس قسم کے رونما ہوگئے کہ اب باہم نباہ کی کوئی دوسری صورت ہی باقی نہ رہی اور قانونی طور پر متارکت عمل میں آ گئی اور قانونی طور پر ہی نکاح کے لیے وجہ جواز پیدا ہوگئی تو خود رب العالمین نے اس عقد کا تکفل فرمالیا جس پر حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر بھر فخر کیا کریں-

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی بزرگی اور عظمت شان کا پتہ ملتا ہے جن کی بشری زندگی میں کبھی کبھی خالق کائنات براہ راست خود بھی مداخلت فرمادیتا ہے- کجا یہ بشر اور کجا وہ بشر

(۱۰۹۳) * حضرت جویریہؓ اس سے قبل اپنا امہات المؤمنین میں شامل ہونا خواب میں دیکھ چکی تھیں اور حسب بیان خود اس انتظار میں لگ رہی تھیں کہ اس کی تعبیر کب پوری ہوتی ہے- واقعات سب خلاف جارہے تھے یعنی اسیر ہوچکی تھیں اور پھر ثابت بن قیسؓ کے حصہ ﷺ .....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا جُوَيْرِيَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ وَ اِنَّمَا كَانَ مِنْ اَمْرِیْ مَالَا يَخْفٰى عَلَيْكَ وَ اِنِّیْ وَقَعْتُ فِیْ سَهْمِ ثَابِتِ بْنِ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ وَ اِنِّیْ كَاتَبْتُ عَلٰى نَفْسِیْ فَجِئْتُكَ اَسْاَلُكَ فِیْ كِتَابَتِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلْ لَّكَ اِلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ قَالَتْ وَ مَا هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اُؤَدِّیْ عَنْكِ كِتَابَتَكِ وَ اَتَزَوَّجُكِ قَالَتْ قَدْ فَعَلْتُ قَالَتْ فَتَسَامَعَ تَعْنِی النَّاسَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَزَوَّجَ جُوَيْرِيَةَ فَاَرْسَلُوْا مَا فِیْ اَيْدِيْهِمْ مِنَ السَّبْیِ فَاَعْتَقُوْهُمْ فَقَالُوْا اَصْهَارُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا رَاَيْنَا امْرَءَةً كَانَتْ اَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا اُعْتِقَ فِیْ سَبَبِهَا مِائَةُ اَهْلِ بَيْتٍ مِنْ بَنِی الْمُصْطَلِقِ. (رواه ابو داؤد فی باب بیع المکاتب اذا فسخت الکتابة قال ابن کثیر فی تاریخه تفرد به ابو داؤد)

ہے اور میں حارث کی دختر ہوں' میری جو سرگزشت ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ قیدی ہو کر ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ میں آ گئی ہوں میں نے ان کے ساتھ اپنی آزادی کی غرض سے کتابت کا عقد کر لیا ہے' اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زرِ کتابت کی درخواست لے کر حاضر ہوئی ہوں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے سامنے اس سے ایک اور بہتر بات رکھتا ہوں- وہ بولیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا زرِ کتابت تو میں اپنی جانب سے ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں- انہوں نے فوراً کہا مجھے بخوشی منظور ہے- یہ فرماتی ہیں لوگوں نے جیسے ہی یہ خبر سنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کر لیا ہے اسی وقت ان کی قوم کے جتنے قیدی تھے سب نے آزاد کر ڈالے اور کہا یہ تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال کا خاندان ہو گیا- صحابہ کا بیان ہے کہ ہم نے کوئی عورت جو اپنے خاندان بھر کے لیے حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ باعث برکت ہو نہیں دیکھی- ان کی وجہ سے قبیلہ بنو مصطلق کے سو گھر آزاد ہو گئے-

(ابوداؤد)

(١٠٩٤) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ عِنْدَ السَّكْرَانِ بْنِ عَمْرٍو اَخِیْ سُهَيْلِ

(١٠٩٤) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سودہؓ پہلے سکران بن عمرو کے نکاح میں تھیں جو سہیل بن عمرو کے بھائی تھے یہ خواب میں کیا دیکھتی ہیں

بقیہ ..... میں آ کر بظاہر اس مقام عالی تک رسائی کی اب کوئی امید نہ رہی تھی مگر جس قدرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان سے نکال کر تاج شاہی بخشا تھا اس کو اپنی قدرت کا نمونہ یہاں پھر دکھانا تھا یعنی عقد کتابت ایک بہانہ بن گیا اور اس طرح تقدیر کشاں کشاں ان کو درِ مقصود پر خود لے آئی- حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا معاملہ بھی ان کے معاملہ سے بہت ہی ملتا جلتا ہے اور ابھی آپ کے سامنے آنے والا ہے- رہا ان کے حسن و جمال کا معاملہ تو وہ جب ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی نظروں میں قابل اعتناء نہ تھا حتیٰ کہ انہوں نے عقد کتابت منظور فرما لیا تو بھلا خاتم الانبیاء علیہ السلام کی نظروں میں بھلا کیا قابل التفات ہوتا- یوں کہیے کہ اس کا تذکرہ صرف ایک شدنی بات کے لیے پیرایہ بیان بن گیا تھا- اس سے زیادہ تفصیل حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کی تشریحی نوٹ میں عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گذرے گی-

بْنِ عَمْرٍو فَرَأَتْ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْبَلَ يَمْشِيْ حَتّٰى وَطِئَ عَلٰى عُنُقِهَا فَاَخْبَرَتْ زَوْجَهَا بِذٰلِكَ فَقَالَ لَئِنْ صَدَقَتْ رُؤْيَاكِ لَا مُوْتَنَّ وَ لَيَتَزَوَّجَنَّكِ مُحَمَّدٌ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ثُمَّ رَأَتْ فِي الْمَنَامِ لَيْلَةً اُخْرٰى اَنَّ قَمَرًا اِنْقَضَّ عَلَيْهَا مِنَ السَّمَاءِ وَ هِيَ مُضْطَجِعَةٌ فَاَخْبَرَتْ زَوْجَهَا فَقَالَ لَئِنْ صَدَقَتْ رُؤْيَاكِ لَمْ اَلْبَثْ اِلَّا يَسِيْرًا حَتّٰى اَمُوْتَ وَ تَتَزَوَّجِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ فَاشْتَكَى السَّكْرَانُ مِنْ يَوْمِهٖ ذٰلِكَ فَلَمْ يَلْبَثْ اِلَّا قَلِيْلًا حَتّٰى مَاتَ وَ تَزَوَّجَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے تشریف لا رہے ہیں- یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ دیا ہے- یہ خواب انہوں نے اپنے شوہر سے نقل کیا اس نے یہ تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں عن قریب مرنے والا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں گے- دوسری شب پھر کیا دیکھتی ہیں کہ وہ لیٹی ہوئی ہیں تو آسمان سے چاند ٹوٹ کر ان پر آ پڑا ہے- اس خواب کو بھی انہوں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو اس کی بھی اس نے یہی تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں اب بہت کم زندہ رہوں گا اور مر جاؤں گا اور تم میرے بعد نکاح کر لو گی پھر ایسا ہوا کہ اسی دن سکران بیمار پڑا اور کچھ مدت نہ گذری تھی کہ اس کی وفات ہوگئی اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا-

(خصائص الکبریٰ)

(كذافي الخصائص ج ١ ص ١٨١ عن ابن سعد كذافي العمدة ص ٦٠٣ ج ٥)

(١٠٩٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ بِعَيْنَيْ صَفِيَّةَ خُضْرَةٌ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاهٰذِهِ الْخُضْرَةُ بِعَيْنَيْكِ قَالَتْ قُلْتُ لِزَوْجِيْ اِنِّيْ رَأَيْتُ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ كَاَنَّ

(۱۰۹۵) ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کی آنکھ پر کچھ نیلا سا نشان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہاری آنکھوں پر یہ سبز نشان کیسا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے اپنے شوہر سے ایک بار کہا کہ جیسا لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے گویا چاند

(۱۰۹۵) * والد اور شوہر کے قتل کی تلخی کا احساس ہر ذی حس طبیعت کو طبعی اور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے- حضرت صفیہؓ نے کس صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ اس سے میں بھی خالی نہ تھی لیکن جب ایمان کی حقیقی حلاوت دل کی تہ میں اتر جاتی ہے تو طبعی تلخی کا اثر بھی سب کافور ہو جاتا ہے- حضرت صفیہؓ بھی کتنی بانصیب تھیں بھلا یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ ایک یہودی سردار کی بی بی کل امہات المؤمنین کے زمرہ میں شامل ہونے والی ہیں- مگر چونکہ وہ عالم تقدیر کی نظر انتخاب میں آ چکی تھیں لہٰذا کچھ دن قبل یہ راز سب سے پہلے خود ان ہی پر افشاء کر دیا گیا- یہاں دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس کا شوہر یہودی ہے مگر وہ اس خواب کو سنتے ہی کس طرح یہ تعبیر دے دیتا ہے کہ اس چاند کا مصداق عالم میں بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بشر ہو نہیں سکتا- یہ بات بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ آپؐ کی ازواج میں اس قسم کی بیبیاں ہونے کے باوجود جن کے باپ اور شوہر آپ کے حکم سے مقتول ہوئے ہوں تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کی پاکیزگی اور برتری کے خلاف مدت العمر کبھی ان کے منہ سے ایک کلمہ بھی نکلا تھا- یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا کتنا بدیہی ثبوت ہے- عجب نہیں کہ اس قسم کے نکاحوں میں قدرت کا یہ بھی ایک راز ہو-

قَمَرًا وَقَعَ فِيْ حَجْرِيْ فَلَطَمَنِيْ وَ قَالَ اَتُرِيْدِيْنَ مَلِكَ يَثْرِبَ قَالَتْ وَ مَا كَانَ اَبْغَضَ اِلَيَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتَلَ اَبِيْ وَ زَوْجِيْ فَمَا زَالَ يَعْتَذِرُ اِلَيَّ وَقَالَ يَا صَفِيَّةُ اِنَّ اَبَاكِ اَلَّبَ عَلَيَّ الْعَرَبَ وَ فَعَلَ مَا فَعَلَ حَتّٰى ذَهَبَ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِيْ.
(رواه الطبراني و رجاله رجال الصحيح كذا في المجمع ص ٢٥١ ج ٩)

میری گود میں آ گیا ہے- یہ سنتے ہی فوراً انہوں نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور کہا کیا تیرا ارادہ اس شاہ یثرب سے نکاح کرنے کا ہے- وہ کہتی ہیں (بھلا میرا یہ ارادہ کیسے ہوسکتا تھا) میرے والد اور میرے شوہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیے گئے تھے اس لیے مجھے تو آپ کی طرف سے اس کی سخت ناگواری تھی لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو یہ سمجھایا کہ تمہارے والد ہی تمام عرب کو میرے مقابلہ کے لیے چڑھا کر لائے تھے اور میرے ساتھ یہ یہ عداوتیں کی تھیں تو پھر میرے دل سے یہ بات نکل گئی- (الطبرانی)

(۱۰۹۶) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَدِمْنَا خَيْبَرَ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ

(۱۰۹۶) انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم خیبر میں داخل ہوئے اور جب اللہ تعالیٰ نے خیبر کا قلعہ فتح کرا دیا (اور حسب ضابطہ دشمنوں کی اسارت اور قید کا

(۱۰۹۶) * حضرت صفیہ کا یہ دوسرا نکاح تھا اور اب تیسری بار تقدیر الٰہی ان کو آپؐ کی زوجیت میں لانے والی تھی اس لیے ایک خواب کے ذریعہ پہلے ہی خود حضرت صفیہ کو اس کی بشارت دے دی گئی تھی- اب ذرا دیکھئے تقدیر کیا ہے اور واقعات کتنے خلاف ہیں یعنی وہ خود یہودی ہیں اور ایک یہودی کے نکاح میں ہیں پھر قلعہ خیبر سر ہو جانے کے بعد دحیہؓ کی درخواست پر ان کے نامزد بھی ہوچکی ہیں' لیکن اچانک تقدیر غالب آتی ہے اور واقعات کا رخ کتنی دور جا کر پھر کدھر بدلتا ہے- کسی کے منہ پر ان کے حسن کا تذکرہ آتا ہے اور کسی کی زبان پر ان کی سرداری کا ذکر آجاتا ہے اور خود صحابہ کی جانب سے یہ مشورہ پیش ہو جاتا ہے کہ ان حالات میں مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر آپؐ ان کو بحق نبوت قبول فرمالیں تو پھر یہ سارے خیالات دلوں سے یکسر نکل سکتے ہیں- عرب میں باندیوں کا عام دستور تھا اس سے قبل اور اس کے بعد ہمیشہ ہر قسم کی باندیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں' جن میں حسین سے حسین بھی تھیں اور شریف سے شریف بھی مگر کبھی کسی کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہ گذرا کہ فلاں باندی کو صرف آپؐ ہی کی ملک ہونا چاہیے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوا بھی اور پھر وہیں ختم ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ آپؐ کے روبرو بھی اس کا تذکرہ آ گیا- اس کے بعد بھی قیاس یہی کہہ سکتا تھا کہ اب یہ بجائے دحیہؓ کے آپ کی باندی رہیں گی لیکن تقدیر میں طے شدہ یہ تھا کہ ان کو ام المومنین بنانا ہے اس لیے آپؐ نے اس معاملہ کو قبول بھی کیا اور پھر ان کو آزاد کر کے ان سے عقد فرمایا اور اس طرح حضرت صفیہ کا خواب پورا تو ہوا مگر ہوا اسباب کے پردہ میں- اس واقعہ کی اس وقت کچھ بھی اہمیت نہ ہوئی اور ان کا ولیمہ بھی جس انداز کا ولیمہ بحالت سفر ہوسکتا تھا ہو گیا اور ان کے سردار ہو کر دحیہ کی ملک میں آنے کی جو ناموزونیت کا خیال پیدا ہو کر کسی اختلاف کا موجب بن سکتا تھا اس طرح وہ بھی سب ختم ہو گیا- اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر نکاح میں خدا جانے کیا کیا اسرار ربانی ہوں گے جو ہم کو معلوم نہیں ہو سکے اگر اتفاق سے کسی روایت کی بدولت ان کے رُخ سے کہیں ذرا سا نقاب اٹھ گیا ہے تو اس کی ذرا سی چمک بھی نظر آ گئی ہے- ابوداؤد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بدلہ دحیہؓ کو آپؐ نے اپنی جانب سے سات راسیں عطا فرمائی تھیں-
حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت خضر کی پوری پوری سرگزشتیں الٰہی حکمتوں اور واقعات کی سطحوں کی بے ارتباطی اور .....

الْحِصْنَ ذُكِرَ لَهُ جَمَالُ صَفِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا بِنْتُ حُيَيِّ بْنِ اَخْطَبَ وَ قَدْ قُتِلَ زَوْجُهَا وَ كَانَتْ عَرُوْسًا فَاصْطَفَاهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فَخَرَجَ بِهَا حَتّٰى بَلَغْنَا سَدَّ الصَّهْبَاءِ حَلَّتْ فَبَنٰى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ صَنَعَ حَيْسًا فِيْ نِطْعٍ صَغِيْرٍ ثُمَّ قَالَ لِيْ اٰذِنْ مَنْ حَوْلَكَ فَكَانَتْ تِلْكَ وَلِيْمَةٌ عَلٰى صَفِيَّةَ ثُمَّ خَرَجْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَوِّيْ لَهَا وَرَاءَهُ بِعَبَاءَةٍ ثُمَّ يَجْلِسُ عِنْدَ بَعِيْرِهِ فَيَضَعُ رُكْبَتَهُ وَ تَضَعُ صَفِيَّةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا رِجْلَهَا عَلٰى

معاملہ شروع ہو گیا تو اس میں صفیہؓ بھی قید کر لی گئیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کے جمال کا ذکر کیا گیا' ان کے شوہر جنگ میں مقتول ہو چکے تھے' تازہ تازہ ان کی شادی ہوئی تھی اور ابھی وہ دلہن ہی شمار ہوتی تھیں اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہؓ کی فرمائش پر پہلے ان کو دے دیا تھا- پھر کسی نے آپؐ سے عرض کی یا نبی اللہ وہ تو قبیلہ قریظہ و نضیر کی سردار عورت ہیں آپؐ کے سواء ان کو کسی اور کو دینا مصلحت نہیں ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بحق نبوت خود لے لیا اور ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرما لیا- چلتے چلتے جب ہم لوگ مقام سد صہباء میں پہنچے تو اب صفیہؓ اپنے نسوانی عذر سے فارغ ہو چکی تھیں یہاں آپ نے اپنا ولیمہ کیا یعنی ایک مختصر سے دستر خوان پر تھوڑا سا حلوہ تیار کرا کے رکھا اور فرمایا کہ آس پاس جو لوگ ہوں ان کو بھی بلا لو حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ کا ولیمہ بس صرف یہ تھا- اس کے

لله ..... ان کے اندرونی ارتباط کی واضح مثالیں ہیں- یعنی مثلاً مقصد تو یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی نظروں میں اونچے سے اونچا ثابت کیا جائے' مگر واقعات کی سطح میں مسلسل ذلتیں ہی ذلتیں نظر آ رہی ہیں' موت کے کوئیں میں گرنا' غلام بن کر مصر کے بازار میں فروخت ہونا اور مجرم کی حیثیت میں قید میں پڑ جانا ایک سے ایک بڑی ذلت تھی کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نتیجہ جو آخر میں ظاہر ہو گا وہی ان کے خواب کی تعبیر ہو گی- پھر جب آخر کار اس کی تعبیر کا دن آیا تو ظاہر ہو گیا کہ یہی ذلتوں کے گڑھے درحقیقت عزت و احترام کی سیڑھیاں تھیں-

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا مقصد تو اپنے محسن ملاحوں پر احسان کرنا تھا مگر اس کی صورت کیا ہے یہ کہ ان غریبوں کے رزق کا جو چھوٹا سا سہارا تھا اس کو بھی توڑ دیا- ان کا مقصود ایک بچہ کے والدین کی خیر خواہی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کی ہزاروں آرزوؤں کے پھول کو مسل ڈالا- کون باور کر سکتا تھا کہ ان واقعات کی تہ میں کوئی معقول حکمت بھی ہو سکتی ہے- لیکن جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے چہروں سے ذرا نقاب اٹھایا تو معلوم ہو گیا کہ یہ تمام واقعات بڑی حکمتوں پر مبنی تھے-

پس اسی طرح آپ انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی پر جلدی سے تنقید کرنے کی عادت نہ ڈالیں اور ان کی حکمتوں کے دریافت کے درپے بھی نہ ہوں- ایمان کا راستہ یہ ہے کہ اگر کہیں آپ کو شبہ گذرتا بھی ہو تو اس کو اپنی عقل کی کوتاہی سمجھیں- یہی بات دانش مندی کی بھی ہے اور دیانت کی بھی- اگر اس کا کچھ شوق دامن گیر ہو تو آپ بھی کسی خضر راہ کی تلاش رکھیے ممکن ہے کہ حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کا کوئی شمہ آپ کے علم میں آ جائے-

اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقوق شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ اگر باندیوں کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنے کی ترغیب آپؐ نے اپنی امت کو دی ہے تو اس سے اپنے نفس کو بھی عملاً مستثنیٰ نہیں رکھا اور اس طرح باندیوں کی آزادی کا سامان اپنے قول و عمل سے مہیا فرما دیا ہے- اگر اسلام کا مقصد کسی کو دائمی غلامی میں رکھنا ہوتا تو ہرگز اس سخاوت کے ساتھ باندیاں لله .....

رُکْبَتِهِ حَتّٰی تَرْکَبَ.

(رواہ البخاری فی غزوۃ خیبر ص ٦٠٦ ج ٢ و فی باب مایذکر فی الفخذ عنده فجاء رجل الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال یا نبی الله اعطیت دحیة صفیة بنت حیی سیدة قریظة و النضیر لا تصلح الالک ج ١ ص ٤٥)

(١٠٩٧) عَنْ اُمِّ حَبِیْبَةَ اَنَّهَا رَأَتْ فِی النَّوْمِ کَاَنَّ اٰتِیًا یَقُوْلُ یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ فَفَزِعَتْ وَ اَذَلَّتْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَزَوَّجُنِیْ ذکره ابن سعد کذافی العمدة ج ٥ ص ٢٠٢ و رواہ الحاکم فی المستدرک مفصلاً.

(١٠٩٨) عَنْ اُمِّ سَلِمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِیْبُهُ مُصِیْبَةٌ فَیَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اٰجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَ اخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَیْرًا مِّنْهَا فَلَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلِمَةَ قُلْتُ اَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرٌ مِنْ اَبِیْ سَلِمَةَ اَوَّلُ بَیْتٍ هَاجَرَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اِنِّیْ قُلْتُهَا فَاَخْلَفَ اللّٰهُ لِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ. (رواہ مسلم)

بعد جب ہم مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے بیٹھنے کے لیے اپنی سواری پر پردہ کا انتظام فرما رہے ہیں (اس سے اب خوب معلوم ہو گیا کہ وہ باندی کی حیثیت سے نکل کر امہات المومنین کے شرف سے مشرف ہو چکی ہیں) آپؐ اپنے اونٹ کے قریب بیٹھ کر اپنا زانو ٹیک دیتے ہیں تاکہ حضرت صفیہؓ اس پر اپنا پیر رکھ کر بآسانی اونٹ پر سوار ہو سکیں۔ (بخاری شریف)

(١٠٩٧) حضرت ام حبیبہؓ بیان فرماتی ہیں کہ انہوں نے آپ کی زوجیت میں آنے سے قبل خواب میں دیکھا تھا کہ کوئی شخص ان کو یا ام المومنین کہہ کر پکار رہا ہے اس خواب سے یہ ذرا متحیر سی ہو گئیں اور انہوں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں گے۔ (متدرک)

(١٠٩٨) حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمات پڑھ لے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے یعنی اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اٰجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَ اخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْهَا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں ضرور اس سے بہتر اس کو اور عنایت فرما دے گا۔ جب ابو سلمہؓ میرے شوہر کا انتقال ہوا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بھلا ان سے کون سا مسلمان افضل ہو سکتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے ان کلمات کو پڑھ ہی لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف بخشا۔ (مسلم شریف)

لاتے ...... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں صدیق اکبر کی صاحبزادی کے برابر بن کر نظر نہ آ سکتیں۔

(١٠٩٨) * دیکھئے یہاں بھی حضرت ام سلمہ کو کہیں دور دور تک اس کا وسوسہ نہیں گذرتا تھا کہ ایک دن ان کو ام المومنین کے خطاب سے سرفراز ہونا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آپؐ کے فرمان پر پورے یقین کے ساتھ عمل کر لیتی ہیں۔ اس کا صلہ پھر قدرت وہ دیتی ہے جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ہمارا مقصد یہاں نہ تو تعداد ازدواج کی حکمتوں پر بحث کرنا ہے اور نہ خاص ان برکات کا تذکرہ کرنا ہے جو آپ کے نکاحوں میں ظاہر ہوئیں تھیں بلکہ صرف ان احادیث کو پیش کرنا تھا جو چند ازواج مطہرات کے غیبی اشارات میں ہمارے سامنے آ گئی تھیں۔ علماء کو چاہیے کہ بقیہ ازواج مطہرات کے لیے بھی وہ اس قسم کی احادیث کی تلاش رکھیں اور ان کو بھی ان حدیثوں کے ساتھ اضافہ کر لیں۔

و من اخص خواص اهل الجنة فهيم عصمتهم من الذنوب صغائرها و كبائرها

انبیاءؑ میں اہل جنت کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں

عنوانِ مذکور درحقیقت علم کلام کا موضوع تھا لیکن اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر علم اصولِ فقہ میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے اور محدثین ومفسرین نے بھی اس میں کافی حصہ لیا ہے۔ اس لیے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس موضوع کے متعلق تھوڑا سا اظہار خیال کر دیا جائے۔ مگر ہمارا اہم مقصد ان جزئی واقعات کی توجیہ یا اُن آیتوں کی تفسیر کرنی نہیں ہے جو یہاں ملحدین کی نظروں میں ہمیشہ سے کھٹکتی چلی آ رہی ہیں بلکہ اس پر حدیثی روشنی میں صرف اصولی حیثیت سے بحث کرنی ہے۔ آیتوں کی تفسیر پر کتب تفسیر اور کتب کلام میں سیر حاصل بحثیں کی جاچکی ہیں وہاں دیکھ لی جائیں۔

مسئلہ عصمت میں اختلاف کا سبب ✽ کتب کلام وغیرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ پر غور وخوض کی ابتدائی بنیاد ہی ان آیات پر قائم کی گئی ہے جو بظاہر عصمت کے خلاف نظر آتی ہیں' اس لیے لامحالہ مسئلہ کا رخ شروع ہی سے بدل گیا ہے' پھر متکلمین کی بحث ونظر کا میدان چونکہ زیادہ تر عقلی ٹھہر چکا تھا اس لیے ان کے نزدیک کسی قطعی مسئلہ کے زیر تردد آ جانے کے لیے صرف عقلی احتمالات کا وجود بھی کافی ہو جاتا ہے چہ جائے کہ وہ مسئلہ جہاں قرآنی آیات بظاہر خلاف نظر آ رہی ہوں بھلا ان کے ذوق پر وہ کیسے قطعی مسئلہ بن سکتا تھا۔ اس کے برخلاف فقہاء کی جماعت ہے وہ ہمیشہ اپنے فیصلے واقعات کی روشنی میں کرتے ہیں اور کسی جگہ صرف عقلی احتمالات سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے یہاں بھی فقہاء حنفیہ تو تقریباً ایک زبان ہو کر انبیاء علیہم السلام کے مطلقاً عصمت کے قائل ہیں۔ اگر ان اصولی نظریات کے اختلاف کو سامنے رکھا جائے تو قیاس کہتا ہے کہ شاید اس مسئلہ میں درحقیقت کوئی اختلاف ہی نہ ہوگا۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف لفظی اختلاف کے قریب ہے جو جماعت یہاں اختلاف رکھتی ہے وہ درحقیقت یا تو اس کی قطعیت میں اختلاف رکھتی ہے یا صرف معصیت کے امکان وجواز میں کلام کر رہی ہے اور اگر ان کے وقوع کی بھی قائل ہے تو اس کی نظر ان آیات پر ہے جو بظاہر اس کے خلاف نظر آتی ہیں اور جس جماعت نے فیصلہ کی بنیاد خارجی واقعات پر رکھی ہے وہ بلا اختلافِ عصمت کی قائل ہوگئی ہے۔

ہم یہاں علمی مباحث پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ حقائق کی دنیا میں اس پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ عصمت کا مفہوم معلوم کر لیا جائے اس میں بھی علماء کے کلمات بہت منتشر ہیں۔

عصمت کی حقیقت امام ماتریدی کی نظر میں ✽ امام ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ عصمت حق تعالیٰ کی اس خاص عنایت ومہربانی کا نام ہے جو انبیاء علیہم السلام کو ہمہ وقت خدا تعالیٰ کی حکم برداری پر مستعد رکھتی ہے اور اس کی ادنیٰ سی معصیت کے ارتکاب کرنے سے بھی دور رکھتی ہے مگر اس طریقہ پر نہیں کہ یہ طاقت وقوت ہی ان کی ذات سے سلب کر لی جائے کیونکہ جس کو مکلّف بنایا گیا ہے ضرور ہے کہ اس میں صفت اختیار باقی رکھی جائے تاکہ جزاء وثواب کا مسئلہ معقول رہے اور جس مخلوق میں یہ صفت پیدا نہیں فرمائی گئی اس کو مکلّف بھی نہیں بنایا گیا پھر اس کے اعمال سے جزاء وسزاء کا تعلق بھی نہیں رکھا گیا۔ (نسیم الریاض ج ۳ ص ۵۴۶)

امام ماتریدیؒ کے ان الفاظ کی تشریح حضرت شاہ اسمٰعیل نے اپنے سادہ الفاظ میں اس طرح فرمائی ہے:

ومعنی عصمت آنست کہ انچہ بایشاں تعلق میدارد اقوال و افعال وعبادات وعادات و معاملات و مقامات واخلاق واحوال آں ہمہ راحق جل وعلا از مداخلت نفس و شیطان و خطاء ونسیان بقدرت کاملہ خود محفوظ می دارد وملائکہ حافظین رابرایشاں می گمارد تا غبار بشریت دامن پاک ایشاں رانہ آلاید. (تنبیہ ثانی درحقیقت ولایت ازمنصب امامت ص ۸)

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اقوال ہوں یا افعال وعبادات ہوں یا عادات' معاملات و مقامات ہوں یا اخلاق واحوال ان سب کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے نفس و شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ فرماتا ہے خواہ وہ خطاء ونسیان کی صورت ہی سے کیوں نہ ہوں اور اپنے حفاظت ونگرانی کرنے والے فرشتے ان کے ساتھ ساتھ رکھتا ہے تاکہ غبار بشریت بھی ان کے دامن پاک پر ذرا سا دھبہ نہ لگا سکے۔

مؤلف کے نزدیک مسئلہ عصمت میں غور وخوض کے لیے سب سے اہم نقطہ انبیاء علیہم السلام کی صفات وملکات سے بحث ہے ✽ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ چونکہ خود ان کی ذات اور ان ہی کے کار وکردار سے متعلق ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں سب سے پہلے ان کے جوہر فطرت ان کی تربیت' ان کی صفات وملکات' ان کی بعثت کی غایت وغرض' ان کے منصب کی اہمیت سے پھر ان کے طریق تعلیم سے اور جو اس کے اثرات خود ان کی ذات' ان کے ہم جلیسوں اور ان کے تمام ماحول پر پھر ان کی تمام امت پر نمایاں ہوتے چلے آئے ہیں ان سب سے بحث کی جائے۔ اگر یہ تمام امور ان کے حق میں طے ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی معصومیت کا عقیدہ واقعات کی روشنی میں ایک بدیہی مسئلہ ہو جانا چاہیے۔ اس تفصیلی نظر کے بعد جب آپ ان آیات کی طرف نظر اٹھائیں گے تو یقیناً آپ کا فیصلہ بدل جائے گا اور جو آیات پہلے آپ کو اس مسئلہ کے خلاف نظر آ رہی تھیں اب وہی اس مسئلہ کا سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگیں گی۔ یہاں براہ راست صرف ان خطاباتِ الٰہیہ پر فیصلہ کر ڈالنا جن کے لب ولہجہ میں حالات و مخاطب کی رعایت سے گرمی ونرمی پیدا ہو جانی فصاحت وبلاغت کا ایک عام باب ہے مناسب نہیں ہے۔ یہاں نہ تو صرف عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں صرف ''روح اللہ'' اور ''کلمۃ اللہ'' کی نسبت سے کوئی نیا مقام تراش لینا درست ہے اور اسی طرح نہ حق تعالیٰ کے اپنے مخصوص بندوں کے ساتھ کسی عتاب آمیز لہجہ سے ان کے خلاف کوئی اصولی نتیجہ نکال لینا صحیح ہے۔

اس حقیقت کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد اگر اوراق نقل میں کوئی جزئی واقعہ ایسا ملتا بھی ہو جو ایک ثابت شدہ حقیقت کے خلاف نظر آئے تو کسی عاقل کے لیے بھی محض ایک مشتبہ یا مجمل اور شاذ واقعہ کی بنیاد پر اس قطعی فیصلہ کو رد کر دینا جائز نہیں ہو سکتا آج بھی تاریخ کے اصولی فیصلے جزئی واقعات کی بناء پر کبھی قابل ترمیم تصور نہیں کیے جاتے بلکہ ان واقعات ہی کے لیے وجوہ واسباب تلاش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کو اصولی تحقیق سے کوئی ٹکراؤ باقی نہ رہے اس لیے ہمارے نزدیک یہاں بھی بحث ونظر کا یہی طریقہ قائم رکھنا چاہیے۔

لہٰذا اگر مفسرین ومحدثین نے اس جگہ کچھ جزئی واقعات کی توجیہات بیان فرمائی ہیں تو ان کو صرف ان کے حسن ظن کا نتیجہ سمجھ لینا صحیح نہیں بلکہ وہ بھی اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں۔ پھر جیسا اس قسم کے مقامات میں گفتگو کرتے کرتے قریب وبعید ہر قسم کے احتمالات زیر بحث آ جاتے ہیں وہ یہاں بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ ادھر جب علماء اسلام کو اعداد اسلام کے ساتھ بحثوں کی نوبتیں

آئیں تو بحث و جدل کے میدان میں پڑ کر ایک معقول سے معقول بات بھی جس طرح محل بحث بن جایا کرتی ہے یہ مسئلہ بھی نظری اور محل بحث مسئلہ بن گیا ہے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ اقوام و امم نے اپنی نااہلیت کی بدولت اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی کوئی ایسی مستند تاریخ ہمارے سامنے نہیں چھوڑی جو کسی بنیادی مسئلہ کے فیصلے کے لیے قابل اعتماد سند بنتی ۔ان کی سیرت کے جو گنے چنے واقعات ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں ان میں قابل اعتماد حصہ صرف اتنا ہی ہے جو کسی تقریب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے اور بس۔ اس لیے اب ہمیں صرف آپ ہی کی حیاتِ طیبہ پر غور کرنا ہے۔ کیونکہ بلحاظِ نبوت و رسالت یہ تمام جماعت ایک ہی جماعت تھی نبوت کے لوازم سب میں یکساں تھے فرق جو کچھ تھا وہ فضائل و کمالات میں تھا۔قرآن کریم نے بھی آپ کے معاملہ میں جابجا بیان کا یہی نہج اختیار کیا ہے اور جب کبھی کفار نے آپ کی دعوت پر اعتراض کیا یا آپ کی ذات پر حملے کیے یا آپ سے ناجائز فرمائشیں شروع کیں یا ایک موقع پر خود مسلمانوں کی جماعت آپ کی وفات کی خبر سے ضرورت سے زیادہ دل شکستہ ہونے لگی تو ان سے یہی ایک بات کہی گئی ہے کہ یہ سنتِ سب رسولوں کی سنت ہے جو پہلے بھی سب پر جاری ہوتی چلی آئی ہے لہٰذا اگر آپ کے اوپر بھی جاری ہوتی ہے تو تعجب کیوں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہے:

مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِکَ. (فصلت:۴۳)	تم سے بھی وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے پیغمبروں کو کہی گئی ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کی تسلی کے لیے بھی یہی فرمایا **وما محمد الا رسول** -محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسولوں کی طرح ایک رسول ہی ہیں اور جس طرح دنیا سے گذرنے کی سنت ان پر جاری ہوتی رہی ہے اگر آپ پر بھی جاری ہو جائے تو گھبرانے کی اور اس کو نئی بات سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔قرآن کریم کے اس طرز سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں نفس نبوت و رسالت کے جو لوازم تھے وہ سب میں یکساں تھے۔[1] اس لیے اگر ہمیں آپ کی حیاتِ طیبہ سے آپ کی پوری پوری معصومیت کا ثبوت ملتا ہے تو پھر جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں بھی یہی ناطق فیصلہ سمجھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور عصمت ایک ہی حقیقت کے دو اعتبارات سے دو نام ہیں یعنی جو معصوم ہے وہ صرف نبی ہی کی ایک ذات ہے اور جو نبی ہے وہ یقیناً معصوم بھی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ نبوت کسب و ریاضات سے بتدریج حاصل ہونے والی نعمتوں میں سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ نقص سے کمال تک کی راہ طے کرنے میں معصیتوں کی ٹھوکریں لگ جائیں لیکن جہاں کسب و اکتساب کا ذرا دخل نہ ہو اور معاملہ براہِ راست خدا تعالیٰ کے اجتباء و اصطفاء کا آ جائے۔ پھر وہاں کسی ٹھوکر کا احتمال کیا ممکن۔حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں ''از رفتن تا بردن فرق ظاہر است'' یعنی خود چلنے میں اور کسی دوسرے کے لیے چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔صفت اجتباء و اصطفاء کے تحت پردرو خود نہیں چلتے کہ بشری ضعف ان کے لیے ٹھوکر کا باعث بن جائے۔ یہاں ان

[1] امام قرطبیؒ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں: ان المنع من التفضیل انما ھو من جھة النبوة التی ھی خصلة واحدة لا تفاضل فیھا و انما التفاضل فی الاحوال و الخصوص و الکرامات..... تفسیر قرطبی ج۳ ص۲۶۳۔

کو بچا بچا کر خود قدرت لے چلتی ہے- ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ (الحج:۷۵)

''یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو نوع ملکی اور نوع بشری میں سے اپنی رسالت کے لیے انتخاب براہِ راست خود ہی فرماتی ہے-''

﴿وَ اصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا﴾ (الطور:۴۸)

''آپ اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کیجئے- آپ تو ہماری نگرانی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں-''

﴿وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡئًا قَلِیۡلًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۴)

''اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو قریب تھا کہ کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک جاتے-''

ترجمان السنۃ ج ا ص ۲۸۸ و ج ا ص ۲۸۹ میں ایک صحیح حدیث آپ کے ملاحظہ سے گزر چکی ہے کہ بندہ عباداتِ نافلہ کرتے کرتے آخر اس بلند مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں رضاء الٰہی میں وہ اس طرح گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ پھر نہ خود اس کی کوئی ہستی باقی رہتی ہے اور نہ اس کے اعمال کی بلکہ وہ سب براہِ راست حضرت حق سبحانہ کی طرف منسوب ہونے لگتے ہیں- وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے تو صرف وہی جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو اور ہاتھ بڑھاتا اور قدم اٹھاتا ہے تو صرف اسی طرف جدھر حق جل وعلا کی مرضی ہوتی ہے اب سوچئے کہ اس کی اس طرح گم شدگی کے بعد اس کے اعضاء و جوارح میں کیا کسی معصیت کے لیے حرکت کرنے کی مجال باقی رہ سکتی ہے اور جب اس کے اعضاء مرضیات ایزدی کے اس طرح منقاد و مطیع بن جائیں تو اس کے اعمال میں کیا کسی ادنیٰ سی معصیت وہ بھی ارادی معصیت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے- جب ان افراد کا حال یہ ہو جن کے کمالات کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں تو پھر ان اولوالعزم ہستیوں کی عصمت کا پوچھنا کیا ہے جن کو یہ نعمت صفت اجتباء و اصطفاء کی بدولت روز اوّل ہی سے میسر ہو- جن کی عصمت کے اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو ان کے نقش قدم پر چل پڑا اس کے اعضاء بھی خدائی معصیت کے لیے شل ہو گئے- انبیاء علیہم السلام کی اس اجتبائی صفت کا نظارہ کرنے کے لیے صوفیاء کرام اور ان سے پہلے صحابہ عظام کے اعمال پر نظر ڈال لینا چاہیے- یہاں حدیث نمبر ۱۴۱ ترجمان السنۃ ج ا ص ۲۸۸ کے نوٹ پر نظر ڈال لینا ضروری ہے- اس جگہ ترجمان السنۃ کا مقدمہ از ص ۱۳۰ تا ۱۳۶ ملاحظہ فرمالیجئے-

انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی خلقت ہی عام انسانوں سے الگ ہوتی ہے' ان کی تربیت کا طریقہ بھی سب سے الگ ہوتا ہے- ان کی طفولیت اور ان کا شباب بھی الگ' ان کا تجرد اور ان کی حیات ازدواجی بھی الگ' ان کا رضاء و غضب اور جد و ہزل بھی سب سے الگ' ان کی عبادت بھی سب سے الگ ہوتی ہے اور ان کا استغفار و توبہ بھی سب سے الگ' ان کا ثواب بھی سب سے الگ ہوتا ہے اور ان سے مواخذہ بھی سب سے الگ- اور یہ سب کچھ اس لیے کہ نظر ربوبیت شروع ہی سے خود ایک الگ نوع کی طرح ان کو پیدا فرماتی ہے اور پھر اپنی رسالت کے لیے خود ہی ان کا انتخاب فرماتی ہے-

﴿وَ رَبُّکَ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخۡتَارُ ؕ مَا کَانَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ﴾ (القصص:۶۸)

''یعنی پیدا کرنا اور پھر پیدا کر کے جس کو چاہیں اس کو چھانٹ لینا یہ دونوں صفتیں تیرے پروردگار کے ساتھ مخصوص ہیں اس میں کسی کا حصہ نہیں لگتا''-

﴿وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ (الزخرف: ۳۱)

''یعنی کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے شخص کے اوپر کیوں نہ اتارا گیا''۔

﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ﴾ (الزخرف: ۳۲)

''اچھا کیا تیرے پروردگار کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں''۔

اور یہ انتخاب وہ خود اس لیے کرتی ہے کہ اس منصب جلیل کی صلاحیتوں کو اس کے سواء کوئی دوسرا پا ہی نہیں سکتا۔

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

''اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کا کون سا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے''۔

انبیاء علیہم السلام کا جوہر فطرت ❋ ان کی خلقت اور ان کے اختیار و انتخاب کی یہ اہمیت کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ بھی مشرکوں میں ایک مشرک' کاہنوں میں ایک کاہن اور شاعروں میں ایک شاعر بن کر پیدا ہوں والعیاذ باللہ یا اس لیے کہ شرک و کفر کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں توحید وعبودیت کی شمع فروزاں بن کر چمکیں- اسی لیے اور یقیناً اسی لیے ان کا خاکی قالب گو وہی ہوتا ہے جو عام انسانوں کا گھر ان کا جوہر فطرت خلقۃً ایسا پاکیزہ اور منور بنایا جاتا ہے کہ اس کو حرفِ معصیت سے ذرا آشنائی نہیں ہوتی پھر اس کو طرح طرح سے اور مجلی کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کے خواب اور بیداری کی دونوں حالتیں یکساں ہوتی ہیں وہ اپنی حالت خواب میں بھی عام انسانوں کی بیداری سے زیادہ بیدار رہتے ہیں محبت و بغض کے طوفان خیز جذبات ان کے بحر اعتدال میں ذرا سی جنبش بھی پیدا نہیں کر سکتے وہ ہر حالت میں انصاف پسند' حق گو اور بے لاگ انسان ہوتے ہیں خلق اللہ کی ہمدردی سے ان کے سینے اس درجہ لبریز ہوتے ہیں کہ ان کی غم خواری میں ان کی جان گھلی جاتی ہے- لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ان کے سینے حق جل وعلا کے احکام رضاء و غضب کے لیے آئینہ ہوتے ہیں اور ان کی ان ہی کامل صلاحیتوں کی وجہ سے خالق کائنات براہ راست خود ان کو اپنی شرف ہم کلامی سے نواز دیتا ہے- وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰى اٰتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا. یہ شرف یا صرف اُس نوع ملکی کو میسر ہے جو فطرۃً معصوم پیدا کی گئی ہے ایسی معصوم کہ اس کو حق تعالیٰ کی معصیت کرنے کی قدرت ہی نہیں دی گئی یا پھر نوع بشری میں ان مخصوص افراد کو میسر ہے جن میں اختیار کی صفت گو موجود ہو مگر ان کی معصومیت پر فرشتوں کی معصومیت بھی رشک کرتی ہے اس لیے ارشاد ہوا ہے اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ (الحج: ۷۵) آیت بالا میں بعض انسان اور فرشتوں کو غالباً اسی نکتہ کے پیش نظر جمع کیا گیا ہے کہ نظر اصطفاء جب اپنی رسالت کے لیے کسی کا انتخاب کرنا چاہتی تو اسی کا انتخاب کرتی ہے جس میں اس کی نافرمانی کرنے کا کوئی احتمال نہ ہو اس لیے یا وہ اس نوع کے افراد کا انتخاب کرتی ہے جس میں معصیت کرنے کا اختیار ہی نہیں اور اگر دوسری نوع میں کسی کا انتخاب کرتی ہے تو ان افراد کا کرتی ہے جن سے معصیت کے صدور کا کوئی احتمال نہیں- ملوک دنیا بھی انتخاب میں کسی ایسے شخص کا انتخاب نہیں کرتے جس میں ان کے نزدیک ایک فیصدی بھی ان کے خلاف جانے کا احتمال ممکن ہو لیکن چونکہ ان کا علم ناقص در ناقص ہوتا ہے اس لیے اس میں ان کو غلطیاں لگتی ہیں اور بعض مرتبہ ان کے تباہ کن نتائج بھی دیکھنے پڑ جاتے ہیں- پروردگار عالم کے علم میں یہ امکان نہیں اس لیے اپنی رسالت کے انتخاب فرمانے کا حق اس نے خود اپنا

رکھا ہے اور اس کو نہ تو کسی انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف رکھا ہے اور نہ کسی کی دعاء و سفارش پر منصب نبوت کی اہمیت خدا تعالیٰ کی رسالت و سفارت کا کام اتنا نازک ہے کہ اگر اس میں ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو کارخانہ رسالت سارا کا سارا درہم و برہم ہو جائے۔

انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں ٭ خدا تعالیٰ کے مقدس رسول دنیا میں آ کر نظام مدارس کی طرح صرف زبانی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان کی تعلیم کا نقشہ وہ ہوتا ہے جو ماں باپ کا اپنی اولاد کے لیے ہوا کرتا ہے یعنی جس طرح بچہ والدین کی فصیح یا غیر فصیح زبان سن سن کر اسی طرح کی زبان سیکھتا چلا جاتا ہے اور جس طرح کہ ان کے مہذب یا غیر مہذب افعال دیکھ دیکھ کر اسی کی نقل اتارنے لگتا ہے۔ اسی طرح رسول کی مجسم ذات تمام امت کے لیے نمونہ بنا کر بھیج دی جاتی ہے اور مخلوق خدا کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جس طرح وہ اس کے مقدس کلمات سن کر علم دین حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس کی ہر ہر نقل و حرکت کو سامنے رکھ کر دین کا دوسرا حصہ سیکھیں یہاں قول و فعل کی تخصیص کے بغیر رسول کی ذات تمام دین کا مکمل نقشہ ہوتی ہے اسی لیے ہر ہر امر میں ان کی اتباع کا حکم دیا جاتا ہے اگر یہاں کچھ احکام مستثنیٰ ہو سکتے ہیں تو صرف وہ کہ جن کے متعلق خود وہی کسی خصوصیت کا اعلان فرما دے۔ ان کو اس کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو کسی مصلحت کے پیش نظر عام قانون سے کسی کو مستثنیٰ بھی فرما دیں کیونکہ رسولوں کے عواطف و میلانات بھی اللہ تعالیٰ ہی کے زیر نگرانی رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی عام تشریع اور اس سے استثناء یہ دونوں باتیں اسی کی مشیت کا ظل ہوتی ہیں ان کا سکوت اختیار کر لینا بلکہ کسی جانب سے منہ موڑ لینا یا ہاتھ کا ذرا اشارہ کر دینا جیسے امور بھی دین کے باب میں حجت شرعیہ شمار ہوتے ہیں۔

انبیاءؑ پیدائشی طور پر نفس مطمئنہ رکھتے ہیں اور ضلالت کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہیں ٭ انسان میں شر کی طاقتیں صرف دو ہیں ایک نفس یہ اندرونی طاقت ہے۔ دوسری شیطان یہ بیرونی طاقت ہے یہاں ان کو پیدائشی طور پر وہ نفس مرحمت ہوتا ہے جو فطرۃً ہر معصیت سے نفور اور نشۂ عبودیت سے چور ہوتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے ولادت کے بعد ہی جو کلمہ نکلا تھا وہ یہی تھا۔ **اِنی عبداللّٰہ**.

اب اس سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ وہ اپنے غیر شعوری دورِ حیات میں بھی توحید و عبودیت کا کتنا شعور رکھتے ہیں اگر اس دار الابتلاء میں اپنی ابتدائی حیات میں اپنی شانِ عبودیت کا عام طور پر اس طرح اظہار کر دینا کہیں خلافِ مصلحت نہ ہوتا تو شاید خدا تعالیٰ کا ہر ہر نبی اپنی ولادت کے ساتھ ان ہی کلمات سے مترنم نظر آتا مگر حکیم مطلق کی حکمت نے اس قسم کی کھلی ہوئی شہادت صرف اسی رسول کے ساتھ خاص فرما دی تھی جن پر خدائی کی تہمت لگائی جانے والی تھی تاکہ الوہیت کی اس بہتان طرازی میں کسی کے لیے بھی عذر و معذرت کا موقعہ باقی نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام کے نفوس میں تزکیہ کی یہ صفت اتنی کامل ہو جاتی ہے کہ آزمائش کے کسی نازک سے نازک موقعہ پر ان سے ذرا سی کمزوری کا احتمال نہیں ہوتا۔ یہاں زنانِ مصر اور حضرت یوسف علیہ السلام کے نفس مطمئنہ کی استقامت کا نقشہ سامنے رکھیے تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ان کی آزمائش کا میدان جتنا خطرناک ہوتا چلا گیا ان کی عفتِ نفس کا جوہر اتنا ہی اور زیادہ کھلتا چلا گیا۔ انبیاء علیہم السلام خود تو کسی خلاف ورزی کا تصور کیا لا سکتے ہیں دوسروں کی خلاف ورزی بھی ان کے آئینہ فطرت کو مکدر کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اس لیے نہ وہ احکام الٰہیہ کے خلاف خود کوئی قدم اٹھاتے ہیں اور نہ کسی کا قدم

ان کے خلاف اٹھتا ہوا دیکھنا برداشت کر سکتے ہیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت قرآن کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمالیجئے کتنی مشقتوں اور تمناؤں کے بعد تو وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے پھر کتنے عہد و پیمان کرنے کے بعد بھی صرف اپنی نبیانہ فطرت کے بدولت چند قدم بھی ان کے ساتھ نہ چل سکے - حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ اب ان کے لیے صرف دو ہی راہیں باقی رہ گئی ہیں رفاقت قائم رکھنی ہے تو ہر معاملہ میں سکوت کرنا ہوگا اور اگر ٹوکنا ہے تو فراق - تو بڑی خوشی کے ساتھ انہوں نے دوسری صورت کو پسند فرمالیا مگر اس کا اقرار نہ کیا کہ اپنی شریعت کے خلاف ایک قدم بھی اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ سکوت کر سکیں گے - حضرت خضر علیہ السلام کو ان کی اس نبیانہ فطرت کا پورا اندازہ تھا اس لیے انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ سفر شروع کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے ساتھ رہنا اور ہر معاملہ پر سکوت کرنا یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے آپ اس کا تجربہ نہ کریں' چنانچہ وہی ہوا - قرآن کریم نے اس سرگزشت کی اتنی اہمیت محسوس کی کہ ایک سورت میں مستقل طور پر اس کی پوری پوری تفصیلات بیان فرمادیں تاکہ منجملہ اور رموز کے یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ نبی کی معصومانہ فطرت کس درجہ بلند ہوتی ہے - خود معصیت کرنا تو درکنار کسی دوسرے کا قدم معصیت کی طرف اٹھتا ہوا دیکھ کر بھی وہ سکوت کی قدرت نہیں رکھتے اس جگہ اگر ہم حضرت خضر علیہ السلام کے افعال اور ہر عمل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے چینی اور بعد میں حقیقت کے تسلی بخش انکشاف اور ظاہری افعال کی ناموزونیت اور باطنی مصالح کی خوشنمائی کی تفصیل کریں تو ہمارا مضمون بہت طویل ہو جائے گا - ہم نے اپنے محل پر اس کی طرف صرف چند اشارات کر دیئے ہیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان میں ان پر غور کر لیا جائے -

یہ تو انسان کی اندرونی شر کی طاقت تھی اور اسی کا نام نفس امارہ ہے - شریعتوں کا سب سے اہم مقصد اسی نفس امارہ کی شائستگی اور تہذیب ہے - جب کوئی رسول دنیا میں آیا تو اس نے اپنی فیض صحبت اور اتباع شریعت کے ذریعہ عام مخلوق کے نفوس کی اصلاح کی جدوجہد کی ہے - پھر جتنے انسانوں کے نصیب میں سعادت لکھی جاچکی تھی انہوں نے خواہشات واہوا کا راستہ چھوڑ کر رسولوں کی پیروی کی یہاں تک کہ ان کے نفوس کی سرشت بدل گئی اور شریعت کے خلاف امور میں ان کے لیے کوئی لذت باقی نہ رہی پھر کسی صاحب نصیب کا مقدر اور جاگا تو اس کے نفس کو اتباع شریعت میں وہی طبعی راحت محسوس ہونے لگی جو پہلے کبھی شریعت کے خلاف امور میں محسوس ہوا کرتی تھی اب اس کا نام امارہ کی بجائے بدل کر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے - دیکھو ترجمان السنہ ج ا ص رہے انبیاء علیہم السلام تو ان کے نفوس پیدائشی طور پر مطمئنہ ہوتے ہیں وہ اپنے کسی دور حیات میں بھی کسی خفیف ناشایاں حرکت کی طرف میلان نہیں رکھتے - دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب سن کے دلربا منظر کے مقابلہ پر اپنے ملکوتی نفس کے اطمینان کا اظہار فرمایا تو اس کو بھی بڑی بلند آہنگی سے نہیں بلکہ بڑے نرم لہجہ میں ادا فرمایا اور یہ ان کے اطمینان نفس کا پہلے سے بڑھ کر مظاہرہ تھا اگر ان کی جگہ یہاں کوئی اور انسان ہوتا تو نہ معلوم اس زبردست آزمائش اور اس کے مقابلہ میں اپنی اس روشن کامیابی پر نہ معلوم تعریف وتزکیہ کی کتنی لن ترانیاں ہانکتا مگر جو فقرہ یہاں ان کی زبان سے نکلا وہ صرف یہ تھا ﴿وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ یعنی میرے اس استقلال میری اس پاک بازی وعفت اور میرے اس شان استغناء کا حاصل دعوی تقدس کرنا نہیں ہے اور یہ دعویٰ میں کیونکر کر سکتا ہوں جب کہ نفس کی بالعموم خصلت صرف برائی پر برانگیختہ کرنا ہے - یہ دوسری بات ہے کہ

رحمت ایزدی نے یہاں اپنے کسی خاص بندہ کے نفس کی سرشت بدل دی ہو مگر سانپ کے زہر کی پوٹلی اگر توڑ بھی دی جائے پھر بھی سانپ ڈرنے ہی کی چیز ہوتا ہے- غور فرمائیے کہ جب اپنے نفس کے متعلق دعویٰ تقدس کی نفی فرمائی تو یہاں "نفسی" (میرا نفس) کا لفظ فرمایا- پھر جب اس کا سبب بیان فرمایا تو وہاں "نفسی" کی بجائے "ان النفس" کا لفظ فرمایا ہے- یعنی میرے اس دعویٰ تقدس سے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میرے نفس میں بھی امارگی کی صفت موجود ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اگر کسی ناشائستہ جنس کا کوئی فرد شاذ و نادر طور پر شائستہ سے شائستہ بھی نکل آئے تو بھی اس جنس کی مذمت اپنی جگہ بحال ہی رہتی ہے- یہاں ان کا پہلا جملہ تو ان کی شان تواضع کا مظہر ہے اور "ان النفس لا مارة بالسوء" فرمانا یہ ایک حقیقت کا بیان ہے عام انسانوں کے ایک ہی کلام میں یہ توازن نہیں مل سکتا جب وہ تواضع پر اترتے ہیں تو حقیقت کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے اور جب حقیقت کے بیان کرنے پر آتے ہیں تو ان کی تواضع کا پلّہ ہلکا نظر آنے لگتا ہے انبیاء علیہم السلام کی نہ تو تواضع کسی تصنع سے ہوتی ہے اور نہ اظہار حقیقت کسی تکلف سے اس لیے وہ ہر موقعہ پر بے ارادہ ان دونوں باتوں کو نبھائے چلے جاتے ہیں-

یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ انبیاء علیہم السلام کے نفس کا کچھ اندازہ لگائیں ان کے عمل سے بھی اور خود ان کے بیان سے بھی جب ان کے عمل سے یہی ثابت ہو کہ کسی موقعہ پر ان کی استقامت میں ذرا سی لغزش نہیں ہو سکی اور ان کی تواضع کے پر زور کلمات میں بھی ایک حرف ایسا نہ مل سکا جس میں ان کے نفس کے خلاف ادنیٰ سا اشارہ بھی ہو تو پھر ان کی عصمت کے خلاف ہم کو کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالنا کتنی بڑی بے احتیاطی ہوگی-

انبیاء علیہم السلام کی برکات صحابہ اور ماحول پر ✻ اب رہی بیرونی طاقت یعنی شیطان تو ان کے تقدس کے سامنے وہ بھی اس طرح بے چارہ اور سرنگوں ہو جاتی ہے کہ کسی برائی کی دعوت دینے کا اس میں کوئی حوصلہ ہی باقی نہیں رہتا بلکہ جس طرح ایک مقہور دشمن کے لیے ساز کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا اسی طرح یہاں شیطان کو بھی طوعاً و کرہاً ان کی ملکی طاقت کے ہم آہنگ ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا- پھر ان کی اس قہرمانی کا اثر صرف ان کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ حسب مناسب ان کے ہم جلیس اور رفقاء سے تجاوز کر کے اس تمام خطہ کو بھی محیط ہو جاتا ہے جو ان کی بعثت کا میدان ہوتا ہے- ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے شیاطین بھی دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی ہر میدان میں شکست کھاتے کھاتے اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اگر ہزار کوشش کے بعد کسی سے کوئی معصیت سرزد ہو گئی تو اسی کو اپنی بڑی کامیابی تصور کرنے لگتے ہیں اور جس طرح ہر ضعیف اپنے سے قوی تر سے ڈرا کرتا ہے اسی طرح شیاطین بھی توحید کے ان علمبرداروں سے ہمہ وقت ترساں ولرزاں نظر آنے لگتے ہیں' اور کسی کسی کی دینی شدت سے تو اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ جس طرف اس کا گذر ہو جائے وہ اس راستہ ہی سے کترا کر نکل جاتے ہیں ایک طرف تو ضلالت کی طاقتوں یعنی نفس و شیطان کی پسپائی اور زبونی کا عالم یہ ہوتا ہے' دوسری طرف ملکوتی طاقتیں اپنے پورے عروج پر آ جاتی ہیں اور ان کے اثرات بھی اسی طرح متعدی ہو کر عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلنے لگتے ہیں اسی لیے مقابلہ کے ہر میدان میں مستقل فتح و کامرانی ان کا حصہ ہو جاتی ہے اور دائمی ذلت و ناکامی نصیب اعداء بن جاتی ہے-

اعتقادات و عادات کی دنیا آباء و اجداد کی رسومات اور فطری خو بو اتنی تیزی کے ساتھ بدلنے لگتی ہے کہ منکرین کو یہ گمان

کرنے کے سواء کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ ضرور یہ جادو یا سحر کا اثر ہے-مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ جہاں فرش سے عرش تک عصمت و تقدس ہی کا سماں بندھا ہوا ہو ضلالت کی قوتیں دن بدن مضمحل ہو ہو کر فنا ہو رہی ہوں وہاں حق کی فتح و ظفر اور اسباب ہدایت میں نمو اسی طرح فطری بن جاتا ہے جیسا کہ موسم خزاں میں زمین کا خشک ہو جانا اور موسم بہار میں چپہ چپہ کا سبزہ زار ہو جانا فطری ہو جاتا ہے- جس طرح موسم بہار کے چند قطرے صحراؤں کا رنگ بدل دیتے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد قلب و دماغ کا رنگ و بو بھی بدلنے لگتا ہے- وہ سینے جو کبھی ظلمات کفر سے تیرہ و تاریک تھے ان کی فیض صحبت سے ایسے جگمگا اٹھتے ہیں گویا عالم قدس کی وہ سب سے بلند جلوہ گاہ ہیں- حضور و یقین کی بیش بہا نعمت ان کو آسانی اس درجہ پر ہاتھ آ جاتی ہے جیسا عالم آخرت ان کے سامنے کھلا ہوا رکھا ہے- اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے کوئی کوئی فرشتوں کی جماعت میں اس طرح بھی گھل مل جاتا ہے کہ وہ اس کو سلام کرتے ہیں اور یہ اس کو سنتا ہے- یہ تمام کرشمے اس مرکز نور کے ہوتے ہیں جو ان کے درمیان آفتاب درخشاں کی طرح موجود ہوتا ہے اور اسی کے قلب مبارک کے انسلاک کے ساتھ دوسروں کے قلوب میں بھی حسب استعداد یہ نور اس طرح تقسیم ہوتا رہتا ہے جس طرح کہ مختلف قوتوں کے بلبوں میں پاور ہاؤس سے روشنی تقسیم ہوتی رہتی ہے- اس فیضان بصیرت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء کی نظروں میں بھی متاع دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی- دل فریب نظاروں کی فریب کاری ان پر بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے اور آخرت کا جزم و یقین ان کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ معصیت کی جرأت کرنا تو درکنار نا موزوں خطرات اور وساوس کا دل میں گذرنا بھی ان کے لیے اتنا شاق ہو جاتا ہے کہ اپنا جل کر خاک ہو جانا ان کو اس سے بدرجہا بہتر معلوم ہونے لگتا ہے- دیکھو ترجمان السنہ ج ۱ ص ۲۸۰ اور اگر کسی سے شاذ و نادر حالات میں معصیت کا صدور ہو جاتا ہے تو وہ آخرت کی گرفت کے مقابلہ میں شریعت کی سخت سے سخت سزا کے نفاذ پر اس طرح بے چین و مضطر ہو جاتا ہے گویا اس کی ساری راحت اور کامل سرور اس سزا کے نفاذ ہی میں ہے- اب ان کے اس پاکیزہ ماحول اور اس قدسی صفت جماعت کو سامنے رکھیے پھر ان کی بلند صفات پر بھی نظر ڈالیے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ جن کی ذاتی صفات یہ ہوں اور جن کے اثرات سے ماحول اتنا پاکیزہ بن جاتا ہو کیا ان سے کسی معصیت کا صدور ہو سکتا ہے-

انبیاء علیہم السلام کے خصائل و عادات کا اثر ان کی امتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا والد کا اس کی اولاد پر بلکہ اس سے بڑھ کر ✵ یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح استاد کے خصائل اس کے شاگردوں میں اور والدین کے ان کی اولاد میں منتقل ہونے ضروری ہوتے ہیں' اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے کمالات و نقائص کا ظہور بھی ان کی امتوں میں لازمی ہوتا ہے- حضرت آدم علیہ السلام سے خطاء و نسیان کا ایک قدم اٹھ گیا تو یہی ان کی اولاد کی سرشت بن گئی' یہ بات دوسری ہے کہ جو مؤاخذہ اس پر ہونا تھا وہ ان سے ہی ہو لیا اور جب رحمت ایزدی نے اصل انسانی سے اس کو درگزر فرما دیا تو اب وہ نسل انسانی کے لیے بھی قابل چشم پوشی بن گیا- اگر کہیں معصیت کرنی انبیاء علیہم السلام کی سرشت میں داخل ہو جائے (والعیاذ باللہ) تو عاصی انسانوں کا بیڑا بحر عصیان میں غرق ہو کر رہ جائے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شب معراج میں دو جام پیش کیے گئے ایک دودھ کا دوسرا شراب کا- نبی کی معصوم فطرت نے فوراً آگے بڑھ کر دودھ کا جام لے لیا- آپ سے کہا گیا کہ اس تخییر و انتخاب

کو معمولی بات نہ سمجھنا اگر کہیں آپ مے کا جام لے لیتے تو معاملہ صرف اسی پر ختم نہ تھا بلکہ آپ کی ساری اُمت گرداب ضلالت میں غرق ہوکر رہ جاتی سبحان اللہ! عین تعظیم واکرام کی شب میں ایسے ایسے نازک اور خطرناک امتحان بھی گذر رہے تھے مگر جب قدرت کو اپنے انعامات واکرام کی تکمیل منظور تھی تو آپ کو اس انعام کی بشارت سے کیسے محروم رکھا جاسکتا تھا جس کے لیے نبی کا قلب سب سے زیادہ بے چین ہوتا ہے یعنی امت کی بہبودی بے شک امتحان بہت خطرناک تھا لیکن جب تک معاملہ کی ہولناکی معلوم نہ ہو اس وقت تک اس سے نجات کی نعمت کا بھی پورا پورا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ان سطور میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہؓ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ایک حصہ تو ترجمان السنہ کی حدیثوں کے ضمن میں پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے اور جو باقی رہ گیا ہے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ احادیث ہی کی روشنی میں ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ ان کو بیک وقت سامنے رکھ کر یہ فیصلہ فرمالیجئے کہ ان نفوسِ قدسیہ سے کیا عمداً کسی معصیت کا ارتکاب کرنا ممکن ہے؟ یہ واضح رہے کہ معصیت کی جو قسم بھی ہے اس میں قصد وارادہ ہونا ضروری ہے۔ انسان کے وہ افعال جو اس کے قصد واختیار سے نہ ہوں وہ معصیت کی تعریف میں نہیں آتے۔ پس جب نافرمانی اور قصداً نافرمانی کا تصور عام انسانوں کے تقدس پر بدنما داغ سمجھا جاتا ہے تو پھر کیا وہ انبیاء علیہم السلام کے لیے شایانِ شان سمجھا جاسکتا ہے؟۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کی ایک ذوقی اور وجدانی دلیل یہ بھی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں جس کی شہادت گزشتہ اوراق میں آپ کے سامنے گذر چکی ہے تو پھر اہل جنت کے صفات میں سے اگر معصومیت کی صفت بھی ان میں موجود ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ لہٰذا یہ جنتی جنت میں خدا تعالیٰ کی معصیت کریں گے نہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں معصیت کرتے ہیں اسی لیے اپنی اُخروی فلاح وبہبود کا ان کو جزم حاصل ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شانِ تواضع اور اپنی کمال خوف وخشیت کے باوجود مرض الوفات میں حضرت فاطمہؓ سے پورے وثوق کے ساتھ فرمایا۔ **"لاکرب علی ابیک بعد الیوم"** آج کے بعد تیرے والد پر بے چینی کا نام ونشان ہوگا۔ سب چین ہی چین ہوگا اور جب کہ یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب اپنی امتوں کے لیے شافع ہوں گے تو کیا جو خود مجرم ہوں وہ شفاعت کے مستحق ہوسکتے ہیں شفاعت کبریٰ کے لیے جو کلمات انبیاء علیہم السلام نے استعمال فرمائے وہ اس لیے تھے کہ یہ مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پہلے سے رزرو ہو چکا تھا۔ تمام جہان کے حق میں سفارش وہی کرسکتا ہے جس کی ساری عمر کے متعلق مغفرت وعفو کا حتمی اعلان ہو چکا ہو۔ اگر آپ کے حق میں یہ اعلان نہ ہو چکا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ آپ بھی رب العزت کی بارگاہ بلند میں پیش ہونے سے شاید معذرت کا کوئی پیرایہ اختیار فرمالیتے لیکن چونکہ رحمت حق نے اس عقدہ کشائی کے لیے آپ کو منتخب فرمالیا تھا اس لیے آپ اہل محشر سے بڑے تسلی کے انداز میں فرمائیں گے **"انا لها انا لها"** "بے شک آج شفاعت کرنے کا حق میرا ہی ہے۔" اس کے بعد جب باب شفاعت کھل جائے گا تو پھر ہر ہر نبی اپنی اپنی امت کی شفاعت کرے گا۔ اس مسئلہ پر بحث ونظر کا ایک طریقہ تو یہ تھا۔ بعض علماء نے یہاں دوسرا طریقہ استدلالی اختیار کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں۔

عصمت کے ارکانِ اربعہ ✻ عدالت وثقاہت خیر وشر کے عواقب کا قطعی علم۔ پھر وحی الٰہی سے ان علوم کی مزید تائید وتاکید۔

نسیان اور ترک اولیٰ پر بھی مواخذہ کا خطرہ (الروضۃ البہیہ ص ۵۹) چونکہ انبیاء علیہم السلام میں یہ چاروں صفتیں کامل طور پر موجود ہوتی ہیں اس لیے ان میں عصمت کی صفت بھی کامل طور پر موجود ہونی ضروری ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام میں ان صفات کے علاوہ دائمی حضوری کی ایک صفت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تنہا یہ صفت ہی ان کی عصمت کے لیے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ عصمت کے جتنے موانع ہو سکتے ہیں وہ بھی ان میں موجود نہیں ہوتے یعنی ان کی اندرونی اور بیرونی طاقتیں سب کی سب اپنے رب کی حکم برداری کے نشہ میں اس طرح ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس کی نافرمانی کا ان کو کبھی تصور ہی نہیں آتا۔ دوسرے انسانوں میں اس حضوری میں! کچھ نہ کچھ فرق پڑھ سکتا ہے ہے لہٰذا ان کی قوم کی غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے یہاں دائمی حضوری میں ادنیٰ سے فرق کا کوئی امکان نہیں ہوتا وہ بظاہر جتنی غفلت میں نظر آتے ہیں اتنے ہی اور ہشیار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نیند کے علوم بھی بیداری کے علوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر غفلت و تکلیف کا وقت انسان کی نزع روح کا وقت ہوتا ہے وہ اس نازک وقت میں اور اتنے مستغرق ہوجاتے ہیں کہ رفقاء دینار سے ان کی نظر یکسر منقطع ہوکر صرف "الرفیق الاعلی" کی طرف لگ جاتی ہے۔ پھر بھوک و پیاس' مسرت و غم اور شکست و فتح کے حالات کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ تو غفلت کی بجائے برعکس ان کی گرمی محفل کے سامان ہوتے ہیں۔ عین جنگ کی گرم بازاری کے موقع پر آپ کی توجہ اور انابت الی اللہ کا جو نقشہ رہا ہے وہ احادیث اور کتب سیر میں موجود ہے۔

<u>یہاں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کا اپنی عصمتوں کے متعلق نظریہ کیا تھا</u> ٭ انبیاء علیہم السلام کی پاک نفسی' ان کی اندرونی و بیرونی طاقتوں کی شائستگی و تہذیب' ان کی بعثت کی غایت و غرض' ان کے منصب کی اہمیت' ملائکۃ اللہ کے ساتھ ہمہ اوقات ان کی صحبت اور ان سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ان کی شرف ہم کلامی کے بعد یہ سوال بھی اہم ہے کہ خود ان کا عقیدہ اس مسئلہ میں اپنے متعلق کیا تھا۔ کیا وہ اپنے نفس کا معاصی کے ساتھ ملوث ہونا تسلیم کرتے تھے' کیا اپنے متعلق عدل و انصاف کے خلاف ذرا سا تصور کرنا یا اپنے کسی فیصلہ کو کسی طبعی رجحان کا اثر سمجھ لینا یا ان کے کسی عمل کو خلاف اولیٰ پر حمل کرنا کسی کے لیے جائز سمجھتے تھے۔ یا اس کے برعکس جہاں ان کے متعلق کسی ادنیٰ سے وسوسہ کا احتمال بھی پیدا ہو سکے اس کے ازالہ کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ جہاں تک حدیثوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان عبدیت و تواضع کے باوجود اپنے حق میں اس قسم کے تصور کی کسی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں دی بلکہ اگر کسی نے آپ کے عمل کو آپ کی رفعت شان اور اپنی کمتری کی وجہ سے بھی ناقابل اتباع سمجھا ہے تو اس پر بھی آپ کو سخت ناگواری گذری ہے۔ دیکھو ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۳۹۵ و ۳۹۶ اور ج ۲ ص ۳۰۷ و ۳۹۸ یہ بات دوسری ہے کہ جب بھی مخلوقات کے دائرہ سے نکل کر معاملہ بارگاہ صمدیت کے سامنے آ گیا ہے تو پھر وہ عجز و نیاز احد انابت و استغفار کا ایک پیکر بن گئے ہیں اور یہی شان انبیاء علیہم السلام ہونی چاہیے۔

<u>مسئلہ عصمت کی بحث میں ایک فرو گذاشت</u> ٭ درحقیقت اسی دقیق فرق کے ذہول سے ان کی عصمت کے خلاف بے وجہ ایک تعمیر کھڑی کر لی گئی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس رخ پر بھی اصولی طور پر قدرے روشنی ڈال دی جائے۔

سب سے پہلے یہاں دو باتیں سامنے رکھنی چاہئیں ایک یہ کہ لغت عرب میں خطاء' ذنب' زلۃ' اسراف اور معصیت سب

مترادف الفاظ نہیں ہیں- ہم یہاں صرف ان کے اردو ترجموں پر کفایت کرتے ہیں- اردو میں بھی غیر ارادی غلطی- ناشایاں کام- لغزش- زیادتی- اور نافرمانی کا مفہوم الگ الگ ہے یہاں سب کا ترجمہ گناہ کردینا صحیح نہیں ہے- قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کسی عمل پر بھی معصیت کا اطلاق نہیں کیا گیا- صرف ایک آدم علیہ السلام کے معاملہ میں یہ لفظ ضرور استعمال ہوا ہے مگر اس کی تشریح ابھی آپ کے سامنے آتی ہے-

دوم یہاں بڑی اہمیت کے ساتھ اس پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ جن آیات کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے- کیا وہ عمل ان کی نظروں میں بھی ان کی عصمت کے خلاف تھے؟ اس کے فیصلہ کے لیے سب سے واضح حدیث شفاعت کی حدیث ہے جہاں ہر نبی نے شفاعت کے لیے قدم نہ اٹھانے کا سبب اپنی اپنی زبانوں سے خود بیان کیا ہے یہاں ہم کو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے متعلق شرک فی التسمیہ کا ایک حرف بھی کہا ہو یا حضرت خلیل علیہ السلام کی زبان مبارک سے ﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ کی فرمائش پر اپنی ندامت کا ایک کلمہ بھی نکلا ہو بلکہ یہاں جو فہرست ہمارے سامنے آتی ہے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا شجرہ ممنوعہ کھالینا' حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے ایک عزیز کے حق میں طوفان سے حفاظت کے لیے نادانستہ طور پر سفارش کرنا- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی زبان سے دین کی حمایت میں تین مختلف مقامات پر توریہ کے کلمات کہہ گذرنا- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک عمل ہے جو نبوت سے پہلی زندگی میں ان کے دشمن کی موت کا باعث بن گیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا ان کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرالینا معلوم ہوتا ہے اور بس-

حضرت آدم علیہ السلام کی زلت قرآن کریم کی نظر میں ❋ جب قرآن کریم کی روشنی میں اس پر نظر کی جاتی ہے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ نظر ربوبیت میں سب سے اہم سمجھا گیا تھا مگر خود قرآنی تفصیلات جو ان کے اس اقدام کے متعلق نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں:

هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا یَبْلٰی. (طٰہٰ: ۱۲۰)	(شیطان نے ان سے کہا تھا کہ) کیا میں تم کو بتاؤں صدا زندہ رہنے کا درخت اور لازوال بادشاہت-
وَ قَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ. (اعراف: ۲۱-۲۲)	اور ان کے آگے قسم کھائی کہ یقین کرو میں تمہارا خیر خواہ دوست ہوں اور اس طرح فریب دے کہ ان کو مائل کرلیا تھا-
فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا. (طٰہٰ: ۱۱۵)	آدم بھول گئے تھے اور اس میں ہم نے ان کا ارادہ ذرا بھی نہ پایا تھا-

ان آیات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو بات ان کے سامنے ان کی فریب دہی کے لیے رکھی گئی وہ خدا تعالیٰ کی جنت میں ان کی دائمی زندگی تھی اور اس کی توثیق و تصدیق کے لیے خدا تعالیٰ کا نام لے کر ان کے سامنے قسم کھائی گئی پھر جس طرح ہر انسان اپنی کسی انتہائی کامیابی اور بے نہایت فوز و فلاح کے تصورات و تمناؤں میں پڑ کر دوسری جانب سے ذہول میں پڑ جایا کرتا ہے- یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اور حضرت آدم علیہ السلام کو قرب ایزدی کی تمناؤں پھر شیطان کی قسموں کے سامنے یہ خیال بھی نہ رہا کہ مجھ سے کہا کیا گیا تھا بس اس فریب میں آکر پوری فراموشی کے عالم میں ان سے اس خلاف ورزی کا ارتکاب

ہو گیا۔[1] قرآن کریم نے ضرور اس کو معصیت کہا ہے' لیکن اس کی تشریح بھی جو خود اس نے بیان کی ہے اس کے بعد کسی انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر معصیت کا لفظ اطلاق کرنے کا حق نہیں رہتا یعنی یہاں معاملہ کی نوعیت ہے اتنی نازک ہوگئی تھی کہ اس کے سامنے کسی فرد سے تحمل و صبر کرنا مشکل تھا۔ اِدھر ان کے نسیان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے درحقیقت وہی ان کی عصمت اور بے گناہی کا بڑا ثبوت ہے۔ پھر غور فرمایئے کہ صرف ان کی فراموشی کے ذکر پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ پورے مبالغہ کے ساتھ اس کا منفی پہلو بھی صاف کر دیا گیا ہے اور اس کو بھی لفظ "و لم یعزم" سے ادا نہیں کیا گیا جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ انہوں نے پختہ ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں ان کے ارادہ کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔ پس اگر قرآن کریم سے ان کے اس عمل کا معصیت ہونا ثابت ہوتا ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف نسیان کا ایک قدم تھا۔

مقام عصمت کی نزاکت کا تقاضہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شانِ رفیع میں کسی ناشایاں عمل کی صورت بھی حقیقت کی برابر شمار ہو

٭ اب اگر ان دونوں باتوں کو جمع کرلو تو نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر ارادی عمل بھی دوسروں کے ارادی عمل کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں معصیت کی حقیقت گو نہیں ہوتی مگر جس عمل کی صورت نافرمانی کی صورت ہو وہ بھی ان کے حق میں اس عمل کے مشابہ سمجھا جاتا ہے جو حقیقت میں بھی معصیت ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے دو باتیں سامنے رکھنی چاہئیں مقام عصمت کی نزاکت۔ دوم بارگاہ الوہیت کی شان عظمت مقام عصمت کی نزاکت چاہتی ہے کہ جب ایک طرف عصمت ہے تو دوسری طرف نسیان بھی کیوں ہو اور اگر کسی مصلحت کے پیش نظر ایسا ہو جائے تو اس پر مواخذہ کیوں کیا جائے۔ ترجمان السنہ جلد دوم کے اوائل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے یہ سوال کیا بتاؤ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے تو اپنے اندازہ فہم کے موافق جو جواب انہوں نے دیا وہ یہی تھا کہ فرشتوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا مگر آپ نے اس پر یہ فرمایا ان کے سامنے تو عالم قدس سب کھلا ہوا موجود ہوتا ہے وہ کیوں ایمان نہ لائیں (پوری حدیث اور اس کی تشریح وہاں دیکھ لی جائے) اس سے معلوم ہوا کہ جو بات عام لوگوں کے حق میں کمال شمار ہوتی ہے' اگر یہاں وہ موجود ہو تو کچھ قابل تعجب نہیں ہوتی۔ آفتاب سے اگر روشنی نکلتی ہے تو نکلنی چاہیے تعجب کی بات کیا ہے کامل سے کمالات ہی کا صدور ہوا کرتا ہے۔ یہاں تعجب ہوتا ہے تو اس پر کہ اس کمال پر ان کے منصب کے خلاف کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو کیوں عام انسان اگر بھولتے ہیں تو رحمت اس کو درگذر کرنے کے لیے تلی ہوئی نظر آتی ہے لیکن جن کے قالب بھی اس جہان میں اہل جنت کے

---

[1] کتاب الانبیاء صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے چوری کی جب عیسٰی علیہ السلام نے اس کو سرزنش کی تو اس نے قسم کھا کر کہا میں نے چوری نہیں کی اب حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے صرف دو راستے تھے یا وہ اس قسم کھانے والے کو متہم کرتے یا اپنی نظر کو متہم کرتے۔ انہوں نے سنت آدم علیہ السلام پر عمل کیا اور اپنی نظر کا قصور قرار دینا اس سے آسان تر سمجھا کہ وہ کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی تہمت لگائیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن القیمؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ابلیس کے قسم کھانے کے بعد تصدیق کرنے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اس چور کی تصدیق کرنے کی صفت نبوت یکساں نظر آتی ہے۔ (دیکھو ترجمان السنہ ص ۲۳۶ ج ۲ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں منقول ہے" و کان و قافا عند سماع آیۃ من القرآن" وہ بھی اسی جنس کی ایک صفت تھی۔

مشابہ ہوں ان سے کسی ادنیٰ سی بات کا ذہول ہوتا ہے تو اس پر فوراً مؤاخذہ ہونے لگتا ہے قدرت نے اگر ایک طرف ان کو معصوم پیدا کیا ہے تو دوسری طرف ان کی گرفت بھی سخت کر دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب عصمت ہے تو پھر یہ فروگذاشت کیوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول بھی ہوگئی اور ان کو خلعت خلافت سے نواز بھی دیا گیا مگر اپنے اس نسیان کا انفعال پھر محشر تک ان کے قلب سے محو نہ ہو سکا یہ اس لیے نہیں کہ یہاں معصیت کی حقیقت کا کوئی وجود تھا بلکہ یہ صرف ان کی عصمت کا اقتضاء تھا کہ جب عصمت تھی تو نسیان سے بھی ایسا عمل کیوں ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب اہل محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں سفارش کے لیے آئیں گے تو وہ بڑے انفعال کے ساتھ یہ عذر فرمائیں گے کہ مجھ کو تو میری قوم نے خدا تعالیٰ کے سواء معبود بنالیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جرم کیا تھا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی فطرت اتنی پاکیزہ ہوتی ہے کہ ان کی امتوں کی معصیتوں کی چھینٹیں بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دیکھئے یہاں صرف معصیت کا گو کوئی شائبہ نہ تھا مگر پھر مقام عصمت اپنوں کی معصیت سے منفعل تھا۔ پس جہاں دوسروں کی معصیت سے تاثر کا یہ عالم ہو وہاں بھلا خود کسی معصیت کا تصور کیا ہوسکتا ہے۔

یہ تو مقام عصمت کی نزاکت کا مختصر سا حال تھا اب خدائے قدوس کی رفعت و بلندی کا ہلکا سا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے متعلق بھلا کیا لب کشائی کی جاسکتی ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ جو متفق علیہ معصوم مخلوق ہے جب اس کا معاملہ بھی خالق کائنات کے سامنے آ گیا تو وہ بھی سرتاسر قصور نظر آنے لگی۔ اسی معاملہ میں فرشتوں کی سرگذشت ذرا سامنے رکھ لیجئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حرفِ معصیت سے یہ مسلوب الاختیار مخلوق بھی شاید انسانوں کی صف میں کھڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے سلسلہ میں فرشتوں کا ایک ہی واقعہ ہمارے سامنے آیا ہے، اگر کہیں دو چار واقعات اسی طرح کے اور سامنے آجاتے تو شاید ہمارے علماء کلام کو یہاں بھی تردد پیدا ہو جاتا مگر چونکہ اس طرف ان کا ایک ہی واقعہ سامنے تھا دوسری طرف ان کی عصمت کا عقیدہ حاصل تھا۔ اس لیے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، حالانکہ حقیقت واضح ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہاں حقیقت معصیت کا صدور ہوتا ہے لیکن جب کبھی مخلوق کا معاملہ خالق کائنات کے سامنے آجائے تو ایک طرف قادر مطلق دوسری طرف مجسم بے چارگی موجود ہوتی ہے اس لیے ہزار عصمت کے باوجود یہاں معاملہ قصور در قصور ہی کا نظر آتا ہے اسی لیے جب اسی معاملہ کو خالق کائنات کے دربار سے الگ کر کے صرف ایک معاملہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو اس میں ایک حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ مقدمہ جب حق تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوا تو اس میں معصیت کا لفظ تک بھی استعمال ہوا اور یہاں تک بھی اس نے طول پکڑا کہ عالم کے ایک بہت بڑے انقلاب کی یہی ایک لغزش بنیاد بن گئی۔ لیکن جب اسی واقعہ کو خالق کائنات کے حضور سے اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مابین رکھا گیا تو حسب بیان حدیث شریف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاجواب ہو جانا پڑا یعنی (جب حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے یہ فرمایا "والد بزرگوار! آپ نے ذرا سی لغزش کر کے اپنی ساری اولاد کو جنت سے باہر نکلوا دیا۔" تو اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا "اے موسیٰ تم کو تورات ملی ہے جو میرے وجود سے بھی سالوں پہلے علم الٰہی میں موجود تھی کیا اس میں میری اس لغزش کا ذکر نہیں؟ پھر والد پر اس عمل کے ارتکاب سے کیا اعتراض جو اس کے وجود سے بھی

پہلے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا-'' یہ وہی آدم ہیں کہ جب ان کا مقدمہ خالق کائنات کے سامنے پیش تھا اور سوال بعینہ یہی تھا تو بجز اعتراف وتوبہ کے جواب کا ایک حرف نہ تھا- پس جب مخلوق کا کوئی معاملہ خالق کائنات کے سامنے آجائے بس سمجھ لو کہ اب اس کی صفائی مشکل ہے یہاں اعترافِ خطاء ہی ایک صحیح راستہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب محشر میں تمام مخلوق کے حساب کا کٹھن مرحلہ سامنے آئے گا تو وہ رحمت جو اہل دنیا میں صرف ایک حصہ نازل فرمائی گئی ہے پورے سو حصوں کے ساتھ مخلوق کا حساب لینے کے لیے آجائے گی- اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل محشر میں ایسا کون تھا جو محض اپنے عمل کے بل بوتہ پر فردوس بریں کا مستحق بن سکتا-

افسوس ہے کہ لغزشوں کو چن چن کر اس طرح بیان فرمانے کی روح تھی تو کیا اور اس کو سمجھا گیا کیا- مقصد تو یہ ظاہر کرنا تھا کہ کن حالات میں کیا قدم اٹھایا گیا تھا پھر وہ بھی عمر بھر میں گنتی کے کتنے واقعات تھے مگر ان کو بھی ان کی شان سے کتنا بعید سمجھا گیا- اس سے نتیجہ تو یہ نکالنا چاہیے تھا کہ جن کی اتنی سی فروگذاشت پر بھی اتنی گرفت ہو وہ کس درجہ معصوم ہوتے ہیں مگر یہاں جو نتیجہ نکالا گیا وہ بالکل اس کے برعکس تھا' والعیاذ باللہ اگر مقام عصمت کی نزاکت اور بارگاہِ الوہیت کی بلندی کو سامنے رکھ کر یہ واقعات پڑھے جاتے تو یہی ان کی معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگتے-

الحاصل اگر فیصلہ صرف قرآنِ کریم کے طرز خطاب پر ہی دائر کر دیا جائے اور متکلم ومخاطب کی ان خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہاں کبائر وصغائر کی بحث تو درکنار بلکہ شاید کفر واسلام میں بھی بحث پیدا ہو سکتی ہے والعیاذ باللہ بلکہ اگر بحث و نظر کا یہی طریقہ ملائکۃ اللہ کے معاملہ میں بھی قائم رکھا جائے تو پھر ان کی متفق علیہ عصمت سے بھی شاید ہاتھ دھونے پڑ جائیں-

شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فعلم ان الانبیاء علیهم السلام لا یشارکون غیرهم فی ارتکاب حرام و لا مکروه الا لبیان الجواز و لکن لما شرف مقامهم سمی اللّٰه تعالی و قوعهم فی خلاف الاولی معصیة و خطیئة.

(الیواقیت و الجواهر ج ۲ ص ۵۹)

ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام ارتکاب حرام یا مکروہ میں دوسرے انسانوں کے شریک نہیں ہوتے اگر کسی مکروہ تنزیہی فعل کا وہ ارتکاب کرتے ہیں تو وہ بھی صرف اس کے جواز کا پہلو بنانے کے لیے کرتے ہیں ان کا قدم اگر اتفاق سے کہیں خلاف اولیٰ میں جا پڑتا ہے تو ان کے مقام کی نزاکت کی وجہ سے اسی کا نام معصیت اور خطا بن جاتا ہے-

و القاعدة ان کل من عظمت مرتبه عظمت صغیرته. (ج ۲ ص ۶۲)

یہاں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے اس کی معمولی باتوں پر گرفت بھی اتنی ہی سخت ہوتی جاتی ہے-

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے چند جزئی واقعات کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے- مثلاً معاصی' رذائل' اور دیگر نوع کے قبیح افعال سے اجتناب کے خطابات- ہمارے نزدیک یہ بھی کلام کی فصاحت و بلاغت کے اسلوب سے ناآشنائی کا ثمرہ ہے- کون نہیں جانتا کہ دنیا میں کلام کا ایک طریقہ ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' بھی ہے

فالخطاب له و المراد غيره. ان الحق من شأنه ان يؤدب الكبير بالصغير و كما ادب الله الامة بتأديب رسولها.

ان مقامات پر خطاب گو آپ کو ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کبھی چھوٹوں کی تنبیہ کے ذریعہ بڑوں کو ادب سکھاتا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ خطاب رسول کو ہوتا ہے اور مقصود ان کی امت کو ادب سکھاتا ہوتا ہے۔

بعض آیتوں میں شرک و کفر اور اس قسم کے دوسرے افعال سے اجتناب رکھنے کی بھی ان کو ہدایت کی گئی ہے۔ شیخ لکھتے ہیں کہ یہاں بھی ان کی ذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ کفار مراد ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کو یہ اظہار منظور ہوتا ہے کہ ان کو اپنا مخاطب بنانا بھی اس کو پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ہمارے رسول سے ہمارے کلام کا بغور سننا پسند نہیں کرتے تو ہم بھی ان کو اپنا مخاطب پسند نہیں کرتے۔

و الحكمة في هذا الخطاب مقابلة لا عراض الكفار عن استماع ماجاء به الرسولؐ فلذلك اعرض الحق عنهم مقابلة اعراض باعراض مع كونهم هم المراد بذلك الخطاب فاسمعهم في غيرهم عقوبة لهم و استهانة بامرهم. (ج ۲ ص ١٤)

اس طرزِ خطاب میں یہ بھی حکمت ہوتی ہے کہ چونکہ وہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمارے کلام کے سننے سے اعراض کرتے ہیں اس لیے اس کی جزاء یہ ہے کہ ہم بھی ان کو نا قابل التفات سمجھ کر ان سے خطاب نہ کریں اگرچہ مراد وہی ہوں۔

ہمارے نزدیک شیخ موصوفؒ کی یہ رائے بہت صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض آیتوں میں آپ کو ان امور سے بھی خطاب کیا گیا ہے جن کا عقلاً کوئی امکان ہی نہ تھا مثلاً والدین کے ادب و احترام کے سلسلہ میں آپ کو اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ ان کے سامنے اف کا کلمہ بھی نہ نکالا جائے **و لا تقل لهما اف و لاتنهر هما**. اب کون نہیں جانتا کہ اس وقت آپ کے والدین موجود ہی کہاں تھے اس لیے مخاطب گو یہاں آپ نظر آئیں مگر یقیناً مراد آپ کی امت ہے۔ اس کے علاوہ اس طرز خطاب میں ایک بڑی حکمت ان امور کی اہمیت پر تنبیہ کرنی ہوتی ہے۔ یعنی مثلاً شرک و کفر جب ایسے خطرناک عمل ہیں کہ اگر بالفرض رسول کے حق میں بھی ان کا تصور کیا جائے تو اس کے اعمال کے لیے بھی تباہ کن ہوں گے تو بھلا دوسروں کے اعمال کے لیے تباہ کن کیونکر نہ ہوں گے۔

یہی وجہ تھی کہ یہ سب آیتیں دشمنوں کے سامنے تلاوت کی جاتی تھیں اور وہ ان پر غیر معقول سے غیر معقول اعتراضات بھی کرتے تھے مگر یہ کبھی ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے کیرکٹر اور اس کے ذاتی کاروکردار پر بھی کبھی ان کو کوئی اعتراض ہوا ہے یا ان آیات کو انہوں نے خود رسول کے برخلاف شہادت سمجھا ہے کیونکہ وہ ذوقِ سخن سے خوب واقف تھے اور اس قسم کے خطابات کا مقصد بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

__انبیاء علیہم السلام کی شانِ استغفار عصمت کے خلاف نہیں__ ✽ اسی طرح رسولوں کی شان استغفار و توبہ کا مسئلہ بھی واضح ہے۔ یہ بھی اس بناء پر نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت کسی ادنیٰ سی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ مقامِ عصمت کی نزاکت اور بارگاہ صمدیت کی بے نیازی کا استحضار اپنے نفسوں کی برأت اور تزکیہ کا ان کو تصور کرنے نہیں دیتا اس لیے وہ اس بارگاہ میں جہاں بے قصوری کا دعویٰ کرنا ہی سب سے بڑا قصور ہے اپنے لیے توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں اور مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے مقبول

احاطہ میں ان کی امتیں بھی شامل ہو جائیں- کیونکہ نظر رحمت اگر مجرموں کی طرف نظر کرتی ہے تو ان ہی کے واسطہ سے کرتی ہے اور ہماری استغفار کی اس دربار عالی تک کوئی رسائی ہوسکتی ہے تو ان نفوسِ قدسیہ ہی کے واسطہ سے ہوسکتی ہے- اب آیات ذیل پر توجہ کے ساتھ ذرا غور فرمائیے کہ درحقیقت ان کا مصداق ہے کون- پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو یہاں پہلے نمبر میں رکھا گیا ہے تو کیوں؟:

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا. (توبہ:۱۱۷-۱۱۸)

اور اللہ تعالیٰ مہربان ہوا نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں- اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جائیں پھر مہربان ہوا ان پر بے شک وہ ان پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا-

يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ. (التحریم:۸)

جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کے ساتھ-

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ. (الاعراف:۱۵۵)

انہوں نے عرض کی اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہیں ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی-

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ. (محمد:۱۹)

اور استغفار کرو اپنے گناہ کے لئے اور مؤمنوں کے گناہ کے لئے-

پہلی آیت میں غزوہ تبوک کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں تین صحابہ سے کچھ تساہل ہو گیا تھا لیکن جب ان کی توبہ کی قبولیت کا وقت آیا تو یہاں سب سے پہلے اپنے معصوم رسول کا ذکر کیا گیا ہے- دوسری آیت قیامت کے دن کا واقعہ ہے جہاں نبی کی ذات کے لئے رسوا ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں تیسری آیت بنی اسرائیل کی اس خودسری کے متعلق ہے جب کہ انہوں نے کوہ طور پر جا کر خود اپنے کانوں سے کلام الٰہی سن لیا تھا، مگر اس پر بھی وہ ایمان نہ لائے اور ایک دوسری گستاخی یعنی رؤیت باری تعالیٰ کی ناممکن بات کی فرمائش کر بیٹھے آخر اس گستاخی کی ان کو سزا ملی اور سب ہلاک کر دیئے گئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے ترحم کی درخواست میں یہ کلمات نکل گئے- حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے فوائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس قسم کے مواضع پر سب سے پہلے اپنے نفسوں کو اس لئے شامل فرما لیتے ہیں کہ ان کو معصوم نفوس کی شمولیت کی برکت سے مجرموں کے لئے بھی یہ درخواستیں قابل توجہ بن جائیں- رحمت ان کے نام پر جھک پڑتی ہے پھر اس کی وسعت مجرموں سے کترانا گوارا نہیں کرتی اور اس طرح مجرموں کی بخشش کا یہ ایک یقینی ذریعہ بن جاتا ہے- انبیاء علیہم السلام کی استغفار و توبہ میں اس حکمت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے-

ہماری اس تفصیل کے بعد اب آپ کو عصمت انبیاء علیہم السلام کا مفہوم خوب واضح ہو گیا ہوگا اور یہ بات بھی صاف ہو گئی ہو گی کہ عصمت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان میں معصیت کا داعیہ تو پیدا ہوتا ہے مگر پھر قدرت ایزدی ان کو اس کے ارتکاب کرنے سے روک لیتی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نہاد ہی میں جو بشری قوتیں رکھی جاتی ہیں وہ فطرۃً اتنی شائستہ اور مذہب رکھی جاتی ہیں

کہ ان میں کسی معصیت کی طرف ادنیٰ سا رجحان ہی نہیں ہوتا ۔ جس طرح کہ ایک لطیف مزاج انسان کو نجاست اور گندگی سے طبعی نفرت ہوتی ہے اسی طرح ان نفوس قدسیہ کو معصیت کی ہر نوع سے طبعی نفرت ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی حکم برداری میں ان کو وہ طبعی راحت[1] محسوس ہوتی ہے جو مچھلی کو پانی میں اس لیے وہ اپنے قصد و ارادہ سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور بھی نہیں لا سکتے ۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان میں بھوک، پیاس، غضب، محبت اور اسی قسم کی دوسری بشری قوتیں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں ۔ اگر ان میں یہ قوتیں موجود نہ ہوں تو پھر ان کی عصمت اتنا بڑا کمال ہی کیوں ہو اور ملائکۃ اللہ کی عصمت سے ان کو امتیاز ہی کیا رہے ۔ یہاں فرق ہے تو یہی ہے کہ ملائکۃ اللہ اگر معصوم ہیں تو اس لیے کہ ان میں سرے سے یہ قوتیں ہی موجود نہیں وہ اگر معصیت کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے ۔ اسی لیے ان کی شان میں ارشاد فرمایا گیا ہے ۔

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ (تحریم:٦) وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس میں جس کا ان کو حکم ہوتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے ۔

انبیاء علیہم السلام اور ملائکۃ اللہ کی عصمتوں میں فرق ❊ آیت بالا کا مقصد ملائکہ کی صرف عصمت بتانی نہیں ہے بلکہ الگ اپنی ایک ایسی مخلوق بتانی ہے جس میں خیر کے سواء شر کی طاقت ہی نہیں اس لیے وہ معصیت کر ہی نہیں سکتے بلکہ نیکی بھی صرف وہی کر سکتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اسی لیے نہ ان میں ترقی کا کوئی احتمال ہوتا ہے نہ تنزل کا ۔

﴿وَ مَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ (الصافات:١٦٤) اور ہم میں جو بھی ہے اس کا ایک معلوم مقام ہے (اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا)

اور اسی لیے قرآن کریم میں کسی جگہ اپنے حق میں توبہ و استغفار کی نسبت ان کی طرف نہیں کی گئی وہ اگر استغفار کرتے ہیں تو بنی آدم کے لیے ' ان کے حق میں توبہ و استغفار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لیے وہ حق تعالیٰ کی صفات میں سے صفت غفار و قہار ' رزاق کا ذوق بھی نہیں رکھتے ۔

﴿وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ:٥) اور فرشتے تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں ۔

یعنی فرشتوں کا وظیفہ اپنے لیے صرف تسبیح و تحمید ہے اور اہل زمین کے حق میں استغفار اور ان کے لیے بخشش مانگنا ۔ وظائف کی یہ تقسیم اتفاقی نہیں بلکہ انسانی اور ملکی خلقت کی تقسیم میں مبنی ہے ۔ فرشتے چونکہ معصیت سے منزہ بنائے گئے ہیں اس لیے ملکوتی وظیفے یعنی تسبیح و تقدیس کے ساتھ استغفار بھی اس کے وظیفہ میں شامل ہے پھر چونکہ بشریت اس کی جوہر ذات ہے اور ملکیت اس کی صفت اس لیے اس کا خاص وظیفہ استغفار ہے ۔

اب یہ غور کر لینا چاہیے کہ ان دو عصمتوں میں سے بلند عصمت کون سی ہے کیا وہ عصمت جو جبری ہو؟ یا وہ عصمت جو اختیاری

---

[1] ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا ارحنی یا بلال پھر ایک حدیث میں فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ.

ہو؟ کمال یہ ہے کہ قوتیں سب ہوں مگر سب شائستہ اور مہذب ہوں یا کمال یہ ہے کہ سرے سے وہ قوتیں ہی مفقود ہوں؟ ملک اور فرشتہ ہونا بھی بے شک ایک کمال ہے مگر اس کمال میں تمام تر کمال صانع ہی کا ظاہر ہوتا ہے خود فرشتوں کی اس میں تعریف کیا ہے' لیکن بشر ہو کر اگر پھر وہ فرشتہ صفت ہو تو یہ اس کی بھی تعریف ہے اور اس سے بڑا کمال ہے۔ زنانِ مصر ایک طرف تو اس کا یقین رکھتی تھیں کہ جس کے حسن و جمال کا وہ نظارہ کر رہی ہیں وہ بے شبہ ایک بشر کی صورت ہے مگر جب وہ اس کی عفت و عصمت کا نقشہ دیکھتی تھیں تو ان کو اپنے اس چشم دید یقین میں بھی شبہ گذرنے لگتا تھا۔ ذیل کی آیت میں ان کی اس حیرت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

﴿مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ (یوسف: ۳۱) یہ شخص آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

گویا کھلے طور پر بشر ہو کر یہ پاک بازی ایسی ہے جیسی فرشتوں میں بھی کسی بڑے فرشتہ کی ہوسکتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس قسم کی گویا کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ پس اسباب و دواعی موجود ہونے کے باوجود معصیت سے نفور ہونا جتنا قابل تعجب ہے ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں معصیت سے نفور ہونا اتنا قابل تعجب نہیں۔ ملک اگر پاک بازی دکھلائے تو یہ اس کی فطرت ہے مگر تعجب تو اس پر ہے جو ہے تو بشر مگر اس کی پاک بازی کا نقشہ پھر وہ ہے جو ملک کا ہونا چاہیے۔

اچھا جب ان کی صفت عصمت کا عالم یہ ہوتا ہے تو پھر ان کی حفاظت الٰہی اور فرشتوں کی اعانت کا مطلب کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ انسان خلقۃً ضعیف بنایا گیا ہے جیسا کہ وخلق الانسان ضعیفا سے ظاہر ہے اس لیے بعض مرتبہ وہ مقابل طاقتوں کا پورا پورا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس کا امکان نظر آنے لگتا ہے کہ اپنے قصد و ارادہ کے بغیر اس کا قدم لغزش کر جائے۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ صرف ایک انفرادی معاملہ نہیں ہوتا' پھر ان کی آزمائش بھی معمولی انسانوں کی آزمائش کی طرح نہیں ہوتی۔ ایک طرف تن تنہا وہ ہوتے ہیں دوسری طرف کفر کا پورا جتھا سامنے ہوتا ہے جو ان کے مقابلہ پر ایسی ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ پہاڑ بھی ہو تو وہ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے۔

﴿وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (ابراھیم: ۴۶)

انہوں نے اپنی سب تدابیر کر ڈالی تھیں اور ان کی یہ سب تدابیر اللہ تعالیٰ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی تدابیر ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیں۔

اس لیے قرآن کریم نے ان کی اس پاک نفسی کو بھی ذکر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے ماحول کی اس نزاکت پر بھی تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان حالات میں اگر کسی میں غلط قدم اٹھانے کے دواعی و اسباب نہ بھی ہوں تو بھی اگر کسی خارجی باعث سے انسان کا قدم اس طرف اٹھ جائے تو کچھ بعید نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کے نگراں ہم ہوتے ہیں اس لیے وہ ان نازک مواضع میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں اور ان موانع کے باوجود ان کی عصمت میں ذرا فرق نہیں پڑتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں دیکھیے حالات کتنی نزاکت اختیار کر چکے تھے یعنی جس طرف سے انکار کا خطرہ ہو سکتا تھا اب اسی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت دی جا رہی تھی۔ سوء اور فحشاء کی بھیانک صورت سے ورہ خود خواہ کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں مگر وہ از خود ان کے اتنا قریب آ چکا تھا کہ اگر کوئی طاقت اس کو دھکا نہ دے دیتی تو اگر یہ از خود اس میں نہ گرتے

تو یقیناً وہ خود آگے بڑھ کر ان کو گھیر چکے تھے۔ جب صورت حالات اتنی نزاکت اختیار کر گئی تو دیکھو پروردگار کی حفاظت کس طرح مدافعت کے لیے سامنے آگئی اور کس طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر اس کا ذرا سا داغ بھی نہ لگ سکا۔ صورت حالات کی اسی نزاکت کو اس آیت میں ادا کیا گیا ہے:

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ[1] (یوسف: ۲۴)
عورت نے تو یوسف کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر یوسف اپنے پروردگار کی محبت اور برہان نہ دیکھتے تو وہ بھی عورت کا ارادہ کر لیتے۔

یعنی ایک جانب تو ارادہ ہو ہی چکا تھا اور اس بناء پر دوسری جانب میں عصمت کے خلاف جتنے اسباب ہو سکتے تھے وہ سب موجود ہو گئے تھے اور نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اگر کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے برہان رب نہ آ جائے تو اس طرف سے بھی قصد پیدا ہو جانا کچھ بعید نہ تھا مگر ان حالات کے باوجود پھر یہ ارادہ بھی کیوں نہ ہو سکا؟ اس لیے کہ ان کے رب کی برہان ان کے سامنے تھی پھر جب اس طرف ارادہ کا بھی وجود نہ تھا تو عصمت کے اس بلند مقام کو ادا کرنے کے لیے جو تعبیر یہاں اختیار کی گئی ہے وہ بھی کتنی بلند ہے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف: ۲۴)
یہ برہان دکھانا اور اس طرح ثابت قدم رکھنا اس لیے تھا تاکہ ہم ہٹائیں اس سے برائی اور بے حیائی کو بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہے۔

یہاں لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ نہیں فرمایا گیا یعنی صرف کا تعلق جو کچھ بھی رہا وہ سوء اور فحشاء کے ساتھ رہا اس کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کچھ نہ تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سوء اور فحشاء چونکہ خود بڑھ کر ان کی طرف آ رہا تھا اس لیے فعل صرف کا تعلق اسی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام چونکہ اپنی جگہ بدستور ثابت قدم رہے اس لیے یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو سوء اور فحشاء سے باز رکھا یہ تعبیر اس وقت مناسب تھی جب کہ یہاں ان کا ادنیٰ سا قدم بھی اٹھانا ثابت ہوتا۔ پس اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی عصمت بیان کرنے میں کتنی احتیاط سے کام لیتا ہے اور اس کے لیے تعبیر بھی وہ اختیار فرماتا ہے جو ان کی شان عصمت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر سکے۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ کے سامنے منافقین نے ایک مسلمان پر جھوٹی تہمت لگائی اور اس کے لیے اس قسم کے قرائن اور شہادتیں مہیا کر دیں کہ ایک خالی الذہن انسان کے لیے ان کے موافق فیصلہ دیئے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس لیے اگر یہاں آپ مسلمان کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو بالکل قرین قیاس ہوتا، مگر خدائی عصمت نے آپ کو ایسے فیصلہ سے بچا لیا اور وحی الٰہی نے تمام حقیقت کھول کر رکھ دی دیکھئے

---

[1] اس جگہ یہ بحث کرنی کہ وہ برہان رب تھی کیا غیر ضروری بحث ہے جس کے بیان سے سکوت کر لیا گیا اس کی تحقیق میں پڑنا ہمارے لیے بھی مناسب نہیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ضرور وہ کوئی ایسی بات ہوگی جو عین اس وقت ان کے سامنے آئی اس سے قبل اس کا ظہور نہ تھا، دوم یہ کہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جس سے رویت متعلق ہوئی تھی۔ یعنی نظر آنے کی چیز تھی۔ یہاں اس کا مصداق صرف نفس کی پاکی قرار دینا ظاہر کے خلاف ہے اور یوں باطل کو قلم کے زور سے حق ثابت کر دینا علیحدہ بات ہے و ان من البیان لسحرا کی ایک شرح یہ بھی کی گئی ہے۔

واقعہ کی اس نزاکت پھر آپ کی غیبی عصمت کو قرآن کریم نے کس انداز سے اداء کیا ہے:

وَ لَوْ لَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا. (بنی اسرائیل: ۷۴)
اور اگر ہم تم کو سنبھالے نہ رکھتے تو تم ان کی طرف تھوڑا سا جھک جاتے۔

یہاں بھی آپ کے حق میں احتیاط کے جتنے پہلو ممکن تھے ان سب کی رعایت کر لی گئی ہے یعنی جس بات کا خطرہ ظاہر کیا گیا ہے وہ آپ کا کوئی عملی قدم نہ تھا بلکہ صرف میلانِ طبع تھا' پھر اس پر لفظ کدت اضافہ فرما کر یہ بتادیا گیا کہ آپ کا یہ میلان بھی ہوا تو نہ تھا مگر حالات اس کے قریب آ لگے تھے کہ اگر ہم نہ سنبھال لیتے تو ایسا ہو جاتا اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ شیاءً کے ساتھ قلیلا کی صفت بڑھا کر یہ اور تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ کا رجحان ہوتا تو وہ بھی بہت خفیف ہوتا۔ اس معاملہ میں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں یوں معلوم ہوتا ہے گویا بہت سنبھال سنبھال کر الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں ادھر ان کی عصمت کی یہ رعایت ہے دوسری طرف اس کا امتحان بھی منظور ہے کہ اتنی عصمت پر بھی ان میدانوں میں ایسی صاف گلو خلاصی صرف ہماری حفاظت کا ثمرہ ہے۔ اگر ہماری دست گیری نہ ہو تو یہ ممکن نہیں۔ پھر جہاں کسی تکوینی مصلحت سے قدرت یہ دستگیری نہیں فرماتی بس وہیں قدم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جب مشیت الٰہی نے ان کی ایک ذرا سی لغزش میں عالم کی آبادی کا راز پنہاں فرما دیا تھا تو یہی نازک مراحل ان کے سامنے آ گئے۔ شیطان نے آ کر جو بات ان کے سامنے رکھی وہ خدا تعالیٰ کے دار الرضوان میں دائمی حیات کی دولت تھی جس کے لیے نبی تو نبی ایک عام مسلمان کا دل بھی بے چین ہوتا ہے۔ پھر اس پر جھوٹی قسمیں کھا کر کچھ ایسا سماں باندھا کہ جو بات ان سے کہی گئی تھی وہ اس وقت ان کے دماغ سے بالکل نکل گئی مگر چونکہ تکوینی طور پر قدرت ہی کو یہ لغزش منظور تھی اس لیے یہاں ان کو سنبھالا نہیں گیا۔ آخر کار ان کا قدم پھسلا اور یہ آواز آئی۔

وَ نَادٰهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَا اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ. (اعراف: ۲۲)
اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں نے اس درخت سے تم کو منع نہیں کیا تھا اور نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

مگر آدم علیہ السلام نے گریہ وزاری کے علاوہ عذر و معذرت کا ایک کلمہ تک منہ سے نہ نکالا کیونکہ جانتے تھے کہ اگر نسیان کا عذر کرتا ہوں تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اچھا یہ نسیان بھی کیوں ہوا؟ پھر جب انہوں نے یہ شان عبودیت دکھلائی تو ادھر سے شان معبودیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ عفو و درگزر کے ساتھ اب خود اس کا عذر بھی بیان فرما دیا گیا۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام بھی کتنے ادب شناس ہوتے ہیں۔ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ) یعنی جو لغزش بھی ان سے ہوگئی وہ صرف نسیان کی بناء پر ہوئی۔ عزم و ارادہ کا تو یہاں نام و نشان بھی نہ تھا' ابھی ابھی یا تو یہ باز پرس تھی مگر جب اعتراف جرم ہے تو ابھی یہ نوازش ہے گویا جرم کچھ بھی نہ تھا انبیاء علیہم السلام کی لغزش بھی تمام جہان سے نرالی ہوتی ہے پھر ان کی بخشش بھی سب سے نرالی ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر نسیان بھی قدرت ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے اسی لیے وہ بہت سے انعامات اور جدید احکام الٰہی کا منشاء بن جاتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنے اہم مقصد کے لیے تو سفر کیا پھر ان کے رفیق کو ٹھیک مقصود پر پہنچ کر کیا

نسیان ہوا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے جو علامت ان کو بتائی گئی تھی وہ بچشم خود دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے اور آگے چل پڑے مگر چونکہ یہ نسیان[1] قدرتی طور پر ڈالا گیا تھا اس لیے اس کی یاددہانی کی شکل بھی قدرت ہی نے پیدا فرمائی وہ یہ کہ اس تمام سفر میں ایک دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکان محسوس نہ ہوا تھا مگر آج ذرا دور چل کر ہی ان کو تکان محسوس ہونے لگا اور وہ ذرا دم لینے کے لیے یہ کہہ کر بیٹھ گئے- لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا. آج کے سفر میں تو ہم کو تکان ہو گیا- آخر بیٹھ کر جب ناشتہ دان کھولا گیا دیکھا تو مچھلی ندارد تھی، اسی وقت ان کے رفیق کو پچھلی منزل کی بات یاد آ گئی اور انہوں نے کہا کہ مچھلی تو میرے سامنے زندہ ہو کر پانی میں گھس گئی تھی، ادھر قدرت نے یہ سامان کر رکھا تھا کہ جس جگہ مچھلی گھستی تھی اس جگہ پانی منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور وہ جگہ طاق کی شکل میں کھلی کی کھلی باقی تھی- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہی تو وہ جگہ تھی جس کی ہم کو تلاش تھی آخر وہ لوٹے اور وہیں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی- انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی اور ان کے سہو و نسیان کے واقعات میں اس پر بھی نظر رکھی جاتی کہ ان میں کیا کیا اسرار اور موعظت و عبر کے کتنے سبق پنہاں ہوتے ہیں تو قرآن کے تکرار قصص کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا-

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک شب اپنی حرم سرائے میں جانے کا اس لیے ارادہ کیا کہ ہر ہر بی بی سے ایک ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو- خدا تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے اس پر فرشتے نے بھی یاد دلایا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجئے مگر ان کو یہ مبارک کلمہ کہنا پھر یاد نہ رہا آخر اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوا وہ اسی جلد میں آپ کے سامنے ہے- بہر حال انبیاء علیہم السلام کے نسیان کا قدم بھی گرفت میں آ جاتا ہے- اگر کہیں قدرت ان کو سنبھالے نہ رہے تو اپنی گوناگوں ذمہ داریوں میں نہ معلوم ان کے کتنے قدم نسیان کے اٹھ جائیں- عام انسانوں کو معمولی پریشانیوں میں اہم سے اہم باتیں بھول جاتی ہیں پھر ان نفوس کا تو حال کیا ہوگا جن کے سر پوری نوع انسانی کے بننے اور بگڑنے کی ذمہ داری ہوتی ہے-

لہٰذا اس قسم کی جتنی آیتیں ہیں ان کو بھی عصمت کے خلاف سمجھنے کے بجائے براہین عصمت سمجھنا چاہیے ہم پہلے ترجمان السنہ میں لکھ چکے ہیں کہ نبی کے قول و عمل کا تو کہنا ہی کیا اس کی رائے کو بھی عصمت حاصل ہوتی ہے اور اگر کہیں اس پر ٹوکا گیا ہے تو یہ ان کی عصمت ہی کی بناء پر ٹوکا گیا ہے کیونکہ یہی اس کی دلیل ہے کہ ان کی ہر ہر نقل و حرکت بلکہ ان کی رائے بھی سب پروردگار کے زیر نگرانی ہوتی ہے اور اسی باطنی حفاظت کے اظہار کے لیے شاذ و نادر صورتوں میں کہیں ان کو ٹوک بھی دیا جاتا ہے اس کے برخلاف ان کی امتوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے اگر اجتہاد و کوشش کے بعد ان سے خطاء واقع ہو جائے تو اس پر بھی ان کے لیے ایک اجر کا وعدہ ہے-

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگایئے کہ مقام نبوت کی نزاکت اور اس کا حسن کیا کسی ادنیٰ سی معصیت کے داغ کا بھی متحمل ہے- حاشا و کلا- و الحمد لله اولاً و آخراً.

---

[1] اس جگہ ترجمان السنہ جلد دوم ص ۳۷۳ حدیث نمبر ۸۰۶ کا تشریحی نوٹ ملاحظہ فرمالیں-

چونکہ اس موضوع کے متعلق مجھ کو قدیم سے شغف رہا ہے اس لیے اس مضمون کی تصانیف مطالعہ کرنے کا مجھ کو ہمیشہ موقعہ ملتا رہا ہے۔ حسن اتفاق سے آج سے تیس سال پہلے اسی مضمون پر ایک مطبوعہ فارسی مکتوب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا تحریر کردہ میرے ہاتھ آ گیا تھا اور مجھ کو اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے اسی وقت اس کی ایک نقل لے کر اپنے پاس رکھ لی تھی اور الحمدللہ کہ آج بھی یہاں وہ میرے دم کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے بعد جب قسمت نے متقدمین و متاخرین کی چند کتب کے مطالعہ کا موقع بخشا تو اندازہ یہ ہوا کہ جو کچھ ان متفرق اوراق میں بکھرا پڑا تھا وہ اس مکتوب میں یکجا جمع شدہ موجود ہے۔ پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فطری جدت پسندی نے طرز استدلال کا اس پر ایک اور ایسا نیا روغن چڑھا دیا ہے کہ وہی استدلال جس کو ملانہ کہا جا سکتا تھا اب فلسفیانہ بن گیا ہے۔ مجھ کو اس کا تصور بھی نہ تھا کہ میں کسی مناسب صورت میں اپنے قدر دانوں کے سامنے کبھی اس کو پیش کر سکوں گا مگر الحمدللہ کہ آج قدرت نے مجھ کو اس کا موقعہ عنایت فرما دیا اور بڑی مسرت کے ساتھ میں اس کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے فارسی زبان ہی علمی زبان تھی، اسلامی معلومات کا بڑا ذخیرہ اسی زبان میں منتقل ہوا ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہ اس میں بھی تمام علماء سے جداگانہ اپنی ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں فارسی زبان تو بالکل متروک ہی ہو چکی ہے اور اردو بھی ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ پھر اتنی طویل مدت گزر جانے کی وجہ سے میری نقل کردہ تحریر جگہ جگہ سے مشکوک بھی ہو چکی ہے۔ میں نے اس پر بھی تھوڑا سا وقت خرچ تو کیا ہے کہ حتیٰ المقدور اس کی تصحیح کروں پھر اس کا ترجمہ بھی کسی حد تک قابل فہم کر دوں۔ اس فکر میں زیادہ میں اس لیے نہیں پڑا کہ ہیں مصنفؒ کا اصل مقصود ہی فوت نہ ہو جائے۔ اب آپ پورے غور کے ساتھ میرے تحریر کردہ مقالہ کو پڑھیں جو اسی مکتوب کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ غور کے ساتھ مکتوب مذکور کا بسم اللہ کر کے ترجمہ دیکھیں۔ و اللّٰہ المیسر۔

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوب حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

در معصومیت انبیاء علیہم السلام و ہم تحقیق حقیقۃ کل طبعی

مکتوب اصل بزبان فارسی

بزعم احقر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام از صغائر و کبائر قبل النبوۃ و بعد النبوۃ بہر طور کہ باشد معصوم اند. وایں رائے جدید ہر چند کہ بظاہر مخالف اقوال اکابر است اما ہر کرا بہرہ از فہم دادہ اندان شاء اللہ بعد تنقیح اصل مراد موافق اقوال اکابر خواہند یافت چوں ہر دعویٰ را دلیل بکار است نہ فقط لانسلم و انکار. می باید کہ ایں دعویٰ را اولاً موجہ نمایم. برادرمن در کلام اللہ می فرمایند "قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ" وہم چنیں لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ فرمودہ اند ایں دو آیت باتبل مطلق ہدایت می فرمایند و ایں طرف آیت. "وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون. و ما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین" باہم پیوستہ بایں جانب مشیر اند کہ مقصود از انسان ہمانست کہ مامور بآنست و آں جز عبادت ہیچ نیست- مگر می دانی کہ ہر چیز را از لوازم ذات خود نا گزیر است چہ "الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ" و ایں ظرف در تعریف ملائکہ و شیطان می خوانی کہ

ترجمہ اردو

احقر کے نزدیک انبیاء صغائر و کبائر ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں اپنی نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی- میری یہ رائے اگرچہ بظاہر اقوال اکابر کے خلاف نظر آتی ہے لیکن مسئلہ کی پوری تقریر کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ موافق نظر آئے گی- چونکہ ہر دعویٰ کے لیے دلیل کی ضرورت ہے صرف کسی بات کا انکار کر دینا کافی نہیں، اس لیے پہلے ہم اپنے دعویٰ کی دلیل قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں- ارشاد ہوتا ہے- "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو-" دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" یعنی تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے! ان ہر دو آیات میں جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع اور ہر بارہ میں آپ کی ہستی کو نمونہ فرمایا گیا ہے اب اگر آپ کے افعال و اقوال میں معصیت کا احتمال ہو تو لازم ہوگا کہ معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. ہم نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں- دوسری جگہ ارشاد ہے وَ مَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ. اُن کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کریں- ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف عبادت ہے نہ کہ معصیت! اور اس کو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ معصیت میں بھی اس کو اتباع کا حکم دیا جا سکے- اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اس کی ذات کے کچھ لوازم ہوتے ہیں جس جگہ وہ ذات موجود ہوتی ہے وہاں اس کے یہ لوازم بھی ضرور موجود ہوتے ہیں اسی لئے ان کی اس ذات کے لوازم کہا جاتا ہے جیسے آگ اس کے لئے جلانا لازم ہے جہاں آگ ہوگی ضرور جلائے گی- اس قاعدہ کے موافق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق

ہیں- ملائکہ وشیاطین ان کی ذات کے لئے بھی کچھ لوازم ضروری ہیں- قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذات کے لئے کفر لازم ہے كَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۔اور ملائکہ کے لئے فرمانبرداری لازم ہے وہ فرماں برداری جس میں سرتابی و نافرمانی کی مطلق گنجائش نہ ہو وَلَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ.

پس شیطان را عصیان و ملائکہ را اذعان فرمان لازم آمد و چون ایں قدر پیشتر گوش خوردہ آں عزیز است کہ لازم ذات از ملزوم خود عام نمی باشد لازم ذات اوست بجائے دیگر نمی رددو چگونہ تواں شد الواحد لا یصدر الاعن الواحد لازم آمد کہ در مصداق (خلطوا عملاً صالحا و اخر سیئا) از ہر دو نوع پارہ در خمیر نہادہ باشند نے بلکہ ہر کہ اخیالِ خیر و خطرۂ شر بہ دل می رددواز ہر دو نوع چیزے در آغوش دادہ اند واز ہر قسم قدرے قدرے در بر نہادہ اندورنہ لازم آید کہ لازم ذات عام باشد اندریں صورت مثال ترکیب ارواح انسانی ازیں دو قسم مادہ چناں باشد لہ در ہر مادہ ترکیب انواع مرکبہ از اربع عناصر شنیدہ بلکہ چنانکہ از خواص اربعہ یبوست و رطوبت و برودت و حرارت کہ در اجسام مرکبہ یافتہ یشوند و لوازم ذات خاک وآب و باد وآتش اند ترکیب اجسامِ مرکبہ ازیں اجسام چارگانہ پے بردہ اندورنہ کیست کہ وقت آفرینش نگریست ہم چنیں ترکیب ارواح انسان ماو شما از دو عنصر ملکی و شیطانی پے تواں برد گوماو رائے ایں دو چیز ہائے دیگر باشند. اندریں صورت لازم افتاد کہ ذات با برکات حضرت خلاصہ موجودات سرور کائنات علیہ و علیٰ آلہ افضل الصلوات و اکمل التسلیمات از شائبہ شیطانی مبرا باشد و رنہ اتباع مطلق چگونہ صورت بندد ہاں اگر از لوازم ذات امید مفارقت بودے می تواں گفت کہ ہر چند کہ در ذات شریف حضرت حبیب رب العالمین جزوی از نوع شیطانی است اما عصیان کہ لازم آن بود در این مادہ مفارقت

چونکہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ ذات کے لوازم ہوتے ہیں وہ اس ذات کے علاوہ دوسری جگہ نہیں پائے جاسکتے - اس لئے ملائکہ اللہ کے علاوہ اذعان و فرماں برداری اور شیطان کے علاوہ کفر سرکشی کسی دوسری جگہ پائی نہیں جاسکتی- لیکن ان دو مخلوق کے سواء یہاں ایک تیسری مخلوق اور نظر آتی ہے یعنی حضرت انسان جس میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں ارشاد ہے خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا یعنی انہوں نے نیک عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کئے ہیں لہٰذا حسب بیان سابق ضروری ہے کہ انسان میں ہر دو قسم کا مادہ موجود ہو- مادہ شیطانی بھی اور مادہ ملکی بھی ورنہ برائی اور بھلائی جو دراصل ان دو قوتوں کے ذات کے لوازم تھے عام بن جائیں گے- ان اجزاء سے انسان کی ترکیب پر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ عناصر اربعہ سے اس کی ترکیب پر ظاہر ہے کہ انسان کے لئے عناصر اربعہ کے اجزاء ترکیبی ہونے کا ثبوت بھی ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ جوان عناصر کے لوازم ہیں مثلاً رطوبت' یبوست' برودت اور حرارت یہ سب انسان میں موجود نظر آتے ہیں- رطوبت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ آب جس کے لئے رطوبت لازم ہے انسان میں موجود ہے اسی طرح بقیہ اثرات کو دیکھ کر بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں بادو آتش و خاک کے عناصر بھی موجود ہیں ورنہ ایسا کوئی شخص ہے جس نے انسانی آفرینش کے وقت ان اجزاء کا مشاہدہ کیا ہو- پس جس طرح ہم نے یہاں صرف لوازم کے وجود سے ان عناظر کے وجود پر استدلال کیا ہے اسی طرح عام انسانوں میں اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کے اثرات کو دیکھ کر تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا کہ اس

نمود بالجملہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ اگر نعوذ باللہ مادہ شیطانی در خمیر حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بودے اتباع مطلق رانشائستے آخر کم از کم کیفیتے ازاں عارضِ حالِ اوشان شدے ورنگے از عصیان پدید آمد پس اگر ہر گونہ اتباع او خان فرمودہ شود بعصیاں نیز ارشاد کردہ شود اندریں صورت تصحیح این حصر وماامروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین چگونہ تواں شد و چوں منشاء گناہ صغیرہ باشد یا کبیرہ ہماں مادہ شیطانی است لازم آمد کہ حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم معصوماں از اندیشہ گناہ معصوم باشند باز باید شنید کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راارشاد میفرمایند فبھداھم اقتدہ وایں ارشاد نیز باقتدار مطلق شدہ است تخصیص نوعی از افعال وتقلید قسمے از اخلاق واقوال نیست وہم مقرر است کہ چوں صلہ رابے قرینہ حذف میکنند چنانکہ در اللہ اکبر صلہ اکبر راحذف فرمودہ اند. ایں حذف بتعمیم میباشد لہٰذا اکبریت اللہ تعالیٰ مخصوص باحدے نیست پس لازم آمد کہ حضرت و دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام نیز ازیں عیب مبرا باشند. علاوہ بریں درآیۃ عالم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبہ احدًا الا من ارتضٰی ضمیر است راجع بسوئے خدا تعالیٰ وضمیر مفعول کہ راجع بسوے من است محذوف باز ارتضٰی رامطلق داشتہ اند یعنی ایں نفرمودہ اند کہ ارتضٰی فی الاعمال او الاخلاق او فی ھذا الامر و بعد ایں ہمہ من رسول گفتہ اند و پیدا است کہ من در من رسول بیانیہ است نہ غیر آں. لہذا ضروری افتاد کہ ہمہ عناصر روحانی رسل محبوب و مرضی خداوندی باشند وجہش ایں است کہ چنانکہ زر ونقرہ رابر معیار سودہ میگرند تاغش از خالص معلوم شوہم دچنیں امتحان

میں وہ دونوں قوتیں بھی ضرور ہیں جس کے یہ دو لوازم ہوگا یعنی مادہ ملکی مادہ شیطانی - اس تمہید کے بعد اب یہ ضروری ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مادہ شیطانی سے مبرا ہوں- ورنہ اگر آپ کی ذاتِ اقدس میں بھی یہ مادہ موجود ہو تو یہ لازم آئے گا کہ جو اس کے لوازم ہیں یعنی معصیت وہ بھی آپ کی ذات میں موجود ہو العیاذ باللہ اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو جب قرآن کریم ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی لازم ہوگا کہ اس معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو- حالانکہ (وَ مَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ) میں حصر کے ساتھ فرمادیا گیا ہے کہ تم کو صرف عبادت کرنے کا ہی حکم دیا گیا ہے معصیت کا نہیں- یہاں اب اگر معصیت میں بھی آپ کی اتباع تسلیم کی جائے تو یہ حصر باطل ہو جائے گا - لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آپ میں مادہ شیطانی جو منشاء گناہ ہے موجود نہیں' اور چونکہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ دونوں کے صدور کا منشاء مادۂ شیطانی ہے- لہٰذا جب آپ میں یہ مادہ شیطانی نہیں تو آپ کا ہر قسم کی معصیت سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے- (اب رہی یہ بحث کہ اس بیان سے صرف آپ کی ذات کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے جمیع انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے) تو قرآن کریم میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ فَبِھُدٰاھُمُ اقْتَدِہْ آپ انبیاء علیہ السلام سابقین کے طریقے کی پیروی کیجئے - یہاں بھی آپ کو ان کے طریقے کی پیروی کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے کسی خاص قول وفعل کی تخصیص نہیں کی گئی - اور یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ جب صلہ حذف کرتے ہیں تو وہاں مراد عموم ہوتا ہے جیسا اللہ اکبر میں دیکھو یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بڑا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز سے بڑا

عناصر روحانی اعنی اخلاق و ملکات وقوی باعمال میکنند تا نیک از بد متمیز شود چنانچہ خودمیفر مایند. لیبلوکم ایکم احسن عملاً وظاہراست کہ فعل داد و دہش از آ ثار ملکہ سخاوت و معرکہ آ رائی از آ ثار شجاعت در دنہا ہم چنیں جملہ انعال از آ ثار ملکات وقویٰ و خلاق کامن می باشند و ایں آ ثار و افعال راباآں اخلاق و ملکات ہماں نسبت است کہ خطوط معیار را با زاء نقرہ پس چناں کہ در زر ونقرہ قدر و قیمت ہماں زر و نقرہ را باشد نہ آں خطوط را د مقصود اصلی ومحبوب زد و نقرہ بود نہ آں خطوط بلکہ آں خطوط فقط مظہر حسن وقبح زر و نقرہ باشند نہ اصل مقصود ومحبوب و بلیغ و مرغوب ہمیں ساں قصہ دین است اصل محبوب ومقصود و مطلوب اخلاق مرضیہ اندنہ اعمال و در بازار آخرت دراصل قدر و قیمت ہماں اخلاق را باشد نہ ایں اعمال را ایں اعمال مظہر آں اخلاق و ملکات اندنہ بذات خود محبوب ومرضی اندریں صورت ضرور است کہ ہمہ اخلاق و ملکات وقویٰ در رسولاں محبوب ومرضی خدا تعالیٰ باشند ایں نتواں شد کہ بعض از آنہا منجملہ مرضیات باشند وبعض ازاں خلاف مرضی ورنہ اطلاق ''ارتضٰی'' باطل گردد مگر دانی کہ اندریں صورت معصومیت انبیاء از صغائر و کبائر ضروری است واز انجا کہ بعد ارتضٰی بایرادمن رسولٍ کہ درآں من بیانیہ آوردہ اند بیان ایں معنی فرمودہ اند کہ ہر کہ مصداق من ارتضٰی باشد رسول شدنش ضروری است ہمہ فہمیدہ باشند کہ سواء انبیاء کسے را بمعصومیت اعنی امتناع صدور عصیاں صغیرہ باشد یا کبیرہ صفت نتواں کرد مگر غرضم از صدور ایں است کہ مصدر معصیت اعنی قوتیکہ مقتضائش عصیان باشد درخمیر بود نہ اینکہ مثل آب گرم کہ از ذات

ہے- اسی طرح جب یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ کس بات میں ان کی پیروی کیجئے تو ثابت ہوا کہ مراد یہ ہے ''ہر بات میں'' لٰہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت بھی ثابت ہوگئی- اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور عام دلیل بھی ہے جس سے جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت ثابت ہوتی ہے-عَالِمُ الْغَيْبِ الخ فعل ارتضٰی میں راتضٰی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے- یہاں بھی فعل کو مطلق رکھا گیا ہے- جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کو بھی اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے- اور اس کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی کہ حق تعالیٰ کی اس رضاء کا تعلق ان کے کس خاص عمل کے یا کسی خاص قول کے ساتھ ہے- تو ماننا پڑے گا کہ یہاں بھی عموم واطلاق ہی مراد ہے اور ''مِنْ رَّسُولٍ'' میں من چونکہ بیانیہ ہے اس لیے ثابت ہوا کہ مَنِ ارْتَضٰی یعنی جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ رسول ہیں- لٰہذا ثابت ہوا کہ رسول جتنے بھی ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مرتضٰی ہیں اور وہ بلاتخصیص ہر بات اور ہر اداء میں محبوب ومرتضٰی ہوتے ہیں- اب اگر ان سے معصیت کا صدور ممکن ہوتو وہ علی العموم محبوب و مرتضٰی کیسے ہو سکتے ہیں- اس کے بعد یہ سمجھے کہ جس طرح چاندی اور سونے کو کسوٹی پر اس لیے گھستے ہیں تا کہ اس کا کھرا اور کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے- یہاں کسوٹی پر گھسنے سے جو لکیریں پیدا ہو جاتی ہیں وہ خود مقصود نہیں ہوتیں بلکہ وہ چاندی اور سونے کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا صرف ایک معیار ہوتی ہیں اصل قدر و قیمت اسی چاندی اور سونے کی ہوتی ہے- اسی طرح عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات اور انسانی افعال و کردار کی مثال ہے- یہاں بھی اعمال کی تشریح کا اصل مقصد اختلاق حسنہ واخلاق سیئہ کا امتحان ہے- چنانچہ ارشاد ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا زندگی اور موت کو ہم نے اس لیے پیدا کیا

خود میتواں شد معروض عصیاں از خارج ہم نمی تواں بعروض حرارت خارجیہ از ذات خود میتواں شد معروض عصیان از خارج ہم نمی تواں شد آری باوجود امکان عروض عصیاں انبیاء راازعروض آن نگاہ میدارند چنانچہ فرمودہ اند کذٰلک لنصرف عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا المخلصین مگر آنکہ بعض اقسام معصیت از سوء وفحشاء ہم خارج باشند بالجملہ ایں آیت برامکان عروض ہم دلالت دارد ورنہ ''صرف'' بچہ کارآمدے در محفوظ ماندن انبیاء ہم شاہد است ورنہ بیکار رفتے بہر حال معصومیت بمعنی مذکور مخصوص بانبیاء است اولیاء راہم شریک اوشاں بدیں صفت نتواں گفت ان اولیاء ہ الا المتقون کہ بہ تعریف اولیاء فرمودہ اند بہ ایں معنی اشارہ دارد تفصیل این اجمال اینکہ متقون صیغہ اسم فاصل است وضمیرش راجع سوء اولیاء ومفعولش ہرچہ باشد محذوف لیکن حاصل اتقاء ہمیں اجتناب از معاصی وغیر مرضیات بو دزیں بعد بشنو کہ حاصل متقی ازایں است کہ موصوف بوصف اتقاء مبنی للفاعل باشد بر تعدی الی المفعول ضرور نیست وایں بداں ماند کہ درایام برشگال مثلاً وقت رفتار خود را از افتادن باز میدارند وباایہمہ گاہے پائے روندہ می لغزد و از پائے افتد و بریں بناء بدیگراں میگویند کہ من ہر چند خود را از افتادن نگاہ بداشتم مگر نتوانستم غرض ازیں تعریف کہ در کلام اللہ مذکور شد عدم امکان صدور معاصی نمی برآید آرے بشہادت ہمچو آیۃ یثبت اللّٰہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ. محفوظ ماندن اوشان از معاصی می برآید زیراکہ اطلاق امنوا اشارہ بکمال ایمان می کند فرمودہ اند المطلق یراد بہ الفرد الکامل

ہے تاکہ تمہاری آزمائش کریں کہ تم میں بلحاظ عمل کون بہتر رہتا ہے- دیکھیے انسان کی داد و دہش کا عمل اس کا شاہد ہوتا ہے کہ اس میں ملکہ سخاوت موجود ہے' اسی طرح اس کی معرکہ آرائی اس کی دلیل ہوتی ہے کہ اس میں شجاعت کی صفت پنہاں ہے-علیٰ ہذا القیاس انسان کے جتنے اعمال بھی ہیں وہ سب درحقیقت اس کے ان اخلاق کی دلیل ہوتے ہیں جو اس میں پوشیدہ موجود ہیں- یہاں بھی کسوٹی کے خطوط کی طرح خود یہ اعمال مقاصد نہیں ہوتے بلکہ اصل مقصود وہ مخفی اخلاق و ملکات ہوتے ہیں اور یہ اعمال اس پر دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں- بازار آخرت میں تمام تر قیمت انسان کے ان مخفی اخلاق ہی کی ہے- اس بنا پر ضروری ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے یہ عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات جو کہ مبداء اعمال ہیں سب کے سب حسنہ اور رب العزت کی نظر میں پسندیدہ ہوں- یہ نہیں ہوسکتا کہ بعض پسندیدہ اور بعض غیر پسندیدہ ہوں ورنہ ارتضیٰ من رسول میں رسولوں کو بلا کسی استثناء کے پسندیدہ فرمانا کیونکر مستقیم ہوسکتا ہے- لہٰذا جب ان کے جملہ اخلاق و ملکات پسندیدۂ حق ہو گئے تو ان کے جملہ اعمال کا بھی حسنہ ہونا ثابت ہوگیا اور ان کی معصومیت بھی ثابت ہوگئی من ارتضیٰ کے بعد من رسول میں اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے من بیانیہ لائے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ مِنْ رَّسُوْلٍ یہ مَنِ ارْتَضٰی کا بیان ہے یعنی جو شخص اس عموم کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو وہ صرف ایک رسول ہی ہوسکتا ہے اسی لیے انبیاء علیہم السلام کے سواء کسی کو اس معنی سے معصوم نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے گناہ کا صدور ناممکن ہو- یہ واضح رہے کہ گناہ صادر نہ ہونے سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ اس کی ذات میں وہ قوت ہی موجود نہ ہو جو صدور عصیان کی مقتضی ہو' یہ مطلب نہیں ہے کہ جس طرح اس کی ذات میں نافرمانی کرنے کا منشاء موجود

و پیدا است کہ کمال ایمان باولایت و مساز است باز بار استعانت در بالقول لثابت برایں امر دلالت دارد کہ انچہ براں ثابت میدارد آں چیز دیگر است لیکن پیدا است کہ انچہ در تحققش قول ثابت یعنی لا الہ الا اللہ را دخل است ہمی طاعت وتقویٰ است نظر برایں اگر گویند کہ مؤمنان کامل را بہ برکت لا الہ الا اللہ ابر طاعت وتقویٰ ثابت می دارند بجاست و ظاہر است کہ ایں دقت محفوظیت از معاصی ضرورست . باقی وجہ تخصیص معصومیت بہر انبیاء و محفوظیت بہر اولیاء باآنکہ ہر دو متحد المفہوم می نمایند درخور ایں عجالہ نیست ورنہ ان شاء اللہ دریں بارہ ہم چیزے رقم میزدم باقی[1] ماند اینکہ ایں جرائم مسلم الثبوت از کجا خاستند اگر مادہ مذکور نبود صدور جرائم محال بود جوابش این است کہ افعال را دو جہت است یکے نیت و مبادی آنکہ آنرا مصدر افعال تواں گفت دوم پیکر و ہویات آنکہ مظہر آں تواں خواند. لیکن پیدا است کہ مصدر و مظہر را بیک وتیرہ نداشتہ اند یک فعل بیک مظہر میباشد و انواع نیات بلکہ مدارج یک نوع ہم ازاں متفاوت اندریں صورت میتواں شد کہ پیکرے و مظہرے دریوزہ گر مصادر شتی باشد ہاں ازیں قدر انکار نتواں کرد کہ بعض مظاہر ارتباط طبعی بابعض مصادر دارند و ازیں جہت درصورت صدور آں از مصدر دیگر بینندہ را بغلط اندازد و

نہ ہو اسی طرح کسی عارضی اور خارجی سبب سے بھی اس سے کوئی عمل ایسا نہ ہو سکے۔ جس پر عصیان کا شبہ ہو۔ دیکھو گرم پانی میں گرمی پانی کی ذات سے نہیں ہے، مگر خارج سے پیدا ہو سکتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر عصیان گو خارجی عوارض کی وجہ سے طاری ہو سکتا ہے مگر قدرت ان کی نگہبان رہتی ہے۔ اور اس خارجی سبب کی وجہ سے بھی نافرمانی سے بچالیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے (كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ) آیۃ بالا سے چند فوائد معلوم ہوئے۔ اول یہ کہ جو نوع سوء اور فحشاء کی تعریف میں نہ آتی ہو اس کا صدور کسی عارضی وجہ سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ دویم یہ کہ سوء اور فحشاء کا تحقق خارجی اسباب سے یہاں بھی ہو سکتا ہے سوئم یہ کہ اس امکان کے باوجود قدرت ان کے صدور سے بھی نگہبان رہتی ہے اگر خارجی اسباب سے معصیت کا صدور ناممکن ہوتا تو پھر آیت بالا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ یعنی صرف کا کوئی فائدہ ہی نہ رہتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ معصومیت بایں معنی کہ اس کی ذات میں صدور معاصی کا منشاء نہ ہو صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اس معنی میں اولیاء اللہ بھی ان کے شریک نہیں ہیں۔ اولیاء اللہ کی شان میں ارشاد ہے (اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ) یہاں اولیاء کی شان میں متقی ہونا فرمایا گیا ہے۔ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں بچنے والا۔ یہاں بھی مفعول محذوف ہے جس کا مطلب وہی عموم ہے۔ یعنی ہر قسم کی معصیت سے بچنے والا' مگر جو خود بچنے والا ہو اس کے لیے یہ لازم نہیں۔ ہے کہ بچ بھی جائے۔ برسات کے موسم میں جب راستے کچے ہوتے

---

[1] حضرت مولانا مرحوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس تحقیق سے جو فرق فہم ناقص میں آتا ہے اس کی طرف ترجمہ میں اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی معصوم اور محفوظ گناہوں سے معصوم ہونے میں گو دونوں شریک ہوں لیکن معصوم میں مبداء عصیان ہی نہیں ہوتا اس لیے اس سے معصیت کا صدور ممکن ہی نہیں اور محفوظ کی فطرت تقدس کے اس مرتبہ میں نہیں ہوتی اس سے معصیت کا صدور ممکن ہے گویا انبیاء علیہم السلام میں یہ صفت ذاتی ہوتی ہے اور اولیاء اکرام میں خارجی اور عارضی۔ واللہ اعلم بالصواب.

خود یا مصدر دیگر سازد مثلاً پیکر صلوٰۃ اعنی ایں صورت خاصہ از رکوع و سجود علاقہ طبعی با مصدر خاص کہ اخلاص است میدارد با اینہمہ با مصادر دیگر اعنی نیات فاسدہ نیز گاہے خود رامی سپارد و زیر پردہ نیات دیگر مثل ریاء و سمعہ سرمی برآمد لیکن بوجہ ہماں علاقہ طبعی کہ مذکور شد در بادی النظر بر اخلاص کہ عین تعبد ست محمول میشود و ہمیں است کہ درحق منافقاں سرمایہ اطمینان دامن شد ورنہ در کفر اوشاں چہ کمی بود کہ آب تیغ جند اللہ بخشیدند ہمیں طور بعض پیکر و ہیاکل بعض افعال رامثل سب وشتم ونقصان مال وجان دوست وگریاں شدن یکے بدیگرے و دروغ و امثال آں علاقہ خاص با عصیان ست گوگاہ بگاہ مصدر آنہا چیزے دیگر شدہ باشد. مقاتلہ جہاد و کشت وخون فساد وعناد ہر چند ہمرنگ یک دیگر اند لیکن بوجہ آنکہ ایں قصد را عناد و فساد اتحادی است طبعی گود ستاویز بغض فی اللہ و مظہر اطاعت نیز میتواں شد ہمیں است کہ بسیارے از انسان صورت آں جہاد را ظلم وستم انگاشتہ دل از حقیقت دین اسلام برداشتہ اند چوں ایں مقدمہ ممہد شد سخن دیگر کہ ہم از اں سرمیزند باید شنید بحکم. **انما الاعمال بالنیات و ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم و لکن اللہ ینظر الی قلوبکم و نیاتکم** او کما قال مدار اعتبار کاروبار بنی آدم بر مصادر اعنی نیات و مبادی آں خواہد بود حسنے یا قبحے کہ در ذات افعال ودیعت نہادہ اند از اں حساب نخواہند فرمود اندریں صورت نوعے از حسن و قبح از طرف مصادر بسوئے مظاہر خواہد آمد لاجرم آں حسن و قبح درحق مصادر لازم ذات و درحق مظاہر عارضی خواہد بود پس اگر مصادر آں قبیح بالذات و مذموم حضرت رفیع

ہیں آدمی کوشش کرتا ہے کہ سنبھلے مگر پیر کبھی پھسل جاتا ہے اور گر جاتا ہے- اس لیے کہا کرتے ہیں کہ میں نے بہت کوشش کی مگر آخر پھسل گیا اور بچ نہ سکا- پس آیت بالا سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے جو اولیاء ہیں وہ گناہوں سے بچتے ہیں مگر یہ کہ صدور معصیت کا ان سے امکان نہیں ہوتا یہ ثابت نہیں ہوتا- ہاں ایک اور آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت امکان عصیان کے باوجود ان کو بھی گناہ کے ارتکاب سے بچالیتی ہے ارشاد ہے- (**یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا.** یہاں الذین امنوا) یعنی مؤمنین سے مراد وہی اولیاء اللہ ہیں چونکہ یہاں بھی یہ صفت مطلق رکھی گئی ہے اور چونکہ مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوتا ہے اس لیے یہاں مؤمنین سے مراد ان کے مرد کامل ہوں گے وہ اولیاء اللہ ہیں اگرچہ آیت بالا میں جس امر پر ثابت وقائم رکھنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ حسب تصریح آیت القول الثابت ہے یعنی کلمہ طیبہ مگر ظاہر ہے کہ کلمہ طیبہ پر ثابت قدمی نتیجہ اسی تقویٰ اور ان کی اطاعت شعاری کا ہے اس بناء پر اولیاء کی معصومیت بھی ثابت ہوگئی- لیکن علماء نے اولیاء کے حق میں معصومیت کی بجائے محفوظیۃ کا لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا ہے- اس وقت اس عجلت میں ان دونوں کے فرق پر روشنی ڈالی نہیں جا سکتی فرصت ہوتی تو اس کے متعلق بھی کچھ تحریر کرتا- اب رہا یہ سوال کہ جب انبیاء علیہم السلام میں معاصی کا منشا ہی موجود نہ تھا تو پھر ان سے ان افعال کا صدور کیسے ہوا جن کی نسبت قرآن کریم کی تصریحات موجود ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ افعال کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک ان کی نیت و مبادی جن کو مصادر افعال کہنا مناسب ہے- دوم ان کے قوالب اور اشکال جن کو مظاہر سے تعبیر کرنا موزوں ہے- یہ ظاہر ہے کہ مصادر و مظاہر افعال دونوں ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی فعل کا مظہر یعنی شکل اپنے مبادی یعنی نیات کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے بلکہ ایک ہی نوع کی

نیت میں بھی بے شمار مراتب پیدا ہو سکتے ہیں- اس بناء پر یہ ہو سکتا ہے کہ فعل کی صورت و مظہر تو بظاہر یکساں نظر آئے مگر اس کے مبادی یعنی نیتوں اور مصادر میں زمین و آسمان کا فرق رہے اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نا قابل انکار ہے کہ بعض افعال کی صورتوں کو بعض مصادر و نیات کے ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے اس بناء پر اگر اسی فعل کا صدور کسی دوسرے مصدر اور کسی دوسری نیت سے ہو جس کے ساتھ اس کو وہ طبعی ربط حاصل نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہاں مغالطہ لگ جاتا ہے اور وہ اس طبعی ربط کی وجہ سے یہاں بھی مصادر کے اتحاد کا حکم لگا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً نماز کی خاص ہیات جو رکوع و سجود سے مرکب ہے اس کے اخلاص کے ساتھ ایک ایسا ربط حاصل ہے جس کی وجہ سے نماز مصلّی کے اخلاص کے لیے برہان بن جاتی ہے- بایں ہمہ کبھی نماز مصادر فاسدہ سے بھی ادا کی جا سکتی ہے یعنی اس میں فاسد نیت بھی ہو سکتی ہے- لیکن اسی طبعی علاقہ کی وجہ سے نمازی پر گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ وہ مخلص ہے اور یہی وجہ تھی کہ منافقین کے حق میں بھی یہ نمازیں سرمایہ اطمینان بنی ہوئی تھی اور ان کے جان و مال دونوں محفوظ تھے ورنہ ان کے کفر میں شبہ کیا تھا- اس کے برعکس بعض اشکال و صور کو بھی بعض معاصی کے ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے- جیسے سب و شتم، جنگ و جدل اور قتل و غارت وغیرہ یہاں بھی نیات کے تفاوت کی وجہ سے ان افعال کے معصیت اور طاعت ہونے میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اسی طبعی ربط کی وجہ سے مغالطہ لگ جاتا ہے- یہی وجہ ہے کہ جہاد کی صورت چونکہ ناحق کشت و خون کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے اور کشت و خون کو عناد و فساد کے ساتھ طبعی ربط حاصل ہے اس لیے جہاد پر کشت و خون کا مغالطہ لگ جاتا ہے حالانکہ یہ بغض فی اللہ کا مظہر اور اطاعت ربانی کا مرقع ہے ان کا قالب گو یکساں نظر آئے مگر ان کا مصدر قطعاً مختلف ہے اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض کوتاہ فہموں کے لیے تو جہاد کی مشروعیت حقانیت اسلام کے سمجھنے میں شبہ کا موجب بن گئی ہے-

الدرجات است مثل جو دعناد و تکبر ہوا و ہوس آنرا گناہ باید پنداشت و ہر چہ مصادر آں حسن بالذات و محمود خالق کائنات است اگر از قسمے است کہ آنرا علاقہ طبعی با مصادر قبیحہ و ذمیمہ است بد حال متصور است یکے آں کہ غلط فہمی باعث تحرک اخلاق حمیدہ گشتہ کہ ایں پیکر بداں وابستہ است. آں را خطائے اجتہادی باید گفت دوم آنکہ غلط فہمی را دریں سلسلہ مداخلتے نبا شد ایں قسم را از زلات باید خواند مثال اول مناقشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام با حضرت ہارون علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام است و مثال ثانی معاملہ برادران حضرت یوسف علیہ السلام باد شان دقصہ گریختن حضرت یونس علیہ السلام بنماید چہ مصدر ایں حرکات و باعثِ صدور آں از اخوان یوسف علیہ السلام محبت دنیا نبود جملہ لیوسف و اخوہ احب الی ابینا منا خود برایں قد رگواہ است کہ باعث این حرکات عنایاتِ حضرت یعقوب علیہ السلام بود. ظاہر است کہ یعقوب علیہ السلام از ملوک روزگار و امراء وقت و سردار نبودند کہ عنایاتِ اوشان بحال یوسف علیہ السلام موجب حصول مناصب دنیوی می شد ازیں باعث عرق حسد برادران بجوش می آمد نے بلکہ توجہ حضرت یعقوب علیہ السلام مورثِ برکات دینی بود و موجب حصول مقاصد یقینی زیں باعث برادران اوشاں را حسد از دں سر زدومی دانی کہ حسد از لوازم بحث و آثار آنست ہر قسم محبت کہ باشد پس اگر محبت دنیوی است حسد نیز لازم و در حکم و اعتبار تابع آن خواہد بود اگر محبت خداوندی است ہمچنان حسد آں ہماں حساب شمردہ خواہد شد. بالجملہ ایں رشک اوشاں از آثار محبت خداوندی می نماید آرے

پیکر نازیبا در برگرفتہ بود ظاہر بیناں ایں را جریمہ خوانند و مرتکبان را گناہگار انگارند و بندۂ گمنام ایں را از قسم زلآت می شمارد و ہمیں است کہ مغفور شدند در نہ فساد ذات البین را حالقہ فرمودہ اند و ازیں جا معنی لاحسد الا فی اثنین پیدا شدہ باشد و ہم ہویدا شدہ باشد کہ دریں حدیث حسد بمعنی خود است حاجت آں نیست کہ بمعنی غبط گیرند مگر غرضم نہ آنست کہ کاربند ایں قسم حسد ہم باید شد و بزد و کوب و ایذاء رسانی باید پرداخت نے بلکہم ادم آنست کہ ایں قسم حسد کہ از آثار محبت خداوندی است و در عروضش بر طبع کے را اختیار نیست بذات خود مذموم نیست ازیں جا دریافت کردہ باشی کہ جرم چیزے دیگر ست و زلہ و خطار اجتہاد چیزے دیگر بلحاظ پیکر یکے را از قسم دیگر شمردن نشاید وہم دریافتہ باشی کہ کذب وغیرہ کہ منشاء آں ہمیں حسد متفرع بر محبت خداوندی شدہ باشد در حکم و اعتبار و شمار ہماں حسد خواہد بود اندریں صورت کذبات اخوان یوسف را جرم نباید گفت زلت باید خواند باقی وجہ تسمیہ ہم ازیں بیان خواہد یافت لیکن ایں قدر باید نوشت کہ در صورتے کہ مصدر گناہ صغیرہ باشد یا کبیرہ ہماں مادۂ شیطانی شد چہ پیش آمد کہ اکابر دین امتناع کبائر پس و پیش نبوت برابر شمردند و صغائر را مخصوص بزمانہ پس نبوت دانستند مقتضائے اتحاد منشاء آں بود کہ ہر دو یکساں می بودند در جوابش آنچہ بفہم احقر می آید انیست کہ کبائر بذات خود مقصودی باشند و صغائر ذرائع کبائر می بودند قبح کبائر بہ نسبت صغائر ذاتی میباشد و قبح آں عرضی چہ کبائر را بجز یک مصدر معین مصدرے دیگر نمی باشد و ذرائع را مصادر کثیرہ می بود و آنہم بسا اوقات متبدل میشود ہمیں ست کہ زناء با ہر کہ

اسی مقدمہ کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ بمقتضائے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اصل محاسبہ کا مدار مصادر افعال رہیں گے نہ ان کے مظاہر و اشکال لہٰذا محاسبہ صرف افعال کے مظاہر حسنہ اور قبیحہ پر نہ ہوگا بلکہ اصل حسن و قبح کا مدار ان کے مصادر یعنی نیتوں پر رہے گا اور ان نیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہی ان کے مظاہر و اشکال پر بھی حسن و قبح کا حکم لگایا جا سکے گا یہ حسن و قبح ان مصادر کے حق میں تو ذاتی اور اصلی ہوگا اور مظاہر کے لیے عارضی لہٰذا اگر مصادر افعال بالذات قبیح ہوں اور حق تعالیٰ کے نزدیک قابل مذمت و نفرت ہوں جیسے توحید کا انکار، عناد و تکبر، ہواء و ہوس، یہ افعال ہر حالت میں معاصی شمار ہوں گے- کیونکہ یہ افعال ایسے ہیں جن کا قبح بالذات اور اصلی ہے عارضی نہیں اور جن افعال کے مصادر حسن بالذات ہوں اور خالق کائنات کے نزدیک عمدہ ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کو مصادر قبیحہ کے ساتھ کوئی طبعی علاقہ تو نہیں ہے اگر ہے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے اخلاق حمیدہ ان مظاہر کے ارتکاب کا محرک بن سکتے ہیں دوم یہ کہ کسی غلط فہمی کا محل ہی نہ ہو- پہلی صورت کو خطاء اجتہادی کہا جاتا ہے اور دوسری کا نام زلت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پہلی قسم میں داخل ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا تھا وہ صرف اس غلط فہمی میں تھا کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ان سے کچھ نہ کچھ تساہل ہوا ہے- اس کے برخلاف برادران یوسف علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کا معاملہ دوسری قسم یعنی زلت میں داخل ہے- کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام سے جو فعل سرزد ہوا اس کی بنیاد دنیا کی محبت نہ تھی بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ان کی جانب غیر معمولی میلان تھا جیسا کہ وَ اَخُوْہُ اَحَبُّ اِلٰی اَبِیْنَا اس پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کوئی ظاہری بادشاہ تو نہ تھے

باشد ممنوع و بوس و کنار با اولاد خود محمود و دانی کہ اندریں صورت کبائر موصوف بالذات و صغائر بالعرض و قابل عروض خواہند بود قبل عروض اطلاع قابلیت لغایت عسیر مثل اطلاع موصوف بالذات سہل و آشکار اینست مع ہذا تحدید حدود کار خداوند معبود دست نبی را ہم اگر ایں علم میسری آید بذریعہ وحی میسری آید و غالبًا و وجدک ضالاً فھدیٰ ہمیں معنی داشتہ باشد مگر علم حدود کبائر بایں وجہ کہ بوجہ مقصود بودن آں و اشتہار ندمت آں قرنًا بعد قرن۔ اتفاق انبیاء دراں روشن تر است چنداں محتاج وحی نیست۔ بایں وجہ لازم آمد کہ ہم پیش از نبوۃ وہم بعد از نبوۃ ممتنع باشد باقی ماند صغائر چوں آنہا دریں مرتبہ اشتہار نمی باشند و نہ چناں مقصود و برروے کار گونہ اختفاء درآں راہ یافت کہ بے نزول وحی علم بسیارے ازاں درحکم ممتنع باشد آخر کیست کہ نمی داند کہ ممانعت ذرائع زنا کہ از حدیث وکلام اللہ می برآید ہر گز بخیال احدے نمی آید ہاں بعضے ازاں مثل کذب کہ علم بطلان آں طبعی ست دربارۂ امتناع و انتہاء انبیاء ازاں محتاج وحی نیست مگر اینہمہ تاہماں دم است کہ جریمہ باشد و اگر از قسم زلت بود امتناعش درحق اوشاں ممتنع نمی نماید ہاں ایں قدر صحیح کہ قوت علمیہ وقوت عملیہ از کمالات ذاتیہ بلکہ اصل آنست۔ و کذب بظاہر دلالت برفساد اول دارد کہ اشرف ست و بعد اطلاع تعمد کذب در اخبار دنیوی رافع اعتماد مطلق ست پس خدارا چہ امید کہ وحی بجنسہ خواہد رسانید و بنی نوع را چہ یقیں کہ ہرچہ از خدا آوردہ بے کم و کاست آوردہ بایں وجہ کسیکہ کذب مقتضاء طبعش بود نبوت رانشاید لیکن از پاک نہاداں بوقت غلبہ مصدر چنانچہ صدور کبائر ممکن است و جملہ لولا ان رأی برھان

کہ ان کے میلان میں کسی ظاہری نفع کا خیال پیدا ہوسکتا ہو بلکہ ایک نبی تھے جن کی محبت پر صرف آخرت ہی کا نفع باعث حسد بن سکتا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسد لوازم محبت میں سے ہے خواہ وہ دنیوی محبت ہو یا اخروی لہٰذا جیسی محبت ہوگی اس کے حسد کا حکم بھی اسی کے تابع رہے گا چونکہ برادرانِ یوسف علیہ السلام کے حسد کا باعث خداوندی محبت تھی اس لیے ان کے حسد کا باعث بھی محبت خداوندی کے آثار میں شمار ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ جو اس کا قالب اختیار کیا گیا وہ یقینًا نازیبا تھا۔ یہاں ایک ظاہر ہیں جو صرف افعال کی ظاہری صورت پر نظر رکھتا ہے اس کو معصیت اور گناہ ہی شمار کرے گا لیکن ہمارے نزدیک وہ زلت میں داخل ہے یہی وجہ تھی کہ یہ ذات البین جس کے حق میں حالقہ کا لفظ وارد ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی سفارش پر بارگاہ رب العزت میں معاف ہوگئی۔ اس تقریر سے حدیث **لا حسد فی الاثنتین** کے معنی میں کسی تاویل کی ضرورت نہ رہی (کیونکہ نیات کے تفاوت سے بعض مواضع میں حسد کی گنجائش نکل آئی) اس بیان سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس قسم کا حسد کرنا اپنے اختیار سے بھی درست ہے اور کسی مسلم کی ایذاء رسانی خواہ کتنی ہی اچھی نیت سے ہو حلال ہوسکتی ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس حسد کا باعث خداوندی محبت ہو وہ غیر اختیاری ہوتی ہے' اس لیے قابل درگزر ہوسکتی ہے برخلاف اس حسد کے جس کی بنیاد حُبِ دنیا ہو اس تقریر سے جرم' زلت اور خطائے اجتہادی میں فرق واضح ہو گیا یہاں سب کی صورت گو ایک ہی نظر آتی ہے مگر معنی اور احکام کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جرم قصداً معصیت کرنے کا نام ہے اور خطاء اجتہادی اس غلطی کو کہتے ہیں جہاں غلط فہمی کا کوئی منشاء پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے برخلاف زلت ہے جہاں غلط فہمی کا کوئی منشاء تو نہیں ہوتا مگر اس میں احتیاط کے باوجود غیر اختیاری طور پر انسان مبتلا ہو جاتا ہے (جیسا کہ خود زلت کا لفظ جس کے معنی لغزش

ربہ شاہد برآں کذب وآنہم بطور زلت بدرجہ اولی ممکن باشد البتہ کبیرہ بوجہ تعیّن مصدر بطور زلت صمادر نتواں شدزیں وجہ عصمت لازم افتا۔

اور پھسلنے کے ہیں اس پر دلالت کرتا ہے) اب رہا یہ سوال کہ جب مصدر گناہ خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ایک ہی ٹھہرا یعنی مادۂ شیطانی تو پھر علماء نے ان دونوں کے صدور میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں تفریق کیوں کی ہے اگر ان میں مادۂ شیطانی نہیں ہے تو پھر ان سے ہر دو لوع کا صدور ممنوع ہونا چاہیے اور قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی کوئی تفصیل بھی نہ ہونی چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبائر وہ گناہ ہیں جو بذات خود مقصود ہوتے ہیں اور صغائر وہ ہیں جو بذات خود مقصود ہوتے ہیں اور صغائر وہ ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ کسی کبیرہ کے لیے ذریعہ اور تمہید ہوتے ہیں اس لیے کبائر کا قبح صغائر کی نسبت سے ذاتی اور صغائر کا عرضی ہوتا ہے کیونکہ کبائر میں نیت فاسدہ کے سوائے کوئی اور دوسری نیت ہی نہیں ہوتی اور اُن کے ذرائع یعنی صغائر میں مختلف نیات بھی ہوسکتی ہیں اور ان نیتوں کے اختلاف سے اُن افعال کا حکم بھی مختلف ہوسکتا ہے دیکھو زنا، جو کبائر میں ہے مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کسی کے ساتھ ہو اور بوس و کنار جو صغائر میں شمار ہے اگر اجنبی عورت کے ساتھ ہو تو حرام ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ حرام نہیں بلکہ مطلوب ومحمود ہے۔ پس جب صغائر میں قبح عارضی ہوا یعنی کہیں ہوا اور کہیں نہ ہوا تو ان کا قبح بھی کبائر کی طرح کھلا ہوا واضح اور ظاہر نہیں ہوگا اس لیے یہاں وحی کی اطلاع کے بغیر یہ حکم لگانا مشکل ہوگا کہ قبح کہاں عرضی ہے اور کہاں اصلی ان حدود کی تحدید صرف ایک احکم الحاکمین کا حق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اگر اس حقیقت کی اطلاع ہوتی ہے تو بذریعہ وحی ہوتی ہے۔ غالبًا و وجدک ضـالاً فهدیٰ کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں اس کے برخلاف کبائر کا معاملہ ہے وہ شرائع سابقہ سے لے کر آج تک اتنا روشن ہوتا چلا آیا ہے کہ ان کے قبح پر وحی الٰہی کو تنبیہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے انبیاء علیہم السلام سے ان کا صدور نہ قبل از نبوت ہوسکتا ہے نہ بعد از نبوت صغائر کا قبح اس درجہ شہرت پذیر نہیں ہوتا اس لیے ان کا معاملہ اتنا دقیق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی شناخت وحی کے بغیر ناممکن ہوتی ہے کون نہیں جانتا کہ جس طرح زنا ہر شخص کے نزدیک معصیت ہے اسی طرح اس کے مقدمات کھلی ہوئی معصیت نہیں اگر قرآن وحدیث ان کی ممانعت نہ فرماتے تو کسی کے ذہن میں بھی ان کی اتنی مذمت نہ آسکتی۔ ہاں بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کے مذموم ہونے کی شہرت بھی کبائر کی طرح ہے جیسے کذب یہاں بھی اس کے قبح کے لیے وحی کی تنبیہ کی احتیاج نہیں ہے مگر یہ بھی اسی وقت ہوگا کہ اس کا صدور قصداً ہو نہ کہ زلت کے طور پر غیر اختیاری۔ انسان کے کمالات کی دو قسمیں ہیں کمالات علمیہ اور کمالات عملیہ کذب انسان کے کمالات علمیہ کے فساد پر ضرور دلالت کرتا ہے اس لیے اگر کوئی شخص قصداً جھوٹ بولے تو نہ وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابل اعتماد ہوسکتا ہے نہ انسانوں کی نظروں میں کیا معلوم جب اس کی عادت کذب کی ٹھہری تو وہ وحی الٰہی کو بجنسہ پہنچائے گا یا نہیں۔ ہر بنی نوع انسان کو کیا اطمینان کہ جو وحی اس پر آئی تھی وہی اس نے بعینہ پہنچائی ہے۔ اس لیے جس کی فطرت میں دروغ گوئی کی صفت ثابت ہوجائے وہ منصب نبوت کے قابل نہیں ہوسکتا ہاں اگر کذب کا صدور غیر اختیاری شور پر ہوجائے تو اس کا امکان ہوسکتا ہے مگر کبائر میں چونکہ مصادر متعین ہوتے ہیں یعنی ان میں فاسد نیت کے سواء کوئی دوسری نیت ممکن ہی نہیں اس لیے بطور زلت بھی انکا صدور ناممکن ہے۔

❁ ❁ ❁

(۱۰۹۹) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْتُخْلِفَ خَلِیْفَۃٌ اِلَّا لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالْخَیْرِ وَ تَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَ بِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالشَّرِّ وَ تَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَ اللّٰہُ.

(رواہ البخاری فی کتاب القدر)

(۱۰۹۹) ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ جو خلیفہ بھی ہوتا ہے اس کے لئے دو قسم کے مشیر ضرور ہوتے ہیں ایک مشیر وہ جو اس کو نیکی کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور اسی کی رغبت دلایا کرتا ہے' دوسرا وہ جو برائی کا مشورہ دیتا ہے اور بری باتوں کی طرف اُبھارتا رہتا ہے پھر برائی سے محفوظ تو صرف وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

(بخاری شریف)

الرَسُول العَظِیم و عِصمته فی عهد طفُولیَّته

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ طفولیت

(۱۱۰۰) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

(۱۱۰۰) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام رسول

(۱۰۹۹) ٭ حدیث مذکور پر امام بخاریؒ نے "بطانته الامام و اهل مشورته" کا عنوان قائم کر کے غالباً اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ یہاں مشیر مراد ہیں جو ہر خلیفہ و حاکم کے ساتھ عام طور پر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت حدیث مذکور کا تعلق فرشتہ اور شیطان کی خیر وشر کی ان دو طاقتوں سے مخصوص نہ ہوگا جو عام انسانوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جب انسانی فطرت ظاہری مشیروں سے متاثر ہوسکتی ہے تو خیر وشر کی ان دو مرکزی طاقتوں سے بھلا کیونکر متاثر نہ ہوگی اس بناء پر اگر حدیث کو عام رکھا جائے تو اس میں بھی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ حدیث کا آخری جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ مقام عصمت یعنی وہ مقام کہ انسان شیطان یا غلط مشیر کا کوئی اثر قبول نہ کر سکے یہ اپنے بس کی بات نہیں جس کو خدا تعالیٰ محفوظ رکھے بس وہی محفوظ رہ سکتا ہے یہ شان صرف انبیاء علیہم السلام کی ہے چونکہ ان کو خود اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے انتخاب فرماتا ہے اس لیے وہی ہر قسم کی غلطی سے ان کو بچانا بھی ہے ان کے علاوہ جتنے انسان ہیں ان کا معاملہ خطرہ میں ہے۔

(۱۱۰۰) ٭ نورِ محمدی قرنہا قرن سے قوالب انسانیہ سے گذرتا ہوا آرہا تھا اور اب وہ وقت آچکا تھا جب کہ بطن آمنہ سے براہ راست پیکر انسانی میں وہ جلوہ گر ہو جائے۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ قالب انسانی کے خواص سے یکسر خالی ہوتا۔ مگر قدرت چاہتی ہے کہ آپ کا قالب بھی تمام دوسرے بشر سے علیحدہ اور ممتاز رہے' اس لیے اس کام کے لیے وہ اپنا سب سے مقدس فرشتہ بھیجتی ہے وہ آکر سب سے مقدس پانی سے اس کو صاف کرتا ہے پھر ایمان کے آب زلال میں اس کو غوطہ دیتا ہے یہ تو ہوسکتا تھا کہ آپ کے جسد اطہر میں پیدائشی طور پر ہی یہ حصہ نہ رکھا جاتا مگر عالم اسباب کے تحت جب یہ قالب مبارک اسی صورت سے منتقل ہوتا چلا آرہا تھا جیسا کہ عام انسانی قالبوں کا انتقال ہوتا ہے تو ان خواص سے علیحدہ رہنا کیسے ممکن تھا' ادھر یہ بھی منظور تھا کہ اپنی خصوصی نظر تربیت کا اظہار کیا جائے۔ تربیت کا ترجمہ پرورش ہے یہ تدریج کی متقاضی ہے اس لیے رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہتا تھا کہ اپنی خصوصی پرورش کا اظہار فرمائے اور قدم قدم پر یہ روشن فرمائے کہ یہ ذاتِ قدسی صفات کسی دوسرے کی نگرانی میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھو والد کا سایہ' والدۂ مبارکہ کا سایہ اور آخر میں عم بزرگوار کا سایہ یہ سب سایے اٹھے مگر اٹھے رفتہ رفتہ اور آخر میں پھر ایک اسی ذات پاک کا سایہ رہ گیا جس نے شروع سے آپ کو براہ راست اپنی تربیت میں لے رکھا تھا۔ حافظ سہیلیؒ نے یہاں ایک عجیب نکتہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قالبِ انسانی کی تخلیق کی اصل نطفہ ہے جس کا ظہور شہوت سے ہوتا ہے۔ یہی نطفہ تدریجی طور پر بستہ خون' پھر تو تھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی بستہ خون مغمز شیطان کہلاتا ہے۔ چونکہ شہوات کے تمام مقامات پر شیاطین دلچسپی کے ساتھ نظر رکھتے ہیں اس لیے قالب انسانی کے اس جزء پر بھی خاص لله .....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ وَ هُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَاَخَذَهٗ فَصَرَعَهٗ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً فَقَالَ هٰذَا حَظُّ

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اس وقت آپ بچوں کے ساتھ کھیل تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لٹا دیا اور قلب مبارک چیر کر اس میں سے خونِ بستہ کا ایک ٹکڑا نکال دیا اور کہا کہ

لله ..... طور پر ان کی نظر رہتی ہے اور اسی کو وہ ہر جدید مولود میں تلاش کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی پیدائش چونکہ اس معہود طریقہ کے برخلاف صرف نفخہ جبرئیلی سے ظہور پذیر ہوئی تھی اس لیے اس میں یہ حصہ ابتداء سے شامل نہ تھا۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ولادت کے بعد ہر بچہ کو شیطان آ کر انگلی سے چھیڑتا ہے سوائے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے (دیکھو ترجمان السنہ ص ۳۷۳ ج ۲) ان کی پیدائش چونکہ نطفہ کی بجائے نفخہ سے ہوئی تھی اس لیے اس میں مغمز شیطان ہی نہ تھا۔ اس لیے یہاں آ کر وہ غمز کرتا تو کس چیز کو کرتا۔

اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت چونکہ نوعِ انسانی کے دستور کے مطابق ہوئی تھی اس لیے اس میں اس مغمز کا ہونا لازمی تھا' مگر یہ ظاہر ہے کہ اس مغمز کا جو تعلق بھی تھا وہ تمام تر والد کی طرف سے تھا مولود مبارک کی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر جیسا کچھ بھی تھا مگر عہد طفولیت ہی میں اس مغمز کو نکال کر پھینک دیا گیا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایمان وحکمت سے بھرا ہوا ایک طشت لا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں ڈال دیا گیا تھا' وہ بھی آبِ زم زم سے دھو کر پھر روح القدس جیسے مقدس فرشتے کے ہاتھوں سے۔ (الروض الانف ص ۱۱۰ ج ۱)

ہمارے نزدیک قدرت کی یہ حکمت بہت زیادہ قابل غور ہے کہ ان دونوں مسعود ولادتوں میں جس فرشتہ کا تعلق ثابت ہوتا ہے وہ ایک ہی فرشتہ یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں فرق ہے تو یہ کہ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول کی تخلیق ہی ملکی تھی۔ اور سب سے آخری رسول کی تخلیق گو بشری تھی مگر تطہیر پھر ملکی تھی' دونوں مقامات میں ﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ کا نظارہ ایک سے ایک بڑھ کر تھا' لیکن یہ بحث کہ عالم بشری کی تکمیل کی صورت ان دونوں میں کون سی کامل تر تھی اس کا کچھ فیصلہ ہر دو رسولوں کی بعثت کے آثار کی طرف نظر کرنے سے ہو سکتا ہے۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور اول میں گو ملکیت کے عجیب در عجیب نظارے دنیا نے دیکھے مگر رسولوں کے لیے بشریت کا مظاہرہ بھی کتنا ضروری ہوتا ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ نزول کے بعد ان کی بشریت کے نظارے بھی جب تک دنیا اسی شد و مد کے ساتھ دیکھ نہ لے اس وقت تک ان کی وفات نہ ہوگی۔ آخر وہ بھی اسی جگہ آ کر مدفون ہو جائیں گے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پہلے مدفون ہو چکے ہیں اس سے زیادہ اس نازک مرحلہ میں پڑنا موزوں نہیں۔ حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ ابوالبشر کی خلافت کا مقصد ایک بشر ہی کے عہد مسعود میں آ کر پورا ہو۔ مگر جو قدرت کے اس راز کو نہیں سمجھتے وہ چاہتے ہیں کہ یہ اہم مقصد جس رسول کے دور میں پورا ہو وہ ملکی خلقت کا رسول ہو۔ یاد رکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت یہ نہیں کہ آپ کی بشریت ہی سے انکار کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ آپ کی بشریت کی وجہ سے جنس بشری کی افضلیت کا یقین پیدا کر لیا جائے۔

برزمیں کہ نشانِ کفِ پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اس تفصیل سے آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دنیا میں بچے سب ہی معصوم ہوتے ہیں' مگر ان کی عصمت کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں اور کوئی کوئی ان میں بداطوار بھی ہوتا ہے پھر ان کی عصمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قانون یسر کے ماتحت قدرت ان کے ان افعال پر قلم عفو کھینچ دیتی ہے اور مواخذہ نہیں فرماتی مگر یہ وہ معصوم ہیں جن کی معصوم فطرت لله .....

الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فِيْ طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ لَامَهُ وَ اَعَادَهُ فِيْ مَكَانِهِ وَ جَاءَ الْغِلْمَانُ يَسْعَوْنَ اِلٰى اُمِّهِ يَعْنِيْ ظِئْرَهُ فَقَالُوْا اِنَّ مُحَمَّدًا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوْهُ وَ هُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ قَالَ اَنَسٌ فَكُنْتُ اَرٰى اَثَرَ الْمُخِيْطِ فِيْ صَدْرِهِ.

(رواہ مسلم)

آپ میں یہ تھا شیطان کا حصہ جس کو میں نے نکال کر پھینک دیا ہے۔ پھر آپ کے قلب مبارک کوزم زم کے پانی سے ایک سونے کے طشت میں ڈال کر دھویا پھر اس کوسی دیا اور اپنی جگہ پر رکھ دیا بچے آپ کی دودھ پلائی کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو قتل کر دیئے گئے۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے نکلے تو آپ کا رنگ فق پڑا تھا۔ انسؓ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ اس سلائی کا نشان آپ کے سینہ مبارک میں دیکھا کرتا تھا۔ (مسلم شریف)

الرَّسُوْلُ العَظِيْمُ وَعِصمته في ابان شبابه

(١١٠١) عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا هَمَمْتُ بِقَبِيْحٍ مِمَّا كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَهُمُّوْنَ بِهِ اِلَّا مَرَّتَيْنِ مِنَ الدَّهْرِ كِلْتَا هُمَا يَعْصِمُنِى اللّٰهُ مِنْهُمَا قُلْتُ لِفَتًى كَانَ مَعِيْ مِنْ قُرَيْشٍ بِاَعْلٰى مَكَّةَ فِيْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ شباب

(١١٠١) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جن ناشائستہ حرکات کا جاہلیت کے لوگ عام طور پر ارادہ کیا کرتے تھے بجز دومرتبہ کے میرے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی نہیں گذرا اور ان دونوں مرتبہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان میں شرکت کرنے سے بچالیا ہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایک قریشی نوجوان جو مکہ مکرمہ کی بالائی جانب میں اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا تم ذرا میری

لله ..... کواور طرح طرح سے معصوم بنایا جارہا ہے تاکہ گناہ کا صدور تو درکنار اس میں کسی ادنیٰ سی معصیت کی طرف میلان بھی نہ رہے اس لیے یہ وہ معصوم ہیں جو گناہ کرنا جانتے ہی نہیں اب اندازہ فرمالیجئے کہ جس تعمیر کی اساس میں اس طرح عصمت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے تو اس تعمیر کی عصمت کا عالم کیا ہوگا۔

(١١٠١) * ملکی اور وطنی عادات انسان میں خلقی عادات کی طرح راسخ ہوتی ہیں۔ اگر نزولِ وحی سے قبل آپ کے قلب میں ان کا خطرہ خطرہ بھی نہ گزرتا تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہوتا لیکن اگر آپ کی اس میں اس طرح قدرت کی تکوینی حفاظت ثابت نہ ہوتی تو یہ صفت عصمت کے مناسب نہ ہوتا اس لیے آپ کا ارادہ ہونا بھی ضروری تھا۔ پھر ایسے اسباب بھی سامنے آنے ضروری تھے کہ آپ اس میں شرکت نہ فرماسکیں۔ اچھا اگر فرض کرلو ایک بار ایسے موانع پیش آ بھی گئے تھے تو دوبارہ پھر ایسا ہی کیوں ہوا؟ اور اس کے بعد پھر آپ کا قلب مبارک اس خیال سے خالی کیوں ہوگیا؟ جب آپ ان سوالات پر غور کریں گے تو جواب صرف یہ ہوگا کہ صفت عصمت کا تقاضہ یہی تھا۔ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ جس بات کا یہاں ارادہ ہوا تھا اس کی حیثیت تھی کتنی؟ صرف ایک افسانہ گوئی کی شرکت۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا کہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس کو بداخلاقی کی فہرست ہی میں شمار کیا جاسکتا۔ مگر چونکہ نبوت کے پرازصدق وصفا فطرت کو صدق وصفا ہی کے ماحول میں رکھنا منظور تھا اس لیے فرضی افسانوں سے بھی اس کو دور رکھا گیا اور اس طرح عصمت کے اسباق قدرت خفیہ درخفیہ آپ کو واقعات کے ضمن ہی میں پڑھاتی رہی۔

اَغْـنـام لَها تَرْعٰی اَبْصِرْلِیْ غَنَمِیْ حَتّٰی اَسمرَ هٰـذِهِ الـلَّـیْـلَةَ بِـمَـكَّةَ كَما یَسمرُ الْفِتْیانُ قالَ نَـعَـمْ فَلَـمَّـا خَـرَجْـتُ فَجِئْتُ اَدْنٰی دَارٍ مِنْ دُوْرِ مَـكَّـةَ سَـمِـعْـتُ غِنَاءً وَ صَوْتَ دُفُوْفٍ وَ زَمِیْـرٍ فَـقُـلْتُ ما هٰذا قَالُوْا فُلانٌ تَزَوَّجَ فُلانَةً لِـرَجُـلٍ مِنْ قُرَیْشٍ فَلَهَوْتُ بِذَالِکَ الْغِنَاءِ وَ بِـذَالِکَ الـصَّـوْتِ حَتّٰی غَلَبَتْنِیْ عَیْنِیْ فَما اَیْـقَـظَـنِـیْ اِلَّا مَــسُّ الشَّـمْـسِ فَرَجَعْتُ اِلٰی صَـاحِـبِیْ فَـقَالَ لِیْ ما فَعَلْتَ قُلْتُ ما فَعَلْتُ شَیْـئًـا فَـوَالـلّٰـهِ ما هَمَمْتُ بَعْدَها بِسُوْءٍ مِمَّا یَعْـمَـلُ اَهْلُ الْـجَـاهِـلِیَّةِ حَتّٰی اَكْرَمَنِی اللّٰهُ بِنُبُوَّتِه.

(رواه ابن راهویه فی مسنده و ابن اسحاق و البزار و البیهقی و ابو نعیم و ابن عساكر قال ابن حجر اسناده حسن متصل و رجاله ثقات كذافی الخصائص)

بکریوں کی بھی دیکھ بھال رکھنا میں بھی اور نوجوانوں کی طرح آج مکہ مکرمہ جا کر افسانہ گوئی کے شغل کا ارادہ کر رہا ہوں اس نے کہا اچھی بات ہے جب میں چلا اور مکہ مکرمہ کی آبادی کے قریب ایک گھر کے نزدیک پہنچا تو میں نے گانے، دف اور باجہ بجانے کی آوازیں سنیں- میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے کہا فلاں قریشی شخص کا فلاں عورت سے نکاح ہوا ہے میں اس گانے بجانے کے قصہ میں پڑ کر قصہ گوئی کی محفل کی شرکت سے غافل ہو گیا اور اس زور کی نیند آئی کہ پھر دھوپ کی تیزی سے ہی میری آنکھ کھلی- میں اپنے رفیق کے پاس لوٹ آیا اُس نے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم نے کیا کیا- میں نے از اوّل تا آخر سارا ماجرا اس کو سنا دیا- ایک شب پھر میں نے اس سے ایسا ہی کہا وہ راضی ہو گیا اور پھر میں قصہ گوئی کے لیے نکلا پھر مجھے گانے کی آواز آئی اور جیسا شادی کا قصہ مجھ سے پہلے کہا گیا تھا اس مرتبہ پھر وہی مجھ سے کہا گیا- اس قصہ میں لگ کر میں پھر ایسا غافل ہوا کہ مجھ کو نیند آ گئی حتیٰ کہ دھوپ کی تیزی سے میری آنکھ کھلی- جب میں لوٹ کر اپنے رفیق کے پاس آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم نے کیا کیا میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا- خدا کی قسم اس کے بعد پھر کبھی میں نے کسی ایسی حرکت کا ارادہ نہیں کیا جس کے جاہلیت کے لوگ عادی تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے شرف نبوت سے مجھ کو نواز دیا- (بزار، بیہقی خصائص)

(۱۱۰۲) حَـدَّثَنا عَمْرُو بْنُ دِیْنَارٍ قَالَ سَمِعْتُ

(۱۱۰۲) عمرو بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابر

(۱۱۰۲) ✽ اس واقعہ کے وقت آپ کے سن مبارک میں مؤرخین کا اختلاف ہے- تاہم یہ متفق علیہ ہے کہ یہ واقعہ نبوت سے قبل کا ہے- دیکھئے کیا یہاں یہ ممکن نہ تھا کہ تہبند کھولنے سے قبل ہی آپ کو عریانی سے بچا لیا جاتا، مگر پھر یہ کیسے ثابت ہوتا کہ یہ وہ نہیں جن کی برہنگی ایک مرتبہ بھی قابل برداشت ہو- اس لیے نظر تربیت چاہتی ہے کہ ایک واقعہ نادانستگی میں ایسا بھی پیش آ جائے اور اس پر گرفت بھی ہو اور اس طرح یہ ظاہر کر دیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہستی عام انسانوں سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے- معیاری اخلاق کے خلاف قدرت ان کا کوئی عمل گوارا نہیں ہوتا- آخر قدم قدم پر قدرت کی یہ روک ٹوک قوم کی نظروں میں ان کو ممتاز کرتی چلی جاتی ہے تا آنکہ نبوت سے قبل ہی قبل یہ بات ذہنوں میں بیٹھ جاتی ہے کہ یہ ہمارے طبقہ سے کوئی الگ اور بلند انسان ہیں- اتنی بات کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اُن سے کوئی ایسا فعل ہی سرزد ہو جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو خواہ وہ صغیرہ ہی سہی بلکہ ہر وہ کام جو کسی اعلیٰ معیار سے ذرا سا بھی گرا ہوا ہو اس کا صدور وہ بھی ایک دو مرتبہ بس اتنا ہی کافی ہے کہتے ہیں کہ شریعت موسویہ میں ستر کا مسئلہ اتنا مکمل نہ تھا جتنا کہ ہماری شریعت میں ہے اس لحاظ سے اس وقت تک عریانی میں چنداں مضائقہ بھی نہ تھا ادھر اس وقت آپ کا سن مبارک بھی زیر اختلاف ہے- نیز اس وقت عرب میں بقیہ.....

جَابِرَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ الْحِجَارَةَ لِلْكَعْبَةِ وَ عَلَيْهِ اِزَارُهٗ فَقَالَ لَهُ الْعَبَّاسُ عَمُّهٗ يَا ابْنَ اَخِيْ لَوْحَلَلْتَ اِزَارَكَ فَجَعَلْتَهٗ عَلٰى مَنْكِبَيْكَ دُوْنَ الْحِجَارَةِ قَالَ فَحَلَّهٗ فَجَعَلَهٗ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ فَسَقَطَ مَغْشِيًا عَلَيْهِ فَمَا رَاٰى بَعْدَ ذٰلِكَ عُرْيَانًا.

(رواه البخاری فی باب كراهية التعری و فی باب بنيان الكعبة و طمحت عيناه الی السماء و فی حديث ابی الطفيل فتودی يا محمد عظ عورتك فذلك اوّل مانودی فما رأيت له عورة قبل و لا بعد)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی تعمیر کے لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ پتھر لا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہبند باندھ رکھا تھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا عزیز بھتیجے! اگر تم اپنا تہبند کھول کر اپنے کاندھوں پر پتھر کے نیچے رکھ لیتے تو آسانی ہو جاتی - ان کے فرمانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہبند کھول کر کاندھوں پر ڈال تو لیا مگر اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہو کر گر گئے - دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور غیب سے ایک آواز آئی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ستر ڈھکو - وہ دن ہے کہ پھر کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برہنہ نہیں دیکھا گیا - اور یہ پہلی آواز تھی جو غیبی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی -

(بخاری شریف)

ﷺ ..... کوئی شریعت ہی نہیں تھی وہ لوگ اپنے نفس کو گو حنیف کہتے تھے مگر ملت حنیفہ کا تخم بھی کھو بیٹھے تھے - پھر اس ایک واقعہ پر اتنی بڑی تنبیہ اس کا لازمی ثمرہ یہ ہونا تھا کہ لوگوں کی نظریں آپ کی طرف اٹھنے لگیں اور اُن میں یہ شعور پیدا ہونے لگے کہ ضرور جن کا اول یہ ہے اُن کا آخر کچھ ہو کر رہے گا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک تو بہت بلند ہے - آپ کے رفیق غار صدیق اکبرؓ کے متعلق جب کسی نے شیخ ابو الحسن اشعریؒ سے پوچھا کہ زمانہ جاہلیت میں ان کا حال کیا تھا تو شیخ موصوف نے کیا عجیب جملہ فرمایا ہے -"انه مازال بعين الرضاء من الله عزو جل" یعنی وہ تو ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی چشم رضاء کے تحت رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو اس طرح کا پروردہ ہو وہ کسی شرک و کفر میں کب مبتلاء ہو سکتا ہے - جب آپ کے ایک امتی کا حال یہ ہو تو خود بارگاہ رسالت کا حال کیا ہوگا - اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے - دیکھو الیواقیت والجواہر - ص ۳۷ ج ۲ - المبحث الثالث و الاربعون فی بيان ان افضل الاولياء المحمديين الخ - آپ کی حیات طیبہ میں یہ کل ایک واقعہ ہے وہ بھی نبوت سے قبل کا اس میں بھی نبوت سے قبل کا اس میں بھی تصریح ہے کہ یہ عم بزرگوار کی تعمیل ارشاد پر ہوا اپنی فطرت سے نہیں - اور اسی پر اس شدت کے ساتھ غیبی گرفت موجود ہے سوچئے جس دور میں ابھی نزول ملک بھی شروع نہ ہوا ہو اپنی شریعت کا کوئی تصور نہ ہو' پہلی شریعت موجود نہ ہو ایسے دور میں کشف ستر کی حیثیت کیا رہنی چاہیے اور کیا اس ایک واقعہ کی وجہ سے جو اس طرح زیر تنبیہ آ چکا ہو انبیاء علیہم السلام کی نبوت سے قبل کی زندگی میں صغائر کے لیے اصولی طور پر کوئی گنجائش تسلیم کر لینی چاہیے یا اس کے برعکس ان کی عصمت کا سبق لینا چاہیے - ابن ہشام بحیرا راہب کا قصہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فشبّ رسول الله صلی الله عليه وسلم و الله تعالی يكلوۂ و يحفظه و يحوطه من

آپ جوان ہوئے تو اس طرح پر اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی فرماتا آپ کی حفاظت رکھتا اور جاہلیت کی تمام ناشایاں حرکتوں سے آپ ﷺ .....

(۱۱۰۳) عَنْ زَیْدِ بْنِ حَارِثَۃَ قَالَ کَانَ صَنَمٌ مِنْ نُحَاسٍ یُقَالُ لَہٗ اِسَافُ وَ نَائِلَۃُ یَتَمَسَّحُ بِہٖ

(۱۱۰۳) زید بن حارثہ بیان کرتے ہیں کہ (مکہ مکرمہ میں) تانبے کا ایک بت تھا جس کو لوگ اساف و نائلہ کہتے تھے مشرک جب طواف کرتے تو تبرکاً

ﷺ..... اقذار الجاھلیۃ لما یرید بہ من کرامتہ و رسالتہ حتی بلغ ان کان رجلاً افضل قومہ مروءۃ و احسنھم خلقًا و احسنھم جوارًا و اعظمھم حلمًا و اصدقھم حدیثا و اعظمھم امانۃ و ابعدھم من الفحش و الاخلاق التی تدنس الرجال تنزھا تکرما حتی ما اسمہ فی قومہ الا الامین لما جمع اللّٰہ فیہ من الامور الصالحۃ.

کو دور دور رکھتا تھا- یہاں تک کہ آپ اپنے عین دور شباب میں بلحاظ مروت سب سے افضل، اخلاق میں سب سے بہتر، پڑوس کی رعایت سب سے زیادہ رکھنے والے، حلم و بردباری میں سب سے بڑھ کر گفتگو میں سب سے زیادہ راستباز، امانتداری میں سب سے زیادہ امانت دار، تمام فحش باتوں اور ان تمام بداخلاقیوں سے جو انسان کے لیے بدنما داغ ہوں کوسوں دور تھے اور ان ہی اوصاف حسنہ کی وجہ سے آپ کی قوم میں آپ کا لقب امین تھا- یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کو رسالت کے منصب جلیل سے نوازنا منظور تھا-

(۱۱۰۳) * شرک و کفر سے انبیاء علیہم السلام کا مجتنب رہنا تو کسی کے نزدیک بھی زیر بحث نہیں ہے- اس لیے یہاں غور صرف اس پر کرنا چاہیے کہ جب شرک و کفر سے صرف قدرت ہی ان کی نگراں ہوتی ہے تو پھر اس کی نگرانی صرف اسی حد پر کیوں ختم سمجھی جائے اور کیوں یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس کی نگرانی کا دائرہ فسوق و عصیان تک بھی وسیع ہوتا ہے- خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ تینوں قسمیں مکروہ تر ہیں گو اُن کے مراتب میں فرق ہو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مکروہ سے تو ان کی حفاظت کی جائے اور دوسرے مکروہ سے ان کی حفاظت نہ کی جائے- قرآن کریم کا ارشاد تو یہاں عام مؤمنوں کے حق میں یہ ہے-

﴿وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ کَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ﴾ (الحجرات:۷)

یہ خدا تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے اور اس کو خوشنما بنادیا ہے (اور یہ بھی اس کا انعام ہے) کہ اس نے کفر، گناہ اور نافرمانی کی نفرت پیدا کردی ہے-

پھر جن کے طفیل میں خدا تعالیٰ کا یہ انعام تقسیم ہوتا ہو خود ان کے حق میں بھی کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور کیسے معقول ہوسکتا ہے- یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان و کفر دو ضدیں ہیں اس لیے ایک کی محبت کے لیے دوسری جانب کی کراہت لازم ہے چونکہ آیت بالا میں ایمان کا مقابل صرف کفر کو نہیں رکھا گیا بلکہ عصیان بھی اس میں داخل ہے اس لیے محبت ایمانی اسی وقت کامل شمار ہوگی جب کہ کفر و عصیان سے نفرت بھی کامل ہو- اس لیے اگر انبیاء علیہم السلام میں محبت ایمانی کامل تسلیم کی جائے تو ان ہر سہ انواع سے کراہت تسلیم کرلینی بھی لازم ہوگی اور اگر ان ہر سہ انواع میں کسی سے کراہت میں کوئی نقصان تسلیم کیا گیا تو دوسری طرف محبت ایمانی میں بھی اتنا ہی نقصان تسلیم کرنا لازم ہوگا والعیاذ باللہ.

انبیاء علیہم السلام میں یہ ایمانی محبت ذاتی اور فطری ہوتی ہے اور کفر و معصیت سے نفرت بھی فطری اور ذاتی ہوتی ہے- اس ذاتی محبت و نفرت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی خلقت میں ایسی کوئی شے نہیں ہوتی جو ان کو کسی ادنیٰ سی برائی کی طرف مائل کرسکے پھر شیطان جو شر کی خارجی طاقت ہے وہ بھی اِن کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اس لیے داخل اور خارج کسی جانب سے بھی ان میں شر کا داعیہ نہیں اُبھرتا- ﷺ.....

اَلْمُشْرِکُوْنَ اِذَا طَافُوْا فَطَافَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ طُفْتُ مَعَہٗ فَلَمَّا مَرَرْتُ بِہٖ مَسَحْتُ بِہٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمُسَّہٗ قَالَ زَیْدٌ فَطُفْنَا فَقُلْتُ فِیْ نَفْسِیْ لَاَ مُسَّنَّہٗ حَتّٰی اَنْظُرَ مَا یَکُوْنُ فَمَسَحْتُہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَمْ تُنْہَ. قال البیھقی زاد غیرہ عن محمد بن عمرو باسنادہ قال زید فوالذی اکرمہ و انزل علیہ الکتاب ما استلم صنما قط حتی اکرمہ اللّٰہ تعالٰی بالذی اکرمہ و انزل علیہ.

اس کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا' میں نے بھی آپ کے ساتھ طواف کیا۔ جب میں اس بت کے پاس سے گذرا تو حسب دستور میں نے بھی اس کو ہاتھ لگایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو ہاتھ نہ لگانا۔ زید کہتے ہیں میں نے اپنے دل میں کہا میں ضرور ہاتھ لگا کر رہوں گا' دیکھو تو کیا ہوتا ہے چنانچہ میں نے اس کو ہاتھ لگا دیا۔ آپؐ نے فرمایا باز نہیں آؤ گے۔ بیہقی کہتے ہیں بعض راویوں نے اس روایت میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ زید کہتے ہیں اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا اور آپؐ پر قرآن نازل فرمایا' آپؐ نے کبھی کسی بت کو نبوت سے قبل بھی ہاتھ نہیں لگایا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نبوت سے نوازا اور آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا۔ (بیہقی کذا فی البدایۃ والنہایۃ)

الرَّسُوْلُ العظیم و سیطرۃ عصمتہ و انقیاد قوی الضلالۃ لہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عصمت کا رعب و دبدبہ اور گمراہی کی طاقتوں کا اس کے سامنے سپر ڈال دینا

(۱۱۰۴) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

(۱۱۰۴) ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ﷺ ..... دوسرے انسانوں میں مغز شیطانی بھی موجود ہوتا ہے ان کی اندرونی طاقتیں بھی انبیاء علیہم السلام کی طرف فطرۃً شائستہ اور مہذب نہیں ہوتیں' ان کا شیطان بھی شروع سے شکست خوردہ نہیں ہوتا اس لیے داخلی یا خارجی عوارض کی وجہ سے ان میں فسوق و عصیان کی کراہت کے باوجود پھر ان کی طرف میلان ہو جانا ممکن ہے۔ قرآن کریم کے لفظ کرۃ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کفر و عصیان کی یہ کراہت پہلے موجود نہ تھی مگر یہ حق تعالیٰ نے پیدا فرما دی ہے اور یہ اس کا انعام ہے کہ جو چیز پہلے تم کو محبوب تھی اللہ تعالیٰ نے اب اس کو تمہارے لیے مکروہ بنا دیا ہے پھر شریعت مطہرہ پر عمل کرتے کرتے اور حب ایمان اور کراہت کفر غالب آتے آتے وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب کہ ایک مسلمان کے اعضاء مرضیاتِ الٰہیہ کے اس طرح منقاد و مطیع بن کر رہ جاتے ہیں کہ ان میں خلاف حرکت کرنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر ان کی شان ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطَانٌ﴾ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے ساتھ ذرا سی دشمنی خدا تعالیٰ کے اعلان جنگ کا موجب بن جاتی ہے۔ ترجمان السنہ ج ا حدیث نمبر ۱۴ اور اس کا تشریحی نوٹ یہاں ضرور ملاحظہ فرمائیے انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں ابتداء ہی سے اتنی بلند ہوتی ہے کہ کسی طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لیے وہ معصوم کہلاتے ہیں اور دوسرے انسان گو معصوم نہ ہوں مگر ان کی اتباع سے معصیت سے محفوظ کہے جا سکتے ہیں۔

(۱۱۰۴) ٭ حدیث مذکور میں لفظ فاسلم کو کسی نے بصیغہ متکلم پڑھا ہے اور اسی کے مطابق ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کو بصیغہ غائب سمجھا ہے اس بناء پر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ میرا شیطان اسلام قبول کر چکا ہے اس لیے وہ صرف بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں ایک تیسری شرح فرمائی ہے اور ان ہر دو شرحوں کو ناپسند فرمایا ہے: ﷺ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَ قَدْ وَ كَّلَ اللّٰهُ بِهٖ قَرِيْنَهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ قَرِيْنَهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوْا وَ اِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِيَّايَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ. (رواه مسلم)

ہے تم میں سے ہر شخص پر اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں مقرر فرمائی ہیں جو اس کے ساتھ رہتی ہیں- ایک جن دوسرا فرشتہ- لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا یہ دونوں قوتیں آپ کے ساتھ بھی ہیں- فرمایا جی ہاں میرے ساتھ بھی ہیں لیکن شر کی قوت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے' اس لیے میں اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہوں- مجھ کو وہ بھی بھلائی ہی کا مشورہ دیتی ہے- (مسلم شریف)

لـہ ..... والمراد في اصح القولين استسلم و انقادلي و من قال حتى اسلم انا فقد حرف معناه و من قال الشيطان صار مأمونا. (مؤمنا) فقد حرف لفظه.

''جس شخص نے یہاں حدیث کے لفظ کو بصیغہ متکلم پڑھا ہے اس نے تو اُس کے معنی میں تحریف کی ہے اور جس نے اس کو بصیغہ ماضی پڑھ کر یہ سمجھا ہے کہ آپ کا شیطان اسلام قبول کر چکا تھا اس نے لفظی تحریف کی ہے صحیح مراد یہ ہے کہ اسلم بمعنی انقاد ہے یعنی وہ میرا مطیع وتابعدار بن گیا-''

دارمیؒ روایت مذکور کے بعد لکھتے ہیں و من الناس من يقول اسلم استسلم يقول ذلَّ. (ص ۳۰۶ ج ۲) اس سے بھی حافظ موصوف کی شرح کی تائید ہوتی ہے- سبحان اللہ! معصومیت کا مقام بھی کیا بلند مقام ہے جہاں سامان ضلالت بھی اسباب ہدایت بن کر رہ جاتا ہے- اب ذرا سوچئے کہ جہاں منبع شر بھی گردن تسلیم خم کر دے وہاں پھر شر کی گنجائش کس راستہ سے نکل سکتی ہے- جس کی معصومیت کی قوت کا اثر معصیت کی قوتوں پر بھی اتنا گہرا پڑتا ہو کہ وہ بھی مؤثر ہونے کے بجائے خود اس سے متاثر ہو کر رہ جائیں اور اس لیے اس کی معصومیت کے سامنے انقیاد وتسلیم کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہے ان کی عصمت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے- قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ. (الحجر:۴۲) جو میرے خاص بندے ہیں ان کے مقابلہ پر تجھ کو ذرا بھی غلبہ نہیں ہوسکتا ہے-

اس سے کچھ یہی مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے سامنے وہ بے بس ہو جاتا ہے- پھر انبیاء علیہم السلام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے- اس لیے خود بڑی خودسری کے موقعہ پر بھی اس کو اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ. (مگر جو تیرے خاص بندے ہیں ان کو میں گمراہ نہ کرسکوں گا) کا استثناء کرنا پڑا ہے- ایک حدیث میں ہے:

ان المؤمن ليضني شياطينه كما يضني احدكم بعيره في السفر. (رواه احمد بسند فيه ابن لهيعة كما في المجمع)

بندۂ مؤمن اپنے شیطانوں کو خدا تعالیٰ کی فرمان برداری کرتے کرتے اس طرح لاغر کر دیتا ہے جس طرح ایک شخص سفر کرتے کرتے اپنا اونٹ لاغر کر دیتا ہے-

اب ظاہر ہے کہ جب ایسے مؤمن کی شیطانی طاقت کمزور ہوگی تو اس کی ملکی طاقت ضرور مسرور ہوگی- اور جتنی وہ مسرور ہوگی اتنی ہی ہر کام میں اس کی معین ومددگار رہے گی حتیٰ کہ اس کی شیطانی طاقت میں برائی پر برانگیختہ کرنے کا کوئی حوصلہ ہی نہ رہے گا- اور اس وقت اس آیت کے معنی اس کے سامنے منکشف ہو جائیں گے-

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا. (النساء:۷۶)

(۱۱۰۵) عَنْ جَابِرٍ قَالَ وَ رُبَّمَا سَأَلْتُ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ وَ رُبَّمَا قَالَ يَسْلُكُ الشَّيْطَانُ مِنَ ابْنِ اٰدَمَ مَجْرَى الدَّمِ قَالُوْا وَ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ. (رواه الدارمي راجع ترجمان السنة ص ٣٢٤ ج ٢)

(۱۱۰۵) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جن عورتوں کے شوہر گھر میں نہ ہوں کہیں باہر سفر میں چلے گئے ہوں ان کے پاس نہ جایا کرو کیونکہ شیطان انسان میں اس طرح گھوم جاتا ہے جیسا خون رگوں میں۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی شیطان ہے۔ فرمایا جی ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے تو وہ میرے سامنے جھک چکا ہے۔ (دارمی) اسی مضمون کی دوسری حدیث ترجمان السنہ ص ۳۲۴ ج ۲ میں بھی گزر چکی ہے۔

(۱۱۰۶) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهٗ قِيْلَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۱۰۶) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

لله ..... جب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والوں کی شان یہ ہو تو اب انبیاء علیہم السلام کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ العیاذ باللہ خود اس کے فریب میں آ سکتے ہیں تو پھر ان پر ایمان لانے والے اس سے بچ کر بھلا کہاں نکل سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ شریعت میں فرشتے اور شیطان کا وجود تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے اس لیے یہاں حدیث میں تاویل کرنا اور ان سے نفس انسانی میں صرف خیر و شر کا رجحان مراد لے لینا قطعاً غلط ہوگا۔ جامع ترمذی میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیطان اور فرشتہ ابن آدم کے قلب میں دونوں باتیں القاء کرتے ہیں القاء شیطانی کی علامت یہ ہے کہ اس میں شر اور حق کی تکذیب کا مضمون ہو اور فرشتہ کی جانب سے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس میں خیر اور حق کی تصدیق کا مضمون ہو لہٰذا جس کے دل میں اس قسم کی بات آئے اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ فرشتہ کی جانب سے ہے اور اگر اس کے خلاف قسم کی بات آئے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے۔ اس کی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ. (تفسیر سورۂ بقرہ) علماء کہتے ہیں کہ لمہ شیطان کا نام وسوسہ اور لمہ ملکی کا نام الہام ہے۔

(۱۱۰۶) * حدیثوں میں بیماریوں کے ظاہری اسباب کے ساتھ کچھ باطنی اسباب بھی مذکور ہو جاتے ہیں مثلاً استحاضہ کے متعلق آپ نے فرمایا تِلْكَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ. یہ شیطان کی ایذا رسانی کا اثر ہے۔ جمائی کے متعلق فرمایا۔ یہ بھی شیطان کا اثر ہوتی ہے طاعون کے متعلق فرمایا کہ یہ جنات کے نیزہ کا نتیجہ ہے وغیرہ۔ اس زمانہ میں چونکہ شیطان اور فرشتہ دونوں کا سرے سے انکار ہی انکار ہو رہا ہے اس لیے اس قسم کی حدیثوں کی صرف تاویل ہی کی طرف ذہن جاتا ہے لیکن اگر ان ہر دو مخلوق کا یقین حاصل ہو پھر انسانوں کے ساتھ ان کی عداوت یا دوستی کا حال بھی معلوم ہو تو اس قسم کے مواضع پر تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے شیطان اور اصل انسانی سے عداوت کا تذکرہ کر کے یہی بتانا چاہا ہے کہ اس پشتہا پشت کی عداوت کو ختم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اب ان دونوں میں قیامت تک کے لیے جنگ رہے گی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی کوئی حالت کھانے پینے' سونے جاگنے' حتیٰ کہ اس کی ازدواجی زندگی بھی اور عبادات کے ہر ہر شعبہ میں بھی کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کی مداخلت نہ ہو ترجمان السنہ ص ۴۱۹ ج ۲ میں عبد اللہ بن مسعود کی بی بی کی آنکھ لله .....

عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا نَتَخَوَّفُ اَنْ یَکُوْنَ بِکَ ذَاتُ الْجَنْبِ قَالَ اِنَّهَا مِنَ الشَّیْطَانِ وَ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُسَلِّطَهُ عَلَیَّ. (رواه ابن اسحاق و ابن سعد و البیهقی کذا فی الخصائص. ص ۲۷۰ و عن ام سلمة و ابن عباس نحوه)

(۱۱) علالت میں کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہمیں اندیشہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں ذات الجنب کی بیماری نہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بیماری شیطانی اثر ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ میرے اوپر مسلط فرمادے۔

(خصائص)

(۱۱۰۷) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا احْتَلَمَ نَبِیٌّ قَطُّ وَ اِنَّمَا الْاِحْتِلَامُ مِنَ الشَّیْطَانِ.

(رواه الطبرانی کما فی الخصائص)

(۱۱۰۷) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو کبھی احتلام نہیں ہوا کیونکہ اس کا منشاء شیطانی خواب ہوتا ہے۔

(طبرانی)

(۱۱۰۸) قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا لَدَدْنَاهُ فِیْ مَرَضِهٖ فَجَعَلَ یُشِیْرُ اِلَیْنَا اَنْ لَّا

(۱۱۰۸) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں دواء

؏ ..... دکھنے کا قصہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں اور آئندہ اپنے باب میں آپ اس کی مزید تفصیلات بھی پڑھیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لہٰذا کسی حقیقت کے علم کے بغیر اس کی نفی میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ذات الجنب کے جو اسباب اطباء اور ڈاکٹروں نے بتائے ہیں ان کا انکار نہیں ہے لیکن وہ اسباب کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں گفتگو اس میں ہے۔ اسباب ظاہری کا جتنا نظم و نسق ہے وہ سب باطنی اسباب کا مسخر ہے اب جو ان کو نہیں جانتا اس کے لیے تسخر کے سواء اور راستہ کیا ہے۔ الناس اعداء ماجھلوا۔ پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ بہت سی بیماریوں کے اسباب میں بلکہ معالجہ میں بھی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے درمیان کتنا بڑا اختلاف ہوتا ہے لیکن علاج کی کامیابی اور ناکامیابی کے نتیجہ میں اوسطاً دونوں برابر رہتے ہیں اب اگر ان کے ساتھ تعویذات کا فن بھی اور شامل کرلیا جائے تو یہاں بہت سی مواقع پر جہاں اطباء عاجز ہوں سوفیدی کامیابی تجربہ میں آچکی ہے۔ پس اگر انکار کی بنیاد صرف علاجی تجربہ ہے تو تعویذات سے شفاء کا تجربہ یہاں بھی ہے۔ بلکہ زہریلے جانور جیسے سانپ وبچھو یا جس کو نظر لگنا کہتے ہیں جتنی مفید اس کے لیے جھاڑ پھونک ہے اتنا مفید اور سریع التاثیر علاج نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ آپ کا ایک اجمالی بیان ہے۔ ذات الجنب کے جملہ اقسام اور ان کے معالجات بیان کرنا آپ کا وظیفہ نہیں۔

(۱۱۰۷) ٭ احتلام کی عام صورت قوت شہوانیہ کا انتعاش ہی ہوا کرتا ہے اسی لیے اس قسم کے اسباب کی قلت و کثرت سے احتلام میں بھی قلت و کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی اوعیہ منی کے پر ہو جانے سے بھی احتلام ہو جاتا ہے۔ جب اوعیہ منی پر ہو جاتا ہے تو طبعی طور پر وہ خارج ہو جاتا ہے۔ بظاہر اس قسم کے احتلام کی صورت یہاں بھی ممکن ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ بہرحال ابن عباسؓ کی اس تعلیل سے آپ کو اس کا تو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوا ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت کو شیاطین سے کتنا بعد ہوتا ہے کہ طبعی عوارض جیسے احتلام و مرض وغیرہ میں بھی شیطان کے اثرات سے کتنے دور ہوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں عام بشر کے حواس معطل ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام اس حالت میں اتنے بیدار رہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی ان کے باطنی احساسات معطل نہیں ہوتے۔

(۱۱۰۸) ٭ ''لدود'' اس دواء کو کہتے ہیں جو مریض کے منہ میں ڈالی جائے جیسا کہ ''سعوط'' وہ دواء ہے جو ناک میں ڈالی جائے ؏ .....

تَـلُدُّوْنِیْ فَقُلْنَا كَرَاهِيَةُ الْـمَرِيْضِ لِلدَّوَاءِ فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ اَلَمْ اَنْهَكُمْ اَنْ تَلُدُّوْنِیْ قُلْنَا كَرَاهِيَةُ الْـمَرِيْـضِ لِـلـدَّوَاءِ فَـقَـالَ لَا يَبْقٰی اَحَدٌ فِی الْبَيْـتِ اِلَّا لُدَّوَ اَنَا اَنْظُرُ اِلَّا الْعَبَّاس رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ فَاِنَّهٗ لَمْ يَشْهَدْكُمْ.

(رواه البخاری و فی لفظ ابن سعد فلما افاق قال كنتم ترون ان الله يسلط علیّ ذات الجنب ما كان الله ليجعل لها علی سلطانا)

لدود استعمال کرانے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے منع فرما دیا- مجھ کو یہ دواء نہ دینا ہم نے اپنے دل میں کہا کہ مریض تو دواء کے استعمال سے گھبرایا ہی کرتا ہے جب آپ کو غفلت سے ذرا ہوش آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- کیا میں نے تم کو لدود کے استعمال سے منع نہیں کیا تھا- ہم نے عذر کیا کہ غلطی سے ہم نے یہ سوچا کہ مریض دواء کا استعمال پسند نہیں کرتے- اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ گھر والوں میں جو جو اس میں شریک ہو سب کو یہ دواء استعمال کرائی جائے بجز عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے-

(بخاری شریف)

لله ..... انبیاء علیہم السلام جو حکم دے دیں وہ سب واجب التعمیل ہوتا ہے خواہ وہ غصہ کی حالت میں ہوں یا رضاء کی، مرض کی حالت میں ہوں یا صحت کی ان کی بے عذر حکم عدولی بھی بلا عذر حکم عدولی کی طرح قابل مؤاخذہ ہوتی ہے- اس میں ذرا سا پس و پیش کرنا بھی غلطی ہے اور اس کی حکمت کے درپے ہونا بھی اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے- مذکورۂ بالا واقعہ میں اہمیت یوں پیدا ہو گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی طویل مدت افہام و تفہیم کے بعد بالخصوص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری لمحاتِ حیات میں اس قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے تھی- عام انسانوں میں بھی آخر وقت کا مرحلہ نازک سمجھا جاتا ہے اور نبی کے معاملہ میں تو نزاکت کا ایک خطرناک پہلو اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ صریح حکم کے بعد اس کی حکم عدولی کبھی کبھی انتقام الٰہی کا سبب بن جاتی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے تقاضہ کیا کہ اس کے انتقام کا تکفل خود فرما لیں تاکہ آئندہ غیرت خداوندی خود اس کا انتقام نہ لے- کوئی شبہ نہیں کہ صریح ممانعت کے بعد ''لدود'' کا استعمال کرنا بڑی فروگزاشت تھی- مگر یہ اسی قسم کی فروگزاشت تھی جیسا کہ ابوالبشر سے ایک بار ہو چکی تھی وہ بھی ممانعت کے باوجود شجرۂ ممنوعہ استعمال کر بیٹھے اور صحابہ نے بھی ''لدود'' کے استعمال میں غلط قدم اٹھایا- شان عفو نے گو ہر دو مقامات میں درگذر کر دیا مگر دونوں جگہ اس کا کچھ نہ کچھ خمیازہ پھر بھگتنا ہی پڑا-

ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات الجنب میں گو عام طور پر ''لدود'' مفید سمجھا جاتا تھا مگر اس کی ایک قسم وہ بھی ہے جو شیطان کی ایذاء سے پیدا ہوتی ہے- اب کسی نبی کے آخری لمحات میں کوئی حرکت ایسی کر بیٹھنا جس سے کسی کو یہ وہم گذرنے کا موقعہ پیدا ہو سکے کہ خدا کا رسول بھی سطوت شیطانی کے زیر اثر آ سکتا ہے- یقیناً ایک بڑی مہلک غلطی تھی اس لیے آپ کی نظر میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی اور اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ جس طرح حالتِ مرض میں بے وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''لدود'' استعمال کرا دیا گیا اسی طرح ان کو بھی بے وجہ ''لدود'' استعمال کرا کے ان کے جرم کو ہلکا کر دیا جائے- سبحان اللہ خدا کے رسول کی عظمت اور اس کے عفو کی دونوں شانیں کیسی نرالی ہوتی ہیں- اب اندازہ فرمالیجیے کہ جن کے متعلق شیطان کے اتنے سے دخل کا تصور بھی جرم ہو ان کے حق میں کیا معصیت کا تصور کرنا صحیح ہو سکتا ہے-

الرسولُ العظیم و عصمته من تمثل الشیطان فی صورتهٖ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شکل بننے سے شیطانوں کا عاجز رہنا

(۱۱۰۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوْا بِاسْمِیْ وَ لَا تَکْتَنُوْا

(۱۱۰۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرا نام شوق سے رکھا کرو

(۱۱۰۹) * سبحان اللہ آپ کا مقام بھی کیا بلند مقام تھا اور آپ کی شکل مبارک بھی کتنی مطہر شکل تھی کہ شیطان میں تمثل بشری کی طاقت کے باوجود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ آپ کی صورت میں متمثل ہو سکے۔ بے شک جو ابدالآباد کے لیے ملعون ہو اس کی کیا مجال کہ وہ ان کی صورت اختیار کر سکے جو کونین کے حق میں مجسم رحمت ہوں۔ نہ خدا کی لعنت اس کی رحمت کی صورت بن سکتی ہے نہ شیطان کی یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی صورت اختیار کر سکے۔ سبحان اللہ جس کی صورت اتنی مبارک ہو اس کی سیرت کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک پر تو کوئی دسترس کیا ہوتی اس کو یہ قدرت بھی نہیں کہ وہ خارجی طور پر اپنی شکل آپ کی شکل بنا سکے۔ پھر جب وہ عالم خواب میں آپ کی شکل بنانے پر قادر نہیں تو یقیناً بیداری میں بھی کسی کے سامنے آپ کی صورت بنانے پر قادر نہ ہوگا۔ لہٰذا جس طرح خواب کی زیارت میں شیطانی رویت کا شبہ نہیں ہو سکتا اسی طرح عالم بیداری کی زیارت میں بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ عام طور پر خواب کی صرف دو قسمیں ہی مذکور ہوتی ہیں۔ بشـری مـن اللـه یعنی خدا کی طرف سے بشارت دوم تـحـزین مـن الشیطـان یعنی شیطان کی طرف سے مؤمن کا جی برا کرنے کی بات۔ لیکن بعض مقامات سے ایک تیسری قسم بھی ثابت ہوتی ہے یعنی تحدیث النفس نفس کے اپنے خیالات۔

اس تقسیم کی بناء پر حدیث مذکور میں خواب کی حالت کی زیارت میں صرف شیطانی مداخلت کی نفی ہوگی مگر تیسری قسم کا احتمال پھر باقی رہے گا کیونکہ وہاں نفی صرف شیطانی تمثل کی فرمائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ نفسی محبت کی وجہ سے خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا خواب کی ہر زیارت پر قطعیت کے ساتھ حقیقی زیارت کا حکم لگایا نہیں جا سکتا۔ اس میں خیالی زیارت کا احتمال ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جب کہ زیارت میں کوئی بات ظاہر شریعت کے مخالف بھی نظر آئے۔

ان جـمـاعة من ائمة الشریعة نصوا علیٰ ان من کرامة الولی انه یری النبی صلی اللّٰه علیه وسلم و یجتمع به فی الیـقـظة و یـاخـذ عـنـه مـا قـسـم لـه مـن معارف و مواهب و ممن نص علیٰ ذلک من ائمة الشافعیة الغزالی و البـارزی، و التـاج ابـن السـبکی، و العفیف الیافعی، و من ائمة المالکیة القرطبی و ابن ابی جمره و ابن الحاج فـی الـمدخل و قد حکی عن بعض الاولیاء انه حضر مجلس فقیه فروی ذلک الفقیه حدیثا فقال له اولی هذا الـحدیث باطل فقال الفقیه و من این لک هذا فقال هذا النبی صلی الله علیه وسلم واقف علیٰ رأسک یقول انـی لـم اقل هـذا الحدیث و کشف للفقیه فراٰه. و قال الشیخ ابو الحسن الشاذلی لو حجبت عن النبی صلی الله علیه وسلم طرفه عین ما عددت نفسی من المسلمین. (الحاوی ص ۱۶۳ ج ۲)

ائمہ شریعت کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی بندہ کرامت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالتِ بیداری بھی کر سکتا ہے اور آپ کی محفل میں حاضر بھی ہو سکتا ہے بلکہ اپنی استعداد کے مناسب کچھ علوم و لطائف .....

بِكُنْيَتِي وَ مَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ مگر میری کنیت نہ رکھا کرو۔ جس شخص نے مجھ کو خواب کی حالت میں دیکھا

لله ..... معارف کا استفادہ بھی کرسکتا ہے اس کی تصریح کرنے والے ائمہ شافعیہ میں غزالی' بارزی' ابن السبکی اور یافعی جیسے حضرات ہیں اور ائمہ مالکیہ میں سے امام قرطبی' حافظ ابن ابی جمرہ' ابن الحاج وغیرہ حضرات ہیں۔ انہوں نے بعض اولیاء کے حالات میں نقل کیا ہے کہ وہ کسی فقیہ کی مجلس میں تشریف لے گئے تو اس فقیہ نے کوئی روایت بیان کی یہ ولی بولے یہ حدیث تو باطل ہے اس فقیہ نے کہا تم نے یہ حکم کیسے لگا دیا اس ولی اللہ نے کہا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرے سامنے کھڑے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث میں نے بیان نہیں کی۔ اس فقیہ کو بھی اس کا انکشاف ہو گیا اور اس نے بھی آپ کو دیکھ لیا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی کا مقولہ تو یہ ہے کہ اگر میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی حجاب پڑ جائے تو میں اپنے آپ کو زمرہ مسلمین میں شمار نہ کروں۔

ثم قال ابن العربی من عنده و رؤية الانبياء و الملائكة و سماع كلامهم ممكن للمؤمن كرامة و للكافر عقوبة اهـ.

اس کے بعد ابن العربی اپنی رائے بیان کرتے ہیں کہ میرے نزدیک انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی زیارت اور ان کے کلام کا سننا بھی ممکن ہے مؤمن اور کافر دونوں کے لیے مگر مؤمن کے لیے کرامت کے طور پر اور کافر کے لیے عقوبت کے طور پر۔

و قال الشيخ عز الدين بن عبدالسلام فی القواعد الكبرىٰ و قال ابن الحاج فی المدخل رؤية النبی صلی الله عليه وسلم فی اليقظة باب ضيق مع اننا لاننكر من يقع له هذا من الاكابر الذين حفظهم الله فی ظواهر هم و بواطنهم قال و قد انكر بعض علماء الظاهر رؤية النبی صلی الله عليه وسلم فی اليقظة. (الحاوی ص ۲۵۸ ج ۲)

شیخ عزالدین بن عبدالسلام قواعد کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ابن الحاج نے ''المدخل'' میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بحالتِ بیداری زیارت کا مسئلہ بہت دقیق ہے با ایں ہمہ جو اکابر اس رتبہ کے ہوں ان کے حق میں ہم اس کے منکر نہیں ہیں لیکن بعض علماء ظاہر نے اس کا انکار کیا ہے۔

و قال القاضی شرف الدين هبة الله بن عبدالرحيم البارزی و قد سمع من جماعة من الاولياء فی زماننا و قبله انهم رؤا النبی صلی الله عليه وسلم فی اليقظة حيا بعد وفاته.

قاضی شرف الدین فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانہ کے اولیاء اور گزشتہ دور کے اولیاء کے متعلق بھی سنا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زیارت کی ہے۔

ثم نقله السيوطی عن الشيخ ابی عبدالله القرشی انه رأى الخليل عليه السلام و عن الشيخ سراج الدين بن الملقن فی طبقات الاولياء قال الشيخ عبدالقادر الكيلانیؒ رأيت رسول الله صلی الله عليه وسلم قبل الظهر الخ و فی ترجمة الشيخ خليفه بن موسىٰ و كان كثير الرؤية لرسول الله صلی الله عليه وسلم يقظةً و منامًا و فی ترجمة الصفی ابی عبدالله محمد بن يحيىٰ الاسوانی كتب عنه ابن دقيق العيد و القطب العسقلانی و كان يذكر انه يری النبی صلی الله عليه وسلم و كان الشيخ عبدالغفار يری رسول الله صلی الله عليه وسلم فی كل ساعة و كان للشيخ ابی العباس المرسی و صلة بالنبی صلی الله عليه وسلم اذا سلم علی النبی صلی الله عليه وسلم ويجاوبه اذا لله .....

الشَّيطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ وَ مَنْ كَذَبَ بلا شبہ اس نے مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا اور جس

ﷺ ..... تحدث معه. و ذكر عنه (كما في لطائف المنن) لوحجب عني رسول الله صلى الله عليه وسلم طرفة عين ماعدوت نفسي من المسلمين. ثم ذكر السيوطي روية النبي صلى الله عليه وسلم يقظة عن عدة من اولياء منهم الشيخ عبدالله الدلاصي و الشيخ ابو العباس الحرار و السيد احمد الرفاعي و السيد نور الدين الايجي و ابي نصر الكرخي و يوسف بن علي الزماني و محمد بن سمعون و ابن ثابت و ذكر قصصهم. (الحاوی ص ۲٦۱ و ۲٦۲ ج ۲)

پھر علامہ سیوطیؒ نے ان حضرات کی ایک فہرست پیش کی ہے جن کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابو عبداللہ قرشیؒ، سراج الدین بن الملقنؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ خلیفہ بن موسیٰؒ، الشیخ محمد بن یحییٰ، الشیخ عبدالغفار یہ صاحب ہمہ وقت آپ کی زیارت سے مشرف رہا کرتے تھے۔ شیخ ابوالعباس یہ صاحب وہی ہیں جن کا مقولہ آپ نے پڑھا کہ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف زیارت سے ایک لمحہ کے لیے بھی محروم رہوں تو میں زمرہ مسلمین میں اپنا شمار نہ کروں۔ الشیخ عبداللہ الدلاصی۔ الشیخ ابوالعباس الحرار۔ سید احمد رفاعی۔ سید نورالدین۔ ابونصر کرخی۔ یوسف بن علی۔ محمد بن سمعون۔ ابن ثابت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ۔

شیخ عبدالوہاب الشعرانیؒ نے علامہ سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ خود علامہ موصوف کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔

قال الشيخ جلال الدين السيوطيؒ رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في اليقظة بضعا و سبعين مرة و قلت له في مرة منها هل انا من اهل انامن اهل الجنة يا رسول الله فقال نعم فقلت من غير عذاب يسبق فقال لك ذلك. قال الشيخ عطيه و سالت الشيخ جلال الدين مرة ان يجتمع بالسلطان الغوري في ضرورة وقعت لي فقال لي يا عطية انا اجتمع بالنبي صلى الله عليه وسلم يقظة و اخشى ان اجتمعت بالغوري ان يحتجب صلى الله عليه وسلم عني. ثم قال ان فلانا من الصحابة كانت الملائكة تسلم عليه فاكتوى في جسده لضرورة فلم ير الملائكة بعد ذلك عقوبة له على اكتوائه. اهـ (اليواقيت و الجواهر ص ۱۳۳ ج ۱)

شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ حافظ سیوطیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری ستر مرتبہ سے بھی زیادہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا میں جنتی ہوں؟ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا کیا عذاب کے بغیر؟ فرمایا جاؤ تمہارے لیے یہ بھی سہی۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں میں نے شیخ سیوطیؒ سے ایک مرتبہ یہ درخواست کی کہ میری ایک ضرورت کے متعلق آپ سلطان غور کے پاس جا کر سفارش فرما دیں تو انہوں نے جواب دیا۔ عطیہ! میں بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں حاضر ہوتا ہوں مجھے خطرہ ہے اگر میں سلطان غوری کی محفل میں جاؤں تو کہیں اس سعادت سے محروم نہ ہو جاؤں۔ اس کے بعد فرمایا۔ بعض صحابہ کو ملائکہ سلام کیا کرتے تھے انہوں نے ایک مرض کی وجہ سے اپنے جسم پر لوہے کا داغ دے کر علاج کیا تو وہ اس سعادت سے محروم ہو گئے۔

ثم قال الشعرانيؒ ان ماذ كرناه عن الشيخ جلال الدينؒ ذكره الاشياخ الثلاثة العدول الدين لايتهمون في مثل ذلك يعني الشيخ الصالح عطيه و الشيخ الصالح قاسم المغربي و القاضي زكريا الشافعي. ﷺ .....

عَلَی مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ۔ نے جان کر مجھ پر جھوٹ باندھا اس کو چاہیے کہ اپنی جگہ دوزخ میں تیار کر
(رواہ البخاری فی کتاب العلم) لے۔ (بخاری شریف)

لله ..... شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ شیخ سیوطیؒ سے اس واقعہ کو نقل کرنے والے تین بڑے بڑے مشائخ ہیں جن کی نسبت غلط بیانی کا تصور نہیں کیا جا سکتا بالخصوص ایسے نازک معاملہ میں (ہوسکتا ہے کہ شیخ سیوطیؒ نے جب اس قسم کے اشخاص کی فہرست شمار کرائی ہو تو اولیاء کے دستور کے موافق اپنے نام کے اظہار سے قصداً سکوت فرمالیا ہو)

قال السیوطیؒ فی ختاواہ ان اکثر ماقعع رؤیة النبی صلی الله علیه وسلم فی الیقظة بالقلب ثم یترقی الی ان یری البصر .لکن لیست الرؤیة البصریة کا لرؤیة المتعارفة عند الناس من رؤیة بعضهم لبعض و انما هی جمعیة حالیة و حالة برزخیة و امر و جدانی لایدرک حقیقة الامن باشره و قد تقدم عن الشیخ عبدالله الدلاصی فلما احرم الامام و احرمت اخذتنی اخذة فرأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فاشار بقوله اخذة الی هذه الحالة. (الحاوی ص ۲۶۲-۲۶۳ ج ۲)

اس زیارت کی حقیقت ٹھیک وہ نہیں سمجھنی چاہیے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے بلکہ اس زیارت کا ادراک پہلے قلب سے شروع ہوتا ہے پھر وہ حاسہ بصر تک بھی سرایت کر جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک برزخی کیفیت ہوتی ہے اور ایک نوع کا وجدان ہوتا ہے جس کا صحیح اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو یہ کیفیت حاصل ہو۔

قال الشیخ اکمل الدین البابرتی الخفی فی شرح المشارق فی حدیث "من رانی" الاجتماع بالشخصین یقظة و مناما لحصول مابه الاتحاد و له خمسة اصول کلیة الاشتراک فی الذات اوفی صفة فصاعداً اوفی الافعال اوفی المراتب و کل ما یتعقل من المناسبة بین شیئین او اشیاء لا یخرج عن هذه الخمسة و حسب قوته علی مابه الاختلاف و ضعفه یکثر الاجتماع و بقل و قد یقوی علی ضده فتقوی المحبة بحیث یکاد الشخصان لایفترقان واقد یکون بالعکس ومن حصل الاصول الخمسة و ثبتت المناسبة بینه و بین ارواح الکمل الماضیین اجتمع بهم متی شاء. اھ (الحاوی ص ۲۵۸ ج ۲)

شیخ اکمل الدین تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی زیارت کا مدار انسان کی اندرونی مناسبت ہوتی ہے۔ جس شخص میں یہ مناسبت جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی کے مناسب اس کو یہ زیارت بھی میسر آتی ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں کو گزشتہ بزرگوں کی ارواح کے ساتھ اتنی مناسبت ہوتی ہے کہ وہ جب ارادہ کرتے ہیں ان سے روحانی ملاقات کر لیتے ہیں۔ (الحاوی ص ۲۶۳ و ۲۵۸ و ۲۶۱ و ۲۶۲ و ۲۶۲ و ۳۲۳ ج ۲)

حافظ ابن تیمیہؒ نے بیداری میں رؤیۃ کا اپنی حسب عادت بڑی شد و مد کے ساتھ انکار فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

و کثیر منهم رأی من ظن انه نبی او صالح او الخضر و کان شیطانًا و قد ثبت فی الصحیح من رآنی فی المنام فقد رآنی حقًا فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی. فهذا فی رویة المنام تکون حقًا و تکون من الشیطان فمنعه الله ان یتمثل به فی المنام و اما فی الیقظة فلا یراها احدٌ بعینه فی الدنیا فمن ظن ان المرئی هو المیت فانما أتی من جهله. (التوسل و الوسیله ص ۲۵)

ایسا بہت ہوا ہے کہ بیداری کی حالت میں دیکھنے والے شخص کو یہ گمان ہوا ہے کہ جس کو اس نے دیکھا تھا وہ نبی یا کوئی لله .....

الرسول العظیم و خوف الشیاطین من بعض اصحابه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کا شیطانوں پر خوف اور ڈر

(۱۱۱۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا وَ صَوْتَ صِبْيَانٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا حَبَشِيَّةٌ تَزْفِنُ وَ الصِّبْيَانُ

(۱۱۱۰) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ دفعتہً ہم نے کچھ شور اور بچوں کے غل مچانے کی آواز سنی آپ آواز سن کر اُٹھے کیا دیکھتے ہیں ایک حبشی عورت ہے جو اچھل کود رہی ہے اور بچے ہیں کہ اس کے اردگرد جمع ہیں۔ آپؐ نے فرمایا عائشہ! آؤ تم بھی

بقیہ ..... بزرگ یا حضرت خضر علیہ السلام تھے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ شیطان ہوتا تھا۔ بے شک یہ صحیح حدیث ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے ٹھیک مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ خواب میں کسی کی رؤیۃ دونوں صورتیں ممکن تھیں یہ بھی کہ وہ اسی انسان کی ہو اور یہ بھی کہ شیطان نے اس کی صورت اختیار کر لی ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کے متعلق شیطان سے یہ قدرت سلب فرمالی ہے کہ وہ کسی کو خواب میں آپ کی صورت میں نظر آسکے مگر یہ بات صرف خواب ہی کے معاملہ تک محدود ہے۔ اب رہا بیداری کا معاملہ تو جس شخص کو بھی یہ گمان ہو کہ اس نے مثلاً فلاں مردہ شخص کو دیکھا ہے تو یہ صرف اس کا جہل ہے۔

(۱۱۱۰) * ایک سیاہ فام حبشی عورت کا اس وقت عرب کے عام دستور کے مطابق اتفاقاً آنکلنا اور بچوں کا اس کے اردگرد جمع ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلق کریم کہ ایک نوعمر بی بی کی خاطر جن کی فطرت کو بچپن کی دلچسپیوں سے بھی پوری طرح آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی خود بلا کر پورا کرنا کتنی غیر معمولی بات تھی پھر اس نوعمری میں فیض نبوت سے منور بی بی کی اولوالعزمی بھی کتنی قابل داد تھی کہ اس احول میں ان کو ادھر ذرا التفات نہ تھا ساری فکر تھی تو یہ کہ سردارِ دو جہاں کے دل میں ان کے لئے جگہ کتنی ہے۔

یہاں جو بات زیادہ تر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اقدس سے وابستہ ہو جانے کے بعد عمرؓ کی فطرت میں کمالات نبوت کا کیسا انعکاس ہوا تھا کہ ان کے سایہ سے بھی شیطان ترساں ولرزاں رہنے لگے تھے۔ یہ وہی عمرؓ ہیں جن سے کبھی شیاطین کھیلا کرتے تھے اور آپ کے زیر سایہ آجانے کے بعد یہ وہ ہیں جن سے شیطان اس طرح دبکتے پھرتے ہیں کہ جس راستہ سے عمرؓ نکل جائیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیتے تھے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ مباحات کا آخری درجہ محرمات کی ابتدائی سرحد کے پاس لگا ہوا ہوتا ہے اس لئے ایک حدیث میں تشبیہ دے کر اس کی تفہیم یوں کی گئی ہے کہ محرمات سے بچنے کا راستہ صرف یہ ہے کہ اس کے خطرہ سے کچھ ایسے مباحات بھی جو محرمات کی سرحد سے لگتے ہوں ترک کر دیئے جائیں۔ جیسا ایک چرواہے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو خاص شاہی چراگاہوں سے دور دور چرائے ورنہ ایک دن اس کے جانور یقیناً شاہی جنگل میں بھی منہ ڈال کر رہیں گے۔ اسی طرح ایک حبشیہ عورت کا جو غالباً مسلمان نہ تھی آنکلنا اور ایسی حرکات کرنا جو اگر ذرا بڑھ جائیں تو حرام کی زد میں بھی آسکتی تھیں۔ ان مباحات میں داخل تھا جو حرام کی سرحد سے بالکل متصل ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کے لئے بھی سب سے زیادہ دلچسپی کا محل ہوتا ہے ان کی سعی ہوتی ہے کہ کسی طرح ضعیف انسان کا قدم یہاں ذرا لغزش کھا جائے تو اس حرام میں گھسیٹ لیں۔ یہ منظر عوام کی نظروں میں تو ضرور دلچسپی کا منظر ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی بقیہ .....

حَوْلَهَا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ تَعَالِى فَانْظُرِىْ فَجِئْتُ فَوَضَعْتُ لَحْيِىْ عَلٰى مَنْكِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلَيْهَا مَا بَيْنَ الْمَنْكِبِ اِلٰى رَأْسِهٖ فَقَالَ لِىْ اَمَا شَبِعْتِ اَمَا شَبِعْتِ فَجَعَلْتُ اَقُوْلُ لَا لِاَنْظُرَ مَنْزِلَتِىْ عِنْدَهٗ اِذْ طَلَعَ عُمَرُ فَارْفَضَّ النَّاسُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ لَاَنْظُرُ اِلٰى شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ قَدْ فَرُّوْا مِنْ عُمَرَ قَالَ فَرَجَعْتُ. (رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن غريب صحيح)

دیکھ لو- میں گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے اور سر مبارک کے درمیان اپنا چہرہ رکھ کر اس کو دیکھنے لگی- (کچھ دیر کے بعد) آپؐ نے فرمایا- ابھی تمہارا دل نہیں بھرا' ابھی تمہارا دل نہیں بھرا؟ میں ہر بار کہہ دیتی- ابھی نہیں- میرا مقصد یہ تھا کہ آپ کے قلب میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ لگاؤں (کہ میری خاطر کب تک تکلیف گوارا فرماتے ہیں) اتنے میں حضرت عمرؓ آ نکلے- ان کا آنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں تھے سب اس کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے- اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خوف سے شیطانی فطرت کے انسان اور جنات سب بھاگ گئے اس کے بعد میں وہاں سے لوٹ کر اپنے کمرہ میں آ گئی- (ترمذی شریف)

(۱۱۱۱) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَتْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱۱۱۱) بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

لله ..... نظروں میں انسان کے لئے ابتلاء و آزمائش کا نازک مقام ہوتا ہے' ان کی شان دوسری ہوتی ہے اگر وہ یہاں ممانعت کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں تو اسی وقت وہ مباح اپنے درجہ سے نکل کر حرام کی فہرست میں داخل ہوتا ہے مگر یہاں یہ منظور نہیں ہوتا- جو رسول ہر قسم کی طبیعت اور جمیع نوعِ بشری کے لئے رسول تنبیہ و ترہیب کے ذریعہ ان کو اس کے ارتکاب سے روک بھی دیا جائے- چنانچہ طلاق ایک ایسی چیز ہے جس کی ضرورت کسی ناگزیر موقعہ پر یقینی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی اجازت دیئے بغیر بھی چارہ تھا- مگر یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار بھی کر دیا جائے اس لئے یوں ارشاد فرمایا گیا ''ابغض المباحات عند الله الطلاق'' مباحات کی فہرست میں جو بات نظر ربوبیت میں سے زیادہ ناپسندیدہ ہے وہ طلاق ہے- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے یا طلاق کوئی منصفانہ آئین نہیں وہ ذرا آنکھ کھول کر ان باتوں کو بھی سامنے رکھیں- پس ایک حبشیہ عورت کو روکنا تو مناسب تھا مگر یہ ممانعت بذریعہ عمرؓ ہی مناسب تھی- آخر عمرؓ میں یہ جذبات کہاں سے پیدا ہوئے اور اس فعل کے مذموم ہونے کی خبر بچوں تک کو کس نے دی جو عمرؓ کو دیکھتے ہی بھاگ پڑتے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فیض نبوت ہی تھا' مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کہیں براہ راست اس کی ممانعت فرما دیتے تو پھر یہ ممانعت صرف ایک مصلحت نہ رہتی بلکہ مسئلہ بن جاتا اور مباحات کی فہرست سے نکل کر محرمات میں داخل ہو جاتا- آئندہ عنقریب ایک دوسرا واقعہ آپ کے سامنے آئے والا ہے- جس میں عید کے دن کچھ لڑکیوں نے جنگی اشعار وہ بھی اپنے گھر کے اندر پڑھے تھے تو صدیق اکبرؓ نے اس کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کو جھڑک کر منع بھی فرمایا- مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ وہ اس موقع پر خاموش تھے- تفصیل تشریحی نوٹ میں آ رہی ہے اس جگہ ترجمان السنۃ ص ۳۳۸ ج ا بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں شانِ عمرؓ کا یہ کرشمہ مذکور ہے کہ جس راستہ کو وہ چلتے ہیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیتے ہیں-

(۱۱۱۱) * قدیم زمانہ میں مسرت اور خوشی کے موقعہ پر دف بجانے کا بڑا اہتمام تھا- دف لکڑی کا بنا ہوا ایک گول دائرہ ہوتا ہے لله .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِيَةٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ بِالدُّفِ وَ اَتَغَنّٰى فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِيْ وَ اِلَّا فَلَا فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَ هِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَ هِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَاَلْقَتِ الدُّفَ تَحْتَ اِسْتِهَا ثُمَّ قَعَدَتْ عَلَيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخَافُ مِنْكَ يَا عُمَرُ اِنِّيْ كُنْتُ جَالِسًا وَ هِيَ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَ هِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَ هِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَ هِيَ تَضْرِبُ فَلَمَّا دَخَلْتَ اَنْتَ يَا عُمَرُ اَلْقَتِ الدُّفَ.

(رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح غريب. وراجع ترجمان السنة ص ٣٧٤ ج ١)

وسلم کسی غزوہ کے لیے باہر تشریف لے گئے تھے۔ جب صحیح وسلامت واپس تشریف لے آئے تو ایک سیاہ فام باندی حاضر ہوئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے یہ منت مان رکھی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح وسالم واپس لے آیا تو میں اس کی خوشی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دف بجاؤں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔ اگر تو نے یہ منت مانی تھی تو خیر اس کو پورا کر لے ورنہ نہیں۔ اس پر وہ دف بجانے لگی اتنے میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے وہ دف بجاتی رہی پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے وہ اسی طرح دف بجاتی رہی۔ پھر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو بھی وہ اسی طرح دف بجاتی رہی اس کے بعد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو فوراً دف نیچے ڈال اس پر بیٹھ گئی یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے۔ میں بیٹھا ہوا تھا تو بھی یہ لونڈی دف بجاتی رہی جب ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے تو بھی یہ بجاتی رہی پھر علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے تو بھی بجاتی رہی پھر عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے تو بھی یہ بجاتی رہی پھر جب اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم آئے تو (تم کو دیکھ کر) اس نے دف ڈال دیا۔

(ترمذی شریف)

لـ ..... جس کے صرف ایک طرف چمڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ آواز تو ضرور ہوتی ہے مگر بالکل بے کیف۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

ان مريم اخت موسیٰ و هارون ضربت بالدف يوم نجا الله موسیٰ عليه السلام و قومه و اغرق و ملاه.

(البداية و النهاية ص ٦٧ ج ٢)

حضرت مریم نے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی ہمشیرہ تھیں اس دن خوشی میں دف بجایا تھا جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تھا۔

غالباً اسی سنت کے مطابق اس جاریہ نے بھی آپ کی بعافیت واپسی پر خوشی منائی ہوگی۔ چونکہ آپ کی بحافظت واپسی کی خوشی منانا ایک شرعی خوشی تھی اس لئے اس کی نذر ماننی بھی درست تھی۔ آپ نے اس کی اجازت دے تو دی مگر بادل ناخواستہ اور صاف واضح کر دیا کہ اگر یہ نذر نہ کی گئی ہوتی تو پھر اس کی بھی اجازت نہ دی جاتی۔ اب رہے ڈھول اور دیگر مزامیر تو شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں

الرسولُ العظيم و يأسُ الشيطان من عبادة الاصنام فی جريرة العرب

(۱۱۱۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْاَيِسَ مِنْ اَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ فِيْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَ لٰكِنْ فِي التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ. (رواہ مسلم و صاحب المشکوۃ فی باب الوسوسة)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص محل بعثت میں شیطان کی مایوسی

(۱۱۱۲) جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے شیطان اس بات سے تو بالکل مایوس ہو چکا ہے کہ نمازی لوگ کبھی آئندہ جزیرۃ العرب میں اس کی عبادت کریں گے۔ اس لیے اب وہ صرف ایک دوسرے کوابھارنے پر ہی راضی ہوگیا ہے۔

(مسلم)

الرسولُ العظيم ولطافة فطرته السليمة

(۱۱۱۳) عَنْ شَبِيْبِ بْنِ اَبِيْ رَوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّوْمَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلّٰى قَالَ مَا بَالَ اَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ وَ اِنَّمَا يُلَبِّسُ عَلَيْنَا الْقُرْاٰنَ اُولٰئِكَ. (رواہ النسائی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیمہ کی پاکیزگی

(۱۱۱۳) شبیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ سے ناقل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ روم پڑھی آپؐ اُس میں کہیں اٹکے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ لوگوں کا بھی کیا حال ہے کہ نماز تو ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں اور پھر وضوء ٹھیک طور سے کرتے نہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ہمارے قرآن پڑھنے میں رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔

(نسائی شریف)

(۱۱۱۲) * حدیثوں میں مستقبل کے متعلق جو خبریں دی جاتی ہیں ان میں جو جو قیدیں مذکور ہوں وہ نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں یہاں حدیث میں سب سے پہلے تو جزیرۂ عرب کی تخصیص ہے کیونکہ یہی جزیرہ آپ کی بعثت کا سب سے پہلا مقام تھا پھر اس میں بھی جس طبقہ کے متعلق خبر دی گئی ہے وہ نمازی لوگوں کا طبقہ ہے۔ پھر جس بات سے مایوسی کی خبر دی گئی ہے وہ نمازی طبقہ کی بت پرستی کرنا ہے۔ اور یہ خبر بھی ان الفاظ سے نہیں دی گئی کہ ان میں کوئی بت پرستی نہیں کرے گا بلکہ صرف شیطان کی اپنی مایوسی کا ذکر ہے۔ اس بناء پر اب حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رفیع تو بہت بلند ہے۔ آپ کی عصمت کا اثر آپ کے خاص مقام بعثت پر بھی اتنا گہرا پڑ چکا تھا کہ شیطان بھی وہاں کے خاص بندوں پر اپنی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو چکا تھا۔ الحمد للہ العزیز کہ آپ کی پیش گوئی حرف بحرف آج تک آفتاب درخشاں کی طرح روشن ہے عرب کے ناخواندہ لوگ جو پشتہا پشت سے بت پرستی کے عادی تھے اسلام کے بعد آج تک بت پرستی سے اتنے متنفر ہیں کہ دوسرے مقامات کے خواندہ بھی اتنے متنفر نہ ہوں گے۔ ان کے تعلیم یافتہ پھر نمازیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

(۱۱۱۳) * حدیث مذکور میں جس امر کی شکایت کی جارہی ہے وہ بے وضوء نماز اداء کرنے کی نہیں بلکہ ناتمام وضوء کرنے کی شکایت ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کا تقدس تو دیکھئے کہ دوسروں کا قصور بھی آپ پر کس درجہ بارِ عظیم بن رہا ہے۔ حتیٰ کہ آپ کی قرأتِ قرآن میں بھی خلل کا باعث بن گیا ہے۔ پس جب دوسروں کا قصور آپ کی فطرت کے لیے اتنا بار ہو تو سوچئے کہ کیا براہ راست قصور کی یہاں کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ معصیت کا تو ذکر کیا ہے۔

(۱۱۱۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلَى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَ اْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلٰوتِيْ.

(متفق علیہ و فی روایۃ للبخاری قال کنت انظر الی علمھا و انا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی)

(۱۱۱۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نقشین کمبلی میں نماز اداء کی- نماز کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ذرا اس کے پھولوں پر جا پڑی- جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اس کمبلی کو تو ابوجہم (ایک صحابی کی کنیت ہے) کو جا کر دے دو اور ان کی وہی موٹی کمبلی مجھے لا دو- اس نے تو مجھے ابھی میری نماز سے بھی غافل کر دیا ہوتا- دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں- میں نے اس کے پھولوں کو دیکھا تو قریب تھا کہ میری نماز کی حضوری میں فرق پڑ جاتا-

(بخاری شریف)

(۱۱۱۵) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اُهْدِيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُّوْجُ حَرِيْرٍ فَلَبِسَهٗ ثُمَّ صَلّٰى فِيْهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعًا شَدِيْدًا كَالْكَارِهِ لَهٗ ثُمَّ قَالَ لَا يَنْبَغِيْ هٰذَا لِلْمُتَّقِيْنَ. (متفق علیہ)

(۱۱۱۵) عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ریشمین عباء ہدیۃً پیش کیا گیا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہنا اور اس کو پہنے ہوئے نماز اداء فرمائی- جب نماز سے فارغ ہو گئے تو بڑی نفرت کے انداز میں اس کو اتار پھینکا اور فرمایا- یہ لباس متقیوں کے شایانِ شان نہیں- (متفق علیہ)

(۱۱۱۴) * پھول دار کمبلی ناجائز لباس نہیں پھر معمولی سے پھول کی حیثیت ہی کیا تھی مگر اللہ رے نبی کی فطرت جہاں حضوری میں کسی ادنیٰ سی چیز کے حائل ہونے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ بھی اس کو برداشت نہیں- سوچو کہ ایسی بلند فطرت سے کیا کسی ادنیٰ سی معصیت کا صدور ممکن ہے- علماء کو یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ جب یہ چادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ناموزوں سمجھ کر اتار دی تو پھر اس کو ابوجہم کے لیے کیسے پسند فرمایا جو جواب ان حضرات نے دیئے ہیں وہ تو اپنی جگہ دیکھ لیے جائیں- ہمارے نزدیک تو نبی کی شان وہ ہے کہ جس کو وہ غفلت کے اندیشہ سے تعبیر کرتا ہے اگر وہ دوسروں کو میسر آ جائے تو ان کی ہزاروں حضوریوں سے بھی بلند تر ہو گی- پس ابوجہم اس کو پہن کر شوق سے نماز پڑھیں- بلکہ اس سے بھی بیش قیمت چادر پہن لیں کوئی مضائقہ نہیں ہے- ان کے مرتبہ کی حضوری پھر قائم رہ سکتی ہے- مگر نبی کی حضوری کا اندازہ کسی کو ہو سکتا ہے جس کو معمولی ایک پھول سے بھی اپنی حضوری میں خلل کا خطرہ ہو جاتا ہے- سچ ہے ۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

یاد رکھیے حدیث میں اندیشہ کا لفظ تصریح کے ساتھ موجود ہے- یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی اثر پیدا بھی کر دیا تھا- اگر انبیاء علیہم السلام کسی ادنیٰ لغزش کے خطرہ سے بھی اتنے خائف نہ رہیں تو ان کی عصمت کا ثبوت ہمارے سامنے اس درجہ بدیہی کیسے ہو- یہی خوف و خشیت ان کی عصمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے-

(۱۱۱۵) * ریشم کا استعمال اس وقت تک درست تھا- لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم فطرت پر جو لباس حرام ہونے والا تھا وہ اس سے پہلے ہی بار بن رہا تھا-

الرسولُ العظیم و خشیته من ربه عزوجل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر الٰہی سطوت و جبروت کا استیلاء

(۱۱۱۶) عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ الشِّخِّيرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ يُصَلِّيْ وَ لِجَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ يَعْنِيْ يَبْكِيْ وَ فِيْ رِوَايَةٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ وَ فِيْ صَدْرِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الرَّحٰى مِنَ الْبُكَاءِ. (رواه احمد و روى النسائى الاولى و ابوداود الثانيه)

(۱۱۱۶) مطرف بن شخیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا- اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ مبارک سے گریہ وزاری کی آواز اس طرح گونج رہی تھی جیسا ہانڈی کے جوش مارنے کی آواز- دوسری روایت میں ہے کہ میں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور رونے کی وجہ سے آپ کے سینہ مبارک میں چکی کی سی آواز آ رہی تھی-

(احمد-نسائی)

(۱۱۱۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدُ وَ الْوَاقِعَةُ وَ الْمُرْسَلَاتِ وَ عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ وَ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ. (رواه الترمذى)

(۱۱۱۷) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بوڑھے ہو گئے فرمایا مجھ کو سورۂ ہود، سورۃ الواقعہ، سورۃ المرسلات، عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ہولناک مناظر نے بوڑھا کر دیا ہے-

(ترمذی شریف)

(۱۱۱۶) * جن قلوب پر خوفِ الٰہی کا عالم یہ ہو کیسے ممکن ہے کہ ان سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا صدور بھی ہو جائے-

(۱۱۱۷) * انبیاء علیہم السلام کے علوم چونکہ کسب و اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے اس لیے وہ صرف دماغی خیالات یا ذاتی تحقیقات کی طرح نہیں ہوتے بلکہ نفسیات اور طبعیات کی طرح ہوتے ہیں- ان میں یقین واذعان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جو مشاہدہ میں ہوا کرتی ہے اس لیے ان پر اس کے اثرات بھی وہی ہوتے ہیں جو مشاہدہ کے ہو سکتے ہیں- ہم اگر قیامت کا یقین رکھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اتنا جتنا کہ مثلاً کلکتہ شہر کا مگر ظاہر ہے کہ جس نے کلکتہ کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہو اس کی نظروں میں اس شان و شوکت اور وسعت کا جو نقشہ ہو گا وہ ہماری نظروں میں صرف سن کر قائم نہیں ہو سکتا- ان کے جزم و یقین کا اندازہ بس اسی سے فرما لیجئے کہ ان کی شریعت میں امتیوں کے حصہ میں بھی ''احسان'' کا ایک مستقل باب آ گیا ہے- آپ پہلی جلد کے آخر میں پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے جواب میں ایمان و اسلام کی تشریح فرما کر آخر میں احسان کی جو تشریح فرمائی وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اس کیفیت سے کرنے لگنا جیسا آنکھوں سے دیکھ کر رہتی ہے- اس کے بعد جلد ثانی میں اسی باب کی متعدد حدیثیں آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں جن میں اس مشاہدہ کی کیفیت خود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زبانوں سے منقول ہے-

(دیکھو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۰ حدیث ۲۶۷ و ج ۲ ص ۴۳ و ج ا ص ۴۹۹ معہ تشریحی نوٹ و ج ا ص ۳۹ و ج ۲ ص ۴۶ وغیرہ)

الرسول العظیم و قوته فی الدین و صفاء الیقین

(۱۱۱۸) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَیْفَ اَنْعَمُ وَ صَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَهٗ وَ اَصْغٰی سَمِعَهٗ وَ حَنٰی جَبْهَتَهٗ مَتٰی یُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ مَا تَأْمُرُنَا قَالَ قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ.
(رواه الترمذی)

(۱۱۱۹) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یُهْرِیْقُ الْمَاءَ فَیَتَیَمَّمُ بِالتُّرَابِ فَاَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمَاءَ مِنْکَ قَرِیْبٌ یَقُوْلُ مَا یُدْرِیْنِیْ لَعَلِّیْ لَا اَبْلُغُهٗ. (رواه فی شرح السنة و ابن الجوزی فی کتاب الوفاء)

(۱۱۲۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ مَرَّبِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَ اُمِّیْ نُطَیِّنُ شَیْئًا فَقَالَ مَا هٰذَا یَا عَبْدَاللّٰهِ قُلْتُ شَیْءٌ نُصْلِحُهٗ قَالَ اَلْاَمْرُ اَسْرَعُ مِنْ ذٰلِکَ.
(رواه احمد و الترمذی و قال هذا حدیث غریب)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم آخرت کا استحضار اور اس کا یقین

(۱۱۱۸) ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دنیوی لذتوں سے بھلا کیونکر لطف اندوز ہوں جب کہ دیکھ رہا ہوں کہ صور پھونکنے والے فرشتے نے (نفخ صور کی تیاری میں) صور اپنے منہ میں لے لیا ہے' اپنی پیشانی جھکا لی ہے اور کان لگا رکھے ہیں کب ان کو نفخ صور کا حکم ملتا ہے لوگوں نے عرض کی فرمایئے اس حالت میں ہمیں کیا حکم ہے۔ ارشاد ہوا بس حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ پڑھتے رہو۔ خدا تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۱۱۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہوتے اور مٹی سے تیمم فرما لیتے۔ میں کہتا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں قریب ہی موجود ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کیا خبر ہے شاید میں پانی تک پہنچ نہ سکوں (اور اس سے قبل ہی موت آ جائے) (شرح السنۃ)

(۱۱۲۰) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے گھر سے گذر ہوا اس وقت میں اور میری والدہ گھر کی لیپ پوت اور مرمت کرنے میں مشغول تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبداللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کی کچھ مرمت کر رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہیں حکم ربی اس سے پہلے تیزی کے ساتھ نہ آ جائے۔ (احمد۔ترمذی)

(۱۱۲۰) * یہ تینوں حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عالم آخرت کا استحضار اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی انسان کے سامنے یہ نقشہ ہمہ وقت متحضر رہے تو کیا اس کی توجہ معصیت کی طرف ہو سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان اپنی مقدس فطرت اپنی قلبی کیفیات' ملائکۃ اللہ کی ہمہ وقت مصاحبت' اور سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کے ساتھ شرف مکالمہ اور تجلیات ربانیہ کی وجہ اس قسم کے تمام نقائص سے برتر و بالا ہوتی ہے جن کے لیے غفلت و کدورت کا ہونا لازم ہے جہاں غافل آ کر ہوشیار ہو جائیں وہاں بھلا اس قسم کے تصورات کیا ممکن۔

الرسولُ العظيم و كون الدنيا أهون عنده من جناح بعوضة

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نظر میں متاعِ دنیا کی حقیقت

(۱۱۲۱) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ قَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ فَقَالُوْا مَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَيْءٍ قَالَ فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ. (رواه مسلم)

(۱۱۲۱) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے بچہ کے پاس سے گذرے جس کے ناک و کان بھی کٹے ہوئے تھے آپ ؐ نے فرمایا تم میں ہے کوئی جو اس کو ایک درہم میں لینا قبول کرے؟ لوگوں نے کہا ہمیں تو یہ مفت لینا بھی پسند نہیں- اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا جتنا یہ مردار بچہ تم کو ذلیل نظر آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے ساری دنیا اس سے زیادہ ذلیل ہے- (مسلم شریف)

(۱۱۲۲) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً. (رواه احمد والترمذى و ابن ماجة)

(۱۱۲۲) سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ اس کا ایک گھونٹ بھی نہ چکھاتا- (ترمذی وغیرہ)

(۱۱۲۳) عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ

(۱۱۲۳) مستورد بن شداد بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے بخدا دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں اتنی

(۱۱۲۱) * ہمارے دور کے مفکرین کی مرعوبیت کا عالم بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ بے چارے ہر اس بات کے اظہار کرنے سے خائف رہتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے ذرا بھی مذاق کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی سچی سے سچی بات ہو بے شک متاعِ دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں انتہاء درجہ ذلیل تھی اور دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جب انسان خود اسی دنیا میں موجود ہے تو وہ اس دنیا سے بالکل مستغنی ہے- نہیں نہیں وہ اس کے طلب کا مامور ہے مگر حرام ذرائع سے نہیں حلال ذرائع سے دارِ آخرت پر ترجیح دے کر نہیں بلکہ متاع کا سدّ سمجھ کر- اس سبق کا حاصل دنیوی ترقیات سے روکنا نہیں بلکہ ایک لازوال ملک سے غفلت کو روکنا ہے-

(۱۱۲۲) * کافروں پر دنیا کی وسعت دیکھ کر آپ تو خدا تعالیٰ کی نظر میں ان کے قرب کا وسوسہ لاتے ہیں- اور حدیث یہ کہتی ہے کہ اس وسعت کا سبب کافر کی قدر و منزلت نہیں بلکہ خود متاعِ دنیا کی بے قدری و ذلت ہے-

انسان کمزور ہے اور بیک وقت وہ دو کی محبت نباہ نہیں سکتا- تجربہ کر لیجئے جو دنیا کے پیچھے لگ گئے آخرت میں ان کی جدوجہد کیا رہ گئی جو آخرت کے طالب بن گئے دنیا کے لیے ان کی مساعی کتنی سست پڑ گئیں شانِ جامعیت علیحدہ چیز ہے لیکن اگر ان دو میں کسی ایک ہی کو اختیار کرنا ہے تو پھر آپ ہی فیصلہ فرمائیے بہتر کیا ہوگا؟

(۱۱۲۳) * ان جملہ احادیث کا منشا یہ ہے کہ جس دنیا میں انسان خود پیدا ہوتا ہے، جس کے تمام علائق اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس کے نقصانات و منافع اور تکالیف و لذتوں سے وہ ہر وقت آشنا ہے اور اس کی ضرورت اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں محسوس کر رہا ہے وہ للہ .....

مَا الدُّنيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَايَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْبِمَ يَرْجِعُ. (رواہ مسلم)

(۱۱۲۴) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدِيْ فِيْ مَرَضِهٖ سِتَّةُ دَنَانِيْرَ اَوْ سَبْعَةٌ فَاَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُفَرِّقَهَا فَشَغَلَنِيْ وَجَعُ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ سَاَلَنِيْ عَنْهَا مَا فَعَلَتِ السِّتَّةُ اَوِ السَّبْعَةُ قُلْتُ لَا وَ اللّٰهِ لَقَدْ كَانَ شَغَلَنِيْ وَجَعُكَ فَدَعَا بِهَا ثُمَّ وَضَعَهَا فِيْ كَفِّهٖ فَقَالَ مَا ظَنُّ نَبِيِّ اللّٰهِ لَوْ لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَ هٰذِهٖ عِنْدَهٗ. (رواہ احمد)

(۱۱۲۵) عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

بھی نہیں جتنا کہ تم اگر سمندر میں انگلی ڈالو پھر دیکھو کہ اس میں کتنا پانی لگا ہے۔ (مسلم)

(۱۱۲۴) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفات میں میرے پاس آپؐ کے چھ یا سات دینار امانت کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں ان کو تقسیم کر دوں، مگر آپؐ کی بیماری میں مجھ کو اس کا خیال نہ رہا۔ آپؐ نے ایک بار پھر پوچھا وہ چھ یا سات دینار تقسیم ہو گئے یا نہیں۔ میں نے عرض کی خدا کی قسم تقسیم نہیں ہو سکے اور صرف آپؐ کی علالت کی فکر کی وجہ سے مجھ سے یہ غفلت ہوئی۔ آپؐ نے ان دیناروں کو منگا کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا۔ اللہ کے اس نبی کے متعلق کیا گمان ہے جس کی اپنے رب سے ملاقات کا اگر وقت آ گیا ہو تو وہ اس حالت میں جائے کہ یہ دنیا اس کے پاس موجود ہوں۔ (احمد)

(۱۱۲۵) ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

..... ان احساسات میں پڑ کر کہیں اس آخرت کو بھول نہ جائے جس میں اس کو ہمیشہ رہنا ہے مگر اس کے نفع نقصان سے وہ ابھی تک آشنا نہیں اور نہ ابھی تک اس کی ضرورت اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں محسوس کرتا ہے۔ جس ایک محسوس مگر عارضی زندگی اور ایک غیر محسوس مگر دائمی زندگی پر تنبیہ کے لیے یہ مختلف تعبیریں ہیں اور اسی کے لیے مختلف پیرایہ بیان ہیں۔ دنیا کے متعلق جن کا عقیدہ تھا وہ تو دنیا کے فاتح بن چکے اور جن کا عقیدہ اس کے برعکس ہے وہ آج خود دنیا کے مفتوح ہیں۔ اس پر ان کو گمان یہ ہے کہ وہ دنیا کے فاتح ہیں۔ اکبر مرحوم کہتے ہیں۔

فخر کیا ہے جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں!

(۱۱۲۵) * انبیاء علیہم السلام کی بلند نظریں دنیا کی متاعِ خسیس کی طرف کبھی نہیں اٹھتیں۔ ان کے نزدیک ساری دنیا کی قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں ہوتی ان کے یہاں قیمت تضرع اور ذکر اللہ کی ہے اس کی حمد و ثناء اور اس کے شکر کی ہے وہ انسان کی ضعیف خلقت سے پورے خبردار ہوتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بھوک کی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہمیشہ شکم سیری کے خطرناک عواقب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لیے ایک طرف بھوکوں کے ساتھ بھوکا رہنے کی دعاء تو کرتے ہیں مگر وہ بھوکا نہیں جو بھوک میں اپنے مالک کی یاد اور اس کے سامنے تضرع والحاح کو فراموش کر بیٹھے اور دوسری طرف شکم سیروں میں شکم سیر ہونے کی دعاء بھی فرماتے ہیں، مگر وہ شکم سیر نہیں جو پیٹ بھر جانے کے بعد بھی اپنے مالک کی حمد و ثناء اور اس کے شکر سے غافل ہو جائے۔ اس طرح کی بھوک اگر ہو تو وہ بھی نبوت کی وراثت ہے اور اس طرح کی شکم سیری اگر ہو تو وہ بھی اسوۂ نبوت ہے۔ جب تک انسان ساری دنیا سے بے نیاز نہ ہو جائے وہ افراط و تفریط کے ان حالات میں خدائی یاد کبھی قائم نہیں رکھ سکتا۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَارَبِّ وَ لٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَ اَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَ ذَكَرْتُكَ وَ اِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَ شَكَرْتُكَ.

(رواہ احمد و الترمذی)

حق تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کے اس پتھریلی میدان کو میرے سامنے کر کے مجھ کو یہ اختیار دیا تھا اگر میں پسند کروں تو وہ اپنی قدرت سے اس کو سونا بنا دے میں نے عرض کی پروردگار! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر رہوں تو ایک دن بھوکا بھی رہوں- جب بھوکا ہوں تو تیرے سامنے گریہ وزاری کروں اور تیری یاد کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد و ثناء کروں اور تیرا شکر بجا لاؤں- (احمد و ترمذی)

(۱۱۲۶) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ لِيْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِيْ اَنْ لَا يَمُرَّ عَلَيَّ ثَلَاثُ لَيَالٍ وَ عِنْدِيْ مِنْهُ شَيْءٌ اِلَّا شَيْءٌ اُرْصِدُهُ لِدَيْنٍ.

(رواہ البخاری و عند الدارمی نحوہ عن ابی ذر)

(۱۱۲۶) ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کی برابر بھی سونا ہوتا تو بھی میری خوشی اسی میں ہوتی کہ تین راتیں بھی نہ گذرنے پائیں کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی رہ جائے- ہاں صرف اتنی مقدار جتنی کہ میں اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ لوں- (بخاری شریف)

(۱۱۲۷) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَ قَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِهٖ فَقَالَ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَ نَعْمَلَ فَقَالَ مَا لِیْ وَ لِلدُّنْيَا وَمَا اَنَا وَ الدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَكَهَا. (رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجہ و رواہ الطیالسی باسناد صحیح)

(۱۱۲۷) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار چٹائی پر سو رہے، جب آپؐ اٹھے تو آپؐ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ گئے تھے- یہ دیکھ کر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت ہو تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بچھونا تیار کر لیں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے دنیا سے کیا کام میری اور دنیا کی مثال بس اس مسافر سوار کی سی ہے جو درخت کے سایہ کے نیچے ذرا سی دیر بیٹھے پھر اس کو چھوڑ کر چل دے-

(احمد- ترمذی- ابن ماجہ- ابوداؤد- طیالسی)

(۱۱۲۸) عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِیْ فَقَالَ كُنْ فِی الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَ عُدَّ نَفْسَكَ فِیْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ. (رواہ البخاری)

(۱۱۲۸) ابن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جسم کا بعض حصہ (شفقت کے انداز میں) پکڑ کر فرمایا دنیا میں اس طرح بسر کرو جیسے تم ایک مسافر ہو اور مسافر بھی وہ جو منزل طے کر رہا ہو اور اپنے نفس کو ایسا سمجھو جیسے قبر کا مردہ- (بخاری شریف)

(۱۱۲۸) * ان واقعات سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ جن کے قلوب میں خشیت الٰہی اس درجہ ہو جس کا نقشہ احادیث مذکورہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اور جن کے قلوب میں دنیا کی بے ثباتی اس درجہ ہو جو آپ کے سامنے ہے ان میں معصیت کا داعیہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے-

الرسولُ العظیم و ابتعاده عن الاثام

حرفِ گناہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نفرت و بیزاری

(۱۱۲۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ مَاخُیِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَمْرَیْنِ قَطُّ اِلَّا اِخْتَارَ اَیْسَرَ هُمَا فَاِنْ کَانَ اِثْمًا کَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَ مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فِیْ شَیْءٍ قَطُّ اِلَّا یُنْتَهَکُ حُرْمَةُ اللّٰهِ فَیَنْتَقِمُ لِلّٰهِ بِهَا. (متفق علیہ)

(۱۱۲۹) حضرت عائشہؓ محترمہ فرماتی ہیں کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا اختیار دیا گیا ہے (تو امت کی سہولت کی خاطر) آپ اسی کو اختیار فرماتے جو دونوں میں آسان تر ہوتی مگر جب کہیں گناہ کا معاملہ آجاتا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی شخص نہ تھا جو اس سے دور دور رہنے والا ہوتا- آپ نے اپنے نفس کی خاطر کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا' بجز اس صورت کے کہ جس میں خدائی احترام پر کوئی زد پڑتی ہو- پھر تو اللہ تعالیٰ کے احترام کی خاطر آپ اس کا انتقام لے کر رہتے تھے- (متفق علیہ)

(۱۱۳۰) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ مَاضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ شَیْئًا قَطُّ بِیَدِهٖ وَ لَا امْرَأَةً وَ لَا خَادِمًا اِلَّا اَنْ یُجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا نِیْلَ مِنْهُ شَیْءٌ قَطُّ فَیَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهٖ اِلَّا اَنْ یُنْتَهَکَ شَیْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ فَیَنْتَقِمُ لِلّٰهِ. (رواه مسلم)

(۱۱۳۰) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غرض کے لیے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو تنبیہ نہیں فرمائی نہ کبھی کسی عورت کو اپنے ہاتھ سے مارا اور نہ کسی خادم کو مگر ہاں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو جہاد کیے ہیں وہ بات الگ ہے- اسی طرح ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو ایذاء دی گئی ہو پھر آپ نے اس ایذاء دینے والے شخص سے اس کا بدلہ لیا ہو- بجز اس صورت کے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خلاف کوئی بات ہو تو پھر آپ ناموس حدود اللہ کی خاطر اس کا انتقام لیتے- (مسلم شریف)

(۱۱۳۱) عَنْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ لَمَّا کَانَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّةَ اٰمَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ اِلَّا اَرْبَعَةَ نَفَرٍ وَ امْرَاَتَیْنِ وَ قَالَ اُقْتُلُوْهُمْ وَ اِنْ وَجَدْتُمُوْهُمْ مُتَعَلِّقِیْنَ بِاَسْتَارِ الْکَعْبَةِ مِنْهُمْ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ سَرْحٍ فَاخْتَبَأَ عِنْدَ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فَلَمَّا دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ اِلَی الْبَیْعَةِ جَاءَ بِهٖ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بَایِعْ عَبْدَ اللّٰهِ فَرَفَعَ

(۱۱۳۱) سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز چار شخصوں اور دو عورتوں کے سب کے لیے امن عام کا اعلان فرما دیا تھا اور صرف چند لوگوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ ان کو تو قتل ہی کرنا اگرچہ وہ تم کو کعبہ کے پردے پکڑے ہوئے بھی ملیں- ان میں سے ایک شخص عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھا یہ حضرت عثمان کے پاس آکر چھپ گیا تھا- پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کرنے کے لیے بلایا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اس کو لے کر آئے اور عرض کی یارسول اللہ عبداللہ کو بھی بیعت فرما لیجئے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اوپر اٹھا کر اس کو تین بار دیکھا ہر بار بیعت کے لیے

(۱۱۳۱) * فتح مکہ میں دشمن سے دشمن کی بھی بخشش ہوگئی لیکن صرف ان معدودے چند اشخاص کی جن کی پیہم ایذاء رسانیوں دنائت للہ.....

رَأْسَهُ فَنَظَرَ اِلَيْهِ ثَلَاثًا كُلُّ ذٰلِكَ يَاْبٰى يُبَايِعَهُ ثُمَّ بَايَعَهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰى اَصْحَابِهِ فَقَالَ اَمَا كَانَ فِيْكُمْ رَجُلٌ رَشِيْدٌ يَقُوْمُ اِلٰى هٰذَا حِيْنَ رَاٰنِىْ كَفَفْتُ يَدِىْ عَنْ بَيْعَتِهِ فَيَقْتُلُهُ فَقَالُوْا مَا يَدْرِيْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا فِىْ نَفْسِكَ هَلَّا اَوْ مَأْتَ اِلَيْنَا بِعَيْنِكَ قَالَ اِنَّهُ لَا يَنْبَغِىْ لِنَبِىٍّ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ خَائِنَةُ الْاَعْيُنِ. (قال الحافظ ابن تيمية رواه ابو داؤد باسناد صحيح و النسائي كذلك و كان ابن ابى السرح اخا عثمان من الرضاعة كذا فى الصارم المسلول ص ۱۰۸)

انکار ہی فرماتے رہے اس کے بعد اس کو بھی بیعت فرمالیا پھر اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا تم میں کوئی ایسا سمجھ دار شخص نہ تھا کہ جب اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کے بیعت کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ رہا ہوں تو اٹھتا اور اس کو قتل کر دیتا - صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا علم تھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ کا ذرا سا اشارہ کر دیا ہوتا - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ اس کی آنکھ بھی خیانت کرنے والی ہو -

(ابوداؤد' نسائی' ابن مردویہ)

الرسول العظيم و جزمه بانه لا يكون عليه مظلمة لاحد يوم القيامة و انه لا كرب عليه بعد وفاته

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جزم و یقین کہ آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مؤاخذہ نہیں

(۱۱۳۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ غَلَا السِّعْرُ عَلٰى عَهْدِ

(۱۱۳۲) انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

..... اور خست طبع سے اس کی کوئی امید نہ تھی کہ آئندہ وہ اسلام کے ساتھ آشتی کا ادنیٰ سا برتاؤ بھی کر سکیں گے - ان میں ایک شخص عبداللہ بن ابی السرح بھی تھا' جس کا کام منجملہ اور خبیث افعال و حرکات کے آپ کی ہجو کرنا بھی تھا - جب اس نے دیکھا کہ آج کہیں مفر کی صورت نہیں ہے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی آکر پناہ لی - یہ قدیم سے مجسمہ اخلاق تھے اپنے گھر میں پناہ لینے والے کو کیسے نکال باہر کرتے' اس پر یہ ان کا رضاعی بھائی بھی تھا - اس لیے اس کی سفارش پر مجبور ہو گئے - اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کو عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے شخص سفارش کے لیے لے کر آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو صاف جواب دے دیں - لہٰذا آپ نہ تو صاف انکار کرنا پسند فرماتے تھے اور نہ اپنی زبان سے امن کا لفظ نکال کر پھر اس کے قتل کا حکم دے سکتے تھا اس لیے کچھ دیر توقف سے کام لیتے رہے تاکہ اگر کوئی شخص سابق حکم کے ماتحت اس کو قتل کر دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش رد کرنے کی نوبت ہی نہ آئے - لیکن اس میں آپ اور زیادہ توقف نہ فرما سکے - آخر اس کو بیعت فرمالیا - اس کے بعد ارشاد فرمایا - کاش تم لوگ میرے اس توقف سے کچھ فائدہ اٹھا لیتے صحابہ کا جواب آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب اندازہ فرمایئے کہ ایک واجب القتل شخص کے قتل کے متعلق اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ذرا سا اشارہ فرما دیتے تو کیا یہ کسی معصیت کی تعریف میں آتا - مگر جب آپ نے اتنی سی بات بھی گوارا نہ فرمائی اور وہ بھی اس عنوان سے کہ یہ نبی کی شان نہیں کہ وہ آنکھ کا بھی کوئی ایسا اشارہ کر سکے جو صورۃً بھی خیانت شمار ہو تو کیا پھر کھلی معصیت کرنی خواہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو نبی کی شان ہو گی - (العیاذ باللہ)

(۱۱۳۲) * پہلے زمانہ میں نرخ کا اتار چڑھاؤ تاجروں کے ہتھکنڈوں سے نہ ہوتا تھا بلکہ اشیاء کی باہر سے آمد اور پیداوار کی قلت .....

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعِّرْلَنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَ اِنِّيْ لَا رْجُوْانُ اَلْقٰى رَبِّيْ وَ لَيْسَ اَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِيْ بِمَظْلَمَةٍ بِدَمٍ وَ لَا مَالٍ.

(رواہ ابوداؤد و الترمذی و ابن ماجه و الدارمی)

ایک بار اشیاء کے نرخ بہت چڑھ گئے- اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی یا رسول اللہ! آپ اپنی جانب سے نرخ مقرر فرما دیجئے- آپ نے فرمایا نرخ کا چڑھنا اترنا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے وہی رازق ہے اور رزق کا تنگ و فراخ کرنے والا بھی وہی ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کے روبرو اس شان سے حاضر ہوں گا کہ تم میں ایک شخص بھی اپنے خون یا مال کے ادنیٰ سے معاملہ کا بھی مجھ سے مطالبہ کرنے والا نہ ہوگا- (ابوداؤد وغیرہ)

(۱۱۳۳) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ وَ اكَرْبَ اَبَاهُ فَقَالَ لَهَا لَيْسَ عَلٰى اَبِيْكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلَمَّا مَاتَ قَالَتْ يَا اَبَتَاهُ اَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ يَا اَبَتَاهُ مَنْ جَنَّةُ

(۱۱۳۳) انسؓ بیان کرتے ہیں کہ آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت اور بے چینی بہت بڑھ گئی تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا میرے والد کو کیسی تکلیف ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہارے والد کو جو تکلیف بھی ہے وہ صرف آج کے دن تک ہے اس کے بعد پھر کوئی تکلیف نہیں- اور جب آپ کے وفات ہوگئی تو شدتِ غم میں ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے اے والد

لله ..... وکثرت سے ہوا کرتا تھا- ادھر شریعت مطہرہ نے اس کا بندوبست پہلے سے خود فرما رکھا تھا کہ بے وجہ اشیاء کے نرخ نہ چڑھیں- تاجروں کو باہر سے باہر اشیاء خرید کر لینے کی ممانعت تھی- کھانے کی اشیاء اکٹھی خرید کر دبالینی پھر ان کو گراں قیمت پر فروخت کرنے پر سخت وعید فرما دی گئی اسی طرح ان جملہ صورتوں کا سد باب کر دیا گیا تھا- جن سے اہل شہر پر کسی تجارتی چکر سے گرانی کا خطرہ ہوسکتا تھا اب اگر قدرتی گرانی پر بھی قیمت پر کوئی سرکاری کنٹرول کر دیا جاتا تو یقینی اس میں ایک طبقہ کی حق تلفی کا اندیشہ تھا- اس لئے آپ نے اس کو پسند نہیں فرمائی کیونکہ بظاہر اس میں گو عوام کی بہبودی معلوم ہوتی تھی لیکن ایک فرقہ کے لئے یہ مضرت رسانی کا موجب بھی ہوسکتا تھا اور نبی کی عصمت اس کو گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی ذات سے کسی متنفس کا بال برابر بھی کوئی نقصان ہو اس تنبیہ کے بعد آپ کی پوری شانِ تواضع کے ساتھ آپ کا یہ جملہ کتنا پرازعظمت جملہ تھا کہ مجھ کو یقین ہے کہ قیامت میں میرے ذمہ کسی کا کوئی حق نہ ہوگا یہ کون ہیں وہ جن کا تعلق ہر ہر فرد امت کے ساتھ وابستہ ہے- پھر کس عموم و اطلاق کے ساتھ- حقوق العباد سے اپنی عصمت کا اعلان فرما رہے ہیں- جہاں حقوق العباد اتنے صاف ہوں وہاں حقوق اللہ کی صفائی کا پوچھنا ہی کا ہے- عصمت کے بغیر کیا یہ جملے زبان سے ادا ہوسکتے ہیں-

(۱۱۳۳) * اس حدیث میں بھی آپؐ نے پورے جزم وثوق کے ساتھ فرمایا ہے کہ آخرت میں آپ سے کسی امر میں کوئی گرفت نہ ہوگی- کیا علی الاطلاق عصمت کے بغیر یہ ممکن ہے اب اگر اس پر بھی عصمت کے خلاف منطقی احتمالات نکالتے ہیں تو لوگوں نے دلائل توحید کے خلاف احتمالات نکالنے میں بھی کا کوتاہی کی ہے- آپؐ کی اول سے آخر تک زندگی پر نظر ڈالئے آپ کی صفات و ملکات پر نظر ڈالئے' آپ کی خدا ترسی اور دنیا سے بے رغبتی پر نظر ڈالئے اس کے بعد آپ کے ان جملوں پر بھی نظر ڈالئے جو اس عالم کے متعلق ہیں جہاں کسی کو اپنے متعلق اطمینان بخش ایک حرف نکالنا بھی مشکل ہے تو صرف یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ معصوم ہیں آپ معصوم ہیں-

اَلْفِرْدَوْسِ مَاوَاهُ يَا اَبَتَاهُ اِلَى جِبْرَئِيْلَ نَنْعَاهُ فَلَمَّا دُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا يَا اَنَس اَطَابَتْ اَنْفُسُكُمْ اَنْ تَحْثُوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التراب.

(رواہ البخاری)

بزرگوار وہ کہ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت قبول فرمالی وہ کہ جن کا مقام جنت الفردوس بن چکا اے والد بزرگوار آپ کا یہ المناک حادثہ ہم جبرئیل علیہ السلام کو سناتے ہیں- پھر جب آپ دفن ہو چکے تو حضرت فاطمہؓ نے شدتِ غم سے فرمایا- انسؓ تمہارے دلوں نے یہ کس طرح گوارا کرلیا کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی دی- (بخاری شریف)

(۱۱۳۴) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُکَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَ كَذَا تَعْنِیْ قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ.

(رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد)

(۱۱۳۴) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک موقعہ پر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا آپ کو بس بس وہی صفیہ کافی ہیں یعنی جو پستہ قد ہیں- اس پر آپؐ نے فرمایا تم نے ایسا کلمہ منہ سے نکالا ہے اگر اس کو سمندر میں ملا دیا جائے تو باوجودیکہ اس کا پانی سخت بدمزہ ہوتا ہے مگر وہ اس کا مزہ بھی بدل دے- (احمد- ترمذی- ابوداؤد)

(۱۱۳۵) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُحِبُّ اَنِّیْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَ اَنَّ لِیْ كَذَا وَ كَذَا.

(رواہ الترمذی و صححہ)

(۱۱۳۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے کسی کی نقل اتارنا پسند نہیں اگر چہ اس کے مقابلہ میں میرے لیے بڑی سے بڑی بھی کوئی چیز ہو-

(ترمذی شریف)

(۱۱۳۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ بَلَغَ صَفِيَّةَ قَالَتْ بِنْتُ يَهُوْدِیٍّ فَبَكَتْ فَدَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هِیَ تَبْكِیْ فَقَالَ مَا يُبْكِيْکِ

(۱۱۳۶) انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت صفیہؓ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت حفصہؓ ان کے متعلق ''دختر یہودی'' کا لفظ کہتی ہیں- اس پر وہ رونے لگیں- حسب الاتفاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو اس وقت وہ رو رہی

(۱۱۳۶) * کسی شخص کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا سب سے سچا معیار اس کی اندرونی زندگی ہوتی ہے اور اس میں بھی بیبیوں کا معاملہ بھی سب سے اہم ہے یہاں بشری فطرت اپنی طبعی مناسبت کی وجہ سے کبھی کسی کی طرف زیادہ میلان بھی رکھ سکتی ہے اور اتنی بات پر اس کو ملامت بھی نہیں کی جاسکتی- کیونکہ یہ بات انسان کے اختیار کی نہیں ہوتی پھر اس میلان کے اثرات بھی باہم معاملات میں بھی نظر آنے ناگزیر ہو جاتے ہیں- بس یہاں پہنچ کر ہی عام بشر کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں لیکن جب کسی نبی کی اندرونی زندگی دیکھی جائے تو ان معاملات میں بھی وہ اتنی ہی صاف نظر آتی ہے جتنی کہ اس کے بیرونی معاملات میں- حضرت عائشہؓ بیشک ازواجِ مطہرات میں سب سے بلند مقام رکھتی تھیں مگر جب حضرت صفیہؓ کے متعلق ان کی زبان ذرا سا ایک کلمہ وہ بھی طبعی غیرت میں منہ سے نکلا تو آپ نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اس طرح حضرت حفصہؓ اگرچہ عمر فاروقؓ جیسے رفیق کی صاحب زادی سہی لیکن ان کے ایک صحیح کلمہ کو بھی آپ نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا کیونکہ اس کی غایت وغرض بھی کچھ اچھی نہ تھی- پھر اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اسی مکروہ کلمہ کی ایسی اصلاح فرمادی کہ جو کلمہ پہلے حقارت کا باعث تھا اب وہی قابل فخر نظر آنے لگا- اس کے بعد نہ تحقیر کرنے والا اس کو دہرا سکتا تھا اور نہ سننے والا اس کو برا مان سکتا تھا- یہ ہے نبی کی اندرونی زندگی ﷲ .....

فَقَالَتْ قَالَتْ لِيْ حَفْصَةُ اَنِّيْ اِبْنَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكِ لَاِ بْنَةُ نَبِيٍّ وَ اِنَّ عَمَّكِ لَنَبِيٌّ وَ اِنَّكِ لَتَحْتَ نَبِيٍّ فَفِيْمَ تَفْخَرُ عَلَيْكِ ثُمَّ قَالَ اتَّقِى اللّٰهَ يَا حَفْصَةُ (رواه الترمذی و النسائی)

تھیں-فرمایا کیوں روتی ہو؟ انہوں نے عرض کی اس لیے کہ حفصہؓ مجھے یہودی کی لڑکی کہتی ہیں-آپؐ نے فرمایا تم تو نبی کی اولاد میں ہو اور تمہارے چچا بھی ایک نبی تھے اور اب تم ایک نبی کی بی بی ہو- پھر حفصہ اگر تمہارے مقابلہ پر فخر کرتی ہیں تو آخر کس بات پر؟ اس کے بعد حضرت حفصہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا حفصہ! اللہ سے ڈرو- (ترمذی-نسائی)

(۱۱۳۷) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ مَا غِرْتُ عَلٰى اَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَؓ وَ مَا رَأَيْتُهَا وَ لٰكِنْ كَانَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا وَ رُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا اَعْضَاءً ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِيْ صَدَائِقِ خَدِيْجَةَؓ فَرُبَّمَا

(۱۱۳۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جتنی غیرت مجھ کو حضرت خدیجہؓ پر آیا کرتی تھی اتنی آپؐ کی بیبیوں میں کسی پر بھی نہ آتی تھی حالانکہ مجھے ان کے دیکھنے کی نوبت کہاں آئی تھی (ان کا تو مجھ سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا) بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور جب کبھی بکری ذبح کرنے کی نوبت آتی تو اس کی بوٹیاں بنوا کر ان کی

بقیہ ..... آپؐ کی ازواج میں ام حبیبہؓ بھی شامل تھیں جن کے والد اس وقت تک آپ کے دشمنوں کی صف میں تھے اور حضرت صفیہؓ بھی اس شرف سے مشرف ہو چلی تھیں اور وہ بھی اپنے والد' چچا اور شوہر کے قتل کا زخم کھائے بیٹھی تھیں لیکن اس کے باوجود کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ آپ کی اندرونی زندگی کے متعلق ان شریف اور غیور عورتوں کی زبانوں سے کبھی ادنیٰ سے نقص کا ایک کلمہ بھی نکلا تھا- بلکہ ام حبیبہؓ سے تو یہاں تک منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد اپنے زمانہ شرک میں آپ کے تشریف لائے تو ایک بچھونا جو سامنے بچھا ہوا تھا انہوں نے فوراً ایک طرف لپیٹ کر رکھ دیا- ان کے والد ابوسفیان نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا- کیا میں بستر کے لائق نہیں-فرمایا کہ یہ بستر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ مشرک ہیں (مشرک کو قرآن کریم نے ناپاک کہا ہے) اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ازواج پر بھی آپ کی عصمت اور آپ کے تقدس کا سکہ کس درجہ جما ہوا ہوگا- کثرتِ ازواج اسلامی تعلیمات کی اشاعت و تفہیم کے لئے کتنی اہم تھی- یہ بات تو جداگانہ ہے مگر یہاں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب مختلف مزاج' مختلف حالات اور مختلف خاندانوں کی بیبیاں بھی آپ کی اندرونی پاکبازی کی سب سے بڑی شاہد ہوں تو پھر آپؐ کی عصمت و پاک بازی کا مسئلہ بدیہی ہونا یقینی ہے-

(۱۱۳۷) ✱ حضرت خدیجہؓ آپ کی نبوت کے ابتدائی حالات میں آپؐ کی پوری پوری دمساز رہ چکی تھیں اس لئے ان کی خدمات اور ان کی وفاشعاری آپ کو کبھی فراموش نہ ہوتی تھیں' زندگی تک تو ہر انسان اپنے مخلصوں کی قدردانی کیا کرتا ہے' لیکن جو موت کے بعد بھی یاد تازہ رکھے ایسے انسان کم ہیں- یہاں حضرت عائشہؓ بڑی صفائی کے ساتھ اظہار فرما رہی ہیں کہ میری زبان سے جو کلمات بھی حضرت خدیجہؓ کی شان میں نکل گئے یہ صرف ایک سوت کی طبعی غیرت تھی اس کو حسد سمجھنا غلط ہے کیونکہ میں نے تو ان کو دیکھا بھی نہیں تھا-مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طور وطریق سے چونکہ ان کے ساتھ محبت و تعلق کے کلمات برابر سنتی بس وہی میری غیرت کو برانگیختہ کر دیتے تھے-مگر دیکھئے کیا حضرت عائشہؓ کی خاطر آپ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر سکوت فرما سکے- اور کیا یہاں بھی ایک ایسی بات نہ فرما دی جس کے بعد حضرت عائشہؓ دوسری بار اس کا ذکر نکال ہی نہیں سکتی تھیں' یعنی ان کا صاحب اولاد ہونا -عورتوں میں لاولد ہونا آج بھی موجب نقص گنا بقیہ .....

قُلْتُ لَهُ كَاَنَّهُ لَمْ تَكُنْ فِي الدُّنْيَا اِمْرَءَةٌ اِلَّا خَدِيْجَةُ فَيَقُوْلُ اِنَّهَا كَانَتْ وَ كَانَتْ وَ كَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ.

(متفق علیه وَ رَاجِعْ حديث الصحفة و حديث الخير من ترجمان السنة ص......)

سہیلیوں کے پاس بھی بھیجا کرتے تھے۔ میں اس وقت کبھی شدتِ غیرت سے یہ کہہ بیٹھتی کہ آپؐ تو ان کا ذکر ہر وقت اس طرح رکھتے ہیں جیسے دنیا میں (حضرت) خدیجہؓ کے علاوہ کوئی اور عورت ہی نہیں تو آپؐ یہ فرما دیتے جی ہاں بس وہ تھیں اس کو میں جانتا ہوں اور بڑی بات یہ ہے کہ میری اولاد بھی ان سے ہی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۱۳۸) عَنْ اُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ وَ كَانَ فِيْهِ مُزَاحٌ بَيْنَمَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَاصِرَتِهٖ بِعُوْدٍ فَقَالَ اَصْبِرْنِيْ قَالَ اصْطَبِرْ قَالَ اِنَّ عَلَيْكَ قَمِيْصًا وَ لَيْسَ عَلَيَّ قَمِيْصٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَمِيْصِهٖ فَاحْتَضَنَهُ وَ جَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَرَدْتُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. (رواہ ابوداؤد)

(۱۱۳۸) اسید بن حضیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری صحابی نے جن کے مزاج میں ظرافت تھی اپنے سلسلہ گفتگو میں بیان کیا کہ اس اثناء میں جب کہ وہ لوگوں کو ہنسا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکڑی ان کی کوکھ میں ذرا چبھو دی انہوں نے کہا میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ آپ نے فوراً فرمایا اچھا لے لو۔ انہوں نے کہا آپ کے جسم پر تو قمیص ہے اور میرے جسم پر قمیص نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اپنی قمیص اٹھا دی۔ پھر کیا تھا وہ آپ کو لپٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو کو بوسہ دیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری دیرینہ تمنا تو بس یہ تھی۔ (ابوداؤد)

☜ ...... جاتا ہے۔ طبعی حالات چونکہ ایک حد تک غیر اختیاری سے ہوا کرتے ہیں اس لئے جب تک اس کے خلاف بھی ایسے ہی طبعی حالات پیدا نہ ہو جائیں پورے طور پر ان سے علیحدگی اختیار کر لینا ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے مواقع پر ایسے دوسرے حالات بھی پیدا کر دیتے تھے جن کے بعد ان کے اعادہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکیں یہاں دو واقعات اور بھی ملاحظہ فرمالیجئے جو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۴۷۱ اور ج ۲ ص ۷۱ او ج ۲ ص ۷۸ پر مذکور ہیں۔ تاکہ آپ کو اور روشن ہو جائے کہ روزمرہ کے بیبیوں کے معاملات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کتنی بے لاگ رہی ہے حالانکہ یہی محل جذبات کے امتحان کا سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ یہاں دس تاویل کر کے انسان کا رخ ادھر ہی پھر جاتا ہے جس طرف کہ اس کے قلب کا رخ ہوتا ہے۔ مگر اس نازک امتحان میں بھی جب رسول کی فطرت کہیں ذرا نہیں ڈگمگاتی تو اندازہ فرمالیجئے کہ پھر حق تعالیٰ کی ادنیٰ سے اولیٰ نافرمانی بھلا وہ کیا کر سکتی ہے۔

(۱۱۳۸) ✱ حدیث مذکور کو ملاحظہ فرمائیے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس اقتدارِ اعلیٰ پر یہ اندازِ بے تکلفی اور اس اندازِ بے تکلفی میں ایک زبردست صحابی کے طلب انتقام پر یہ انداز رضا مندی یہ آپؐ کے عصمتِ نفس کی کتنی بڑی شہادت ہے۔ ہم بارہا تنبیہ کر چکے ہیں کہ اہم مواقع پر انسان کی آزمائش بھی گو ایک بڑی آزمائش ہوتی ہے مگر یہاں فطرتاً ہر انسان اس کی کچھ نہ کچھ تیاری کر لیتا ہے مگر روزمرہ کے وہ واقعات جن کی نظروں میں نہ اس جانب کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ اس جانب ان میں لغزشوں سے اس طرح محفوظ رہنا گویا نفس کی افتادِ طبیعت یہی ہے یہ انسان کی پاک نفسی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ انسان کی لغزش کا سب سے بڑا مقام حقوق العباد ہی کی گھاٹیاں ہوتی ہیں۔ ☜ .....

الرسول العظيم كان اسوة حسنة للناس كافة من الله عزوجل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نمونہ تھا

(١١٣٩) عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ قَالَ سَأَلْنَا ابْنَ عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ طَافَ بِالْبَيْتِ فِيْ عُمْرَةٍ وَ لَمْ

(١١٣٩) عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا جس نے عمرہ کا احرام باندھ کر بیت اللہ کا طواف تو کرلیا تھا مگر

لله ..... یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھاٹی سے اس طرح صاف نکل گئے ہیں گویا ان میں کہیں ایک کانٹا بھی نہ تھا - ازواجِ مطہرات کی خانگی معاملات آپ نے پڑھے - اہل ذمہ اور یہود کی سخت کلامی اور ناروا کلمات آپؐ نے سنے اور پھر اب آپ کے فداکاروں کی اس قسم کے واقعات بھی دیکھے - یہ بات تو بعد میں کھلی کہ اس جاں نثار کا جذبہ محبت کس موقعہ کا متلاشی تھا لیکن اس سے قبل صورتِ حال جتنی ناموزوں نظر آ رہی تھی وہ ظاہر ہے مگر اول سے لے کر آخر تک کیا ممکن کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کا قدم جادہ اعتدال سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹا ہو - یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذات پاک کیا تھی بحرِ سکون کا ایک بے پایاں سمندر تھا جس میں کنکر پتھر تو کیا اگر پہاڑ بھی اٹھا کر ڈال دو تو بھی اس میں ذرا جنبش نہیں ہو سکتی - حضرت انس آپ کے دیرینہ خادم بیان کرتے ہیں کہ اس طویل مدت میں مجھے کبھی یاد نہیں آتا کہ آپ نے کسی نقصان کرنے پر کبھی مجھ کو ٹوکا ہو بلکہ اگر کسی اور شخص نے بھی کچھ کہا ہے تو اس کو بھی یہ کہہ کر منع فرما دیا ہے - شدنی معاملات ہو کر رہتے ہیں انس کو کچھ نہ کہو -

(١١٣٩) ٭ اسلام میں رسول کی شخصیت کے متعلق ایک اصولی اور سب سے مقدس تصور یہ ہے کہ اس کی ذات اور اس کی ایک ایک ادا اس کی امت کے لئے مرضیاتِ الٰہیہ کا نمونہ اور ''اسوہ حسنہ'' بنا کر بھیجی جاتی ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خالق کی نظر میں جتنی پسندیدہ صفات ہیں وہ سب کی سب اس کی ذات میں جمع کر دی جاتی ہیں اور جتنی صفات ناپسندیدہ ہیں وہ ایک ایک کر کے اس کی ذات سے علیحدہ کر دی جاتی ہیں - کیونکہ کسی چیز کے نمونہ کہنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار رہے -

حق تعالیٰ نے اس امت کو جہاں اپنی جانب سے اپنی کتاب دے کر سرفراز فرمایا تھا - اسی کے ساتھ اس کتاب کا ایک عملی نمونہ بھی عنایت فرمایا تھا لہٰذا جس طرح اس کی کتاب ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ تھی اسی طرح اس کا نمونہ بھی ہر عیب و نقص سے مبرا ہونا چاہئے - اللہ تعالیٰ نے رسول کی ذات کو کسی تفصیل کے بغیر ''اسوۂ حسنہ'' نہیں فرمایا اور صحابہ نے کسی حجت کے بغیر اس کو اپنا ''اسوہ'' بنا لیا - پھر جس طرح کہ اس نے تبلیغ احکام کے لئے آپ کو اپنا رسول بنا کر خود بھیجا تھا اسی طرح آپ کی ذات کو نمونہ اور ''اسوۂ حسنہ'' بھی خود ہی بنا کر بھیجا تھا لہٰذا جس طرح آپ کے علوم کی قدرت ضامن تھی اسی طرح آپ کے اعمال و افعال کی بھی قدرت ہی خود نگراں تھی اور عصمت رسول کا مفہوم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں - لہٰذا ''اسوۂ حسنہ'' کو رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان سمجھنا چاہیے اب اگر رسول کے کسی قول و عمل میں معصیت کی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو دو باتوں میں سے ایک بات ماننی لازم ہوگی یا رسول کی ذات اسوہ نہ رہے یا معصیت بھی اسوہ کا جزو بن جائے اور امتوں کے حق میں معصیت کا یہ عمل بھی مذموم نہ رہے - کیونکہ جب وہ معصیت خود قدرت کے نمونہ میں موجود ہے تو پھر اس کی اتباع پر امت سے باز پرس کیوں ہو - یہ دونوں باتیں ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں اس لیے یہی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ رسول چونکہ معصوم ہوتا ہے اس لیے اس کے کسی عمل پر معصیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا' اس کا ہر ہر عمل نظر ربوبیت میں حسنہ اور نیکی شمار ہوتا ہے اور نیکی بھی وہ جس کو نمونہ کہا جا سکے -

يَطُفُ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ سَبْعًا أَيَأْتِي امْرَأَتَهُ فَقَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَ صَلَّى خَلْفَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ وَ طَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ سَبْعًا وَ قَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وَ قَالَ (عَمْرُو بْنُ دِيْنَارٍ) وَ سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ فَقَالَ لَا يَقْرَبَنَّهَا حَتّٰى يَطُوْفَ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ. (رواہ البخاری)

ابھی صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر نہ لگائے تھے' کیا وہ اپنی بی بی کے ساتھ صحبت کر سکتا ہے- اس پر انہوں نے یہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کے گرد سات چکر کیے اس کے بعد مقام ابراہیم پر آ کر دو رکعتیں طواف کی ادا فرمائیں' پھر صفا و مروہ کے سات چکر لگائے اور تمہارے واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی بہترین نمونہ ہے- عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے جابرؓ سے بھی یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا جب تک صفا و مروہ کے درمیان پوری سعی سے فارغ نہ ہولے بی بی کے قریب نہ پھٹکے- (بخاری شریف)

(۱۱۴۰) عَنْ نَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ أَرَادَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا الْحَجَّ عَامَ حَجَّةِ الْحَرُوْرِيَّةِ فِيْ عَهْدِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقِيْلَ لَهُ إِنَّ النَّاسَ كَائِنٌ بَيْنَهُمْ قِتَالٌ وَ نَخَافُ أَنْ يَصُدُّوْكَ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ إِذَنْ أَصْنَعُ كَمَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ أُشْهِدُكُمْ أَنِّيْ قَدْ أَوْجَبْتُ عُمْرَةً حَتّٰى كَانَ بِظَاهِرِ الْبَيْدَاءِ قَالَ مَا شَأْنُ الْحَجِّ وَ الْعُمْرَةِ إِلَّا وَاحِدٌ أُشْهِدُكُمْ أَنِّيْ قَدْ جَمَعْتُ حَجَّةً مَعَ عُمْرَةٍ وَ أَهْدٰى هَدْيًا مُقَلَّدًا اشْتَرَاهُ حِيْنَ قَدِمَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ وَ بِالصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ وَ لَمْ يَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ وَ لَمْ يَحْلِلْ عَنْ شَيْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتّٰى يَوْمَ النَّحْرِ فَحَلَقَ وَ نَحَرَ وَ رَأٰى أَنْ قَدْ قَضٰى طَوَافَهُ لِلْحَجِّ وَ الْعُمْرَةِ بِطَوَافِهِ الْأَوَّلِ ثُمَّ قَالَ كَذٰلِكَ صَنَعَ النَّبِيُّ. (رواہ البخاری)

(۱۱۴۰) نافع بیان کرتے ہیں کہ جس سال خوارج کے ساتھ جنگ تھی حضرت ابن عمرؓ نے حج کا ارادہ فرمالیا یہ عبداللہ بن زبیرؓ کا زمانہ تھا- لوگوں نے کہا کہ سامنے جنگ کھڑی ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ دشمن کہیں آپ کو جانے نہ دیں- انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے اگر ایسا ہوگا تو میں بھی وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعہ پر کیا تھا یہ فرما کر ابن عمرؓ نے فرمایا گواہ رہو میں عمرہ کی نیت کر چکا- اس کے بعد جب مقام بیداء پر پہنچے تو فرمایا کہ حج اور عمرہ کا معاملہ یکساں ہی ہے لہٰذا میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ عمرہ کے ساتھ میں حج کی بھی نیت کیے لیتا ہوں اور جو ہدی آتے وقت مقام قدید سے خرید کی تھی اس کو قلادہ پہنا کر ساتھ لے چلے- مکہ مکرمہ پہنچ کر انہوں نے بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف کیا اس کے سوا اور کچھ نہ کیا اور عید قرباں کے دن تک بدستور محرم رہے جب دسویں تاریخ ہوئی تو اب سر منڈایا اور ہدی کا جانور ذبح کیا اور ان کا خیال یہ تھا کہ حج و عمرہ کے لیے جو طواف ان کے ذمہ ضروری تھا وہ پہلا طواف کر کے انہوں نے ادا کر دیا ہے- اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا- (بخاری شریف)

(۱۱۴۱) حَدَّثَنَا حَكِيْمٌ أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ

(۱۱۴۱) حکیم کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ پوچھا گیا جس

(۱۱۴۱) * صحیح بخاری میں اس روایت کے بعد ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں- کنت مع ابن عمر فساله رجل قال الخ.....

عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ نَذَرَ اَلَّا يَأْتِيَ عَلَيْهِ يَوْمٌ اِلَّا صَامَ فَوَافَقَ يَوْمَ اَضْحٰى اَوْ فِطْرٍ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لَمْ يَكُنْ يَصُوْمُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَ لَا اَضْحٰى وَ لَا يَرَىٰ صِيَامَهُمَا. (رواه البخاری)

نے یہ نذر کر لی تھی کہ جب تک وہ زندہ رہے گا ہر سہ شنبہ یا چہار شنبہ کو روزہ رکھا کرے گا- اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن عید الفطر یا عید قربان آ گئی اب وہ کیا کرے- انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے آپ نہ عید الفطر میں روزہ رکھتے تھے نہ عید قربان میں اور ان دونوں دنوں میں روزہ رکھنا درست سمجھتے تھے- (بخاری)

(۱۱۴۲) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍؓ قَالَ فِي الْحَرَامِ يُكَفِّرُ وَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۲) سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے اگر کوئی شخص اپنی بی بی سے "انت علی حرام" کے لفظ کہہ دے تو اس کو کفارہ یمین ادا کرنا چاہیے- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں تمہارے لیے بہتر نمونہ ہے- (بخاری شریف)

(۱۱۴۳) عَنْ زِيَادِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ اَتٰى عَلٰى رَجُلٍ قَدْ اَنَاخَ بَدَنَتَهٗ يَنْحَرُهَا قَالَ ابْعَثْهَا قِيَامًا مُقَيَّدَةً سُنَّةُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۳) زیاد بن جبیر بیان کرتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا گذر ایک شخص پر ہوا جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا- انہوں نے فرمایا کہ اس کا گھٹنا باندھ کر کھڑا کر- یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا- (بخاری شریف)

(۱۱۴۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَرَأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا اُمِرَ وَ سَكَتَ فِيْمَا اُمِرَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۴) ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بات کا حکم ہوا وہ آپ نے پڑھ کر سنا دی اور جہاں خاموش رہنے کا حکم ہوا وہاں آپ خاموش رہے (اس لیے آپ کا نطق و سکوت دونوں حکم الٰہی کے ماتحت تھا) وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (مریم) اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہترین نمونہ ہے- (لہٰذا بے وجہ کھود کرید مت کیا کرو) (بخاری شریف)

(۱۱۴۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَحِبْتُ النَّبِيَّ صَلَّى

(۱۱۴۵) ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

لله ..... نذرت ان اصوم كل يوم ثلثاء او اربعاء. ہم نے اوپر کی روایت کا ترجمہ اسی روایت کی روشنی میں کیا ہے- اگر یہاں شارحین نے اس کو علیحدہ علیحدہ دو واقعات قرار دیے ہوں تو پھر اس روایت کا ترجمہ بدل جائے گا-

(۱۱۴۲) * حضرت ابن عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ صرف کفارہ یمین ادا کر دینا کافی ہوتا ہے- جیسا کہ ایک واقعہ میں آپ نے شہد کے متعلق فرما دیا تھا کہ آئندہ میں شہد استعمال نہیں کروں گا تو اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمہ کفارہ ادا کرنا ہی لازم فرمایا تھا-

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ اَرَهُ يُسَبِّحُ فِي السَّفَرِ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (رواه البخاری)

رہا ہوں میں نے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوافل پڑھتے نہیں دیکھا- اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات ہی میں بہتر نمونہ ہے- (بخاری شریف)

(۱۱۴۶) عَنْ رَجُلٍ اَنَّهُ سَاَلَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَقَالَ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اِنَّا نَجِدُ صَلٰوةَ الْخَوْفِ وَ صَلٰوةَ الْحَضَرِ فِي الْقُرْاٰنِ وَ لَا نَجِدُ صَلٰوةَ السَّفَرِ فَقَالَ يَا ابْنَ اَخِيْ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ اِلَيْنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَا نَعْلَمُ شَيْئًا فَاِنَّمَا نَفْعَلُ كَمَا رَاَيْنَاهُ يَفْعَلُ.

(رواه مالك فى الموطا)

(۱۱۴۶) ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا اے ابو عبدالرحمٰن (ان کی کنیت ہے) قرآن کریم میں ہم کو صلوٰۃ الخوف کا بھی ذکر ملتا ہے اور اقامت کی حالت کا بھی ذکر ملتا ہے مگر سفر کی نماز کا ذکر نہیں ملتا- انہوں نے فرمایا میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے زمانہ میں بھیجا تھا کہ ہم کچھ بھی نہ جانتے تھے بس جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ایسا ہی ہم کر لیتے تھے-

(امام مالک)

(۱۱۴۷) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِيْ سَفَرٍ فَتَخَلَّفْتُ عَنْهُ فَقَالَ اَيْنَ كُنْتَ فَقُلْتُ اَوْ تَرْتُ فَقَالَ اَلَيْسَ لَكَ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ عَلٰى رَاحِلَتِهِ.

(رواه الترمذی و قال حديث حسن صحيح)

(۱۱۴۷) سعید بن یسار کہتے ہیں کہ میں ایک سفر میں ابن عمرؓ کے ساتھ تھا- ایک جگہ میں ان سے ذرا پیچھے رہ گیا- انہوں نے پوچھا کہاں رہ گئے تھے میں نے عرض کی پیچھے اتر کر وتر پڑھنے لگا تھا- اس پر انہوں نے فرمایا کیا تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہتر نمونہ موجود نہ تھا- میں نے آپ کو اپنی سواری ہی پر وتر پڑھتے دیکھا ہے-

(ترمذی شریف)

(۱۱۴۷) * ان تمام واقعات میں صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف عمل کا ذکر کیا ہے اور ہر عمل کی اتباع کرنے کی دعوت اسی بناء پر دی ہے کہ آپ کی ذاتِ بابرکات امت کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' تھی- اس لیے اگر اس میں کچھ ایام میں روزہ جیسی عبادت کا ترک نظر آتا ہے تو پھر وہی سب سے بڑی عبادت ہے اگر کسی نماز کا سواری کے اوپر پڑھنا ثابت ہوتا ہے تو یہی کمال ہے' اگر حالتِ سفر میں پابندی کے ساتھ نوافل نظر نہیں آتے تو نوافل کا اسی طرح ادا کرنا ہی افضل ہے حتیٰ کہ اگر حج و عمرہ جیسی قدیم عبادت کا کسی عذر سے ناتمام چھوڑ دینا منقول ہے تو کسی تردد کے بغیر یہی مستحسن ہے پس صرف عبادات ہی میں آپ کی ذات اُسوہ نہ تھی ترکِ عبادات میں بھی اُسوہ حسنہ تھی مطلب یہ تھا کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ترکِ عبادت ثابت ہے وہاں عبادت کرنا بعض اوقات معصیت تھا- جیسے عیدین کا روزہ- صحابی یہاں اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے اور اس کے لیے سب سے محکم اور آخری دلیل یہی بیان کرتا ہے کہ ان ایام کا روزہ اسوۂ حسنہ میں ہم کو نظر نہیں آتا- اب یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان قرآن کریم کے اس عنوان اور خاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لقب کی کتنی اہمیت تھی-

الرسول العظیم ووجوب الاتباع

بافعاله(صلى الله عليه وسلم) كلها

(۱۱۴۸) اَخْبَرَنِیْ عَطَاءٌ رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ فِیْ اُنَاسٍ مَعَهٗ قَالَ اَهْلَلْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْحَجِّ خَالِصًا لَيْسَ مَعَهٗ عُمْرَةٌ قَالَ عَطَاءٌ رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ قَالَ جَابِرٌ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ فَقَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِی الْحِجَّةِ فَلَمَّا قَدِمْنَا اَمَرَنَا النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَحِلَّ وَ قَالَ اَحِلُّوْا وَ اَصِيْبُوْا مِنَ النِّسَاءِ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ وَ لَمْ يَعْزِمْ عَلَيْهِمْ وَ لٰكِنْ اَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَبَلَغَهٗ اَنَّا نَقُوْلُ لَمَّا لَمْ يَكُنْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ عَرَفَةَ اِلَّا خَمْسٌ اَمَرَنَا اَنْ نَحِلَّ اِلٰی نِسَائِنَا فَنَاْتِیَ عَرَفَةَ تَقْطُرُ مَذَاكِيْرُنَا الْمَنِیَّ قَالَ وَ يَقُوْلُ جَابِرٌ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ بِيَدِهٖ هٰكَذَا وَ حَرَّكَهَا فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ وَ اَصْدَقُكُمْ وَ اَبَرُّكُمْ وَ لَوْ لَا هَدْيِیْ لَحَلَلْتُ كَمَا تَحِلُّوْنَ فَحِلُّوْا فَلَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا اَهْدَيْتُ فَحَلَلْنَا وَ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا.

(رواه البخاری ص ۱۰۹۵ و راجع ترجمان السنة ج ۲ ص ۳۷۷ حدیث نمبر ۸۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہر عمل میں لازم ہے

(۱۱۴۸) عطاء کہتے ہیں میں نے چند اور اشخاص کے ساتھ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ ہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت تھے ہم نے صرف حج کا احرام باندھا تھا اور اس کے ساتھ عمرہ کا احرام نہ باندھا تھا- عطاء ذکر کرتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا ذی الحجہ کی چار تاریخ ہو چکی تھی- چوتھی کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے- جب ہم حاضر ہوئے تو آپؐ نے ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا اور فرمایا احرام سے نکل جاؤ اور عورتوں کے ساتھ صحبت کرو- عطاء کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حکم سے مقصد صرف یہ تھا کہ اب یہ فعل بھی تمہارے لیے حلال ہوگیا ہے کوئی تاکیدی حکم نہ تھا (حج قریب تھا ادھر آپؐ حالت احرام میں تھے اس لیے قبل از وقت حلال ہو جانا ہم کو بہت شاق گذرا) آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچ گئی کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ حج میں تو صرف پانچ دن ہی باقی رہ گئے اور اب آپؐ نے ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا ہے اگر ہم اب حلال ہوں اور عورتوں کے ساتھ صحبت کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب پھر دوسرا احرام باندھ کر عرفہ میں اس طرح حاضر ہوں گویا اب صحبت سے فارغ ہوکر آ رہے ہیں- عطاء کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طبعی کراہت کا اپنے ہاتھ سے نقشہ کھینچ کر بھی بتایا- یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا- تم سب جانتے ہو کہ سب میں زیادہ متقی، سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر نیک عمل کرنے والا میں ہوں- اگر میرے ساتھ ہدی کے جانور موجود نہ ہوتے تو جس طرح تم حلال ہوئے ہو میں بھی حلال ہو جاتا کاش اگر مجھ کو آغاز سفر میں اس انجام کی خبر ہوتی تو میں اپنے ساتھ قربانی کے جانور ہی نہ لاتا- آپؐ کا خطبہ سن کر ہم سب نے آپؐ کے فرمان کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا اور سب حلال ہو گئے- (بخاری شریف) یہی روایت مختصر صورت سے ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۷۷ میں گذر چکی ہے-

(۱۱۴۹) عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّهُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ اُمِّ الْحَكَمِ يَخْطُبُ قَاعِدًا فَقَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰى هٰذَا الْخَبِيْثِ يَخْطُبُ قَاعِدًا وَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ اِذَا رَءَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَانِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَائِمًا. (رواہ مسلم)

(۱۱۴۹) کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت عبدالرحمٰن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا - انہوں نے فرمایا ذرا اس خبیث کو دیکھو تو (کیسا) بیٹھا بیٹھا خطبہ دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے وَاِذَا رَءَوْا تِجَارَةً الخ یعنی جب کسی تجارت کو یا کسی کھیل تماشہ کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں - (مسلم شریف)

(۱۱۵۰) عَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ اَنَّهُ رَاٰى بِشْرَ بْنَ مَرْوَانَ عَلَى الْمِنْبَرِ رَافِعًا يَدَيْهِ فَقَالَ قَبَّحَ اللّٰهُ هَاتَيْنِ الْيَدَيْنِ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَزِيْدُ عَلٰى اَنْ يَّقُوْلَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا وَ اَشَارَ بِاَصْبَعِهِ الْمُسَبِّحَةِ. (رواہ مسلم)

(۱۱۵۰) عمارہ بن رویبہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ وہ منبر پر خطبہ میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں - یہ دیکھ کر انہوں نے فرمایا خدا تعالیٰ ان دو ہاتھوں کا ناس کرے - کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی صرف شہادت کی انگلی اٹھاتے تھے اس کو عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا - (مسلم شریف)

(۱۱۵۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا اسْتَوٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱۱۵۱) جابر سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۱۴۹) * شیخ جلال الدینؒ نے تفسیر اتقان میں اس پر روایت پیش کی ہے کہ پہلے جمعہ کے دن خطبہ نماز کے بعد ہوا کرتا تھا - یہ بات اسی زمانہ کی ہے - وہ عسرت اور تنگی کا زمانہ تھا جب لوگ نماز ادا کر لیتے تو اب صرف ایک خطبہ رہ جاتا جس کی حیثیت بھی ابتداءً صرف ایک تقریر و وعظ کی سی سمجھی گئی تھی ایک بار ایسا ہوا کہ باہر سے کوئی قافلہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر آیا سامعین فطرۃً ادھر اٹھ کر چل دیئے - یہ حرکت ناپسند ہوئی اور اس کے بعد ہی خطبہ کو مقدم کر دیا گیا - قرآن کریم نہایت مؤثر انداز میں اسی کا شکوہ کر رہا ہے اور لوگوں میں بڑی سے بڑی ضرورت میں بھی آخرت ہی کی طرف متوجہ رہنے کی خو پیدا کرنا چاہتا ہے - کعب بن عجرۃ جب مسجد میں تشریف لے گئے تو عبدالرحمٰن کو دیکھا کہ سنت کے خلاف بیٹھے بیٹھے خطبہ دے رہے ہیں آخر ضبط نہ کر سکے اور ان کی اس زشت اعمالی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر حرکت دیکھ کر یہ کلمات کہنے پر بے اختیار مجبور ہو گئے -

(۱۱۵۰) * بشر بن مروان حاکم وقت ہے لیکن ایک صحابی سے سنت کے خلاف اس کو دونوں ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا - اب یہاں اندازہ فرمایئے کہ مخالفت کتنی سی بات میں تھی اور ان کے غصہ کا عالم کیا تھا - حقیقت یہ ہے کہ جن کے سامنے اتباع سنت کی بحث تھی ان کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ اس مسئلہ کی حیثیت فرض کی ہے یا مستحب کی - اس اشارہ میں علماء کا اختلاف ہے - کس غرض سے ہوتا تھا - کسی نے سمجھا ہے کہ دعاء کے لیے تھا اور کسی کا ذہن اس طرف بھی گیا ہے کہ تفہیم کے لیے تھا -

(۱۱۵۱) * واضح رہنا چاہیے کہ اتباع رسول ایمان بالرسول کی روح ہے اس باب کی اہمیت حسب ذیل آیت سے ظاہر ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ — ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لٰلہ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ اِجْلِسُوْا فَسَمِعَ ذٰلِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَجَلَسَ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ فَرَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ تَعَالٰى يَا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ. (رواہ مسلم)

خطبہ کے لیے منبر پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے تو لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا- سب بیٹھ جائیں- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مسجد کے دروازہ پر سنا اور فوراً وہیں بیٹھ گئے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور فرمایا عبداللہ بن مسعود! آ گے آ جاؤ- (مسلم شریف)

(۱۱۵۲) حَدَّثَنَا اَبُوْحَازِمٍ اَنَّ رِجَالًا اَتَوْا سَهْلَ

(۱۱۵۲) ابو حازم بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان آپؐ کے منبر کی

ﷺ ..... يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ. (آل عمران : ۳۱)

تم کو میری پیروی کرنی چاہیے (اگر تم نے ایسا کیا) تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا-

اس بات کو خود قرآن کریم نے قائم کیا ہے اور اپنی محبت کا اسی کو معیار مقرر فرمایا ہے انسان کی یہ بڑی خودسری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا تو دم بھرتا ہے مگر کسی دوسرے انسان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے کتراتا ہیں حضرت آدم علیہ السلام کی سرگذشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے سر جھکانے سے تو شیطان کو بھی انحراف نہ تھا لیکن جب انسان کے سامنے سر جھکانے کا وقت آیا تو حکم ربانی کے باوجود انحراف ہی انحراف تھا یہود و نصاریٰ کا حال بھی یہی تھا وہ بھی نحن ابناء الله و احباء ه کی لن ترانیاں گایا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے انگلی رکھ کر بتا دیا کہ میری محبت کا معیار یہ ہیں جو ان کی اتباع نہیں کرتا وہ میری محبت میں جھوٹا ہے پھر عجیب بات ہے کہ آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بجائے اتباع کا لفظ رکھا گیا ہے معلوم ہوا کہ جس طرح آپ کی اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ غلط ہے اسی طرح آپ کی اتباع کے بغیر آپ کی محبت کا دعویٰ بھی غلط ہے- یہ اتباع ''اسوۂ حسنہ'' کے لوازم میں سے ہے- جب آپ نمونہ ہیں تو پھر نمونہ کی اتباع کیوں نہ ہو پھر جب نمونہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے تو جو اس نمونہ کی نقل اتارے وہ اس کی نظر میں پسندیدہ کیوں نہ ہو اس لیے فرمایا کہ آپ ہمارا محبوب نمونہ ہیں اس لیے جو آپ کی اتباع کرے گا وہ بھی ہماری نظر میں محبوب بن جائے گا پھر جتنا وہ ہمارے نمونہ سے ملتا جلتا چلا جائے گا اتنا ہی شانِ محبوبیت میں بھی اونچا ہوتا چلا جائے گا- العیاذ باللہ اگر کہیں رسول معصوم نہ ہوتے تو کیا اسی اطلاق کے ساتھ ان کے اتباع کا حکم دیا جا سکتا تھا- حدیث مذکور میں آپ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شانِ اتباع ملاحظہ کی کہ انہوں نے آپ کی زبان سے ''بیٹھ جاؤ'' کا کلمہ جس جگہ سنا بس اسی جگہ بیٹھ گئے اور ایک قدم آگے نہ اٹھا سکے حالانکہ خطاب سامنے کے حاضرین کو تھا نہ ان کو جو ابھی مسجد کے دروازہ میں ہیں اور خطبہ سننے کے لیے آ رہے ہیں مگر یہاں جذبہ اتباع نے میں سیکھ نکالنے کی مہلت نہ دی جہاں آپ کی آواز کان میں پڑی وہیں بیٹھ گئے- (مسلم شریف)

(۱۱۵۲) * حدیث مذکور میں اتباع کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نماز جیسی چیز کو آج منبر پر صرف اس لیے ادا کیا جا رہا ہے کہ مقتدیوں کا ہر ہر فرد آپ کی نماز کو بچشم خود ملاحظہ کر لے اور پھر مو بہ مو اس کی نقل کرنے کی سعی کر لے- حالانکہ جو لوگ پنجوقتہ آپ ہی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ان کو ایک حد تک آپ کی نماز کا مشاہدہ حاصل ہی تھا مگر نہ معلوم آپ کی اتباع کی نظر ربوبیت میں اہمیت کتنی تھی کہ آپ نے یہ بھی پسند نہ فرمایا کہ صف اول و ثانی کے فرق سے آپ کے ارکانِ صلوٰۃ کے مشاہدہ میں جو فرق آ سکتا ہے وہ بھی باقی رہے' اس لیے اس کا یہ اہتمام فرمایا کہ بیک وقت آپ کی نماز کا جتنا حصہ زیادہ سے زیادہ مشاہدہ میں آ سکتا ہے وہ بلاواسطہ سب کے ہی ﷺ .....

بْنِ سَاعِدِ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَ قَدِ امْتَرَوْا فِي الْمِنْبَرِ مِمَّ عُوْدُهُ فَسَأَلُوْهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ وَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ مِمَّا هُوَ وَ لَقَدْ رَأَيْتُهُ اَوَّلَ يَوْمٍ وُضِعَ وَ اَوَّلَ يَوْمٍ جَلَسَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى فُلَانَةَ امْرَءَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ قَدْ سَمَّاهَا سَهْلٌ مُرِيْ غُلَامَكِ النَّجَّارَ اَنْ يَعْمَلَ لِيْ اَعْوَادًا اَجْلِسُ عَلَيْهِنَّ اِذَا كَلَّمْتُ النَّاسَ فَاَمَرَتْهُ فَعَمِلَهَا مِنْ طَرْفَاءِ الْغَابَةِ ثُمَّ جَاءَ بِهَا فَاَرْسَلَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَبِهَا فَوُضِعَتْ هٰهُنَا ثُمَّ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلَيْهَا وَ كَبَّرَ وَ هُوَ عَلَيْهَا ثُمَّ نَزَلَ الْقَهْقَرٰى فَسَجَدَ فِيْ اَصْلِ الْمِنْبَرِ ثُمَّ عَادَ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَاْتَمُّوْا بِيْ وَ لِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِيْ۔

(رواه البخاري في باب الخطبة على المنبر)

لکڑی کے متعلق کچھ اختلاف ہوا وہ کس لکڑی کا تھا- اس لیے وہ سہل بن ساعد کے پاس آئے اور ان سے اس کی تحقیق کرنی چاہی- انہوں نے فرمایا بخدا میں خوب جانتا ہوں منبر کس لکڑی کا تھا- میں نے تو اس کو اس دن دیکھا تھا جب کہ وہ پہلے پہل رکھا گیا تھا اور جب کہ آپ اس پر سب سے پہلے رونق افروز ہوئے تھے- بات یوں ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری شخص کی بی بی کے پاس یہ کہلا کر بھیجا تھا (جن کا نام بھی سہل نے بیان کیا تھا) کہ اپنے غلام سے جو نجاری کا کام جانتا ہے کہہ دو کہ جب میں لوگوں کے سامنے خطبہ دینا چاہوں تو میرے بیٹھنے کے لیے وہ لکڑیوں کا ایک منبر بنا دے- انہوں نے اسی وقت اپنے غلام کو حکم دیا- اس نے مقام غابہ کے جھاؤ کے درخت کا منبر تیار کر کے حاضر کر دیا- ان بی بی صاحبہ نے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا- پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق وہ وہاں رکھ دیا گیا (یعنی جو منبر کی جگہ تھی) اس کے بعد پھر ایک موقعہ پر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر نماز ادا فرمائی اس طرح پر کہ جب تکبیر کہی تو آپ اس کے اوپر ہی تھے' پھر جب سجدہ کا وقت آیا تو پچھلے پیروں اتر گئے اور اتر کر منبر کی جڑ میں سجدہ کیا پھر لوٹ کر منبر پر تشریف لے گئے جب نماز سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا- لوگو! دیکھو (آج) میں نے اس طرح نماز اتر کر اور چڑھ کر اس لیے ادا کی ہے تا کہ تم سب کے سب دیکھ کر میری نماز سیکھ سکو اور دیکھ کر میری اقتدا کر سکو-

(بخاری شریف)

؎ ..... مشاہدہ میں آ جائے- پھر نماز سے فارغ ہو کر آپ کے اس ارشاد سے کہ آج میں نے منبر پر نماز اس لیے ادا کی ہے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا آج کا عمل نماز کی مستقل سنت نہ تھا- اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر عمل قابل اتباع تھا حتیٰ کہ اگر کہیں آپ یہ تنبیہ نہ فرما دیتے تو اس طرح نماز ادا کرنے کو بھی ایک سنت سمجھا جا سکتا تھا- تعجب ہے کہ اپنے جس عمل کی وجہ آپ نے خود بیان فرما دی ہو اس پر آئندہ بحثوں کی ضرورت ہی کیا تھی یہ عمل قلیل تھا یا فعل کثیر مگر بہر حال نہ آپ کے سواء کوئی ایسا ہے جس کی ایک ایک امت کے سامنے آنے کی ضرورت ہو اور اس لیے نہ آئندہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ منبر پر اس طرح نماز ادا کر سکے اس لیے اس عمل کو عہد رسالت پر ہی ختم کر دینا چاہیے-

الرسولُ العظیم و اباء ہ علی من تنزہ عن الاتباع بافعالہ بایّ تأویل کان

(۱۱۵۳) عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ جَاءَ ثَلٰثَۃُ رَھْطٍ اِلٰی اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِھَا کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا فَقَالُوْا اَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَ مَا تَاَخَّرَ فَقَالَ اَحَدُھُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَ قَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّھَارَ اَبَدًا وَ لَا اُفْطِرُ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَاءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْھِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَ کَذَا اَمَا وَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَ اَتْقَاکُمْ لَہٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَ اُفْطِرُ اُصَلِّیْ وَ اَرْقُدُ وَ اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ. (متفق علیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل میں اتباع کرنے میں پس وپیش کرنا آپ کے غصہ کا موجب ہے

(۱۱۵۳) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ تین شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ طیبات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوئے- جب ان سے اس کی تفصیل بیان کی گئی تو ایسا انداز ہوا گویا وہ اپنے حق میں اس کو کم سمجھے- انہوں نے کہا بھلا ہمارا حال خستہ کہاں اور آپ کی شانِ رفیع کہاں آپ کے تو گزشتہ اور آئندہ سب معاملات کی مغفرت ہوچکی ہے- اس لیے ان میں ایک بولا میں تو ہمیشہ تمام شب نماز پڑھا کروں گا- دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا- تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا- اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں- سن لو! تم سب میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں اور تم سب سے بڑھ کر متقی میں ہوں- میں تو روزہ بھی رکھوں گا اور افطار بھی کروں گا، شب میں نماز بھی پڑھوں گا اور سوؤں گا بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کروں گا- اب جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا جو مجھ سے نہ ہوگا- (متفق علیہ)

(۱۱۵۳) * مذکورۂ بالا حدیث پر غور فرمائیے کہ صحابہ کرام نے یہ کلمات فرمائے کیوں؟ صرف آپ کی شان کی برتری اور اپنے احساس کمتری کی بناء پر- مگر اس پر بھی ان کو تنبیہ کی گئی- بات یہ تھی کہ جس طرح جذبات کے دباؤ میں انسان کو بعض اہم گوشوں سے ذہول ہو جایا کرتا ہے' اسی طرح ان کو بھی یہاں ذرا سا ذہول ہو گیا اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی تعلیم امت ہے- اس لیے جب تک وہ خود تصریح نہ فرما دیں ان کے کسی عمل کو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص سمجھ لینا خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت تاویل کے ساتھ کیوں نہ ہو مستحسن نہیں ہے- نبی کا حق یہ ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور اتباع کی حقیقت قدم بہ قدم چلنا ہے یہاں جس طرح ایک قدم اگر پیچھے رہ گیا تو اتباع نہیں رہی اسی طرح اگر ایک قدم آگے بڑھ گیا تو بھی اتباع نہ رہی اس لیے صرف کثرتِ عبادت کچھ کمال نہیں نبی وقت میں دو صفتیں اپنی تمام امت سے کامل ہوتی ہیں علم باللہ اور تقویٰ- پھر ان صفات میں ان کا رتبہ خود قیاس کرلو جن کا دامن قیامت کے انسانوں تک پھیلا ہوا ہے پھر ان کے کسی عمل کو بھی اپنے لیے باعث کمال نہ سمجھنا کس قدر بڑا نقص ہوگا- عملی کوتاہی کے صرف دو سبب ہوتے ہیں یا علمی نقصان یہ جذبہ عمل کا فقدان- جہاں یہ دونوں سبب موجود ہوں وہاں کسی عمل کے متعلق بھی یہ تصور کرنا کہ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے حق میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ نہ ہوگا' یہ بڑی کوتاہی ہے-

(۱۱۵۴) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا تَرَخَّصَ فِيْهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَهُ ذٰلِكَ فَخَطَبَهُ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْءِ اَصْنَعُهُ فَوَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَ اَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً.

(اخرجه الشيخان)

(۱۱۵۴) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کوئی ایسا کام کیا جس میں آپ نے رخصت پر عمل فرمایا (یعنی دین کا وہ پہلو جو دوسرے پہلو کی نسبت آسان ہو) بعض لوگوں نے اس کی اتباع کرنے سے کنارہ کشی کی یہ بات آپ کو بھی پہنچ گئی اس پر آپ نے تقریر فرمائی اور خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسی بات کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں جو خود میں کرتا ہوں- خدا کی قسم ان سب میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں اور ان سب سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں- (شیخین)

(۱۱۵۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ وَاقِفٌ عَلَى الْبَابِ وَ اَنَا اَسْمَعُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُصْبِحُ جُنُبًا وَ اَنَا اُرِيْدُ الصِّيَامَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا اُصْبِحُ جُنُبًا وَ اَنَا اُرِيْدُ الصِّيَامَ فَاَغْتَسِلُ وَ اَصُوْمُ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ لَسْتَ مِثْلَنَا قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ قَالَ وَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَ اَعْلَمُكُمْ بِمَا اَتَّقِيْ. (رواه مالك)

(۱۱۵۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے اس وقت ایک شخص نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھا اور میں سن رہی تھی یا رسول اللہ اگر صبح کو میں ناپاک اٹھوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہو تو کیا میں جنابت کی حالت میں روزہ کی نیت کرسکتا ہوں آپ نے جواب دیا اگر صبح کو میں جنابت کی حالت میں ہوتا ہوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا ہے تو میں پہلے غسل کرتا ہوں پھر اس کے بعد روزہ کی نیت کر لیتا ہوں اور بس- اس پر وہ شخص بولا- بھلا آپ کی شانِ عالی کہاں آپؐ کے تو اگلے پچھلے سب معاملات بخشے جا چکے ہیں- اس کا یہ کہنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ تقویٰ کی راہ کا علم رکھنے والا ہوں گا- (مالک)

(۱۱۵۶) عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا قَبَّلَ

(۱۱۵۶) عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے روزہ کی حالت

(۱۱۵۶) * اس روایت کے مختلف سیاق میں آپ کی زبان مبارک سے "انا اعلمکم" کا لفظ نکلا ہے- مگر جب یہی لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا تو گرفت میں آ گیا تھا اس لیے سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ کسی معمولی فروگذاشت پر گرفت کا معاملہ مالک کی مرضی پر دائر ہوتا ہے اگر وہ چاہے تو درگذر فرمادے اگر چاہے تو اس پر گرفت فرمائے- مگر یہاں کچھ اور فرق بھی ہے ایک تو یہ کہ ان تمام مقامات پر آپ نے اپنے نفس کو مطلقاً اعلم نہیں فرمایا بلکہ کہیں "اعلم باللہ" کہیں "اعلم بحدودہ" اور کہیں "اعلم بما اتقی" لِلّٰہ .....

اِمْرَءَتَهٗ وَ هُوَ صَائِمٌ فِیْ رَمَضَانَ فَوَجَدَ مِنْ ذٰلِکَ وَجْدًا شَدِیْدًا فَاَرْسَلَ امْرَاَتَهٗ تَسْئَلُ لَهٗ عَنْ ذٰلِکَ فَدَخَلَتْ عَلٰی اُمِّ سَلِمَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَتْ ذٰلِکَ لَهَا فَاَخْبَرَتْهَا اُمُّ سَلِمَةَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُ وَ هُوَ صَائِمٌ فَرَجَعَتْ اِلٰی زَوْجِهَا فَاَخْبَرَتْهُ فَزَادَهٗ ذٰلِکَ شَرًّا وَ قَالَ لَسْنَا مِثْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُ یُحِلُّ لِرَسُوْلِهٖ مَا یَشَاءُ ثُمَّ رَجَعَتْ امْرَاَتُهٗ اِلٰی اُمِّ سَلِمَةَ فَوَجَدَتْ عِنْدَهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا لِهٰذِهِ الْمَرْاَةِ فَاَخْبَرَتْهُ اُمُّ سَلِمَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلَا اَخْبَرْتِیْهَا اَنِّیْ اَفْعَلُ ذٰلِکَ

میں اپنی بی بی کا بوسہ لے لیا پھر اس حرکت پر اس کو سخت غم ہوا۔ اس نے مسئلہ دریافت کرنے کے لیے اپنی بی بی کو بھیجا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سب واقعہ ان سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کر لیتے تھے۔ انہوں نے لوٹ کر یہ جواب اپنے شوہر کو سنا دیا۔ اس پر ان کا غم اور دونا ہو گیا وہ بولے ہم بھلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کہاں ہیں (کہ آپ کی نقل کر سکیں) اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے۔ ان کی بی بی پھر ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس مرتبہ وہ آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں رونق افروز تھے۔ آپ نے پوچھا یہ عورت کیسے آئی ہیں؟ حضرت ام سلمہؓ نے ان کا واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا تم نے اس سے کہہ دیا ہوتا کہ میں بھی ایسا کر لیتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی۔ میں نے کہہ تو دیا تھا مگر جب انہوں نے اپنے شوہر کو جا کر اس کی اطلاع دی تو ان کو اور زیادہ غم

ﷺ ..... کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہ تمام الفاظ مقید تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو کلمات نکلے اگرچہ بے شبہ مقصد ان کا بھی یہی تھا مگر ان کے لفظوں میں پھر اطلاق تھا دوم یہ کہ آپ کے ان الفاظ کا اصل مقصد اپنا اظہار علم نہ تھا بلکہ ہر امر میں اپنی اتباع کی تاکید فرمانا تھی۔ ہاں اس کی دلیل میں آپ نے اپنی اعلمیت ضرور بیان فرمائی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہی یہ کیا گیا تھا "ای الناس اعلم" یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ علم کس کو ہے اس پر موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو لفاظ نکلا وہ یہ تھا "انا اعلم" میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے "فعتب اللہ عزوجل علیہ اذ لم یرد العلم الیہ فاوحی اللہ الیہ ان عبدا من عبادی بجمع البحرین ھوا علم منک" یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عتاب ہوا کہ انہوں نے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالہ کیوں نہیں کیا اور ان پر یہ وحی آئی کہ مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں ایک بندہ ایسا ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم کی صفت اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں سے ایک بڑی صفت ہے اس میں کسی درجہ کی بھی کسی کو شرکت حاصل نہیں ہو سکتی ہاں صرف اتنی جتنی کہ خود مشیت الٰہیہ کسی کے حق میں مقدر فرما دے۔ اس لیے یہاں لفظی اطلاقات اور غیر ارادی عموم پر بھی گرفت کر لی جاتی ہے مگر یہ گرفت ہوتی ہے ان ہی کے ساتھ جن کی شان سے اتنی سی فروگذاشت بھی بعید سمجھی جائے۔ بہر حال ان دو مقامات میں جس طرح خود نفس کلمات میں بھی اطلاق وتقیید کا فرق ہے اسی طرح سیاق وسباق کے لحاظ سے مقاصد میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔

ہم نے یہاں ان سب واقعات کو وقت کی فرصت کے لحاظ سے ایک جگہ جمع کر دیا ہیں جہاں صحابہ کرام کی جانب سے آپ کے کسی عمل میں اتباع کرنے سے ذرا سا بھی پس وپیش ہوا ہے اور آپ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے۔ ان تمام واقعات کو بیک نظر پیش ﷺ .....

فَقَالَتْ قَدْ اَخْبَرْتُهَا فَذَهَبَتْ اِلٰى زَوْجِهَا فَاَخْبَرَتْهُ فَزَادَهُ ذٰلِكَ شَرًّا وَ قَالَ لَسْنَا مِثْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ يُحِلُّ اللّٰهُ لِرَسُوْلِهٖ مَاشَاءَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ قَالَ وَ اللّٰهِ اِنِّىْ لَاَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ وَ اَعْلَمُكُمْ بِحُدُوْدِهٖ. (رواہ مالک)

ہوا اور انہوں نے یہ کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کہاں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ رکھتا ہوں اور اس کے حلال وحرام کی حدود کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ (مالک)

(۱۱۵۷) عَنْ جَابِرٍ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰى مَكَّةَ فِىْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهُ حَتّٰى نَظَرَ النَّاسُ اِلَيْهِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِيْلَ لَهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ اُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ اُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ. (رواہ مسلم)

(۱۱۵۷) جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال جس میں کہ مکہ مکرمہ فتح ہوا رمضان المبارک میں سفر کے لیے نکلے اور آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھا لیا۔ جب مقام "کراغ الغمیم" پر پہنچے تو آپ نے ایک پیالہ میں پانی منگایا اور اپنے ہاتھ میں اس کو اتنا اونچا اٹھایا کہ سب لوگوں نے دیکھ لیا' اس کے بعد (افطار کرنے کی غرض سے) اس کو پی لیا' اس کے بعد آپ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ بعض لوگ تو اب بھی روزہ دار ہیں اس پر آپؐ نے فرمایا یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں' یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ (مسلم شریف)

بقیہ ..... نظر رکھیے اور پھر یہ فیصلہ فرمالیجئے کہ جہاں والعیاذ باللہ کسی ادنیٰ سی معصیت کا بھی امکان ہو ان کی زبانِ مبارک سے کیا انداز خطاب یہی ہونا چاہیے۔ پھر کسی ایک مقام پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک اس احتراز و تنزہ کا سبب آپ کے عمل میں اس قسم کے امکان کا کوئی احتمال تھا حاشا وکلا اس روایت میں صاف تصریح موجود ہے۔ "اللہ یحل لرسول مایشاء" یعنی آپ کا عمل اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خاص آپ کے حق میں حلال ہو۔ اس کے علاوہ ان کے دماغوں میں کوئی دوسرا تصور نہ تھا۔ پھر جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور ان کے صحابہ کی جانب سے یہ احتمال نہیں نکالا گیا تو کیا یہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان کا محل ہی نہیں ہوتی۔

(۱۱۵۷) * اب غور فرمائیے کہ یہاں معاملہ ایک عبادت یعنی روزہ کا تھا اور روزہ بھی رمضان کا' پھر اگر لوگوں نے اس کو نہ توڑا تو کیا وہ شاباش کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ آپ کے اس علی الاعلان عمل کے بعد بھی روزہ نہ توڑنا یہ آپ کی اتباع میں کوتاہی تھی اس لیے اب وہی اہم عبادت معصیت بن گئی معلوم ہوا کہ رسول کی ہستی وہ ہے کہ اگر وہ عبادت کرے تو جس طرح عبادت میں اس کی اتباع کرنا عبادت ہے اسی طرح اگر وہ عبادت شروع کرکے توڑ دے تو پھر اس کا توڑ دینا یہی عبادت ہے۔ گویا عبادت کی حقیقت کیا ہے؟ اتباع رسول اور معصیت کی حقیقت کیا ہے؟ رسول کی نافرمانی۔ اسی لیے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اطاعت پر جتنا زور دیا ہے ان کی معصیت سے ممانعت پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے۔ گویا جس طرح اطاعت ایزدی اور رسول کے کسی فعل میں بھی معصیت ہونے کا احتمال ہو والعیاذ باللہ تو ان کی ہر خلاف ورزی کو معصیت کیسے کہا جاسکتا ہے اور ان کی نافرمانی سے علی الاطلاق ممانعت کیسے درست ہے۔ بقیہ .....

الرسول العظيم و كون تقريره صلى الله عليه وسلم حجة قاطعة فى الدين

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر خاموشی بھی شریعت میں اس کے جواز کی قطعی دلیل ہے

(۱۱۵۸) عَنُ اِبُنِ عَبَّاسٍ اَنَّ اُمَّ حُفَيُدٍ بِنُتَ الُحَارِثِ بُنِ حَرُبٍ اَهُدَتُ اِلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ سَمُنًا وَ اَقِطًا وَ اَضُبًّا فَدَعَا بِهِنَّ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ فَأُكِلُنَ عَلٰى مَائِدَتِهٖ فَتَرَكَهُنَّ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ كَالُمُتَقَذِّرِلَهٗ وَ لَوُ كُنَّ حَرَامًا مَا اُكِلُنَ عَلٰى مَائِدَتِهٖ وَ لَا اَمَرَ بِاَكُلِهِنَّ. (رواه البخارى)

(۱۱۵۸) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ام حفیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑا سا گھی، کچھ پنیر اور چند گوہ (ایک جانور ہوتا ہے) بطور ہدیہ پیش کیں آپ نے ان کو منگوایا اور آپ کے دسترخوان پر دوسرے لوگوں نے ان کو کھایا لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرح نفرت سے چھوڑ دیا جیسے گھن کی چیز چھوڑی جاتی ہے اور ان کے کھانے کے لیے بھی کسی کو نہ فرمایا - اگر گوہ حرام ہوتی تو آپ کے دسترخواں پر لوگوں کے کھانے میں نہ آسکتی - (بخاری شریف)

(۱۱۵۹) عَنُ جَابِرٍ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنُهُ قَالَ

(۱۱۵۹) جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور اس وقت قرآن

﴿ ..... وَمَنُ يَّعُصِ اللّٰهَ وَ رَسُوُلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوُدَهٗ يُدُخِلُهُ نَارًا خَالِدًا فِيُهَا وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيُنٌ. (النساء:١٤)

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر نکل گیا تو وہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا اور ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا -

يَوُمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيُنَ كَفَرُوُا وَ عَصَوُا الرَّسُوُلَ لَوُ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرُضُ وَ لَا يَكُتُمُوُنَ اللّٰهَ حَدِيُثًا. (النساء:٤٢)

اس دن وہ (حسرت و ندامت سے) تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے -

وَ مَنُ يَّعُصِ اللّٰهَ وَ رَسُوُلَهٗ فَقَدُ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيُنًا. (الاحزاب:٣٦)

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں جا پڑا -

(۱۱۵۸) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امر و نہی کا رتبہ تو بہت بلند ہے - جو چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے اور اس پر آپ سکوت فرما لیں تو آپ کا یہ سکوت بھی جواز کی قطعی حجت سمجھا جاتا ہے - کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ آپ کے سامنے کوئی ناجائز فعل ہو اور آپ اس پر سکوت اختیار فرمائیں - اب اندازہ فرمائیے کہ دین کے باب میں کسی ناجائز بات پر جہاں سکوت کا امکان بھی نہ ہو وہاں خود کسی معصیت کے ارتکاب کرنے کا بھلا کیا امکان ہوسکتا ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت کا ایک اہم سبق یہی ہے - تفصیل پہلے گذر چکی ہے -

(۱۱۵۹) * صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس استدلال کا حاصل یہی ہے کہ اگر یہ بات نادرست ہوتی تو اس کے علم میں آجانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کیسے سکوت فرما سکتے تھے پس جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق دین کے باب میں حجت تھا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت بھی حجت تھا بلکہ اس سے زیادہ سکوت و نطق کی ایک ایک ادا بھی دین میں حجت سمجھی جاتی تھی -

كُنَّا نَعْزِلُ وَ الْقُرْاٰنُ يَنْزِلُ (متفق عليه) و زاد مسلم فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا.

نازل ہو رہا تھا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں یہ بات اور زیادہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اس عمل کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔ (عزل کا مطلب یہ ہے کہ انزال کے وقت عضو باہر کر لیا جائے تا کہ عورت حاملہ نہ ہو)

(۱۱۶۰) عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَ عِنْدِيْ جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِي الْاَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ قَالَتْ وَ لَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَبِمَزَامِيْرِ الشَّيْطَانِ فِيْ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ ذٰلِكَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَابَكْرٍ اِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَ هٰذَا عِيْدُنَا. رواه البخاري و في رواية عنده فَاضْطَجَعَ (رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) عَلَى الْفِرَاشِ وَ حَوَّلَ وَجْهَهٗ و في رواية عنده وَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَابَكْرٍ.

(۱۱۶۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ والد بزرگوار ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور اس وقت میرے گھر میں قبیلہ انصار کی دو لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو انصار نے جنگ بعاث کے موقعہ پر حسب دستور فخریہ طور پر کہے تھے۔ یہ لڑکیاں ڈونیاں نہ تھیں (یعنی پیشہ ور گانے والی نہ تھیں) صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے از راہ سرزنش فرمایا یہ شیطانی آوازیں اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں۔ یہ قصہ عید کے دن کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکر! ہر قوم عید مناتی ہے اور یہ ہمارے عید منانے کا دن ہے (بخاری شریف) دوسری روایت میں یہ اضافہ اور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر اس طرف سے اپنا چہرۂ مبارک پھیر لیا تھا۔ ایک روایت میں اس طرح سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑے سے اپنا چہرۂ مبارک ڈھانکے ہوئے تھے۔ ان لڑکیوں کو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھڑکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رخ انور سے کپڑا اتار کر فرمایا۔ ابوبکر! رہنے دو (یہ عید کا دن ہے)

(۱۱۶۰) * روایت مذکورہ میں دو لڑکیوں کے اشعار پڑھنے کا تذکرہ ضرور ہے مگر وہ لڑکیاں جو نہ گانے سے واقف تھیں اور نہ یہ پیشہ کرتی تھیں' اشعار بھی وہ جو جنگی ترانہ کے تھے اور دن بھی عید کا دن جس میں خوشی منانا عام عادت تھی' ادھر زمانہ وہ تھا جو تقدس و پاکیزگی کا سب سے زرین دور تھا اتنی قیود کے بعد بھی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظروں میں اس کی حقیقت کیا تھی۔ یہ کہ وہ مزامیر شیطان ہے اور یہ کہ آپؐ کے گھر میں وہ اور زیادہ مکروہ ہے۔ یہ فہم ابوبکرؓ میں کہاں سے پیدا ہوئی تھی اس کا خود اندازہ فرما لیجئے۔ ابوبکرؓ نے ان کو جھڑکا اور ان کو جھڑکنا لائق تر تھا مگر کیا ابوبکرؓ کے فرمان یا ممانعت کرنے سے شریعت بن سکتی تھی لہٰذا اگر بطور (مسئلہ نہ سہی تو بطورِ مصلحت سہی جو کچھ انہوں نے کیا وہ مناسب کیا مگر یہاں صورت حال کیا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ضرور ہیں مگر اس جانب سے اپنا رخ بدلے ہوئے ہیں کپڑا منہ پر ڈھکا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ گویا عالم خواب میں ہیں یا بیدار ہیں تو اس طرف ذرہ برابر کوئی التفات نہیں ہے اب اگر آپؐ منہ کھول لیتے تو ایک حد تک اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی شرکت ثابت ہوتی اور اگر صریح منع فرما دیتے تو چند گھر کی بچیوں کا خوشی اور عید کے مواقع میں جنگی اشعار پڑھنا بھی حرام کی فہرست میں آ جاتا۔ اس لیے منہ بھی نہیں کھولتے اور زبان بھی بند رکھتے لٰلہ .....

(۱۱۶۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ غُلَامٌ وَعَنْ يَسَارِهِ الْاَشْيَاخُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ اِنْ اَذِنْتَ لِيْ اَعْطَيْتُ هٰؤُلَاءِ فَقَالَ مَا كُنْتُ لِاُوْثِرَ بِنَصِيْبِيْ مِنْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَدًا فَتَلَّهٗ فِيْ يَدِهٖ.

(رواه البخاری)

(۱۱۶۱) سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پانی پیش کیا گیا آپ نے اس کو پیا اس وقت آپ کے دائیں جانب ایک نوجوان اور بائیں جانب معمر اور سن رسیدہ اصحاب موجود تھے آپ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا - اجازت دو تو میں بقیہ پانی ان لوگوں کو دے دوں - وہ بولے یا رسول اللہ آپ کے جھوٹے پانی میں قدرت نے جو میرا حصہ لگا دیا ہے میں کسی کے لیے بھی اس میں سخاوت نہیں کر سکتا - اس پر آپؐ نے ناگواری سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پانی ان کے ہاتھ پر رکھ دیا - (بخاری)

الرسول ان لم یکن معصومًا فکیف یا منه اللّٰه علی اھل الارض

رسول اگر معلوم نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ تمام روئے زمین کے حق میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے

(۱۱۶۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمَ حُنَيْنٍ اٰثَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۱۶۲) عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جنگ حنین کے موقعہ پر جب مال تقسیم کرنے کی نوبت آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقرع بن حابس

لله ...... ہیں - یہ شان شارع کی ہے جن کے نطق و سکوت تو کیا ذرا سی شرکت اور ادنیٰ سے اغماض سے بھی مسائل بن جاتے تھے -
اب آپ رسول کی عصمت اور اس کی عظمت شان کا اندازہ فرما لیجئے اگر ان میں معصیت کا ادنیٰ سا بھی شائبہ موجود ہو تو کیا ان کے طبعی رجحانات اور صرف سکوت و اغماض شریعت بن سکتے ہیں -

(۱۱۶۱) ✻ جذبات وہ بھی نوعمری کے ایک متحمل سے متحمل انسان کو بھی بے قابو بنا دیتے ہیں یہاں قسمت سے اس نوجوان کو ایک موقعہ ہاتھ آ گیا تھا کہ جس پانی سے خاتم الانبیاء علیہم السلام کا دہن مبارک لگ چکا تھا ضابطہ میں وہ ان کا حق تھا' اگر یہاں اس کے جذبات مچل گئے تو کسی حد تک قابل معذوری ہے مگر جن کی شان اخلاقیات میں سب سے اونچی بنائی گئی تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے رفقاء و اصحاب بھی ان ہی اخلاق سے رنگین ہو جائیں لیکن اس طرح کہ کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو اور ایثار کی عالی خصلت کی ترغیب بھی ہو جائے - اگر آپ یہ پانی عمر کی رعایت سے معمر لوگوں کو عطاء فرما دیتے تو دائیں جانب بیٹھنے والے نوعمروں کا آئین میں کوئی حق ہی نہ رہتا اور اگر اظہار ناگواری کیے بغیر پانی حوالہ فرما دیتے تو اس موقعہ پر ایثار کا کوئی سبق نہ ملتا - اس لیے پانی دیا تو مگر ذرا سی ناگواری کے ساتھ کہ اس قسم کے مقامات پر جو تقاضا اخلاق کا ہو سکتا تھا اس کا سبق مل جائے - آپ کی یہ دونوں ادائیں دو حکم شرعی کی علیحدہ علیحدہ بنیادیں بن گئیں - پس نبی کا صرف قول و فعل ہی نہیں بلکہ اس کا نطق و سکوت بھی بلکہ اس کے نطق و سکوت کی ادائیں بھی ایک ایک حکم شرعی بن جاتی ہیں - اگر العیاذ باللہ ان کے قول و فعل میں معصیت کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی ہو تو کیا ان کو یہی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے - منطقیوں کی اور باتیں جیسی بھی ہوں مگر ان کی ایک یہ بات ہم کو بھی یہاں پسند ہے - اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال - پس اگر ان کے افعال میں کوئی دوسرا احتمال ہو سکتا ہے تو پھر ان کے قول و فعل کو بھی حجت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا -

(۱۱۶۲) ✻ روایت مذکور کے سب الفاظ کو سامنے رکھ لیجئے آپ کو واضح ہو جائے گا رسولوں کی شان کیا ہونی چاہیے - یہاں جس لله .....

عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فِی الۡقِسۡمَةِ اَعۡطَی الۡاَقۡرَعَ بۡنَ حَابِسٍ مَائَةً مِنَ الۡاِبِلِ وَ اَعۡطَی عُیَیۡنَةَ مِثۡلَ ذٰلِکَ وَ اَعۡطَی اُنَاسًا مِنۡ اَشۡرَافِ الۡعَرَبِ وَ اٰثَرَهُمۡ یَوۡمَئِذٍ فِی الۡقِسۡمَةِ قَالَ رَجُلٌ وَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذِهٖ لَقِسۡمَةٌ مَا عُدِلَ فِیۡهَا اَوۡ مَا اُرِیۡدَ فِیۡهَا وَجۡهُ اللّٰهِ فَقُلۡتُ وَ اللّٰهِ لَاُخۡبِرَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فَاَتَیۡتُهٗ فَاَخۡبَرۡتُهٗ فَقَالَ فَمَنۡ یَعۡدِلُ اِذَا لَمۡ یَعۡدِلِ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ رَحِمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی قَدۡ اُوۡذِیَ بِاَکۡثَرَ مِنۡ هٰذَا فَصَبَرَ. رواه البخاری فی الجهاد و فی کتاب الادب و یلک من یعدل اذا لم اعدل و فی المغازی و یلک او لست احق اهل الارض ان یتقی اللّٰه و فی باب علامات النبوۃ قد خبت و خسرت ان لم اکن اعدل و فی کتاب الانبیاء ص ۴۷۲ فقال من یطیع اللّٰه اذا عصیت أیأ مننی اللّٰه علی اهل الارض و لا تأمنونی۔

(ایک شخص کا نام) کو سو اونٹ دے دیئے اور اتنے ہی اونٹ عیینہ کو (ایک شخص کا نام ہے) اور اسی طرح عرب کے اور چند بڑے بڑے لوگوں کو عطا فرمائے' اور اس دن مال کی تقسیم میں دوسرے لوگوں پر ان کو ترجیح دی - اس پر ایک شخص بولا خدا کی قسم اس تقسیم میں تو انصاف سے کام نہیں لیا گیا - یا یہ کہا کہ یہ تقسیم خلوص کے ساتھ نہیں کی گئی - میں نے کہا اچھا خدا کی قسم میں ضرور اس بات کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوں گا - میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی آپؐ کو خبر دی آپؐ نے فرمایا ارے اگر اللہ اور اس کا رسول بھی انصاف نہ کرے گا تو بتاؤ پھر اور کون انصاف کرے گا - خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر رحم فرمائے ان کو اس سے بھی زیادہ تکلیفیں دی گئیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا - بخاری شریف میں دوسری جگہ یہ لفظ ہے "تیرا ناس ہو اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون کرے گا -" کتاب المغازی کے لفظ یہ ہیں - "کیا روئے زمین میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خوف کرنے کا میں حق دار نہیں" - علاماتِ نبوت میں یہ لفظ ہیں "اگر میں نے انصاف نہ کیا تو میں تو بڑے ٹوٹے میں رہا اور بہت ناکام رہا" - کتاب الانبیا کے الفاظ یہ ہیں "اگر میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو پھر اور کون ہے جو اس کی حکم برداری کرے گا - بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ تم تو مجھے قابل اعتماد نہ سمجھو اور اللہ تعالیٰ ساری روئے زمین کے حق میں مجھ پر اعتماد کر لے - (بخاری شریف)

لله ..... شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بدگمانی کا کلمہ منہ سے نکالا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں "ویل" (ہلاکت) کا لفظ فرمایا ہے کیونکہ یہ شخصی توہین نہ تھی بلکہ منصب رسالت کی توہین تھی - پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح غیر معقول بھی قرار دیا کہ جس کو بندے قابل اعتماد نہ سمجھیں کیا حق تعالیٰ اپنی ساری مخلوق کے حق میں اس کو قابل اعتماد سمجھے گا - پھر جب رسول مال کی تقسیم میں قابل اعتماد ہوتا ہے تو اپنے اور افعال میں بھی قابل اعتماد کیوں نہیں ہوتا - ہم کو روایات سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل پر معصیت کا گمان کیا ہو اور جب کسی ناشائستہ شخص کی زبان سے ایسا کلمہ نکلا ہے تو یاد نہیں آتا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار ناگواری نہ فرمایا ہو - پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے کسی خاص عمل پر معصیت کا لفظ طلاق نہیں کیا گیا تو محض عقلی طرز فکر سے کسی کا اس پر معصیت کا اطلاق کرنا کیسے درست ہوگا -

لو عصى الانبیاء علیھمُ السَّلام لغوت اممھم

(۱۱۶۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ لَقِیْتُ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ فَنَعَتَہٗ فَاِذَا رَجُلٌ حَسِبْتُہٗ قَالَ مُضْطَرِبٌ رَجِلُ الرَّأْسِ کَاَنَّہٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَۃَ قَالَ وَ لَقِیْتُ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فَنَعَتَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَبْعَۃٌ اَحْمَرُ کَاَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِیْمَاسٍ یَعْنِی الْحَمَّامَ وَ رَأَیْتُ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاَنَا اَشْبَہُ وَلَدِہٖ قَالَ وَ اُوْتِیْتُ بِاِنَائَیْنِ اَحَدُھُمَا لَبَنٌ وَ الْاٰخَرُ فِیْہِ خَمْرٌ فَقِیْلَ لِیْ خُذْ اَیَّھُمَا شِئْتَ فَاَخَذْتُ اللَّبَنَ فَشَرِبْتُہٗ فَقِیْلَ لِیْ ھُدِیْتَ الْفِطْرَۃَ اَوْ اَصَبْتَ الْفِطْرَۃَ اَمَا اِنَّکَ لَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ اُمَّتُکَ.

(رواہ البخاری)

اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں (والعیاذ باللہ) تو ان کی امتیں گمراہ ہوکر رہ جائیں

(۱۱۶۳) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شب میں مجھ کو معراج ہوئی تھی تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی میری ملاقات ہوئی' اس کے بعد آپؐ نے ان کا حلیہ اس طرح بیان فرمایا - کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چھریرے جسم کے' سر کے بال کچھ خمیدہ اور کچھ سیدھے جیسے ان میں کنگھی کی گئی ہو' بس ایسے تھے جیسے شنوءۃ قبیلہ کے لوگ ہوتے ہیں - پھر عیسیٰ علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی - اس کے بعد آپؐ نے ان کا حلیہ بیان فرمایا' میانہ قد' سرخ رنگ کے ایسے نہائے دھوئے جیسے ابھی ابھی حمام سے نکلے ہیں اس شب میں میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا' اگر ان کی اولاد میں ان کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ شخص کو دیکھنا ہو تو وہ مجھ کو دیکھ لو اس کے بعد آپؐ نے فرمایا - میرے سامنے دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی اور امتحان کے طور پر مجھ سے کہا گیا ان میں سے کون سا جام لیتے ہو؟ میں نے اٹھا کر دودھ کا جام لے لیا اور اس کو پی لیا - اس وقت مجھ سے کہا گیا آپؐ نے ٹھیک فطرت کے مطابق انتخاب کیا' یا آپ نے منشاء فطرت کو پالیا - اور خوب سن لو اگر کہیں تم شراب والا جام لے لیتے تو تمہاری ساری امت گمراہ ہو جاتی - (بخاری شریف)

(۱۱۶۳) ❊ رسول کا معنوی علاقہ اپنی امت کے ساتھ والد اور اولاد کے ظاہری علاقہ سے کہیں قوی تر ہوتا ہے پھر جب والد کے خصائل کا اولاد میں ظاہر ہونا ضروری ہے تو رسول کی کسی فروگزاشت کا اثر اس کی امت میں کیونکر ظاہر نہ ہو - صحیح حدیث میں ہے "نسی ادم فنسیت ذریتہ خطا ادم فخطات ذریتہ" یعنی آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا تو ان کی ذریت میں بھی یہ خصلت ظاہر ہوکر رہی اور آدم علیہ السلام سے ذرا چوک ہوگئی تو یہ ذرا سا نقص ان کی اولاد میں بھی نظر آتا رہا اسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں دوسرا جام اختیار فرما لیتے تو یہ معصیت کی طرف آپ کے رجحان کی دلیل ہوتی' پھر کیسے ممکن تھا کہ آپ کی امت کا قدم سنبھل سکتا - حقیقت یہ ہے کہ نبی وقت اپنی امت کے تمام کمالات کے لیے مصدر و مرکز ہوتا ہے' امت کے جملہ کمالات اپنے نبی کے کمال کا فیض ہوتے ہیں اسی لیے جو افضل الرسل تھے ان کی امت خیر الامم کہلائی - اب اگر نبی میں اصولی لحاظ سے کسی معصیت کا امکان ہو اور والعیاذ باللہ تو پھر جو بالطبع عاصی ہوں ان کی کیا گت بن کر رہ جائے - اسی لیے نبی کو معصوم فطرت پیدا کیا جاتا ہے تاکہ اس کی امت کشاں کشاں معصیت سے معصومیت کا رنگ اختیار کرتی چلی جائے اور اس طرح پھر اس جنت کی مستحق بن جائے جہاں کی آبادی کے لیے معصومیت شرط اوّل ہے - آدم علیہ السلام سے ذرا سی غلطی ہو گئی .....

الوسوسة بما يخالف عصمة الرسول العظيمؐ مما يخشى منه الهلاك

(۱۱۶۴) اَخْبَرَنِیْ عَلِیُّ بْنُ حُسَیْنٍ اَنَّ صَفِیَّةَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْهُ اَنَّهَا جَاءَتْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَزُوْرُهُ فِی اعْتِکَافِهٖ فِی الْمَسْجِدِ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَتَحَدَّثَتْ عِنْدَهٗ سَاعَةً ثُمَّ قَامَتْ تَنْقَلِبُ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَعَهَا یَقْلِبُهَا حَتّٰی اِذَا بَلَغَتْ بَابَ الْمَسْجِدِ عِنْدَ بَابِ اُمِّ سَلَمَةَ مَرَّ رَجُلَانِ مِنَ الْاَنْصَارِ فَسَلَّمَا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُمَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی رِسْلِکُمَا اِنَّمَا هِیَ صَفِیَّةُ بِنْتُ حُیَیٍّ فَقَالَا سُبْحَانَ اللّٰهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ کَبُرَ عَلَیْهِمَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَبْلُغُ مِنَ الْاِنْسَانِ مَبْلَغَ الدَّمِ وَ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یَقْذِفَ فِیْ قُلُوْبِکُمَا شَیْئًا وَ فِیْ روایة فتهلكا.

(وفی روایة عبدالرحمن بن اسحاق ما اقول لكما هذا ان تکونا تظنان شرا و لکن قد علمت الخ)

آپ کی عصمت کے خلاف قلب میں وسوسہ بھی ایسی خطرناک بات ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے

(۱۱۶۴) علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نقل فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی نے ان سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ دورانِ اعتکاف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے مسجد میں آئیں- یہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا موقع تھا' تھوڑی دیر آپؐ سے بات چیت کی پھر رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو رخصت فرمانے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ تشریف لے چلے یہاں تک کہ جب وہ مسجد کے اس دروازہ کے پاس پہنچیں جو حضرت ام سلمہؓ کے دروازہ کے متصل تھا تو دو انصاری شخصوں کا اس طرف سے گذر ہوا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا- آپؐ نے ان سے فرمایا ذرا ٹھہرنا دیکھو یہ میرے ساتھ صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں- انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ سبحان اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا فرماتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان کے لیے بڑی مجحوبی کا باعث بن گیا- اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان انسان میں خون کی طرح گھوم جاتا ہے- مجھ کو اس کا خطرہ ہوا مبادا تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے اور اس کی وجہ سے تم خواہ مخواہ ہلاک ہو جاؤ- دوسری روایت میں یوں ہے کہ یہ بات میں نے اس لیے نہیں کہی تھی کہ تم کوئی بدظنی کرتے بلکہ بات یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ کبھی شیطان دل میں غیر اختیاری وساوس ڈال دیتا ہے- (بخاری شریف)

لله ..... گئی تو عصمت کے باوجود جنت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے پھر جب تک عاصی انسان اپنی معصیت کی سزا بھگت کر معصومیت کا رنگ اختیار نہ کر لے جنت میں بھلا کیسے داخل ہو سکتا ہے خدا تعالیٰ کے مقدس رسول چونکہ اسی عالم میں جنت کی مخلوق ہوتے ہیں اس لیے وہ اہل جنت کی طرح معصوم بھی ہوتے ہیں' تفصیل پہلے گذر چکی ہے- واضح رہے کہ اس امتحان کا نظارہ صرف آپ کی فطرت کی عصمت کے اظہار کے لیے تھا' اسی لیے دوسری صورت کو صرف فرضی طریقہ پر ادا کیا گیا ہے تاکہ نبی اور امتی کا باہم اندرونی علاقہ معلوم ہو جائے- آب حیات میں حضرت مولانا نانوتویؒ نے اس کی خوب تشریح فرمائی ہیں- عوام کے ڈر سے اس کا نقل کرنا مناسب نہیں علماء دیکھ لیں-

(۱۱۶۴) ٭ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ اعتکاف تھے اگر یہاں شیطان کوئی وسوسہ ڈالتا تو یہی کہ یہ نقاب پوش کوئی اجنبی عورت نہ ہوں والعیاذ باللہ پھر اجنبی عورت سے تنہائی میں گفتگو اور بات چیت اگر معصیت تھی تو کس درجہ کی معصیت تھی اس کے بعد آپؐ کا کس لله .....

الانبياء عليهم الصلوة والسلام ومكانتهم في التشريع

(١١٦٥) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحَجُّوْا فَقَالَ رَجُلٌ اَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَكَتَ حَتّٰى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَ لَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَكْتُكُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُوَالِهِمْ وَ اخْتِلَافِهِمْ عَلٰى اَنْبِيَائِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ فَاْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْهُ. (رواه مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تشریع میں

(۱۱۶۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر حج فرض قرار دیا ہے اس لیے حج ادا کیا کرو۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہر سال؟ آپؐ خاموش رہے یہاں تک کہ جب اس نے تین بار یہی سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا اگر میں اس کا اقرار کر لیتا اور ہاں کہہ دیتا تو ہر سال تم پر حج فرض ہو جاتا۔ پھر تم ہر سال حج ادا نہ کر سکتے اس کے بعد اصولی طور پر یہ نصیحت فرمائی کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہا کروں تم بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو، کیونکہ تم سے پہلی امتیں جو ہلاک ہوئی ہیں وہ ان ہی بے جا سوالات اور اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے بے جا اختلافات کی بدولت ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ لہٰذا جب میں تم کو کسی بات کا حکم دیا کروں تو اپنے مقدور بھر اس کو بجالایا کرو اور جس بات سے روک دیا کروں بس اس کو یک قلم چھوڑ دیا کرو۔ (مسلم)

للہ ...... اہتمام سے اس کا بھی ازالہ فرمانا وہ بھی اس لیے نہیں کہ صحابہؓ سے اس بدگمانی کا کوئی اندیشہ تھا جیسا کہ خود آپؐ نے صاف فرما دیا کہ میرا یہ کہنا اس بناء پر نہیں ہے کہ تمہارے دل میں اس قسم کی کوئی بدگمانی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے ہے کہ بعض مرتبہ شیطان غیر اختیاری طور پر دل میں بے بات بے سبب کوئی وسوسہ ڈال دیتا ہے صرف اس کی پیش بندی کے لیے میں نے تم کو خبردار کیا ہے مگر اس غیر اختیاری وسوسہ کا وہ بھی صرف ایک اجنبی عورت سے تنہائی میں ملاقات کا اثر کیا ہوتا؟ تمہاری ہلاکت اور آخرت کی بربادی۔ اب اس سے اندازہ فرما لیجئے کہ نبی کی شان عصمت کیا ہوتی ہے یہ کہ اگر اس کے خلاف ذرا سا وسوسہ بھی دل میں آئے اور جم جائے تو ایمان کی خیریت نہیں رہتی۔ کیا والعیاذ باللہ اگر رسول معصوم نہ ہوں تو ان کی شان یہی ہونی چاہیے۔

(۱۱۶۵) * اسلام میں نبی کی حیثیت ایک مقنن کی حیثیت قرار دی گئی ہے اسی لیے قرآن کریم نے جا بجا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی مستقل حکم دیا ہے گو رسول کا جو حکم بھی ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کے حکم کے تحت ہوتا ہے مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہی تھا کہ کچھ باتوں کا حکم تو وہ براہ راست خود دے اور کچھ باتیں ایسی بھی چھوڑ دے جن کا حکم وہ براہ راست خود نہ دے بلکہ اس کا رسول دے دے۔ ادھر حاکم علی الاطلاق کو مقصود یہی تھا قطعیت کے جس مرتبہ میں تمام قرآن کی حفاظت ہو اس درجہ میں ہر حدیث کی حفاظت نہ ہو اور اس طرح حفاظت کی نوعیت کے فرق سے کہیں کہیں ان کی قطعیت میں بھی فرق پڑ جائے اور اس طرح کمزور اُمت کی تقصیرات میں یہ کچھ خفت کا سبب بن جائے۔ اگر کہیں ہر ہر حکم اسی مرتبہ میں آ جاتا جس میں کہ قرآن پاک کی آیات تھیں تو شاید اس امت کے عاصیوں کا معاملہ بہت زیادہ نازک ہو جاتا۔ رحمت نے صرف اتنے ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے رسول کے ساتھ زیادہ کھود کرید کرنے کی ممانعت بھی فرما دی تاکہ ابہام اور اجمال سے کمزوروں کو جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ اور پہنچ جائے۔ نیز یہ رسول کے خود اپنے فرائض میں داخل ہے کہ جو تفصیلات ضروری ہوں للہ .....

(۱۱۶۶) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّخَذَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيْرٍ فَصَلّٰى فِيْهَا لَيَالِيَ حَتّٰى اِجْتَمَعَ عَلَيْهِ نَاسٌ ثُمَّ فَقَدُوْا صَوْتَهُ لَيْلَةً وَ ظَنُّوْا اَنَّهُ قَدْ نَامَ فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحْنَحُ لِيَخْرُجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ مَا زَالَ بِكُمُ الَّذِيْ رَأَيْتُ مِنْ صَنِيْعِكُمْ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمْ وَ لَوْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ مَا قُمْتُمْ بِهٖ فَصَلُّوْا اَيُّهَا النَّاسُ فِيْ بُيُوْتِكُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ صَلٰوةِ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ.

(متفق عليه)

(۱۱۶۶) زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ماہ رمضان میں) اپنی مسجد میں ایک بوریے کا حجرہ سا بنالیا تھا۔ چند شب آپؐ نے اسی کے اندر نماز ادا کی یہاں تک کہ لوگ بھی آپؐ کے پیچھے آ آ کر نماز میں شریک ہونے شروع ہو گئے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لوگوں نے آپؐ کی آواز نہ سنی اور گمان یہ کیا کہ شاید آپؐ خواب استراحت فرما رہے ہیں تو کسی کسی نے کھانسنا بھی شروع کیا تا کہ آپؐ نماز کے لیے باہر تشریف لے آئیں آخر آپ نے فرمایا تمہارے ذوق وشوق کے ساتھ آ آ کر اقتداء کرنے کا یہ معاملہ میں سب دیکھتا رہا ہوں یہاں تک کہ مجھ کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ یہ نماز کہیں تم پر فرض قرار نہ دے دی جائے پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔ تو لوگو آئندہ سے تم یہ نماز اپنے اپنے گھروں میں ہی ادا کر لیا کرو۔ کیونکہ فرض نماز کو مستثنیٰ کر کے آدمی کی جتنی اور نمازیں ہیں وہ سب گھروں میں ہی افضل ہوتی ہیں۔ (متفق علیہ)

(۱۱۶۷) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى

(۱۱۶۷) عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ﷺ ..... ان کو وہ خود اپنی جانب سے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دے کیونکہ اس کو مبین ہی کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ پس جہاں اس نے سکوت اختیار کرلیا تم کو بھی چاہیے کہ وہاں سکوت اختیار کر لو اور زیادہ سوال و جواب کی چپقلش میں نہ پڑو ورنہ یہ اس پر بھی کوتاہی کے ایک الزام کے مرادف ہوگا۔ ادھر نزول وحی کے زمانہ میں تم جتنی زیادہ تفصیلات کے درپے ہو گے وہ سب کھول دی جائیں گی پھر وہ تمہارے ہی حق میں تکلیف کا سامان بن جائیں گی۔ لہٰذا خاموشی کے ساتھ سکوت کرنے میں رسولؐ کا احترام بھی ملحوظ رہتا ہے اور تمہاری بہتری بھی اسی میں مضمر ہے۔ ضروری بات تم سے پوشیدہ نہیں رکھی جائے گی غیر ضروری بات کا سوال تم مت کیا کرو۔ رسول کی عظمت کا اس سے اندازہ فرمالیجئے کہ اس کی ایک جنبش لب سے فرض وحرمت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

(۱۱۶۶) * نبی کے نطق وسکوت کا رتبہ تو بہت بلند ہے یہاں اس کی انفرادی عبادت میں اجازت کے بغیر سکوت کے ساتھ شرکت کرنا بھی معمولی بات نہیں ہوتی بعض مرتبہ وہ عبادت صرف اسی کی ذات کے لیے مناسب ہوتی ہے اس میں جا جا کر شریک ہونا چھوٹا منہ بڑی بات ہے بعض مرتبہ وہ اس کی خصوصیت تو نہیں ہوتی مگر اس میں شرکت کرنا کسی بڑی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے جیسے یہاں کہ نزول وحی کا زمانہ تھا احکام میں کمی وبیشی جاری تھی۔ اس مبارک مہینہ میں اس طرح ذوق وشوق کے ساتھ مبارک اجتماع پھر کس مبارک نبی کی اقتداء میں اس کو فرشتے بھی دیکھ کر غبطہ کر سکتے تھے بہت ممکن تھا کہ ملاء اعلیٰ میں اس کو وہ شرف قبول حاصل ہو جاتا اس کو فرض ہی قرار دے دیا جاتا پھر آئندہ ضعفاء امت کے لیے یہ مشکلات در مشکلات کا سبب بن جاتا۔ اس جگہ حجۃ اللہ ج ا ص ۹۶ ضرور ملاحظہ کر لی جائے۔

(۱۱۶۷) * یہاں قربانی کے جانور میں ایک شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استثناء فرما دینا صحیح سند کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حسب آیت ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات چونکہ خود مؤمنوں کی جانوں سے زیادہ ان کی خیر خواہ تھی اس لیے جس طرح والد کو اولاد پر ولایت حاصل ہوتی ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑھ کر مؤمنوں کی ﷺ .....

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْطَاہُ غَنَمًا یَقْسِمُھَا عَلٰی صَحَابَتِہٖ ضَحَایَا فَبَقِیَ عَتُوْدٌ فَذَکَرَہٗ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحِّ بِہٖ اَنْتَ ۔ (متفق علیہ و فی روایۃ ابی بردۃ اذ بحھا ولن تجزیٔ عن احد بعدك. و نحوہ قصۃ زید بن خالد عند ابی داؤد و ابی زید الانصاری عند ابن ماجۃ)

کچھ بکریاں ان کے سپرد کیں تا کہ وہ ان کو قربانی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں تقسیم کر دیں (چنانچہ انہوں نے بکریاں تقسیم کر دیں) آخر میں صرف ایک بکری بچ رہی جو پورے سال کی نہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چلو بس تم تو اس کی قربانی کر ہی لو۔ متفق علیہ۔ ابو بردہ کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ خیر تم تو اس کو ذبح کر دو مگر تمہارے بعد اس عمر کی بکری آئندہ کسی شخص کے لیے بھی کافی نہ ہوگی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ زید بن خالد کا ابوداؤد میں اور ابوزید انصاری کا ابن ماجہ میں موجود ہے۔

(١١٦٨) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ لَعَنَ اللّٰہُ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَاتِ وَ الْمُتَنَمِّصَاتِ وَ الْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَیِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰہِ فَجَاءَتْہُ امْرَأَۃٌ فَقَالَتْ اِنَّہٗ بَلَغَنِیْ اَنَّکَ لَعَنْتَ کَیْتَ وَ کَیْتَ فَقَالَ مَالِیْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ مَنْ ھُوَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ (تَعَالٰی) فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ

(١١٦٨) عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت کرے جو جسم کو گودتی ہیں یا گدواتی ہیں' یا خوبصورتی کے لیے بال نچواتی ہیں یا دانتوں کے درمیان جھری کھلواتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خلقت بدلنا چاہتی ہیں اتنے میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؐ اس قسم کی عورتوں پر لعنت فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا۔ جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی لعنت فرمائی ہو میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں۔ اس نے کہا کہ قرآن شریف تو میں نے بھی پڑھا ہے مگر اس میں میں نے تو وہ بات کہیں نہیں پڑھی جو آپ فرماتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا اگر تو قرآن ذرا سمجھ کر پڑھتی

بقیہ ..... جان و مال پر ولایت حاصل تھی اور اس لیے آپ کو ان کی جان و مال میں جملہ قسم کے تصرف کا حق حاصل تھا۔ اگر آپؐ چاہیں تو کسی کا نکاح فرما دے سکتے تھے اور اگر کوئی اپنے غلام پر ظلم کرے تو آپؐ اس کو اپنی جانب سے آزاد بھی کر سکتے تھے بعض حدیثوں کی جواب دہی کے ضمن میں کچھ علماء کی رائے اس طرف بھی ہے۔ اس لیے ترجمان السنہ ج ٢ ص ٨٩ حدیث نمبر ٣٣٧ کے تشریحی نوٹ میں ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ "بعض مقامات پر رسول جیسی شخصیت کو بھی آئینی دست اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا" اس کی بجائے اب اس کو اس طرح درست فرما لیجئے" یہاں پہنچ کر رسول جیسی شخصیت کو بھی آئینی دست اندازی نہیں کرتی اور صرف اتنے ہی پر اکتفا کر لیتی ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کر دے اور بس"

تنبیہ: بعض حدیثوں میں ایک شخص کے لیے نمازوں کے متعلق بھی آپؐ کے استثناء فرمانے کا ایک واقعہ اور دوسرا ایک عورت کے لیے نوحہ کرنے کی اجازت دے دینے کا واقعہ بھی ملتا ہے بعض علماء نے ان دونوں واقعات کو بھی اسی جنس کے واقعات میں شمار کیا ہے لیکن ان کے متعلق جو رائے ناقص ہماری تھی ہم پہلے اس کا اظہار کر چکے ہیں۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ٢ ص ٥٣ و ج ٢ ص ٥٦۔

(١١٦٨) * احادیث سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہؓ نے احکام یا غیر احکام میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان کہیں تفریق کی ہو۔ منکرین حدیث کی یہ سخت جرأت ہے کہ تشریع احکام میں رسول کا کوئی مقام ہی تسلیم نہیں کرتے اور اس بہانہ سے در پردہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی دست بردار ہونا چاہتے ہیں حالانکہ کتاب اللہ اور احادیث ہی نہیں بلکہ دین کی تاریخ از اول تا آخر اس کے خلاف ہے۔

مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ قَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ اَمَا قَرَأْتِ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ. (متفق عليه)

تو جو بات میں کہتا ہوں ضرور ضرور اس میں دیکھ لیتی کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ الخ جو بات تم کو رسول بتائے اس کو قبول کرلو اور جس بات سے روک دے اس سے رک جاؤ- اس نے کہا یہ آیت تو پڑھی ہے- اس پر انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال کی ممانعت فرمائی ہے (اس لیے ان کو نہ کرنا قرآن ہی کا حکم کہا جائے گا- (متفق علیہ)

(۱۱۶۹) عَنْ سَهْلَةَ امْرَءَةِ اَبِىْ حُذَيْفَةَ اَنَّهَا ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَالِمًا مَوْلٰى اَبِىْ حُذَيْفَةَ وَ دُخُوْلِهٖ عَلَيْهَا فَاَمَرَهَا اَنْ تُرْضِعَهٗ فَاَرْضَعَتْهُ وَ هُوَ رَجُلٌ كَبِيْرٌ بَعْدَ مَا شَهِدَ بَدْرًا. (اخرجه ابن سعد و الحاكم كما في الخصائص ج ٢ ص ٢٦٣)

(۱۱۶۹) سہلہ جو ابوحذیفہ کی بیوی تھیں کہتی ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سالم کے متعلق تذکرہ کیا یہ ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے کیا وہ ان کے گھر اب بھی آمد و شد رکھ سکتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا- جاؤ ان کو اپنا دودھ لے کر پلا دو- چنانچہ انہوں نے اپنا تھوڑا سا دودھ نکال کر ان کو پلا دیا اس وقت یہ پورے مرد تھے اور جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے- (حاکم)

(۱۱۷۰) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اَبٰى سَائِرُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّدْخَلَ عَلَيْهِنَّ اَحَدٌ بِهٰذَا الرَّضَاعِ وَ قُلْنَ اِنَّمَا هٰذَا رُخْصَةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِسَالِمٍ خَاصَّةً. (اخرجه الشيخان)

(۱۱۷۰) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس قسم کی رضاعت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ازواج نے اختلاف رائے ظاہر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ خاص سالم ہی کے لیے اجازت تھی- عام مسئلہ نہیں تھا- (متفق علیہ)

(۱۱۷۱) عَنْ اَبِى النُّعْمَانِ الْاَزْدِيِّ قَالَ زَوَّجَ

(۱۱۷۱) ابونعمان ازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

(۱۱۷۰) * یعنی مدتِ رضاعت کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہے اور نہ ایسے آدمی کو رضاعی اولاد یا رضاعی بھائی کہا جا سکتا ہے- سہلہ کی روایت اگر صحیحین کی نہ ہو مگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض مواضع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قوانین سے مستثنیٰ کرنے کا شرعی حق بھی حاصل تھا-

(۱۱۷۱) * مہر کے باب میں ایک شخص کو عام قانون سے مستثنیٰ کرنے کی یہ دوسری مثال ہے- گو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ثبوت میں کلام ہو مگر مکحول وغیرہ کے بیانات سے کسی درجہ میں اس کی تائید ہو جاتی ہے ہماری غرض یہاں ان مسائل پر روشنی ڈالنی نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ عموم قاعدہ سے استثناء کرنے کا حق بھی آپ کو حاصل تھا اور یہ حقیقت صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم مکہ کی گھاس کاٹنے کی ممانعت فرمائی تو ایک صحابی نے کھڑے ہو کر ''اذخر'' کے استثناء کی درخواست پیش کی کیونکہ یہ گھاس لوگوں کی بہت سی ضروریات میں مستعمل تھی- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا- اس جگہ ان سب کا استقصاء کرنا منظور نہیں ہے-

النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِمْرَءَۃً عَلٰی سُوْرَۃٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَ قَالَ لَا یَکُوْنُ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِکَ مَھْرًا. (رواہ سعید بن منصور مرسلاً و فیہ من لا یعرف و اخرج ابوداؤد عن مکحول قال لیس ھذا لاحد بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اخرج ابن عونۃ عن اللیث بن سعد نحوہ کذافی الخصائص ج ۲ ص ۲٦٤)

علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح قرآن کی ایک سورت پر پڑھا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے بعد یہ مہر کسی اور شخص کا نہیں ہو سکے گا - اس حدیث کی اسناد ضعیف در ضعیف ہیں - لیکن ابوداؤد میں ہے کہ مکحول کی ذاتی رائے یہی تھی کہ جن واقعات میں صحتِ سند کے ساتھ قرآن کریم کا مہر مقرر ہونا ثابت ہوتا ہے وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول ہے -

(الخصائص ج ۲ ص ۲٦۳)

(۱۱۷۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْمُعَلّٰی قَالَ کُنْتُ اُصَلِّیْ فِی الْمَسْجِدِ فَدَعَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ اُجِبْہُ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ کُنْتُ اُصَلِّیْ فَقَالَ اَلَمْ یَقُلِ اللّٰہُ. اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَا کُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ. ثُمَّ قَالَ لِیْ لَاُعَلِّمَنَّکَ سُوْرَۃً ھِیَ اَعْظَمُ السُّوَرِ فِی الْقُرْاٰنِ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِیْ فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ یَخْرُجَ قُلْتُ لَہٗ اَلَمْ تَقُلْ لَاُعَلِّمَنَّکَ سُوْرَۃً ھِیَ اَعْظَمُ سُوْرَۃٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ اُوْتِیْتُہٗ.

(رواہ البخاری)

(۱۱۷۲) ابوسعید روایت کرتے ہیں ایسا ہوا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آواز دی تو میں نماز میں تھا اس لیے آپ کو جواب نہ دے سکا - نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معذرت کی یا رسول اللہؐ میں نماز میں تھا اس لیے جواب نہ دے سکا -- آپؐ نے فرمایا کیا فرمانِ الٰہی یہ نہیں اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ الخ یعنی رسول جس وقت بھی تم کو اس بات کے لیے بلائے جو تمہاری حیات کا موجب ہو تو فوراً اللہ اور اس کے رسول کو لبیک کہا کرو - اس کے بعد آپ نے فرمایا - مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے پہلے میں تم کو وہ سورت بتاؤں گا جو قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سب سے بڑی شان کی سورت ہے اس کے بعد آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا - جب آپ مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے عرض کی آپ نے تو فرمایا تھا میں تجھ کو قرآن کریم کی سب سے افضل سورت بتاؤں گا آپ نے فرمایا (تو سن لو) وہ سورت الحمد للہ رب العالمین والی سورت ہے' یہی سبع مثانی ہے اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا ہے - (بخاری شریف)

الرسول العظیمؐ وعصمۃ رأیہٖ فی القران

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی عصمت

(۱۱۷۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کَانَ النَّبِیُّ

(۱۱۷۳) ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

(۱۱۷۳) ✽ دیکھئے حدیث مذکور میں یوں نہیں فرمایا گیا کہ '' تم سفارش کیے جاؤ اور رسول جو چاہے گا وہ فیصلہ فرما دے گا - '' بلکہ یوں فرمایا گیا ہے کہ '' اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان سے جو فیصلہ چاہے گا صادر فرما دے گا - '' اس تعبیر میں یہ اشارہ ہے کہ رسول دوسرے حاکموں کی طرح صرف اپنی رائے سے فیصلے نہیں فرماتے بلکہ ان کی زبان خداوندی احکام کے اجراء کے لیے صرف ایک آلہ ہوتی ہے حکم للہ .....

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاہُ السَّائِلُ اَوْ   اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی سائل یا کوئی صاحب ضرورت آتا (راوی کو

ﷺ ..... درحقیقت یہاں اللہ تعالیٰ ہی کارہتا ہے- یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے سب فیصلہ ناطق اور ناقابل اپیل ہوتے ہیں ان سے معارضہ کرنا کفر اور ان میں ذرا تردد کرنا بھی مؤمن کی شان سے بعید ہوتا ہے- اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ رسالت کی حقیقت ہے کیا اور جو عقلاء زمانہ کہلاتے ہیں وہ اس کو سمجھے کیا ہیں-

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ. (الاحزاب:۳۶)

اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو حق نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کردیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں-

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (النساء:۶۵)

تمہارے پروردگار کی قسم جب تک یہ لوگ اپنے جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور تم جو فیصلہ کردو اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں اس وقت تک مومن نہ ہوں گے-

تیسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ. (النساء:۱۰۵)

ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سمجھائے-

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا فیصلہ ایک ہی قرار دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں قوتِ حاکمہ بہر کیف ایک ہی رہتی ہے اگرچہ بظاہر حاکم دو نظر آئیں اسی طرح یہاں فیصلہ بھی ایک ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کی نسبت الگ الگ ہو- رسول کے فیصلوں کی اس اہمیت کے بعد جو دفعہ اس سے بھی زیادہ اہم بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے فیصلہ کے بعد سب اختیارات معطل ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ اس کی آزادیٔ رائے بھی سلب ہوجاتی ہے اور یہ اس لیے کہ خالق کے فیصلہ کے سامنے مخلوق کو ادنیٰ سی سرتابی کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا- رسول کا فیصلہ چونکہ بعینہٖ خالق کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اس لیے جو حقوق خالق کے فیصلے کے ہیں وہی رسول کے فیصلے کے سمجھے جاتے ہیں اس بارے میں آیت بالا میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے مابین کوئی تفریق نہیں کی گئی-

دوسری آیت میں اس سے زیادہ یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مخلوق کے ذمہ یہاں اس سے پہلے ایک فرض اور عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنے ہر معاملہ کا مرافعہ خواہ وہ باہمی نزاعات ہی کا کیوں نہ ہو رسول ہی کی خدمت میں کرے- رسول کی موجودگی میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملہ کا مرافعہ اس کے سواء کسی اور شخصیت کے سامنے لے جائے اور نہ کسی دوسرے انسان کا یہ حق ہے کہ وہ رسول کی موجودگی میں کوئی فیصلہ دے سکے- صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی اہم مخلوق کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہر فیصلہ پر اپنے قلب میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کرے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس منفی جزء کے بعد وہ دوسرے اثباتی جزء کا فرض بھی ادا کرے یعنی اپنے اعتراف وتسلیم کا بھی سرخم کردے- امام رازی آیت بالا کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منفی جزء کا حاصل انقیاد باطن ہے اور مثبت جزء کا حاصل انقیاد ظاہر ہے اور دونوں جزء کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے جسم وجان سے اس پر راضی ہوجائے- ایسی رضاء جس میں انحراف یا کراہت قلبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ رہے- ﷺ .....

رُبَـمَا قَالَ جَاءَ هُ السَّائِلُ اَوْ صَاحِبُ الْحَاجَةِ لفظوں میں شک ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے - تم لوگ تو ضرورت

لله ..... واضح رہے کہ ظاہر کے انقیاد کا ایک مرتبہ تو انقیاد باطن سے بھی پہلے ہوتا ہے اور یہ اس کا ادنیٰ مرتبہ ہے - ایمان و اسلام ابتداء میں انسان کے صرف جوارح اور ظاہر تک محدود رہتا ہے پھر شدہ شدہ اس کے باطن میں سرایت کرتا ہے حتیٰ کہ جب انسان کا باطن ایمان کامل کے رنگ سے رنگیں اور اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو پھر باطن کا اثر لوٹ کر اس کے جوارح پر بھی نظر آنے لگتا ہے - انقیاد ظاہر کا یہ مرتبہ کمال ایمان کے آثار میں سے ہے اور یہ صرف اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہوتا ہے - مثال کے طور سے یوں سمجھئے کہ ایک تواضع تو وہ ہے جو انسان کے اعضاء پر اس کے علمی و عقلی شعور کا نتیجہ ہوتی ہے یہ تواضع تو اختیاری ہے لیکن ایک تواضع تو وہ ہے جو انسان کے باطنی عجز و انکسار اور اس کے ذاتی نقص و افتقار کے دائمی استحضار کا ثمرہ ہوتی ہے' یہ اضطراری ہوتی ہے یا مثلاً ایک خوف تو مصنوعی ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے جو انسان کے باطن پر مستولی ہو جانے کی وجہ سے اس کے ظاہر پر بھی نظر آتا ہے - یہ خوف اتنا اضطراری ہوتا ہے کہ انسان اگر اس کو چھپانے کی سعی بھی کرے تو چھپا نہیں سکتا - یہ اضطراری صفت ہے - اسی طرح انقیاد باطن کامل ہو جانے کے بعد اس کے جو اثرات انسانی جوارح پر نظر آتے ہیں یہ بھی اضطراری ہوتے ہیں - یہاں بھی انسان کے تصنع اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس بناء پر آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ پر انسان کا ضمیر اس طرح رضامند ہو جانا چاہیے کہ پھر انقیاد ظاہر میں کوئی تصنع نہ رہے بلکہ وہ اس کی ایک صفت اضطراری بن جائے - غالباً ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اسلام کے کسی ایسے ہی اعلیٰ مرتبہ کا مطالبہ کیا گیا ہے -

تیسری آیت کے الفاظ بہت زیادہ قابل غور ہیں یہاں اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ کے بعد لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰكَ اللّٰهُ کے لفظ فرمائے ہیں اور یوں نہیں فرمایا کہ ﴿لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا رَاَيْتَ﴾ جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ یہ کتاب ہم نے آپ پر اس لیے نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وہ فرمائیں جو آپ کی رائے میں آ جائے بلکہ اس کی بجائے بِمَا اَرٰكَ اللّٰهُ کے لفظ فرمائے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ آپ کی رائے میں ڈالے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی رائے بھی اراءۃ الٰہیہ کے تابع رہتی ہے اسی لیے اس کو معصومیت کا مقام حاصل ہوتا ہے - دوسرے کسی انسان کی رائے کو یہ مقام حاصل نہیں - اسی لیے رسول کے فیصلہ کے سوا کسی کے فیصلہ کو الٰہی فیصلہ اور قضاء الٰہی نہیں کہا جا سکتا اور نہ رسول کے فیصلہ کے علاوہ کسی اور بشر کا فیصلہ نکتہ چینی سے بالاتر ہو سکتا ہے اور اس لیے رسول کے علاوہ ہر انسان کے فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہونا لازم قرار دیا نہیں جا سکتا ہے ہر سہ آیات بالا کے مضامین پر اگر غور کرو تو سب کی روح ایک ہی ہے' وہ یہ کہ رسول درمیان میں صرف ایک پیامبر ہوتا ہے اور اس کا جو فیصلہ ہوتا ہے وہ حکم ربانی کے تحت ہوتا ہے' حتیٰ کہ اگر اس کی رائے بھی ہو تو وہ بھی اراءۃ الٰہیہ کے تابع ہوتی ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کو یہ رتبہ حاصل نہیں - حضرت عمر کی رائے اور ان کے اجتہاد کا رتبہ کتنا بلند تھا' اللہ اکبر کبھی کبھی وحی الٰہی بھی اسی کی موافقت کرتی تھی لیکن اس کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ یقیناً اراءۃ الٰہی سے پیدا ہوئی ہے اور کوئی دوسرا احتمال اس میں نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے منشی نے ان کے ایک فیصلہ کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھ دیئے '' یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عمر کے خیال میں ڈالا ہے'' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یوں مت لکھو یوں لکھو'' یہ فیصلہ وہ ہے جو عمر نے خود اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق کیا ہے - (ترجمان السنۃ ج ا ص ۱۵۷) دوسرے مقام پر اس کی وجہ بھی خود بیان فرمائی ہے '' لو گو دیکھو دین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس لیے صواب ہی صواب تھی کہ وہ لله .....

قَالَ اشْفَعُوْا فَلْتُوْ جَرُوْا وَ يَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى مندوں کی سفارش کر دیا کرو اور اس پر ثواب کمائے جاؤ' رہا اس کے فیصلہ کا

لله ..... خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تھی' ہماری رائے تو ہماری جانب سے صرف ایک اٹکل ہوتی ہے تو ترجمان السنہ ص ۱۵۷ ج ۱)

عن عمرو بن دينار رضى الله تعالى عنه قال قيل لعمرا حكم بما اراك الله قال ان هذا للنبى صلى الله عليه وسلم خاصة.
(درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)

عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر سے کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جو آپ کے دل میں ڈالے آپ اسی کے موافق فیصلہ فرما دیجئے - انہوں نے فرمایا کہ ٹھہرو یہ بات تو بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھی-

عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما قال اياكم و الرأى فان الله تعالى قال لنبيه صلى الله عليه وسلم لتحكم بين الناس بما اراك الله و لم يقل بما رأيت.
(درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اپنی جانب سے دین میں رائے زنی کرنے سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس رائے کے موافق فیصلہ فرمائیں جو ان کے دل میں منجانب اللہ ڈالی جائے اور یہ حکم نہیں دیا کہ جو خود ان کے دل میں آ جائے وہ فیصلہ فرمائیں-

یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان محض خاکساری کے طور پر نہ تھا بلکہ اس عمیق حقیقت کی طرف اشارہ تھا جو اس تیسری آیت میں رسول اور غیر رسول کی رائے کے فرق کے متعلق کیا گیا ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ رسول کی رائے کے سواء قطعی طور پر صواب رسی کا حکم کسی دوسرے انسان کی رائے پر لگایا نہیں جا سکتا اور اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کہ کسی انسان کے متعلق وحی الٰہی نے یہ تصریح نہیں کی کہ اس کی رائے ہمیشہ اراءۃ الٰہی کے تابع اور منجانب اللہ ہی ہوگی -

ایک مرتبہ ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بریدہؓ صحابی کو امیر لشکر بنا کر بھیجا مگر ان کو صاف یہ ہدایت فرما دی گئی کہ دیکھو اگر محاصرہ کے بعد صلح کی نوبت آئے تو اس صلح نامہ پر یہ نہ لکھنا کہ یہ فیصلہ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کے حکم کے مطابق ہے بلکہ یہ لکھنا کہ یہ فیصلہ میری اور میرے رفقاء کی رائے کے مطابق لکھا جاتا ہے کیونکہ تمہارے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا جو فیصلہ ہوگا وہ یقیناً خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوگا - (ترجمان السنہ ج ۱ ص ۱۴۷)

اس سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ رسالت کا مقام کیا ہے اور امامت و اجتہاد کا رتبہ اس سے کتنا فروتر ہے-

حافظ ابن تیمیہؒ اس تفریق کی وجہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ رسول کی فطرت اتنی مجلی و مصفی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ شیطانی اتصال کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا دوسروں کی فطرت خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر وہاں قطعیت کے ساتھ اس احتمال کی نفی نہیں کی جا سکتی اس لیے دوسرے انسانوں کے رائے میں بہرحال یہ احتمال ہوتا ہے کہ کسی راستہ سے اس میں شیطانی مداخلت ہوگئی ہو اگرچہ وہ عمداً نہ ہو خطاءً ہو اور اس وجہ سے قابل مواخذہ بھی نہ ہو-حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنَ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. (الشعراء: ۲۲۱: ۲۲۲)

اچھا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں' وہ ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں-

حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ آیت بالا میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ شیطان کا نزول صرف ان افراد پر ہوتا ہے جو ان کے ساتھ مزاجی لله .....

لِسَانِ رَسُوْلِهِ بِمَا شَاءَ. (رواه البخاری قلت و   معاملہ تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے جو فیصلہ

ﷺ ..... مناسبت رکھتے ہیں۔ چونکہ شیاطین کا مزاج بھی خدائی نافرمانی اور افتراء پردازی ہوتا ہے اس لیے جن انسانوں میں قریب یا بعید جتنی یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے ان پر اسی تناسب سے ان کا نزول بھی ہوسکتا ہے۔ عام انسانوں کے متعلق چونکہ رسولوں کی سی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کی رائے پر قطعیت کے ساتھ شیطانی مداخلت سے برأت کا حکم بھی نہیں لگایا جاسکتا اس لیے حضرت ابن مسعود نے سائل کے ایک استفسار کا جواب دے کر فرمایا:

اقول فیہ برأیی فان یکن صوابًا فمن اللہ و ان یکن خطاء فمنی و من الشیطان و اللہ و رسولہ برئیان منہ.

اگر میرا یہ جواب درست ہوتو صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے ورنہ میری غلطی ہے اور شیطانی مداخلت کا اثر ہے اللہ اور اس کا رسول یقیناً اس سے بری ہیں۔

اس کے بعد بطور خلاصہ حافظ موصوف لکھتے ہیں:

فالرسول برئ من تنزل الشیطان علیہ فی العمد و الخطاء بخلاف غیر الرسول فانہ قد یخطیء و یکون خطاء من الشیطان و ان کان خطاء ہ مغفورًا لہ.

خلاصہ یہ ہے کہ رسول کی ذات خطاء اور عمد کی ہر دو صورتوں میں شیطانی مداخلت کا احتمال نہیں رکھتی اس کے برخلاف ہر انسان کی رائے میں شیطانی مداخلت سے غلطی واقع ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے اگر چہ اس کی یہ غلطی خطاء اجتہادی ہونے کی وجہ سے معاف ہوں

(الجواب الصحیح ص ۸۵ ج ٤)

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عنوان بالا کے تحت مذکورہ حدیث میں رسول کے فیصلوں کی حیثیت مستقل ہونے کے باوجود ان کو پھر قضاء اللہ یعنی خدائی فیصلہ کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں شیطانی مداخلت کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا اور فیصلہ کرنے والی گو بظاہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر چونکہ درحقیقت وہ الٰہی فیصلہ ہوتا ہے اس لیے اس کو قضاء اللہ بھی کہا جاتا ہے گویا یہاں حاکم دو ہیں مگر حکم ایک ہی ہوتا ہے جیسا کہ آپ رسول کی اطاعت کے متعلق پڑھ چکے ہیں کہ یہاں بھی فعل اطاعت گو متعدد نظر آئے مگر مطاع دراصل ایک ہی ذات پاک اللہ تعالیٰ کی رہتی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان السنہ جلد ا ص   ) اس لیے رسول کے فیصلوں کی نسبت یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یہ رسول کا فیصلہ ہے اور بہ نظر حقیقت یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ وہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہے یہ دونوں نسبتیں مناسبت مقام اور مصلحت کی رعایت سے آپ کو احادیث میں نظر آئیں گی۔ حسب بیان آیت بالا جس طرح یہ معلوم ہوا کہ نزول شیاطین کن کن قسم کے انسانوں پر ہوتا ہے اس کے برعکس یہ بھی معلوم ہوا کہ نزول ملائکہ کن کن افراد پر ہوتا ہے یعنی جس طرح نزول شیاطین کے لیے مزاجی تناسب درکار ہے اسی طرح نزول ملکی کے لیے بھی مزاجی مناسبت ضروری ہوگی۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ملکی کے لیے شرط اول اقرار ربوبیت اور اس کے بعد اس پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (فصلت: ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے کہ) نہ تو خوف کرو اور نہ غم میں پڑو۔ ﷺ .....

من ھذا الباب ما روی مرفوعاً فی شان عمر　　چاہے گا صادر فرمادے گا-

للہ ..... آیت بالا کے بموجب جن افراد میں ایمان باللہ اور اس پر استقامت موجود ہوگی ان کے طبائع کے ساتھ ملائکۃ اللہ کا اتصال بھی ممکن ہوگا اب جن مزاجوں پر پہلی مناسبت اتنی غالب ہوگئی ہے کہ ان میں دوسری مناسبت کا تخم ہی نہیں رہا جیسے کفار ان پر صرف شیاطین کا نزول ہوگا' ملائکۃ اللہ کے نزول کا یہاں کوئی احتمال نہیں ہوگا غالباً پہلی آیت میں اسی لیے "افاک اثیم" دونوں صیغے مبالغہ کے استعمال کیے گئے ہیں اس کے برخلاف جن افراد میں اقرار ربوبیت کی صفت انتہاء درجہ غالب آگئی ہے ان پر نزول ملکی ہوتا ہے مگر چونکہ دوسری صلاحیت کی قطعیت کے ساتھ ان سے نفی نہیں کی جاسکتی اس لیے یہاں ان کی رائے میں مداخلت شیطان کا احتمال لگا رہتا ہے- دوسری آیت میں "رَبُّنَا اللّٰہُ" کے ساتھ استقامت کی قید غالباً اسی ملکی صلاحیت کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے- حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو قسم کی طاقتیں پیدا کی گئی ہیں ایک فرشتہ اور دوسری شیطان - آپ فرماتے ہیں کہ میرا شیطان بھی اسلام لا چکا ہے' اس لیے وہ بھی مجھ کو خیر کے سواء برائی کا مشورہ نہیں دیتا- ہمارے نزدیک اس کا خلاصہ بھی یہی ہے- ہر انسان چونکہ مکلّف بنایا گیا ہے اس لیے اس میں کم و بیش دونوں صلاحیتیں پیدا فرمائی گئی ہیں- ان میں سے ملکی جانب کا خطرہ سعادت اور دوسری جانب کا غلبہ شقاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے- انبیاء علیہم السلام چونکہ ہدایت خلق کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اس لیے یہاں بھی گو دوسری طاقت پیدا تو کی جاتی ہے مگر یہ طاقت بھی ان کی قوت قدسیہ کے سامنے سرنگوں رہتی ہے اور سواء خیر اور بھلائی کے ان کو دوسرا مشورہ دے نہیں سکتی پھر جس فرقہ امت سے اہواء اور شیطان کی نسبت جتنی بعید ہوتی چلی جائے گی اسی قدر اس کے اقوال کی نسبت اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ کوئی کوئی اس معراج کو بھی پہنچا ہے جس کا نام محدثیت ہے- جیسا کہ حضرت عمرؓ یہ اپنی فطری استعداد کی وجہ سے چونکہ محدثیت[1] کے رتبہ پر تھے اس لیے ان کی رائے کا رتبہ نبی کی رائے سے دوسرے نمبر پر آ چکا تھا' حتیٰ کہ بعض اوقات وحی الٰہی ان ہی کی رائے کے مطابق اتر آتی تھی- اور درحقیقت یہ ان کے اسی مناسبت کی طرف اشارہ تھا- لیکن محدثیت کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ کسی خاص فرد امت پر لگایا جا سکتا ہے اور اس لیے نہ کسی خاص فرد کے فیصلہ کو قطعیت کے ساتھ قضاء اللہ کہا جا سکتا ہے- اسی حقیقت کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اپنے انداز میں اشارہ فرمایا ہے-

تحقیق بالا سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ آیت "لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور اس کے لیے فیصلہ کی صورت صرف وحی میں منحصر کر دی گئی ہے بلکہ آیت بالا یہ صراحت کرتی ہے کہ رسول کو اجتہاد کی بھی گنجائش دی گئی ہے- کیونکہ یہاں یوں نہیں فرمایا گیا کہ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْکَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بِهٖ بَيْنَ النَّاسِ بلکہ بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ فرمایا گیا ہے گویا اس کے لیے یہ وسعت دے دی گئی ہے کہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اجتہاد کر کے حکم دینے کا بھی حق دار ہے مگر چونکہ اس کی رائے کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق ہی ہوتی ہے اور اگر کہیں ایک دو واقعہ میں اس کی رائے میں ادنیٰ سی بھی کمی سمجھی گئی ہے تو اس پر فوراً وحی کی جانب سے تنبیہ کر دی گئی ہے- اس لیے اس کی رائے کو بہرکیف من جانب اللہ کہا جاتا ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کی یہ نگہداشت وحی کی طرف سے نہیں ہوتی اس لیے اس کی رائے کو الٰہی رائے نہیں کہا جا سکتا بالخصوص جب کہ اس میں شیطانی

[1] محدثیت کی تشریح ترجمان السنہ ص ۳۶۸ ج ا پر ملاحظہ فرمایئے-

جعل الله الحق على لسان عمر رضی اللہ عنہ۔ (بخاری شریف)

..... مداخلت کا احتمال بھی موجود ہو۔ حضرت عطیہ عوفی آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قال (امعناه) الذی أراه فی كتابه یعنی بما اراک الله کا مطلب یہ ہے کہ جو رائے کتاب میں غور کے بعد آپ کے دل میں ڈالے۔ (درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت بالا رسول کے اجتہاد کرنے کے خلاف نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا ثبوت ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں:

معناه على قوانين الشرع اما يوحى و نص او بنظر جاء على سنن الوحى و هذا اصل فى القياس و هو يدل على ان النبى اذا رأى شيئا اصاب لان الله تعالى اراه ذلك. (تفسیر قرطبی ص ۳۷۶ ج ۵)

آیت بالا میں بما اراک اللہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ فیصلہ فرمایا کریں اس رائے کے مطابق جو یا تو کسی نص کے موافق ہو یا ایسے اجتہاد اور رائے سے ہو جو وحی کی منشاء اور اس کے اقتضاء کے موافق ہو اور یہ حجیت قیاس کی ایک دلیل ہے اور اس کی بھی کہ رسول جب اجتہاد کرتا ہے تو وہ صواب ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔

امام ابومنصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں:

معنى الاية بما الهمک الله بالنظر فى الاصول المنزلة و قال فيه دليل على جواز الا جتهاد فى حقه. (مدارك التنزيل)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ نازل شدہ اصول پر غور کے بعد جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالے آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو بھی اجتہاد کرنا جائز تھا۔

ہماری اس تحقیق سے یہ بھی صاف ہو گیا کہ رسول کی رائے کے من جانب اللہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اب کبھی کسی اجتہاد پر اس کو ٹوکا ہی نہیں جائے گا' ہو سکتا ہے کہ اس کو ٹوکا جائے بلکہ اس کی رائے کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے کہ اس کی جو رائے بھی ہوتی ہے وہ وحی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہے اسی لیے اگر سرمو اس میں فرق ہوتا ہے تو فوراً اس پر اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو پھر حکم بما انزل اللہ اور حکم بما اراک اللہ دونوں صورتیں ایک ہی بن جائیں گے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پانی پتی زیر تفسیر آیہ بالا لکھتے ہیں:

و هذه الاية دليل على ان النبى صلى الله عليه وسلم لم يكن يعمل بالمظنون لكنها لاينفى الاجتهاد عن النبى صلى الله عليه وسلم لانه اذا حصل للنبى صلى الله عليه وسلم ظن بالاجتهاد و قرر الله سبحانه و لم يطلعه على الخطاء ظهر شده بيقين انه الحق بخلاف المجتهد. (تفسیر مظہری)

یہ آیت اس کی دلیل تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظنی بات پر عمل نہ فرماتے تھے' مگر اس کی دلیل نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد کرتے اور اس کے متعلق وحی کی جانب سے کوئی اصلاح نہ کی جاتی تو اس کی حقانیت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین حاصل ہو جاتا ہر مجتہد کے اجتہاد کا یہ معاملہ نہیں اس لیے وہ صرف ظن کی حد تک رہتا ہے۔ .....

للہ ..... اسی طرح آیت بالا میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی گئی کہ رسول کو ہمیشہ صورت واقعہ کی بھی اطلاع دے دی جائے گی بلکہ اس کے فیصلہ کے بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ ہونے کا مطلب صرف اتنا ہوگا کہ وہ اصول منزلہ اور کتاب اللہ کے موافق ہوگا۔ مثلاً فیصلہ کرنے کا آئین یہ بتایا گیا ہے کہ صورت حالات کو مکمل سن لینے کے بعد مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اور گواہاں نہ ہونے کی صورت میں مدعی علیہ سے قسم لے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے اس کے بعد خواہ خارجی واقعات کچھ بھی ہوں ایسے فیصلہ کو بما اراک اللّٰہ فیصلہ ہی کہا جائے گا کیونکہ نہ واقعات کی تہ تک پہنچ جانا شریعت عامہ بنایا جا سکتا ہے نہ یہ ہمیشہ انسان کی قدرت میں ہوتا ہے اس لیے آئین بالا کے موافق یہی فیصلہ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے موافق فیصلہ سمجھا جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے آیت بالا کی تفسیر حضرت مطر سے یہی نقل فرمائی ہے "قال بالبینات و الشھــــود" (درمنثور ص ۲۱۹ ج ۳) ہمارے نزدیک حضرت مطر نے بینہ اور گواہ کو بطور ایک مثال کے ذکر فرمایا ہے۔ صرف اسی میں انحصار نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلہ فرما دیئے کے بعد بھی اہل مقدمہ کو برابر آپ کی ہدایت یہی ہوتی رہی ہے کہ میرے اس آئینی فیصلہ کے بعد بھی اگر اہل معاملہ نے حقیقت سے ذرا بھی عدول کیا ہے تو وہ عنداللہ اپنے آپ کو مجرم ہی سمجھیں۔ میرا فیصلہ صرف ایک نظامی آئین کے تحت ہوا ہے اس کو ہمیشہ وبال آخرت سے نجات کا باعث نہ سمجھ لینا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کا اجتہاد بھی درحقیقت وحی ہی کا حکم رکھتا ہے نہ وحی میں خطاء کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اجتہاد رسول میں خطاء پر استقرار کا احتمال ہے۔ ہماری اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اجتہاد رسول کے باب میں جو اختلاف مدون ہے دراصل وہ لفظی اختلاف ہے جس نے حقیقت کی طرف نظر کی اس نے اجتہاد جائز قرار دیا اور جس نے یہ دیکھا کہ وہ بہر کیف وحی ربانی ہی کی نگہداشت میں ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی وحی کے حکم میں سمجھا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

حافظ سیوطیؒ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے قرآن کریم ہی سے ہوا کرتے تھے مگر اس کو اجتہاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

و الـدلیـل علی ذلک ان العلماء حکوا خلافا فی جواز الاجتھاد للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلوکان حکم بما یفھمہ من القران یسمی اجتھادا لم تتجسہ حکایتہ الخلاف. (الحاوی ص ۱۵۶ ج ۲)

اس کی دلیل یہ ہے کہ علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجتہاد کے جواز میں اختلاف کیا ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظم قرآنی سے مستنبط فرما کر صادر فرماتے تھے اجتہاد کہا جا سکتا تھا تو یہ اختلاف نقل کرنا ہی صحیح نہ ہوتا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی ارشاد فرمایا ہے وہ یا تو صاف صاف قرآن میں موجود ہے ورنہ اس کی اصل ضرور موجود ہے اور اسی طرح جو فیصلے بھی آپ نے فرمائے وہ سب قرآن ہی کی روشنی میں تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کوئی اس کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ پھر ابن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں ہماری ضرورت کے سب علوم موجود ہیں' لیکن ہمارا علم ہی ان کے ادراک سے قاصر ہے۔ (ج ۲ ص ۱۶۰)

اب ذرا غور فرمائیے کہ رسول کو معصومیت کا مقام حاصل نہ ہو تو کیا اس کی رائے کو معصومیت کا یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے بلکہ رائے تو رائے رسول کے خطرات وعواطف قلبیہ بھی وحی ربانی کی زیر نگرانی ہوتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ ج ۱ و حاشیہ ص ۱۳۲ ج ۱ بحوالہ اعلام الموقعین ص ۱۹۸ ج ۱)

دعوت الانبیاء علیهم الصلوة و السلام ومایأتی علیهم انما یأتی من جهة البشریة

انبیاء علیہم السلام سے بد دعائیہ کلمات کا برمحل صدور بھی صرف بشریت کی بناء پر ہوتا ہے

(۱۱۷۴) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتَّخِذُ عِنْدَکَ عَهْدًا لَا تُخْلِفْنِیْهِ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اٰذَیْتُهٗ اَوْ سَبَبْتُهٗ اَوْ قَالَ لَعَنْتُهٗ اَوْ جَلَدْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ زَکَاةً وَ صَلٰوةً وَ قُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَیْکَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ. (رواه ابو یعلی قال الهیثمی و اسناده حسن و اخرجه الشیخان بتغییر یسیر عن ابی هریرة کما فی الخصائص ص ۲۴۴ ج ۲)

(۱۱۷۴) حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ دونوں صاحبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی - الٰہی میں تجھ سے ایک وعدہ لیتا ہوں امید ہے تو مجھ سے ہرگز اس کا خلاف نہ فرمائے گا - میں ایک بشر ہی ہوں - تو جس کسی مؤمن بندہ کو میں نے کوئی تکلیف دی ہو یا برا بھلا کہا ہو یا یہ فرمایا کہ اس پر لعنت کی ہو (راوی کو لفظ میں شک ہے) یا اس کے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہو تو اس کے حق میں تو اس کو کفارہ، رحمت اور قیامت کے دن اپنے دربار میں باعث تقرب بنا دینا -

(خصائص الکبریٰ)

(۱۱۷۵) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُثْمَانَ بْنِ خُثَیْمٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی اَبِی الطُّفَیْلِ عَامِرِ بْنِ وَاثِلَةَ فَوَجَدْتُهٗ طَیِّبَ النَّفْسِ فَقُلْتُ یَا اَبَا الطُّفَیْلِ اَخْبِرْنِیْ عَنِ النَّفَرِ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَهَمَّ اَنْ یُّخْبِرَنِیْ فَقَالَتِ امْرَاَتُهٗ سَوْدَةُ مَهْ یَا اَبَا الطُّفَیْلِ اَمَا بَلَغَکَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّمَا عَبْدٍ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ دَعَوْتُ عَلَیْهِ بِدَعْوَةٍ فَاجْعَلْهَا لَهٗ زَکَاةً وَ رَحْمَةً. (رواه الطبرانی فی الاوسط و اللفظ له و احمد بنحوه و اسناده حسن)

(۱۱۷۵) عبداللہ بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت وہ کچھ ہشاش بشاش نظر آئے میں نے عرض کی ابو الطفیل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے آپ مجھ کو ذرا ان لوگوں کے نام بتا دیجئے - انہوں نے ابھی بیان فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ان کی بیوی سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں ابو الطفیل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! ذرا ٹھہر جایئے کیا آپ کو یہ اطلاع نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی تو فرمائی تھی کہ میں ایک بشر ہی ہوں تو جس کسی مؤمن بندہ کے متعلق میری زبان سے بددعاء کے کلمات نکل گئے ہوں تو الٰہی تو اس کے حق میں ان کو کفارہ اور رحمت بنا دینا - (طبرانی - احمد)

(۱۱۷۴) * اس جگہ آپ کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلا ہے وہ یہی ہے "الٰہی میں ایک بشر ہوں" یہی کلمہ آئندہ روایت میں بھی ہے - اور اس طرح اس باب کی پانچویں روایت میں بھی موجود ہے اس سے پہلے بھی ترجمان السنہ کی مختلف روایات میں ہر معذرت کے موقع پر آپ کی زبان مبارک پر بشکل اصل کلی کے یہ کلمہ آتا رہا ہے - (دیکھو حدیث نمبر ۸۰۴) پھر تعجب ہے کہ جو بات انبیاء علیہم السلام کی نظروں میں اتنی اہم ہو اسی کا انکار لوگوں کی نظروں میں کیونکر اہم بن گیا ہے -

(۱۱۷۶) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَفَعَ اِلٰى حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ رَجُلًا وَ قَالَ لَهَا اِحْتَفِظِيْ بِهٖ فَغَفَلَتْ حَفْصَةُ وَ مَضَى الرَّجُلُ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا حَفْصَةُ مَا فَعَلَ الرَّجُلُ قَالَتْ غَفَلْتُ عَنْهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَخَرَجَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ اللّٰهُ يَدَكِ فَقَالَتْ بِيَدِهَا هٰكَذَا فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا شَاْنُكِ يَا حَفْصَةُ قُلْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ قَبْلُ كَذَا وَ كَذَا قَالَ ضَعِيْ يَدَكِ فَاِنِّيْ سَاَلْتُ رَبِّيْ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اَيُّمَا اِنْسَانٍ مِنْ اُمَّتِيْ دَعَوْتُ عَلَيْهِ اَنْ يَجْعَلَهَا لَهٗ مَغْفِرَةً.

(رواہ احمد و رجالہ رجال الصحیح و اخرجہ فی الخصائص ایضًا ص ۳۴۴ ج ۲ و راجع فی الترجمان ج ۲ ص عن عائشۃؓ)

(۱۱۷۶) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نگرانی میں دیا اور ان سے فرمایا یہ انتظام رکھنا کہ وہ بھاگ نہ جائے۔ ایسا ہوا کہ کسی سبب سے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ذراسی غفلت ہوگئی اور وہ آدمی چل دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ حفصہ! وہ شخص کدھر گیا؟ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معاملہ میں مجھ سے غفلت ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناگواری کے ساتھ باہر تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ کلمات تھے "قَطَعَ اللّٰهُ يَدَكِ" خدا تیرے ہاتھ توڑ دے۔ بس اسی وقت ان کے ہاتھ اس طرح مڑ کر رہ گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ کی یہ صورت دیکھ کر پوچھا۔ حفصہ! یہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات فرمائے تھے بس ایسا ہوگیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو میں نے اپنے رب سے یہ دعاء کی ہے کہ اپنی امت میں جس کے لیے بھی میرے منہ سے بددعاء کے کلمات نکل گئے ہوں الٰہی تو اس کے حق میں ان کو مغفرت و بخشش کا سبب بنا دینا۔

(اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے)

(۱۱۷۶) * بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جو ترجمان السنہ ص ۳۲۴ ج ۲ حدیث نمبر ۷۱۵ میں گذر چکا ہے لیکن وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر کسی راوی نے اس کو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف اور کسی نے حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ہم نے دونوں جگہ اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے گویا آپ کے کلمات کا اثر اسی وقت حادثہ کی صورت میں ظاہر ہو چکا تھا یہ ترجمہ ہم نے حضرت استاذ قدس سرہ کے ایک بیان کی روشنی میں کیا ہے ورنہ اس کا ظاہری ترجمہ دونوں جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دعائیہ کلمات کی وجہ سے میں نے اپنے ہاتھ موڑ موڑ کر دیکھنے شروع کیے کہ ان میں سے آپ کی بددعاء کا اثر کس میں ہے۔ پہلی روایت کے لفظ "انظر ایهما تقطعان" میں دیکھ رہی تھی کہ کس ہاتھ کو یہ بددعاء لگتی ہے اور اس روایت کے لفظ "ضعی یدک" اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو۔ اس کی تائید کرتے ہیں کہ ان کلمات کا اثر اب تک ظاہر ہونے نہیں پایا تھا۔ اس جگہ حدیث سابق نمبر ۷۱۵ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ وہ حقیقت اپنی جگہ پھر مسلّم ہے۔

(۱۱۷۷) عَنْ اَبِی السَّوَّارِ عَنْ خَالِهٖ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ اُنَاسٌ یَتْبَعُوْنَهٗ فَاتَّبَعْتُهٗ مَعَهُمْ قَالَ فَفَجِئَنِیْ الْقَوْمُ یَسْعَوْنَ قَالَ وَ اَبْقَی الْقَوْمَ قَالَ فَأَتٰی عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَضَرَبَنِیْ ضَرْبَةً اِمَّا بِعُسَیْبٍ اَوْ قَضِیْبٍ اَوْ سِوَاکٍ اَوْ شَیْءٍ کَانَ مَعَهٗ قَالَ فَوَاللّٰهِ فَمَا اَوْجَعَنِیْ قَالَ فَبِتُّ بِلَیْلَةٍ قَالَ اَوْ قُلْتُ مَا ضَرَبَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا لِشَیْءٍ عَلِمَهُ اللّٰهُ فِیَّ قَالَ وَ حَدَّثَتْنِیْ نَفْسِیْ اَنْ اٰتِیَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصْبَحْتُ قَالَ فَنَزَلَ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّکَ رَاعٍ لَا تُکْسِرُ قُرُوْنَ رَعِیَّتِکَ قَالَ فَلَمَّا صَلَّیْنَا الْغَدَاةَ اَوْ قَالَ صَبَّحْنَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنَّ اُنَاسًا یَتْبَعُوْنِیْ وَ لَا یُعْجِبُنِیْ اَنْ یَتْبَعُوْنِیْ اَللّٰهُمَّ فَمَنْ ضَرَبْتُ اَوْ سَبَبْتُ فَاجْعَلْهَا لَهٗ کَفَّارَةً وَ اَجْرًا اَوْ قَالَ مَغْفِرَةً وَ رَحْمَةً اَوْ کَمَا قَالَ.

(رواه احمد ج ٥ ص ٢٩٤)

(۱۱۷۷) ابوالسوار اپنے ماموں سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگ رہے ہیں، میں بھی ان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگ گیا یہ بیان کرتے ہیں کہ اتنے میں ناگاہ طور پر لوگ بھاگتے ہوئے میرے اوپر آ پڑے۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر میری طرف تشریف لائے اور کھجور کی ایک تر شاخ یا چھڑی یا مسواک یا کوئی اور ایسی ہی چیز ہوگی جو اس وقت آپ کے پاس تھی، آپ نے اس کو لے کر مجھ کو ہلکے سے مار دیا۔ بخدا مجھے کو اس سے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ کہتے ہیں کہ میں نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی، یا میں نے یہ بات کہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ ضرور کسی ایسی نامناسب بات کی وجہ سے ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں میرے نفس میں ہوگی۔ پھر میرے دل نے کہا کہ کسی طرح صبح ہو تو میں فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ادھر جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے اور فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوم کے نگراں ہیں، اپنی رعایا پر سختی نہ فرمایا کریں۔ یہ کہتے جب ہم صبح کی نماز ادا کر چکے یا یہ کہا کہ جب صبح ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی الٰہی لوگ میرے پیچھے پیچھے لگ جاتے ہیں اور مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ اس طرح وہ میرے پیچھے پیچھے لگے رہیں۔ تو الٰہی جس کو میں نے مار دیا ہو یا برا بھلا بھی کہا ہو تو اس کے حق میں تو اس میری تنبیہ کو گناہوں کا کفارہ اور ثواب کا سبب بنا دینا یا یہ فرمایا کہ مغفرت اور رحمت بنا دینا، یا اسی کے قریب اور کلمات فرمائے۔ (احمد)

(۱۱۷۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ لَعَنْتُهٗ اَوْ شَتَمْتُهٗ اَوْ جَلَدْتُهٗ

(۱۱۷۸) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الٰہی میں بھی بشر ہوں تو مسلمانوں میں جس پر بھی میں نے لعنت کی ہو یا اس کو برا بھلا کہا ہو یا اس کے کوڑے لگوانے کا حکم دیا ہو تو اس

(۱۱۷۸) * اس حدیث میں آپ کی دعاء کا پہلا کلمہ پھر یہی ہے ''میں بشر ہوں'' درحقیقت آپ کے ان تمام کلمات کی روح یہی ہے کہ جب میں بشر ہوں تو بشری خصلت سے بری نہیں ہوسکتا۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ غصہ نہیں آئے گا، کسی کو کوئی تنبیہ نہیں کی جائے گی اور کسی کی کوئی حرکت خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو ناگوار نہیں گذرے گی۔ نہیں نہیں یہ سب کچھ ہوگا مگر ہوائے نفس کی بناء پر نہیں، تکبر و للہ ....

فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلٰوةً وَ رَحْمَةً وَ قُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا اِلَيْکَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ عَنْ جَابِرٍ مثله الا ان فيه زكاة و رحمة. (رواه الدارمی)

کے حق میں تو اس کو باعث رحمت و برکت اور قیامت کے دن اپنے دربار میں باعث تقرب بنا دینا۔

(دارمی شریف)

(۱۱۷۹) عَنْ مُعَاوِيَةَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ مَنْ لَعَنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ ثُمَّ دَخَلَ فِي الْاِسْلَامِ فَاجْعَلْ ذٰلِکَ قُرْبَةً لَهُ اِلَيْکَ. (رواه الطبرانی كما فی الخصائص ص ۲۴۴ ج ۲)

(۱۱۷۹) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے۔ الٰہی جس کسی کی جاہلیت کے دور میں میں نے اس پر لعنت کی ہو پھر وہ اسلام قبول کر چکا ہو تو اس کو تو اس کے حق میں اپنے دربار میں تقرب کا سبب بنا دینا۔

(طبرانی شریف)

(۱۱۸۰) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ قَالَ كَانَ فُلَانٌ يَجْلِسُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا تَكَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَلَجَ بِوَجْهِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنْ كَذٰلِکَ فَلَمْ يَزَلْ يَخْتَلِجُ حَتّٰى مَاتَ رواه الحاكم فی صحيحه.

(۱۱۸۰) عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزند ارجمند روایت کرتے ہیں کہ فلاں شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں آ کر بیٹھا کرتا' اور جب آپ گفتگو فرماتے تو استہزاء کے طور پر منہ بنایا کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تو یونہی ہو جائے (اللہ تعالیٰ نے اس کا منہ اسی طرح بنا دیا) اور جب تک وہ جیا اسی طرح منہ بناتا رہا۔

(حاکم)

ﷺ ..... غرور کی بناء پر نہیں' اور ظلم و تعدی کے طور پر نہیں بلکہ ضعف بشری کی بناء پر۔ یہ معذرت اس لیے نہیں کہ معصیت کا صدور رہا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ جب معصومیت ہے تو یہ کلمات بھی معصوم منہ سے کیوں نکلے پھر اس کی معذرت یوں ہے کہ میں بشر ہوں۔ جو رسولوں کو بشر' نہیں مانتے وہ ان کے عجز و نیاز کی روح سے بھی آشنا نہیں۔

(۱۱۷۹) * ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کی حق تلفی کا گمان ہو تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اس صاحب حق کے لیے دعاء کی جائے مگر یہ اس صورت میں ہے جب کہ صاحب حق کے حق کی ادائیگی کی اور کوئی صورت نظر نہ آئے گویا آپ کے ان تواضع و نیاز کے کلمات سے امت کے لیے ایک اور اہم سنت معلوم ہوگئی۔

یہ واضح رہے کہ ہر لغت کے محاورات میں کچھ کلمات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً بچہ کو پیار و محبت میں شریر کا لفظ کہہ دیتے ہیں بعض اوقات بدمعاش کا لفظ بھی مہذب زبانوں پر آ جاتا ہے مگر یہ صرف اس ماحول کے ایک محاورہ کی حد تک ہوتا ہے اسی طرح عرب میں بھی اس قسم کے کلمات رائج تھے اگر وہ کسی مناسب محل پر شاذ و نادر آپ کی زبان پر آ گئے ہوں تو بشریت کے سواء ان کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ واقعات مذکورۂ پر نظر ڈالی جائے ہر موقعہ محل تنبیہ ہی تھا اور جو تنبیہی کلمات عرب کے محاورات میں تھے وہی بڑی احتیاط کے ساتھ یہاں استعمال ہوئے ہیں مگر معصومیت کا تقاضہ ہے کہ دعائیں دے دے کر ان کی بھی تلافی کر دی جائے۔

(۱۱۸۱) عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا اَكَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِهٖ فَقَالَ كُلْ بِيَمِيْنِكَ قَالَ لَا اَسْتَطِيْعُ قَالَ لَا اسْتَطَعْتَ مَا مَنَعَهٗ اِلَّا الْكِبْرُ فَمَا رَفَعَهَا اِلٰى فِيْهِ.

(رواه مسلم) رياض الصالحين ص ٣١٤.

(۱۱۸۱) سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ- اس نے کہا دائیں ہاتھ سے تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بڑائی کی وجہ سے نہیں کھاتا اچھا تو پھر جیسا تو کہتا ہے ایسا ہی ہو- اس کے بعد وہ شخص اپنا دایاں ہاتھ منہ تک اٹھا ہی نہ سکا- (مسلم شریف)

(۱۱۸۲) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى اَعْرَابِيٍّ يَعُوْدُهٗ وَ كَانَ اِذَا دَخَلَ عَلٰى مَرِيْضٍ يَعُوْدُهٗ قَالَ لَابَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَقَالَ لَهٗ لَابَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ قَالَ كَلَّا بَلْ حُمّٰى تَفُوْرُ عَلٰى شَيْخٍ كَبِيْرٍ تُزِيْرُهُ الْقُبُوْرَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَعَمْ اِذًا.

(رواه البخاری)

(۱۱۸۲) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بادیہ نشین شخص کے پاس اس کی عیادت فرمانے کے لیے تشریف لے گئے اور عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی مریض کی عیادت کو جاتے تو یہ کلمات فرمایا کرتے تھے ''لابـــأس الـخ ''یعنی خدا کرے کوئی تکلیف نہ رہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بیماری گناہوں کا کفارہ ہے- چنانچہ اس سے بھی یہی کلمات فرمائے لابـأس الخ وہ بولا ہرگز نہیں یہ تو ایک سخت بوڑھے کو تیز بخار چڑھ رہا ہے اور اس کو قبرستان لیجا کر چھوڑے گا- اس پر آپ نے ناگواری سے فرمایا اچھا تو یونہی سہی- (بخاری)

مِنْهَا اِسْتِغْفَارُ النَّبِى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استغفار

(۱۱۸۳) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اللّٰهِ اِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِى الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً. (رواه البخاری)

(۱۱۸۳) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے- بخدا میں بھی ایک ایک دن میں ستر ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے استغفار اور توبہ کرتا ہوں-

(بخاری شریف)

(۱۱۸۴) عَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

(۱۱۸۴) اغر مزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

(۱۱۸۲) * انبیاء علیہم السلام کی حکم عدولی استہزاء سے ہو خواہ شدتِ جہالت سے کسی صورت میں مبارک نہیں ہوتی- جس کی شان یہ ہو کہ اگر ان کی آواز سے آواز بلند کی جائے تو کی کرائی نیکیاں برباد ہو جائیں- ان کی بات کا مقابلہ کرنا بعض مرتبہ بہت خطرناک عواقب کا موجب بن جاتا ہے- استہزاء تو کفر ہے' کبر فسوق ہے اور گنوار پن خوفناک عیب ہے ان پر ہمیشہ گرفت کا خطرہ ہوسکتا ہے- قدرت چاہتی ہے کہ جمال کے ساتھ ساتھ کہیں اس کے جلال کا بھی مظاہر ہو جائے تاکہ مخلوق نڈر نہ ہو جائے اور رسولوں کے سامنے اس پیرایہ سے ان کو ادب کا سبق بھی ملتا رہے-

اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّىْ اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِى الْيَوْمِ مِأَةَ مَرَّةٍ. (رواه مسلم)

لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کیا کرو کیونکہ میں بھی ایک دن میں سوسو بار توبہ کرتا ہوں۔

(مسلم شریف)

(۱۱۸۵) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَ اِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِى الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةً. (رواه مسلم)

(۱۱۸۵) اغر مزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے قلب پر ایک بادل سا چھا تا ہے اور میں بھی اللہ تعالیٰ سے دن میں سو سو بار استغفار کرتا ہوں۔ (مسلم شریف)

(۱۱۸۵) * بشر ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس لیے ایک ضعیف مخلوق کے لیے بجائے استکبار کے استغفار کرنا ہی مناسب ہے آفرنیش عالم کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں تین قسم کی مخلوق تھی۔ نوری یعنی فرشتے وہ معصوم تھے اس لیے ان کا معاملہ صرف ایک تسبیح سے قابل اغماض بن گیا۔ "سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" ۔ ناری یعنی جنات وشیاطین انہوں نے بڑائی اور استکبار کی چال چلی "اِسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ" وہ اسی تکبر کی بدولت ملعون بن گئی خاکی یعنی آدم علیہ السلام انہوں نے عجز و نیاز کے ہاتھ پھیلا دیئے' توبہ واستغفار کی زبان کھول دی اور اپنے رب کے سامنے اعتراف وتسلیم کا سر جھکا دیا۔ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ﴾ اس ذل وافتقار اور انابت واستغفار کے صلہ میں تاج خلافت ان کو پہنا دیا گیا۔ یہی سرگزشت پھر آئندہ مخلوق کے استکبار یا استغفار کی بنیاد بن گئی۔ یعنی اولاد ابلیس میں استکبار اور بنی آدم میں استغفار کی سنت قائم ہوگئی اس لیے بنی آدم میں جو مخصوص افراد فطرت پر پیدا ہوتے اور فطرت ہی پر قائم رہتے' توبہ واستغفار کرنا ان کی فطرت کی پکار تھی اور جو اس کے برخلاف چل پڑے وہ ابلیس کے قدم پر کہلائے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی استغفار استغفار فرشتوں کی تسبیح کی طرح فطری ہوتی ہے وہ ان کے ضعف بشری کا تقاضہ ہوتا ہے۔ وہ حقیقتاً کسی گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ معصیت کا تصور اور بشری ضعف اس کا مدعی ہوتا ہے۔ جو خود استغفار کرنا نہیں جانتے وہ دوسروں کو استغفار کی تعلیم دینا بھی نہیں جانتے۔ رحمت چاہتی ہے کہ سنت آدم علیہ السلام کو تازہ رکھنے کے لیے ایسے نفوس قدسیہ آتے رہیں جن کی زبانیں توبہ واستغفار کے لیے شب وروز کھلی ہوں اور اس طرح نظر رحمت میں بنی آدم کے لیے اپنے آبائی وطن کی وراثت کا استحقاق پھر قائم ہو جائے آخری حدیث میں کچھ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے بھی کبھی کبھی ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ میری استغفار بھی صرف مجازی نہیں رہتی بلکہ آدم علیہ السلام کی طرح اس میں حقیقت کی لذت پیدا ہو جاتی ہیں خلاصہ یہ کہ استغفار کو صرف معصیت ہی میں منحصر سمجھ لینا بہت نادانی ہیں ورنہ یہاں لفظ "غنین" یعنی بادل کے لفظ کی بجائے صاف معصیت کا لفظ کیوں نہ فرما دیا گیا۔ استغفار انبیاء علیہم السلام کے کمال کی معراج ہے اور اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت نزدیک آ گیا تو سورۂ "النصر" میں آپ کو تسبیح و استغفار میں منہمک رہنے کا حکم دیا گیا۔ "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْهُ" تسبیح واستغفار کے اس طرح جمع فرمانے میں انسان کی شان جامعیت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ یعنی استغفار کے ساتھ چونکہ اس میں ملکوتی صفت بھی ہے اس لیے ان کا وظیفہ تسبیح واستغفار کا مجموعہ ہے اور اس لیے صرف تسبیح کرنے والوں کی رسائی اس مقام تک نہیں ہوتی جہاں تک کہ تسبیح کے ساتھ استغفار کرنے والوں کی رسائی ہوتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے آدم علیہ السلام کی لغزش کے تکوینی اسرار پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اور جو بات اس عاصی مخلوق کے خلیفہ بنانے میں فرشتوں کی فہم میں نہ آ سکی تھی وہ بھی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے اور یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان ہر سہ انواع میں خلافت کا استحقاق للہ .....

منها عبادة النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۱۸۶) عن المغیرۃؓ قال قام النبیﷺ صلی اللہ علیہ وسلم حتی تورمت قدماہ فقیل لہ لم تصنع ھذا و قد غفرلک ما تقدم من ذنبک و ما تأخر قال افلا اکون عبدا شکورا. (متفق علیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبادت

(۱۱۸۶) مغیرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل قیام فرمایا ہے کہ پیروں پر ورم چڑھ گیا اس پر لوگوں نے عرض کی آپ کے تو اگلے پچھلے معاملات سب درگزر ہو چکے آپ کس لیے یہ مشقت اٹھاتے ہیں؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ (متفق علیہ)

ؒ ..... کس کو ہونا چاہیے۔ فرشتوں کی نظر صرف بنوآدم کی معصیت تک ہی محدود رہی اور اسی حد تک ان کی عصمت کا تقاضہ ہونا چاہیے' وہ معصیت سے آشنا نہ تھے اس لیے استغفار و توبہ کی حقیقت پہچانتے تو کیسے پہچانتے رحمت نے یہ کرشمہ دکھلا دیا کہ صورت معصیت کے ساتھ اگر استغفار و توبہ رہے تو جنت سے ہبوط' ہبوط نہیں وہ خلود کی بشارت ہے اور اس کا نقد ثمرہ خلافت الٰہیہ ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ زمین پر وقت کے سب سے بڑے اور آخری خلیفہ ہوں ان کی زبان سے مخلوق خدا ایک ایک مجلس میں سو سو بار بھی استغفار سن لے۔

خوب یاد رکھیے خطرہ معصیت سے نہیں خطرہ یہ ہے کہ معصیت کے بعد استغفار نہ ہو اور جب استغفار نہ ہو تو پھر صرف معصیت ہی معصیت رہ جائے اور اس طرح انسان بنی آدم کی فہرست سے نکل کر اولاد ابلیس میں شمار نہ ہو جائے اب آپ ہی اندازہ فرمالیجئے کہ جب آغاز عالم میں مخلوق الٰہی میں مقبول و مردود کی تقسیم کی بنیاد استغفار ٹھہری اور آئندہ بھی اس درمیانی مخلوق کی اس طرف یا اس طرف مردم شماری کا مدار اسی استغفار پر ٹھہرا تو پھر استغفار کرنا کتنا اہم وظیفہ ہونا چاہیے اور نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ دلیل معصیت ہوئی یا برہان معصیت۔ واللہ یھدی من یشآء الی صراط مستقیم.

(۱۱۸۶) * انبیاء علیہم السلام کی نفلی عبادت کا معیار بہت بلند ہوتا ہے وہ فرائض میں امت کی خاطر تخفیف کا لحاظ رکھتے ہیں لیکن جہاں ان کا انفرادی معاملہ آیا پھر وہاں ان کی شان الگ نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبد کی ترقی کا سارا راز ہی جب عبادت میں پنہاں ہو تو جتنا بڑا اعبد ہو اس کی شان عبادت بھی اتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو۔ یہاں قرآن کا حکم بھی یہی تھا۔ ﴿قم الیل الا قلیلا﴾ آپ کی عبادت کی ایک صورت یہ ہے کہ رات بھر مصروف عبادت رہیں اور صرف تھوڑے سے حصہ میں استراحت ہو۔ تو پھر حکم ایزدی کی تعمیل میں آپ کی جدوجہد جتنی بھی وسیع ہو سب بجا تھی۔ پھر آپ کی اتباع میں آئندہ بھی بعض ائمہ نے اس سنت کو تازہ رکھا ہے۔ اس حدیث میں یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ عبادت کی کثرت صرف اس میں منحصر نہیں کہ گناہ موجود ہوں بلکہ بندہ کی شکر گذاری کی بڑی سے بڑی صورت یہی ہے اس لیے بخشش و کرم کا انعام جتنا زیادہ ہو عبادت کی شان بھی اتنی ہی اونچی ہونی چاہیے۔ یہاں آپ نے دو لفظ فرمائے ہیں عبدٌ' شکورٌ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت پہلے تو تقاضہ عبدیت ہے' پھر تقاضائے شکر گذاری بھی یہی ہے۔ جب میں عبد بھی عبد شکور ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میری عبادت اسی کے مناسب نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے عبد سب ہی ہیں اس لیے اس نعمت کا شکر سب ہی کے ذمہ واجب ہے لیکن ایسے عبد نادر ہیں جو عبد بھی ہوں اور شکور بھی ہوں۔ ﴿و قلیل من عبادی الشکور﴾ میں کفران نعمت کا شکوہ ہے۔ یہ جماعت انبیاء علیہم السلام ہی کا خاصہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر شکر گذار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شکور نہیں وہ گویا عبد ہی نہیں۔ ﴿انہ کان عبدا شکورا﴾ بے شک نوح شکر گذار بندے تھے۔

الانبیاء وَالرُّسل علیھم الصّلوٰۃ وَ السلام وَاعدَادُھم

حضرات انبیاء علیہم السلام اوران کی تعداد

(۱۱۸۷) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

(۱۱۸۷) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ کل انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ

(۱۱۸۷) * واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز شان یہ ہے کہ ان سب کو ماننا بھی ایمان کا ایک رکن اعظم ہے جن کا نام بیان میں آچکا ہے ان کے نام کے ساتھ اور جن کا نام بیان میں نہیں آیا ان پر اجمال کے ساتھ۔ یہاں انبیاء علیہم السلام کی ذات گو سب کے مشاہدہ میں موجود ہوتی ہے مگران کی نبوت کا معاملہ پھر اسی طرح عالم غیب میں داخل ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور جنت و دوزخ کا۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو خود بھی اپنی اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے' کیونکہ جو چیز مشاہدہ میں ہوتی ہے وہ صرف ان کی ذات ہے ان کی نبوت نہ مشاہدہ ہوتی ہے اور نہ وہ مشاہدہ کرنے کی چیز ہے۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ کا منکر کافر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں کسی ایک فرد کا انکار یا اجمالاً ان کی جنس ہی کا انکار یہ سب کفر ہیں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ. (البقرہ:۲۸۵)

لفظ نبی کا اشتقاق: حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ نبی کا لفظ نبأ سے مشتق ہے اور لغت میں انباء گو ہر چیز کے لیے مستعمل ہوسکتا ہے لیکن اس کا عام استعمال اب صرف غیب کی خبروں میں ہونے لگا ہے۔ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے:

وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ. (آل عمران:۴۹)	اور جو تم اپنے گھر میں کھا کر آتے ہو اور جو رکھ کر آتے ہو وہ میں تم کو سب بتا دیتا ہوں۔
فَلَمَّا نَبَّاَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ. (التحریم:۳)	پھر جب آپ نے اس بات کو جلا دیا تو وہ بولیں آپ کو یہ خبر کس نے دی آپ نے فرمایا اس نے بتا دیا جو بڑا جاننے والا اور واقف کار ہے۔
قُلْ ھُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ اَنْتُمْ عَنْہُ مُعْرِضُوْنَ. (ص:۶۷-۶۸)	کہہ دو کہ ایک بڑی خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔
عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ. (عم:۱-۲)	کس چیز کے متعلق یہ باہم گفت و شنید کر رہے ہیں ایک بہت بڑی خبر کے متعلق۔ (یعنی قیامت)
وَ اِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّھُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْبَآئِکُمْ. (الاحزاب:۲۰)	اور اگر وہ فوجیں آجائیں تو یہ آرزو کریں کہ کسی طرح ہم گاؤں میں باہر نکلے ہوئے ہوں پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں۔
وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعْدَ حِیْنٍ. (الزمر:۸۸)	اور تھوڑے دنوں بعد اس کی خبر جان لوگے۔
لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ. (انعام:۶۷)	ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ تم اس کو جان لوگے۔
اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ. (البقرہ:۳۱)	(فرشتوں سے فرمایا) اچھا ان چیزوں کے نام مجھ کو بتاؤ۔
یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ. (البقرہ:۳۳)	اے آدم تم ان کو بتا دو ان چیزوں کے نام۔ بقیہ.....

كَمُ الْاَنْبِيَاءُ قَالَ مِائَةُ اَلْفِ نَبِيَّ وَ اَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُوْنَ اَلْفًا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمِ الرُّسُلُ مِنْهُمْ قَالَ ثَلٰثُ مِائَةٍ وَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ جَمٌّ غَفِيْرٌ

چوبیس ہزار- میں نے پوچھا یارسول اللہ اس میں رسول کتنے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین سو تیرہ کی بڑی تعداد- اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر! ان میں چار نبی تو سریانی تھے- آدم' شیث' نوح'

..... قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ. (التوبہ) کہہ دو بہانہ مت بناؤ ہم ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے اللہ تعالیٰ ہم کو تمہارے حالات بتا چکا ہے-

دیکھو ان تمام مواضع میں لفظ انباء کا استعمال صرف ان خبروں میں ہوا ہے جو اپنے علم و مشاہدہ کی نہیں ہیں بلکہ لاعلمی اور عدم موجودگی کی ہیں اس لیے اس کو نبی پڑھنا چاہیے تھا لیکن تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے اور اب بجائے مہموز کے اس کو نبی (معتل) استعمال کرنے لگے ہیں- اس کے مہموز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع انبیاء آتی ہے- دیکھو کتاب النبوات ص ۲۲۲ و ص ۲۲۳-

<u>نبی کے معنی</u>: حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ ''نبی'' فعیل کے وزن پر ہے- لغت عرب میں یہ وزن ''فاعل'' اور ''مفعول'' دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے مگر یہاں اس کو مفعول کے معنی میں لینا زیادہ موزوں ہے- اس لحاظ سے ''نبی اللہ'' کے معنی یہ ہوں گے الذی نبأہ اللہ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہو اور اس کو غیب کی خبریں دی ہوں- اب یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ان کی اطلاع دے- اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تو وہ دوسروں کو بھی اس کی اطلاع دے دے گا- ورنہ نہیں لیکن جس بات پر اس کا ''نبی اللہ'' ہونا موقوف ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو غیب کی خبریں دی جائیں- پس جس حرف سے نبی اور غیر نبی میں امتیاز پیدا ہوتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبریں دینا نہ دینا ہے- غیب کی خبریں جس طرح انبیاء علیہم السلام بیان کرتے ہیں اسی طرح ان کے علاوہ کاہن و جوتشی وغیرہ بھی بیان کرتے ہیں مگر پھر ان کو انبیاء کیوں نہیں کہا جاتا؟ صرف اس لیے کہ کاہن کو خبر دینے والا شیطان ہوتا ہے' رحمٰن نہیں ہوتا اس لیے وہ نبی اللہ کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے- لفظ رسول کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیے ''رسول اللہ'' بھی صرف اسی کو کہا جائے گا جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو پس جیسے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا رسول ہو کسی غیر کا رسول نہیں ہو سکتا اور نہ کسی دوسرے کا حکم مان سکتا ہے اسی طرح ''نبی اللہ'' بھی غیر اللہ کا نبی نہیں بن سکتا اور نہ وہ کسی اور کی خبریں دینا قبول کر سکتا ہے- جب حقیقت یہ ٹھہری کہ اس کی خبریں صرف انہی خبروں میں منحصر ہو گئیں تو ان پر ایمان لانا بھی لازم ہو گیا کیونکہ اس کے متعلق یہ وہم ہی نہیں ہو سکتا کہ جو خبریں وہ دیتا ہے اس میں شیطان کی وحی کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے- غیر نبی کی یہ شان نہیں- اولیاء اللہ بھی غیب کی خبریں مگر چونکہ وہ ''نبی اللہ'' نہیں ہوتے اس لیے ان کی خبروں پر یہ اعتماد نہیں ہو سکتا کہ اس میں شیطان کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی' یہ صرف ''نبی اللہ'' کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ فطرۃً غیر اللہ کی خبر قبول ہی نہیں کرتا- اس کے علاوہ دوسروں کی خبروں میں یہ امکان موجود ہوتا ہے اس لیے وہاں حق و باطل مشتبہ ہو سکتے ہیں- اس لیے ان کی خبروں پر ایمان لانا واجب نہیں ہوتا اور اسی لیے رسول کی طرح ان کی اطاعت کرنی واجب نہیں ہو سکتی- کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اور نبی نہیں بنایا تو اب اس کی کیا ضمانت ہے کہ غیر اللہ نے اس کے قلب میں کوئی بات القاء نہیں کی پھر ان کی اطاعت کو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیسے کہا جا سکتا ہے- رسول چونکہ اسی لیے رسول بنایا جاتا ہے کہ وہ خدائی احکامات دوسروں تک پہنچا دے اس لیے وہاں یہ احتمال نہیں ہو سکتا اور اسی لیے دوسروں کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے- .....

ثُمَّ قَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ! اَرْبَعَةٌ سُرْيَانِيُّوْنَ اٰدَمُ وَشِيْثٌ وَنُوْحٌ وَخُنُوْخٌ وَهُوَ اِدْرِيْسُ وَهُوَ اَوَّلُ مَنْ خَطَّ بِقَلَمٍ وَ اَرْبَعَةٌ مِنَ الْعَرَبِ هُوْدٌ

خنوخ (علیہم السلام) یہ ادریس علیہ السلام کا نام ہے اور یہ پہلے وہ نبی ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا - اور چار ان میں عرب کے ہیں - ہودؑ صالحؑ، شعیب (علیہم السلام) اور تمہارا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بنی اسرائیل میں جو

لله ..... وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء:٦٤)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمان سے -

علماء امت بھی گو اللہ تعالیٰ ہی کی حکم برداری اور اسی کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں اور اکثر ان کا یہ حکم درست ہی ہوتا ہے، مگر چونکہ ان کو غیر اللہ کی اطاعت پر اللہ کی اطاعت سمجھنے کی غلط فہمی ہو سکتی ہے اس لیے نادانستگی میں وہ غیر اللہ کی اطاعت کا حکم بھی دے سکتے ہیں اسی لیے علماء کی اطاعت کو بعینہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار نہیں دیا جا سکتا - یہی حال امت کے محدثین اور ملہمین کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں وہ بھی معصوم نہیں ہوتے اس لیے ان کے الہامات میں بھی شیطانی وساوس کا احتمال ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے الہامات کے حق و ناحق ہونے کا معیار انبیاء علیہم السلام کی وحی سے مطابقت و مخالفت قرار دیا گیا ہے - شیاطین کو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پوری عداوت ہوتی ہے اس لیے وہ خوب پہچانتے ہیں کہ رحمٰن کی وحی کیا ہے اور شیطان کا فریب کیا ہے - کتاب النبوات ص ۱۶۶ و ص ۱۶۷ -

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کیا عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکامات رسول کے واسطے سے ہمارے پاس آئیں وہ تو کسی تفصیل کے بغیر بے چون و چرا قابل تسلیم ہوں اور جو ہم خود بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے سنیں یعنی الہام کے طور پر وہ اس وقت تک قابل اعتماد نہ ہوں جب تک کہ رسول کی وحی پر اس کو تول نہ لیا جائے - چنانچہ رسول کی شان میں ارشاد ہے:

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (الحشر:٧)

رسول جو تم کو دے وہ لے لو اور جس بات سے روکے اسے چھوڑ دو -

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ رسول کی بات مطلقاً قبول کر لینی فرض ہے - اب یہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ رسول اللہ کی ذات خود تو مقید ہے (ظاہر ہے کہ انسان ہر گوشہ میں مقید ہے اپنی ذات میں بھی اور اپنی صفات میں بھی) مگر اس کا حکم ماننا مطلقاً واجب ہے - لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گو خود تو مطلق ہے مگر اس کے بلاواسطہ احکام کا قبول کرنا مفید ہے - یعنی اس کو میزانِ شریعت پر تولنا ضروری ہے - پھر اس کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ رسول چونکہ خود معصوم ہوتا ہے اور اس کو اسی لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام مخلوق کے سامنے بیان کرے اس لیے جب اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے تو پھر اس کی حکم برداری کا حکم مطلق کیوں نہ ہو - رسول کے علاوہ کسی کو اس لیے مقرر نہیں کیا جاتا کہ وہ احکام ربانی دوسروں تک پہنچائے، اس لیے ''مبین''، یعنی کھول کر بیان کرنے والا - ان کا منصب نہیں ہوتا اس لیے وہاں یہ احتمال موجود ہوتا ہے کہ اس میں کوئی غیبی آزمائش ہو، قدرت کو یہ امتحان منظور ہو کہ اعتماد رسول کی وحی پر ہے یا اپنے الہام پر - پھر اگر اپنے الہام پر اعتماد کر لیا گیا ہے تو کیوں؟ قدرت نے جب ان کو نبی نہیں بنایا تو ان پر شیطان دشمن کی طرف سے وحی کیوں نہیں آسکتی اور ان کے پاس اس کی ضمانت کیا ہے کہ جس کو انہوں نے الہام رحمٰن سمجھا ہے وہ درحقیقت الہام رحمٰن ہی ہے - یہ ضمانت صرف ایک رسول کے حق میں ہے ان کے علاوہ کسے باشد ان کے علوم میزان ہی علوم نبوت ہیں - الیواقیت والجواہر - ص ۸۴ و ۸۵ ج ۲ -

نبی اور رسول کا فرق: حافظ ابن تیمیہؒ نبی اور رسول کا فرق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو غیب کی خبریں لله .....

وَ صَالِحٌ وَ شُعَيْبٌ وَ نَبِيُّكَ وَ اَوَّلُ نَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اٰخِرُهُمْ عِيْسٰى وَ اَوَّلُ النَّبِيِّيْنَ اٰدَمُ وَ اٰخِرُهُمْ | سب سے پہلے نبی تھے وہ موسیٰ علیہ السلام تھے اور سب سے آخری عیسیٰ (علیہ السلام) تھے خلاصہ یہ کہ نبیوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب سے آخر میں تمہارا نبی (اللھم صل وسلم و بارک علیھم) یہ

﴿بقیہ﴾ ..... دے کر نبی بنا دے تو وہ ''نبی اللہ'' بن جاتا ہے- اور جب تک کسی کافر قوم کو خدائی پیغامات پہنچانے کا اس کو حکم نہ دے اس وقت تک وہ صرف ''نبی اللہ'' ہی رہتا ہے خواہ وہ کسی پہلی شریعت پر ہی عمل کرتا رہے ہاں جب اس کو کسی کافر قوم کو خدائی احکام پہنچانے کا حکم ہو جائے تو اب وہ ''نبی اللہ'' ہونے کے ساتھ ''رسول اللہ'' بھی بن جاتا ہے-حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان جو اس کے برگزیدہ بندے گذرے ہیں وہ سب انبیاء تھے- ''رسول اللہ'' ان میں کوئی نہ تھا- ان کا وظیفہ صرف یہ تھا کہ وحی ربانی پر خود عمل کریں اور مؤمنوں کی جو جماعتیں ان کے سامنے تھیں ان کو بھی عمل کرنے کا حکم دیں- جب حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا اور کفر ظاہر ہوا تو اب ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے اور وہ رسول اللہ کہلائے- اسی لیے ان کو حدیثوں میں سب سے پہلا رسول کہا گیا ہے-

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا مقصد: اس بیان سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تذکیر ونصیحت کا تعلق صرف مؤمنوں کے دائرہ تک محدود رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر احکامات آتے اور وہ ان کو مؤمنوں کو سنادیتے جیسا کہ انبیاء بنی اسرائیل تھے وہ خود تورات کی شریعت پر عامل تھے- اگر چہ خاص خاص معاملات میں ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص خاص وحی بھی آتی تھی- پھر وہ اس وحی کی روشنی میں بنی اسرائیل کے مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں- یہی نکتہ تھا کہ آپ نے اپنے علماء امت کو بنی اسرائیل کے انبیاء سے تشبیہ دی ہے اور علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل فرمایا ہے اور بنی اسرائیل کے رسولوں سے تشبیہ دے کر یوں نہیں فرمایا علماء امتی کرسل بنی اسرائیل۔

اس کے بعد حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ رسول کے لیے جدید شریعت لانا قطعاً ضروری نہیں- دیکھو حضرت یوسف علیہ السلام رسول اللہ تھے باوجودیکہ وہ ملت ابراہیمی پر تھے- اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی رسول اللہ تھے اور شریعت تورات پر عامل تھے- کتاب النبوات ص ۱۷۳ و ۱۷۴-

نبوت اور رسالت کی اس تشریح سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ صرف وحی یا ارسال یا بعثت کے لفظ سے نہ رسالت ثابت ہوتی ہے نہ نبوت یہ سب الفاظ لغت میں عام معنی میں بھی مستعمل ہوتے ہیں- ارشاد ہے-

وحی کا عام اطلاق: ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا الخ ...﴾ (النحل:٦٨)

''اور تمہارے پروردگار نے وحی بھیجی (یعنی حکم دیا) شہد کی مکھی پر کہ پہاڑوں میں چھتے بنالے-''

﴿وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ (یوسف:١٥)

''اور ہم نے (یوسف علیہ السلام) کو اشارہ کیا (وحی کی) کہ تم ان کے کام ان کو جتاؤ گے اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے-''

﴿وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ (القصص:٧)

''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو حکم بھیجا کہ اس کو دودھ پلاتی رہ-''

﴿وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ﴾ (المائدۃ:١١١)

نبیک. (اخرجه ابن حبان فی صحیحه و قال حدیث موضوع تو نہیں مگر ضعیف ہے۔
صاحب الدر المنثور و الصواب انه ضعیف لا (درمنثور)
صحیح و لا موضوع) (اخرجه عبد بن حمید و الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول و ابن حبان فی صحیحه و الحاکم و ابن عساکر) وقد تکلم الحافظ ابن کثیر فی اسانیده وضعفها کما فی البدایة والنهایة ج۲ ص ۱۵۱ و ج۳ ص ۱۵۳ و ج۱ ص ۹۷)

ﷺ..... ''اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔''

﴿وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِهِمْ﴾ (الانعام:۱۲۱)

''اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے۔''

﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ﴾ (الرحمٰن:۳۵)

''چھوڑے جائیں تم پر آگ کے صاف شعلے اور دھواں ملے ہوئے۔''

رسالت کے عام معنی: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِه﴾ (الاعراف:۵۷)

''اور وہی ہے کہ ہوائیں خوش خبری لانے والی چلاتا ہے بارش سے پہلے۔''

﴿یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ﴾ (ھود:۸۱)

''مہمانوں نے کہا اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ ہرگز آپ تک نہ پہنچ سکیں گے۔''

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا﴾ (مریم:۸۲)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطان رکھ چھوڑے ہیں جو ان کو ابھار ابھار کر اچھالتے ہیں۔''

بعثت کے دوسرے معنی: ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ﴾ (بنی اسرائیل:۵)

''پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے بھیجے۔''

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (الاعراف:۱۶۷)

''اور اس وقت کو یاد کرو جب تیرے رب نے خبر کر دی تھی کہ یہود پر ایسے شخص کو ضرور بھیجتا رہے گا جو ان کو برا عذاب دیا کرے۔''

پہلی پانچ آیتوں میں وحی کا اطلاق وحی نبوت کے علاوہ عام معنوں میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نہ نبیہ تھیں نہ رسول اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر جس وحی کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ان کے بچپن کا واقعہ ہے اس وقت تک وہ رسول نہ تھے۔ اسی طرح حواری بھی رسول نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس عام معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال شہد کی مکھی میں بھی آیا ہے اور آخری آیت میں شیطانی القاء کو بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ لغت کے لحاظ سے ہر وہ بات جو خفیہ طور پر اور اشارات میں کہی جائے وحی کہلاتی ہے۔ وحی نبوت ایک خاص اصطلاح ہے۔ اسی طرح لفظ رسول اور ارسال بھی عام ہے۔ اس لفظ کو بھی اللہ تعالیٰ' ملائکہ' شیاطین' آتش اور ہواؤں میں بھی استعمال فرمایا گیا ہے۔ آیات بالا ملاحظہ فرمائیے لیکن اصطلاح میں اس کا اطلاق اب صرف اللہ تعالیٰ کی رسالت سے ﷺ.....

....

ﷺ ..... مخصوص ہے- عام رسالت کا مقصد صرف کسی مقررہ خدمت کا انجام دینا ہوتا ہے- یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق کو کوئی پیغام پہنچایا جائے یہی حال لفظ بعث کا ہے اس کا استعمال بھی بعثت شرعی اور بعثت کونی دونوں میں آیا ہے- یہاں گفتگو ان کے عام معانی میں نہیں، بلکہ خاص ''وحی النبوۃ'' و ''نبی اللہ'' و ''رسول اللہ'' بالاضافت کے معنی میں ہے اور جو تشریح اوپر بیان کی گئی ہے وہ ان مقید الفاظ ہی کی ہے-[1]

❁ ❁ ❁

---

[1] واضح رہے کہ نبی اور رسول کے الفاظ اسلامی تصانیف میں اللہ کے اسم مبارک کے بعد دوسرے درجہ کی شہرت رکھتے ہیں حتیٰ کہ علمی کتابوں میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی خواہ وہ کسی فن کی کیوں نہ ہو جس میں ان الفاظ کی تشریح نہ کی گئی ہو مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ اصطلاحات کی ریاضت نے اس بدیہی مسئلہ کو بھی اتنا الجھا دیا ہے کہ اس جیسا صاف مسئلہ بھی ہر جگہ نظری بنا ہوا نظر آتا ہے- حافظ موصوف نے جس طرح یہاں اس کو سلجھا دیا ہے اتنا صاف ہماری نظر سے اور کہیں نہیں گذرا- حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ حافظ موصوف کی پوری کتاب النبوات میں ایک یہی مسئلہ قابل قدر ہے-

اس لیے اگر آیات قرآنیہ اور صحیح حدیثوں کی روشنی میں یہ تحقیق درست ثابت ہوتی ہے تو کسی ضعیف روایت کی بناء پر اس کو ترک کرنا صحیح نہیں ہو سکتا- آدم علیہ السلام کے متعلق اکثر حدیثوں میں ''نبی مکلم'' کے لفظ آتے ہیں- اگر کسی راوی نے یہاں رسول کا لفظ نقل کر دیا ہے تو اتنی بیش قیمت تحقیق کو صرف راوی کے ایک لفظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا- اس لیے اس روایت کی بناء پر جن بعض اکابر نے حافظ موصوف سے یہاں اختلاف رائے فرمایا ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق نہیں- واللہ تعالیٰ اعلم.

سیدنا وسید ولد ادم الرسول الاعظم محمد النبی الامی المطلبی الھاشمی اولھم خلقا و اخرھم بعثا صلوات اللہ وسلامہ علیہ

معنوی نظر میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ قرآن شریف سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کی ابتداء وانتہاء بشکل دائرہ ہوئی ہے۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہے کہ ایک دائرہ کے لیے کیا کیا باتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دائرہ کی ابتداء اور اس کی انتہاء بالکل یکساں ہوتی ہے' اس کے دونوں سروں میں اگر ذرا سا بھی فرق رہ جائے تو دائرہ تمام نہیں ہوسکتا' پھر ہر دائرہ کے لیے ایک مرکز کا ہوتا بھی لازم ہے۔ مرکز کے بغیر کسی دائرہ کا موجود نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب تک مرکز متعین نہ ہو جائے اس وقت تک دائرہ کا خط کھینچ ہی نہیں جا سکتا۔ پھر جب مرکز متعین ہو جائے تو دائرہ میں جتنے بھی نقطے فرض کیے جائیں ضروری ہے کہ ان سب کا رخ اسی مرکز کی طرف رہے اگر کوئی نقطہ اس مرکز سے ذرا علیحدہ فاصلہ پر رہے گا بس نہ وہیں سے دائرہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر جس طرح وجود دائرہ کے لیے مرکز کا تعین پہلے ضروری ہوتا ہے اسی طرح ظہور مرکز کے لیے دائرہ کے وجود کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب دائرہ کھینچا جاتا ہے تو ضرور کسی مرکز سے کھینچا جاتا ہے مگر جب تک دائرہ تمام نہیں ہو لیتا اس وقت تک مرکز کا وجود معرض ظہور میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ کسی دائرہ میں دو مرکز نہیں ہو سکتے' البتہ ایک ہی مرکز پر چھوٹے بڑے بہت سے دائرے کھینچے جا سکتے ہیں۔ اب سنیے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کی آفرینش بشکل دائرہ ہوئی ہے اسی لیے اس کا ابتدائی نقطہ یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور اس کا انتہائی نقطہ یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام دونوں کو یکساں فرمایا گیا ہے۔ یہ صفت دائرہ ہی کی ہوتی ہے کہ جو اس کا ابتدائی نقطہ ہوتا ہے وہی آخر میں اس کا انتہائی نقطہ بن جاتا ہے۔ خط مستقیم میں یہ صفت نہیں ہوتی اس کے ابتداء وانتہاء کے دونوں نقطے بالکل علیحدہ علیحدہ ممتاز ہوتے ہیں۔ یہاں جب دائرہ کے ابتدائی نقطہ کی طرف نظر کی جاتی ہے تو وہ حضرت آدم علیہ السلام نظر آتے ہیں جن کے نہ والدہ تھیں نہ والد۔ ان کے بعد حضرت حواء کا وجود ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے بنائی گئی تھیں اس لیے اس کو ولادت سے تعبیر کیا نہیں جا سکتا جیسے کسی شخص سے اگر اس کا ہاتھ الگ کر لیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہاتھ اس سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حواء کو چونکہ ضلع آدم علیہ السلام سے بنایا گیا تھا اس لیے ان کو آدم علیہ السلام کی ذریت میں شمار نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اب ان کو بھی سلسلہ تخلیق میں اسی مرتبہ میں رکھنا پڑے گا جس میں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام بہ حیثیت والد کے نہ سہی بہ حیثیت اصل ہونے کے حضرت حواء سے اشرف ہوں مگر یہ نسبت صرف ان دونوں کے درمیان رہے گی بنی آدم کے لیے دونوں ہی مبداء ہوں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سلسلہ خلافت کے لیے اور اجسام انسانیہ کے مبدأ اول اور حضرت حواء صرف اجسام انسانیہ کے لیے مبدء مگر مبدء ثانی ہوں گی۔ اب اگر ان پر غور کیا جائے تو حضرت حواء کے لیے والدہ کوئی نہیں ہاں حضرت آدم علیہ السلام ان کی اصل ہونے کی وجہ سے والد کی جگہ کہے جا سکتے ہیں۔ پس جب تخلیق کے ابتدائی نقطہ جو اس کے مقابلہ میں آ کر دائرہ کو پورا کر سکتا ہے ایسا ہی ہونا چاہیے جس میں ایک مذکر اور ایک مؤنث ہو مگر یہاں والدہ ہو مگر والد کوئی نہ ہوتا کہ اطراف دائرہ میں ایک طرف کی کمی اور دوسری طرف کی زیادتی بالمقابل آجائیں یعنی اگر ابتداء میں والدہ کی کمی ہے تو انتہاء میں والدہ کی زیادتی ہو اور اگر ابتداء میں والد کی زیادتی ہے تو انتہاء میں والد کی کمی رہے اور اس طرح اطراف دائرہ کے نشیب وفراز دونوں مل کر ایک دائرہ پورا ہو سکے۔ یہاں جب تمام انبیاء علیہم السلام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس صفت کا انسان بجز حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اور کوئی نہیں ملتا۔ سلسلہ تخلیق میں اگر ایک طرف

حضرت حواء ہیں جن کی والدہ نہ تھیں تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے والد نہ تھے- شاید یہ خیال گذرے کہ اس بناء پر تشبیہ ان دو میں ہوئی لہٰذا بظاہر آیت یوں ہونی چاہیے تھی کہ ان مثل عیسی عند اللہ کمثل حواء تاکہ جو دو نقطے مقابل تھے وہی معرض بیان میں آتے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے مقصد چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا والد کے بغیر صرف اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر کرنا منظور ہے اس لیے اس میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کے ساتھ تشبیہ دینی زیادہ مؤثر تھی اگر کمثل حواء فرماتے تو حضرت حواء کے لیے حضرت آدم علیہ السلام والد کے قائم مقام موجود اور یہاں منظور یہ تھا کہ علاقہ والدیت کا یکسر قلع قمع کر دیا جائے لہٰذا ایسی ہستی کے ساتھ تشبیہ دی جن کے لیے نہ والد تھے نہ والدہ تاکہ خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بھی پورا ثبوت ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کسی ادنیٰ سی تشبیہ سے بھی والد کا خطرہ ذہن میں نہ گذر سکے- اس بیان سے ظاہر ہے کہ دائرہ نبوت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم ہو گیا-

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں:

و قوله اذ جعل فيكم انبياء اى كلما هلك نبى قام فيكم نبى من لدن ابيكم ابراهيم الى من بعده و كذلك كانوا لا يزال فيهم الانبياء يدعون الى الله و يحذرون نعمته حتى ختموا بعيسى عليه السلام.

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۳۱)

اللہ تعالیٰ کے قول اذ جعل فیکم انبیاء کی تفسیر یہ ہے کہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو تم میں سے ہی دوسرا نبی اس کے قائم مقام آجاتا -تمہارے والد (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) سے لے کر بعد تک یہی دستور رہا اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتے رہے اور اس کے عذاب سے ڈراتے رہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم کر دیا گیا-

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس تقدیر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا رہے گی تو اس کا جواب ظاہر ہے وہ یہ کہ آپ کی حیثیت مرکز کی حیثیت ہے اسی لیے آپ کو مرکز کی طرح ظاہری طور پر بھی سلسلہ نبوت سے بالکل الگ سلسلہ میں پیدا فرمایا گیا تھا اور تعجب ہے کہ یہاں بھی اس کی رعایت رکھی گئی کہ جس طرح مرکز ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور دوسرا رسول ہی پیدا نہ ہو- پھر جس طرح آپ کو دائرہ نبوت کا مرکز بنایا گیا تھا اسی طرح آپ کی ولادت کے لیے بھی وہی مقام پسند فرمایا گیا جو زمین کا مرکز کہلاتا ہے یعنی مکہ مکرمہ- اور جس طرح بیت اللہ کو زمین کا مرکز قرار دے کر سب سے پہلے وجود میں لایا گیا تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق بھی سب سے پہلے مقدر ہوئی تاکہ تعین مرکز ہو لے تو دائرہ نبوت اسی کے ارد گرد کھینچا جا سکے لیکن مرکزیت کا ظہور چونکہ دائرہ کی تمامیت پر موقوف ہوتا ہے اس لیے مقدر یوں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسی طور پر ظہور قدسی جملہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد ہو اور جس طرح محیط دائرہ کی نسبت ہر طرف سے اپنے مرکز سے مساوی ہوتی ہے اسی طرح جملہ انبیاء علیہم کی نسبت مرکزی حیثیت سے آپ کے ساتھ برابر رہے حتی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام جیسی بڑی شریعت والا رسول بھی آپ کے دور میں آتا تو اس کو بھی آپ کی اتباع کیے بغیر کوئی اور راستہ نہ تھا- اسی مرکزیت کے اعلان کے لیے جملہ انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت کا قولاً و عملاً عہد لیا گیا تھا اور اسی کے اظہار کے لیے شب معراج میں جملہ انبیاء علیہم السلام کی امامت کا شرف آپ کو ہی عنایت ہوا اور اسی حقیقت کے عالم آشکارا کرنے کے لیے محشر میں ''لواء حمد'' یعنی حمد کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں ہوگا جس کے نیچے آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء علیہم السلام ہوں گے- تفصیل کے لیے ترجمان السنۃ ج اص ۳۴۳ حدیث نمبر ۱۱۴ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرما لیجیے-

اس بیان کے اہم رکن دو ہیں-تکوینی نظر میں نبوت کی تخلیق بشکل دائرہ ہوئی اور آپ کی تخلیق بہ حیثیت مرکز ہوئی ان دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ موجود ہے اس لیے ہمارے اس بیان کو گو برہان کا درجہ حاصل نہ ہو مگر محض خیالی بھی نہیں کہا جا سکتا- ہمارے مذکورہ بالا بیان سے اب حدیث انا اولھم خلقا و اخرھم بعثا کی پوری شرح بھی ہوگئی-اس مضمون کی تائید قرآن کریم کی ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے ارشاد ہے-کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ. یعنی ابتداء آفرینش دین ایک ہی تھا پھر جو جو اختلاف رونما ہوئے وہ امتوں کی کج رویوں سے رونما ہوئے-اسی طرح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں دین پھر ایک ہی رہ جائے گا جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دست مبارک سے ڈال چکے ہیں- مذاہب ساویہ میں بنیادی لحاظ سے قبلے دو رہ چکے ہیں: بیت مقدس' بیت اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خود بیت مقدس کا بھی استقبال فرمایا اس کے بعد پھر بیت اللہ کو قبلہ متعین فرمادیا-سوچئے جب آخر کار قبلہ یہی ہونا تھا تو بیت مقدس کے عارضی استقبال کی حکمت کیا تھی؟ بے شک ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آخری رسول کے دور میں سابقہ سب اختلافات کو ختم کر کے پھر ایک دین پر جمع کر دیا جائے اور اس کی صورت یہی تھی کہ آپ عملی طور پر یہ بتا دیں کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی تھا-قبلہ کے مسئلہ کو صرف ناسمجھی سے اختلافات کی بنیاد بنایا گیا-اس لیے مدینہ طیبہ میں آ کر پہلے آپ نے بیت مقدس ہی کا استقبال فرمایا اور عملاً یہ ثابت فرمادیا کہ یہ مسئلہ کوئی بنیادی اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا-اسی لیے جو رسول وحدت ادیان کا اہم مقصد لے کر آیا ہے وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ قبلہ کی تقسیم صرف ایک وقتی مصلحت کے پیش نظر رہی ہے ورنہ اصل مقصد توجہ الی اللہ ہے اور یہ کسی خاص سمت کے ساتھ مخصوص نہیں فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ. اس حقیقت کو آپ نے اتنا واضح فرمایا کہ استقبال قبلہ جو نماز کی صحت کی شرائط میں شمار ہوتا ہے نفل نمازوں میں بحالت سفر مسافر کی سہولت پر چھوڑ دیا-

الغرض جب ابتداء میں دین ایک تھا تو چونکہ دائرہ کی ابتداء اور انتہاء یکساں ہوتی ہے اس لیے عالم کی انتہاء میں پھر دین ایک ہی ہو جانا چاہیے اس لیے اس کی صورت یہ مقدر ہوئی کہ جس طرح ایک اسماعیلی رسول نے آ کر اسرائیلی قبلہ کا استقبال کیا تھا اسی طرح ایک اسرائیلی رسول آ کر اسماعیلی قبلہ کا استقبال کر لے اور یہ بات پورے طور پر واضح ہو جائے کہ نہ تو اصل دین میں کوئی اختلاف ہے اور نہ انبیاء علیہم السلام میں باہم کوئی اختلاف ہے- جو اختلافات بھی ہوئے یہ سب امتوں کی کج روی کے نتائج تھے-كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ. اب اگر اس مقصد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوتی تو یہ ختم نبوت کے خلاف تھا اس لیے مقدر یوں ہوا کہ آپ سے پہلے وہ بہ حیثیت نبوت ان کا ظہور بھی ہو جائے پھر اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ کی دوسری آمد بہ حیثیت امامت بھی ہو ظاہر ہے کہ جو بنی اسرائیل کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا- اب بنی اسماعیل میں اس کی آمد سے اس کے نبی ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ اپنے دورۂ نبوت کو پورا کر کے اب بہ حیثیت امامت امت محمدیہ تشریف لائیں گے اور ہم پہلے ترجمان السنہ ج ۱ ص ۳۴۳ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ مقام وہ تھا جس کو اولوالعزم انبیاء نے بھی تمناء کی ہے اس لیے یوں مقدر ہوا کہ اس اہم مقصد کے ظہور کے لیے عالم کے خاتمہ پر وہ رسول آئے جو پہلے نبی سے مشابہ ہوتا کہ جس طرح دین پہلے ایک تھا آخر میں پھر ایک ہی رہ جائے اور جب اس طرح اتحاد ملل کا کام مکمل ہو جائے تو پیدائش عالم کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو جانے کی وجہ سے عالم کی صف لپیٹ کر رکھ دی جائے اور قیامت آ جائے-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اَوَّلِهِمْ خَلْقًا وَ اٰخِرِهِمْ بَعْثًا

(۱۱۸۸) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ شَفِيْعٍ فِي الْجَنَّةِ لَمْ يُصَدَّقْ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ مَا صُدِّقْتُ وَ اِنَّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ نَبِيًّا مَا صَدَّقَهُ مِنْ اُمَّتِهٖ اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ. (رواہ مسلم)

(۱۱۸۸) میں جنت کے لیے سب سے پہلا شفاعت کرنے والا ہوں- انبیاء سابقین میں اس کثرت کے ساتھ کسی کی تصدیق نہیں کی گئی جتنی کہ میری-بعض انبیاء تو ایسے بھی ہوئے ہیں جن کی تصدیق صرف ایک ہی شخص نے کی ہے-

(مسلم شریف)

(۱۱۸۹) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ اَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَ اَوَّلُ شَافِعٍ وَ اَوَّلُ مُشَفَّعٍ. (رواہ مسلم)

(۱۱۸۹) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ روزِ محشر تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہوں گا-قبر پھٹ کر جو سب سے پہلا شخص باہر آئے گا وہ میں ہوں' جو نبی سب سے پہلے مخلوق کی شفاعت کرے گا وہ میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی وہ میں ہوں- (مسلم شریف)

(۱۱۹۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَكْثَرُ الْاَنْبِيَاءِ تَبَعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ يَقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ.

(رواہ مسلم)

(۱۱۹۰) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- قیامت میں جس نبی کے ماننے والے سب سے زیادہ ہوں گے وہ میں ہوں' اور جو سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے دستک دے گا وہ میں ہوں-

(۱۱۹۱) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰتِيْ بَابَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَسْتَفْتِحُ فَيَقُوْلُ الْخَازِنُ مَنْ اَنْتَ فَاَقُوْلُ مُحَمَّدٌ فَيَقُوْلُ بِكَ اُمِرْتُ اَنْ لَّا اَفْتَحَ لِاَحَدٍ قَبْلَكَ. (رواہ مسلم)

(۱۱۹۱) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- قیامت کے دن میں جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور دروازہ کھلواؤں گا- جنت کا دربان پوچھے گا آپ کون؟ میں کہوں گا میں ہوں محمدؐ وہ عرض کرے گا مجھ کو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں آپ ہی کے لیے دروازہ کھولوں' آپ سے پہلے کسی شخص کے لیے نہ کھولوں- (مسلم شریف)

(۱۱۹۲) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَا فَخْرَ وَ بِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَ لَا فَخْرَ وَ مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِيْ وَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ وَ لَا فَخْرَ. (رواہ الترمذی)

(۱۱۹۲) ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں-حمد و ثناء کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور وہ بھی کوئی فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سواء جتنے رسول ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلا شخص جو زمین پھٹ کر باہر آئے گا وہ میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں- (ترمذی شریف)

(۱۱۹۳) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۱۱۹۳) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ بیٹھے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے-

فَخَرَجَ حَتّٰی اِذَا دَنَا مِنْهُمْ سَمِعَهُمْ يَتَذَاكَرُوْنَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا وَ قَالَ اٰخَرُ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَلَّمَهُ تَكْلِيْمًا وَ قَالَ اٰخَرُ فَعِيْسٰى كَلِمَةُ اللّٰهِ وَ رُوْحُهُ وَ قَالَ اٰخَرُ اٰدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ قَالَ قَدْ سَمِعْتُ كَلَامَكُمْ وَ عَجَبَكُمْ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَ هُوَ كَذٰلِكَ وَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَجِيُّ اللّٰهِ وَ هُوَ كَذٰلِكَ وَ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ رُوْحُهُ وَ كَلِمَتُهُ وَ هُوَ كَذٰلِكَ وَ اٰدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ وَ هُوَ كَذٰلِكَ اَلَا وَ اَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَحْتَهُ اٰدَمُ فَمَنْ دُوْنَهُ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَ اَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ يُّحَرِّكُ غَلَقَ الْجَنَّةِ فَيَفْتَحُ اللّٰهُ لِيْ فَيُدْخِلُنِيْهَا وَ مَعِيْ فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ وَ لَا فَخْرَ.

(رواہ الترمذی و الدارمی)

جب ان کے قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گفتگو سنی کوئی تعجب سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے۔کوئی کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر براہ راست گفتگو کی ہے۔کوئی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہلانے کا شرف بخشا ہے۔ کوئی اور یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صفی اللہ کے لقب سے نوازا ہے۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا میں نے تمہاری تمام گفتگو اور تمہارے تعجب کا معاملہ دیکھا اور سنا۔کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ تھے جیسا کہ تم کہہ رہے تھے اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی عطا ہوا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے لقب سے نوازے گئے تھے اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نظر ربوبیت میں خلافت کے لیے منتخب ہوئے۔لیکن تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں حبیب اللہ ہوں اور یہ فخر یہ بات نہیں ہے اور قیامت میں حمد وثناء کا جھنڈا میرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔آدم علیہ السلام اور ان کے سواء سب مخلوق اس کے نیچے ہوگی اور یہ بھی فخر یہ بات نہیں ہے اور قیامت میں سب سے پہلا مخلوق کی شفاعت کرنے والا رسول میں ہوں اور سب سے پہلے جس کی شفاعت قبول ہوگی وہ رسول بھی میں ہوں اور یہ بھی فخر یہ بات نہیں ہے۔جنت کی کنڈی جو سب سے پہلے کھٹکھٹائے گا وہ رسول میں ہوں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے میرے لیے جنت کھولے گا اور مجھ کو اس میں داخل فرمائے گا اور اس وقت میرے ساتھ ساتھ محتاج مؤمنوں کی جماعت بھی ہوگی اور میں اللہ تعالیٰ کی نظر میں گذری ہوئی اور آنے والی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ معزز و مکرم ہوں اور اس میں فخر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

(۱۱۹۴) عَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ وَ نَحْنُ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ اِنِّيْ قَائِلٌ قَوْلًا غَيْرَ فَخْرٍ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَ مُوْسٰى صَفِيُّ اللّٰهِ وَ اَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَ مَعِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَنِيْ فِيْ اُمَّتِيْ وَ اَجَارَهُمْ

(۱۱۹۴) عمرو بن قیسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں گو ہم سب سے بعد میں آئے ہیں لیکن قیامت میں ہم سب سے آگے ہوں گے اور دیکھو میں ایک بات کہتا ہوں اور کسی فخر سے نہیں کہتا ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام صفی اللہ ہیں لیکن میں حبیب اللہ ہوں قیامت میں حمد وثناء کا جھنڈا میرے ساتھ ہوگا۔اور اللہ تعالیٰ نے میری امت کے معاملہ میں مجھ سے وعدہ فرمایا ہے اور تین باتوں

مِنْ ثَلٰثٍ لَا يَعُمُّهُمْ بِسَنَةٍ وَ لَا يَسْتَأْصِلُهُمْ عَدُوٌّ وَ لَا يَجْمَعُهُمْ عَلٰى ضَلَالَةٍ.

(رواه الدارمی)

سے ان کو پناہ دے دی ہے ایک یہ کہ عام قحط میں ان کو مبتلا نہیں کرے گا۔ دوم یہ کہ ان کا دشمن بیخ و بن سے ان کو ہلاک نہیں کر سکے گا۔ تیسرے یہ کہ میری پوری کی پوری امت گمراہی میں پڑ جائے ایسا بھی نہیں ہوگا۔ (دارمی)

(۱۱۹۵) و عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا قَائِدُ الْمُرْسَلِيْنَ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَ لَا فَخْرَ وَ اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَ مُشَفَّعٍ وَ لَا فَخْرَ.

(رواه الدارمی)

(۱۱۹۵) جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام رسولوں کا قائد میں ہوں اور یہ فخر یہ بات نہیں اور میں تمام نبیوں کے آخر میں آیا ہوں اور یہ بات بھی فخر یہ نہیں اور تمام مخلوق کی سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی وہ رسول میں ہوں اور یہ بات بھی فخر یہ نہیں ہے۔ (دارمی)

(۱۱۹۶) عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا اِذَا بُعِثُوْا وَ اَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَ اَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا وَ اَنَا مُسْتَشْفِعُهُمْ اِذَا حُبِسُوْا وَ اَنَا مُبَشِّرُهُمْ اِذَا اَيِسُوْا الْكَرَامَةُ وَ الْمَفَاتِيْحُ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَ لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَ اَنَا اَكْرَمُ وُلْدِ اٰدَمَ عَلٰى رَبِّيْ يَطُوْفُ عَلَيَّ اَلْفُ خَادِمٍ كَاَنَّهُمْ بَيْضٌ مَكْنُوْنٌ اَوْ لُؤْلُؤٌ مَنْثُوْرٌ.

(رواه الترمذی و الدارمی و قال الترمذی حدیث غریب)

(۱۱۹۶) انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمام لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے باہر آنے والا میں ہوں گا' جب وہ جماعتیں بن کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے تو ان کا قائد میں ہوں گا' اور جب سب خاموش رہیں گے تو ان کی جانب سے بولنے والا میں ہوں گا اور جب وہ میدانِ محشر میں پھنس جائیں گے تو ان کے لیے شفاعت کی اجازت طلب کرنے والا میں ہوں گا اور جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو ان کو بشارت دینے والا میں ہوں گا۔ بزرگی اور کنجیاں اس دن سب میرے ہاتھ میں ہوں گی اور حمد و ثنا کا جھنڈا بھی اس دن میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام اولادِ آدم میں سب سے پیارا میں ہوں گا۔ میرے ارد گرد ہزار خادم حاضر رہیں گے جو اس طرح سفید رنگ ہوں گے گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے انڈے ہیں یا بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ (ترمذی۔ دارمی)

(۱۱۹۷) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاُكْسٰى حُلَّةً مِنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ الْعَرْشِ لَيْسَ اَحَدٌ مِنَ الْخَلَائِقِ يَقُوْمُ ذٰلِكَ الْمَقَامَ غَيْرِيْ.

(رواه الترمذی و فی روایة جامع الاصول عنه قال) مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ فَاُكْسٰى.

(۱۱۹۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اس کے بعد جنتی حلوں میں سے ایک حلہ (ایک لباس کا نام ہے) لا کر مجھ کو پہنایا جائے گا' پھر میں عرش کے دائیں جانب آ کر کھڑا ہوں گا جہاں کھڑے ہونے کا منصب میرے سوا اور کسی کا نہیں۔

(ترمذی شریف)

(۱۱۹۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلُوا اللّٰهَ لِی الْوَسِیْلَةَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا الْوَسِیْلَةُ قَالَ اَعْلٰی دَرَجَةٍ فِی الْجَنَّةِ لَایَنَالُهَا اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَ اَرْجُوْ اَنْ اَکُوْنَ اَنَا هُوَ. (رواه الترمذی)

(۱۱۹۸) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مقام وسیلہ کی دعاء مانگا کرو۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وسیلہ کیا چیز ہے؟ فرمایا وہ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے جو صرف ایک شخص کو ملے گا اور مجھ کو پوری امید ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ (ترمذی شریف)

(۱۱۹۹) عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَةِ کُنْتُ اِمَامَ النَّبِیِّیْنَ وَ خَطِیْبَهُمْ وَ صَاحِبَ شَفَاعَتِهِمْ غَیْرَ فَخْرٍ. (رواه الترمذی)

(۱۱۹۹) ابی بن کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو سب نبیوں کا امام میں ہوں گا اور میں ہی ان کا خطیب اور شفاعت کرنے والا ہوں گا اور یہ بات فخریہ نہیں ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۰۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَ اِنَّ وَلِیِّیْ اَبِیْ وَ خَلِیْلُ رَبِّیْ ثُمَّ قَرَأَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِیُّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ. (رواه الترمذی)

(۱۲۰۰) عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے انبیاء میں سے کوئی ولی ہوتا ہے۔ میرے ولی وہ ہیں جو میرے دادا اور میرے رب کے خلیل ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی بلاشبہ سب میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے حضرت ابراہیم کے ساتھ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کی اتباع کی اور یہ نبی ہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ سب مؤمنوں کا ولی ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۰۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی فَضَّلَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ وَ عَلٰی اَهْلِ السَّمَاءِ فَقَالُوْا یَا ابْنَ عَبَّاسٍ بِمَ فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلٰی اَهْلِ السَّمَاءِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ لِاَهْلِ السَّمَاءِ وَ مَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْ اِلٰهٌ مِنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِکَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ قَالُوْا وَ مَا فَضْلُهٗ عَلٰی

(۱۲۰۱) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر بھی فضیلت بخشی ہے اور آسمان والے تمام فرشتوں پر بھی لوگوں نے پوچھا اے ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرمایئے جس بات سے سب فرشتوں پر فضیلت دی ہے وہ کیا ہے؟ جواب دیا وہ بات یہ ہے کہ فرشتوں کے حق میں تو یہ فرمایا ہے کہ جو ان میں یہ کہے گا کہ میرے سواء خدا کوئی اور ہے تو اس کو ہم بس دوزخ کی جزا دیں گے اور نامنصفوں کو ہم ایسی ہی جزاء دیتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح نصیب فرمائی ہے تاکہ اللہ آپ کے گذشتہ اور آئندہ تمام فروگذاشتوں سے درگزر فرمائے (مخاطب دونوں جگہ معصوم مخلوق ہے مگر طرز خطاب میں فرق کتنا ہے) لوگوں نے عرض کی اچھا

اَلْاَنْبِیَاءِ قَالَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ فَیُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَّشَاءُ الایۃ وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ مَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِلنَّاسِ فَاَرْسَلَہٗ اِلَی الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ. (رواہ الدارمی)

تو جس بات سے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ہے وہ بات کیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ سب رسولوں کے حق میں تو ارشاد یہ ہے کہ ہم نے جو رسول بھی بھیجا وہ اپنی قوم کی زبان کا بھیجا اس کے بعد پھر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا گمراہ کیا الخ- اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے تو آپ کو جنات و انسان سب کے لیے رسول بنایا-

(۱۲۰۲) عَنْ مَالِکِ بْنِ صَعْصَعَۃَ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدَّثَھُمْ عَنْ لَیْلَۃِ اُسْرِیَ بِہٖ بَیْنَمَا اَنَا فِی الْحَطِیْمِ وَ رُبَّمَا قَالَ فِی الْحِجْرِ مُضْطَجِعًا اِذَا اَتَانِیْ اٰتٍ فَشَقَّ مَابَیْنَ ھٰذِہٖ اِلٰی ھٰذِہٖ یَعْنِیْ مِنْ ثُغْرَۃِ نَحْرِہٖ اِلٰی شِعْرَتِہٖ فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِیْ ثُمَّ اُتِیْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَھَبٍ مَمْلُوٍّ اِیْمَانًا فَغَسَلَ قَلْبِیْ ثُمَّ حُشِیَ ثُمَّ اُعِیْدُوْا فِیْ رِوَایَۃٍ ثُمَّ غَسَلَ الْبَطْنَ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِیءَ اِیْمَانًا وَ حِکْمَۃً ثُمَّ اُتِیْتُ بِدَابَّۃٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَ فَوْقَ الْحِمَارِ اَبْیَضَ یُقَالُ لَہٗ

(۱۲۰۲) حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرام سے اس شب کا واقعہ جس میں آپ کو بیت مقدس اور آسمانوں کی سیر کرائی گئی تھی اس طرح بیان فرمایا کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا اور کبھی حجر کا لفظ کہا (مراد دونوں کی ایک ہے) کہ ایک فرشتہ آیا اور اس نے یہاں سے لے کر یہاں تک میرا پیٹ چاک کیا یعنی کوڑی کے پاس سے لے کر زیر ناف تک پھر اس نے میرے قلب کو نکالا اور اس کے بعد ایک سونے کا طشت ایمان و حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا اور اس فرشتہ نے میرے قلب کو دھویا- ایک روایت میں اس طرح ہے کہ پھر میرے پیٹ کو آب زم زم سے دھویا اور اس کے بعد اس میں ایمان و حکمت بھر دیا پھر میرے سامنے ایک جانور پیش کیا گیا جو خچر سے ذرا چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا سفید رنگ

(۱۲۰۲) * معراج کے واقعہ پر اہل قلم اور علماء کبار کے اتنے مضامین مسلمانوں کے سامنے آ چکے ہیں کہ ان کے بعد اب اس کی تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی-

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں چند باتیں تحریر فرمائی ہیں جو عام طور سے ہماری نظر سے نہیں گذریں اس لیے ہم اس اہم موضوع کو صرف ان کی مختصر تنبیہات پر ختم کرتے ہیں- عام لوگ تو کیا خاص لوگ بھی خال خال یہ علم رکھتے ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا تذکرہ پہلے صحیفوں میں بھی آ چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر علامات میں اس کو بھی بطور ایک علامت کے شمار کرایا گیا ہے- چنانچہ حافظ موصوف لکھتے ہیں:

قال دانیال النبی: ایضًا سالت اللہ و تضرعت الیہ ان یبین لی مایکون من بنی اسرائیل فذکر شانھم الی ان قال حتی ابعث نبیا من بنی اسمعیل الذی بشرت بہ ھاجر فذکر صفاتہ الی ان قال اسری بہ اتی و ارقیہ من السماء الی سماء حتی یعلو قادنیہ و اسلم علیہ و اوحی الیہ ثم اردہ الی عبادی بالسر درد الغبطہ ثم سرد دانیال قصۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ھذہ الیشارۃ الی الآن عند الیھود و النصاری یقرؤ نھاو یقولون لم یظھر صاحبھا بعد. (الجواب الصحیح ج ٤ ص ٣)

حضرت دانیال نبی نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ بنی اسرائیل کا حال مجھ سے بیان فرمایئے تو اس نے ان کے لئے .....

اَلْبراقُ يَضَعُ خَطْوَهُ عِنْدَ اَقْصٰى طَرْفِهٖ فَحُمِلْتُ عَلَيْهِ فَانْطَلَقَ بِىْ جِبْرَئِيْلُ حَتّٰى اَتَى السَّمَاءَ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَ مَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْئُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا فِيْهَا اٰدَمُ قَالَ هٰذَا اَبُوْكَ اٰدَمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَ النَّبِىِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِىْ حَتّٰى اَتَى السَّمَآءَ الثَّانِيَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَ مَنْ مَّعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْئُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ اِذَا يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ هُمَا ابْنَا خَالَةٍ قَالَ هٰذَا يَحْيٰى وَ هٰذَا عِيْسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ

کا تھا اس کو براق کہا جاتا ہے (اس کی رفتار کی حالت یہ تھی) کہ وہ اپنا قدم اس جگہ ڈالتا تھا جہاں اس کی نظر پہنچتی تھی مجھے اس پر سوار کیا گیا اور مجھے لے کر جبرئیل علیہ السلام اوپر چلے یہاں تک کہ جب اس دنیا کے آسمان تک پہنچے تو انہوں نے دروازہ کھلوایا ان سے دریافت کیا گیا کون؟ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل- پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں- فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ہاں اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے- یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا- جب میں دروازہ سے نکل گیا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں- جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ آپ کے والد ماجد آدم ہیں ان کو سلام کیجئے' میں نے سلام کیا' انہوں نے سلام کا جواب دیا' پھر فرمایا صالح فرزند اور نیک نبی خوش آمدید مبارک ہو' پھر مجھ کو لے کر جبرئیلؑ اور اوپر چڑھے اور دوسرے آسمان پر آئے' دوسرے آسمان پر پہنچے' تو انہوں نے دروازہ کھلوایا' ان سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ جبرئیل نے کہا میں جبرائیل ہوں کہا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انھوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں- ان سے پوچھا گیا کہ ان کو معراج ہوئی ہے؟ کہاں ہاں! اس کے بعد فرشتوں نے خوش آمدید کہا اور تشریف آوری پر مبارک باد پیش کی' پھر دروازہ کھول دیا' چنانچہ جب میں اندر داخل ہوا تو

لے ..... حالات بیان فرما دیئے یہاں تک کہ فرمایا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک نبی اٹھاؤں گا جس کی بشارت میں نے ہاجر کو دی پھر اس نبی کی صفات ذکر کیں یہاں تک کہ فرمایا میں شب میں اس کو بلاؤں گا اور آسمان در آسمان سیر کراتے ہوئے اس کو اوپر بلاؤں گا اور اس کو اپنے قریب کر کے اس پر صلوٰۃ و سلام بھیجوں گا اور اس کو وحی کے ذریعہ اسرارِ پنہاں سے آگاہ کروں گا اس کے بعد شادان و فرحاں اپنے بندوں کے پاس اس کو پھر واپس کروں گا- اس کے بعد دانیال علیہ السلام نے آپ کا پورا قصہ ذکر فرمایا- یہ بشارت آج تک یہود کے ہاں چلی آتی ہے نصاری بھی اس کو پڑھتے ہیں مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کا مصداق ابھی نہیں آیا-

حافظ موصوفؒ کی اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ قصہ اسراء و معراج صرف اسی امت میں متواتر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحف میں بھی اسی طریقہ پر موجود ہے' اگر اس واقعہ کی حیثیت صرف ایک خواب کی سی ہوتی تو کیا اس کا تذکرہ اسی انداز سے کتب سماویہ میں ملنا چاہیے اور کیا اکتیس صحابہ کو تواتر کے ساتھ اس کو روایت کرنا چاہیے- اس کے بعد ایک دوسرے موقعہ پر حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کا تذکرہ سورۂ اسراء میں مسجد اقصیٰ تک صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جتنے حصہ کے متعلق کفار کے مقابلہ میں دلیل قائم ہو سکتی تھی وہ اتنا ہی حصہ تھا اس کے بعد آپ کی آسمانوں کی سیر پر کوئی دلیل ایسی قائم نہیں کی جاسکتی جو ان کو لے .....

وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ اِلَى السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ وَ مَنْ مَّعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ اِذَا يُوْسُفُ قَالَ هٰذَا يُوْسُفُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى اَتَى السَّمَاءَ الرَّابِعَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَ مَنْ مَّعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا اِدْرِيْسُ فَقَالَ هٰذَا اِدْرِيْسُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِيْ حَتّٰى اَتَى السَّمَاءَ الْخَامِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَ

دفعتہً دیکھا کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تشریف فرما ہیں' یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے' حضرت جبرئیلؑ نے بتایا یہ یحییٰ علیہ السلام ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں' آپ ان دونوں کو سلام کیجئے' میں نے ان کو سلام کیا' دونوں نے سلام کا جواب دیا اس کے بعد انہوں نے میرا استقبال کرتے ہوئے فرمایا۔ مرحبا مرحبا آیئے برادر صالح۔ آیئے نبی صالح' پھر حضرت جبرئیلؑ مجھے لے کر تیسرے آسمان کی طرف بڑھے' دروازہ کھلوایا' وہاں بھی پوچھا گیا آپ کون ہیں؟ کہا گیا جبرئیلؑ' سوال ہوا آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوچھا گیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ حضرت جبرئیلؑ نے کہا جی ہاں! مرحبا مرحبا کی صدا آئی' اور خوش آمدید کہا گیا' اور دروازہ کھول دیا آگے بڑھا تو دیکھا حضرت یوسف علیہ السلام تشریف فرما ہیں' حضرت جبرئیلؑ نے بتایا یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں' ان کو سلام کیجئے' میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا' پھر انہوں نے مرحبا بالاخ الصالح و النبی الصالح کے کے الفاظ سے خوش آمدید کہا' پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر چوتھے آسمان کے پاس پہنچے پوچھا گیا' کون ہیں؟ حضرت جبرئیلؑ نے کہا میں جبرئیل ہوں' کہا گیا کہ آپ کے ساتھ کون بزرگ ہیں؟ انہوں نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں' پوچھا گیا' کیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! مرحبا مرحبا اور خوش آمدید

لے ..... ساکت کر سکے۔ پھر جب بیت مقدس تک آپ کا سفر بحالت بیداری قابل تسلیم ہو جائے تو چونکہ یہ ایک ہی سفر تھا اس لیے اس کا دوسرا حصہ خود بخود تسلیم کرنا پڑے گا' کیونکہ اگر آپ کی صداقت اس حصہ کے متعلق ثابت ہو جاتی ہے تو دوسرے حصہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہاں کسی کا خیال یہ بھی ہے کہ اسراء صرف اتنے ہی حصہ کا نام ہے دوسرے حصہ کا نام معراج ہے مگر اس بناء پر یہ سوال پھر اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جب یہ دونوں سفر ایک ہی سلسلہ کے تھے تو جداگانہ دو سورتوں میں اس کے بیان فرمانے کا نکتہ کیا ہے۔ حافظ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ سورۂ اسراء میں گو دوسرے حصہ کی تفصیل نہیں کی گئی مگر یہ اشارہ صراحت کے ساتھ کر دیا گیا ہے کہ اس سفر کا مقصد بلند تھا اور تھا اور وہ یہ کہ ہم کو اپنی کچھ خاص نشانیاں آپ کو دکھانی مقصود تھیں جن کا تذکرہ سورۂ والنجم میں واضح فرما دیا گیا ہے۔ سورۂ اسراء میں "لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا" فرمایا ہے اور سورۂ والنجم میں "وَ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى" فرمایا ہے۔ جس میں سدرۃ المنتہیٰ' جنت و دوزخ اور جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھنا تھا:

و کذلک صعوده لیلة المعراج الی مافوق السموات و هذا مما تواترت به الا حادیث و اخبر به القرآن اخبر بمسراه لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی. و فی موضع آخر بصعوده الی السموات لے .....

مَنْ مَّعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا هَارُوْنُ قَالَ هٰذَا هَارُوْنُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِیْ حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ السَّادِسَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ مَنْ مَّعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا مُوْسٰی قَالَ هٰذَا مُوْسٰی فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ فَلَمَّا جَاوَزْتُ بَکٰی قِيْلَ لَهٗ مَا يُبْکِيْکَ قَالَ اَبْکِیْ لِاَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِیْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِهٖ اَکْثَرَ مِمَّنْ يَّدْخُلُهَا مِنْ اُمَّتِیْ ثُمَّ صَعِدَ بِیْ اِلَی السَّمَآءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَ مَنْ مَّعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَ قَدْ بُعِثَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيْلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا اِبْرَاهِيْمُ اَبُوْکَ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَ النَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ رُفِعْتُ اِلَیَّ

کے الفاظ کے ساتھ استقبال ہوا' اور دروازہ کھول دیا' میں اندر بڑھا تو حضرت ادریس علیہ السلام کو موجود پایا' انہوں نے بتایا کہ یہ حضرت ادریسؑ ہیں ان کو سلام کیجئے حضرت جبرئیلؑ کے اس تعارف کے بعد میں نے سلام کیا انہوں نے جواب دیا' پھر حضرت ادریسؑ نے مرحبا مرحبا اخ صالح نبی صالح کہہ کر استقبال فرمایا پھر حضرت جبرئیلؑ مجھے لے کر آگے بڑھے' پانچویں آسمان پر پہنچے وہاں سوال ہوا کون؟ کہا' جبرئیلؑ ہوں' پوچھا گیا آپ کے ساتھ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا' محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں- پوچھا گیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں' انہوں نے کہا خوش آمدید' بہت خوب تشریف آوری ہوئی' یہ کہہ کر دروازہ کھولا' میں اندر پہنچا تو حضرت ہارونؑ نظر آئے- جبرئیلؑ نے بتایا- یہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں- ان کو سلام کیجئے' میں نے سلام کیا' انہوں نے جواب دیا' پھر انہوں نے مبارک باد پیش کی پھر یہاں سے مجھے لے کر حضرت جبرئیل چھٹے آسمان پر پہنچے' دروازہ کھولنے کی درخواست کی' پوچھا گیا آپ کون ہیں؟' انہوں نے کہا جبرئیلؑ امینؑ' سوال ہوا آپ کے ساتھ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' پوچھا گیا ان کو معراج کی دولت نصیب ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں مرحبا اور خوش آمدید کہا اور دروازہ کھول دیا' میں اندر داخل ہوا تو دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف فرما ہیں' حضرت جبرئیلؑ نے بتایا یہ حضرت موسیٰؑ ہیں- سلام کیجئے' میں نے سلام کیا' انہوں نے سلام کا جواب دیا انہوں نے بھی مجھے مبارک باد پیش کی- میں جب آگے بڑھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے' پوچھا گیا کیوں رو رہے ہیں' آپ نے فرمایا اس لیے روتا ہوں کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں' ان کی امت میری امت سے زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی- پھر حضرت جبرئیلؑ مجھے لے کر اوپر چڑھے اور ساتویں آسمان پر پہنچے اور دروازہ کھولنے کو کہا' پوچھا آپ کون؟ انہوں نے کہا

ﷺ ..... واخبر انه نعل ذلک ليريه من آياته و كان فى اخباره بالمسرى ليريه من آياته بيان انه رأى من آياته مالم يره الناس و قد بين فى السورة الاخرى و انه راى جبرئيل عليه السلام عند سدرة المنتهى عند هاجنة الماوى و انه راى بالبصر آيات ربه الكبرى و ذكر كما فى تلك السورة المسرى. لانه ﷺ .....

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى فَاِذَا نَبْقُهَا مِثْلُ قِلَالِ هَجَرَ وَ
اِذَا وَ رَقُهَا مِثْلَ اٰذَانِ الْفِيْلَةِ قَالَ هٰذَا سِدْرَةُ
الْمُنْتَهٰى فَاِذَا اَرْبَعَةُ اَنْهَارٍ نَهْرَانِ بَاطِنَانِ اَنِ
قُلْتُ مَا هٰذَانِ يَاجِبْرَئِيْلُ قَالَ اما الباطنان
فنهرات فى الجنة و اما الظاهر ان فَالنِّيْلُ وَ
الْفُرَاتُ ثُمَّ رُفِعَ اِلَىَّ الْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ ثُمَّ
اُتِيْتُ بِاِنَاءٍ مِنْ خَمْرٍ وَ اِنَاءٍ مِّنْ لَبَنٍ وَ اِنَاءٍ مِّنْ
عَسَلٍ فَاَخَذْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ هِىَ الْفِطْرَةُ اَنْتَ
عَلَيْهَا وَ اُمَّتُكَ ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ
خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ
عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَا اُمِرْتَ قُلْتُ اُمِرْتُ
بِخَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا
تَسْتَطِيْعُ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ وَ اِنِّىْ وَ
اللّٰهِ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَ عَالَجْتُ
بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ اِلٰى
رَبِّكَ فَسْئَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِاُمَّتِكَ فَرَجَعْتُ
فَوَضَعَ عَنِّىْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى
فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّىْ عَشْرًا
فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّىْ عَشْرًا فَرَجَعْتُ اِلٰى
مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّىْ
عَشْرًا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ
فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّىْ عَشْرًا فَاُمِرْتُ بِعَشْرِ
صَلَوٰتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ

جبرئیلؑ امین، پوچھا آپ کے ساتھ کون؟ انہوں نے جواب میں کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں! مرحبا، خوش آمدید جب میں آگے بڑھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نظر آئے۔ انہوں نے بتایا یہ حضرت ابراہیم ہیں ان کو سلام کیجئے۔ میں نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا، انہوں نے کہا مرحبا اے ابن صالح خوش آمدید اے نبی صالح، پھر میری طرف سدرۃ المنتہٰی لایا گیا، میں نے دیکھا کہ اس کے پھل مقام ہجر کے مشکوں کے برابر تھے، اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر، حضرت جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ سدرۃ المنتہٰی ہے، وہاں مجھے چار نہریں نظر آئیں، دو اندر کی جانب، اور دو باہر کی جانب، میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ دونوں نہریں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جو نہریں اندر جا رہی ہیں، یہ جنت کی نہریں ہیں، اور جو باہر کی جانب ہیں، یہ نیل و فرات ہیں پھر میرے سامنے بیت المعمور لایا گیا اس کے بعد میرے پاس تین برتن لائے گئے، ایک میں شراب تھی، دوسرے میں دودھ، اور تیسرے میں شہد، میں نے دودھ والا برتن اٹھالیا، جبرئیلؑ نے کہا کہ یہی فطرت ہے، اور آپ اسی پر ہوں گے اور آپ کی امت بھی، پھر مجھ پر ہر دن پچاس نماز فرض کی گئیں لوٹتے ہوئے میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا حکم کیا گیا؟ میں نے بتایا کہ ہر دن پچاس وقتوں کی نماز کا حکم ملا ہے، انہوں نے فرمایا کہ آپؐ کی امت ہر دن پچاس نماز ادا کرنے میں قادر نہ ہو سکے گی، خدا کی قسم آپ سے پہلے میں نے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ زور آزمائی کر چکا ہوں، آپؐ اپنے رب کے پاس واپس ہوں اور تخفیف کی درخواست کریں، میں پلٹ گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں معاف کر دیں۔ میں جب اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، تو انہوں نے پھر ویسی ہی بات کی، چنانچہ میں پھر واپس ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں اور معاف کر دیں، مگر جب پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر پہلے جیسی بات فرمائی، اب میں پھر پلٹ کر

لله ..... امکنه ان یقیم علیه برهانا. (الجواب الصحیح ج ٤ ص ١٦٠)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر جانا تواتر کے ساتھ حدیثوں سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ایک سورت میں مسجد اقصیٰ تک اس کا ذکر ہے اور دوسری سورت میں آسمانوں کے سفر کا ذکر ہے۔ قرآن کریم لله .....

مِثْلَهٗ فَرَجَعْتُ فَأُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ بِمَا اُمِرْتُ قُلْتُ اُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَ اِنِّىْ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَ عَالَجْتُ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ التَّخْفِيْفَ لِاُمَّتِكَ قَالَ سَاَلْتُ رَبِّىْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ وَ لٰكِنِّىْ اَرْضٰى وَ اُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰى مُنَادٍ اَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِىْ وَ خَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِىْ۔ (متفق علیہ)

گیا' اور اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ بھی دس نمازیں معاف کر دیں' لوٹ کر جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا' اب کی مرتبہ پھر انہوں نے وہی بات دہرائی' چنانچہ پھر واپس گیا' چنانچہ پانچ نمازوں کا روزانہ حکم دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا آپ کی امت کو اس پانچ وقت کے نباہنے کی بھی استطاعت نہ ہوگی۔ چنانچہ میں آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنی اسرائیل کے معاملہ میں کافی محنت اٹھا چکا ہوں لہٰذا پھر آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں اور تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے بار بار اپنے رب سے درخواست کی' اب مزید جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لہٰذا میں اب اس پر راضی ہوں اور خوش ہوں' اس کے بعد فرمایا کہ جب میں آگے بڑھا' تو ایک منادی نے آواز دی اب میں اپنا آخری حکم جاری کر چکا اور اپنے بندوں پر جو تخفیف کرنی تھی کر چکا۔ (متفق علیہ)

(اعلم ان الاسراء و رد مطولا و مختصرا من حديث انس و ابى بن كعب و بريدة و جابر بن عبدالله و حذيفة بن اليمان و سمرة بن جندب و سهل بن سعد و شداد بن اوس و صهيب و ابن عباس و ابن عمرو ابن مسعود و عبدالله بن اسعد بن زرارة و عبدالرحمن بن قرط و على بن ابى طالب و عمر بن الخطاب و مالك بن صعصعة و ابى امامة و ابى ايوب الانصارى و ابى حبة و ابى الحمراء و ابى ذر و ابى سعيد الخدرى و ابى سفيان بن حرب و ابى ليلى الانصارى و ابى هريرة وعائشة و اسماء بنتى ابى بكر و ام هانى و ام سلمة رضى الله عنهم كذافى الخصائص الكبرىٰ ج ۱ ص ۱۵۲ و قال فى الشفاو ذهب معظم السلف و المسلمين الى انه اسراء بالجسد و فى اليقظة و هذا هو الحق و ذهب اليه من الصحابة ابن عباس و جابر و انس و حذيفة و عمر و ابى هريرة و مالك بن صعصعة و ابى حبة البدرى و ابن مسعود رضى الله عنهم اجمعين و من التابعين الضحاك و سعيد بن جبير و قتادة و ابن المسيب و ابن شهاب و ابى زيد و الحسن البصرى و ابراهيم النخعى و مسروق و مجاهد و عكرمة و ابن جريج رضى الله تعالى عنهم و جماعة عظيمة من المسلمين و هو قول اكثر المتأخرين من الفقهاء و المحدثين و المتكلمين و المفسرين)

لله ..... نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ بیت مقدس تک آپ کا سفر اس لیے تھا کہ آئندہ آپ کو اپنی خاص نشانیاں دکھانی مطلوب تھیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نشانیاں ایسی ہونی چاہئیں جن کو عام انسانوں نے نہ دیکھا ہو۔ پھر دوسری سورت میں خود ان کی تفصیل فرما دی گئی کہ ان آیات میں سدرۃ المنتہیٰ اور اس کے پاس ہی جبرئیل علیہ السلام کو اصل صورت میں دیکھنا ہے اور وہیں جنت الماویٰ بھی ہے اور قرآن کریم نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو آنکھوں سے دیکھا البتہ سورہ اسریٰ میں بیت مقدس تک کا سفر صرف اس لیے ذکر کیا ہے کہ مخالفوں پر اتنے ہی حصہ کے متعلق حجت قائم کی جا سکتی تھی۔

ابوالبشر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اول نبی اللہ فی الارض

حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جو اختلافات قابل ذکر ہیں ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ جس جنت میں ان کو سکونت کا حکم دیا گیا تھا وہ جنت خلد یعنی بہشت بریں تھی یا اسی زمین پر کوئی باغ تھا۔ اس میں جمہور کا پہلا قول قرار دیا ہے۔ صحیح حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنت سے خلد بریں ہی مراد ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مناظرہ میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ آپ نے اپنی ذریت کو جنت سے نکلوایا۔ اور حدیث شفاعت میں خود حضرت آدم علیہ السلام کا بیان بھی ہے کہ میری ہی وجہ سے تم خلد بریں سے نکلے میں اس کے لئے آج شفاعت کیسے کروں۔ قرآن کریم کی آیت وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان جیسے صریح اور صحیح دلائل کے باوجود یہاں حافظ ابن تیمیہؒ جیسے شخص کا رجحان پھر معتزلہ کے قول کی طرف ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب النبوات)

دوسرا اختلاف ان کے موضع ہبوط کے متعلق ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ دحنان تھا جو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان کوئی مقام ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام کے محل ہبوط ہند، حواء کا ہبوط جدہ، ابلیس کا دستمیسان (بصرہ کے قریب ایک جگہ ہے) اور سانپ اصبہان تھا۔ آدم علیہ السلام کے محل ہبوط کے متعلق سدی کی روایت بھی یہی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہبوط کوہ صفا پر اور حضرت حواء علیہا السلام کا کوہ مروہ پر ہوا تھا۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام صنعتوں کی تعلیم دے کر زمین پر اتارے گئے تھے اور جنت کے پھل بھی ان کے ہمراہ کئے گئے تھے۔ حضرت انس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو بننا اور حضرت حواء علیہا السلام کو کاتنے کی تعلیم دی تھی۔ آدم علیہ السلام نے اپنے لئے جبہ اور حواء علیہا السلام کے لئے ایک کرتی (قمیص) اور ایک اوڑھنی تیار کی تھی اور ان کی پہلی پوشش اون کی تھی۔
(البدایہ ج ۱ ص ۹۲)

کعب احبار بیان کرتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ سب بے ریش ہوں گے، صرف ان کے ڈاڑھی ہوگی، اسی طرح سب اپنے ناموں کے ساتھ پکارے جائیں گے اور یہ کنیت کے ساتھ ان کی کنیت ابومحمد ہوگی۔
(البدایہ ج ۱ ص ۹۷)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ کعبۃ اللہ کے پہلے بانی یہی تھے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ عرشِ الٰہی کے محاذ میں

زمین پر وہ بیت اللہ کی تعمیر کریں اور جس طرح انہوں نے ملائکۃ اللہ کو عرش الٰہی کا طواف کرتے دیکھا ہے اسی طرح خود اس کا طواف کریں- (البدایہ ج ا ص ۹۶)

حضرت آدم علیہ السلام کے موضع دفن کے متعلق مشہور قول یہ ہے کہ ہند میں جس جگہ ان کا ہبوط ہوا تھا اسی جگہ کسی پہاڑ کے قریب ان کا مدفن مبارک ہے- کسی کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل ابوقبیس مشہور پہاڑ میں آپ مدفون ہیں کوئی کہتا ہے بیت مقدس میں ان ہر دو اصل انسانی کے مزارات ہیں- حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ میں ان تمام اختلافات کو ذکر کیا ہے انہوں نے یہ بھی نقل کی ہے کہ حضرت حواء کے ہمیشہ ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی حمل سے پیدا ہوتے تھے اور ان دونوں کے درمیان شادی کی رسم ممنوع قرار دی گئی تھی- حکم یہ تھا کہ ایک حمل کے لڑکے کی شادی دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ کی جائے- ہابیل و قابیل کے قتل کے قصہ میں قتل کا ایک سبب یہ بھی ہو گیا تھا- اہل تاریخ و سیر نے ہابیل کے قتل پر حضرت آدم علیہ السلام کے جو اشعار نقل کئے ہیں حافظ ابن کثیر نے اس میں کلام کیا ہے اور اس کی یہ تاویل کی ہے کہ بظاہر یہ ان کے درد و غم کی کسی اور شخص نے ترجمانی کی ہے-

یہاں امام ترمذی نے باسناد حسن عن سمرۃ ایک حدیث نکل کی ہے کہ حضرت حواء کے کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی شیطان نے آکر ان کو بہکایا کہ اس مرتبہ جو لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دینا وہ زندہ رہے گا- انہوں نے شیطان کے کہنے پر اس بچہ کا نام عبدالحارث ہی رکھ دیا تھا-

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مرفوع ہوئے میں کلام ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ موقوف ہے یعنی صحابی کا قول ہے اور صحابہ نے جس طرح بعض اسرائیلیات روایت فرمائی ہیں یہ بھی اسرائیلیات ہی کی روایت معلوم ہوتی ہے- اس پر قرینہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اصل بشری کے اس جوڑے سے تمام نسل انسانی کو پھیلائے تو یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت حواء کی کوئی اولاد ہی زندہ نہ رہتی- پھر یہ کہ جس آیت کی شرح میں حضرت حسن سے یہ روایت نقل کی گئی ہے خود حضرت حسن سے اس کی دوسری تفسیر موجود ہے- اگر حسن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفسیر موجود ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مرفوع تفسیر کے خلاف کوئی اور دوسری تفسیر اختیار فرماتے- (البدیۃ ج ا ص ۹۹)

شارحین نے حدیث مذکور کی اور توجیہات بھی ذکر فرمائی ہیں وہ اپنے محل میں دیکھ لی جائیں-

حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سلسلہ نسب حضرت شیث علیہ السلام سے چلا ہے- شیث کے معنی ہبۃ اللہ ہیں یعنی عطاء الٰہی- چونکہ ان کی ولادت ہابیل کے مقتول ہونے کے بعد ہوئی تھی اس لئے ان کا نام شیث رکھا گیا تھا محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے قرب وفات میں حضرت شیث علیہ السلام کو چند باتوں کی تعلیم دی تھی اور شب و روز کی ساعتیں اور ہر ساعت کی خاص عبادت کی تعلیم بھی دی تھی اور بعد میں طوفان آنے کی اطلاع بھی فرمائی تھی- (البدایۃ والنہایۃ ج ا ص ۹۸)

(۱۲۰۳) سَمِعْتُ اَبَا اُمَامَةَ اَنَّ رُجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَبِىٌّ كَانَ اٰدَمُ قَالَ نَعَمْ مُكَلَّمٌ قَالَ فَكَمْ كَانَ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ نُوْحٍ قَالَ عَشْرَةُ قُرُوْنٍ. (رواه ابن حبان فی صحیحه قال ابن کثیر فی البدایة و النهایة ج ۱ ص ۱۰۲ علی شرط مسلم و لم یخرجه.

(۱۲۰۳) راوی کہتا ہے میں نے ابو امامہ سے خود سنا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا - یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں نبی تھے اور ایسے نبی تھے جو اس کی شرف ہم کلامی سے مشرف تھے - پھر اس نے پوچھا اچھا ان کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان کتنا زمانہ گذرا ہے - فرمایا دس قرن - (ابن حبان)

و رواه الطبرانی قال الهیثمی و رجاله رجال الصحیح غیر احمد بن خلید و هو ثقة و فی الدر المنثور عشرة اباء مکان عشرة قرون ج ۱ ص ۵۳)

(۱۲۰۴) عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

(۱۲۰۴) ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی

(۱۲۰۳) * حافظ ابن کثیر نے بروایت بخاری ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس قرن کی مدت گذری ہے جن میں سب لوگ اسلام ہی پر تھے ان کے بعد جب بت پرستی اور گمراہیوں کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے - اسی لحاظ سے ان کو سب سے پہلا رسول کہا جاتا ہے - اس لحاظ سے جن مورخین نے لکھا ہے کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آتش پرستی شروع کر دی تھی، یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا - ابن عباس کی روایت اس کی تردید کرتی ہے - حدیث مذکور میں قرون کا لفظ مبہم ہے - لغت میں ''قرن'' کا اطلاق سو سال کی مدت پر بھی آتا ہے اور لوگوں کے ایک طبقہ میں بھی آتا ہے پہلے معنی کے لحاظ سے دس قرن ایک ہزار سال کے ہوتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ مدت ہزاروں سال کی ہوگی کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں عمریں بہت طویل ہوا کرتی ہیں اس لحاظ سے ایک طبقہ کے گذرنے کے لیے ہی بہت طویل مدت درکار ہوگی پھر اسی نسبت سے دس قرن کا اندازہ کر لینا چاہیے (البدایۃ ج ا ص ۱۰۲) درمنثور میں دس قرون کی بجائے دس پشتوں کا لفظ ہے -

(۱۲۰۴) * حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش حسب بیان قرآن شریف صرف حق تعالیٰ کے ایک تکوینی ارادہ کے ماتحت ہوئی تھی یہاں مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کریم کی تاویل کرنی ظلم عظیم ہے اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء پر غائر نظر کرنے کے بعد کوئی اجتماع کی صورت باقی نہیں رہتی یہ سعی خام صرف ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے یا تو مسئلہ ارتقاء کے اطراف و جوانب کو ملحوظ نہیں رکھا یا قرآن کریم میں بے جا تاویل کی اہمیت نہیں سمجھی فلسفہ قدیم کے افلاک تسعہ اور عقول عشرہ کو بھلا اسلامی افلاک سبعہ اور ملائکۃ اللہ سے کیا مناسبت مگر یہاں بھی بے جوڑ تطبیق کی کوشش کی گئی تھی اور اب مرکز حیات یعنی اسلامی روح اور پروٹو پلازم کے مابین تطبیق کی کوشش کی جارہی ہے - وہ بھی خلاف واقع تھا اور یہ بھی خلاف واقع ہے - اور یہ سب کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں پہلے فلسفہ قدیم سے دنیا متاثر تھی اور اب فلسفہ جدید سے مرعوب ہے -

عربی زبان میں آج کل اس کو ''بروتو بلاسما'' کہا جاتا ہے - ہمارے علم میں قرآنی تفسیر میں اس کو سب سے پہلے داخل کرنے والے تفسیر المنار کے مؤلف ہیں - دیکھو تفسیر المنار ص ۳۲۰ ج ۳ - ان کے بعد پھر ان کے اتباع میں دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو جابجا استعمال کیا ہے -

ہم اس موقعہ پر صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ جو لوگ پروٹو پلازم کے قائل ہیں وہ اس حیات کو محض ایک مادی حیات قرار ﷲ .....

كَـمُ الانْبِيَـاءُ مِـائَـه اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُوْنَ اَلْـفًـا قُـلْـتُ يَـا رَسُـوْلَ الـلّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَـلَّـمَ وَكَـمُ الـرُّسُـلُ مِنْهُمْ قَالَ ثَلَاثَـمِائَةٍ وَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ جَمٌّ غَفِيْرٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ

اللہ علیہ وسلم کل انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی تھی؟ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار میں نے عرض کی ان میں رسول کتنے تھے؟ فرمایا تین سو تیرہ کا بہت بڑا گروہ تھا - میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سب سے پہلا رسول کون تھا؟ فرمایا آدم علیہ السلام میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا وہ نبی مرسل

ﷺ ..... دیتے ہیں ان کے نزدیک انسانی حیات و موت کی حقیقت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح پر کہ نباتات کی حیات و موت کی' ان میں نشو و نما کی استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد کے فقدان کا نام موت - آپ کے نزدیک حیات و موت کا تمام تعلق عالم غیب سے وابستہ ہے - روح ایک غیبی حقیقت ہے اس کے نفخ سے انسانی حیات پیدا ہوتی ہے' پھر اس غیبی حقیقت کے نکل جانے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے' وہ نہیں جو کسی شاعر نے کہا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے ان اجزاء کا پریشاں ہونا

اب سوچیے کہ پروٹو پلازم کا صرف نام لے کر کر آپ ان دو راستوں میں کوئی اتحاد پیدا کر سکتے ہیں - خوب یاد رکھئے اگر آپ ایک لاکھ بار بھی پروٹو پلازم کا اقرار کر لیں اور افسوس یہ کہ اس کو قرآن کریم کی تفسیر بھی بنا ڈالیں جب بھی وہ قوم روح کے اس تخیل سے جو آپ کے ذہن میں ہے آپ سے برابر بدکتی رہے گی - لَنْ تَـرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ. اس لیے اس خیال خام اور سعی لا حاصل میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور بے وجہ بحث کر کر کے اسلامی بیانات اور تحقیقات عصریہ کے مابین مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے - بلکہ اسلامی تاریخ کی اس تحریف کا ہم کو حق بھی نہیں ہے -

ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ شریعت سلام نے چونکہ محالات کے تسلیم کرنے کا بوجھ ہم پر کہیں نہیں ڈالا' اس لیے اگر واقعہ میں کوئی بات ایسی موجود ہو جو اسلامی عقل کے چونکہ محال سمجھی جائے تو اس جگہ بے شک تاویل نہ کرنا جمود ہوگا - ہم نہ اس آزادی کے حامی ہیں نہ اس جمود کے قائل - امام رازی نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تفسیر میں دو جگہ اس مذموم مسئلہ کو چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت عقلی لحاظ سے کسی ایک انسان پر جا کر ختم ہونی چاہیے - لابدمن انتهاء الناس الى انسان - (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۴۸۵ و ج ۵ ص ۲۷۵)

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کی بناء پر نسل انسانی کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور تمام انسانوں کے لیے ان کے وجود کو ایک اساس مانا جاتا ہے اسی بنا پر ان کو ابوالبشر کا لقب عنایت ہوا ہے پھر یہ لقب اتنا مشہور کیا گیا ہے کہ اکثر مقامات میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسی لقب کے ساتھ یاد فرمایا گیا ہے - ظاہر ہے کہ جس دور میں صرف ایک انسان نیست ہی نیست ہوا ہو - ابھی قوم اور شریعت کا پتہ تک نہ ہو اس کو رسول اور نبی کے لفظ سے کیسے یاد کیا جا سکتا تھا - باوجودیکہ وہ خدا تعالیٰ سے نبیوں کی طرح ہمکلام بھی تھا لیکن اس کا نقشہ حیات جتنا کہ بحیثیت ابوۃ قابل بیان تھا اتنا بہ حیثیت رسالت نہ تھا - انسانی پیدائش کے بعد جو اہم تر مسئلہ سامنے آتا ہے وہ انسانی معاشیات کا تھا کیونکہ اسی پر اس کے بقاء و نشر کا مدار تھا - یہاں اصولی عقائد میں ابھی کوئی تفریق کا محل ہی نہ تھا - اولاد کے کانوں میں خدا اور اس کی توحید کے سوا کوئی دوسری آواز ہی نہیں پڑی تھی گویا اس وقت عقائد کا مقام وہ تھا جو فطری خصائل کا ہو سکتا ہے اس کے باوجود جب کہیں صف انبیاء علیہم السلام بچھی ہے تو اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ضرور آ گیا ہے اور رسولوں ہی کے ساتھ آیا ہے - دیکھو شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام کا اجتماع کیا گیا حالانکہ حسب بیان احادیث یہ ﷺ .....

كَانَ اٰوَّلُهُمْ قَالَ اٰدَمُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَبِيٌّ مُرْسَلٌ قَالَ نَعَمْ خَلَقَهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ ثُمَّ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُوْحِهٖ ثُمَّ سَوَّاهُ قُبُلًا. (رواه ابن حبان فی صحيحه كذافی البداية و الهاية ص ۹۷)

تھے؟ فرمایا جی ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا تھا' پھر ان میں اپنی خاص روح پھونکی اور اپنے سامنے ان کو ہر طرح سے لیس کر دیا تھا۔

(ابن حبان)

(۱۴۰۵) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ اٰدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَتْرُكَهُ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ

(۱۴۰۵) حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنت میں حضرت آدم کا کالبد تیار کرلیا تو جب تک اس کو منظور تھا اسی صورت پر اس کو رکھا۔ اس درمیان میں ابلیس اس کے گرد

لله..... اجتماع بہت ہی محدود پیانہ پر تھا لیکن اس پر بھی حضرت آدم علیہ السلام وہاں موجود نظر آتے ہیں محشر میں جہاں رسولوں کے سواء کسی کو لب کشائی کی مجال نہ ہوگی اہل محشر کی نظریں جب شفاعت کے لیے رسولوں کی طرف اٹھیں گی تو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف اس طرح اٹھیں گی گویا ان کی رسالت انسانی فطرت میں مرکوز تھی پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نظر کی جاتی ہے تو ان کا جواب بھی وہاں ٹھیک اسی انداز کا نظر آتا ہے جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ گویا خود وہ بھی اپنے نفس کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھتے ہیں' لیکن یہ حقیقت کتنی ظاہر ہے کہ جو سارے انسانوں کی بنیاد ٹھہر چکا ہو اس کے لقب کے لیے دنیا و آخرت میں ابوالبشر سے بڑھ کر اور کون سا لقب ہو سکتا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ایسے دور میں زیر بحث آ گئی ہے جس میں کرشن جی کی نبوت قرین قیاس سمجھی جا رہی ہے۔ اہل قلم چاہتے ہیں کہ بچ بچ کر جس طرح ممکن ہو کرشن کی نبوت کا عقیدہ اس طرح دماغوں میں اتار دیں کہ کسی خلاف کے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی نہ ہو اور ان کی نبوت بھی ثابت ہو جائے۔ ادھر تو یہ فراخ حوصلگی ادھر یہ تنگی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اس طرح شبہات سامنے لاتے ہیں کہ ان پر کوئی گرفت بھی نہ ہو سکے اور ایک نبی کی نبوت کا عقیدہ ذہنوں سے اگر نکل نہ سکے تو کم از کم اس میں شبہات تو ضرور پیدا ہو جائیں۔ ہمیں یہاں کسی فرد کی نبوت و عدم نبوت کی تحقیق کرنی منظور نہیں ہے بلکہ انسانی جدت پسندی کا نوحہ کرنا ہے اور اس پر اہمیت سے تنبیہ کرنی ہے کہ نبوت کوئی ایسا مقام نہیں جو محض حسن ظنی کی بناء پر کسی کے حق میں تجویز کر دیا جائے یہاں احتیاط کا قدم بس یہ ہے کہ جن رسولوں کے نام ہم کو بتائے جا چکے ہیں ان پر تو خاص ایمان رکھا جائے اور ان کے سواء خصوصی اشخاص کے متعلق نہ اس جانب کسی رجحان کا اظہار کیا جائے نہ اس جانب۔ دوم یہ بھی تنبیہ ضروری ہے کہ صرف کسی انسان کی خدا ترسی اس کی نبوت کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کے حق میں نبوت کی حسن ظنی بھی پیدا کر لی جائے۔ امم سابقہ میں کتنے ہی انسان گذرے ہیں جن کے معتقدین نے بنص حدیث ان کی قبروں کو عبادت گاہیں بنالیا ہے مگر ان کے حق میں رسالت کا بے دلیل کوئی گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سوم یہ بات بھی قابل فراموشی نہیں ہے کہ اگر دین کے عام مسلمات جو متقدمین علماء حق کے نزدیک محقق اور مختار ہیں کسی بین اور بدیہی ثبوت کے بغیر غیر معتمد قرار دے دیئے جائیں تو پھر شاید اسلام از اوّل تا آخر بدلا جا سکتا ہے۔ دین محمدی صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوا اس کے کچھ بدیہی مسلمات ہیں جو توارث سے ثابت ہیں اس مقام پر لفظی دلائل کے ساتھ توارث کا خیال رکھنا بھی لازم ہے فیصلہ صرف لفظی بحث سے کر دینا عجلت پسندی مذموم اور جدت طرازی ہے۔

(۱۴۰۵) * اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی صورت خلد بریں میں ہی بنائی گئی تھی۔ اگر جنت سے مراد دنیا کا کوئی باغ ہوتا تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی جس کا تذکرہ حدیثوں میں آتا پھر جب وہیں ان کی صورت بنی تو یقیناً وہیں ان کی سکونت بھی لله.....

يَطُوفُ بِهٖ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَاٰهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهٗ خُلِقَ خَلْقٌ لَايَتَمَا لَكُ.

(رواہ مسلم)

چکر لگاتا اور دیکھتا کہ یہ کیسی مخلوق ہے جب اس نے دیکھا کہ وہ تو اندر سے کھوکھلی ہے (ٹھوس نہیں ہے) تو سمجھ لیا کہ یقیناً یہ ایسی مخلوق بنائی گئی ہے جو اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔ (مسلم شریف)

(۱۲۰۶) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ يَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَائِهِمُ الَّذِيْنَ مَاتُوْا اِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ جَهَنَّمَ اَوْ لَيَكُوْنَنَّ اَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِیْ يُدَهْدِهُ الْخَراءَ بِاَنْفِهٖ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ. (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

(۱۲۰۶) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا۔ یا تو یہ لوگ جو اپنے ان مردہ باپ دادوں پر جو مر کر جہنم میں کوئلہ ہو چکے ہیں فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پاخانہ کے اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہوں گے جو نجاست کو اپنی ناک سے ہٹا ہٹا کر کھسکتا ہے سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔ (پھر فخر کس بات کا) (ترمذی وابوداؤد)

(۱۲۰۷) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَ فِيْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَ فِيْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا.

(رواہ مسلم وفی الصحیح وفیہ تقوم الساعة)

(۱۲۰۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے مبارک دن جس میں آفتاب طلوع کرتا ہے جمعہ کا دن ہے اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن جنت سے نکلے اور قیامت بھی اسی دن آئے گی۔

(مسلم شریف)

للہ ..... ہوگی اور اسی وقت جنت کو آدم علیہ السلام کی وراثت کہنا بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم کی کسی ایک آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دنیا کا باغ تھا۔ آدم علیہ السلام کی سرگزشت مختلف مقامات میں ذکر کی گئی ہے مگر کسی ایک مقام پر بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ آج بھی بہت سے انسان باغوں میں رہتے ہیں اس لیے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں جس کا قرآن کریم بار بار اس انداز سے ذکر فرمائے گویا وہ ان پر قدرت کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا۔ اور معصیت کے بعد پھر اس سے نکلنا کوئی بہت بڑی محرومی تھی جو ہمیشہ قابل یادگار تھی۔

يَا بَنِیْ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ. (الاعراف:۲۷)

اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں ڈال دے جیسا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت میں سے باہر کرادیا۔

(۱۲۰۷) * قرآن کریم میں جابجا چھ دن میں عالم کی تخلیق کا تذکرہ آیا ہے اس کے بعد پھر استواء علی العرش کا ذکر ہے۔ اسلامی نقول کے لحاظ سے عالم کی پیدائش ہفتہ سے شروع ہو کر جمعرات پر ختم ہوگئی ہے اور اس جمعہ میں کچھ اور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسی لحاظ سے ہمارے یہاں جمعہ کا دن تعطیل کا دن شمار ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کتنی مدت کے بعد کسی اور جمعہ میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہاں جمعہ سے مراد عالم کی تخلیق کے بعد متصل جمعہ مراد نہ لینا چاہیے۔ جس دن میں قدرت کے اتنے اہم افعال جمع ہوں ظاہر ہے کہ وہ کتنا عظیم الشان دن ہوگا۔

(۱۲۰۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهٗ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰی اُولٰئِکَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِنَ الْمَلٰئِکَةِ جُلُوْسٌ فَاسْتَمِعْ مَا یُحَیُّوْنَکَ فَاِنَّهَا تَحِیَّتُکَ وَتَحِیَّةُ ذُرِّیَّتِکَ فَذَهَبَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ فَقَالُوا السَّلَامُ عَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ الحدیث. (متفق علیہ)

(۱۲۰۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی خاص صفات پر پیدا فرمایا' ان کا قد ساٹھ گز لمبا تھا- جب ان کو پیدا فرما چکا تو اس نے کہا جاؤ یہ جو فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو اور جو جواب وہ تم کو دیں اس کو غور کے ساتھ سننا کیونکہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی آئندہ سلام کی وہی سنت ہوگی- یہ گئے اور انہوں نے فرمایا ''السلام علیکم'' انہوں نے جواب میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کا لفظ اور زیادہ کر دیا-
(متفق علیہ)

وقد رواہ الترمذی ابسط منہ و فیہ قصۃ اعطاء ادم ابنہ داؤد علیہ السلام من عمرہ.

(۱۲۰۸) * نسل انسانی کو جو جو اہم اسباق قدرت کو سکھانے تھے وہ ابتداء سے ہی اصل انسانی میں ودیعت فرما دیئے تھے تا کہ وہ انسانی فطرت کا جزء بن جائیں- پھر جب اس کو اپنی خلافت خاصہ سے نواز کر کرۂ ارضی پر اپنا نائب بنایا تو یہ بھی ضروری ہوا کہ خلیفہ اپنے اصل مالک کے کمالات کا مظہر ہو اور اس لیے یہ بھی مناسب ہوا کہ تاج پوشی کی رسم کے لیے ایک بار خلیفہ کے حق میں بھی انقیاد وتسلیم کا وہ نقشہ دکھا دیا جائے جو اصل مالک کے لیے مخصوص تھا' یعنی ''سجدۂ تحیہ'' نیز جب آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تو ضروری ہوا کہ ان کی ماتحت مخلوق کی فطرت میں جذبہ انقیاد کا تخم بھی ڈال دیا جائے- اس لیے سب سے قوی مخلوق کو جو بقیہ تمام مخلوق پر نگراں بنائی گئی تھی سجدہ کا حکم دیا گیا تا کہ بقیہ تمام مخلوق میں آدم علیہ السلام کی اطاعت شعاری ان کی سرشت بن جائے اور کسی کو سرتابی کا حوصلہ نہ رہے' اسی عام تسخیر کو جو آسمانوں سے لے کر ارضی مخلوق تک نظر آتی ہے- قرآن کریم میں جابجا بطریق امتنان ذکر فرمایا گیا ہے' جدید فلسفہ کہتا ہے کہ یہ قوی کے ضعیف پر غیر محدود زمانہ کے تسلط کا اثر ہے' مگر مذہب یہ بتاتا ہے کہ یہ قدرت کی پوشیدہ کارفرمائیاں ہیں- پھر جب یہ عام تسخیر مقدر ہوئی تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس خلیفہ کو اصل کے خاص کمالات کا مظہر بنایا جائے اور اس کے خاص صفات میں سے صفت علم میں سب سے ممتاز بنایا جائے حتی کہ ملائکۃ اللہ سے بھی اسی نکتہ سے فرشتوں کی نظر چوک گئی اور انہوں نے اپنی تسبیح وتقدیس اور عبودیت کو پیش کیا حالانکہ یہ اگر کمال تھا تو مخلوق اور عبد کا کمال تھا' حاکم اور خالق کا تو نہ تھا- آدم علیہ السلام اگر کسی دوسری مخلوق کے خلیفہ ہوتے تو ان کی یہ بحث شاید برمحل ہوتی مگر یہاں خلافت الٰہیہ کا منصب عطاء ہو رہا تھا' یہاں عبودیت کی خاص صفت کی بجائے اصل مالک کی خاص صفات کا مظہر ہونا لازم تھا- حیات' قدرت' سمع و بصر' مشیت وارادہ' کلام کے آثار تو دوسری مخلوق میں بھی کم وبیش موجود تھے ان سب میں نمایاں اور خاص صفت علم کی صفت تھی اس لیے اسی کو معیار مقرر کیا گیا اور اسی پر خلافت کی بحث ختم کردی گئی اور اسی وقت یہ راز مخلوق پر روشن ہو گیا کہ جو اصل خالق کے کمالات کا سب سے بڑا مظہر ہو وہی اس کی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہونا چاہیے-

اب رہی یہ بحث کہ ساٹھ ذراع شرعی جو ہمارے تیس ذراع ہوتے ہیں اس طول کے انسان کا دنیا کے کسی دور میں ہونا عصری تحقیقات کے خلاف ہے تو یہ صرف ایک قیاسی بحث ہے اور اس پر عقلی طور پر گفتگو کرنے کی بہت گنجائش ہے' اب جس پر اپنی تحقیق کا غلبہ ہوگا وہ اسی طرف جھکتا رہے گا اور جس پر اخبار شریعت کا غلبہ ہوگا وہ اسی پر اعتماد ووثوق کرے گا- صرف عقلی میدان میں کسی کو بازی لے جانا مشکل ہے- اس کے علاوہ ایک روایت میں ''ستون ذراعا فی السماء'' کی تصریح ہے- حضرت شیخ اس کی مراد یہ بیان فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کے قد کی یہ درازی جنت میں تھی' جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو اس میں مناسب تخفیف کردی گئی-

(۱۲۰۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَفَعَه قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَطَسَ (ای لَمَّا دَخَل الروح فی رأسه) فَقَالَ الْحَمْدُلِلّٰهِ فَقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ رَحِمَکَ رَبُّکَ یَا اٰدَمُ. (رواه البزار قال الحافظ ابن کثیر فی البدایة ج۱ ص۸٦ و هذا اسناد لابأس به و قدروی ابن حبان فی صحیحه عن انس بنحوه)

(۱۲۰۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا (اور روح ان کی ناک تک پہنچی) تو ان کو چھینک آئی انہوں نے کہا ''الحمد للہ'' ان کے پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا ''یـا ادم رحـمـک ربـک'' اے آدم تمہارا رب تم پر رحم فرمائے-

(البدایہ والنہایہ ج۱ص ۸٦)

(۱۲۱۰) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَنْ جَحَدَ اٰدَمُ قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَمَّا خَلَقَهٗ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّتَهٗ فَعَرَضَهُمْ عَلَیْهِ فَرَاٰی فِیْهِمْ رَجُلًا یَزْهَرُ فَقَالَ اَیْ رَبِّ زِدْ فِیْ عُمْرِهٖ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَزِیْدَهٗ اَنْتَ مِنْ عُمْرِکَ فَزَادَهٗ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً مِنْ عُمْرِهٖ فَکَتَبَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ کِتَابًا وَ

(۱۲۱۰) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سب سے پہلے انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں- آپؐ نے یہ جملہ تین بار فرمایا- بات یوں ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کر لیا اور ان کی پشت سے ان کی ذریت نکال کر ان کے سامنے کی تو انہوں نے ان میں ایک شخص دیکھا جو چمک رہا تھا- انہوں نے عرض کی پروردگار اس کی عمر کچھ اور بڑھا دے ارشاد ہوا یہ نہیں ہوسکتا مگر اس صورت سے کہ تم اپنی عمر سے کچھ ان کو دے دو- آدم علیہ السلام نے اپنی عمر کے چالیس سال اس کو دے دیئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس معاملہ کی نوشت وخواند کے بعد اس پر

(۱۲۰۹) * اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ چھینک آثارِ حیات میں سے ہے اس لیے آج تک اس پر الحمد للہ کہنا سنت آدم شمار ہوتا ہے- اسی طرح اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہنا اسی قدیم سنت کے مطابق ہے- ان احادیث سے تحیۃ وتحمید کے الفاظ کی اہمیت سمجھنی چاہیے اسی لیے حدیثوں میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے جو اپنے محل میں آئے گا- افسوس کہ مسلمانوں نے آج ان دونوں مقامات پر سنت آدم کو فراموش کر کے نئے نئے الفاظ اپنی جانب سے تراش لیے ہیں اور کسی نے تو چھینک کو برکت کی بجائے اس کو اور آثار نحوست تک سمجھ لیا ہے-

(۱۲۱۰) * حضرت آدم علیہ السلام جس طرح تخلیق انسانی کی اساس تھے اسی طرح قدرت کے بہت سے اسرار تکوینیہ کا ایک مرکب نسخہ بھی تھے- ان کا کالبد مختلف رنگ وبو کی مٹی سے بنایا گیا تو ان کی ذریت میں ہر رنگ کا انسان اور اس میں نرمی وگرمی ہر قسم کی خو پیدا ہوگئی- اسی طرح جب سہو ونسیان اور جو دوخطا کا تخم بھی گو کسی حیثیت کا ہوان میں بو دیا گیا- تو وہی تخم بڑھ کر خدا تعالیٰ کے قہر ومہر کا سامان بن گیا یعنی سہو ونسیان بڑھا تو غفلت کی شکل بن گئی خطاء نے ترقی کی تو عمد کی صورت ظاہر ہوگئی اور جب جو د کی خصلت بڑھی تو کفر رونما ہوگیا- والعیاذ باللہ اگر طینت آدم علیہ السلام میں مختلف رنگوں کی مٹی شامل نہ ہوتی تو نہ تو نسل انسانی کے رنگوں میں اختلاف نظر آتا اور نہ ان کے خصائل وطبائع میں- سب ایک ہی باپ کی اولاد تھے اور اس لیے اپنے رنگ وبو میں بھی سب یکساں ہوتے اسی طرح اگر ان میں بنیادی طور پر انسانی ضعف نہ رکھا جاتا تو نسل انسانی میں بھی کمزوری کا اثر نظر نہ آتا-

واضح رہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے مذکورہ بالا واقعہ کو اپنی تالیف میں دو جگہ ذکر فرمایا ہے- کتاب القدر میں اور باب السلام میں اور لطف .....

اَشْهَدَ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةَ فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ يَقْبِضَ رُوْحَهُ قَالَ اِنَّهُ بَقِيَ مِنْ اَجَلِيْ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً فَقِيْلَ لَهُ اِنَّكَ قَدْ جَعَلْتَهَا لِاِبْنِكَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ فَجَحَدَ قَالَ فَاَخْرَجَ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَ اَقَامَ عَلَيْهِ الْبَيِّنَةَ فَاَتَمَّهَا لِدَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِائَةَ سَنَةٍ وَ اَتَمَّ لِاٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عُمْرَهُ اَلْفَ سَنَةٍ.

(رواہ الامام احمد)

فرشتوں کی گواہی لے لی پھر جب ان کی قبض روح کا وقت آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں ان سے کہا گیا آپ تو وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام کو وہ بات یاد نہ رہی اس لیے انہوں نے انکار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اقرار نامہ نکال کر ان کے سامنے کیا اور اس کا ثبوت دے دیا (بس اصل انسانی کے اس انکار کا اثر نسل انسانی میں بھی چلتا رہا۔ اور نسیان کی طرح انکار بھی انسان کی سرشت بن گئی) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی عمر بھی سو سال پوری کر دی اور آدم علیہ السلام کی عمر بھی بدستور ہزار سال رہنے دی۔ (مسند احمد)

لله ..... دوسری جگہ اس میں اربعین کی جگہ ستین سنۃ کا لفظ نقل فرمایا ہے یعنی آدم علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال عطا فرمائے تھے مگر اس روایت میں داؤد علیہ السلام کی عمر چالیس سال مذکور ہوئی ہے اور پہلی روایت میں جہاں آدم علیہ السلام کا چالیس اپنی عمر میں سے عطا فرمانا مذکور ہے۔ وہاں داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی درخواست ان کی عمر پوری سو سال ہونے کے متعلق تھی۔ پس اگر ان کی عمر ساٹھ سال تھی تو اس میں چالیس کی کسر تھی اور اگر چالیس سال تھی تو ساٹھ سال کی کسر تھی۔ دونوں صورتوں میں ان کی عمر پورے سو سال ہو جاتی ہے۔ روایوں کو یہاں اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی اصل عمر کیا بیان فرمائی تھی اس لیے سو سال کی تکمیل میں بھی اسی حساب سے ان کو مختلف رہنا چاہیے تھا۔ یہاں حدیث کی جو توجیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نقل فرمائی ہے وہ مشکوٰۃ کے حواشی میں دیکھ لی جائے۔ اس کے حساب سے ان کی عمر ۱۲۰ سال بن جاتی ہے۔ اپنی رائے ناقص ہم بیان کر چکے ہیں۔ شارحین کی نظر یہاں صرف آخر حصہ پر گئی ہے۔ یعنی یہ کہ آدم علیہ السلام نے ان کو چالیس سال بخشے تھے یا ساٹھ اور اسی پر بحث شروع کر دی ہے۔ اگر اس طرف بھی ان کی نظر چلی جاتی کہ یہاں دوسرا اختلاف اس سے پہلے داؤد علیہ السلام کی اصل عمر میں بھی موجود ہے تو بات صاف ہو جاتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ترمذی شریف کی اس دوسری روایت میں یہ لفظ اور ہیں قال فمن یومئذ امر بالکتاب و الشھود۔

تقدیر کے بیان میں اس روایت کے اہم اجزاء پر کلام کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمالیا جائے۔ یہاں مسند احمد کی یہ روایت خاص اس لیے نقل کی گئی ہے کہ اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی عمریں پوری کی پوری ہی عطا فرما دیں اور حساب سے جو کمی بیشی ہوئی تھی اس کی رعایت نہیں کی۔

اس سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ سہو و نسیان جو دو عصیان کی نسبت گو انبیاء علیہم السلام کی جانب بھی آ گئی ہے مگر ان میں اس کی حقیقت کیا ہو گی کہ ان کے سہو و نسیان اور جو د پر بھی رحمت کی اتنی بارشیں ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ قرآن کریم کے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی ذریت کے لیے نمونہ تقدیر تھے۔ سہو و نسیان اور جو د و عصیان کی جو جو خصلتیں ان کی ذریت میں مقدر تھیں وہ سب ان کے آئینہ میں پہلے سے نظر آ گئیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ شدت و خفت کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں وہ اختلاف پیدا ہو گیا جو صورت و حقیقت میں ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان کی صورت ہی صورت تھی اور آگے چل کر وہ صورت ترقی کر کے حقیقت کا رنگ اختیار کر گئی یہ بھی ایک ارتقائی حرکت سمجھنی چاہیے۔

(۱۲۱۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَرْاَۃَ خُلِقَتْ مِنْ

(۱۲۱۱) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- عورت (بائیں) پسلی سے بنائی گئی ہے وہ کبھی ایک سیدھے طریقہ پر

(۱۲۱۱) * حضرت حواء کی تخلیق کے متعلق قرآنی اور حدیثی بیان ہمارے پاس صرف ایک یہی ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان موجود نہیں- حضرت حواء کی پسلی سے پیدائش گو فہم سے بالاتر بات ہے- لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر ذرا غور کرلیا جائے تو پھر اس میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی- حدیث میں حضرت حواء کے متعلق ''ولد'' کا لفظ نہیں بلکہ ''خلق'' کا لفظ ہے- چونکہ اردو زبان میں دونوں کا ترجمہ یکساں ہے اس لیے یہاں بے وجہ کی الجھن پیدا ہوگئی ہے حدیث یہ نہیں کہتی کہ حضرت حواء کی ولادت پسلی سے ہوئی تھی بلکہ یہ کہتی ہے کہ ان کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے یعنی جس طرح آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے حضرت حواء ضلع آدم یعنی ان کی پسلی سے بنائی گئی تھیں- ہمارے نزدیک تو انسان کی ایک انسان سے تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی کہ انسان کی مٹی سے بعید ہے اب اگر ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ نے اس کو بدیہی بنادیا ہے تو اس سے اصل حقیقت کا معمہ پھر حل نہیں ہوتا- حدیث کے اس بیان کو اگر سورۂ نساء کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً﴾ (النساء:۱)

''اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں-''

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت نہ تو براہ راست ابتداءً پیدا کی گئی ہے اور نہ صرف ایک وحدت سے پیدا کی گئی ہے بلکہ اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس کی شکل یہ ہوئی کہ پہلے ایک ہی نفس کو پیدا فرمایا گیا- پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا گیا پھر اس جوڑے سے انسانوں کی یہ کثرت پیدا کی گئی اب اگر فرض کرو کہ حضرت حواء کی تخلیق بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرح مستقل ہوتی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مادہ تخلیق کیا تھا- قرآن کریم اور حدیث میں مذکورہ بالا صورت کے علاوہ اس باب میں کوئی بیان موجود نہیں' نیز اگر حضرت حواء کی تخلیق بھی مستقل مانی جائے تو پھر انسانوں کی کثرت کے ظہور کے لیے جو نسق بیان اختیار فرمایا گیا ہے اس کی بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کثرت کو آدم و حواء سے پیدا کیا ہے جیسا کہ حضرت حواء کے بعد یہی نسق بیان اختیار فرمایا گیا- ''وَبَثَّ مِنْهُمَا'' یعنی پھر ہم نے اس جوڑے سے کثرت پیدا کی- سورۂ بقرہ میں امام قرطبی نے صرف اسی تفسیر کو ذکر فرمایا ہے' بلکہ اس میں ایک لفظی نکتہ بھی لکھا ہے- وہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں عورت کو ''امراۃ'' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ''المرء'' سے بنی ہے جس کے معنی مرد کے ہیں اور ان کا نام حواء بھی اسی لیے رکھا گیا تھا' کیونکہ وہ ایک ''حی'' یعنی زندہ ہستی سے بنائی گئی تھیں- گویا یہ حقیقت حضرت حواء کی تخلیق سے لے کر ان کے نام تک سرایت کرگئی ہے بلکہ احکام میں بھی اس کا اثر یہاں تک ظاہر ہوا کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں شیر خوار لڑکے کا پیشاب بہ نسبت شیر خوار لڑکی کے نجاست میں خفیف سمجھا گیا ہے- پھر جب خود امام شافعیؒ سے اس تفریق کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے ایک علمی نکتہ کے طور پر فرمایا کہ نوع انسانی میں مذکر کی پیدائش آب و گل سے ہوئی ہے اور وہ پاک ہے اور مؤنث کی گوشت و خون سے اور وہ ناپاک ہے اس لیے نسل انسانی میں بھی اپنی اصل کے آثار باقی رہ گئے ہیں- امام موصوف کا یہ بیان صرف ایک علمی نکتہ ہے اس کی اصل بنا صحیح حدیثوں پر ہے فروعی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے- علاوہ ازیں عقلی طور پر تخلیق کی چار صورتیں ہیں' اور وہ چاروں انسانی تخلیق میں پوری کردی گئی ہیں- والدین للہ.....

صَلَحِ لَنْ يَسْتَقِيمَ لَكَ عَلٰى طَرِيْقَةٍ فَاِنْ اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ وَ بِهَا عِوَجٌ وَ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَ كَسْرُهَا طَلَاقُهَا.

(رواہ مسلم و فی البخاری نحوہ)

تمہارے ساتھ بسر نہیں کر سکتی اب اگر اس سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی کجی کے ساتھ نفع حاصل کرتے رہو' اگر کہیں تم نے اس کے سیدھا کرنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھو کہ تم اس کو توڑ دو گے- یعنی اس کو طلاق دینی ہوگی-

(مسلم شریف)

(۱۲۱۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱۲۱۲) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ﷺ ..... کے بغیر پیدائش' جیسے آدم علیہ السلام والدین سے پیدائش- جیسا کہ معمول ہے- صرف والدہ سے پیدائش جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام- اب صرف ایک یہی صورت باقی رہتی ہے جس میں صرف مذکر سے تخلیق ہو- اب اگر حدیث مذکور میں تاویل نہ کی جائے تو حضرت حواء اس چوتھی صورت کا مصداق ہوں گی ورنہ دائرہ تخلیق میں صرف یہی ایک قسم ہوگی جس کی مثال نہ ہوگی- ظاہر ہے کہ عقل کے نزدیک دوسری قسم کے سواء سب صورتیں نا قابل فہم ہیں چنانچہ نصاریٰ نے گو صرف والدہ سے پیدائش کا اعتراف تو کر لیا مگر وہ بھی پورے طور پر اس کے سمجھنے سے قاصر رہے حتیٰ کہ اسی کو عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کی دلیل بنا بیٹھے دوسری طرف یہود نے اس خلقت کو غیر معقول سمجھا تو عالم کی ایک پاک باز ترین عورت کو متہم کرنے سے باز نہ رہ سکے اب رہ گئی حضرت حواء کی شخصیت تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے اہم واقعات میں اس طرح گم ہے کہ یہاں نئے نئے محققین نے صاف طور پر سامنے آ کر کوئی بات تو نہیں کہی مگر ان کے دلوں کے اندر ہی اندر تخلیق کی اس نوع میں بہت سے شبہات کھٹک رہے ہیں-

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا حدیث قرآن کریم کی آیت خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کا بیان ہے اور اس طرح تخلیق کا نکتہ بھی خود قرآن کریم ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا﴾ (اعراف:۱۸۹)

''وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا- اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے تسکین حاصل کرے-''

سورۂ نساء اور سورہ اعراف میں دونوں جگہ حضرت حواء کے حق میں ایک ہی لفظ یعنی خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ارشاد فرمایا گیا ہے' مگر یہاں اس کی حکمت بھی بیان فرما دی گئی ہے یعنی یہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت حواء حضرت آدم علیہ السلام ہی سے بنائی گئی تھیں- کیونکہ انسان کو جتنی کشش اپنے ہم جنس کی طرف ہوتی ہے اس سے زیادہ کشش اس کی طرف ہوتی ہے جو خود اسی سے پیدا شدہ ہو- اسی لیے جو محبت اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی- اجنبی مرد و عورت کے درمیان عقد نکاح کے فوراً بعد جس محبت کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ بعید نہیں کہ ان کے اصول میں ضرور کوئی ایسا ہی رشتہ ہونا چاہیے امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو حضرت حواء کی اس طرح تخلیق سے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو نسل انسانی میں کسی مرد کو کسی عورت کی طرف کبھی رغبت نہ ہوتی اور اصل انسانی میں تکلیف کی تاریخ نسل انسانی میں اثر دکھائے بغیر نہ رہتی- واللہ سبحانہ اعلم-

(۱۲۱۲) * بنی اسرائیل کی فرمائش پر من وسلویٰ نازل ہوا تھا مگر ان کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ کچھ بچا کر نہ رکھا کریں مگر انہوں نے حکم عدولی کی- آخر یہ رسم بد آئندہ نسلوں میں بھی چل پڑی اور اپنی حاجت سے فاضل گوشت جمع کرنا شروع کر دیا گیا- حتیٰ کہ سڑنے کی نوبت آنے لگی- کیا تعجب ہے کہ انسانی اخلاق کسی زمانہ میں گوشت جیسی چیز کا ضرورت سے زیادہ جمع رکھنا مکروہ سمجھتے ہوں- پھر اخلاق کی ﷺ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ لَا بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ لَمْ يَخْنَزِ اللَّحْمُ وَ لَوْ لَا حَوَّاءُ لَمْ تَخُنِ الْاُنْثٰى زَوْجَهَا الدَّهْرَ. (متفق عليه)

اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو (گوشت جمع کر کے رکھنے کی بری رسم نہ پڑتی) اور گوشت (گھروں میں پڑاپڑا) نہ سڑا کرتا - اور اگر حضرت حواء نہ ہوتیں تو کوئی عورت زمانہ بھر میں کبھی اپنے شوہر کے ساتھ خیانت نہ کرتی - (متفق علیہ)

لله ..... پستی کی بدولت اس کا جمع کرنا شروع ہو گیا ہو اور اس کے سڑنے کی نوبت آئی ہو- آج بھی بخیل طبائع حاجت مندوں میں کھانا تقسیم کرنے سے اس کو سڑا دینا بہتر سمجھتی ہیں کاش اگر بنی اسرائیل اس رسم بد کی بنیاد نہ ڈالتے تو دنیا اس بخل کی عادی نہ ہوتی - اسی طرح جدی خصائل آئندہ نسل میں نمودار ہوا کرتے ہیں- حضرت حواء علیہا السلام کا جو معاملہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا گو اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو مگر اس خصلت کا ظہور بھی عورتوں میں ایک جزء لازم بن گیا - یہ دوسری بات ہے کہ ہر عورت کی اپنی فطرت کی بلندی و پستی کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں فرق ضرور پڑتا رہا- مگر شوہر کے ساتھ ناعاقبت اندیشی کی جو بنیاد ایک مرتبہ قائم ہو چکی تھی وہ بدل نہیں سکی- ابوہریرہ کی ان ہر دو حدیثوں سے صنف رجال کی برتری اور صنف نساء کی فطری کمزوری یعنی مرد کے مقابلہ میں ان کی کمتری بھی ثابت ہوتی ہے- خدا کی مخلوق میں ضعف وقوت کا یہ اختلاف سماوی مخلوق سے لے کر ارضی مخلوق تک موجود ہے آسمان پر جب نظر کی جاتی ہے تو اس میں بھی شمس وقمر تمام ستاروں میں سب سے روشن اور بڑے نظر آتے ہیں' پھر ستاروں میں بھی ان کی جسامت اور نورانیت میں بھی بڑا اختلاف موجود ہے- زمین میں بھی حیوانات میں بڑا اختلاف ہے اور اس جنس میں بھی مذکر و مؤنث میں طاقت و جسامت کے اندر کھلا اختلاف موجود ہے- یہی اختلاف انسانوں میں بھی نظر آتا ہے- یہاں مذکر و مؤنث یعنی مرد و عورت کی صنف میں قوت وضعف کا بڑا اختلاف ہے- اس فطری اختلاف کو اگر جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھنا ہو تو "المرءة المسلمه" کا مطالعہ کیا جائے' اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جس کا نام "مسلمان عورت" ہے- ان اختلافات کے علاوہ خود ایک ہی شخص کے دائیں بائیں اعضاء میں فرق ہوتا ہے مگر ان تمام اختلافات کو قدرت کے کمال کے سواء کہیں کسی کی حق تلفی نہیں سمجھا گیا' نہ کبھی کسی نے ان بدیہی اختلافات کے انکار کی ہمت کی ہے' مگر ہمارے دور میں صرف یورپ کے اعتراضات کی بناء پر عورت کے شرعی اور فطری نقصان کے انکار کی سعی جاری ہے حالانکہ قرآن و حدیث میں اس دعوے کی کوئی گنجائش نہیں- قرآن کریم میں اگر دو جگہ عورتوں کا تذکرہ آیا ہے تو سو جگہ نہیں آیا- ہمارے نزدیک صنف نازک کو مرد قوی کے بالکل برابر لا کھڑا کرنے کی سعی ایسی ہی ہے جیسی کہ بائیں اعضاء کی دائیں اعضاء کے بالکل برابر بنانے کی- فطرت کے ان اختلافات کا انکار کرنا بداہت کا انکار کرنا ہے-

بعض اہل قلم کو اس مسئلہ سے اتنا شغف ہے کہ انہوں نے سورۂ یوسف کی آیت اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عالم کے واقعات پر جہاں کہیں نظر ڈالی جائے تو ہر جگہ عورت ہی معصوم نظر آتی ہے اور ہر جگہ در پردہ مرد ہی کی کارفرمائی ثابت ہوتی ہے- اور اتنا نہیں سوچا کہ کیا اس فقرہ کا محل سورۂ یوسف ہی رہ گئی تھی- جس میں صرف مرد کی عصمت اور عورت کے فریب کی سرگزشت بیان کرنی مقصود ہے- لیکن یہ انسان کا فطری ضعف ہے کہ جب وہ کسی جانب مائل ہوتا ہے تو آنکھ میچ کر اس طرح ڈھلتا چلا جاتا ہے کہ محل و بے محل کی طرف اس کو کوئی توجہ نہیں رہتی اس لیے ہمیں اس کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ احادیث بالا کی روشنی میں صنف نازک بے شبہ مرد کی نسبت سے ضعیف اور ناقص بنائی گئی ہے مگر اس کے باوجود وہ مرد کے ایک اہم گوشہ حیات کے لیے باعث تکمیل بھی ہے- اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر مذکورہ حدیث کی روشنی میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں- ہم صرف یہ دو حرف لکھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں کسی عورت کو منصب نبوت سے نوازا نہیں گیا- اور اس طرح دنیا کے ملوک وسلاطین کی تاریخوں میں بھی عورتوں کا حصہ بہت ہی کم ہے- مذہب و دنیا کی تاریخوں کے اس توافق کے بعد اب واقعات کی دنیا میں تو آپ کے اس لله .....

سیدنا ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مؤرخین کو اختلاف ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام سے پیشتر ہوئے ہیں یا بعد میں- اس تاریخ بحث کی اہمیت اس لیے ہے کہ اگر وہ پہلے ہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ان کا ہونا یقینی ہے- حافظ ابن کثیر نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے- حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام کے بعد یہ پہلے وہ شخص تھے جو نبوت سے سرفراز ہوئے- درمنثور میں حاکم کی روایت سے ان کا حلیہ مبارک یہ نقل کیا ہے: گورا رنگ' دراز قامت' بھاری پیٹ چوڑا سینہ' جسم پر بال کم' سر کے بال گھنے' ایک آنکھ زیادہ فراخ اور سینہ پر ذرا سا سفید دھبہ-

سلف میں صرف دو نبیوں کے متعلق آسمان پر اٹھائے جانے کی شہرت تھی ایک یہ دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان دونوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع تو تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور ادریس علیہ السلام کے رفع کے متعلق کوئی مرفوع روایت صحت کو نہیں پہنچی- البتہ صحابہؓ اور تابعین میں اس کا تذکرہ ضرور رہا ہے اور چونکہ حضرت ابن عباسؓ اور ابو سعید خدریؓ وغیرہما سے ان کا رفع آیت ''وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا'' کی تفسیر میں منقول ہے اس لیے اس کو بے اصل اسرائیلیات میں شمار نہیں کیا جا سکتا- حافظ ابن کثیرؒ نے یہاں جن روایات پر منکر ہونے کا حکم لگایا ہے وہ اس جزء کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں اور بہت سی بے تحقیق باتیں موجود ہیں جو بے اصل ہیں- چنانچہ ان کے قول **وفی بعضہ نکارۃ** میں اسی طرف اشارہ ہے- عجلت پسندوں نے یہاں یہ سمجھ لیا ہے کہ انہوں نے پوری روایت پر منکر ہونے کا حکم لگا دیا ہے- اسی لیے صحابہؓ کے ان آثار کو انہوں نے ضعیف قرار نہیں دیا اور نہ ان کو منکر کہا ہے بلکہ اپنی تاریخ میں خود ان کو نقل فرمایا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا اور اس لیے نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کی طرح اس کو عقائد کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو بے اصل کہا جا سکتا ہے- یہ بھی واضح رہے کہ اسرائیلیات کو مطلقاً بے اصل سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے- اسرائیلیات کا جو حصہ ''دین محمدیؐ'' علی صاحبہا الف الف صلوات وتحیات کے خلاف نہ ہو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ اس کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف ''التوسل والوسیلہ'' میں اس پر مبسوط بحث کی ہے-

---

لاہ ..... فیصلہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں- اس کے لیے آپ کو کوئی دوسرا جہان تلاش کرنا ہوگا-

ہمارے نزدیک اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں جداگانہ جداگانہ قسموں کی صلاحیتیں پیدا فرمائی ہیں اور ہر ہر صنف دوسری نوع کی خاص صلاحیتوں سے خالی ہے عالم انسانیت کی تکمیل کے لیے ان دونوں کا وجود ضروری ہے- پس انسانی عالم کو عالم نساء کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ کسی ناقص کو اپنے کمال کے لیے ضرورت ہوتی ہے- پس ایک لحاظ سے عورتوں کے کمال اور ضرورت کا انکار نہیں- مگر یہ بات صاف ہے کہ جو صلاحیتیں مرد میں رکھی گئی ہیں وہ ان سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں جو عورتوں میں پیدا کی گئی ہیں- نبوت اور رسالت تو بڑے مقامات ہیں ت میں روزمرہ کی نماز کی امامت کی صلاحیت بھی نہیں بلکہ مقتدیوں کی صف اول میں شامل ہونے کی صلاحیت بھی نہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا موقف تمام صفوف رجال کے پیچھے ہے- شرعی نقطہ نظر سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ جمیع حقوق میں مساوات کی ہمیں تو کوئی اصل معلوم نہیں ہوسکی- پھر معلوم نہیں مسلمان اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے جا داویلا کس لیے ہے-

(۱۲۱۳) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السَّلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمُوْرًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ قَالَ كُنَّا نَتَطَيَّرُ قَالَ ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُهٗ اَحَدُكُمْ فِيْ نَفْسِهٖ فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ قَالَ قُلْتُ مِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ خَطًّا قَالَ كَانَ نَبِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهٗ فَذَاكَ.

(رواه مسلم)

(۱۲۱۳) معاویہ بن حکم سلمی کہتے ہیں- میں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم زمانہ جاہلیت میں بہت سے افعال کرتے تھے ان کے متعلق کیا ارشاد ہے- ہم کاہنوں کے پاس بھی جاتے تھے- آپؐ نے فرمایا ان کے پاس جا کر خبریں دریافت نہ کیا کرو (یہ بے اصل بات ہے) انہوں نے عرض کی- ہم بد فالی کے بھی قائل تھے- آپؐ نے فرمایا قدیم عادت کی بناء پر تمہارے دل میں اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہوگا مگر عملاً اس کی تردید کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام کرنا ہے وہ کرلو اور اس احساس کی وجہ سے اس کے کرنے سے باز نہ رہو- پھر انہوں نے عرض کی- ہم رمل کا حساب بھی کرتے تھے- آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو یہ علم عطا فرمایا تھا تو تم میں جس شخص کا حساب حسب اتفاق ان کے ساتھ مطابق ہو جاتا ہے تو وہ درست بھی نکل آتا ہے- (مسلم)

(۱۲۱۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا عُرِجَ بِيْ رَاَيْتُ اِدْرِيْسَ فِي السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ. اخرجه الترمذی و صححه فی الصحیحین فی حدیث المعراج نحوه و عن ابن عباسؓ فی قوله تعالیٰ وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا قَالَ رُفِعَ اِلَى السَّمَاءِ السادسة و عن العوفی کما فی البدایة فمات بها و عن ابی سعید الخدریؓ فی السماء الرابعة و عن مجاهد رفع ادریس کما رفع عیسیٰ و لم یمت. کله فی الدرالمنثور و و فی البدایة عن ابن عباس انه مات بها و نحوه عن کعب.

(۱۲۱۴) انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- جب مجھ کو معراج نصیب ہوئی تو میں نے ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا تھا- (ترمذی شریف) وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی تفسیر میں ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چوتھے آسمان پر اٹھالیا تھا- ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے چوتھے کے بجائے چھٹے آسمان کا لفظ کہا ہے- مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے گئے اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام بھی اٹھائے گئے تھے- پھر ان کی وفات نہیں ہوئی لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ آسمان پر ہی ان کی وفات ہوگئی- کعب احبار بھی آسمان پر ان کی وفات کے قائل تھے-

---

(۱۲۱۳) ❋ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نبی حضرت ادریس علیہ السلام ہی تھے- پھر جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف بہت سے غلط افسانے منسوب کردیئے گئے ہیں ان کی طرف بھی بہت سی غلط باتیں منسوب کردی گئی ہیں- یہ واضح رہے کہ اس روایت میں اس خط کی پوری تفصیلات مذکور نہیں ہیں لہٰذا صرف اس اجمالی بیان سے رمل کے متعلق جتنی باتیں مشہور ہیں وہ سب اس حدیث کے تحت درج نہیں کی جاسکتیں-

(۱۲۱۴) ❋ سلف میں کسی بشر کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے امکان وعدم امکان کی بحث کبھی نہیں ہوئی وہ یہ بات کسی تردد کے بغیر جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- اسی کے ساتھ ان میں جب کبھی حضرت عیسیٰ علیہ ﷺ .....

سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اول رسول اللہ الی الارض

حضرت نوح علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی صف میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کی بناء پر حدیثوں میں ان کو ''اول رسول'' کہا گیا ہے- حافظ ابن کثیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گذرے ہیں جو سب دین حق پر قائم تھے- اس روایت کی وجہ سے انہوں نے مؤرخین کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ قابیل کی نسل میں آتش پرستی شروع ہوگئی تھی ان کی تحقیق یہ ہے کہ کفر و شرک کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے عہد ہی کے قریب میں پڑی تھی اور اس کے ابطال و تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا جو رسول بھیجا وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور اسی لئے ان کو حدیثوں میں ''اول رسول'' کہا گیا ہے- یہی وجہ تھی کہ اصولی مباحث کے بیان و ایضاح میں انہوں نے بہت بڑی جدو جہد فرمائی تھی- حتیٰ کہ دجال کا فتنہ جو دنیا کے آخر میں نمودار ہونے والا تھا اس سے بھی اپنی امت کو پوری طرح خبردار کر دیا تھا- حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی گذشتہ تحقیق کے مطابق ان کے اول رسول ہونے کا مطلب کسی توجیہ کے بغیر واضح ہو جاتا ہے-

حافظ ابن کثیرؒ نے ابن جبیر وغیرہ کے حوالہ سے ان کی قوم کا نام بنو راسب نقل فرمایا ہے- حافظ سیوطیؒ نے درمنثور میں حضرت نوح علیہ السلام کا شجرۂ نسب اس طرح تحریر فرمایا ہے-

نوح بن لامک بن متوشلخ بن ادریس وہو اخنوخ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام کے بعد دنیا کی آبادی نے ان ہی کے زیر سایہ اطمینان و سکون کا سانس لیا تھا اس لیے ان کو نوح سکن کہتے تھے- اور ان کے نوح کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ ساڑھے نو سال تک اپنی امت کو تبلیغ و ارشاد فرماتے رہے اور جب وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو ان پر ہمیشہ غم کے آنسو بہاتے رہے- (درمنثور ج ۳ ص ۹۴)

حضرت نوح علیہ السلام کی حیات کا سب سے مشہور تاریخی واقعہ طوفان کا ہے جو بعد میں ہمیشہ نظم و نثر میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے- اس کے متعلق اہل کتاب اور مؤرخین کا اختلاف ہے- فارس اور اہل ہند تو سرے سے اس کا انکار کر

للہ ..... السلام کے رفع کا تذکرہ آیا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے نزدیک دین کے دوسرے بدیہی مسلمات کی طرح ایک مسلم بات تھی- نیز ان کے نزدیک اس میں بھی کوئی اشکال نہ تھا کہ کوئی انسان اگر آسمان میں وفات پا جائے تو اس کی تجہیز و تکفین اور دفن کی صورت کیا ہوگی- موت، روح اور جسم کی صرف علیحدگی کا نام ہے- اتنی بات اگر آسمانوں پر ہو جائے تو اس میں عقل کے نزدیک بھی کیا دشواری ہے- پھر جب انبیاء علیہم السلام کے جسم اس مٹی میں دفن ہونے کے بعد بھی کون و فساد سے محفوظ رہتے ہیں تو آسمانوں پر ان کے رہنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہے- یہ بات دوسری ہے کہ انسان جب کسی بات کا انکار کرنا چاہے تو بے وجہ ہر ہر بات کو اپنی عقل نارسا کے لیے نا قابل تحمل بوجھ بنا لے- ہم یہاں یہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق راجح کیا ہے کیونکہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کا کوئی واضح اور مستند سامان ہمارے علم میں نہیں ہے-

رہے ہیں- ہم ذیل میں صرف حافظ ابن کثیر کے الفاظ نقل کرتے ہیں جو بالاتفاق مسلم محدث بھی ہیں اور معتبر مؤرخ بھی:

و قد اجمع اهل الادیان الناقلون عن رسل الرحمن مع تواتر عند الناس فی سائر الازمان علی وقوع الطوفان و انه عم جمیع البلاد و لم یبق الله احدًا من کفرة العباد استجابة لدعوته نبیه المؤید المعصوم و تنفیذًا لما سبق فی القدر المختوم.

تمام ادیانِ سماویہ کا اور ہر دور میں تواتر کے ساتھ لوگوں کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام پوری زمین کو محیط تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعاء کی وجہ سے اللہ تعالٰی نے سب کافروں کو ہلاک کر دیا تھا-

(البدایة ج ۱ ص ۱۱۸)

حافظ ابن تیمیہؒ بھی اسی کی تصحیح فرماتے ہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام پورے کرۂ ارضی کو محیط تھا:

فنوح علیه السلام ابو الآدمیین الذین حدثوا بعد الطوفان فان الله اغرق ولد آدم علیه السلام الا اهل السطینة و قال فی نوح علیه السلام و جعلنا ذریته هم الباقیین.

(الجواب الصحیح ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۵)

اس لیے نوح علیہ السلام ان سب انسانوں کے والد قرار پائے جو طوفان کے بعد پیدا ہوئے کیونکہ اللہ تعالٰی نے کشتی والوں کے سوائے تمام اولاد آدم علیہ السلام کو غرق کر دیا تھا چنانچہ ارشاد ہے وجعلنا ذریة الخ یعنی ہم نے صرف ان ہی کی نسل کو باقی رہنے والا رکھا-

محقق ابن خلدون کی رائے بھی اسی طرف ہے- دیکھو مقدمہ ص ۱۲ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے- دیکھو اظہار الحق ج ۲ ص ۱۰۲ اس کے علاوہ اکثر محدثین و مفسرین کا مختار بھی یہی ہے- ہاں نصاریٰ ضرور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور بعض علماء بھی بظاہر اس خیال سے کہ اس سے ان کی بعثت کا عموم ثابت ہوتا ہے دوسری طرف چلے گئے ہیں' ورنہ قرآنی عموم و اطلاقات کا ظاہر یہی ہے کہ طوفان تمام کرۂ ارضی کو محیط تھا واللہ تعالٰی اعلم-

اس تحقیق کی بناء پر چونکہ دنیا کی نشاۃ ثانیہ ان ہی کی ذات سے ہوئی اس لیے ان کو آدم ثانی کہا جاتا ہے حافظ موصوف نے ان کی قبر کے متعلق زیادہ صحیح یہی قرار دیا ہے کہ وہ مسجد حرام میں ہے اور اکثر متاخرین کے اس خیال کو مرجوح کہا ہے کہ وہ مشہور مقام کرک نوح میں ہے- جہاں لوگوں نے ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک روایت پیش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار نبیوں کی قبریں زم زم اور رکن یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہیں- حضرت نوح' ہود' شعیب وصالح علیہم السلام- (درمنثور ج ا ص ۸۶)

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اس سلسلہ میں ایک مرفوع روایت بھی پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ مکرمہ آ کر اپنا وقت عبادت میں پورا کیا کرتا تھا اور نوح' ہود' صالح اور شعیب علیہم السلام کی قبریں زم زم اور حجر اسود کے درمیان ہیں ج ا ص ۱۳۶ اور ایک ضعیف روایت میں ستر قبروں کا لفظ بھی ہے- مگر یہ مرفوع نہیں ہے-

(۱۲۱۵) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَجِیْءُ نُوْحٌ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ اُمَّتُهٗ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ هَلْ بَلَّغْتَ فَیَقُوْلُ نَعَمْ اَیْ رَبِّ فَیَقُوْلُ لِاُمَّتِهٖ هَلْ بَلَّغَکُمْ فَیَقُوْلُوْنَ لَامَا جَآءَ نَا مِنْ نَبِیٍّ فَیَقُوْلُ لِنُوْحٍ مَّنْ یَّشْهَدُ لَکَ فَیَقُوْلُ اُمَّتُهٗ فَتَشْهَدُ اَنَّهٗ قَدْ بَلَّغَ وَ هُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا.

(رواه البخاری)

(۱۲۱۵) ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- قیامت میں جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت آئے گی تو اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے سوال فرمائے گا- تم نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے میرے پروردگار! جی ہاں- پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے سوال کرے گا- اچھا تم بتاؤ تم کو پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے نہیں' ہمارے پاس تو کوئی نبی نہیں آیا اس پر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا آپ کے پاس کوئی گواہ ہے جو آپ کی گواہی دے وہ کہیں گے میرے گواہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کی امت ہے- یہ امت گواہی دے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا- قرآن کریم کی حسب ذیل آیت کا مطلب یہی ہے- وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا' الخ-

(۱۲۱۶) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُکُمْ عَنِ الدَّجَّالِ حَدِیْثًا مَاحَدَّثَ بِهٖ نَبِیٌّ قَوْمَهٗ اِنَّهٗ اَعْوَرُ وَ اِنَّهٗ یَجِیْءُ مَعَهٗ بِمِثَالِ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ وَ الَّتِیْ یَقُوْلُ عَلَیْهَا الْجَنَّةَ هِیَ النَّارُ وَ اِنِّیْ اُنْذِرُکُمْ کَمَا اَنْذَرَبِهٖ نُوْحٌ قَوْمَهٗ.

(رواه البخاری)

(۱۲۱۶) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- کیا دجال کے متعلق میں تم کو ایسی صاف بات نہ بتادوں جو کسی نبی نے اپنی قوم کو نہ بتائی ہو- دیکھو وہ کانا ہوگا اور اس کے ساتھ دو چیزیں ہوں گی جو دیکھنے میں جنت اور دوزخ کے مشابہ ہوں گی- مگر جس کو وہ جنت کہے گا وہ دراصل دوزخ ہوگی (لہٰذا جس کو وہ جنت میں داخل کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا) دیکھو میں تم کو دجال کے فتنہ سے اسی اہمیت کے ساتھ ڈراتا ہوں جیسا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی امت کو ڈرایا تھا- (بخاری)

(۱۲۱۶) ✱ حدیث مذکور میں آپ نے دجال کے فتنہ کا بڑی خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے اور اس کی اہمیت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے کہ اس عظیم فتنہ کی ہولناکی کی اطلاع ہر نبی نے دی ہے- پھر ان انبیاء میں آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کا نام خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ خدا کی زمین پر یہی سب سے پہلے رسول تھے بے شبہ ہر شفیق و حریص نبی کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے فتنوں سے اپنی امتوں کو ڈرایا کرتا ہے خواہ ان کے ظہور کا وقت کچھ بھی ہو آخر قیامت کے تذکرہ سے بھی ہر نبی و رسول نے اپنی اپنی امتوں کو ڈرایا ہے اس کا منشاء ان اہم واقعات کے ظہور سے پہلے استعداد عمل ہے- لیکن یہ عظیم فتنہ چونکہ آپ ہی کی امت میں ظاہر ہونے والا تھا اس لیے یہ حق آپ ہی کا تھا کہ آپ اس کے متعلق ایسی ایسی واضح علامات بیان فرمادیں جس کے بعد اس کے پہچاننے میں ذرا سا بھی کوئی شبہ نہ رہے- اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق میں تم سے وہ بات کہتا ہوں جو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی نہ فرمائی تھی- اس واقعہ کی سیر حاصل تفصیلات آئندہ اوراق میں آپ کے ملاحظہ سے گذرے گی' ان شاء اللہ.

(۱۲۱۷) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ صَامَ نُوْحٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ الدَّھْرَ اِلَّا یَوْمَ الْفِطْرِ وَ الْاَضْحٰی وَ صَامَ دَاوٗدُ عَلَیْہِ السَّلَامُ نِصْفَ الدَّھْرِ وَ صَامَ اِبْرَاھِیْمُ عَلَیْہِ السَّلَامُ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ مِنْ کُلِّ شَھْرٍ صَامَ الدَّھْرَ وَ اَفْطَرَ الدَّھْرَ. (رواہ الطبرانی و ابن ماجۃ نحوہ و فی اسناد یھما ابن لھیعۃ کذافی البدایۃ)

(۱۲۱۷) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ نوح علیہ السلام بجز عید و بقرعید کے صوم دہر رکھا کرتے تھے (یعنی ان ایام کے سواء ہمیشہ روزہ رکھتے تھے) اور داؤد علیہ السلام نصف دہر روزہ رکھتے تھے۔ یعنی ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر ماہ میں تین دن روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صوم دہر کے برابر شمار تھا اگرچہ تین دن کے علاوہ ہمیشہ افطار کرتے تھے۔

(طبرانی - ابن ماجہ)

(۱۲۱۸) عَنْ سَمُرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَامُ اَبُو الْعَرَبِ وَ حَامُ اَبُو الْحَبْشِ وَ یَافِثُ اَبُو الرُّوْمِ. (رواہ امام احمد و الترمذی نحوہ)

(۱۲۱۸) سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد میں عرب سام کی اور حبش حام کی اور روم یافث کی نسل سے ہیں۔

(ترمذی شریف)

(۱۲۱۷) * آخرت میں ایک نیکی دس کے برابر شمار ہوگی اس لیے تین روزے تیس کے برابر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخشی وہ اس ملت حنیف کے سب سے اولوالعزم رسول کی امت کو بھی بخش دی اس لیے صوم دہر کی فضیلت حاصل کرنے کی ایک صورت حدیث میں ہر ماہ میں تین روزے رکھنا بھی آئی ہے۔

(۱۲۱۸) * حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں روم سے مراد روم اول ہے جس کو یونان کہتے ہیں ان کا نسب نامہ یہ ہے:

رومی بن بطی بن یونان بن یافث بن نوح علیہ السلام۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع روایت پیش کی ہے کہ عرب، فارس اور روم یہ سام کی اولاد میں ہیں اور ان میں خیر رہے گی۔ اور یاجوج و ماجوج، ترک اور سقالبہ یافث کی اولاد ہیں اور ان میں خیر کا نام نہ ہوگا اور قبط و بربر اور سودان یہ حام کی اولاد ہیں۔ مگر حافظ موصوف نے اس روایت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول تسلیم نہیں کیا اور فرمایا ہے کہ سعید بن المسیب کا قول ہے۔ حام و سام و یافث کے متعلق بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ تینوں طوفان کے بعد کی پیدائش ہیں مگر حافظ موصوف نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور طوفان سے قبل کی پیدائش قرار دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ تورات کی تصریح کے مطابق ان تینوں کا کشتی میں موجود ہونا ثابت ہے۔ حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ موجودہ بسیط ارض کی تمام آبادی صرف ان تین ہی کی نسل سے ہے۔ (ج ۱ ص ۱۱۵ البدایۃ) جو لوگ یہاں اختلاف رکھتے ہیں وہ طوفان نوح علیہ السلام کے عام ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن حافظ ابن کثیر اس نظریہ سے متفق نہیں ہے۔

سیدنا ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام

حسب بیان حافظ ابن کثیر ان کا نسب نامہ یہ ہے ہود بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام- ان کے نسب میں اس کے علاوہ بھی اور چند اقوال ہیں- حضرت ابوذر کی روایات کی بناء پر چار عربی انبیاء علیہم السلام سے یہ پہلے عربی نبی تھے- کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عربی بولنے والے نبی یہی تھے- مگر حافظ ابن کثیرؒ کا میلان اس طرح ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے- ان کا قبیلہ عاد بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام تھا- تاریخ میں ان کو عادِ اوّل کہا جاتا ہے- عادِ ثانیہ ان کے بعد ہوئے ہیں- اور آیت اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ میں انہی کا تذکرہ ہے- طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی بت پرستی شروع کی تھی- ان کے بتوں کے نام صدا و صمود هرا تھے- اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور جب انہوں نے سرکشی کی راہ نہ چھوڑی تو عذابِ الٰہی سے نیست و نابود کردیئے گئے-

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ان کی قبر بلاد یمن میں ہے کوئی کہتا ہے کہ دمشق میں ہے اور دمشق کی جامع مسجد کی قبلہ کی دیوار کی طرف ایک قبر ہے- بعض کا خیال ہے کہ یہی ہود علیہ السلام کی قبر ہے- (البدایہ ج ا ص ۱۳۰)

(۱۲۱۹) عَنْ اَبِیْ وَائِلٍ عَنِ الْحَارِثِ وَ هُوَ ابْنُ حسان و یقال ابن یزید البکری قَالَ خَرَجْتُ اَشْکُو العَلاء بن الحَضْرَمِیَّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَرَرْتُ بِالرَبَذَةِ فَاِذَا عَجُوْزٌ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ مُنْقَطِعٌ بِهَا فَقَالَتْ یَا عَبْدَاللّٰہِ اِنَّ لِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَاجَةً فَهَلْ اَنْتَ مُبْلِغِیَّ اِلَیْهِ قَالَ فَحَمَلْتُهَا فَاَتَیْتُ الْمَدِیْنَةَ فَاِذَا الْمَسْجِدُ غَاصٌّ بِاَهْلِهٖ وَ اِذَا رَأَیْتُ سُوْدٌ تَخْفِقُ وَ اِذَا بِلَالٌ مُتَقَلِّدٌ السَّیْفَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ

(۱۲۱۹) حارث روایت کرتے ہیں کہ میں علاء بن حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا- میرا گذر جب مقام ربذہ سے ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بنی تمیم قبیلہ کی ایک بوڑھی عورت ہے جو سواری نہ ہونے کی وجہ سے سفر سے رہ گئی ہے- اس نے کہا اے اللہ کے بندے! مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ کام ہے- کیا تم اتنا کرو گے کہ مجھ کو ان تک پہنچا دو- یہ کہتے ہیں میں نے اس کو اپنے ہمراہ لے لیا- جب مدینہ میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد شریف لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور سیاہ جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں اور ادھر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں- میں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کو کسی مہم پر روانہ کرنا ہے- یہ کہتے ہیں میں بیٹھ

(۱۲۱۹) * ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو بہت سے مفسرین نے عاد اولیٰ کی ہلاکت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے حالانکہ یہ واقعہ بظاہر عاد ثانیہ کا ہے- کیونکہ اول تو اس واقعہ میں مکہ مکرمہ کا ذکر ہے اور عاد اولیٰ کے زمانہ میں اس کی بناء ہی نہیں ہوئی تھی اس کو بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا ہے اور عاد اولیٰ ان سے پہلے گذر چکے ہیں- نیز اس میں معاویہ بن بکر اور اس کے اشعار ؒ .....

مَاشَأْنُ النَّاسِ قَالُوْا يُرِيْدُ اَنْ يَّبْعَثَ عَمرو بْنَ الْعَاصِ وَجْهًا قَالَ فَجَلَسْتُ قَالَ فَدَخَلَ مَنْزِلَهٗ اَوْقَالَ رَحْلَهٗ فَاسْتَاْذَنْتُ عَلَيْهِ فَاَذِنَ لِيْ فَدَخَلْتُ فَسَلَّمْتُ فَقَالَ فَهَلْ كَانَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ بَنِيْ تَمِيْمٍ شَيْءٌ فَقُلْتُ نَعَمْ وَ كَانَتْ لَنَا الدَّبَرَةُ عَلَيْهِمْ وَ مَرَرْتُ بِعَجُوْزٍ مِنْ بَنِيْ تَمِيْمٍ مُنْقَطِعٍ بِهَا فَسَأَلَتْنِيْ اَنْ اَحْمِلَهَا اِلَيْكَ وَ هَاهِيَ بِالْبَابِ فَاَذِنَ لَهَا فَدَخَلَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ رَأَيْتَ اَنْ يَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ بَنِيْ تَمِيْمٍ حَاجِزًا فَاجْعَلِ الدهنا فَاِنَّهَا كَانَتْ لَنَا قَالَ فَحَمِيَتِ الْعَجُوْزُ وَ اسْتَوْفَزَتْ وَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِلٰى اَيْنَ تَضْطَرُّ مُضَرُكَ فَقُلْتُ اِنَّ مَثَلِيْ مَا قَالَ الْاَوَّلُ (مِعْزَىً حَمَلَتْ حَتْفَهَا) حَمَلْتُ هٰذِهِ الْاَمَةَ وَ لَا اَشْعُرُ اَنَّهَا كَانَتْ لِيْ خَصْمًا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ اَنْ اَكُوْنَ كَوَا فِدِعَادٍ قَالَ هِيْهِ وَ مَا وَا فِدُ عَادٍ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْحَدِيْثِ مِنْهُ وَ لٰكِنْ يَسْتَطْعِمُهٗ قُلْتُ اِنَّ عَادًا قُحِطُوْا فَبَعَثُوْا وَفْدًا لَهُمْ يُقَالُ لَهُمْ قِيْلُ فَمَرَّ بِمُعَاوِيَةَ بْنِ بَكْرٍ فَاَقَامَ عِنْدَهٗ شَهْرًا يَسْقِيْهِ الْخَمْرَ وَ يُغَنِّيْهِ

گیا اتنی دیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف لے گئے۔ میں نے حاضری کے لیے اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی‘ میں اندر حاضر ہوا اور سلام بجالایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو تمہارے اور بنی تمیم کے درمیان کوئی قصہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں۔ ہمارا ایک نشیبی زمین کے بارے میں ان پر دعویٰ ہے۔ نیز راستہ میں مجھے ایک بوڑھی عورت ملی جس کے پاس سواری نہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک پہنچادوں۔تو وہ دروازہ پر حاضر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی اجازت دے دی اور وہ بھی اندر آ گئی۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مہربانی فرما کر ہمارے اور بنی تمیم کے درمیان ایک حد فاصل مقرر فرمادیں اور اگر مناسب خیال فرمائیں تو مقام ''دہنا'' مقرر فرمادیں کیونکہ یہ مقام ہمارا ہی تھا۔ یہ سن کر عورت گرم ہوگئی اور جلدی سے بولی یارسول اللہ تو پھر یہ آپ کا قبیلہ مضر کدھر جائے گا۔ اس کی گفتگو سن کر میں نے کہا میری مثال تو وہی ہوگئی جو پہلوں نے کہا تھا کہ ''بکری اپنی موت خود اپنے ساتھ لائی'' میں اس عورت کو خود ساتھ لے کر آیا تھا‘ مجھ کو یہ کیا خبر تھی کہ یہی میرے مخالف بولے گی۔ میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ لیتا ہوں کہ میرا حشر وہ نہ ہو جو ''وافد عاد'' کا ہوا تھا۔ یہ جملہ سن کر آپ نے فرمایا۔خوب! جانتے بھی ہو وافد عاد کا قصہ کیا تھا۔ گو اس قصہ کو آپ ان سے زیادہ خود جانتے تھے مگر آپ نے چاہا کہ ان سے بھی سنیں۔ یہ کہتے ہیں میں نے عرض کی کہ ایک بار قوم عاد قحط میں مبتلاء ہوئی تو انہوں نے اپنے دستور کے مطابق ''قیل'' کو اپنی جانب سے وفد کا سردار مقرر کر کے مکہ مکرمہ دعاء کے لیے بھیجا۔ اس شخص کا

لله ..... کا ذکر بھی موجود ہے یہ اشعار عاد اولیٰ کے ذوق سے ملتے جلتے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ذوق بعد کے لوگوں کا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس قصہ کے الفاظ میں یہ بھی منقول ہے کہ اس بادل میں آگ اور چنگاریاں نظر آئی تھیں‘ حالانکہ عاد اولیٰ ہوا کے عذاب سے ہلاک کیے گئے تھے اور ابن مسعودؓ اور عباسؓ اور بہت سے تابعین سے منقول ہے کہ یہ ہوا نہایت سرد تھی۔ ان وجوہات کی بناء پر عاد اولیٰ کی تفسیر میں اس روایت کا تذکرہ چسپاں نہیں ہے۔ البدایہ ج ا ص ۱۲۸ اس سلسلہ کی حدیث ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۰ میں گذر چکی ہے۔

جَارِيَتَانِ يُقَالُ لَهُمَا الْجَرَادَتَانِ فَلَمَّا مَضَى الشَّهْرُ خَرَجَ إِلَى جِبَالِ تِهَامَةَ فَقَالَ اللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ إِنِّيْ لَمْ أَجِئْ إِلَى مَرِيْضٍ فَأُدَاوِيَهُ. وَلَا إِلَى أَسِيْرٍ فَأُفَادِيَهُ. اَللّٰهُمَّ اسْقِ عَادًا مَا كُنْتُ تَسْقِيْهِ فَمَرَّتْ بِهِ سَحَابَاتٌ سُوْدٌ فَنُوْدِيَ مِنْهَا اِخْتَرْ فَأَوْمَأَ إِلَى سَحَابَةٍ مِنْهَا سَوْدَاءَ فَنُوْدِيَ خُذْهَا رِمَادًا رِمْدِدًا لَا تُبْقِيْ مِنْ عَادٍ أَحَدًا قَالَ فَمَا بَلَغَنِيْ أَنَّهُ بُعِثَ عَلَيْهِمْ مِنَ الرِّيْحِ إِلَّا كَقَدْرِ مَا يَجْرِيْ فِيْ خَاتَمِيْ هٰذَا مِنَ الرِّيْحِ حَتّٰى هَلَكُوْا قَالَ أَبُوْ وَائِلٍ وَ صَدَقَ وَ كَانَتِ الْمَرْأَةُ وَ الرَّجُلُ إِذَا بَعَثُوْا وَفْدًا لَهُمْ قَالُوْا لَا تَكُنْ كَوَافِدِ عَادٍ.

(هكذا رواه الترمذی عن عبد بن زيد بن الحباب به و رواه النسائی من حديث سلام ابی المنذر عن عاصم بن بهدلة و من طريقه رواه ابن ماجة و هكذا اور دهذا الحديث و هذه القصة عند تفسير هذه القصة غير واحد من المفسرين كابن جرير و غيره و قد يكون هذا السياق لاهلاك عاد الاخرة)

گذر اپنے دوست معاویہ بن بکر کے پاس ہوا یہ اس کے پاس ایک ماہ ٹھہرا رہا' وہ اس کو شراب پلاتا اور اس کے یہاں دو گانے والی لونڈیاں تھیں جن کو ''جراد تان'' کہا جاتا تھا' ان کا گانا سنواتا (جب اس کے قیام کی مدت دراز ہوئی گئی تو اس کو اپنی قوم کے حال زار پر ترس آیا مگر زبان سے بھلا کیا کہہ سکتا تھا اس لیے ان گانے والیوں سے کہا کہ آنے گانے میں اپنی قوم کے قحط کا نقشہ گائیں یہ سن کر) ایک ماہ بعد اس کو اپنی قوم کا خیال آیا اور وہ تہامہ کی پہاڑوں کی طرف دعا کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اور یہ دعاء کی۔ الٰہی تو جانتا ہے کہ میں نہ تو کسی بیمار کی دوا دارو کے لیے آیا ہوں اور نہ فدیہ دے کر کسی قیدی کو چھڑانے کے لیے آیا ہوں' میں تو اپنی قوم عاد کے لیے بارش مانگنے آیا ہوں تو جو کچھ تجھ کو ان کو پلانا ہے وہ پلا دے۔ اس دعاء کے بعد ہی اس کے سامنے سے سیاہ سیاہ بادل گذرے اور آواز آئی کہ ان میں سے جس کو دل چاہے پسند کر لے اس نے کالے کالے ایک بادل کی طرف اشارہ کیا (اور یہ سمجھا کہ اس میں بہت پانی ہو گا) آواز آئی لے جا جلی پھونکی راکھ جو قوم میں سب کا خاتمہ کر دے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو بات مجھ کو پہنچی یہ ہے کہ ان پر ہوا کا عذاب آیا جس سے وہ سب ہلاک و برباد ہو کر رہ گئے حالانکہ وہ عذاب کی ہوا ان پر صرف اتنی سی چھوڑی گئی تھی اور اشارہ کر کے بتایا کہ جتنی میری اس انگوٹھی کے حلقہ سے نکل سکے۔ ابو وائل کہتے ہیں انہوں نے یہ درست کہا۔ اس کے بعد یہ مثل بن گئی کہ جب کوئی مرد یا عورت کسی کو اپنا وفد بنا کر بھیجتے تو یہ کہہ دیتے' دیکھنا کہیں وافد عاد کی طرح نہ ہو جانا جو گیا تو تھا بارش کے لیے اور لایا عذاب۔ (ترمذی شریف و ابن ماجہ)

سیدنا صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام

ان کا نسب نامہ یہ ہے صالح بن عبد بن ماشح بن عبید بن حاجر بن ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام اس نسب نامہ کے لحاظ سے حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود میں سے تھے ان کی قوم کو ثمود اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کے جداعلیٰ ثمود تھے' ان کا مقام سکونت ''حجر'' تھا جو حجاز اور تبوک کے درمیان واقع ہے۔ قوم ثمود کی عمریں بہت طویل ہوتی تھیں۔ جب یہ رہائش کے لئے کوئی مکان بناتے تو وہ ایک شخص کی عمر کو بھی کافی نہ ہوتا اور اسی کی حیات میں ڈھیر ہو کر گر جاتا۔ اس لئے پہاڑوں کو کھود کر انہوں نے مکانات بنانے شروع کر دیے تھے۔

ایک دن حضرت صالح علیہ السلام ان کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے تو ان کی قوم نے یہ فرمائش کی کہ اگر آپ اس پتھر سے ان صفات کی ایک ناقہ نکال دیں تو ہم آپ کو مان لیں گے - ان کی دعا سے پتھر پھٹا اور اس میں سے ان ہی کی مطلوبہ صفات کی ایک ناقہ برآمد ہوگئی - اس پر ایک جماعت تو ایمان لے آئی مگر اکثر افراد بدستور اپنے کفر پر قائم رہے - ایمان قبول کرنے والی جماعت کے سردار کا نام جندع بن عمر بن لبید تھا - چونکہ یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا کہ جس دن یہ ناقہ پانی پئے گی اس دن قوم کا کوئی فرد کنوئے سے پانی نہیں لے سکے گا - اس لیے اس دستور کے مطابق ایک مدت تک یہی عمل چلتا رہا آخر اس میں ان کو تنگی محسوس ہونے لگی اور ان کے رئیس قدار بن سالف نے اپنی قوم کے مشورہ سے ناقہ کو زخمی کر کے مار دیا - اور اسی کی پاداش میں عذاب الٰہی سے ہلاک کردی گئی - دیکھو البدایۃ والنہایۃ -

اب رہا یہ سوال کہ ناقہ پتھر سے کیسے پیدا ہوئی تو ہر چند کہ یہاں کوئی قرآنی بیان نہیں ہے تاہم کتب محدثین سے جو صورت یہاں منقول ہے اس کی تکذیب کی بھی کوئی وجہ ہمارے سامنے نہیں ہے بالخصوص جب کہ قرآن کریم نے اس کو معجزہ کہا ہے اور معجزات کا اپنی حقیقت کے لحاظ سے اس قسم کے عجائبات پر مشتمل ہونا کوئی جدید بات نہیں - ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جن تفصیلات کی تصدیق کے لیے اجمالی سامان موجود ہو اور ان کی تکذیب کے لیے کوئی دلیل نہ ہو تو اس کو صرف اپنی عقل کی بناء پر ہر جگہ ساقط الاعتبار قرار نہیں دینا چاہیے - موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ایک ضرب سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلنا اور پتھر پھٹ کر ناقہ کا نکل آنا دونوں باتیں خلاف عادت ہیں اور قدرت کے سامنے دونوں یکساں ممکن ہیں اس لیے ان کے انکار و تردد کی یہاں کوئی وجہ نہیں ہے -

(۱۲۲۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَمْعَةَ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ النَّاقَةَ وَ ذَكَرَ الَّذِىْ عَقَرَهَا فَقَالَ (اِذِ انْبَعَثَ اَشْقَاهَا) اِنْبَعَثَ لَهَا رَجُلٌ مِنْ غَارِمٍ عَزِيْزٍ مَنِيْعٍ فِىْ رَهْطِهٖ مِثْلُ اَبِىْ زَمْعَةَ. (رواه الامام احمد اخرجاه من حديث هشام كذافى البداية ج ۱ ص ۱۳۵)

(۱۲۲۰) عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر فرمایا اور جس نے اس کو زخمی کر کے ہلاک کیا تھا اس کا بھی ذکر فرمایا جس کا تذکرہ قرآن شریف کی اس آیت میں کیا گیا ہے ''اِذِ انْبَعَثَ اَشْقَاهَا'' فرمایا یہ شخص اپنی قوم میں بڑا معزز اور سردار تھا - جیسا مکہ مکرمہ میں یہ ابوزمعہ ہے -

(مسند احمد)

(۱۲۲۱) عَنْ جَابِرٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَسْئَلُوا الْاٰيَاتِ فَقَدْ سَاَلَهَا قَوْمُ صَالِحٍ فَكَانَتْ يَعْنِىْ هٰذِهٖ لِلنَّاقَةِ تَرِدُ مِنْ هٰذَا الْفَجِّ وَ

(۱۲۲۱) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر سے گذرے تو فرمایا معجزات کی فرمائش نہ کرنا - صالح علیہ السلام کی قوم نے معجزہ کی فرمائش کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی فرمائش کے مطابق ان کو اونٹنی دے دی گئی جو ایک راستہ سے گھاٹ پر پانی پینے آتی اور پانی پی

(۱۲۲۱) * اس صورت سے ارضِ حرم کا احترام بھی اپنی جگہ باقی رہا اور عذاب مقدر سے پھر جان چھوٹ نہ سکی - اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ پاداش عمل کسی باعث سے گو مؤخر ہو جائے مگر آخر کار بھگتنی ہی پڑتی ہے اس لیے تھوڑی تاخیر سے مغرور نہ ہونا چاہیے - للّٰہ .....

تَصْدُرُ مِنْ هٰذَا الْفَجِّ (فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَعَقَرُوْهَا) وَ كَانَتْ تَشْرَبُ مَاءَ هُمْ يَوْمًا وَ يَشْرِبُوْنَ لَبَنَهَا لَوْمًا فَعَقَرُوْهَا فَاَخَذَتْهُمْ صَيْحَةٌ اَهْمَدَا اللّٰهُ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ مِنْهُمْ اِلَّا رَجُلًا وَاحِدًا كَانَ فِيْ حَرَمِ اللّٰهِ فَقَالُوْا مَنْ هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ هُوَ اَبُوْرَ غَالٍ فَلَمَّا خَرَجَ مِنَ الْحَرَمِ اَصَابَهُ مَا اَصَابَ قَوْمَهُ. (قال ابن كثير هذا الحديث على شرط مسلم و ليس هو فى شىء من الكتب الستة البداية ج ۱ ص ۱۳۷)

کر دوسرے ارستہ سے لوٹ جاتی تھی- مگر انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کا مقابلہ کیا اور اس کو زخمی کر ڈالا- طریقہ یہ تھا کہ ایک دن اونٹنی ان کے حصہ کا پانی پیا کرتی (اس دن پانی میں ان کا کوئی حق نہ تھا) اور ایک دن وہ اس کا دودھ پیتے- آخر ایک چنگھاڑ کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا اور آسمان کے نیچے ان کا جو فرد بھی تھا اللہ تعالیٰ نے سب کو فنا کر دیا- صرف ایک شخص بچا رہا جو اس وقت حرم کی زمین میں موجود تھا- لوگوں نے عرض کی- یا رسول اللہ وہ کون شخص تھا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ابو رغال تھا پھر جب وہ حرم کی زمین سے نکلا تو جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا وہی اس پر ٹوٹ پڑا- (مسند احمد).

لله ..... نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر قدرت کے متعارض قوانین میں تطبیق کی صورت خود قدرت ہی کے علم میں ہوتی ہے- یہاں عقلی گھوڑے دوڑانے غلط ہیں- اب دیکھیے "مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" کا اقتضاء یہ تھا کہ ابو رغال امن میں رہتا اور قومی عذاب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عذاب اس پر بھی آتا- مگر علم الٰہی میں ان دونوں میں توافق کی صورت کیا تھی یہ پہلے سے کس کو معلوم تھا-

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ رزق کی طرح رحمت و عذاب کا بھی ایک حصہ رسد ہوتا ہے جو مل کر رہتا ہے پھر اس کے ملنے کے لیے قدرت کیا پیرایہ اختیار کرتی ہے یہ ہمارے علم سے باہر بات ہے- لہٰذا نہ تو بد اعمالی پر مواخذہ نہ ہونے سے بے خوف ہونا چاہیے اور نہ نیک چلنی پر انعامات نہ ہونے سے مایوس ہونا چاہیے- ہر عمل کے بدلے کے لیے ایک وقت ہے- بس اس کا انتظار کرنا چاہیے- اسی لیے قرآن میں فرمایا ہے: فَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ. (الشعراء:۲۲۷)

وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ — اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں-

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. (الانعام:۶۷) — ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا-

حدیث مذکور کی روشنی میں اب اس پر غور کر لینا چاہیے کہ جس طرح معذب مقامات میں آثار عذاب مسلسل رہتی ہیں اسی طرح متبرک مقامات میں آثار برکت و رحمت بھی مسلسل رہنے چاہئیں اور جس طرح کہ معذب مقامات میں عذاب الٰہی کی گرفت کا خطرہ ہوتا ہے اسی طرح مقامات برکت و رحمت میں قیام سے رحمت کا امیدوار بھی رہنا چاہیے اور جس طرح کہ معذب مقامات کی آب و ہوا اور غذاء مسموم ہوتی ہے اسی طرح رحمت کے مقامات کی آب و غذاء بھی متبرک ہونی چاہیے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں سے اور آپ کے جھوٹے پانی سے امت ہمیشہ برکت حاصل کرتی رہی ہے یہ بات علیحدہ ہے کہ عوام کے عقیدہ کے فساد کے خطرہ سے کوئی عمل مصلحۃً اس کو ترک فرما دیا پس مسئلہ اور مصلحت دونوں کی رعایت لازم ہے اور یہی وہ دقیق مقام ہے جہاں اکثر لغزش ہو جاتی ہے- یعنی ان دونوں کے درمیان پورا توازن قائم نہیں رہتا اور کبھی مصلحت کی رعایت اتنی ہو جاتی ہے کہ مسئلہ کے خلاف ہو جاتا ہے اور کبھی مسئلہ کی جانب اتنی نظر ہوتی ہے کہ مصلحت بالکل نظر انداز ہو جاتی ہے- صحیح راہ اعتدال کی ہے-

(۱۲۲۲) عَنْ اِبْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ لَمَّا نَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ عَلٰی تَبُوْکَ نَزَلَ بِهِمِ الْحِجْرَ عِنْدَ بُیُوْتِ ثَمُوْدَ فَاسْتَقَی النَّاسُ مِنَ الْاٰبَارِ الَّتِیْ کَانَتْ تَشْرَبُ مِنْهَا ثَمُوْدُ فَعَجَنُوْا مِنْهَا وَ نَصَبُوْا الْقُدُوْرَ فَاَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَهْرَاقُوا الْقُدُوْرَ وَ عَلَفُوا الْعَجِیْنَ لِلْاِبِلِ ثُمَّ ارْتَحَلَ بِهِمْ حَتّٰی نَزَلَ بِهِمْ عَلَی الْبِئْرِ الَّتِیْ کَانَتْ تَشْرَبُ مِنْهَا النَّاقَةُ وَ نَهَاهُمْ اَنْ یَدْخُلُوْا عَلَی الْقَوْمِ الَّذِیْ عُذِّبُوْا اِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یُصِیْبَکُمْ مِثْلَ مَا اَصَابَهُمْ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَیْهِمْ۔

(رواہ الامام احمد)

(۱۲۲۲) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو جاتے ہوئے جب وادی حجر سے گذرے جہاں ثمود کی (ویران شدہ) بستیاں تھیں تو لوگوں نے جن کنوؤں سے کہ قوم ثمود پانی پیا کرتی تھی ان ہی سے پانی پینا شروع کیا' اسی کے پانی سے آٹے گوندھ لیے اور ہانڈیاں چڑھا دیں- جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا سب ہانڈیاں الٹ دی جائیں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر فوراً ہانڈیاں گرا دی گئیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو ڈال دیا گیا- اس کے بعد آگے چلے اور جب اس کنوئیں سے گذرے جس سے کہ خاص صالح علیہ السلام کی ناقہ پانی پیا کرتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو عذاب شدہ قوموں کی بستیوں کے اندر داخل ہونے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھ کو اندیشہ ہے کہ جو عذاب ان پر ہے کہیں اس کی لپیٹ میں تم بھی نہ آ جاؤ' لہٰذا ایسی بستیوں میں داخل ہی نہ ہو-

(۱۲۲۳) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ بِالْحِجْرِ لَا تَدْخُلُوْا عَلٰی هٰؤُلَاءِ الْمُعَذَّبِیْنَ اِلَّا اَنْ تَکُوْنُوْا بَاکِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا بَاکِیْنَ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَیْهِمْ اَنْ یُصِیْبَکُمْ مِثْلَ مَا اَصَابَهُمْ۔ (رواہ الامام احمد)

(۱۲۲۳) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وادیٔ حجر سے گذرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو ان عذاب شدہ بستیوں میں داخل نہ ہونا - مگر گریہ وزاری کرتے ہوئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر ان میں داخل نہ ہونا - کہیں تم بھی اسی عذاب کے لپیٹ میں نہ آ جاؤ جو ان کو ہو رہا ہے-

(احمد-شیخین)

(۱۲۲۳) * یہ عالم غیب کی ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ تھا - عام آنکھیں صرف ان بستیوں کو دیکھتی تھیں اور خیال یہی ہوتا تھا کہ ان بستیوں پر کبھی عذاب آیا تھا اور اب ختم ہو گیا مگر صاحب نبوت نے تنبیہ فرمائی کہ معذب مقامات ہمیشہ معذب ہی رہتے ہیں اور جس طرح وبائی آب وہوا میں تندرست آدمی بھی جاتے ہوئے خوف کھاتا ہے اسی طرح معذب بستیوں میں سیر وتفریح کے لیے جانا بڑی غلطی ہے یہ تفریح کے مقامات نہیں - یہ بڑے خوف اور بڑی عبرت کے مقامات ہیں - ان فضاؤں میں عذاب الٰہی کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے اس لیے سیر وتفریح کے بجائے یہاں صورت عجز وانکسار اور خوف وخشیت کی بنانی چاہیے اور اس ماحول کی اشیاء بھی استعمال میں لانی نہیں چاہئیں اور ان سے اسی طرح پرہیز کرنا چاہیے جس طرح کہ وبائی علاقوں کی اشیاء سے دنیا آج پرہیز کرتی ہے - وبائی امراض سے حفاظت میں آج تو اتنا مبالغہ ہے کہ خارجی ممالک کے سفر کے لیے بھی مختلف قسم کے انجکشن اور ذرا سی بات پر قرنطینہ لازم قرار دیا گیا ہے - افسوس للّٰہ ......

اخرجاه فی الصحیحین من غیر وجه و فی بعض الروایات انه علیه السلام لَمَّا مَرَّ بِمَنَازِلِهِمْ قَنَّعَ رَأْسَهُ وَ اَسْرَعَ رَاحِلَتَهُ وَ نَهٰی عَنْ دُخُوْلِ مَنَازِلِهِمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِیْنَ وَفِیْ رِوَایة فَاِنْ لَمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا خَشْیَةَ اَنْ یُصِیْبَكُمْ مِثْلُ مَا اَصَابَهُمْ.

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بستیوں سے گذرے تو اپنا سر مبارک جھکا لیا اپنی اونٹنی تیز کر دی اور صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو منع فرمایا کہ ان بستیوں کے اندر نہ جائیں' مگر گریہ وزاری کے ساتھ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم گریہ وزاری کی صورت ہی بنالیں - مبادا جو عذاب ان کو ہے کہیں تم بھی اس کے لپیٹ میں نہ آ جاؤ -

(۱۲۲۴) قَالَ مَعْمَرٌ اَخْبَرَنِیْ اِسْمَاعِیْلُ بْنِ اُمَیَّةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّبِقَبْرِ اَبِیْ رِغَالٍ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَنْ هٰذَا؟ قَالُوا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ هٰذَا قَبْرُ اَبِیْ رِغَالٍ رَجُلٌ مِنْ ثَمُوْدَ كَانَ فِیْ حَرَمِ اللّٰهِ فَمَنَعَهٗ حَرَمُ اللّٰهِ عَذَابَ اللّٰهِ فَلَمَّا خَرَجَ اَصَابَهٗ مَا اَصَابَ قَوْمَهٗ فَدُفِنَ هٰهُنَا وَ دُفِنَ مَعَهٗ غُصْنٌ مِنْ ذَهَبٍ فَنَزَلَ الْقَوْمُ فَابْتَدَرُوْهُ بِاَسْیَافِهِمْ فَبَحَثُوْا عَنْهُ فَاسْتَخْرَجُوا الْغُصْنَ. (رواه عبدالرزاق. قال ابن كثیر هذا مرسل من هذا الوجه و قد جاء من وجه اخر متصلا كما رواه ابوداؤد و یحتمل ان یكون رفعه و هم لكن فی هذا المرسل و فی حدیث جابر شاهد له. كذا فی البدایة ج ۱ ص ۱۳۷)

(۱۲۲۴) اسماعیل بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابورغال کی قبر سے گذر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اس کا علم ہے - فرمایا یہ قبر ابورغال کی ہے - یہ شخص بھی قوم ثمود کا ایک فرد تھا - جب ثمود پر اللہ کا عذاب آیا تھا تو یہ اس وقت حرم کی زمین میں موجود تھا - خدائی حرم کی وجہ سے اس وقت تو عذاب الٰہی سے محفوظ رہا - بس حرم الٰہی سے اس کا نکلنا تھا کہ جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا اسی نے اس کو آ پکڑا اور وہ بھی ہلاک ہو گیا - اور جب دفن کیا گیا تھا تو اس کے ساتھ سونے کی ایک شاخ بھی دفن ہو گئی تھی - یہ سن کر لوگ لپکے اور اپنی تلواروں سے اس کی قبر کھود ڈالی (دیکھا تو سونے کی وہ شاخ موجود تھی چنانچہ اس کو نکال لیا)

(عبدالرزاق)

لله ..... ہے کہ یہی محتاط دماغ جب ان معذب مقامات سے گذرتے ہیں تو یہاں احتیاط کرنا مذہبی وہم پرستی سمجھتے ہیں -
اسی طرح مسرت و سرور کے حالات میں جن میں کہ شیطان نخوت و غرور کا نشہ پیدا کر سکتا ہے تواضع و انکسار میں ڈوب جانا چاہیئے کہیں ہوا کا رخ پھر نہ پلٹ جائے اسی لیے بنی اسرائیل کو یہ حکم ہوا تھا کہ بیت المقدس میں جب داخل ہوں تو تواضع و عاجزی کی شکل بنا کر سر جھکائے ہوئے داخل ہوئے مگر اس متمرد قوم نے اس کے برعکس ہی کیا - اسی سنت کے مطابق جب مکہ فتح ہوا اور جس مقام سے مسلمان کبھی بڑی کس مپرسی سے نکالے گئے تھے آج پھر بڑی شان سے فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تواضع کا عالم یہ تھا کہ اونٹنی پر سوار تھے اور مارے تواضع کے سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ریش مبارک کے بال کجاوہ کی لکڑی سے جا جا لگتے تھے - دیکھو البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۳۲۴ -

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام خلیل اللہ وجد سیدنا حبیب اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بہت سی حیثیات سے نمایاں ہے اور اس عالم سے لے کر عالم آخرت تک اپنی گوناگوں خصوصیات سے معمور ہے ان کے بعد نبوت کا ان کی ذریت میں منحصر ہو جانا خود قرآنِ کریم کا بیان ہے- انبیاء علیہم السلام گو سب حنیف تھے مگر یہاں بھی ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی ملت کا نام ہی حنیفیہ ہے- اس جگہ ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۶۸ حدیث نمبر ۳۱۳ اور اس کا تشریح نوٹ ضرور ملاحظہ فرمالیں- شریعت محمدیہ کی زمین ملت حنیفیہ ہی ہے ہم نے پہلے چالیس وہ احکام نقل کر دیئے ہیں جو دونوں شریعتوں میں مشترک ہیں- اس کے بعد ابن قتیبہ کی مشہور تالیف تاویل مختلف الحدیث ہماری نظر سے گذری اس میں چند اور مشترک احکام کی فہرست سامنے آئی- مثلاً قرابت وصہر کے رشتہ سے محرمات ایک اور دو طلاق کے بعد شوہر کو رجعت کا حق رہنا- نفس کی دیت سو اونٹ ہونا- جنابت سے غسل کرنا اور خنثیٰ میں مذکر و مؤنث کی غالب علامت کا اعتبار کرنا- دیکھو تاویل مختلف الاحادیث ص ۱۳۵ اس لحاظ سے اب مشترک احکام کی تعداد چالیس کی بجائے پینتالیس ہو جائے گی-

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے زمانہ میں عبادت اصنام یعنی بت پرستی اور کواکب پرستی کی عام وباء پھیلی ہوئی تھی اور کفر کا اس درجہ غلبہ ہو چکا تھا کہ حضرت خلیل علیہ السلام' ان کی بیوی اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے سواء کوئی کلمہ گو موجود نہ رہا تھا- اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ کے لیے ان کو مبعوث فرمایا- اس سلسلہ میں بادشاہوں کے ساتھ ان کے مناظرے قوموں کی تفہیم اور جابجا اثبات توحید اور ابطال شرک کے قاہرانہ براہین کا تذکرہ خود قرآن کریم میں موجود ہے- اسی لیے ہم نے آپ کے حالات زندگی کے تفصیلی تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی- وہ آفتابِ عالمتاب کی طرح سب ادیان سماویہ کی نظروں میں ہمیشہ درخشاں رہی ہے-

آپ کا مولد بابل یا غوطہ تھا' آپ کی والدہ ماجدہ کا نام ''امیلہ'' یا ''بلونا'' تھا- والد ماجد کا نام حسب ترجیح حافظ ابن کثیر آزر تھا- جمہور نساب تارح اور اہل کتاب تارخ لکھتے ہیں اور زبانوں کے اختلاف سے ناموں کی نقل میں اختلاف ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے- پھر علم اور لقب کا فرق بھی اگر ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں- اسی طرح اگر صفاتی نام بھی اسماء کی فہرست میں آ سکتے ہیں تو پھر پیش گوئیوں میں جو بے وجہ مباحث پیدا کی گئی ہیں وہ سب آسانی سے حل ہو سکتی ہیں- آپ کی کنیت ابو الضیفان تھی' اور آپ کی ایک اہم ضیافت کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے- آپ کی حیاتِ طیبہ میں بناء کعبہ اور آزمائشی میدانوں میں آپ کا صبر و استقامت اس کا سب سے نمایاں حصہ ہے ذبح عظیم اور آپ پر آتش کے برد و سلام جیسے عظیم الشان واقعات تو زباں زد خاص و عام ہو چکے ہیں اس سلسلہ میں جبرئیل علیہ السلام کے اصرار پر آپ کا فرمان ''**اما الیک فلا**'' حسب بیان حافظ ابن کثیر صرف بعض سلف کا مقولہ ہے-

آپ کی بیوی حضرت سارہ شاہ حران کی بیٹی تھیں- حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ جس کسی نے یہ کہا کہ وہ آپ کی بھیجتی تھیں یہ

بالکل بے تکی بات ہے اس پر یہ دعویٰ کرنا اور زیادہ بے اصل ہے کہ پہلے بھتیجی سے نکاح کرنا درست تھا - اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی یہ ان جائزات میں سے ہوگا جس کا انبیاء علیہم السلام کبھی ارتکاب نہیں فرماتے -

حضرت سارہ کا مشہور واقعہ جس ظالم بادشاہ کے ساتھ پیش آیا تھا حسب بیان بعض اہل تاریخ وہ ضحاک ظالم کا بھائی تھا اور اس کا نام سنان بن علوان تھا - ابن ہشام نے اپنی کتاب التیجان میں اس کا نام عمرو بن امرء القیس بن مایلون یا مایلبون لکھا ہے -

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبور مبارک شہر حبرون میں موجود ہیں - جس کو آج کل ''الخلیل'' کہا جاتا ہے - لیکن ان کی علیحدہ علیحدہ تعیین یقینی طور پر معلوم نہیں - البدایہ ج ۲ ص ۱۷۵ -

(۱۲۲۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ وَ مُوْسٰى وَ اِبْرَاهِيْمَ فَاَمَّا عِيْسٰى فَاَحْمَرُ جَعْدٌ عَرِيْضُ الصَّدْرِ وَ اَمَّا مُوْسٰى فَاٰدَمُ جَسِيْمٌ قَالُوْا لَهٗ فَاِبْرَاهِيْمُ قَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰى صَاحِبِكُمْ يَعْنِىْ نَفْسَهٗ.

(رواه الامام احمد و روى البخارى و مسلم نحوه فى الحج و فى اللباس ايضا)

(۱۲۲۵) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو عیسیٰ علیہ السلام سرخ رنگ، گھونگروالے بال اور چوڑے سینہ کے تھے - اور موسیٰ علیہ السلام گندم گوں رنگ اور لانبے چوڑے جسم کے آدمی تھے - رہ گئے ابراہیم علیہ السلام تو وہ مجھ کو دیکھ لو -

(احمد، بخاری شریف، مسلم شریف)

(۱۲۲۶) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِى الْجَنَّةِ قَصْرًا اَحْسِبُهٗ قَالَ مِنْ لُؤْلُؤَةٍ لَيْسَ فِيْهِ فَصْمٌ وَ لَا وَهْىٌ عَدَّهُ اللّٰهُ لِخَلِيْلِهٖ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نُزُلًا.

(رواه البزار و فيه علة مع كونه على شرط مسلم)

(۱۲۲۶) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - جنت میں ایک محل ہے میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ ایسے موتی کا ہے جس میں کہیں ذرا بال نہ ہو - اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے خلیل علیہ السلام کی مہمانی کے لیے تیار فرمایا ہے -

(بزار)

(۱۲۲۷) عَنْ جُنْدُبِ الْبَجَلِىِّ وَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِىْ خَلِيْلًا كَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا.

(رواه الشيخان)

(۱۲۲۷) جندب بجلی، عبداللہ بن عمرو اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - لوگو! سن لو اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا مجھ کو بھی اپنا خلیل بنایا ہے -

(متفق علیہ)

(۱۲۲۸) عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ قَالَ اِنَّ مُعَاذًا لَمَّا قَدِمَ الْيَمَنَ صَلّٰى بِهِمُ الصُّبْحَ فَقَرَأَ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ

(۱۲۲۸) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ معاذ جب یمن آئے اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی تو اس میں یہ آیۃ پڑھی وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا. اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو ان لوگوں میں سے ایک شخص بولا ابراہیم

قَرَّتْ عَيْنُ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

(رواه البخاری)

(۱۲۲۹) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِيْلَ لَهٗ مَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ قَالَ ذٰلِكَ يَوْمَ يَنْزِلُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى كُرْسِيِّهٖ فَيَأْطُّ كَمَا يَأْطُّ الرَّحْلُ الْجَدِيْدُ مِنْ تَضَايُقِهٖ وَ هُوَ كَسِعَةِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ وَ يُجَاءُ بِكُمْ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا فَيَكُوْنُ اَوَّلُ مَنْ يُكْسٰى اِبْرَاهِيْمُ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اُكْسُوْا خَلِيْلِيْ فَيُؤْتٰى بِرَيْطَتَيْنِ بَيْضَاوَيْنِ مِنْ رِيَاطِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اُكْسٰى عَلٰى اَثَرِهٖ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ اللّٰهِ مَقَامًا يَغْبِطُنِي الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ. رواه الدارمی و اخرج الحافظ برواية البيهقی من كتاب الاسماء و الصفات نحوه كما فی الفتح ج ٦ ص ٢٤٤ و الحافظ العينی فی عمدة القاری ج ٧ ص ٣٤٧.

(۱۲۳۰) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كَلِمَاتِ اِبْرَاهِيْمَ

علیہ السلام کی والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں (کہ اتنی بڑی فضیلت ان کے فرزند کونصیب ہوئی) (بخاری شریف)

(۱۲۲۹) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا - مقام محمود کیا چیز ہے؟ فرمایا یہ ایک مقام ہے جو مجھ کو اس دن نصیب ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ عرش عظیم سے اپنی کرسی پر تجلی فرمائے گا تو وہ اس طرح آواز کریں گی جیسا نیا کجاوہ کسی بڑی چیز کے وزن سے آواز کرنے لگتا ہے - حالانکہ اس کرسی کی وسعت آسمان وزمین کے درمیان فاصلہ کی برابر ہے اس کے بعد پھر تم سب مخلوق کو حاضر کیا جائے گا اور سب پابرہنہ، برہنہ جسم اور غیر مختون ہوں گے - پھر جن کو سب سے پہلے جنت کا لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے - ارشاد ہوگا - میرے خلیل کو پوشش پہناؤ - فوراً جنت کی چادروں میں سے دوسفید رنگ کی چادریں لاکر ان کو پہنائی جائیں گے اس کے بعد ہی پھر مجھ کو پوشش پہنائی جائے گی اور میں اللہ تعالیٰ کے دائیں آکر ایسے مقام پر کھڑا ہوں گے جہاں سب اگلے اور پچھلے مجھ پر غبطہ کریں گے -

(دارمی شریف)

(۱۲۳۰) ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کے متعلق جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے

(۱۲۳۰) * ان تین باتوں کا تفصیلی تذکرہ آپ ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۲۷ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا ذکر فرما کر یہ بات پورے طور پر صاف فرمادی ہے کہ وہ تینوں باتیں ہر طرح پر صحیح تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدائی دین کی حفاظت کی خاطر اختیار کی گئی تھیں - یہ خدا تعالیٰ کے خلیل کی بلند فطرت تھی کہ مخاطبوں کو چونکہ ان کی مراد سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی اس لیے انہوں نے اس کذب نما صدق کو بھی کذب کی برابر شمار کیا اور اس کو صوری کذب قرار دے کر اس پر ہمیشہ اتنے نادم رہے کہ قیامت تک اس کا انفعال ان کی فطرت سے محو نہ ہوسکا - جن لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام کا اندازہ نہیں ہے انہوں نے بے وجہ یہاں بخاری شریف کی اس حدیث میں بھی تاویلیں شروع کردی ہیں - حالانکہ جب ان کی کی حقیقت خود روایت میں واضح ہوچکی تو اب سوال اس کے سوا اور کیا رہتا ہے کہ اس حقیقت پر کذب کا اطلاق کیوں کیا گیا لیکن اگر ذرا اس طرف بھی نظر اٹھ جاتی کہ یہاں صرف ایک ابراہیم علیہ السلام ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی پوری کی پوری جماعت کے حالات زندگی اسی قسم کی سخت گیریوں اور مؤاخذات لفظیہ کا مرقع ہیں تو یہاں کوئی اشکال نہ رہتا - آخر آدم علیہ اسلام کی جو سرگذشت کہ خود قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اس کے بعد پھر جو لغزش ان سے ہوئی تھی .....

الثَّلاثُ الَّتِیْ قَالَ مَامِنْهَا کَلِمَةٌ اِلَّا مَاحَلَ بِهَا　　نکلی تھیں فرمایا کہ ان تینوں میں ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس سے ان کا

ﷲ ..... اس کی اہمیت کتنی رہ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے اس صوری فروگذاشت کوارادی فروگذاشت کے انداز میں ذکر کیا ہے' اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب معصیت کی نسبت فرمادی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی پوری جماعت پر نظر ڈال جائیے - آپ کو یہی ثابت ہوتا چلا جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں الفاظ گو وہی استعمال ہوتے ہیں جو عرف عام میں مستعمل ہوتے ہیں مگر ان کے مصداق میں ذرا سا بھی اشتراک نہیں ہوتا - ترجمان السنہ میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے - پس حدیث میں توریہ پر کذب کا اطلاق اسی نوع کا ہے جیسا قرآن کریم میں ایک زلت پر معصیت کا - انکشافِ حقیقت کے بعد ان اطلاق سے انبیاء علیہم السلام کی کسر شان نہیں نکلتی بلکہ اوران کی عظمت کا ثبوت ملتا ہے -

ہم اس وقت یہ بات اور بتا دینی چاہتے ہیں کہ کذب کا اطلاق صرف اس معنی میں منحصر سمجھ لینا جس کو عام طور پر جھوٹ کہا جاتا ہے' یہ بھی صحیح نہیں ہے - اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے جو تحقیق فرمائی ہے چونکہ وہ بہت جگہ کارآمد ہوگی اس لیے اس کو پیش کیا جاتا ہے -

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق ہمیشہ ارادی کذب پر نہیں ہوتا بلکہ ایسی خلاف واقع بات پر بھی ہوتا ہے جس کے کہنے کا انسان کو شرعی طور پر حق نہ ہو' خواہ اس میں دروغ گوئی کا ارادہ نہ ہو -

(۱) جیسا ایک بار ایک حاملہ عورت کے شوہر کے انتقال پر مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اس کا وضع حمل ہو چکا ہے تو کیا اب وہ جدید نکاح کر سکتی ہے - اس پر ابوالسنابل صحابی نے جواب دیا "ما انت بنا کحة حتی یمر علیک اربعة اشهر و عشر" یعنی جب تک تو چار ماہ دس دن تک عدت نہ گذار لے تجھ کو نکاح کا کوئی حق نہیں - جب اس بات کی آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا "کذب ابو السنابل" ابو السنابل نے جھوٹ کہا -

ا: اسی طرح عامر صحابی کی کی اپنی تلوار اتفاقی طور پر لگ جانے کی وجہ سے جب ان کی موت واقع ہوئی تو لوگوں نے کہا: عامر کا جہاد تو برباد ہو گیا - آپؐ نے فرمایا: "کذب من قالها" جس نے بھی یہ کہا جھوٹ کہا -

ب: فتح مکہ کے موقع پر سعد بن عبادہ کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا "الیوم یوم الملحمة" آج ہے جنگ کا دن تو آپ نے فرمایا "کذب سعد" سعد نے جھوٹ کہا -

ج: عبادہ بن صامت کے سامنے کسی نے بیان کیا کہ ابو محمد کہتے کہ وتر واجب ہے تو انہوں نے فرمایا "کذب ابو محمد" ابو محمد نے جھوٹ کہا -

د: حضرت ابن عباس سے کسی نے کہا کہ نوف کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ جس موسیٰ کا واقعہ پیش آیا تھا وہ موسیٰ بنی اسرائیل نہ تھے کوئی اور موسیٰ تھے تو فرمایا "کذب نوف" نوف نے جھوٹ کہا -

(۲) اسی طرح جو شخص ایسی خبر بیان کرے جس کی تصدیق شرعی طور پر شہادت کے بغیر ممنوع ہو تو وہ بھی جھوٹ کہلاتی ہے چنانچہ کسی پر تہمت لگانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے -

لَوْ لَا جَآءُوْا عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ. (النور:۱۳)　　چونکہ یہ لوگ چار گواہ نہیں لائے اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں -

(۳) جو شخص بے علمی سے غلط باتیں بنائے وہ بھی جھوٹ کی فہرست میں داخل ہے خواہ اس کے اپنے علم میں وہ حق ہی کیوں نہ ہوں - جیسا ﷲ .....

عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ. (رواه ابن ابی حاتم)

مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کی تائید کرنی نہ ہو۔ (ابن ابی حاتم)

(۱۲۳۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَتَنَ اِبْرَاهِيْمُ النَّبِیُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ هُوَ ابْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً بِالْقَدُوْمِ.

(رواه البخاری و مسلم)

(۱۲۳۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں کسلہ سے ختنہ کی تھی۔

(بخاری و مسلم)

(۱۲۳۲) عَنْ عَلِیِّ بْنِ رَبَاحٍ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اُمِرَ اَنْ يَخْتَتِنَ وَ هُوَ حِيْنَئِذٍ ابْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً فَعَجَّلَ وَ اخْتَتَنَ بِالْقَدُوْمِ فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ الْوَجَعُ فَدَعَا رَبَّهٗ فَاَوْحٰی اِلَيْهِ اَنَّكَ عَجَّلْتَ قَبْلَ اَنْ نَاْمُرَكَ بِاٰلَتِهٖ قَالَ يَا رَبِّ كَرِهْتُ اَنْ اُؤَخِّرَ اَمْرَكَ.

(درمنثور ج ۱ ص ۱۱۵)

(۱۲۳۲) علی بن رباح روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب ختنہ کرنے کا حکم ہوا تو ان کی عمر اس وقت اسی سال کی تھی انہوں نے خدائی حکم بجا لانے میں جلدی کی اور فوراً کسلہ لے کر اپنی ختنہ کر ڈالی جب تکلیف زیادہ محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعاء کی ادھر سے وحی آئی ہمارے ختنہ کا طریقہ بتانے سے پہلے ختنہ کرنے میں تم نے خود جلدی کی۔ انہوں نے عرض کی پروردگار مجھ سے یہ گوارا نہ ہو سکا کہ میں تیرے حکم میں ذرا سی تاخیر بھی کروں۔ (درمنثور)

ﷺ..... کاہنوں پر شیطان یہی ظاہر کرتا ہے کہ جو خبریں وہ بیان کرتے ہیں یہ سب درست ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی خبروں کے بیان کرنے والوں کو کاذب قرار دیا ہے۔

تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كَاذِبُوْنَ. (الشعراء: ۲۲۲-۲۲۳)

ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں جو سنی ہوئی بات (اس کے کان میں) لا ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہیں۔

اس کے علاوہ امام خطابی شرح ابوداؤد میں فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق عربی زبان میں خطاء کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے کہتے ہیں "کذب سمعی . کذب بصری" ای زل و لم یدرک - میری چشم و گوش نے جھوٹ بولا یعنی سننے اور دیکھنے میں غلطی کھائی اور جس شخص نے اپنے مریض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر شہد پلایا تھا اس کو شروع میں افاقہ نہ ہوا تو جب اس نے آپ سے آ کر پھر شکایت کی تو آپ نے فرمایا صدق اللہ و کذب بطن اخیک. تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ سچا ہے۔ یعنی شہد میں تو شفا یقینی ہے مگر تیرے بھائی کو ناموافق رہا ہے۔ یہ بات دوسری ہے۔ معالم السنن ج ۱ ص ۱۳۲۔

(۱۲۳۱) * صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سن کی تصریح ہوتے بھی بعض مصنفین نے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال کی ہوئی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو۔ یہاں البدایہ و النہایہ میں گو صحیح ابن حبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت ۱۲۰ سال بھی نقل کی ہے، مگر پھر ترجیح بخاری شریف کو ہی رہے گی۔

(۱۲۳۲) * اب اس ایک ہی واقعہ سے اندازہ فرمالیجئے کہ انبیاء علیہم السلام سے مؤاخذات کا معیار کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے "انا اعلم" ایک کلمہ نکل گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا اور آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی قرب کی خاطر بھول سے ایک قدم اٹھایا تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مستحسن توریہ کے کلمات منہ سے نکلے تو اس کا انفعال کہاں تک باقی رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نادان قوم نے ان کو خدا کا شریک بنایا تو اس کا اثر بھی ان کی مقدس فطرت پر کتنا شدید رہا۔ الی غیر ذلک.

(۱۲۳۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ اَوَّلُ مَنْ اَضَافَ الضَّیْفَ وَ اَوَّلُ مَنْ قَصَّ الشَّارِبَ وَ اَوَّلُ مَنْ رَأَی الشَّیْبَ وَ اَوَّلُ مَنْ قَصَّ الْاَظَافِیْرَ وَ اَوَّلُ مَنِ اخْتَتَنَ بِقَدُوْمِه. (رواه ابن عدی و البیهقی کذافی الدرالمنثور ج ۱ ص ۱۱۵ و اخرج البیهقی عن سفیان بن عیینة انه اوّلُ من تسرول واوّل من فرق و اوّل من استحد ایضا. و عند ابن ابی شیبة و البزار انه اوّل من خطب علی المنبر و عند ابن عساکر انه اوّل من رتب العسکر فی الحرب میمنة و میسرة و قلبا و عند ابن ابی شیبة انه اوّل من عقد الالویة و عند ابن ابی الدنیا انه اوّل من عمل القسی و عنده فی کتاب الاخوان و الخطیب فی تاریخه و الدیلمی فی مسند الفردوس انه اوّل من عانق و عند ابن سعد انه اوّل من ثرد الثرید و عند الدیلمی انه اوّل من اتخذ الخبز المبقس و عند الشیخین و غیرهما انه اوّل من یکسی یوم القیامة کله من الدر المنثور. و روی بعضه مالک فی مؤطاه)

(۱۲۳۳) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (چند باتیں وہ ہیں جو سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئیں) سب سے پہلے مہمانی کی سنت انہوں نے شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مونچھیں تراشیں' سب سے پہلے سر میں بڑھاپے کے آثار انہوں نے دیکھے۔ سب سے پہلے ناخن انہوں نے تراشے۔ سب سے پہلے کسلہ لے کر اپنی ختنہ انہوں نے کی۔ سب سے پہلے پاجامہ انہوں نے پہنا۔ سب سے پہلے مانگ انہوں نے نکالی۔ سب سے پہلے استرہ سے زیر ناف بال انہوں نے لیے۔ سب سے پہلے منبر پر انہوں نے خطبہ دیا۔ لشکر کے میمنہ' میسرہ اور قلب کی سب سے پہلے تقسیم انہوں نے ایجاد کی۔ سب سے پہلے جھنڈے پر پرچم انہوں نے لگایا۔ سب سے پہلے کمان انہوں نے بنائی۔ سب سے پہلے معانقہ انہوں نے کیا۔ سب سے پہلے ثرید کھانا انہوں نے تیار کیا۔ وہ روٹی جو قریہ بلقس کی طرف منسوب ہے سب سے پہلے انہوں نے تیار کی۔[1]

(۱۲۳۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ

(۱۲۳۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دس باتیں فطرت میں داخل ہیں۔ مونچھ تراشنا'

(۱۲۳۳) * یہ جملہ امور اولیات ابراہیم علیہ السلام کے عنوان سے مشہور ہیں ہم نے ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ سب اشیاء ممکن ہے کہ سب سے پہلے ان سے ہی شروع ہوئی ہوں یا ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی خصوصیت ایسی ہو جس کی بناء پر ان کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب اولی سمجھی گئی ہو۔

(۱۲۳۴) * حافظ ابن کثیرؒ نے اس حدیث کی تشریح نہایت پرمغز اور مختصر الفاظ میں حسب ذیل فرمائی ہے:

و المقصود انه علیه الصلوة و السلام کان لایشغله القیام بالاخلاص لله عزوجل و خشوع العبادة العظیمة عن مراعاة مصلحة بدنه و اعطاء کل عضو مایستحقه من الاصلاح و التحسین و ازالة مایشین من زیادة لخ......

---

[1] تاج العروس شرح قاموس میں ہے کہ اس روٹی کا وزن چار رطل ہوتا تھا۔

الشَّارِبِ وَ اِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَ السِّوَاكِ وَ اِسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْاَظْفَارِ وَ غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْاِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ يَعْنِي الْاِسْتِنْجَاءَ. (رواه مسلم و اهل السنن و في الصحيحين ذكر الختان و الاستحداد ايضا)

ریش بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی دینا، ناخن تراشنا، انگلی کے جوڑوں کو صاف کرنا، زیربغل بالوں کو اکھاڑنا، زیرناف بالوں کا مونڈنا اور استنجاء کرنا - ختنہ کرنا-

(مسلم شریف)

(١٢٣٥) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا رَأَى الصُّوَرَ فِي الْبَيْتِ لَمْ يَدْخُلْ حَتّٰى اَمَرَبِهَا فَمُحِيَتْ وَ رَأَى اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ بِاَيْدِيْهِمَا الْاَزْلَامُ فَقَالَ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ. وَاللّٰهِ اِنْ يَسْتَقْسِمَا بِالْاَزْلَامِ قَطُّ.

(رواه البخاري و لم يخرجه مسلم)

(١٢٣٥) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ بیت اللہ کے اندر تصویریں ہیں تو آپؐ اس وقت تک اندر تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ ان کے مٹانے کا حکم نہ دے دیا اور وہ مٹا نہ دی گئیں- آپؐ نے دیکھا کہ کفار نے ان تصویروں میں حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ علیہما السلام کے ہاتھوں میں فال و بدفالی کے تیر دے رکھے تھے- یہ کہ یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے فرمایا خدا ان کو برباد کرے بخدا یہ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے پانسے کے تیر کبھی نہیں ڈالے- (بخاری شریف)

(١٢٣٦) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ امْرَأَةً دَخَلَتْ عَلٰى عَائِشَةَ فَاِذَا رُمْحٌ مَنْصُوْبٌ فَقَالَتْ مَا هٰذَا

(١٢٣٦) نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کیا دیکھتی ہیں ایک نیزہ کھڑا ہوا ہے- انہوں نے پوچھا یہ نیزہ

ﷺ ..... شعراو ظفر او وجود قلع او وسخ فهذا من جملة قوله تعالى و ابراهيم الذى و فى.

(البداية و النهاية ج ١ ص ١٧٢)

اصل مقصد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا کمال یہ تھا کہ ایک طرف وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی پورے خشوع و خضوع سے ادا فرماتے تھے اور دوسری طرف اپنی بدنی مصالح کی بھی پوری رعایت رکھتے تھے کہیں جسم پر قابل نفرت بال یا ناخن یا میل کچیل باقی نہ رکھتے تھے جو موجب نفرت ہو ان ہی مجموعہ حقوق کی اس طرح ادائیگی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے و ابراهيم الذى و فى - یعنی ابراہیم وہ تھے کہ جنہوں نے پورے طور پر حقوق کی ادائیگی فرمائی تھی-

(١٢٣٦) ✽ واضح رہے کہ جہاں آتش نمرود کے سرد ہو جانے کا ذکر ہو وہاں بعض حیوانات کی حمایت اور بعض کی عداوت سے بھلا کیا تعجب ہونا چاہئے- حقیقت یہ ہے کہ طبعیت کی سلامتی اور خباثت یہ دونوں خواص انسان اور حیوانات میں فطری طور پر موجود ہوتے ہیں ان کے ظہور کے لئے صرف فطرت کافی ہوتی ہے- دیکھئے شیر اور بھیڑیا یا دونوں ہی خونخوار جانور ہیں مگر پھر دونوں کی شرافت اور دنائت میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہاں ارادہ و شعور کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ جس قسم کی فطرت ہوتی ہے اسی قسم کے افعال کا ظہور غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہوتا ہے رہتا ہے- اسی لئے مشہور ہے

نیش عقرب نہ از پئے کینست　　　مقتضائے طبیعتش اینست ﷺ .....

الرُّمْحُ فَقَالَتْ نَقْتُلُ بِهِ الْاَوْزَاغَ ثُمَّ حَدَّثَتْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَمَّا اُلْقِىَ فِى النَّارِ جَعَلَتِ الدَّوَابُّ كُلُّهَا تُطْفِئُ عَنْهُ النَّارَ اِلَّا الْوَزْغَ فَاِنَّهٗ جَعَلَ يَنْفُخُهَا عَلَيْهِ.

کیسا ہے انہوں نے فرمایا ہم اس سے چھپکلیاں مارتے ہیں- اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو تمام جانور آگ بجھانے کے لیے کوشاں تھے بجز چھپکلی کے کہ یہ اور پھونک مارنے لگی- (احمد)

(رواہ احمد من وجہ اخر ایضا قال ابن کثیر تفردبہ احمد من ھذین الوجھین وقد رواہ ابن ماجۃ ایضا و قد اخرجہ احمد باسنادہ ایضا)

سیدنا اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ذبیح اللہ

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حسب بیان اہل کتاب جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت ہوئی تو اس وقت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر مبارک چھیاسی سال کی تھی- پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے تیرہ سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطن سارہ سے (حضرت) اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت ہوئی- حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ سن کر سجدہ میں گر گئے- پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ بشارت ہوئی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں جو دعا تم نے کی وہ قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں بڑی برکت دے گا اور بارہ بڑی بڑی ہستیاں ان میں پیدا فرمائے گا- ٹھیک اسی نوع کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت میں بارہ خلفاء کے متعلق دی ہیں حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ عورتوں میں ختنہ کی رسم سب سے پہلے حضرت ہاجرہ سے شروع ہوئی ہے اور کان بندھوانے اور دامن دراز رکھنے کی سنت کی ابتداء بھی ان ہی سے ہوئی ہے-

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جس بیوی کے طلاق دینے کا حکم دیا تھا اس کا نام عمارہ بنت سعد تھا اور جس کے ساتھ نباہ کا حکم دیا تھا اس کا اسیدہ بنت مضاض تھا-

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی میں بناء کعبہ کی شرکت اور خود ان کے ذبیح ہونے کے واقعات سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں-

---

ؒ ..... پس جس طرح بچھو کا کاٹنا اس پر موقوف نہیں کہ پہلے سے دشمنی یا عداوت کا شعور اس میں موجود ہو- پھر ایسا ہوتا کیوں ہے اس لئے کہ اس کی فطرت یہی ہے- اسی طرح چھپکلی کی یہ حرکت صرف اس کی ایک فطرت تھی- یہاں تمام مقدمات اس کے پیش نظر ہونے ضروری نہیں- بندر٬ چوہا٬ کوا وغیرہ جیسے موذی جانوروں کی ایذاء دہی کی عجیب وغریب حکایات سب کو معلوم ہیں- حتیٰ کہ بہت سے حیوانات ہیں جن کو حدیث میں موذیات کا لقب دیا ہے اور ان کا مارنا ہر حالت میں درست قرار دیا ہے- چھپکلی میں انسانی ایذاءرسانی کی یہ خصلت آج تک موجود ہے کہ نمک پر پیشاب کرتی ہے- اگر اس نمک کو استعمال کرلیا جائے تو اس کے سمّی اثر سے جسم پر برص کے داغ پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے- اسی طرح خواص حیوانات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حیوانات میں فطری طور پر ایذاء رسانی کی خصوصیات موجود ہیں- پس اگر قدرت کے کسی خاص مظاہرہ کے وقت حیوانات میں بھی وقتی طور پر کوئی شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جائے تو اس کا انکار یا تاویل دونوں صریح طریق نہیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حیوانات کا کلام کرنا جلد ثانی کی شروع حدیثوں میں آپ پڑھ چکے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں شیر و بکری کی باہم معاشرت کا ذکر آپ کے سامنے آنے والا ہے پس عجائباتِ قدرت صرف چند قطرات نہیں ہیں بلکہ ان کا بھی ایک سمندر ہے جس کی طوفان خیز موجوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا-

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے میں اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان مناقشات ومباحثات کی پوری تفصیلات اپنے مقام میں مدون ہیں اس کا یہ محل نہیں - حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ظاہری نظم میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ پہلے قرآن کریم نے ذبیح کا قصہ ذکر فرمایا ہیں اس کے بعد ارشاد ہوا ہے "و بشرناہ باسحق نبیاً من الصالحین" گویا ذبیح کا قصہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سے بھی پہلا ہے - پھر حضرت اسحٰق علیہ السلام ذبیح کیسے ہو سکتے ہیں - حافظ موصوف نے یہاں محمد کعب قرظی کا ایک دوسرا عجیب استدلال اور نقل کیا ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے

﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ (ھود: ۷۱) "تو ہم نے اس کو اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی -"

آیت بالا میں جب حضرت اسحٰق علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے عطاء ہونے کی بشارت دی گئی تھی تو اب یہ کیسے مناسب تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت سے قبل صغر سنی ہی میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم دے دیا جاتا - اندازہ فرمایئے کہ ایک طرف ان کے ذبح کا حکم دوسری طرف ان کے فرزند کی بشارت کیا یہ دونوں باتیں جوڑ کھاتی ہیں - (البدایہ ج ا ص ۱۵۹)

واضح رہے کہ ہم نے صرف وقتی لحاظ سے یہاں حافظ موصوف کی تاریخ کے یہ دو جملے نقل کر دیئے ہیں ان سے مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا - حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور دیگر علماء اسلام نے ہر پہلو سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحثیں کر دی ہیں وہ دیکھ لی جائیں -

(۱۲۳۷) عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ اَخْبَرَتْنِی امْرَءَ ةٌ من بَنِیْ سُلَيْمٍ قَالَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عُثْمَانَ بْنِ طَلْحَةَ وَ قَالَ مَرَّةً اِنَّهَا سَاَلْتُ عُثْمَانَ لِمَ دَعَاكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ كُنْتُ رَاَيْتُ قَرْنَيِ الْكَبْشِ حِيْنَ دَخَلْتُ الْبَيْتَ فَنَسِيْتُ اَنْ اٰمُرَكَ اَنْ تُخَمِّرَ هُمَا فَخَمِّرْهُمَا فَاِنَّهُ لَا يَنْبَغِیْ اَنْ يَكُوْنَ فِی الْبَيْتِ شَیْءٌ يَشْغَلُ الْمُصَلِّیْ قَالَ سُفْيَانُ لَمْ تَزَلْ قَرْنَا الْكَبْشِ فِی الْبَيْتِ حَتّٰى اِحْتَرَقَ الْبَيْتُ فَاحْتَرَقَا. (رواہ احمد قال فی البدایۃ و ھذا روی عن ابن عباس ان رأس الكبش لم یزل

(۱۲۳۷) صفیہ بنت شیبہ روایت کرتی ہیں کہ بنو سلیم قبیلہ کی ایک عورت نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے کہلا بھیجا یا خود انہوں نے عثمان سے پوچھا تھا (راوی کو شک ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کیوں بلایا تھا - انہوں نے کہا یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ جب میں بیت اللہ میں داخل ہوا تھا تو میں نے اس میں ذبح عظیم والے مینڈھے کے دو سینگ رکھے دیکھے تھے - مجھے ان کے متعلق تم سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ ان کو ڈھانک دینا - تو اب جا کر ان کو ڈھانک دو کیونکہ بیت اللہ کے اندر ایسی کسی چیز کا کھلا رہنا مناسب نہیں جسے دیکھ کر نماز پڑھنے والے آدمی کا دل بٹے - سفیان راوی حدیث کہتے ہیں کہ وہ دونوں سینگ بیت اللہ میں ہمیشہ موجود رہے یہاں تک کہ جب بیت اللہ کے جلنے کا حادثہ پیش آیا تو وہ بھی اس میں جل گئے تھے - ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کعبہ کے پرنالے کے پاس

(۱۲۳۷) ✵ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ صرف یہی ایک روایت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے لیے کافی ہے - کیونکہ دور طفولیت میں یہی مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ہمارے علم میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی صغر سنی میں یہاں آمد کہیں ثابت نہیں -

معلقا عند ميراب الكعبة فاييس ج ۱ ص ۱۵۸)

(۱۲۳۸) عَنْ سَعِيْدُ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ اَوَّلُ مَا اتَّخذَ النِّسَاءُ الْمِنْطَقَ مِنْ قَبْلُ اُمُّ اِسْمٰعِيْلَ اتَّخَذَتْ مِنْطَقًا لِتَعْفِيَ اَثَرَهَا عَلٰى سَارَةَ ثُمَّ جَاءَ بِهَا اِبْرَاهِيْمُ وَ بِابْنِهَا اِسْمٰعِيْلَ وَ هِيَ تُرْضِعُهُ حَتّٰى وَ ضَعَهُمَا عِنْدَ الْبَيْتِ عِنْدَ رُوْحَةٍ فَوْقَ ذَمْزَمَ فِيْ اَعْلَى الْمَسْجِدِ وَ لَيْسَ بِمَكَّةَ يَوْمَئِذٍ اَحَدٌ وَ اَلَيْسَ بِهَا مَاءٌ فَوَضَعَهُمَا هُنَالِكَ وَ وَضَعَ عِنْدَهُمَا جِرَابًا فِيْهِ تَمَرٌ وَ سِقَاءً فِيْهِ مَاءٌ ثُمَّ قَفٰى اِبْرَاهِيْمُ مُنْطَلِقًا فَتَبِعَتْهُ اُمُّ اِسْمٰعِيْلَ فَقَالَتْ يَا اِبْرَاهِيْمُ اين تَذْهَبُ وَ تَتْرُ كُنَا فِيْ هٰذَا الْوَادِي الَّذِيْ لَيْسَ فِيْهِ اِنِيْسٌ وَ لَا شَيْءٌ فَقَالَتْ لَهٗ ذٰلِكَ مِرَارًا وَ جَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ اِلَيْهَا فَقَالَتْ لَهٗ آللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَتْ اِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا ثُمَّ رَجَعَتْ فَانْطَلَقَ اِبْرَاهِيْمُ حَتّٰى اِذَا كَانَ عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لَا يَرَوْنَهٗ اِسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ الْبَيْتَ ثُمَّ دَعَا بِهٰؤُلَاءِ الدَّعَوَاتِ وَ رَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ حَتّٰى بَلَغَ يَشْكُرُوْنَ جَعَلَتْ اُمُّ اِسْمٰعِيْلَ وَ تَشْرَبُ مِنْ ذٰلِكَ الْمَاءِ حَتّٰى اِذَا نَفِدَ مَا فِي السِّقَاءِ عَطِشَتْ وَ عَطِشَ اِبْنُهَا وَ جَعَلَتْ تَنْظُرُ اِلَيْهِ يَتَلَوّٰى وَ قَالَ يَتَلَبَّطُ فَانْطَلَقَتْ كَرَاهِيَةَ اَنْ تَنْظُرَ اِلَيْهِ فَوَجَدَتِ الصَّفَا اَقْرَبَ جَبَلٍ فِي الْاَرْضِ يَلِيْهَا فَقَامَتْ

اس مینڈھے کا سر لٹکا ہوا تھا حتیٰ کہ لٹکے لٹکے وہ سوکھ گیا تھا۔

(۱۲۳۸) حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے۔ سب سے پہلے جس نے منطق کا لباس بنایا تھا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ تھیں' انھوں نے یہ لباس اس لئے بنایا تھا تاکہ زمین پر اس کے گھسٹنے سے ان کے نشانات قدم محو ہو جائیں جو حضرت سارہ کو ان کا پتہ نہ لگ سکے۔ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کے لڑکے اسمٰعیل علیہ السلام کو جو ابھی دودھ پی رہے تھے لائے اور بیت اللہ کے پاس ایک درخت کے نیچے زمزم کے نزدیک مسجد کے بالائی حصہ میں چھوڑ دیا' اس وقت مکہ میں نے کوئی آدمی تھا اور نہ کہیں پانی کا نام ونشان' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے پاس ایک مشک پانی اور ایک تھیلا کھجور رکھ دیا' اور پھر رخ پھیر کر روانہ ہو گئے' حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ماں یہ کہتے ہوئے ان کے پیچھے لگ گئیں کہ اے ابراہیمؑ آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں اس وادی میں چھوڑ رہے ہیں جہاں نہ کوئی غم گسار ہے اور نہ کوئی چیز یہ بار بار کہہ رہی تھیں مگر وہ ان کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے' انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم فرمایا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہاں' انھوں نے کہا تو پھر وہ ہمیں برباد نہ ہونے دے گا' اور یہ کہہ کر وہ بچہ کی طرف پلٹ گئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے' جب وہ گھاٹی سے اتنی دور نکل آئے' جہاں سے وہ سب ان کو نہ دیکھ سکیں' تو قبلہ رو ہو کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی' اے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد لا کر تیرے محترم گھر کے پاس ایسی وادی میں آباد کر دی ہے' جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں ہے یَشْکُرُوْن تک کلمات آپ نے فرمائے' ادھر ام اسمٰعیل تھیلے سے کھجور' اور مشکیزہ سے پانی پیتی رہیں۔ تا آنکہ پانی ختم ہو گیا اور خود وہ اور ان کا بچہ پیاس سے بے چین ہوا' وہ دیکھ رہی تھیں کہ بچہ شدت پیاس سے لوٹ پوٹ کر رہا ہے' چنانچہ اس حالت بے تابی میں وہ بچے کے پاس سے چل پڑیں' ان سے بچہ کا حال نہ دیکھا گیا۔ انھوں نے سب سے قریب زمین کے پہاڑوں میں سے صفا کی پہاڑی دیکھی' وہ اس جگہ چڑھ کر وادی میں دیکھنے

عَلَيْهِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَتِ الْوَادِى تَنْظُرُ هَلْ تَرٰى اَحَدًا فَهَبَطَتْ مِنَ الصَّفَا حَتّٰى اِذَا بَلَغَتْ الْوَادِىْ رَفَعَتْ طَرْفَ دِرْعِهَا ثُمَّ سَعَتْ سَعْىَ الانسان المجهود حَتّٰى جَاوَزَتِ الْوَادِىْ ثُمَّ اَتَتِ الْمَرْوَةَ فَقَامَتْ عَلَيْهَا فَنَظَرَتْ هَلْ تَرٰى اَحَدًا فَفَعَلَتْ ذٰلِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِذٰلِكَ سَعَى النَّاسُ بَيْنَهُمَا فَلَمَّا اَشْرَفَتْ عَلَى الْمَرْوَةِ سَمِعَتْ صَوْتًا فَقَالَتْ صَهْ تُرِيْدُ نَفْسَهَا ثُمَّ تَسَمَّعَتْ فَسَمِعَتْ اَيْضًا فَقَالَتْ قَدْ اَسْمَعْتَ اِنْ كَانَ عِنْدَكَ غَوَاثٌ فَاِذَا هِىَ بِالْمَلَكِ عِنْدَ مَوْضِعِ زَمْزَمَ فَبَحَثَ بِعَقِبِهٖ اَوْ قَالَ بِجَنَاحِهٖ حَتّٰى ظَهَرَ الْمَاءُ فَجَعَلَتْ تُحَوِّضُهُ وَ تَقُوْلُ بِيَدِهَا هٰكَذَا وَ جَعَلَتْ تَغْرِفُ مِنَ الْمَاءِ فِىْ سِقَائِهَا وَ هُوَ يَفُوْرُ بَعْدَمَا تَغْرِفُ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللّٰهُ اُمَّ اِسْمٰعِيْلَ لَوْتَرَكَتْ زَمْزَمَ اَوْ قَالَ لَوْلَمْ تَغْرِفْ مِنَ الْمَاءِ لَكَانَتْ زَمْزَمُ عَيْنًا مَعِيْنًا قَالَ فَشَرِبَتْ وَ اَرْضَعَتْ وَلَدَهَا فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ لَا تَخَافِى الضَّيْعَةَ فَاِنَّ هٰهُنَا بَيْتُ اللّٰهِ يَبْنِىْ هٰذَا الْغُلَامُ وَ اَبُوْهُ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَهْلَهٗ وَ كَانَ الْبَيْتُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْاَرْضِ كَالرَّابِيَةِ تَأْتِيْهِ السُّيُوْلُ فَتَاْخُذُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَ شِمَالِهٖ فَكَانَتْ كَذٰلِكَ حَتّٰى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمَ اَوْ اَهْلُ بَيْتٍ مِنْ جُرْهُمَ مُقْبِلِيْنَ مِنْ طَرِيْقِ

لگیں کوئی نظر تو نہیں آ تا' لیکن کوئی نظر نہ آیا' آخر صفا کی پہاڑی سے اتریں اور جب وادی میں پہنچیں' تو اپنا دامن اٹھا کر ایک پریشان حال انسان کی طرح دوڑ پڑیں' یہاں تک کہ وادی سے آگے بڑھ گئیں اور مروہ کی پہاڑ پر ئیں' اور اس پر کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدم نظر آتا ہے یا نہیں' اسی طرح سات مرتبہ چکر لگایا' عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی کی یاد میں لوگ صفا ومروہ کی سعی کرتے ہیں۔ اخیر میں جب وہ مروہ پر چڑھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی' انھوں نے اپنے جی سے کہا' کہ تو خاموش رہ' پھر کان لگایا تو پھر آواز آئی۔ انھوں نے کہا کہ تم نے اپنی آواز سنادی' اب اگر تیرے پاس میرے لئے کوئی مدد ہو تو وہ بھی کردے چنانچہ دفعۃً ان کو زمزم کے پاس ایک فرشتہ نظر آیا' اس نے اپنی ایڑ زمین پر لگائی یا اپنا بازو لگایا' یہاں تک کہ پانی ابل آیا' وہ اس کو چاروں کناروں سے گھیرنے لگیں اور پانی چلو میں لے لے کر مشکیزہ بھرنے لگیں' مگر پانی اس کے بعد بھی ابل ہی رہا تھا' عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی مادر مہربان پر رحم فرمائیں' اگر وہ زمزم کو اسی حال پر چھوڑ دیتیں یا فرمایا کہ چلو سے لے کر مشکیزہ میں نہ ڈالتیں' تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ فرمایا کہ انھوں نے خود پانی پیا اور بچہ کو دودھ پلایا' فرشتہ نے ان سے کہا کہ ہلاکت کا خطرہ محسوس نہ کرو' یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر ہے' یہ بچہ اور اس کے والد محترم اس کو بنائیں گے' اور اللہ تعالیٰ یہاں والوں کو برباد نہ ہونے دے گا' اور بیت اللہ عام زمین سے اونچا ایک ٹیلہ کی صورت تھا' جب سیلاب آتا اس کے دائیں بائیں سے گذر جاتا' چنانچہ وہ اس حال پر رہا یہاں تک کہ جرہم کا ایک قبیلہ یا قافلہ یہاں سے گذرا' جو کدا کے راستے سے آرہا تھا' وہ مکہ کے نشیبی علاقہ میں فروکش ہوا' انھوں نے پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھا' یہ دیکھ کر انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندے پانی پر منڈلا رہے ہیں' کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے' ہم اس وادی سے گذر چکے ہیں' یہاں پانی نہ تھا' انھوں نے اپنے ایک یا دو تیز و چست

كَـذاء فنزلُوا فِى اَسْفَلِ مَكَّةَ فرَاَوْا طائرًا عائفًا فَقَالُوْا اِنَّ هٰذَا الطَّائِرَ لَيَدُوْرُعَلَى الْمَاءِ لَعَهْدُنَا بِهٰذَا الْوَادِىْ وَ مَا فِيْهِ فَاَرْسَلُوْا جَرِيًّا اَوْ جَرِيَّيْنِ فَاِذَا هُمْ بِالْمَاءِ فَرَجَعُوْا فَاَخْبَرُوْهُمْ بِالْمَاءِ فَاَقْبَلُوْا قَالَ وَ اُمُّ اِسْمٰعِيْلَ عِنْدَ الْمَاءِ فَقَالُوْا اَتَأْذَنِيْنَ لَنَا اَنْ نَنْزِلَ عِنْدَكِ قَالَتْ نَعَمْ وَ لٰكِنْ لَا حَقَّ لَكُمْ فِى الْمَاءِ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَلْفٰى ذٰلِكَ اُمَّ اِسْمٰعِيْلَ وَ هِىَ تُحِبُّ الْاُنْسَ فَنَزَلُوْا وَ اَرْسَلُوْا اِلٰى اَهْلِيْهِمْ فَنَزَلُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِهَا اَهْلُ اَبْيَاتٍ مِنْهُمْ وَ شَبَّ الْغُلَامُ وَ تَعَلَّمَ الْعَرَبِيَّةَ مِنْهُمْ وَ اَنْفَسَهُمْ وَ اَعْجَبَهُمْ حِيْنَ شَبَّ فَلَمَّا اَدْرَكَ زَوَّجُوْهُ امْرَاَةً مِنْهُمْ وَ مَاتَتْ اُمُّ اِسْمٰعِيْلَ فَجَاءَ اِبْرَاهِيْمُ بَعْدَ مَا تَزَوَّجَ اِسْمٰعِيْلُ يُطَالِعُ تركتهٗ فَلَمْ يَجِدْ اِسْمٰعِيْلَ فَسَاَلَ امْرَاَتَهٗ عَنْهُ فَقَالَتْ خَرَجَ يَبْتَغِىْ لَنَا ثُمَّ سَاَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَ هَيْئَتِهِمْ فَقَالَتْ نَحْنُ بِشَرٍّ نَحْنُ فِىْ ضِيْقٍ وَ شِدَّةٍ فَشَكَتْ اِلَيْهِ قَالَ فَاِذَا جَاءَ زَوْجُكِ اقْرَئِىْ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَ قُوْلِىْ لَهٗ يُغَيِّرْ عَتَبَةَ بَابِهٖ فَلَمَّا جَآءَ اِسْمٰعِيْلُ كَاَنَّهٗ اٰنَسَ شَيْئًا فَقَالَ هَلْ جَاءَكُمْ مِنْ اَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ جَآءَنَا الشَّيْخُ كَذَا وَ كَذَا فَسَاَلَنَا عَنْكَ فَاَخْبَرْتُهٗ وَ سَاَلَنِىْ كَيْفَ عَيْشُنَا فَاَخْبَرْتُهٗ اَنَّا فِىْ جَهْدٍ وَ شِدَّةٍ قَالَ اَوْصَاكِ بِشَىْءٍ قَالَتْ نَعَمْ اَمَرَنِىْ اَنْ اَقْرَأَ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَ يَقُوْلُ غَيِّرْ عَتَبَةَ بَابِكَ قَالَ ذَاكِ اَبِىْ وَ قَدْ اَمَرَنِىْ اَنْ اُفَارِقَكِ

آدمیوں کو بھیجا' دفعۃً انھوں نے پانی دیکھا- پلٹ کر انھوں نے پانی کی خبر لی' چنانچہ وہ سب ادھر چل پڑے' وہاں پہنچے تو دیکھا پانی کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں بیٹھی ہوئی ہیں' انھوں نے ان سے کہا کہ کیا ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم یہیں آپ کے پاس قیام پزیدر ہو جائیں- انھوں نے کہا اجازت ہے' لیکن اس پانی میں آپ لوگوں کا کوئی حق نہ ہو گا انھوں نے کہا بہتر ہے' حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ام اسماعیل تنہا تھیں' چاہتی تھیں کہ مانوس لوگ ہوں' چنانچہ وہ آ بسے اور اپنے لوگوں کے پاس آدمی بھیج کر ان کو بھی بلا لیا' اور وہ بھی آ گئے جب ان کے یہاں کئی گھر آباد ہو گئے اور ادھر حضرت اسماعیلؑ جو بچے تھے جوان ہو گئے اور ان سے عربی سیکھ لی اور وہ سب ان کو بھلے بھی معلوم ہوئے چنانچہ جب یہ پورے جوان ہو گئے' قبیلہ جو ہم کے لوگوں نے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے ان کی شادی کر دی' کچھ دنوں بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ وفات پا گئیں' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے کہ جن کو چھوڑ کر گئے' ان کا حال معلوم کریں' حضرت اسماعیلؑ کو موجود نہیں پایا ان کی بیوی سے ان کے متعلق دریافت کیا' کہ کہاں گئے' اس نے کہا ہمارے لئے رزق کی تلاش میں گئے ہیں پھر انھوں نے پوچھا زندگی کیسی گذرتی ہے اور کیا حال ہے؟ اس نے کہا ہم برے حال میں ہیں' تنگی میں ہیں' تکلیف میں ہیں' اس نے ان سے معاش کی شکایت کی' آپ نے اس سے فرمایا جب تیرا شوہر آئے' تو میرا سلام پہنچانا' اور کہنا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں' حضرت اسماعیلؑ آئے تو انھوں نے گویا انس محسوس کیا' اور پوچھا کیا تمہارے یہاں کوئی آیا تھا' اس نے کہا ہاں ایک شیخ تشریف لائے تھے' ان کی یہ ہیئت تھی' انھوں نے آپ کے بارے پوچھا' میں نے انہیں بتایا' پھر گذر بسر کے متعلق سوال کیا' میں نے کہا کہ مشقت اور تکلیف میں ہیں- انہوں پوچھا کہ وہ کچھ کہہ بھی گئے' اس نے کہا ہاں فرما گئے کہ میں آپ کو ان کا سلام پہنچا دوں اور آپ سے فرما گئے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں' آپ نے فرمایا وہ میرے پدر

الْحَقِیْ بِاَھْلِکِ فَطَلَّقَھَا وَ تَزَوَّجَ مِنْھُمْ اُخْرٰی فَلَبِثَ عَنْھُمْ اِبْرَاھِیْمُ مَاشَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ اَتَاھُمْ بَعْدُ فَلَمْ یَجِدْہُ وَ دَخَلَ عَلٰی اِمْرَأَۃٍ فَسَأَلَھَا عَنْہُ فَقَالَتْ خَرَجَ یَبْتَغِیْ لَنَا قَالَ کَیْفَ اَنْتُمْ وَ سَأَلَھَا عَنْ عَیْشِھِمْ وَ ھَیْئَتِھِمْ فَقَالَتْ نَحْنُ بِخَیْرٍ وَ سَعَۃٍ وَ اَثْنَتْ عَلَی اللّٰہِ قَالَ مَا طَعَامُکُمْ قَالَتِ اللَّحْمُ قَالَ فَمَا شَرَابُکُمْ قَالَتِ الْمَاءُ قَالَ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمْ فِی اللَّحْمِ وَ الْمَاءِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ لَمْ یَکُنْ لَھُمْ یَوْمَئِذٍ حَبٌّ وَ لَوْ کَانَ لَھُمْ دَعَا لَھُمْ فِیْہِ قَالَ فَھُمَا لَا یَخْلُوْ عَلَیْھِمَا اَحَدٌ بِغَیْرِ مَکَّۃَ اِلَّا لَمْ یُوَافِقَاہُ قَالَ فَاِذَا جَاءَ زَوْجُکِ فَاقْرَئِیْ عَلَیْہِ السَّلَامَ وَ مُرِیْہِ یُثْبِتَ عَتَبَۃَ بَابِہٖ فَلَمَّا جَاءَ اِسْمٰعِیْلُ قَالَ ھَلْ اَتَاکُمْ مِّنْ اَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ اَتَانَا شَیْخٌ حَسَنُ الْھَیْئَۃِ وَ اَثْنَتْ عَلَیْہِ فَسَأَلَنِیْ عَنْکَ فَاَخْبَرْتُہٗ فَسَأَلَنِیْ کَیْفَ عَیْشُنَا فَاَخْبَرْتُہٗ اِنَّا بِخَیْرٍ قَالَ فَاَوْصَاکِ بِشَیْءٍ قَالَتْ نَعَمْ ھُوَ یُقْرِئُ عَلَیْکَ السَّلَامَ وَ یَاْمُرُکَ اَنْ تُثْبِتَ عَتَبَۃَ بَابِکَ قَالَ ذَاکَ اَبِیْ وَ اَنْتِ الْعَتَبَۃُ اَمَرَنِیْ اَنْ اُمْسِکَکِ ثُمَّ لَبِثَ عَنْھُمْ مَاشَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ جَاءَ بَعْدَ ذٰلِکَ وَ اِسْمٰعِیْلُ یَبْرِیْ نَبْلًا لَہٗ تَحْتَ دَوْحَۃٍ قَرِیْبًا مِنْ زَمْزَمَ فَلَمَّا رَاٰہُ قَامَ اِلَیْہِ فَصَنَعَا کَمَا یَصْنَعُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ وَ الْوَلَدُ بِالْوَالِدِ ثُمَّ قَالَ یَا اِسْمٰعِیْلُ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ بِاَمْرٍ قَالَ فَاصْنَعْ کَمَا اَمَرَکَ رَبُّکَ قَالَ

بزرگوار تھے اور وہ حکم فرما گئے کہ میں تم سے جدائی اختیار کرلوں' تو اپنے گھر والوں میں چلی جا' چنانچہ اس کو طلاق دے دی' اسی خاندان کی دوسری عورت سے شادی کرلی' پھر عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آنا نہ ہوا' پھر بعد میں آئے' حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہیں پایا- آپ کی بیوی کے پاس گئے' اور آپ کے متعلق دریافت کیا کہ کہاں ہیں' اس نے کہا تلاش معاش میں گئے ہیں' انھوں نے پوچھا تم لوگ کس طرح رہتے سہتے ہو' اور گذر بسر کا کیا حال ہے' اس نے کہا ہم بعافیت ہیں' اور کشادہ حال ہیں' اس نے خدا کا بڑا شکر ادا کیا' انھوں نے پوچھا تمہارا کھانا کیا ہے' ان سے بتایا گوشت' پوچھا پینا کیا ہے اس نے کہا پانی' انھوں نے دعا کی اے اللہ! ان کے لئے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس زمانہ میں ان کے یہاں غلہ کا رواج نہ تھا' اگر وہ ہوتا تو اس کے لئے بھی دعا فرما دیتے اور اس دعا کی برکت ہے کہ صرف گوشت پانی کی غذا مکہ کے سوا اور کہیں موافق نہیں آتی' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چلتے ہوئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اہلیہ سے فرمایا کہ جب تیرے شوہر آجائیں تو ان سے میرا سلام کہنا' اور کہنا کہ دروازہ کی چوکھٹ قائم رکھیں' جب حضرت اسماعیل علیہ السلام باہر سے واپس آئے انھوں نے بیوی سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا' اس نے کہا ہاں ایک شیخ صاحب تشریف لائے تھے جن کی ہیئت بہت عمدہ تھی اور ان کی تعریف کی' انھوں نے آپ کے بارے میں مجھ پوچھا میں نے ان کو بتایا کہ آپ کہاں گئے پھر انھوں نے ہمارے گذر بسر کے متعلق سوال کیا' میں نے بتایا کہ بخیر و خوبی سب کچھ چل رہا ہے آپ نے پوچھا کچھ فرما بھی گئے اس نے کہا ہاں وہ آپ کو سلام کہہ گئے اور حکم دے گئے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ قائم رکھیں' آپ نے فرمایا وہ میرے والد محترم تھے' اور تو چوکھٹ ہے' مجھے حکم دے گئے کہ میں تجھ کو باقی رکھوں' پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت دنوں جب تک اللہ نے چاہا نہ آئے- اس کے بعد تشریف لائے' اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے لئے ایک درخت کے نیچے تیر بنا رہے تھے' جو زمزم کے قریب تھا' جونہی آپ علیہ السلام نے دیکھا فوراً لپک کر کھڑے ہو گئے اور دونوں نے باہم

وَ تُعِيْنُنِيْ قَالَ وَ أُعِيْنُكَ قَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِيْ أَنْ أَبْنِيَ هٰهُنَا بَيْتًا وَ أَشَارَ إِلٰى أَكَمَةٍ مُرْتَفِعَةٍ عَلٰى مَا حَوْلَهَا قَالَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ رَفَعَا الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ فَجَعَلَ إِسْمٰعِيْلُ يَأْتِيْ بِالْحِجَارَةِ وَ إِبْرَاهِيْمُ يَبْنِيْ حَتّٰى إِذَا ارْتَفَعَ الْبِنَاءُ جَاءَ بِهٰذَا الْحَجَرِ فَوَضَعَهُ فَقَامَ عَلَيْهِ وَ هُوَ يَبْنِيْ وَ إِسْمٰعِيْلُ يُنَاوِلُهُ الْحِجَارَةَ وَ هُمَا يَقُوْلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ قَالَ فَجَعَلَا يَبْنِيَانِ حَتّٰى يَدُوْرَا حَوْلَ الْبَيْتِ وَ هُمَا يَقُوْلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

(رواه البخاری)

اس تعلق و محبت کا اظہار کیا جو بیٹے باپ کیا کرتے ہیں' پھر انھوں نے فرمایا اے اسماعیلؑ ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے' آپ نے کہا آپ کر گزریئے' جیسا آپ کو آپ کے رب نے فرمایا ہے' انھوں نے فرمایا تم میری اعانت کرو گے' آپ نے عرض کیا میں ضرور آپ کی اعانت کروں گا انھوں نے فرمایا کہ رب العالمین نے مجھے حکم کیا ہے کہ ایک گھر تعمیر کروں اور اس ابھرے ہوئے ٹیلہ کی طرف اشارہ فرمایا' اس کے بعد دونوں باپ بیٹے نے بیت اللہ کی بنیاد اٹھائی' حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو لگاتے جاتے تھے' جب دیوار بلند ہوگئی' تو اس مخصوص پتھر کو لائے اور اس کو رکھ دیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہوئے اور بیت اللہ کی تعمیر کرنے لگے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر دیتے جاتے تھے اور دونوں فرما رہے تھے- رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (بخاری شریف)

سيدنا موسى عليه السلام كليم الله

حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ

(۱۲۳۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ ذَكَرَ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِهِ فَقَالَ مُوْسٰى آدَمُ طُوَالٌ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوْءَةَ وَ قَالَ عِيْسٰى جَعْدٌ مَرْبُوْعٌ وَ ذَكَرَ مَالِكًا خَازِنَ النَّارِ وَ ذَكَرَ الدَّجَّالَ. (رواه البخاری)

(۱۲۳۹) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ گندم گوں رنگ اور دراز قامت تھے جیسا قبیلہ شنوۃ کے لوگ ہوتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام گھونگر والے بال اور میانہ قد کے تھے اور اس شب کے عجائبات میں آپ نے مالک داروغہ دوزخ اور دجال کے دیکھنے کا بھی ذکر فرمایا- (بخاری شریف)

(۱۲۴۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ وَ رَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَقِيْلَ هٰذَا مُوْسٰى فِيْ قَوْمِهِ.

(رواه البخاری)

(۱۲۴۰) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ نے فرمایا میرے سامنے تمام امتیں پیش کی گئیں تو میں نے ایک امت اتنی کثیر تعداد میں دیکھی کہ تمام افق اس نے گھیر رکھا تھا- اس وقت مجھ کو بتایا گیا یہ موسیٰ علیہ السلام اپنی امت میں ہیں- (بخاری شریف)

(۱۲۴۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ وَجَدَهُمْ يَصُوْمُوْنَ يَوْمًا يَعْنِيْ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ فَقَالُوْا

(۱۲۴۱) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہاں لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں- لوگوں نے کہا یہ بہت عظیم الشان دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ

هٰذَا يَوْمٌ عَظِيْمٌ وَ هُوَ يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَ اَغْرَقَ اٰلَ فِرْعَوْنَ فَصَامَ مُوْسٰى شُكْرَ اللّٰهِ فَقَالَ اَنَا اَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْهُمْ فَصَامَهُ وَ اَمَرَ بِصِيَامِهِ. (رواه البخاري)

(۱۲۴۲) عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبَاحٍ قَالَ سَمِعْتُ عُتْبَةَ بْنَ النُّدَّرِ يَقُوْلُ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأَ "طٰسٓ" حَتّٰى اِذَا بَلَغَ قِصَّةَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ اِنَّ مُوْسٰى اٰجَرَ نَفْسَهُ ثَمَانِيَ سِنِيْنَ اَوْ عَشْرَةً عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهِ وَ طَعَامِ بَطْنِهِ. (رواه ابن ماجه في باب استيجار الاجير قال ابن كثير و هذا من هذا الوجه لا يصح لان مسلمة بن على الحسنى)

(۱۲۴۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ (فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا) قَالَ هٰكَذَا بِاِصْبَعِهِ وَ وَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِبْهَامَ عَلَى الْمِفْصَلِ الْاَعْلٰى مِنَ الْخِنْصَرِ فَسَاخَ الْجَبَلُ. (رواه ابن جرير و رواه احمد و الترمذي و صححه و الحاكم ايضًا)

(۱۲۴۴) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ قَالُوْا لِمُوْسٰى هَلْ يَنَامُ رَبُّكَ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ فَنَادَاهُ رَبُّهُ يَا مُوْسٰى سَأَلُوْكَ هَلْ يَنَامُ رَبُّكَ فَخُذْ زُجَاجَتَيْنِ فِيْ يَدَيْكَ فَقُمِ اللَّيْلَ فَفَعَلَ مُوْسٰى فَلَمَّا ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ ثُلُثٌ نَعَسَ فَوَقَعَ لِرُكْبَتَيْهِ ثُمَّ انْتَعَشَ فَضَبَطَهُمَا حَتّٰى اِذَا كَانَ اٰخِرَ اللَّيْلِ نَعَسَ فَسَقَطَتِ الزُّجَاجَتَانِ فَانْكَسَرَتَا فَقَالَ يَا مُوْسٰى لَوْ كُنْتُ اَنَامُ لَسَقَطَتِ السَّمٰوَاتُ وَ

علیہ السلام کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون کو غرق فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے شکر کے طور پر اس دن روزہ رکھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ان سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے قریب تر میں ہوں پھر آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (بخاری شریف)

(۱۲۴۲) علی بن رباح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عتبہ بن الندر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خود سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، ایسا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سورۂ ''طٰس'' تلاوت فرمائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پاک دامنی اور اپنی معاش کی خاطر آٹھ یا دس سال کے لیے اپنی خدمات سپرد کر دی تھیں۔

(ابن ماجہ)

(۱۲۴۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ﴾ الخ...... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا انگوٹھا انگلی کے اوپر کے پورے پر رکھ کر بتایا کہ بس اتنی سی تجلی ہوئی تھی کہ طور پہاڑ زمین میں دھنس گیا تھا۔

(احمد، ترمذی)

(۱۲۴۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا۔ فرمایئے آپ کا پروردگار کیا سوتا بھی ہے؟ انہوں نے فرمایا ذرا اللہ سے ڈرو۔ اس پر ان کے پروردگار کی طرف سے آواز آئی موسیٰ یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کا پروردگار سوتا ہے؟ تو تم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو شیشے لے لو اور رات بھر کھڑے رہنا۔ موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تہائی شب گذری تو ان کو اونگھ آئی اور وہ گھٹنوں کے بل گر گئے پھر اٹھ کر سنبھلے یہاں تک کہ جب آخر شب ہوئی تو پھر اونگھے اور دونوں شیشے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گئے۔ ارشاد ہوا اے موسیٰ اگر کہیں ہم

اَلْاَرْضُ فَهَلَكْنَ كَمَا هَلَكَتِ الزَّجَاجَتَانِ فِي يَدَيْكَ قَالَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِه اية الكرسى.
(رواه ابن ابى حاتم كما فى البداية و النهاية)

(۱۲۴۵) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مُوسٰى كَانَ رَجُلًا حَيِيًّا سِتِّيْرًا لَا يُرٰى مِنْ جِلْدِهٖ شَيْءٌ اِسْتِحْيَاءً مِنْهُ فَاٰذَاهُ مَنْ اٰذَاهُ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ فَقَالُوْا مَا يَسْتَتِرُ هٰذَا التَّسَتُّرَ اِلَّا مِنْ عَيْبٍ بِجِلْدِهٖ اِمَّا بَرَصٌ وَ اِمَّا اُدْرَةٌ وَ اِمَّا اٰفَةٌ وَ اَنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يُبَرِّأَهٗ مِمَّا قَالُوْا بِمُوْسٰى فَخَلَا يَوْمًا وَحْدَهٗ فَوَضَعَ ثِيَابَهٗ عَلَى الْحَجَرِ ثُمَّ اغْتَسَلَ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ اِلٰى ثِيَابِهٖ لِيَاْخُذَهَا وَ اَنَّ الْحَجَرَ عَدَا بِثَوْبِهٖ فَاَخَذَ مُوْسٰى عَصَاهُ وَ طَلَبَ الْحَجَرَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ ثَوْبِىْ حَجَرُ ثَوْبِىْ حَجَرُ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى مَلَاٍ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ فَرَاَوْهُ عُرْيَانًا اَحْسَنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَ اَبْرَاَهٗ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ وَ قَامَ حَجَرٌ فَاَخَذَ ثَوْبَهٗ فَلَبِسَهٗ وَ طَفِقَ بِالْحَجَرِ ضَرْبًا بِعَصَاهُ فَوَاللّٰهِ اِنَّ بِالْحَجَرِ لَنَدَبًا مِنْ اَثَرِ ضَرْبِهٖ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا اَوْ خَمْسًا فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا. (رواه البخارى)

سوتے تو زمین و آسمان گر کر اسی طرح پاش پاش ہو جاتے جیسے تمہارے ہاتھوں میں یہ دونوں شیشے ہو گئے۔

(ابن ابی حاتم)

(۱۲۴۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام بہت شرمیلے اور پردہ والے شخص تھے حیا کا اثر یہ تھا کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا دیکھا نہیں جا سکتا تھا' بنی اسرائیل میں سے جس کو ایذا پہنچانی تھی اس نے آپ کو ایذا پہنچائی' اور وہ کہنے لگے کہ آپ اتنا پردہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو آپ کے جسم میں کوئی نہ کوئی عیب ہے' یا برص ہو' یا ورم خصیہ' یا اسی طرح کی کوئی اور بیماری' اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ آپ کو ان عیوب سے بری کر دے' جو وہ لگاتے تھے' چنانچہ ایک دن آپ نے تنہائی میں اپنے کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے' پھر غسل کرنے لگے جب غسل سے فارغ ہوئے' کپڑے کی طرف متوجہ ہوئے کہ اس کو لے کر پہنیں' لیکن وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور پتھر سے کپڑے کا مطالبہ کیا' اور فرمانے لگے' پتھر میرے کپڑے لاؤ' پتھر میرے کپڑے دو' اس کا پیچھا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے ایک مجمع کے پاس پہنچ گئے' انہوں نے آپ کو ننگا دیکھا اور ان تمام عیوب سے پاک جو بنی اسرائیل (برص وغیرہ کا) لگاتے تھے' یہاں آ کر پتھر رک گیا' آپ نے اپنے کپڑے لیے اور پہنے اور پھر اپنی لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے' خدا کی قسم آپ کے ڈنڈے برسانے کی وجہ سے پتھر پر تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے' اسی کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا الخ....

(بخاری شریف)

(۱۲۴۵) * پتھر تکوینی طور پر شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جانی بالکل ممکن ہے۔ پھر جس پتھر سے شعوری حرکات سرزد ہوں اس کو ذی شعور کی طرح تنبیہ کرنا بھی بالکل معقول ہے اور اس پر نشانات پڑنے میں تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ جو معاملات تکوینی ہیں یعنی براہ راست قدرت کے افعال ہیں ان کو بواسطہ اسباب افعال پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے آسمان یا زمین اتنے بڑے ...

(۱۴۴۶) اَخبَرنِی سَعِیدُ بنُ جُبَیرٍ قَالَ قُلتُ لِابنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَوفًا البَکَّالِیَّ یَزعَمُ اَنَّ مُوسٰی لَیسَ بِمُوسٰی بَنِی اِسرَائِیلَ اِنَّمَا ھُوَ مُوسٰی اٰخَرُ فَقَالَ کَذَبَ عَدُوُّ اللّٰہِ حَدَّثَنَا اُبَیُّ بنُ کَعبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوسَی النَّبِیُّ (عَلَیہِ السَّلَام) خَطِیبًا فِی بَنِی اِسرَائِیلَ فَسُئِلَ اَیُّ النَّاسِ اَعلَمُ فَقَالَ اَنَا اَعلَمُ فَعَتَبَ اللّٰہُ عَلَیہِ اِذ لَم یَرُدَّ العِلمَ اِلَیہِ فَاَوحَی اللّٰہُ اِلَیہِ اَنَّ عَبدًا مِن عِبَادِی بِمَجمَعِ البَحرَینِ ھُوَ اَعلَمُ مِنکَ قَالَ یَا رَبِّ وَ کَیفَ بِہٖ فَقِیلَ لَہٗ وَ احمِل حُوتًا فِی مِکتَلٍ فَاِذَا فَقَدتَّہٗ فَھُوَ ثَمَّ فَانطَلَقَ وَ انطَلَقَ بِفَتَاہُ یُوشَعَ بنِ نُونٍ وَ حَمَلَا حُوتًا فِی مِکتَلٍ حَتّٰی کَانَا عِندَ الصَّخرَۃِ وَ ضَعَا رُءُ وسَھُمَا وَ نَامَا فَانسَلَّ الحُوتُ مِنَ المِکتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِیلَہٗ فِی البَحرِ سَرَبًا وَ کَانَ لِمُوسٰی وَ فَتَاہُ عَجَبًا فَانطَلَقَا بَقِیَّۃَ لَیلَتِھِمَا وَ یَومِھِمَا فَلَمَّا اَصبَحَ

(۱۴۴۶) سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ نوف بکائی تو یہ کہتے ہیں کہ جن موسیٰ کی سرگزشت خضر علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ بنی اسرائیل والے موسیٰ علیہ السلام نہیں تھے بلکہ کوئی دوسرے موسیٰ ان کے ہم نام شخص تھے اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نوف خدا کے دشمن نے غلط کہا۔ ہم سے ابی بن کعبؓ نے خود بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سامنے کھڑے ہوئے وعظ فرما رہے تھے' تو ان سے سوال ہوا فرمایئے انسانوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ سب سے بڑا عالم میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا کہ انہوں نے اس بات کا علم خدا تعالیٰ کے حوالے کیوں نہ کیا اس لیے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی (اے موسیٰ) مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی پروردگار پھر اس سے ملاقات کیسے اور کہاں ہو؟ ارشاد ہوا تو یوں کرو کہ ایک زنبیل میں مچھلی اپنے ہمراہ لے لو اور جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ ملے گا' موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہ ان کے رفیق یوشع بن نون روانہ ہو گئے اور (حسب ہدایت) اپنے ہمراہ زنبیل میں ایک مچھلی بھی

للہ ..... کرات متحرک ہیں مگر اس میں کسی کو مجال شبہ نہیں۔ یہ قدرت کا بلاواسطہ افعال ہیں پس اگر زمین جیسے بڑے کرہ کو حرکت کرنا ممکن ہے تو صرف ایک پتھر کی حرکت پر تعجب کیوں ہے۔ اصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قدرت کے براہ راست ترجمان ہوتے ہیں اس لئے ان کے ماحول میں قدرت کے بہت سے براہ راست کا ظہور ہونا یہ بھی ایک عادۃ اللہ ہے اس لئے یہاں ﴿وَ لَن تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبدِیلًا﴾ کی آیت پڑھنا بے محل ہے۔

(۱۴۴۶) ✽ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی سرگذشت کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا تفصیلی تذکرہ خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور جب اس پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام سرگزشت کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے نکلا ہوا ایک ذرا سا کلمہ تھا جس کو اگر مخلوق کے دائرہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو سرتاسر صدق ہی صدق نظر آتا ہے۔ یعنی سائل بنی اسرائیل ہیں اور مخاطب نبی وقت موسیٰ علیہ السلام ہیں ادھر محاورات میں صیغہ تفضیل کا مطلقاً کہنا زیادتی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اب اس میں کیا شبہ تھا کہ نبی وقت پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی ان سے بڑھ کر علم میں اور کون شخص ہو سکتا تھا لیکن جب یہی معاملہ رسول اور خالق کے درمیان آیا تو اس صدق در صدق میں بھی خامی کا ایک پہلو نکل آیا اور وہ یہ کہ صیغہ تفضیل عرف عام میں خواہ کسی معنی میں مستعمل ہو لیکن بلحاظ لغت للہ .....

قَالَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ لِفَتَاہُ اٰتِنَا غَدَاءَ نَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا وَ لَمْ یَجِدْ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ مَسًّامِنَ النَّصَبِ حَتّٰی جَاوَزَا مَکَانَ الَّذِیْ اُمِرَ بِہٖ فَقَالَ لَہٗ فَتَاہُ اَرَأَیْتَ اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَۃِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ قَالَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا فَلَمَّا اَنْتَھَیَا اِلَی الصَّخْرَۃِ اِذَا رَجُلٌ مُسَجًّی بِثَوْبٍ اَوْ قَالَ تَسَجّٰی بِثَوْبِہٖ فَسَلَّمَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فَقَالَ الْخَضِرُ وَ اَنّٰی بِاَرْضِکَ السَّلَامُ فَقَالَ اَنَا مُوْسٰی فَقَالَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ قَالَ نَعَمْ قَالَ ھَلْ

لے لی چلتے چلتے جب ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچے تو اپنا سر رکھ کر وہاں دونوں سو گئے' ادھر مچھلی زنبیل سے نکل گئی اور اس طرح سمندر میں داخل ہوئی کہ اس کے داخل ہونے کی جگہ پر سرنگ کی شکل بن گئی اس پر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق کو بعد میں بڑا تعجب ہوا- وہ آگے چل پڑے اور جب بقیہ ایک دن رات کی مسافت طے کر چکے اور صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا لاؤ بھئی ذرا ہمارا ناشتہ تو نکالو آج کے سفر میں تو ہم کو کچھ تکان ہو گیا اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو سفر میں تکان محسوس نہیں ہوا تھا اور آج بھی تکان اس وقت محسوس ہوا جب کہ وہ اس جگہ سے آگے نکل چکے تھے جس کا ان کو پتہ دیا گیا تھا ان کے رفیق سفر نے عرض کی جی ہاں جہاں ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا مچھلی تو اس جگہ گم ہو گئی تھی مگر مجھ کو آپ سے اس کا ذکر کرنا یاد نہیں رہا- موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اسی جگہ کی تو ہم کو تلاش تھی آخر پھر اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اسی راستے پر واپس ہوئے جب اس پتھر کے پاس پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص

ﷺ ..... اس میں اتنی وسعت اور اطلاق کا لفظ استعمال کرنا ایک نبی کی شان کے مناسب نہ تھا اس لیے جب سوال یہ ہے کہ سب سے بڑا عالم کون ہے تو نبی کی شان کے مطابق جواب یہ ہونا چاہیے کہ اس عموم و اطلاق کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے چونکہ جواب میں ذرا سی خامی رہ گئی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے "اَنَا اَعْلَمُ" (میں سب سے بڑا عالم ہوں) کا لفظ نکل گیا اس لیے فوراً گرفت ہوئی اور ارشاد ہوا کیوں نہیں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے- اس پر جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کا پتہ دریافت کیا تو ان کے علمی نقصان کا ظہور تو یہیں سے شروع ہو گیا اور اس پہلے قدم پر ہی علم کا اتنا قصور واضح ہوا کہ جب ایسے بڑے علم والے شخص کے مقام کا بھی تم کو علم نہیں تو سوچو تمہارے علم کا مقام کیا ہے؟ پھر جب پتہ بتایا گیا ہو تو وہ بھی ایک ابہام کے ساتھ یعنی یہ کہ جہاں مچھلی گم ہو جائے اب کہاں؟ یہ معلوم نہیں- پھر جب سفر شروع ہوتا ہے تو موقعہ کی تلاش ہے' مگر جب موقع سامنے آ جاتا ہے تو وہیں ذہول ہوتا ہے اور سفر کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے' آخر پھر واپس ہونا پڑتا ہے' آخر جب خود کشش ربانی ہی کھینچ کر ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے تو معاہدہ کے وقت جو پہلی بات وہ سنتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو علم مجھ کو ہے وہ تم کو نہیں اور جو تم کو ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں- مقصد یہ ہے کہ علمی دنیا میں ہم دونوں ناقص در ناقص ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی قصور کی منزل ختم ہوئی تو اب خضر علیہ السلام کے علمی وفور کی منزل شروع ہوئی اور اس کا آغاز بھی ایک پرندہ کی آمد سے اس طرح ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہمارا اور تمہارا دونوں کا علم مل کر بھی کچھ نہیں ہے- آخر بڑے عہد و پیمان کے بعد سفر شروع ہوا اور قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاعلمی اور حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی برتری کا ظہور ہوتا چلا گیا- آخر جب واقعات سفر اور ان کے حکم سب بیان میں آ گئے تو کچھ اور عجائبات قدرت کے سننے کی تمنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں رہ گئی اور آپ نے بڑی حسرت کے انداز میں فرمایا کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر سے کام لیتے- ﷺ .....

اَتَّبِعُکَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا قَالَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا یَا مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِیْهِ لَا تَعْلَمُهٗ اَنْتَ وَ اَنْتَ عَلٰی عِلْمٍ عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ لَا اَعْلَمُهٗ قَالَ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَا اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا فَانْطَلَقَا

ہے جو چادر اوڑھے لیٹا ہے۔موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا۔اس پر خضر علیہ السلام نے کہا اس ملک میں سلام کہنے والا کہاں۔انہوں نے فرمایا میں موسیٰ ہوں۔انہوں نے کہا کیا وہ موسیٰ جو بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ہیں' انہوں نے فرمایا جی ہاں میں وہی موسیٰ ہوں۔اس کے بعد فرمایا کیا میں آپ کے ہمراہ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ مجھ کو بھی تعلیم فرمائیں۔انہوں نے کہا آپ ہرگز صبر کے ساتھ اس کو حاصل نہیں کر سکتے' اے

ﷺ ...... اس ایک واقعہ ہی سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتنا نازک ہوتا ہے۔یہاں صغائر و کبائر درکار ہیں یا حسنات میں کسی باریکی کی فروگزاشت بھی کافی ہے۔ابھی آپ پڑھ چکے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ صلوات اللہ وسلامہ کو جب ختنے کا حکم ہوا اور امتثال امر کی عجلت میں انہوں نے فوراً بسولہ لے کر ختنہ کر ڈالی۔تو کیا اس سے بڑھ کر بھی وفاداری اور اطاعت شعاری کا مظاہرہ کچھ ہو سکتا تھا' مگر جب انہوں نے اپنی تکلیف کا اظہار فرمایا تو جواب یہ ملا کہ ختنہ کس طرح کرنی چاہیے یہ ہم سے پوچھا کیوں نہیں گویا اب اگر تکلیف ہوئی تو یہ تمہارا قصور ہے۔سبحان اللہ! جو لوگ گرفت کی اس شدت کو نہیں جانتے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ "رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ" پر گرفت کا راز بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔ادھر ہمارے متکلمین ہیں کہ وہ صرف تعبیرات کی شدت سے انبیاء علیہم السلام کی علی الاطلاق عصمت میں اختلاف کر رہے ہیں۔اگر ان لغزشوں پر پھر اس کے نتائج پر غور سے نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لغزشیں حکم و اسرار کا ایک بحر بیکراں تھیں۔حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش سب سے پہلے ہے مگر عالم کی آبادی کا سارا راز اسی ایک لغزش میں پنہاں تھا' پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے لغزش کا یہ کلمہ ضرور نکلا اور ان کو اس طویل سفر کی مشقت بھی جھیلنی پڑی مگر اس سفر میں کتنے اسرار حکمت کے دریا بہ نکلے اس کا اندازہ کچھ اسی سے فرما لیجئے کہ اس پورے سفر کو قرآن کریم نے کس تفصیل سے بیان کیا ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا مزے لے لے کر اس کو سنا آخر جب یہ طویل سفر ختم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بھی اس کی حسرت رہ گئی کاش کہ یہ سفر کچھ اور دراز ہو جاتا تو عجائبات قدرت کچھ اور بھی کھلتے۔

اس سرگزشت میں نہ معلوم کتنے درس عبرت ہوں گے۔ہم اپنے قصور علم اور وقت کی فرصت کے لحاظ سے چند اہم اسباق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ایک یہ کہ واقعات کی سطح اور اندرونی حکم ربانی کے درمیان مناسبتوں کا ادراک انسانی عقول کے احاطہ سے باہر ہے اور اسی لیے ان حکمتوں کے ادراک کے درپے ہوئے بغیر صبر کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے مگر یہی صبر عقول انسانیہ کے لیے بڑا امتحان ہے۔اسی کی طرف قرآن کریم کی اس آیۃ میں اشارہ فرمایا گیا ہے ﴿عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (البقرہ:٢١٦) اور یہ کہ خضر علیہ السلام کو جب واقعات و حکم کے اس غیر مدرک بالعقول ربط کا علم بخشا گیا تھا تو اسی کے ساتھ ان کو وہ قوت بھی عنایت فرما دی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک گرنے والی دیوار صرف ان کے ایک اشارہ سے سیدھی ہو گئی بلکہ اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ جب تک اس کے نیچے کے دفینہ کا مالک جوان نہ ہو لے وہ دیوار نہ گر سکے اور یہ کہ جب تک مصالح ربانیہ کا کسی کو قطعی علم حاصل نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ خود قطعی طور پر ان کا مامور بھی نہ ہو اس وقت تک شریعت میں وہ افعال جرم اور معصیت ہی کی فہرست میں شمار ہوں گے اور یہ کہ تکوینی امور کا راستہ تشریعی احکام سے الگ ہے اور ان کی تنفیذ کے لیے بھی تشریعی احکام کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندے مقرر ہیں مگر وہ اتنے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ان کا علم ضروری نہیں ہوتا۔اور یہ کہ ایسے افراد کو قدرت اس لیے عوام ﷺ ......

يَمْشِيَان عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِيْنَةٌ فَمَا بِهِمَا سَفِيْنَةٌ فَكَلَّمُوْهُمْ اَنْ يَحْمِلُوْهُمَا فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوْهَا بِغَيْرِ نَوْلٍ فَجَاءَ عُصْفُوْرٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِيْنَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً اَوْ نَقْرَتَيْنِ فِى الْبَحْرِ فَقَالَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا نَقَصَ عِلْمِىْ وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ اِلَّا كَنَقْرَةِ هٰذَا الْعُصْفُوْرِ فِى الْبَحْرِ فَعَمَدَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلٰى لَوْحٍ مِنْ اَلْوَاحِ السَّفِيْنَةِ فَنَزَعَهٗ فَقَالَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَوْمٌ حَمَلُوْنَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَّ اِلٰى سَفِيْنَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ فَكَانَتِ الْاُوْلٰى مِنْ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ نِسْيَانًا فَانْطَلَقَا فَاِذَا غُلَامٌ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَاَخَذَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِرَأْسِهٖ مِنْ اَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَأْسَهٗ بِيَدِهٖ

موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو علم مجھ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ نہیں جانتے اور جو علم آپ کو بخشا ہے وہ میں نہیں جانتا' انہوں نے فرمایا انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر دیکھیں گے اور کسی معاملہ میں آپ کے خلاف نہیں کروں گا- اس کے بعد وہ دونوں سمندر کے کنارہ کنارہ روانہ ہو گئے کشتی ان کے پاس نہ تھی کہ دریا عبور کر سکتے- آخر ادھر سے ایک کشتی گزری تو انہوں نے اس کے ملاح سے گفتگو کی کہ ان کو بھی سوار کر لے اتفاق سے کسی نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور کسی اجرت کے بغیر ان کو کشتی میں بٹھا لیا اتنے میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور آ کر کشتی کے کنارہ بیٹھ گئی اور سمندر میں ایک دو چونچیں ماریں- اس پر خضرؑ نے فرمایا اے موسیٰ میرا اور تمہارا علم مل کر بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنی کہ اس چڑیا کی چونچ کے پانی کی اس سمندر کے ساتھ ہے' اس کے بعد حضرت خضر اٹھے اور کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ پھینکا موسیٰ علیہ السلام فوراً بولے- یہ وہ شریف لوگ تھے جنہوں نے اجرت لیے بغیر ہم کو کشتی میں بٹھا لیا تھا' آپ نے یہ کیا کیا کہ لگے تو ان ہی کی کشتی کو توڑ ڈالا تا کہ سارے کشتی والوں کو ڈبو دیں' انہوں نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے' موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں بھول گیا' اور آپ بھولی بات پر مجھ سے گرفت نہ فرمائیں- یہ پہلی بے صبری موسیٰ علیہ السلام سے ازراہ نسیان سرزد ہوئی' آگے چلے تو ایک بچہ جو بچوں میں کھیل رہا تھا خضر علیہ السلام نے اس کا سر پکڑ کر گردن سے اکھاڑ ڈالا- موسیٰؑ

ﷺ..... کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے کہ ان کے اس قسم کے افعال شریعت کی زد میں آ کر اختلال نظم کا باعث نہ بنیں اور یہ کہ علم تشریعی کا درجہ علم تکوینی سے بلند ہے اور یہ کہ افضل کو اگر اس قسم کے جزئیات کا علم نہ ہو تو اس سے اس کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا- اور یہ کہ جن کو ان علوم کا حامل نہیں بنایا گیا ان کے لیے ان علوم کے حاملین کی نہ تلاش چاہیے اور نہ ان کی رفاقت ان کے لیے موجب کمال- اور اگر کہیں حسب الاتفاق ملاقات ہو جائے تو ان پر زبان طعن کھولنا بھی غلط ہے-

اس روایت کے چند الفاظ کتاب التفسیر میں بھی دیکھ لیے جائیں-

﴿فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ و امسک الله عن الحوت جرية الماء ذمار عليه مثل الطاق.

(دریا میں سرنگ پیدا ہونے کی صورت یہ ہوئی) کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے داخل ہونے کی جگہ سے پانی کا سیلان روک دیا تو وہاں ایک طاق کی سی شکل پیدا ہو گئی-

خذنونا ميتا حتى ينفخ فيه الروح.

اے موسیٰ! ایک مردہ مچھلی ساتھ لے لو یہاں تک کہ اس میں روح پڑ جائے- ﷺ.....

فَقَالَ مُوْسٰى أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ اِبْنُ عُيَيْنَةَ وَ هٰذَا اَوْ كَدُفًا نَطْلَقَا حَتّٰى اِذَا اَتَيَا اَهْلَ قَرْيَةِ نِ اسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهُ قَالَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِيَدِهٖ فَاَقَامَهُ فَقَالَ لَهُ مُوْسٰى لَوْشِئْتَ لَا تَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوْسٰى لَوَدِدْنَا لَوْصَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ عَلَيْنَا مِنْ اَمْرِهِمَا. (رواه البخاری)

نے فرمایا- آپ نے یہ کیا کیا ایک معصوم بچہ کو بے گناہ مارڈالا- خضرؑ نے کہا میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے - ابن عینیہ راوی حدیث کہتے ہیں یہاں لفظ "لک" (آپ سے) زیادہ تاکید کے لیے اضافہ فرمایا- آگے چلے تو ایک بستی سے گزرے اوران سے مہمانی کی درخواست کی- انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا- وہاں ایک دیوار تھی جو بالکل ٹوٹنے والی تھی- حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے اس کو سیدھا کر دیا- موسیٰ نے فرمایا اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت ان سے لے سکتے تھے- حضرت خضر علیہ السلام نے کہا اچھا بس اس کے بعد اب ہماری آپ کی جدائی ہے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ہماری تمنا تھی کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر کر لیتے تاکہ ان کے کچھ واقعات ہم کو اور معلوم ہو جاتے- (بخاری شریف)

(۱۲۴۷) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ يُوْذِيْ مُوْسٰى وَ كَانَ اِبْنَ عَمِّهٖ فَبَلَغَ مِنْ اَذَاهُ اِيَّاهُ اَنْ قَالَ لِاِمْرَأَةٍ بَغِيٍّ اِذَا اجْتَمَعَ النَّاسُ عِنْدِيْ غَدًا فَتَعَالِيْ وَ قُوْلِيْ اِنَّ مُوْسٰى رَاوَدَنِيْ عَنْ نَفْسِيْ فَلَمَّا كَانَ

(۱۲۴۷) عبداللہ بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا اور ہمیشہ ان کے در پے آزار رہا کرتا تھا اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے ایک زانیہ عورت کو فہمائش کی کہ لوگ جب کل میرے پاس جمع ہوں تو تو یہ کہنا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے مائل کرنا چاہا میرے قلب کو چنانچہ جب کل ہوئی اور لوگ جمع ہو گئے تو وہ آئی

ﷺ ..... قال اما يكفيك ان التورات بيديك و ان الوحي ياتيك يا موسى ان لي علما لا ينبغي لك ان تعلمه و ان لك علما .

(خضر علیہ السلام نے کہا) اے موسیٰ! کیا تم کو یہ تورات کافی نہیں- جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے- اور کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ وحی الٰہی تم پر آتی ہے- اے موسیٰ! مجھ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم بخشا ہے جو آپ کے لیے مناسب نہیں اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو میرے لیے مناسب نہیں-

لا ينبغي لي ان اعلمه. و في اصل الصخرة عين يقال له الحياة لا يصيب من مائها شيء الاحيي فاصاب الحوت من ماء تلك العين قال فتحرك و انسل من المكتل فدخل البحر.

درخت کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جس کو آبِ حیات کہتے ہیں- اس کا پانی جس چیز کو لگ جاتا وہ زندہ ہو جاتی تھی- وہ پانی کسی طرح اس مچھلی پر بھی پڑ گیا تو وہ زندہ ہو گئی تھی-

واقعہ مذکورہ کے بعض مجمل الفاظ کی شرح اس تشریح کی روشنی میں سمجھ لینی چاہیے-

الْغُدُوا جُتمعَ النَّاسُ جاءَتْ فَسارَّتْ قَارُوْنَ ثُمَّ قَالَتْ لِلنَّاسِ اِنَّ قَارُوْنَ قَالَ لِيْ كَذَا وَ كَذَا وَ اِنَّ مُوْسٰى لَمْ يَقُلْ لِيْ شَيْئًا مِنْ هٰذَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ وَ هُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ فَخَرَّ سَاجِدًا فَقَالَ اَيْ رَبِّ اَنَّ قَارُوْنَ قَدْ اٰذَانِيْ وَ فَعَلَ وَ فَعَلَ وَ بَلَغَ مِنْ اَذَاهُ اِيَّايَ اَنْ قَالَ مَا قَالَ فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى مُوْسٰى اَنْ يَا مُوْسٰى اِنِّيْ قَدْ اَمَرْتُ الْاَرْضَ اَنْ تُطِيْعَكَ وَ كَانَ لِقَارُوْنَ غُرْفَةٌ قَدْضَرَبَ عَلَيْهَا صَفَائِحَ الذَّهَبِ فَاَتَاهُ مُوْسٰى وَ جُلَسَاؤُهُ فَقَالَ لِقَارُوْنَ قَدْ بَلَغَ مِنْ اَذَاكَ اَنْ قُلْتَ كَذَا وَ كَذَا يَا اَرْضُ خُذِيْهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الْاَرْضُ اِلٰى كَعْبِهِمْ فَهَتَفُوْا يَا مُوْسٰى اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ اَنْ يُنْجِيَنَا مِمَّا نَحْنُ فِيْهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَ نَتَّبِعُكَ وَ نُطِيْعُكَ فَقَالَ خُذِيْهِمْ فَاَخَذَتْهُمْ اِلٰى اَنْصَافِ سُوْقِهِمْ فَهَتَفُوْا وَ قَالُوْا يَا مُوْسٰى اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ اَنْ يُنْجِيَنَا مِمَّا نَحْنُ فِيْهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَ نَتَّبِعُكَ وَ نُطِيْعُكَ فَقَالَ يَا اَرْضُ خُذِيْهِمْ اِلٰى رُكَبِهِمْ فَلَمْ يَزَلْ يَقُوْلُ يَا اَرْضُ خُذِيْهِمْ حَتّٰى تَطَابَقَتْ عَلَيْهِمْ وَ هُمْ يَهْتِفُوْنَ فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ يَا مُوْسٰى مَا اَفَظَّكَ اَمَا اَنَّهُمْ لَوْ كَانُوْا اِيَّايَ دَعَوْا لَخَلَّصْتُهُمْ. (رواه عبدالرزاق كما في الصارم المسلول ص ٤١٠ و اخرج ابن ابي شيبة في المصنف و ابن المنذر و ابن ابي حاتم و الحاكم نحوه و صححه كما في الدر المنثور من قصة قارون ج ٥ ص ١٣٦)

اور قارون سے چپکے سے اس نے کوئی بات کہی - پھر لوگوں کو مخاطب کر کے بولی - اس قارون نے ہی مجھ کو موسیٰ علیہ السلام کے سر ایسی ایسی بات لگانے کے لیے کہا تھا - موسیٰ علیہ السلام نے ان باتوں میں سے کوئی حرف مجھ سے نہیں فرمایا - یہ خبر موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہوگئی وہ اس وقت محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے - یہ سن کر سجدہ میں گر گئے اور فرمایا پروردگار قارون نے مجھ کو بڑی تکلیفیں دیں اور جو کچھ اس نے کیا وہ کیا یہاں تک کہ اب اس کے تہمت لگانے کی نوبت بھی آ گئی - اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی - میں نے زمین کو حکم دے دیا ہے' تم اس سے جو کہو گے وہ تمہاری تابعداری کرے گی - قارون ایک بالاخانہ میں رہتا تھا جس میں اس نے سونے کے پتر چڑھا رکھے تھے - حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے - اس وقت قارون کے احباب بھی وہاں موجود تھے اور فرمایا کہ تیری ایذاؤں کی اب یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ تو نے اس قسم کے کلمات بھی کہے - اے زمین تو ان کو پکڑ لے زمین نے فوراً گٹوں تک ان کو ہضم کر لیا - اس پر وہ چیخ پڑے - موسیٰ (علیہ السلام)! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہم کو اس عذاب سے نجات بخش دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے' آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور آپ کے تابعدار بن جائیں گے مگر موسیٰ علیہ السلام نے زمین سے پھر یہی فرمایا ان کو اور گھٹنوں تک پکڑ لے موسیٰ علیہ السلام زمین سے برابر یونہی فرماتے رہے حتیٰ کہ زمین اوپر سے مل گئی اور وہ اس کے اندر چیختے کے چیختے ہی دھنستے چلے گئے - اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی - موسیٰ (علیہ السلام)! تم کتنے تیز مزاج ہو' خوب سن لو اگر کہیں مجھ کو وہ ایک بار بھی پکارتے تو میں ان کو نجات دے دیتا -

(درمنثور - الصارم المسلول)

(١٢٤٨) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُوْنُسُ رفع هذا الحديث اِلٰى

(۱۲۴۸) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ پہلے ملک الموت وفات کے وقت آمنے سامنے آیا کرتے تھے - آپ نے فرمایا کہ

النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَ مَلَکُ الْمَوْتِ یَأْتِیْ النَّاسَ عَیَانًا قَالَ فَاَتٰی مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ فَلَطَمَهٗ فَفَقَأَعَیْنَهٗ وَ فِیْ اٰخِرِهٖ فَرَدَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَیْنَهٗ وَ کَانَ یَاْتِی النَّاسَ خُفْیَةً.

(رواہ احمد و رفعه ابن جریر ایضا کما فی البدایة و النهایة)

جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے تھپڑ مارا اور ان کی آنکھ پھوٹ گئی - پھر پورا واقعہ ذکر فرمایا - اس کے بعد دستور یہ ہو گیا کہ وہ پوشیدہ طور پر آنے لگے -

(مسند احمد)

سیدنا داؤد علیه السلام

(۱۲۴۹) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کَانَ لِدَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ مِنَ اللَّیْلِ سَاعَةٌ یُوْقِظُ فِیْهَا اَهْلَهَا یَقُوْلُ یَا اٰلَ دَاوٗدَ قُوْمُوْا فَصَلُّوْا فَاِنَّ هٰذِهٖ سَاعَةٌ یَسْتَجِیْبُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِیْهَا الدُّعَاءَ اِلَّا لِسَاحِرٍ اَوْ عَشَّارٍ. (رواہ احمد)

(۱۲۵۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الصَّلٰوةِ اِلَی اللّٰهِ صَلٰوةُ دَاوٗدَ وَ اَحَبُّ الصِّیَامِ اِلَی اللّٰهِ صِیَامُ دَاوٗدَ کَانَ یَنَامُ نِصْفَ اللَّیْلِ وَ یَقُوْمُ ثُلُثَهٗ وَ یَنَامُ سُدُسَهٗ وَ یَصُوْمُ یَوْمًا وَ یُفْطِرُ یَوْمًا. (متفق علیه) و قد ذکره البخاری اطول من هذا فی کتاب الانبیاء.

حضرت داؤد علیہ السلام

(۱۲۴۹) عثمان بن ابی العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ شب میں ایک وقت تھا جب کہ داؤد علیہ السلام اس وقت پر اپنے اہل کو بیدار کر دیتے اور یہ فرماتے جاتے تھے اے آل داؤد اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ یہ ایسا مقبول وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول فرماتا ہے سوائے جادوگر اور عشر وصول کرنے والے شخص کے - (احمد)

(۱۲۵۰) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نمازوں میں سب سے پیاری نماز اور روزوں میں سب سے پیارے روزے اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز اور ان کے روزے تھے - نماز کے معاملہ میں ان کا دستور یہ تھا کہ نصف شب سوتے پھر تہائی شب خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور آخر کے چھٹے حصہ میں پھر آرام فرماتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے -

(متفق علیہ)

(۱۲۴۹) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع شریعت میں انبیاء سابقین کے درخشاں عمل چن چن کر جمع کر دیئے گئے ہیں - آپ نے رات کی اس ساعت میں جو تہجد کے وقت اپنی ساری امت کو نماز کی تاکید فرمائی ہے پس جس امت کو انبیاء علیہم السلام کے اعمال حسنہ کی تعلیم دی گئی ہو اس کے کمالات کا اندازہ کر لینا چاہیے -

خدائی محاسبہ بھی کیسا خوفناک مرحلہ ہے کہ جس ساعت میں دعاء کی قبولیت کا عام اعلان ہے وہاں بھی ان اشخاص کے لیے ناامیدی ہی نظر آتی ہے جن کی بداعمالی خلق اللہ کے لیے موجب اذیت ہو ایک ساحر اور دوسرا سرکاری عشر وصول کرنے والا -

(۱۲۵۰) * اس صورت سے تمام حقوق کی ادائیگی ہو جاتی ہے - خالق کے حقوق تو کون ادا کر سکتا ہے مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ بندہ کے تھوڑے سے عمل کو قبول فرما لیتا ہے جب کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی رہے - حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم و .....

(۱۲۵۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُفِّفَ عَنْ دَاوٗدَ الْقُرْاٰنُ فَكَانَ يَأْمُرُ بِدَوَابِّهٖ فَتُسْرَجُ فَيَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ اَنْ تُسْرَجَ دَاوٗبُهٗ وَ لَا يَاْكُلُ اِلَّامِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ. (رواہ البخاری)

(۱۲۵۱) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے لیے زبور کے ترانے اتنے ہلکے اور خفیف کر دیئے گئے تھے کہ وہ اپنی سواری تیار کرنے کا حکم دیتے ادھر اس پر زین کسی جاتی ادھر زین کسنے سے پہلے پہلے یہ زبور پڑھ کر فارغ ہو جاتے۔ ان میں بڑی خاص بات یہ تھی کہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

سیدنا سلیمان علیه السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام

(۱۲۵۲) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتِ امْرَءَ تَانِ مَعَهُمَا اِبْنَا هُمَا جَاءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ اِحْدٰهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكَ وَ قَالَتِ الْاُخْرٰی اِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكَ فَتَحَا كَمَنَا اِلٰی دَاوٗدَ فَقَضٰی بِهٖ لِلْكُبْرٰی فَخَرَجَتَا عَلٰی سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ فَاَخْبَرَتَاهُ فَقَالَ ائْتُوْنِیْ بِالسِّكِّيْنِ اَشُقُّهٗ بَيْنَكُمَا فَقَالَتِ الصُّغْرٰی لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ هُوَ ابْنُهَا فَقَضٰی بِهٖ لِلصُّغْرٰی.

(متفق علیه)

(۱۲۵۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے بیان فرمایا کہ دو عورتیں تھیں ان کے ساتھ ان کے دو بچے تھے۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کا بچہ لے گیا۔ اس پر اس کی ساتھی بولی کہ تیرے بچہ کو لے گیا ہے‘ دوسری نے کہا نہیں تیرے کو لے گیا ہے۔ یہ دونوں اپنا معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے کر آئیں انہوں نے (روئداد مقدمہ سن کر) بڑی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد پھر وہ دونوں سلیمان بن داؤد کی طرف چلیں اور ان دونوں نے پھر یہاں اپنا معاملہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا اچھا لاؤ چھری لاؤ میں اس لڑکے کو کاٹ کر آدھا آدھا تم دونوں کو دیئے دیتا ہوں۔ یہ سن کر چھوٹی بول پڑی۔ خدا تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے‘ دیکھئے ایسا نہ کیجئے چلئے یہ لڑکا اسی کا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر انہوں یہ فیصلہ دے دیا کہ لڑکا چھوٹی کو دے دیا جائے۔ (متفق علیہ)

﴿..... جان بھی خدائی امانت ہیں اور ان کے بھی ہمارے ذمہ کچھ حقوق ہیں۔ کمال یہ ہے کہ جملہ اہل حقوق کے علیحدہ علیحدہ اداء ہوں۔

(۱۲۵۱) * قدرت کے یہاں ایک باب طی زمان کا بھی ہے یعنی بہت سا عمل تھوڑے سے وقت میں ہو جانا سلف امت کے اعمال پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اس حقیقت کا لاچار اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اگر قدرت کی طاقت کی ترازو لگانے والے ذرا غور کریں تو ان کو اس کے سمجھنے میں نہ کوئی دشواری ہو اور نہ شب معراج کے طویل سفر کے سمجھنے میں کوئی دقت رہے۔

(۱۲۵۲) * اس روایت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کس بنیاد پر تھا۔ لہٰذا اس پر بحث کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت سلیمان کے فیصلہ کے تفصیلات بھی یہاں بیان میں نہیں آئیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ مبہم ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ شکل اس لیے اختیار کی تھی کہ کسی تدبیر سے اصل واقعہ کا انکشاف ہو جائے۔ ان کی اس غیر معمولی فہم کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (الانبیاء : ۷۹)

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کی ایک اہم سرگذشت کے متعلق

چند جدید علمی اور منصفانہ نکات قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی بڑی علامت ہے اس لئے اس کو عالم کے تعمیری نظم ونسق کی بجائے تخریب عالم کے نظم ونسق پر قیاس کرنا چاہیے ✻ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیاتِ طیبہ میں رفع ونزول کی سرگذشت بیشک عجیب تر ہے لیکن اس پر غور کرنے سے قبل سب سے پہلے یہ سوال سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت کے ساتھ متعلق ہے کیونکہ دنیا کے روزمرہ معمولی واقعات بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے بہت مختلف ہو جاتے ہیں اور اُن کی تصدیق وتکذیب میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی زمین پر ایک خطہ زمین ایسا بھی ہے جہاں مہینوں کی رات اور مہینوں کا دن ہوتا ہے اور ان ہی سمندروں میں ایک سمندر ایسا بھی ہے جس پر مسافر موسم سرما میں خشکی کی طرح سواریوں پر چلتے ہیں اسی طرح انسانوں کا اختلاف بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ شجاعت وطاقت اور دانائی وفرزانگی کے وہ بعید سے بعید کارنامے جو رستم واسفندیار، انورپے اور ہٹلر، اسٹالن اور لینن وغیرہ کے حق میں بے تامل قابل تصدیق سمجھے جاتے ہیں وہ عام انسانوں کے حق میں بڑے تأمل کے بعد بھی بمشکل قابل تصدیق ہو سکتے ہیں۔ پس صرف عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے یا صرف اپنے دور اور اپنے زمانہ کے حالات پر قیاس کر کے کسی صحیح واقعہ کا انکار کر دینا کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔

لہٰذا مسئلہ نزول پر بحث کرنے کے وقت بھی سب سے پہلے اس پر غور کر لینا ضروری ہے کہ یہ واقعہ کس دور اور کس زمانہ سے پھر کس شخصیت سے متعلق ہے۔

جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہوگا کہ یہ واقعہ تخریب عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور کے واقعات سے ملتا جلتا ہو۔ پس اگر تخریب عالم کے وہ سب واقعات جو تعمیری دنیا کے بعد کے واقعات سے مختلف ہونے کے باوجود قابل تصدیق ہیں تو پھر اس ایک واقعہ کی تصدیق میں آپ کو تامل کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور اس کی تخریب کے دونوں واقعات اتنے عجائبات پر مشتمل ہیں کہ جو انسان ان دونوں جانبوں سے غائب ہے وہ بے چارہ اپنے موجودہ حالات کی دنیا دیکھ کر ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ عالم کی تخلیق کے واقعات پر ذرا نظر ڈالیں، زمین کس طرح بنائی گئی، پھر کس طرح بچھائی گئی، آسمان کس طرح بنائے گئے آدم کس طرح پیدا ہوئے ان کا جوڑا کس طرح پیدا ہوا پھر کس طرح خلافت ارضی قائم ہوئی اسی طرح بہت سے واقعات ہیں جو ایک سے ایک عجیب تر ہیں اور ان سب ہی کے بیان کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اپنے سر رکھی ہے اگر آپ ان میں سے ایک واقعہ بھی عالم کے تعمیری دور کے نظم ونسق سے ملا کر دیکھیں تو آپ کو ان میں سے ایک واقعہ کے فہم میں بھی سخت الجھن پیش آئے گی اور اسی بنا پر ایک جماعت نے تو سرے

سے تخلیق عالم ہی کا انکار کر کے قدم عالم کا راستہ لے لیا ہے مگر آپ کے نزدیک کیا اس کا یہ طریقہ کار صحیح ہے؟

اسی طرح جب آپ تخریب عالم کے واقعات پر نظر ڈالیں گے تو وہ بھی عجیب در عجیب ہی نظر آتے ہیں یعنی کبھی نہ پھٹنے والے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے آفتاب و ماہتاب اور یہ تمام روشن ستارے بے نور ہو کر گر پڑیں گے اور کبھی جنبش نہ کرنے والے یہ بڑے بڑے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آئیں گے اور یہ سارا کا سارا عالم ہستی عدم محض اور صرف نیستی کے تحت آ جائے گا - یہ اور ان جیسے اور بہت سے عقل سے بالاتر واقعات کے بیان کی ذمہ داری بھی خود قرآن کریم ہی نے اٹھائی ہے اب اگر آپ ان کی تصدیق کا فیصلہ موجودہ عالم کے واقعات کے پیش نظر کرنے بیٹھ جائیں تو کیا آپ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں گے لیکن ہاں جب آپ عالم کی تخلیف اور اس کی تخریب کے دونوں سرے ملا کر دیکھیں گے تو دونوں آپ کو بالکل یکساں صورت میں نظر آئیں گے-

پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے اس لئے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مردوں کے زندہ ہو ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے- بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعۂ عالم انسانی کے جسمانی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ارشاد ہے- (اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک مجسم علامت ہیں درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ اور قتادہؒ سے منقول ہے کہ اس آیت کا مصداق قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہے-

اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیشگوئی ہے کس شخصیت کے متعلق وہ شخصیت کسی عام بشری سنت کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ ہے تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ وہ صرف عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے الگ اور سب سے ممتاز خلقت کا بشر ہے جتنے انسان ہیں وہ سب مذکر و مؤنث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے انسان ہیں جن کی تخلیق صرف ایک صنف انسانی سے وجود میں آئی ہے پھر اس میں میں تمثیل جبرئیلی اور نفخۂ ملکی اور تکلم فی المہد کے واقعات اور بھی عجیب تر ہیں- اُن کے معجزات دیکھئے تو وہ بھی کچھ نرالی شان رکھتے ہیں ان میں سے ہر معجزہ ایسا ہے جس میں ''باذن اللہ'' کی قید لگانی پڑتی ہے اُن کے گذشتہ دور حیات میں ملکیت کا اتنا غلبہ ہے کہ کھانے پینے رہنے سہنے' شادی و نکاح کا کوئی نظم و نسق ہی نہیں ملتا' یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان سب ضروریات سے منزہ و مبرا سچ مچ کے ایک فرشتہ ہیں پھر جب ان کی ہجرت کا مرحلہ سامنے آتا ہے تو یہاں بھی اُن کی شان سب سے نرالی نظر آتی ہے یعنی ان کی ہجرت کسی خطۂ ارضی کی بجائے اُس عالم کی طرف ہوتی ہے جو ملکوت اور ارواح کا مستقر ہے غرض اُن کی حیات کے جس گوشہ پر نظر ڈالئے وہ ملکوتیہ کا ایک مرقعہ نظر آتا ہے- یہاں قرآن کریم نے جو لقب اُن کو عطا فرمایا ہے وہ بھی سب سے ممتاز ہے اور اس نوع کا لقب ہے جس سے کہ اُن کی زندگی کی یہ سب خصوصیات اجمالی طور پر بیک نظر سامنے آ جاتی ہیں یعنی ''روح اللہ'' اور

''کلمۃ اللہ'' گو بنی آدم جتنے بھی ہیں اُن سب کی روحیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اور اسی کے حکم کن سے آئی ہیں مگر یہاں اس روح کی آمد میں کوئی ظاہری واسطہ بھی نہ تھا اور جو واسطہ تھا وہ ایسا ہی تھا جس کے موجود ہونے سے عالم قدس کی طرف اُن کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا یہ تمام کا تمام وہ تذکرہ حیات ہے جو اُن کے آسمانوں پر جانے سے قبل سے متعلق ہے اب آپ نازل ہونے کے بعد اُن کے حالات پر نظر ڈالئے تو وہ پہلی زندگی کے بالکل برعکس ہیں یہاں اُن کے تمام معاملات میں دنیا کا مرتب نظم ونسق ملتا ہے حتیٰ کہ نکاح وولادت کا بھی اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کی حیثیت ایک امام وامیر کی ثابت ہوتی ہے گویا وہ انسانوں میں بھی کوئی معمولی طبقہ کے انسان نہیں بلکہ اس اعلیٰ طبقہ کے انسان نہیں بلکہ اس اعلیٰ طبقہ کے انسان ہیں جن کی قیادت میں اسفل طبقہ کے انسان ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ کے انسان بن سکتے ہیں۔ غرض ان کی حیات کے یہ دو دور تمام تر قدرت کے ان عجائبات سے مشابہ ہیں جو عالم میں دست قدرت کے براہِ راست پیدا کردہ ہیں وہ بیک وقت بن باپ پیدا ہو کر آغاز عالم کے واقعات میں حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں (اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَاللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ) اور اتنی طویل غیبت کے بعد عالم کے خاتمہ پر جسمانی نزول فرما کر علامات قیامت میں بھی شمار ہیں (وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا) اگر ایک طرف اپنی پہلی حیات میں آسمانوں پر جا کر وہ فرشتوں سے مشابہ ہیں تو دوسری طرف نزول کے بعد موت اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون ہو کر عام انسانوں کی صف میں بھی داخل ہیں۔ اگر پہلی زندگی میں اُن کا معجزہ احیاء ہوتی ہے تو نزول کے بعد دوسرے دورِ حیات میں اماتۃ دجال یعنی قتل دجال ہے۔ ان کی یہ تمام سوانح حیات قرآن کی بیان کردہ ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء آیت ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ الخ﴾ آئندہ اُن کی وفات اُن کے نزول کی شاہد ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تشریح آئے گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ اتر آنا نہ عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ زمانہ کے عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے اور ہے بھی اس شخصیت کے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں تو پھر بنظر انصاف اس میں آپ کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام سے تشبیہ دے کر یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی ہستی کو عالم کے درمیانی سلسلہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں اگر اُن کے حالات کو قیاس کرنا ہی ہے تو تخلیق عالم کے حالات پر قیاس کر کے دیکھو تمہارا سب تعجب جاتا رہے گا۔

اصل یہ ہے کہ مادی عقول کے نزدیک کچھ یہی ایک مسئلہ نہیں ہے جو زیر انکار آرہا ہو بلکہ عالم غیب کے تمام حقائق ہی زیر انکار ہیں۔ اور درحقیقت یہ عقل ونقل کی اصولی جنگ کا ثمرہ ہے ارباب عقل یہ سمجھتے ہیں کہ اخبار انبیاء علیہم السلام سب خلافِ عقل ہوتے ہیں اور اصحابِ نقل یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات بھی عقلی ہو وہ سب شریعت کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ نزاع وجدل درحقیقت عقل و شرع کا صحیح مفہوم متعین نہ کرنے سے پیدا ہو رہا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: کون نہیں جانتا کہ قرآن وسنت نے جا بجا عقل کی تعریف فرمائی ہے بلکہ اپنی دعوت کا مخاطب ہی صرف اہل فہم اور اہل عقل کو قرار دیا ہے۔ مجنون اور بچے اس کی دعوت کے احاطہ سے ہی باہر ہیں لیکن جب بعض اہل بدعت نے

بعض کلامی مسائل کو جو دراصل قرآن وسنت کے بھی خلافت تھے اصول دین میں داخل کر دیا اور اس کا نام عقلیات رکھا تو اب اہل شرع کو عقلیات کے نام ہی سے ایسی نفرت پیدا ہوگئی کہ جو شخص بھی عقلی استدلال کرتا نظر آتا اُن کے نزدیک بدعتی اور باطل پرست سمجھا جاتا دوسری طرف جب عقلاء نے اہل شرع سے وہ مسائل سنے جو صریح عقل اور یقینی تاریخ کے خلاف تھے اُس پر ان کا یہ دعویٰ سنا کہ وہ قرآن وحدیث کے بیان کردہ ہیں تو ان کے دلوں میں نفس قرآن وسنت ہی کے متعلق خلاف عقل ہونے کی بدگمانی بیٹھ گئی حتیٰ کہ اب جو قرآن وسنت سے استدلال کرتا اُن کے نزدیک قانون فطرت اور تقاضۂ عقل کا مخالف ہوتا - یہاں غلطی دونوں فریق کی ہے - عقلاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق کئے بغیر ہر خلاف عقل بات کا نام شرع کیوں رکھ دیا اور علماء کی کوتاہی یہ ہے کہ انہوں نے جو عقل صحیح کا تقاضہ نہ تھا اس کو شرع کے مفہوم میں کیسے داخل کر دیا حالانکہ شریعت کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو عقل سلیم کے نزدیک قابل انکار ہو یا محالات کی تعریف میں آتا ہو لیکن جب کسی ابتدائی غلطی پر کچھ مدت گذر جاتی ہے تو وہ غلطی راسخ ہوتے ہوتے عقائد کا رنگ پیدا کر لیتی ہے اور جو کسی صحیح حقیقت پر نتائج وآثار مرتب ہوتے ہیں وہی اس غلطی پر مرتب ہونے لگتے ہیں اس لئے اگر مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل عقل وشرع کا صحیح صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے تو عقلاء اور علماء کے درمیان بحث وجدل کا یہ وسیع میدان بہت تنگ ہوسکتا ہے -

علماء ہر خلاف عقل بات کو شرع کے مفہوم میں داخل کرنے کی سعی کرنا ترک کر دیں اور عقلاء شرع کی ہر بات پر خلاف عقل ہونے کی بدگمانی دل سے نکال ڈالیں اور عقل وفکر کا کوئی صحیح معیار مقرر کر لیں - (کتاب النبوت ص ۶۴)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ قابل تسلیم نہیں ہے تو پھر آپ کو بھی ایک فیصلہ کرنا ہوگا کہ عالم کے تخلیق وتخریب کے دوسرے تمام واقعات بھی قابل تسلیم نہیں ہیں اور اگر وہ سب قابل تصدیق ہیں تو پھر یہ مسئلہ بھی قابل تصدیق ماننا ہوگا - صرف اس لئے آغازِ عالم کے تعمیری واقعات سے آپ کی زندگی کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا یہ مستقبل بعید کے تخریبی واقعات کے موجودہ دور کے انسانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ان سب سے صرف نظر کر کے بحث کا رخ صرف مسئلہ نزول میں منحصر کر دینا اپنے نفس کو بھی مغالطہ میں رکھنا ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنا ہے -

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جزئی معاملات کی اہمیت ✲ واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اس لحاظ سے بھی سب میں ممتاز ہے کہ اُن کے جزئی جزئی واقعات کو بھی قرآن کریم نے اصولی معاملات کی سی اہمیت دی ہے مثلاً اُن کی ولادت کا معاملہ یہ ایک جزئی معاملہ ہے مگر اُن کی ولادت کو بھی قرآن کریم نے بڑی اہمیت سے ذکر کیا ہے یعنی فرشتہ کا بصورتِ بشری آنا اور اپنی آمد کی غرض وغایت بتانا اُس پر حضرت مریم کا نا کتخدائی کی حالت میں تعجب فرمانا پھر فرشتہ کا جواب اور اس کے بعد ان کے گریبان میں پھونک مارنا یہ سب تفصیلی ذکر ہیں حتیٰ کہ اُن کی والدہ کا دروازہ بھی پھر ولادت اور اُس پر لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی ظاہر ہے کہ ان سب معاملات میں سے کسی معاملہ کو اصولی اور بنیادی کہا جاسکتا ہے؟ مگر کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جس کو آپ صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر ٹال سکتے ہوں اور جس پر عقیدہ رکھنا کوئی ضروری بات نہ ہو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے اہم واقعہ کو صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر آپ کیونکر عقائد کی فہرست سے خارج کر سکتے ہیں -

مسئلہ نزول کی حیثیت کتب عقائد میں ✻ یہی وجہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک کتب عقائد میں اس مسئلہ کو بھی دیگر عقائد کے ساتھ ساتھ ایک عقیدہ ہی شمار کیا ہے حتیٰ کہ محدثین نے جو مؤلفات ترتیب دی ہیں گو اُن کو عقائد کی شکل پر مرتب نہیں فرمایا اُن کے مقاصد دوسرے ہیں لیکن اس کے باوجود امام مسلم نے جن کی کتب کو بلحاظِ ترتیب بخاری شریف پر بھی فوقیت دی گئی ہے نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ابواب ایمان کا ایک جزء قرار دیا ہے پھر یہ کہنا کتنی کوتاہ نظری ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ چونکہ ایک جزئی مسئلہ ہے اس لئے اس کو عقائد اور ایمانیات کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا - یہ معجزات کی بحث میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس پر اور مبسوط بحث کریں گے کہ رسولوں کی اخبار پر ایمان رکھنا یہ جزئی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بنیادی مسئلہ ہے رہا خاص نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ تو اس کو اس حیثیت کے علاوہ رسالت اور قیامت کے مسئلہ سے بھی براہِ راست تعلق ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آنے والی ہے- یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ذات وصفات' قضاء وقدر' حشر ونشر اور رؤیۃ باری تعالیٰ وغیرہ جن مسائل کو بے چون و چرا عقائد میں داخل سمجھا گیا ہے- اُن میں تو کافی اختلافات بھی ملتے ہیں چنانچہ معتزلہ ان سب مسائل میں اہل سنت والجماعت سے اپنا علیحدہ خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ اشاعرہ و ماتریدیہ کے مابین بھی بعض مسائل میں ضرب المثل اختلاف موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان مسائل کو کسی نے عقائد کی فہرست سے خارج نہیں کیا اس کے برخلاف نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ ہے جس میں سلف سے لے کر آج تک ائمہ دین میں سے کسی کا اختلاف ثابت نہیں پھر اس کو عقائد کی فہرست سے کس طرح خارج کیا جاسکتا ہے- حیرت ہے کہ معتزلہ جو مذکورہ بالا مسائل میں اہل سنت سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں جمہور امت کے ساتھ متفق ہیں جیسا کہ زمخشری نے کشاف میں اس کی تصریح کی ہے- ابن عطیہ لکھتے ہیں کہ تمام اُمت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قربِ قیامت میں بجسمِ عنصری پھر تشریف لانے والے ہیں جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے- دیکھو (بحر محیط ج ۲ ص ۴۷۳)

مسئلہ نزول کی حیثیت احادیث میں ✻ اس بارے میں اگر حدیثوں پر نظر ڈالئے تو تمیں صحابہ سے تقریباً سو حدیثوں میں باسالیب مختلفہ اس مسئلہ کو بتکرار قسمیں کھا کھا کر دہرایا گیا ہے- اس بڑے ذخیرہ میں سے چالیس حدیثیں تو ایسی ہیں جن کی تصحیح و تحسین محدثین نے صراحت کے ساتھ ثبت فرمادی ہے اور بقیہ کے متعلق گو صراحتہً اُن سے تحسین منقول نہ ہو لیکن کوئی صاف جرح بھی ثابت نہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پیشگوئی کا رتبہ کیا ہے دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ متواتر حدیث کی جو بڑی سے بڑی مثال پیش کی گئی ہے اس پیش گوئی کا پلہ کسی طرح بھی اس سے ہلکا نہیں ہے- پھر جب کتب سابقہ پر نظر ڈالی جائے تو یہاں انجیل بھی احادیث نبویہ کے ساتھ اس درجہ مطابق ملتی ہے کہ اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین بدیہی بن جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول صرف اسی شریعت کا مسئلہ نہیں بلکہ جملہ ادیانِ سماویہ کا ایک ایسا متفقہ عقیدہ ہے جس میں اصول دین کی طرح کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا-

مسئلہ نزول کی حیثیت انجیل میں ✻ پھر اس مسئلہ کی حقیقت ایک عام اور مجمل پیشگوئی کے سمجھ لینے میں کتنی بڑی فروگذاشت ہوگی انجیل متی باب ۲۴ آیت ۳ میں ہے :- اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا اس کے شاگردوں نے خلوت میں اُس کے پاس

آ کر کہا، ہم سے یہ کہہ کہ یہ کب ہوگا اور تیرے آنے کا اور زمانہ کے آخر ہونے کا نشان کیا ہے؟ تب یسوع نے جواب میں اُن سے کہا۔ خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آئیں گے اور کہیں گے کہ میں مسیح ہوں اور بہتوں کو گمراہ کریں گے۔ اور تم لڑائیوں اور لڑائیوں کی افواہوں کی خبر سنو گے خبردار مت گھبرائیو کیونکہ ان سب باتوں کا ہونا ضرور ہے پر اب تک آخر نہیں ہے کہ قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھ آئے گی اور کال اور مری پڑے گی اور جگہ جگہ بھونچال آئیں گے یہ سب کچھ مصیبتوں کا شروع ہے۔

انجیل متی باب ۲۴-۲۳-۲۸- اس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ دیکھو مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام دکھائیں گے کہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کر لیں۔ دیکھو میں نے پہلے ہی تم سے کہہ دیا ہے پس اگر وہ تم سے کہیں کہ دیکھو وہ بیابان میں ہے تو باہر نہ جانا دیکھو وہ کوٹھریوں میں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جیسے بجلی پورب سے کوند کر پچھم تک دکھائی دیتی ہے ویسے ہی ابن آدم کا آنا ہوگا جہاں مردار ہے وہاں گدھ جمع ہو جائیں گے۔

اور فوراً ان دنوں کی مصیبت کے بعد سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمان کی قوتیں ہلائی جائیں گی اور اس وقت ابن آدم کا نشان آسمان پر دکھائی دے گا اور اس وقت زمین کی ساری قومیں چھاتی پیٹیں گی اور ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھیں گی انجیل لوقا ۲۱-۲۶ میں اتنی زیادتی اور ہے۔ اور ڈر کے مارے اور زمین پر آنے والی بلاؤں کی راہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کی جان میں جان نہ رہے گی۔ اور جب یہ باتیں ہونے لگیں تو سیدھے ہو کر سر اوپر اُٹھانا اس لئے کہ تمہاری مخلصی نزدیک ہوگی انجیل مرقس و لوقا میں۔

انجیل متی باب ۲۴-۳۲ ✻ اب انجیر کے درخت کی ایک تمثیل سیکھو جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک ہے بلکہ دروازہ پر ہے۔

اعمال باب ۱ آیت ۹ ✻ اور وہ یہ کہہ کے ان کے دیکھتے ہوئے اوپر اُٹھایا گیا اور بدلی نے اُسے اُن کی نظروں سے چھپا لیا اور اُس کے جاتے ہوئے جب وے آسمان کی طرف تک رہے تھے دیکھو دو مرد سفید پوشاک پہنے اُن کے پاس کھڑے تھے اور کہنے لگے اے جلیل مردو تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔ یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اُٹھایا گیا ہے اسی طرح جس طرح تم نے اسے آسمان کو جاتے دیکھا ہے پھر آئے گا۔

ان صحابہ کے اسماء مبارکہ یہ ہیں جن کی تفصیلی روایات دیکھنی ہوں تو رسالہ ''التصریح بما تواتر من الاحادیث فی نزول المسیح'' مؤلفہ محترم جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ابو ہریرہ (۲) جابر بن عبداللہ (۳) نواس بن سمعان (۴) ابن عمر (۵) حذیفہ بن اسید (۶) ثوبان (۷) مجمع (۸) ابو امامۃ (۹) ابن مسعود (۱۰) ابو نضرۃ (۱۱) سمرۃ (۱۲) عبدالرحمٰن بن جبیر (۱۳) ابو الطفیل (۱۴) انس (۱۵) واثلہ (۱۶) عبداللہ بن سلام (۱۷) ابن عباس (۱۸) اوس (۱۹) عمران بن حصین (۲۰) عائشہ (۲۱) سفینہ (۲۲) حذیفہ (۲۳) عبداللہ بن مغفل (۲۴) عبدالرحمٰن بن سمرۃ (۲۵) ابو سعید الخدری (۲۶) عمار (۲۷) ربیع (۲۸) الحسن (۲۹) عمرو بن ردیم (۳۰) کعب (۳۱) الامام جعفر۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

مسئلہ نزول کی حیثیت قرآن کریم میں ✲ خدا تعالیٰ کی سب سے آخری کتاب قرآن کریم ہے جب اُس پر نظر ڈالئے تو اس میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی یہی حیثیت ثابت ہوتی ہے رہا اُن کے رفع جسمانی کا مسئلہ تو اُس کو تو قرآن کریم نے اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنی جانب سے ایک فیصلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آتی ہے ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾(النساء : ۱۵۹) یعنی اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے- آیت بالا میں اس کی تصریح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی فوت نہیں ہوئے نیز یہ کہ آئندہ زمانہ میں کسی شبہ کے بغیر اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے یہی وجہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صحیح حدیث روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کی روشنی میں دیکھنا چاہو تو آیت بالا کو پڑھ لو- اس کی مزید تشریح آئندہ آئے گی اور اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائے گا کہ نزول کا لفظ قرآن کریم میں کیوں نہیں آیا- پس اگر یہ مسئلہ جو کتب سابقہ سے لے کر احادیث نبویہ اور خود کتاب اللہ میں اس تواتر کے ساتھ ثابت ہے عقائد کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہے تو پھر اور کس مسئلہ کو عقائد میں شمار کیا جا سکتا ہے- تعجب ہے کہ یہاں کتب سماویہ کو اس پر جتنا اصرار ہے ہماری مادی عقول کو اس سے اتنا ہی انکار ہے- فالی اللہ المشتکی

مسئلہ نزول کی اہمیت اور اصول دین سے اس کا تعلق ✲ موجودہ دور کے مبصرین کی نظر یہاں ایک اور واضح حقیقت سے بھی چوک گئی ہے وہ صرف اس بحث میں اُلجھ کر رہ گئی ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی خبر صرف ایک پیشگوئی ہے لہٰذا جو اُمت اس رسول کی تصدیق پہلے سے کر چکی ہے اس کے حق میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور اسی غلط فہمی میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اصل دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے- اُن کو یہ علم ہی نہیں کہ اس پیشگوئی کو ایک اصولی اہمیت بھی حاصل ہے کیونکہ اہل کتاب کی دو مرکزی جماعتوں کا نقطہ ضلالت یہی پیشگوئی ہے- حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ کتب سابقہ میں دو مسیح کی آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک مسیح ہدایت کی جس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور دوسری مسیح ضلالت کی جس کا مصداق دجال ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو یہود بے بہبود نے اُن کو تو مسیح ضلالت کا مصداق ٹھہرالیا اور اس لئے اُن کی ایذا رسانی اور قتل کے در پے رہے اور جب مسیح ضالت ظاہر ہوگا یعنی جدال تو اُس کو مسیح ہدایت کا مصداق ٹھہرائیں گے یہی وجہ ہے کہ تمام یہود دجال کی اتباع کر لیں گے- اس کے برعکس نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گو مسیح ہدایت کا مصداق تو مانا مگر حد سے بڑھا کر ان کو اقانیم ثلاثہ کا ایک جزء بنالیا اب یہاں ان دونوں بڑی بڑی جماعتوں کو جو بسیط ارض پر پھیلی پڑی ہیں ایک مسیح کی آمد کا انتظار لگ رہا ہے یہود کو تو اس لئے کہ اُن کے نزدیک مسیح ہدایت کی جو پیشگوئی کی گئی تھی اُس کا ظہور ابھی باقی ہے- لہٰذا مسیح ہدایت کو آنا چاہیے اور نصاریٰ کو اس لئے کہ اُن کے زعم میں وہی مسیح دوبارہ آ کر مخلوق کا حساب لیں گے اور یہی دن قیامت کا دن ہوگا- (دیکھو الجواب الصحیح ج اص ۱۴۱ و ج ۱ ص ۱۸۱)

اس مسئلہ پر بحث کے وقت اگر اس اہم تاریخ کو بھی سامنے رکھ لیا جاتا تو یہ واضح ہو جاتا کہ اس پیشگوئی کی حقیقت نہ صرف ایک پیشگوئی کی ہے اور نہ ایک جزئی واقعہ کی بلکہ اس کا تمام تر تعلق اصول دین کے ساتھ ہے کیونکہ رسالت اور قیامت کے دونوں

مسئلے اصولی مسئلے ہیں اور اس مسئلہ کو ان دونوں سے گہرا تعلق ہے- یہاں یہودیوں کی یہ گمراہی کتنی اصولی گمراہی تھی کہ انہوں نے مسیح ہدایت یعنی خدا تعالیٰ کے ایک سچے رسول کو مسیح ضلالت یعنی دجال ٹھہرالیا تھا اور نصاریٰ کی یہ گمراہی بھی کتنی اصولی تھی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے ایک رسول کی آمد کو خدائی آمد اور اُس کی آمد کے دن کو قیامت کا دن سمجھ رکھا تھا- ان دو اصولی غلطیوں کی اصلاح پر دنیا کی ان دو بڑی بڑی امتوں کے ایمان کا دارومدار ہے- اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آمد کی پیشگوئی کی وہی اہمیت محسوس فرمائی ہے جو کسی اصولی معاملہ کی کی جاسکتی ہے اور مسیح ہدایت اور مسیح ضالت کی تفصیلات بیان فرمادی ہیں کہ پھر آئندہ ان دونوں کے ظہور کے وقت ان کی شناخت میں دونوں قوموں کو کوئی مغالطہ نہیں لگ سکتا یہود آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جس کو انہوں نے مسیح ضالت سمجھا تھا (والعیاذ باللہ) درحقیقت وہ مسیح ہدایت تھے اور نصاریٰ کو یہ خوب ثابت ہو جائے گا کہ جس کو انہوں نے خدائے تعالیٰ کا شریک ٹھہرالیا تھا- درحقیقت وہ اس کا ایک بندہ اور اُس کی مخلوق تھا اور اُن کی آمد قیامت کا دن نہیں بلکہ اس کی ایک بڑی علامت تھی اور ساری غلطیاں خود عیسیٰ علیہ السلام ہی کی زبان سے دور کردی جائیں گی تاکہ اختتام عالم سے قبل اتحاد ملل کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہوسکتی تھیں وہ ایک ایک کر کے سب دور کردی جائیں اور ملل سماویہ کی وحدت کا وعدہ پوری صفائی اور صداقت سے پورا ہو جائے وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا-

<u>حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہمیت تاریخی نظر میں</u> ☼ یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ان انبیاء علیہم السلام میں سے نہیں ہیں جن کا تذکرہ تاریخ نے محو کر ڈالا ہو بلکہ اُن اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں جن کا تذکرہ ہر دور میں بڑی اہمیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے اہل کتاب کے وہ بڑے بڑے گروہ اُن کی ایک ایک علیحدہ تاریخ رکھتے ہیں اور خود اہل اسلام کے پاس بھی اُن کی ایک منقح تاریخ موجود ہے- یہود کی تاریخ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انہوں نے قتل کرڈالا ہے اس لئے اُن کے نزدیک تو اُن کی حیات اور دوبارہ تشریف آوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رہ گئے نصاریٰ تو وہ اُن کے دوبارہ تشریف آوری کے قائل ہیں مگر وہ اُس دن کو قیامت کا دن سمجھتے ہیں اور مجمل طور پر اُن کے سولی چڑھائے جانے اور زندہ ہو کر آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بھی قائل ہیں- اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ وہ قتل ہوئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ اسی جسم عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اُٹھائے گئے اور قیامت سے پہلے پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ تشریف لائیں گے اور مدینہ طیبہ میں جوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں وفات کے بعد مدفون ہوں گے- اب ایسے اولوالعزم رسول کے متعلق یہ حق کس کو پہنچتا ہے کہ وہ کوئی ایسی جدید تاریخ بنالے جو دنیا میں کسی جماعت کو بھی مسلم نہ ہو- مثلاً یہ کہنا ہے کہ وہ سولی پر چڑھائے گئے پھر نیم مردنی کی حالت میں اتار لئے گئے تھے پھر کہیں جا کر اپنی طبعی موت سے مرگئے اور آخر کشمیر یا کسی اور شہر میں جا کر ایسی گمنامی کی حالت میں مدفون ہو گئے جس کی اطلاع کسی کو نہیں ہو سکی- اس جلیل القدر رسول کی اس جدید تاریخ کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا آج کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرے کہ آپ کی وفات اور دفن کا سب افسانہ غلط ہے- بلکہ جب کفار نے آپ کو زیادہ ستایا تو آپ اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور آئندہ پھر تشریف لانے والے ہیں- کیا دنیا میں کوئی عاقل ایسا ہے جو اس رسول اعظم کی اس جدید تاریخ پر غور کرے اور اس کے دلائل سننے کے لئے تیار ہو- ہمارے نزدیک ایک مسلّم فوت شدہ رسول کے زندہ آسمانوں پر

جانے کی تاریخ میں اور ایک مسلم زندہ آسمانوں پر موجود رسول کے متعلق اُن کی موت اور دفن کی جدید تاریخ میں کوئی فرق نہیں نہ وہ عقلاء کے نزدیک قابل توجہ ہے نہ یہ قابل التفات ہو سکتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی اہمیت تاریخ کی نظر میں ✻ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں اُن کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آ رہی ہے پھر ان کی موت اور اُن کی قبر کا صحیح صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا۔ بالخصوص یہود جو ان کے قتل کے مدعی تھے وہ اس اہم واقعہ سے کیسے غفلت اختیار کر سکتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول ہونے کے لئے ان کی قبر کی نشاندہی اُن کے لئے سب سے کھلا ہوا ثبوت تھی مگر یہاں نہ تو یہود اُن کی قبر کا پتہ نشان بتا سکتے ہیں اور نہ اس بارے میں نصاریٰ کے پاس ہی کوئی صحیح علم ہے ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان جو مدت ہے وہ تقریباً چھ سو سال کی مدت ہے یہ اتنی طویل مدت نہیں کہ اس میں کسی ایسی اولوالعزم تاریخی شخصیت کی قبر اتنی لاپتہ ہو جائے کہ نہ اس کے ماننے والے بلکہ پوجنے والوں کو معلوم ہو اور نہ اُس کے دشمنوں کو اس اُمت میں نہ معلوم کتنے اولیاء اللہ گذر چکے ہیں جن کی وفات پر اس سے کہیں زیادہ کی مدت گذر چکی ہے مگر اُن کی قبریں آج تک تازہ یادگاریں معلوم ہوتی ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور ان کی قبر کی ایسی گمنامی یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر اُن کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا اور نہ اُن کی قبر کا کہیں نشان بتایا۔ درانحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے زیر بحث چل رہے تھے اس کے برعکس فرمایا تو یہ کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے اور ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی اور قبر بتائی تو مستقبل بعید میں اپنے پہلو کے قریب مدینہ طیبہ میں۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقعہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً ان کا کھانا کھانا کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ۔ مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے واضح ثبوت تھا یعنی یہ کہ وہ مر چکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔ اور کبھی آپ کی زبان مبارک سے یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے۔ پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ بارہا عیسائیوں کے ساتھ آپ کے مکالمات ہوئے ہیں۔ پھر اس تحقیقاتی دور میں جہاں جبل ایورسٹ (Evarest) پر رسائی ہو چکی ہو' فرعون کی لاش دستیاب ہو چکی ہو اور سفینہ نوح علیہ السلام کے نشانات معلوم کئے جا چکے ہوں وہاں کیا اس مقدس رسول کی قبر مخفی رہ سکتی تھی۔ ان حالات میں بھی اگر اپنی جانب سے ہم ان کی موت اور قبر کی نشاندہی کے مدعی بنتے ہیں تو تاریخی دنیا میں اُس کی کیا قدرومنزلت سمجھی جا سکتی ہے۔

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی تو نصاریٰ اور اہل اسلام خاص طور پر ان ہی کی حیات کے قائل کیوں ہیں ✻ یہاں تھوڑا سا غور اس پر بھی کر لینا چاہیے کہ اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو پھر تمام انبیاء علیہم السلام میں سے ایک ان ہی کی خصوصیت کیا تھی کہ ان ہی کے معاملہ میں نصاریٰ سے لے کر اہل اسلام تک اُن کی حیات اور اُن کے نزول کے تسلسل کے ساتھ قائل چلے آ رہے ہیں۔ چلئے نصاریٰ اگر اپنی فرط عقیدت سے کسی بے اصل بات کا دعویٰ کر ڈالیں تو جائے تعجب نہیں مگر یہاں ان علماء اسلام کے لئے اس کا کیا محل ہو سکتا تھا جو ہمیشہ تردید الوہیت میں سرگرم رہے ہیں بلکہ اس

سلسلہ میں کسی کے قلم سے ایسے کلمات بھی نکل گئے ہیں کہ اگر کہیں اتنی بڑی تہمت اُن کے سر نہ رکھی جاتی تو وہ کلمات ہرگز ان کے زیر قلم نہ آ سکتے تھے- پھر کسی غلطی کا اگر امکان تھا تو چلئے یہ کسی خاص فرد میں ہوسکتا تھا لیکن جمہور امت اور صحابہ و تابعین پھر ائمہ دین اور مفسرین و شارحین سب ہی کا ایک بدیہی البطلان غلطی پر متفق ہو جانا یہ کیونکر قرین قیاس مانا جا سکتا ہے- چلئے اگر یہ مسئلہ الٰہیات کے دقیق مسائل یا حیاتِ برزخی کے بالاتر از فہم کیفیات کی طرح کوئی باریک مسئلہ ہوتا تو بھی کسی غلط فہمی کا امکان تھا مگر ایک شخص کی موت و حیات کا مسئلہ تو کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہ تھا جس کے فہم میں کوئی دشواری تھی یا اس میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش تھی یہ تو عام انسانوں سے لے کر انبیاء علیہم السلام کی جماعت تک کی ایک عام سنت بشری تھی پھر انبیاء علیہم السلام کی تمام جماعت میں سے ان ہی کی موت میں غلط فہمی کیوں پیدا ہوگئی اور حیرت در حیرت یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صاف نہ ہوسکی بلکہ اور مستحکم ہوتی رہی- پس اگر حقیقت حال یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے تو پھر کسی تاریخ سے یہ ثبوت پیش کرنا لازم ہوگا کہ کم از کم مسلمانوں میں اس کے خلاف ان کی حیات کے عقیدہ کی بنیاد کب سے پڑی لیکن یہاں تو ہم جتنا صحابہ و تابعین اور اُن سے اوپر احادیث مرفوعہ کی طرف نظر کرتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی ہم کو رفع و نزول کا ثبوت اور بہم پہنچتا چلا جاتا ہے اور اس کے برعکس آخر میں موت کے عقیدہ کی بدعت سیئہ جس کسی فرد نے ایجاد کی ہے تاریخ انگلی رکھ کر اس کا نام و نشان بتاتی ہے اور ہمیشہ اس کو مسلمانوں کے خلاف عقیدہ کا شخص شمار کرتی ہے حتیٰ کہ اس مدت میں جو مدعی مسیحیت گذرے ہیں وہ بھی اپنے دعویٰ سے قبل تمام عمر اس بارے میں عام امت کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ جب زمین ہموار ہوگئی اور انہوں نے خود مسیح ہونے کا دعویٰ شروع کیا تو پھر جس عقیدہ پر اُن کی ساری عمر گذری تھی اسی کو انہوں نے مشرکانہ عقیدہ ٹھہرا دیا بلکہ اس سے بڑھ کر اس مضمون کی صحیح سے صحیح حدیثوں کے متعلق ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے مکروہ ترین الفاظ بھی لکھ مارے ہوں- كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر وفات پا چکے ہیں تو اُن کے متعلق قرآن و حدیث میں کہیں موت کا صاف لفظ کیوں نہیں

✻ اس مقام پر دقیقہ بھی قابل فروگذاشت نہیں ہے کہ ایک انسان کی موت کا واقعہ کونسا پیچیدہ واقعہ ہے جس کے بیان کرنے میں ایک معمولی سے معمولی انسان کو بھی کوئی دشواری ہوسکتی ہے اگر قرآن کریم کسی ایک جگہ بھی صراحت کے ساتھ یہ لفظ فرما دیتا کہ ''ان عیسٰی مات'' یعنی عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں تو بس اسی ایک لفظ سے ساری بحثیں ختم ہو جاتیں اور بے وجہ لفظ توفی پر دفتر کے دفتر خرچ کر کے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی کہ توفی لغت عرب میں موت کے ہم معنی ہے- افسوس ہے کہ لفظ توفی کے موت کے معنی میں ثابت کرنے کے لئے تو عمریں صرف کی گئیں مگر اس پر بھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہ کیا گیا کہ جب عربی زبان میں موت کے لئے دوسرا صاف لفظ موجود تھا تو پھر یہاں موضع اختلاف میں اس صاف اور سیدھے لفظ کو چھوڑ کر ایسے مشتبہ لفظ کو کیوں اختیار کیا گیا ہے جو بڑی کاوشوں کے بعد بھی موت میں منحصر نہیں ہوسکتا بالخصوص جبکہ عیسائی یہ ڈنکہ بجا رہے ہوں کہ وہ اللہ تھے والعیاذ باللہ تو کیا یہ بات سیدھی اور صاف نہ تھی کہ اللہ کا سب سے پہلا نام ''اَلْحَیُّ'' ہے اور عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں- سورۂ آل عمران میں جو نصاریٰ ہی کی تردید کے لئے اُتری اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو ''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' کہہ کر

ان کی تردید کی گئی مگر ساری سورت میں ایک بار بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں موت کا لفظ نہ بولا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ عام انسانوں کی موت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ٭ یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ صرف عام انسانوں کی موت پر قیاس کر کے طے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عام انسانوں کی حیات وموت سے قومی تاریخ یا مذہبی عقیدہ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے یہاں طویل گمشدگی کو بھی موت کا قرینہ بنالیا جاتا ہے لیکن ایک ایسے اولوالعزم نبی کی وفات کا مسئلہ جس کی حیات وموت کی بحث دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سے چل رہی ہو پھر جس کی حیات کے واضح اور مستحکم دلائل بھی موجود ہوں اس کو صرف عام انسانوں پر قیاس کر کے کیسے طے کیا جا سکتا ہے یہ بالکل اتنا ہی غیر معقول ہے جتنا کہ کسی ایسے زندہ شخص کی طویل گمشدگی سے اس کی موت کا حکم لگا دینا جس کی حیات کی شہادت معتمد اخبارات کے ذریعہ بھی اور خود اُس کے بیانات سے بھی مسلسل موصول ہو رہی ہو یہاں کوئی عاقل ایسا نہیں ہوگا جو ان حالات میں صرف اس کی مدت سفر کے غیر معمولی طوالت کی وجہ سے اس کے ترکہ تقسیم کا دعویٰ کسی عدالت میں دائر کر سکے اور نہ کوئی عدالت یہاں اُس کی وراثت کی تقسیم کا حکم دے سکتی ہے۔

خوب یاد رکھو جہاں کوئی معاملہ خاص دلائل کی روشنی میں پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے وہاں صرف عام قیاسات سے کوئی حکم لگانا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ مثلاً آج جبکہ فرعون کی لاش پختہ ثبوت کے ساتھ دریافت ہو چکی ہے تو اب محض اس بناء پر اس کا انکار کرنا کہ ایک غرق شدہ لاش کا وہ بھی سینکڑوں سال کے بعد صحیح وسالم برآمد ہونا چونکہ عام دستور کے خلاف ہے اس لئے فرعون کی لاش کا برآمد ہونا بھی قابل تسلیم نہیں یا قابل یقین نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس قیاس کی عقل وتاریخ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا مسئلہ بھی ہے۔ یہاں صرف عام قیاسات اور عام دلائل پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُن کا معاملہ قرآن وحدیث کے واضح سے واضح اور مستقل طور پر علیحدہ بیان میں آ چکا ہے۔

حیات وموت کا مسئلہ دنیا کے عام واقعات میں شامل ہے پھر قرآن وحدیث میں اس کی اہمیت کیوں ہے ٭ اس امر پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ حیات وموت دنیا کے عام واقعات میں شامل ہیں بہت سے انبیاء علیہم السلام فوت ہوئے اور بہت سے نااہل اُمتوں کے ہاتھوں شہید بھی ہوئے اسی طرح مستقبل میں بہت سے مبارک اور نامبارک افراد واشخاص کے ظہور کی پیشگوئیاں کی گئی ہیں مگر آخر ان سب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اور اُن کی حیات کے مسئلہ کی اہمیت کیا تھی کہ کتب سابقہ سے لے کر قرآن کریم تک نے اس کے بیان وایضاح کا اہتمام کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار اُن کے متعلق نزول کی پیشگوئی فرمائی اور اس کی اتنی تفصیلات فرمائی ہیں جتنی کہ کسی اور دوسرے شخص کے متعلق نہیں فرمائیں۔ یقیناً اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کا تعلق آئندہ زمانہ سے ابھی باقی ہے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح فوت ہو چکے ہوتے تو جس طرح اُن کی موت اور سوانح موت کی تفصیلات سے سکوت اختیار کر لیا گیا تھا۔ یہاں بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا مگر چونکہ اُن کو ابھی دوبارہ تشریف لانا باقی تھا اس لئے آپ نے اُن کی آمد کی تفصیلات کا خاص اہتمام فرمایا ہے تاکہ جن کے متعلق پہلی بار دو بڑی قومیں گمراہ ہو چکی تھی دوسری بار اب وہ اپنی اپنی غلطیوں کو صاف طور پر سمجھ جائیں اور اجتماعی حیثیت سے جس طرح وہ

پہلی بار کفر پر جمع ہوگئی تھیں اس مرتبہ ایمان پر جمع ہوسکیں اور و ان من اھل الکتاب الا لیؤمن بہ قبل موتہ کی پیشگوئی پوری آب وتاب سے پوری ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح اور شافی بیان جس طرح کہ اس امت پر ایک احسان عظیم ہے اسی طرح دوسری امتوں پر بھی ہے کہ اُن کو صرف آپ کے طفیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح معرفت اور ان پر صحیح ایمان کا سامان میسر آ گیا اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و برتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مسائل جو آج تک اُلجھے ہوئے چلے آ رہے تھے وہ آپ کے دور میں کس طرح سلجھتے چلے جا رہے ہیں۔

نافہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن کی پہلی آمد امتوں کے فتنے کا موجب بنی اُن کی دوسری آمد سے ہدایت کی کیا توقع ہوسکتی ہے اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس کی ذمہ داری اگر تمام تر اُمتوں پر عائد ہوتی ہے تو اُن کی دوبارہ آمد میں خطرہ کیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خود اُن ہی پر عائد ہے والعیاذ باللہ تو یہ براہ راست خدا کے ایک معصوم رسول پر حملہ ہے اور صحیح معنی میں یہود کی اتباع ہے ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ اُن کی دوبارہ تشریف آوری درحقیقت اسی عمیق حکمت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ بات عالم آشکار کر دی جائے کہ جن کو جماعتوں نے مرکز ضلالت ٹھہرایا تھا یہ ان کی شقاوت تھی درحقیقت وہ مرکز ہدایت تھے اور اس طرح جہاں ایک طرف اُن کی بزرگی ثابت ہو دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان بھی ظاہر ہو۔ کہ اب جو جہان بھر کے نافہم تھے وہ آپ کے دور میں کتنے بافہم تھے وہ آپ کے دور میں کتنے بافہم بن چکے ہیں۔

خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ نزول کی اہمیت ✵ یہ امر بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے تو حدیثوں میں نزول کی پیشگوئی خاص اسی نام و نسبت کے شخص کے متعلق کیوں کی گئی ہے اور کیوں صاف طور پر دنیا کے دستور کے موافق اُس کا وہی نام ذکر نہیں کیا گیا جو اس کا اصل نام تھا نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ کسی ایک حدیث میں ان کے متعلق ولادت کا سیدھا لفظ کیوں نہیں فرما دیا گیا تا کہ یہ بات صاف ہو جاتی کہ جو شخص آئندہ آنے والا ہے وہ عام انسانوں کی طرح کسی وقت پیدا ہوگا اور وہ مسیح اسرائیل نہیں بلکہ کوئی اور دوسرا انسان ہے بالخصوص جبکہ امام مہدی اور دجال جو بھی مبارک و نامبارک انسان آئندہ ظاہر ہونے والے تھے اُن کے حق میں ولادت ہی کا صاف لفظ بولا گیا ہے اور اُن کی وہی نام و نسبتیں ذکر فرمائی گئی ہیں جو اُن کی اصل نام و نسبتیں تھیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر مسیح ابن مریم درحقیقت فوت ہو چکے تھے اور ان کی بجائے کوئی اور شخص ان کا ہمرنگ اس اُمت میں پیدا ہونے والا تھا تو اُس کے حق میں کہیں ولادت کا لفظ بولا نہ جاتا اور کسی ایک حدیث میں اس کے اصل نام و نسبت کی تصریح نہ کی جاتی اور کہیں اُس کے اصل شہر اور محل پیدائش کا پتہ بتایا نہ جاتا بلکہ ہر ہر مقام پر وہی نام و نسبت وہی شہر وہی تمام صفات اور وہی حلیہ ذکر کیا جاتا جو درحقیقت مسیح اسرائیل کا تھا۔ کیا جس نام و نسبت والے شخص کے متعلق عیسائی قوم دوبارہ آمد کا انتظار کر رہی تھی اسی نام و نسبت والے شخص کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کر کے عیسائیوں کی کھلے طور پر تائید کرنی نہیں ہے اس انداز بیان کا مطلب ایک سیدھی بات کو اور اُلجھاؤ دینا اور ہدایت کی بجائے اور گمراہی میں مبتلا کرنا ہے والعیاذ باللہ۔ پس اگر صرف اسی ایک بات پر غور کر لیا جاتا کہ حدیثوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار کیوں نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کیوں ایک مرتبہ بھی ولادت کا لفظ نہیں بولا گیا اور

کیوں تمام مقامات پر اُسی اسرائیلی رسول بزرگ کے نام نسبت اور شکل وشمائل کو ذکر کیا گیا ہے اور کیوں اس کا اصل نام ونسبت ذکر نہیں کیا گیا تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی کہ یقیناً وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں جو ایک بار پہلے آ چکے ہیں اور وہ زندہ ہیں اور آئندہ زمانہ میں اُن کو نازل ہونا ہے۔ حدیثوں کے اس واضح بیان کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں حدیثوں کی تاویل کرنا اور اُن کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک پیدا ہونے والا انسان شمار کرنا ٹھیک اسی طرح تحریف ہوگا جیسا امام مہدی علیہ السلام یا دجال کے بارے میں ولادت کے صاف لفظ مذکور ہو جانے کے باوجود یہ دعویٰ کرنا کہ امام مہدی علیہ السلام اور دجال بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان سے نازل ہوں گے پس جس طرح امام مہدی علیہ السلام کے حق میں اُن کے نزول کی بجائے اُمت کو اُن کی ولادت ہی کا انتظار ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان کی پیدائش کے بجائے اُن کے اترنے کا انتظار ہونا چاہیے۔ ہم کو اس کا کوئی حق نہیں کہ حدیثوں میں جہاں صاف طور پر نزول کا صاف لفظ آ چکا ہے وہاں اُس کے معنے ولادت کے اور جہاں ولادت کا صاف لفظ وارد ہے اس کے معنی نزول کے کر ڈالیں۔

<u>غیر موقت پیشگوئیوں کا انکار یا تاویل دونوں خطرناک اقدام ہیں</u> ⁕ جو پیشگوئیاں موقت نہیں ہیں ان کے متعلق بل از وقت تھک کر یہ کہنا کہ مسلمانوں کا مسیح ومہدی جب آج بھی نہ آیا تو آخر کب آئے گا بالکل کفار کے اس قول کے مشابہ ہے جو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں قیامت کے بارے میں کہا تھا ﴿وَ يَقُولُونَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُونَ قَرِيبًا﴾

حقیقت یہ ہے کہ اسلام چونکہ قیامت تک باقی رہنے والا مذہب ہے اس لئے اس کی پیشگوئی کا دامن بھی قیامت تک وسیع رہنا چاہیے بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پوری ہو چکیں پھر کچھ حصہ ہے صحابہ کے زمانہ میں پورا ہوا اس کے بعد اسی طرح ہر دور میں اُن کا ایک ایک حصہ پورا ہوتا رہا حتیٰ کہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کا کوئی دور خالی نہیں گذرا جس میں آپ کی پیشگوئی کا کوئی نہ کوئی حصہ آنکھوں کے سامنے نہ آتا رہا ہو۔ ۴۷ء میں ہنگاموں کی سرگذشت بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اگر آپ کو پڑھنی ہو تو آپ اُن الفاظ میں پڑھ لیجئے جو صحیح مسلم میں موجود ہیں ''ایک زمانہ آئے گا جس میں ایسی جنگ ہوگی کہ قاتل کو یہ بحث نہ ہوگی کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور مقتول کو یہ علم نہ ہوگا کہ وہ کس جرم میں قتل کیا جا رہا ہے''۔ ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان ہنگاموں میں قتل کا یہی نقشہ تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان اور ایک جماعت دوسری جماعت کے قتل کے درپے تھی اور کسی کو اس تحقیق کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ اُس کے موافق ہے یا مخالف۔ قتل کرنے والا کس گناہ میں دوسرے کو قتل کر رہا ہے اور مقتول کیوں مفت مارا جا رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی پیشگوئیوں کو صرف گذشتہ زمانہ میں ختم کر دینا اور مستقبل میں پوری ہونے والی پیشگوئیوں کا قبل از وقت انتظار کر کر کے تھک جانا اور ان کے انکار پر آمادہ ہو جانا درحقیقت یہ آپ کی عموم بعثت کا انکار ہے کیونکہ اگر آپ کی بعثت قیامت تک کے لئے ہے تو پھر اس کی صداقت کے نشانات بھی دُنیا کے ہر دور کے انسان کے سامنے آنے چاہئیں اسی لئے قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کی سب پیشگوئیاں آپ ہی کی حیات طیبہ میں پوری ہوں گی۔ بلکہ بعض یعنی کچھ کا لفظ فرمایا۔

﴿فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ﴾ (یونس : ۱۱)

﴿وَ اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ وَ اِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ﴾ (غافر: ۲۴)

اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی آپ قبل از وقت انتظار کر کے خود بخود تھک جائیں اور پھر صریح حدیثوں کی ایسی ایسی تاویلیں کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں جو دُنیائے عالم میں قابل مضحکہ اور سارے دین میں شبہ کا باعث بن جائیں کیونکہ جب دین کے ان واضح الفاظ کی یہ حقیقت ثابت ہو تو پھر کیا اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ ذات وصفات اور حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے واضح الفاظ کی صحیح حقیقتیں کیا ہوں گی اور اس طرح پورے کے پورے دین پر کیا اطمینان باقی رہ سکتا ہے۔

قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا ٭ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور مقتول نہ ہونے کا تذکرہ صرف یہود کے اسباب لعنت کے بیان کے ضمن میں آ گیا ہے اس ضمن میں قرآن شریف نے یہ نقل کیا ہے کہ یہود واقع کے خلاف اُن کے قتل کرنے کے مدعی ہیں اور نصاریٰ گو بہت سے بے تحقیق باتیں بناتے ہیں مگر اجمالاً اُن کے رفع کے قائل ہیں اس لئے یہاں قابل توجہ صرف یہی مسئلہ تھا کہ وہ مقتول ہوئے یا نہیں اور اگر مقتول نہیں ہوئے تو آسمان پر اُٹھائے گئے یا نہیں رہا اُن کے نزول کا مسئلہ تو وہ کسی مقام پر بھی زیر بحث نہیں آیا۔ پھر ہم کو کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ نزول یا عدم نزول کا مسئلہ کبھی اہل کتاب نے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ لہٰذا جب یہ مسئلہ کہیں آپ کے سامنے زیر بحث ہی نہیں آیا اور نہ قرآن کریم ہی کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو اب صراحت کے ساتھ نزول کا لفظ ذکر ہوتا تو کیسے ہوتا ہاں اگر نزول کا مسئلہ بھی اس وقت کہیں زیر بحث آ جاتا تو جس طرح یہاں رفع کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور ہوا تھا نزول کا لفظ بھی یقیناً اسی طرح صراحت کے ساتھ ذکر ہو جاتا لیکن جب یہ مسئلہ کہیں زیر بحث آیا ہی نہیں تو اب قرآن کریم میں صراحت لفظ نزول کا مطالبہ کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے اور اگر بالفرض یہ لفظ مذکور ہو بھی جاتا ہے جب بھی حیلہ جو طبیعتوں کو فائدہ کیا تھا؟ آخر صحیح سے صحیح حدیثوں میں یہ لفظ بار بار آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قسموں کے ساتھ آیا مگر پھر اُن کو کیا فائدہ ہوا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یعنی آمد ثانی کا مسئلہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو مگر اس وقت وہ زیر بحث ہی نہ تھا۔ ہاں قومی تاریخ کے لحاظ سے جو فرقہ اُن کے رفع جسمانی کا قائل تھا وہ اُن کی آمد ثانی کا بھی منتظر تھا اور اب تک ہے اور جو اُن کے قتل کا مدعی تھا اُن کے نزدیک اُن کی آمد ثانی محل بحث ہی کیا ہو سکتی تھی پس اگر یہاں قرآنی فیصلہ اُن کے رفع کا ہو جاتا ہے تو اُن کے نزول کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اگر تحقیق یہ ہو کہ وہ مقتول ہوں گئے (والعیاذ باللہ) تو پھر ایک شخص کے دوبارہ آمد کی بحث ہی پیدا نہیں ہو سکتی لہٰذا اگر قرآن کریم کی کسی آیت میں رفع کے صاف لفظ کی طرح نزول کا لفظ مذکور نہیں تو اس سے مسئلہ نزول کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا پھر خاص نزول کا لفظ مذکور ہونا ہی کیوں ضروری ہے جبکہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابھی وفات نہیں پائی اور قیامت سے پہلے تمام اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے اور ابھی تک اُس کو موت نہیں آئی ضرور ہے کہ وہ زمین پر نازل ہوتا کہ اہل کتاب اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اُن پر ایمان لے آئیں اور وہ اپنی مقررہ مدتِ عمر پوری کر کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے وفات پا کر مدفون ہو۔ اس

لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث روایت کر کے فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کے الفاظ میں دیکھنا چاہو تو سورۂ نساء کی یہ آیت پڑھ لو۔ ﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ﴾

آیت بالا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے جو سب سے زیادہ صاف اور واضح لفظ ہو سکتا تھا وہ **قَبۡلَ مَوۡتِهٖ** کا لفظ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جس زندہ شخص کی اب تک وفات ثابت نہیں ہوئی اُس کی حیات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں جو شخص اُن کی موت کا مدعی ہو یہ فرض اُس کا ہے کہ وہ اُن کی موت ثابت کرے۔ پھر آیتِ بالا میں خاص اہل کتاب کے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کو اُن پر اس وقت بھی صحیح ایمان حاصل ہے لہٰذا جن کا ایمان لانا قابل ذکر ہو سکتا تھا وہ صرف اہل کتاب کا ایمان ہے اب اگر فرض کر لو کہ اہل اسلام بھی نصاریٰ کی طرح اُن کے سولی پر چڑھنے کو تسلیم کرتے ہوں یا یہود کی طرح اُن کے مردہ ہونے کے قائل ہوں تو پھر اہل اسلام کا ایمان بھی اُن پر صحیح ایمان نہیں رہتا اہل کتاب اگر اس بارے میں ایک غلطی پر ہیں تو اہل اسلام بھی دوسرے اعتبار سے غلطی میں مبتلا ہیں پھر اس تخصیص کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے جہاں اُن کی موت کی صاف نفی فرما کر یہ بتایا ہے کہ ابھی آئندہ زمانہ میں اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اسی طرح دوسری طرف یہ بھی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن پر شہادت دینا باقی ہے ان دونوں باتوں کے لئے اُن کی تشریف آوری لازم ہے کیونکہ شہادت شہود سے مشتق ہے لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام جب تک کہ پھر تشریف لا کر ان میں موجود نہ ہوں اُن پر گواہی کیسے دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے ﴿وَ كُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ فِيۡهِمۡ فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِىۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ﴾ (المائدہ: ۱۱۷) یعنی میں اُن پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں موجود رہا اور جب تو نے مجھ کو اُٹھا لیا تو تو ہی اُن کا نگران حال تھا۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دو زمانے گذرے ہیں ان میں سے آپ کی شہادت کا زمانہ صرف وہ ہے جس میں کہ آپ اُن کے اندر موجود تھے اور دوسرا زمانہ جس میں کہ آپ اُن میں موجود نہ تھے وہ آپ کی شہادت سے خارج ہے پس آئندہ اہل کتاب پر آپ کی شہادت کے لئے دوبارہ آپ کی تشریف آوری ضروری ٹھہری۔ اسی لئے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی دلیل فرماتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ صحابی جلیل القدر تو نزول کی پیشگوئی کو قرآنی پیشگوئی کہتا ہے ایک بدنصیب جماعت وہ ہے جو اس کو حدیثی پیشگوئی بھی کہنے کو تیار نہیں۔

وَ مَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ

قرآن کریم کے رفع جسمانی اور حدیث کے نزولِ جسمانی کے اہتمام فرمانے کی حکمت

* حجیت حدیث کے مضمون میں ہم یہ بات پوری وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ حدیث و قرآن کے مابین متن و شرح کی سی نسبت ہے۔ آیاتِ قرآنیہ اور تشریحاتِ حدیثیہ پر آپ جتنا غور کرتے چلے جائیں گے یہ حقیقت آپ کو اتنی ہی روشن ہوتی چلی جائے گی اسی لئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جہاں کہیں قرآن کریم کسی مصلحت کے پیش نظر کسی مسئلہ کا ایک پہلو اپنے بیان میں لے لیتا ہے تو فوراً اُس کا دوسرا پہلو حدیث لے لیتی ہے اور اس طرح مسئلہ کے دونوں پہلو صاف ہوتے چلے جاتے ہیں اور درحقیقت حدیث کے بیان کہلانے کا

منشا بھی یہی ہے- مثلاً جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے صف رجال میں ایک تباہ کن فاحشہ کی بنیاد ڈالی تو قرآن کریم نے اس عمل کی حرمت کا تذکرہ بھی صرف رجال یعنی مردوں ہی میں فرمایا اور صنف نساء میں بے وجہ اس عمل کی حرمت پر زور دینا اپنے انداز بلاغت کے خلاف سمجھا- ظاہر ہے کہ جب اس ماحول میں اس نوع کا وجود ہی نہ ہوتو پھر اُس کا تذکرہ کر کے خواہ مخواہ ذہنوں کو اس طرف متوجہ کیوں کیا جائے لیکن چونکہ شرعی نظر میں ان دونوں عملوں کی حرمت یکساں تھی اس لئے حدیث نے صنف نساء میں اس کی حرمت کا اسی شدومد سے اعلان کیا جس طرح کہ قرآن کریم نے صنف رجال میں اس کی حرمت کا اعلان کیا تھا اور اس طرح دونوں صنفوں کے احکام وضاحت سے ہمارے سامنے آ گئے- ہمارے اس بیان سے یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ اس عمل کے حرمت کی قرآن کریم میں صنف رجال کی تخصیص اور حدیث میں صنف نساء کی تخصیص کا سبب کیا ہے اسی طرح ساوی عذر کے ایام میں صنف نساء کے ساتھ حدود اعتزال اور اختلاط کا مسئلہ ہے یعنی اس زمانہ میں عورتوں سے کس حد تک الگ رہنا چاہیے اور کہاں تک اُن سے اختلاط رکھا جا سکتا ہے- یہاں یہود نے تو اجتناب نجاسات کے باب میں اتنا مبالغہ کر رکھا تھا کہ ان ایام میں وہ اپنے گھروں میں بھی داخل نہ ہوتے تھے اور نصاریٰ نے اتنی لاپرواہی اختیار کر لی تھی کہ نجاسات سے اجتناب کرنے کا ان کے ہاں باب ہی ندارد تھا- دیکھو الجواب الصحیح ج ا ص ۲۳۲) جب اس مسئلہ کے متعلق آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا تو چونکہ یہاں قرآن کریم نے اپنے بیان میں اعتزال کا پہلو لے لیا تھا اور یہی ضعف بشریٰ کے مناسب بھی تھا اور صاف فرما دیا تھا کہ ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ ان ایام میں عورتوں سے الگ رہو- تو اس کے جواب میں آپ نے اپنے قول وعمل سے فوراً حدود اختلاط بیان فرما دیئے- صحیح مسلم میں ہے کہ جب آیت ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ نازل ہوئی تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿اصنعوا کل شیء الا النکاح﴾ یعنی ان ایام میں ہم بستری کے علاوہ سب کچھ جائز ہے- اب اندازہ فرمایئے کہ قرآن کریم نے تو لفظ اعتزال کا فرمایا تھا پھر آپ نے اُس کی تشریح میں حدود اختلاط کیوں بیان فرمائیں- حقیقت یہ ہے کہ حدود اعتزال اس وقت تک معین ہی نہیں ہو سکتی تھیں جب تک کہ حدود اختلاط بیان میں نہ آ جائیں- و بضدھا تتبین الاشیاء لہٰذا یہاں وہ حدیثیں جو ان ایام میں امہات المؤمنین کے ساتھ آپ کے اختلاط کے متعلق روایت کی گئی ہیں اسی روشنی میں پڑھنی چاہئیں تا کہ یہ بات پورے طور پر حل ہو جائے کہ ان میں آپ نے اس تاکید کے ساتھ اُس کی عملی وضاحت کی کیا ضرورت سمجھی تھی- غرض جہاں بھی قرآن کریم نے مسئلہ کے عموم کے باوجود کسی وقتی مصلحت سے اس کا ایک پہلو بیان میں لے لیا ہے وہاں اس کا دوسرا پہلو فوراً حدیث نے لے لیا ہے اور درحقیقت حدیث کے بیان ہونے کا یہی منشاء بھی ہے- اسی مقام سے حدیث کی اہمیت اور اُس کی ضرورت کا اندازہ کر لینا چاہیے-

اس مقدمہ کے ذہن نشین کر لینے کے بعد جب آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معاملہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا مسئلہ وضاحت سے آ چکا تھا تو یہاں حدیث کا فرض بھی ہونا چاہئے کہ وہ اسی ضابطہ کے ماتحت رفع کے بعد نزول کا مسئلہ جو اُس کا دوسرا پہلو ہے پورے طور پر روشن کر دے اسی لئے نزول کا دوسرا پہلو حدیثوں میں اتنی تفصیل و تاکید سے قسمیں کھا کھا کر بیان کیا اور اس کو مختلف صحابہ اور مختلف مجلسوں میں پیرایہ بہ پیرایہ اتنا واضح فرما

دیا کہ ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں کسی شبہ کا محل باقی نہیں رہا- دوسری طرف قرآن کریم کے لفظ رفع کی ایسی تشریح ہوگئی کہ اب اس میں ادنیٰ سا ابہام بھی باقی نہ رہا- اب آپ قرآنی لفظ رفع اور حدیث کے لفظ نزول کو جتنا ملا ملا کر پڑھیں گے اتنا ہی اُن کے رفع جسمانی اور نزول جسمانی کا مسئلہ آپ کے سامنے کھلتا چلا جائے گا- کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص جسم کے ساتھ اترے گا وہ یقیناً جسم ہی کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اور جو جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اس کو یقیناً دوبارہ اپنے جسم ہی کے ساتھ اترنا چاہئے-

اب یہ عقیدہ بھی حل ہوگیا کہ حدیثوں میں جس کثرت کے ساتھ نزول کا تذکرہ ملتا ہے اس کثرت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا اور اسی طرح قرآن کریم میں جس صراحت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ ملتا ہے اس صراحت کے ساتھ نزول کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا- حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کریم ان کے رفع کی تصریح فرما چکا تھا تو اب حدیث کی نظر میں یہ مسئلہ تو ایک طے شدہ مسئلہ تھا اس کے تکرار کی ضرورت کیا تھی اس لئے حدیثوں میں اس کے دوسرے پہلو پر یعنی نزول پر زور دیا گیا ہے اور اسی پہلو پر زور دینا مناسب بھی تھا-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جتنی تفصیلات ثابت ہوچکیں کیا اسکے بعد بھی یہاں تاویل کرنا معقول ہے ✽ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ ہر ممکن تشریح کے ساتھ معرض بیان میں آچکا ہے یعنی آپ کا اسم مبارک آپ کا نام ونسب اور اس خاص نسب نامہ کی خصوصیت یعنی صرف ماں سے آپ کی پیدائش آپ کا حلیہ مبارک' اس شہر کا نام جہاں آپ کا نزول ہوگا اور پھر خاص اس جگہ کا نام بھی جہاں آپ کا نزول ہوگا' نزول کا وقت اور اس وقت آپ کا مکمل نقشہ نزول کے بعد پہلی نماز میں آپ کا امام یا مقتدی ہونا' آپ کا منصب' آپ کی خدماتِ مفوضہ' آپ کی مدت قیام' آپ کے دور کی محیر العقول فراوانی اور عدل وانصاف' آپ کی زندگی کے اہم کارنامے' آپ کی شادی کرنا اور اولاد ہونا حتیٰ کہ آپ کا وفات پانا اور آپ کے مدفن کی مکمل تحقیق- اب انصاف سے فرمائیے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے آپ کو اور کن تفصیلات کا انتظار ہے- اب سوال یہ ہے کہ کسی واقعہ کی تعیین و تشریح کے لئے اس سے زیادہ آخر اور کیا طریق اختیار کیا جائے- آج دنیوی مقدمات میں صرف مدعی اور مدعی علیہ اور اُن کے باپ دادوں کے نام ان کی تعیین کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں اور آئندہ ہم قدمہ کی تمام کارروائی اسی معین شدہ شخص سے متعلق سمجھی جاتی ہے اسی طرح خطوط' بیمے' منی آرڈر اور رجسٹریاں وغیرہ صرف شہر اور اس شخص کے نام لکھ دینے سے اس کو تقسیم کردی جاتی ہیں حیرت ہے کہ جب دنیا کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ میں معمولی درجہ کی تعیین کافی سمجھی جاتی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اتنی مفصل تاریخ کیوں ناکافی ہے- اچھا فرض کر لیجئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ آپ خود اپنی عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو آخر آپ وہ اور کس طرح ادا کریں گے کہ اس کے بعد اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے- اگر درحقیقت اس پیشگوئی کا مصداق رسول اسرائیل کی بجائے خود اسی امت کا کوئی فرد ہو جو اسی امت میں پیدا ہونے والا ہو جس کا نہ یہ نام ہو نہ یہ نسب نامہ نہ یہ حلیہ نہ یہ جائے نزول نہ یہ منصب اور نہ یہ کارنامے تو کیا اس بیان کو ایسے شخص کے حق میں ایک گمراہ کن بیان نہ کہا جائے گا- کیا آج کسی شخص کی پیدائش کا معمولی مسئلہ کوئی ادنیٰ زبان داں شخص بیان کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اسی طرح اس کو مجاز و استعارہ کی بھول بھلیاں میں ادا کرے گا چہ جائے کہ ایک رسول اور رسول بھی وہ جو افصح العرب والعجم ہو پس اگر دنیوی معاملات میں

بادشاہوں سے لے کر فقراء اور اولیاء سے لے کر رسولوں تک کی پیدائش کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کئے جاتے تو پھر مجاز و استعارہ کی یہ ساری رام کہانی خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے بارے میں کیوں گائی جاتی ہے-

حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم لفظ رفع کا ہے توفی کا لفظ قرآن کریم کی نظر میں اتنا اہم نہیں ❋ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں سورۂ آل عمران میں تین لفظ استعمال فرمائے گئے ہیں-توفی-رفع الی اللہ اور تطہیر اور سورۂ نساء میں جہاں اُن کے مقدمہ پر خاص طور پر بحث کی گئی ہے وہاں صرف رفع الی اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان تینوں الفاظ میں تطہیر کا لفظ توفی و رفع کے تابع ہے کیونکہ کفار سے ان کی تطہیر کا مقصد ان سے ان کی علیحدگی تھی اب وہ خواہ کسی صورت سے بھی ہو اس لئے قابل بحث دو ہی لفظ ہیں-توفی - رفع الی اللہ-ان دو میں سے جس لفظ کو ان کے مقدمہ میں بصیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف لفظ رفع کا ہے جس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ توفی اور رفع کے دو وعدوں میں سے رفع کا وعدہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے پہلے پہلے پورا ہو چکا تھا اور اسی لئے اس کو بصیغہ ماضی ذکر نہیں فرمایا گیا-ہاں سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان سے توفی کا لفظ گو بصیغہ ماضی استعمال کیا گیا ہے-مگر حسب تصریح قرآن کریم وہ ان کے مقدمہ کے ذیل میں نہیں ہے بلکہ اس سوال کے جواب میں ہے جو محشر میں اُن سے ہوگا اور ظاہر ہے کہ قیامت سے قبل اُن کی موت واقع ہونا سب کو مسلم ہے لیکن جہاں قرآن کریم نے اُن کے مقدمہ پر بحث کی ہے اور اُن کے معاملہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے وہاں صرف لفظ رفع ہی استعمال فرمایا ہے اور توفی کا لفظ ذکر نہیں فرمایا جیسا کہ سورۂ نساء میں ہے-﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھالیا-اگر توفی کے معنی موت ہوتے اور اُن کی موت واقع ہو چکی ہوتی تو ضروری تھا کہ یہاں بل تَوَفَّاهُ اِلَيْهِ فرمایا جاتا-

خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن لفظ رفع کا ہے اسی لئے مقدمہ کے فیصلہ میں خاص طور پر اسی لفظ پر زور دیا گیا ہے اور توفی کے لفظ کو اہمیت نہیں دی گئی اس لئے یہاں جنھوں نے لفظ توفی کی لغوی تحقیق پر اپنا وقت خرچ کیا ہے وہ بالکل ضائع کیا ہے کیونکہ توفی خواہ کسی معنی میں بھی مستعمل ہو مگر قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی-کیا یہ امر قابل غور نہیں ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو آخر ہر مقام پر اس حقیقت کا اخفاء کیوں کیا گیا ہے اور کیوں صاف الفاظ میں یہ نہیں فرمادیا گیا-وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ مَاتَ-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آچکا ہے یہاں اُن کے معاملہ میں ایک ایک لفظ پر علیحدہ بحث کرنا معقول نہیں ❋ یہ بات بھی بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معاملہ قدرے مشترک طور پر ایک قومی تواتر رکھتا ہے-کتب سابقہ سے لے کر قرآن کریم اور احادیث نبویہ تک اُس کے جزئی جزئی واقعات کی تفصیل آچکی ہے-یہاں کتب لغت اٹھا کر صرف نزول یا صرف لفظ رفع یا صرف توفی کے الفاظ پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنی صرف ایک بے معنی بحث ہے بلکہ ایک حقیقت کے مسخ کرنے کے مترادف ہے-سیدھی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں

جتنے تفصیلی واقعات معرض بیان میں آ چکا ہیں اُن کی روشنی میں ان الفاظ کے معنی متعین کئے جائیں کیونکہ الفاظ صورت واقعہ کے بغیر ایک وسیلہ ہوتے ہیں یہاں واقعہ سے قطع نظر کر کے الفاظ میں مجاز و استعارہ کی بے وجہ بحث کھڑی کر دینی حد درجہ غیر معقول ہے۔ پس کسی لفظ کے معنی حقیقی یا مجازی متعین کرنے کے لئے صرف لغت کی عام بحث شروع کر دینی صحیح طریقہ نہیں بلکہ پہلے اُس کے استعمال کا محل اور دوسرے قرائن اور خارجی حالات پر نظر ڈالنی بھی ضروری ہے۔ مثلاً لفظ ''اسد'' عربی زبان میں اس کے معنی ''شیر'' ہیں۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عربی اردو محاورات میں ایک بہادر شخص کو بھی مجازاً شیر کہہ دیتے ہیں اب کسی سے صرف ھذا اسد کا جملہ سن کر یہی رٹ لگائے جانا کہ اس جملہ کا مقصد صرف کسی بہادر شخص کی طرف اشارہ کرنا ہے اور اس محاورہ کے لئے دوا دین عرب اور شعراء کے کلام سے استدلال کرتے چلے جانا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بسا اوقات اس کے متکلم کے لئے باعث ہلاکت بھی بن سکتی ہے' یہاں اس بحث سے پہلے یہ تحقیق کرنی ضروری ہوگی کہ یہ جملہ کس مقام پر کہا گیا ہے بستی میں یا جنگل میں کسی عام مجمع میں یا کسی بیابان میں سیاق کلام کسی کی مدح و ثنا کا ہے یا خوف و ہراس کا۔ اب اگر یہ جملہ جنگل میں کسی شخص کی زبان سے نکلتا ہے جس کے سامنے شیر کھڑا ہے اس کی آواز کانپ رہی ہے اور جسم لرز رہا ہے تو اس وقت انصاف فرمائیے کہ لفظ ''اسد'' کے مجازی معنے یعنی بہادر انسان مراد لینا اور اس کے لئے ہزاروں اشعار پڑھ ڈالنا اور یہی کہے چلے جانا کہ اس شخص کی مراد شیر نہیں بلکہ ایک بہادر انسان کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کیا ایک صحیح العقل انسان کا کام ہوسکتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر بحث معاملہ میں بھی ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے جو صحیح طریقوں سے ثابت ہیں پھر جب اس طرف بھی نظر کی جائے گی کہ قرآن و حدیث میں جو جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ الفاظ کسی دوسرے شخص کے حق میں بیک وقت آج تک استعمال نہیں کئے گئے تو یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ ان کا معاملہ ہی سب سے جداگانہ معاملہ ہے چنانچہ لفظ توفی اور رفع کا علیحدہ علیحدہ استعمال قرآن کریم میں آپ کو بہت جگہ نظر آئے گا۔ لیکن ایک ہی شخصیت کے بارے میں یہ دونوں لفظ ایک ہی سیاق میں کسی دوسری شخصیت کے متعلق آپ کو کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں یہ ہر دو لفظ اس طرح سے فرما دیئے گئے ہیں۔ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ۔ ان کے علاوہ کسی کے حق میں ان دونوں لفظوں کو جمع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نزول کا لفظ بھی محاورات میں بہت جگہ آپ کی نظروں سے گذرے گا لیکن نزول کے ساتھ رفع اور رفع کے ساتھ نزول پھر نزول کی اتنی تفصیلات کسی ایک مقام پر بھی کسی کے حق میں آپ کی نظروں سے نہیں گذریں گی نہ کسی لغت میں نہ شعراء کے کلام میں نہ کسی آیت میں اور نہ کسی حدیث میں پس جب آپ ان جملہ امور پر غور کریں گے کہ حدیث و قرآن میں جو الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں وہ کسی بشر کے لئے بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں کئے گئے تو پھر صرف ایک یہی نتیجہ بدیہی ہو کر آپ کے سامنے آ جائے گا کہ ان کا معاملہ بھی یقیناً سب سے الگ معاملہ ہے۔ یہاں ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ لے کر بحث کرنا یا اس میں مجاز و استعارہ کی آڑ لینا کتنا بے جا ہے سوال سیدھا یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں قرآن و حدیث میں بیک وقت یہ سب الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے یہ تفصیلی سوانح حیات بھی موجود ہیں کیا اس کے بعد بھی ان میں لغوی موشگافیوں اور مجاز و استعارہ کی تاویلات کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

اسلام صرف علمی مذہب نہیں بلکہ سلف صالحین سے اس کی عملی صورت بھی منقول چلی آتی ہے- لہٰذا محض کتب لغت کی حدود سے اس کی کوئی اور شکل بنالینا درست نہیں ✻ یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اسلام صرف ایک علمی مذہب نہیں ہے جس کو صرف دماغی کاوشوں نے پیدا کیا ہو بلکہ وہ ایک مجموعی شکل وصورت کے ساتھ عملاً بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے- ہمارے دین کا تمام تر تعلق اوپر سے ہے ہم نیچے سے کسی نئے دین تراشنے کے مجاز نہیں اس کے بانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے ان سے صحابہ نے اس کے شعبہ اعمال اور اس کے بنیادی عقائد بھی سیکھے آپ نے ان پر خود بھی ایمان رکھا اور ان ہی پر بعد کی امت کو ایمان رکھنے کی وصیت فرمائی اور پھر کسی درمیان انقطاع کے بغیر اسی طرح دین سپرد ہوتا رہا ہے- ادھر حفاظت الٰہیہ کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ بحث وتمحیص کا جو مرحلہ تھا وہ سب تبع تابعین کے ماحول ہی میں ختم ہو چکا تھا یہ وہ قرآن ہے جس کے متعلق خیریت کی شہادت خود لسان نبوت سے نکل چکی ہے اس لئے جب کسی دین کے مسئلہ پر بحث کی جائے تو اس کو محض دماغی کاوش اور لغت کی مدد سے سرتوشروع کردینا ایک بنیادی غلطی ہے یہاں ریسرچ کے اصول کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کام خود انبیاء علیہم السلام کا بھی نہیں اس کو قدرت نے براہ راست خود اپنے ہی دست قدرت میں رکھا ہے- ان کی بھی مجال نہیں کہ حکم ایزدی کے بغیر وہ ایک نقطہ کا اضافہ یا ایک نقطہ کی ترمیم کرسکیں چنانچہ ارشاد ہے-

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنَاتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَ نَااْئتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ.الخ (یونس:۱۵)

جب ہمارے کھلے کھلے احکام ان لوگوں کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کی امید نہیں وہ تم سے یہ فرمائش کرتے ہیں کہ اس کے سواء کوئی اور قرآن لاؤ یا کم ازکم اسی میں کچھ ردوبدل کردو ان سے کہہ دو کہ میرا تو ایسا مقدور نہیں کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی ردوبدل کرسکوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس وحی آتی ہے-

اس ترمیم وتبدیل کا انحصار کچھ الفاظ ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کے معانی کو بھی شامل ہے اور وہ لفظی ترمیم سے زیادہ شدید ہے- یہود بے بہبود نے دونوں قسموں کی تحریفیں کی تھیں تورات کے الفاظ میں بھی اور ان کے معانی میں بھی، قرآن کریم چونکہ آخری کتاب تھی اس لئے وہ دونوں قسموں کی تحریفوں سے محفوظ ہے لفظی ترمیم کا تو یہاں کوئی امکان ہی نہیں رہی معنوی ترمیم وتحریف تو امت کے بعض ملحد فرقوں نے گو اس میں یہود کو بھی مات دے دی ہے مگر اس کی معنوی حفاظت کی وجہ سے وہ اصل دین پر کچھ اثر انداز نہیں ہوگی اور ہر دور میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کیا جاتا رہا ہے پس اگر کوئی شخص آج یہ دعویٰ کرنے لگے کہ نمازیں پانچ نہیں صرف دو ہیں اور اسی کے لئے دماغی تراشیدہ دلائل کا ڈھیر لگادے تو بالکل بے سود سعی ہے اس کو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ امت اوپر سے بھی صرف دو ہی نمازیں پڑھا کرتی تھی- بلکہ اس کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ پانچ نمازوں کی فرضیت اگر غلط ہے تو پھر اس کی بنیاد کس دن سے قائم ہوئی اسی طرح مسئلہ جنت ودوزخ، فرشتے اور جنات وغیرہا کی حقیقتیں صرف لفظی بحثوں سے نئی نئی بنا کر پیش کرنی بھی غلط ہے کیونکہ یہ الفاظ جس طرح اوپر سے منقول ہوتے چلے آئے ہیں اُسی طرح اُن کے معانی بھی اوپر ہی سے مفہوم اور معلوم ہوتے چلے آئے ہیں اسی طرح ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ السلام کے الفاظ کا حال ہے یہ بھی اُمت میں ہمیشہ سے مستعمل ہوتے

چلے آئے ہیں اور ہر دور میں اس کے صرف یہی ایک معنی سمجھے گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں بنے گا اور اسی کے ساتھ یہ بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آنے والے ہیں اب ذرا اس پر غور فرمائیے کہ ایک طرف نبی کی آمد کی ممانعت بھی منقول ہے اور اسی کے ساتھ اسرائیلی رسول کی آمد بھی منقول ہے۔ اب اگر کوئی صرف اپنی دماغی کاوش سے یہ کہنے بیٹھ جائے کہ جب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تو عیسیٰ علیہ السلام بھی نہیں یا اگر عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو اور نبی بھی آئیں گے تو اس کا حاصل صرف اپنی دماغی کاوش سے ایک علمی دین بنانا ہوگا اس کو منقول شدہ دین نہیں کہا جا سکتا اور اگر فرض کرلو کہ ہمارا کہنا صحیح نہیں تو پھر آپ کو کسی تاریخ سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فلاں تاریخ سے اس غلط عقیدہ کی بنیاد قائم ہوئی ہے مگر یہاں اسلامی تاریخ تو درکنار اگر اس بارے میں دوسرے اہل مذاہب سے آپ اس امت کا عقیدہ پوچھیں تو وہ بھی کسی تردد کے بغیر آپ کو یہی بتائیں گے کہ ان کے نزدیک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا ہاں وہی عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی رسول آئیں گے اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ یہ عقیدہ خلاف قیاس ہے یا نہیں اور نزول کے اور خاتم کے لغت میں معنی کیا ہیں اور ختم نبوت اور نزول میں حروف تطبیق کیا ہے۔ بلکہ بحث صرف یہ ہے کہ امت میں ان الفاظ کے معنی کیا سمجھے جاتے رہے ہیں تو آپ صرف اسی ایک مذکورہ بالا نتیجہ پر پہنچیں گے یہی وجہ ہے کہ تفسیروں میں اور شروح حدیث میں کتب عقائد میں اور دین کے تمام معتبر لٹریچر میں اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے اور اسی حقیقت کے ماتحت ہر مدعی نبوت اور ہر مدعی مسیحیت کی تکفیر و تردید کی گئی ہے لہٰذا یہاں صرف مجاز و استعارہ یا ناتمام نقول یا مبہم یا محرف الفاظ سے کوئی ایسی حقیقت تراش لینی جو آج تک امت کے بیان کردہ حقیقت کے برعکس ہو دین محمدی کہلانے کے قابل نہیں اس کو نیا دین کہنا بجا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ آیات پر غور کرنے سے قبل یہاں ان کے مقدمہ کی پوری وہ روئداد جو قرآن کریم نے نقل فرمائی ہے اور فریقین کے بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں ❋ قرآن کریم پر غور کرنے سے قبل یہاں یہ غور کرلینا بھی ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جو مسئلہ زیر بحث آیا ہے وہ کیا مسئلہ ہے اور وہ کیوں زیر بحث آیا ہے۔ جب آپ اس طرف توجہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سورۂ نساء میں جس امر کی اہمیت محسوس کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو قوم کل تک خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی آخر کیوں یک لخت وہ اُن تمام نعمتوں سے محروم کردی گئی اور کیوں نعمتوں کی بجائے لعنت کا مورد بن گئی اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اُن کے اُن پے در پے جرائم کا ذکر کیا ہے جو ایک سے ایک بدتر تھے اور جس کی کہ یہ قوم عادی بن چکی تھی جو جرم ان کے یہاں شمار کئے گئے ہیں ان میں کچھ تو ان کے حیاناک اقوال ہیں اور کچھ زشت افعال۔ اُن کے زشت افعال میں خدا تعالیٰ کے مقدس انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا اور اُن کے احیاناک اقوال میں معصومہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان طرازی اور اُن کے ملکی صفت فرزند مطہر کے متعلق قتل کرنے کا دعویٰ کاذب ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ یہاں یہود ملعون کا بیان کیا ہے اور پھر ان بیانات ہی کی روشنی میں قرآنی فیصلہ پر غور کرنا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی حیثیت چونکہ ایک حکم اور فیصل کی ہے اس لئے ہم کو یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جس معاملہ کے متعلق قرآن کریم نے فیصلہ فرمایا ہے اس میں فریقین کے بیانات کیا نقل کئے ہیں یہاں کسی ایک حرف کا اپنی جانب سے

اضافہ کرنا جو مقدمہ کی جان ہو قرآن پر خیانت یا عجز کا بڑا اتہام ہے- یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہر عدالت کے لئے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ فریقین کے بیانات نہایت احتیاط کے ساتھ ضبط کرے اور بالخصوص جو اجزاء کسی فریق کے مقدمہ کی اصلی روح ہوں ان کو پورے طور پر واضح کردے آج بھی اگر کوئی عدالت فریقین کے بیانات قلمبند کرنے میں ایسی تقصیر کر جائے تو اس کے حق میں یہ کتنا بڑا سنگین جرم شمار ہوتا ہے پس ہمارے نزدیک جو بات یہاں صورت واقعہ کو آسانی سے حل کر دے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے ہم فریقین کے بیانات کو حاشیہ آرائی کے بغیر دیکھیں اس کے بعد کسی تاویل کے بغیر قرآنی فیصلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں- اس قامرہ کے موافق جب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ سامنے رکھتے ہیں تو جو بیان ہم کو یہاں یہود کا ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے رہا یہ کہ کس غرض سے ان کو قتل کیا ہے اور کس آلہ سے قتل کیا ہے اس کو انہوں نے نہ یہاں بیان کیا ہے اور نہ یہ باتیں اُن کے نزدیک کچھ اہم معلوم ہوتی ہیں- جس بات پر انہوں نے اپنے بیان دعویٰ میں زور دیا ہے- وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کی تشخیص وتعیین ہے دوم ان کے قتل کرنے کا پورا جزم ویقین ہے اسی لئے مقتول کے صرف نام یا لقب ہی پر انہوں نے کفایت نہیں کی بلکہ خاص طور پر ان کی خاص مادری نسبت کا بھی ذکر کیا ہے یعنی والد کے بغیر پیدائش اور اس سے بھی زیادہ یہ کہا ہے کہ یہ شخص وہی ہے جو ''رسول اللہ'' کہلاتا ہے اس کے بعد انہوں نے اپنی جس جرأت کا بے باکانہ ذکر کیا ہے وہ قتل کا جرم ہے چنانچہ اس کو بھی انہوں نے لفظ ''اِنَّ'' سے ذکر کیا ہے جو عربی زبان میں جزم ویقین کے لئے مستعمل ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کو نہ تو اپنے فعل قتل میں کوئی شبہ ہے اور نہ اس مقتول کی ذات میں کوئی شبہ ہے جس کے قتل کا ان کو دعویٰ تھا- اس سے زیادہ کوئی اور بات یہاں نقل نہیں کی گئی- اس لئے قرآنی فیصلہ بھی ہم کو صرف اسی بیان کی روشنی میں دیکھنا چاہیے-

نصاریٰ کے متعلق یہاں قرآن کریم نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہتے مختلف باتیں بناتے ہیں اور چند وجوہات کی بناء پر حقیقت کا ان کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے اس لئے صرف اٹکل کے تیر چلانے کے سوا ان کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے ہاں اجمالی طور پر اُن کا یہ خیال ضرور تھا کہ وہ اپنے جسم ناسوتی یا لاحوتی کے ساتھ آسمانوں پر اٹھائے گئے- اب ظاہر بات ہے کہ قرآنی الفاظ کے مطابق جو بات یہاں متنازع فیہ نظر آتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صرف زندہ شخصیت ہے- یہود کہتے تھے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے اور نصاریٰ اس خیال میں تھے کہ وہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں- ان کی روح کے متعلق یہاں کوئی تذکرہ ہے اور نہ روح کا تذکرہ معرض بحث میں لایا جاسکتا ہے کیونکہ روح کا معاملہ ایک غیبی معاملہ ہے وہ انسان کے ادراک سے بالاتر بات ہے- اس پر نہ یہود کوئی حجت قائم کر سکتے ہیں اور نہ قرآنی بیان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اس لئے حسب تصریح قرآن کریم ان کے دعویٰ ہی میں روح زیر بحث نہ تھی تو فیصلہ میں اس کا ذکر کیسے آسکتا ہے ظاہر ہے کہ قتل کا فعل جسم پر وارد ہوتا ہے روح پر وارد نہیں ہوسکتا- لہٰذا ان کے مقابلہ میں جب قرآنی فیصلہ یہ ہو کہ وہ مقتول نہیں ہوئے بلکہ مرفوع ہوئے ہیں تو یہاں رفع سے جسم ہی کا رفع مراد ہوگا نہ کہ روح کا-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور ان کے عزت سے مرجانے کی جدید داستان ✻ یہاں ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج بھی رکھا، منہ پر تھوکا بھی

اور جو کچھ نہ کرنا تھا وہ سب کچھ بھی کر لیا تھا (والعیاذ باللہ) حتیٰ کہ جب ان کو پورا یقین ہوگیا کہ انہوں نے ان کو درحقیقت مار ڈالا ہے تو ان کو سولی سے اتار ا مگر ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی آخر وہ چھپ کر کشمیر یا دنیا کے کسی اور غیر معروف شہر میں آ کر اپنی موت سے مر گئے تھے۔ اس جماعت کے نزدیک یہود کا یہ گمان تھا کہ جو شخص بھی صلیب کے ذریعہ مارا جاتا ہے وہ لعنتی موت مرتا ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے کی بجائے اُن کا ملعون ہونا ثابت کریں اس لئے اُن کے نزدیک یہ از بس ضروری تھا کہ ان کی موت صلیبی موت ہو تاکہ وہ ان کے لعنتی ہونے کا ثبوت بن سکے۔ اس جماعت کو یہود کے یہ سب جرائم مسلّم ہیں یعنی ان کا سولی دینا اور تمام اہانت کے اسباب کا ارتکاب کرنا حتیٰ کہ ان کو اس نوبت میں پہنچا دینا کہ ان کے حق میں زندگی کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے اور یہاں قرآنی تردید کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ میں گو اسباب موت سب پورے ہو چکے تھے مگر ان میں کچھ جان باقی رہ گئی تھی اس لئے وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ کہیں جا کر خود اپنی موت سے مرے ہیں اس لئے ان کی موت لعنتی موت نہیں ہوئی بلکہ ان کو بڑی عزت کی موت نصیب ہوئی ہے اور ان کے بڑے درجے بلند ہوئے ان کے نزدیک بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی تفسیر یہی ہے۔

اب اگر واقعہ درحقیقت یہی تھا جو اس جماعت کا خیال ہے تو یہاں حسب ذیل اُمور قابل غور ہیں۔

(الف) اگر درحقیقت یہود کا دعویٰ یہاں ان کی صلیبی موت کا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان کے بیان میں صلیب کا دعویٰ نقل نہیں کیا اور کیوں قتل کا ایک عام لفظ نقل کیا ہے۔

(ب) اور کیا وجہ ہے کہ جبکہ ان کا تمام زور صلیبی موت کے متعلق تھا تو تردید میں صرف نفی قتل پر زور دیا گیا ہے اور کیوں ایک ایسے غیر متعلق جرم کی نفی پر زور دیا گیا ہے جس کی نفی سے اُن کے دعویٰ کی تردید کا کوئی تعلق نہیں تھا یعنی فعل قتل ظاہر ہے کہ یہ ایک عام جرم ہے جو صلیب اور غیر صلیب ہر آلہ سے حاصل ہو سکتا ہے قتل کی نفی پر تو زور نہ دینا اور ایک عام جرم کی نفی پر زور دینا یہ کہاں تک مناسب ہے۔

(ج) پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اگر ایک بار صلیب کا انکار بھی کیا تو وہ بھی ایسے محل پر کیا ہے جو اس کا صحیح محل نہ تھا یعنی جب قرآن کریم ان کی لعنتی موت تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے ان کی موت کو عزت کی موت قرار دیتا ہے تو پھر بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو مقابل بنا کر ذکر کرنا چاہیے تھا اور یوں کہنا تھا کہ وَمَا صَلَبُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہاں بھی قرآن کریم نے خاص صلیب کی بجائے صرف ایک عام فعل قتل کی نفی فرمائی ہے اور یوں فرمایا ہے کہ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔

(د) اس تفسیر کی بناء پر یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ جو چیز موقعہ واردات پر واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ کشمیر یا اور کسی طرف چلے گئے تھے رہا ان کی موت کا مسئلہ تو اگر ان کی موت کہیں جا کر واقع ہوئی تو یہ سالوں یا مدتوں بعد کا معاملہ ہے پس جو بات یہاں صورت حال بتانے کے لئے ضروری تھی اس کو کیوں حذف کر دیا گیا ہے اور صاف طور پر یہ کیوں نہیں فرما دیا گیا کہ یہود نے ان کو سولی نہیں دی بلکہ وہ زندہ کشمیر وغیرہ کہیں چلے گئے تھے تاکہ یہ بات واضح ہو جاتی کہ صلیبی موت سے بچنے کی ان کی شکل کیا ہوئی پس اصل

حقیقت کا تو اخفاء کرنا اور موت کی ایک عام سنت کا بیان کرنا یہ کس درجہ بے محل اور غیر متعلق بات ہے-

(ھ) اس سے بڑھ کر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصل بات ان کی طبعی موت تھی تو یہاں **بل رفعه الله اليه** کی بجائے **بل توفاه الله** کہنا زیادہ مناسب تھا تاکہ ثابت ہوجاتا کہ وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ طبعی موت سے مرے ہیں اور جب اپنی طبعی موت سے مرے ہیں تو رفع درجات کا مسئلہ خود بخود ثابت ہوجاتا ہے پس اگر صورت حال کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اسی صورت سے ہوتا ہے کہ یہاں ان کی طبعی موت کا ذکر کیا جائے-

لیکن آیت بالا میں یہاں ان تینوں الفاظ میں سے کوئی لفظ نہیں ہے-

نہ یہ (۱) وَ مَا صَلَبُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ-

نہ یہ (۲) وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ اذهبه الله الى الاكشمير-

نہ یہ (۳) وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ-

اب اگر ہم اس جماعت کے خیالات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو ہم کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ سرے سے یہود کا اصل دعویٰ ہی یہاں مذکور نہیں یعنی خاص صلیب دینا کیونکہ ان کے بیان کے مطابق ان کی لعنتی موت ہونا اسی وقت ثابت ہوسکتا ہے جبکہ یہ ثابت ہوجائے کہ ان کی موت صلیب کے ذریعہ واقع ہوئی ہے اس لئے یہاں ان کے دعوے میں قتل کے عام جرم کا نقل کرنا مدعیین کے دعویٰ کے بھی اور ان کے مقاصد کے بھی بالکل خلاف ہیں- اسی طرح جب ہم قرآن کریم کے فیصلہ پر نظر کرتے ہیں تو یہاں بھی واقعہ کی اصل صورت بالکل مبہم نظر آتی اور صورت حال کا کچھ انکشاف نہیں ہوتا کیونکہ نہ یہاں ان کے کشمیر جانے کا ذکر ہے نہ ان کے طبعی وفات پانے کا کوئی تذکرہ ہے اس لئے اس کا کوئی انکشاف نہیں ہوتا کہ ملزمین جس کے قتل کے اس شد و مد کے ساتھ مدعی تھے اور اگر وہ شخص مقتول نہیں ہوا تو آخر پھر کدھر گیا- ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو نہ صرف ان کے زیر حراست آچکا تھا بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے مر بھی چکا تھا صرف یہ کہہ دینا کہ وہ سولی پر نہیں مرا تھا بلکہ عزت کی موت مرا تھا کیا تشفی بخش تھا ہاں اگر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے اس کو فلاں مقام پر بھیج دیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کردیا جاتا کہ مدعیین کے لئے اس مغالطہ لگنے کا باعث کیا تھا تو بیشک صورت حال پر روشنی پڑسکتی تھی لیکن صرف یہ کہہ دینا کہ ان کی عزت کی موت واقع ہوئی ہے بے معنی فیصلہ ہے اور بالکل بعید از قیاس بھی ہے کیونکہ جو لوگ ان کے قتل کے مدعی تھے وہ یہود تھے اور اس بارے میں ان کو اتنا یقین تھا کہ اپنے بیان میں اس کے متعلق تاکید اور یقین کے جتنے طریقے وہ استعمال کرسکتے تھے سب استعمال کرچکے تھے- اب اگر قرآن کریم یہ تسلیم کرلیتا ہے کہ تم نے ان کو سولی پر چڑھا دیا تھا مگر جب وہ سولی سے مردہ سمجھ کر اتارے گئے تھے تو وہ پورے طور سے نہیں مرے تھے- اگرچہ تم کو مردہ معلوم ہوتے تھے پھر بعد میں ان کو کسی غیر جگہ لے جاکر خود ہم نے ان کو موت دی تھی یہ بیان جتنا خلاف قیاس ہوسکتا ہے ظاہر ہے- خاص کر جب کہ ان کی موت تسلیم کرلی جائے جو لوگ یقینی اسباب قتل کا ارتکاب کرچکے تھے ان سے یہ کہنا کہ وہ ان اسباب سے نہیں مرے بالکل اتنی ہی مضحکہ خیز بات ہوگی جیسے کوئی قاتل اپنی صفائی کے بیان میں یہ کہے کہ مقتول کے پیٹ میں چھرا تو میں نے ہی گھونپا تھا مگر مقتول اس کی وجہ سے نہیں مرا بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے مرا ہے یہ سب جانتے ہیں کہ قاتل کے یقینی آلہ قتل

کے استعمال کرنے کے بعد ان حالات میں جبکہ موت کا ظاہری سبب وہی ہو کوئی عدالت اس کے اس عذر کو معقول نہیں سمجھے گی بلکہ اس کی سماعت مقتول کے حق میں ایک ظلم تصور کرے گی پھر یہاں سولی کا جرم تسلیم کر لینے کے بعد اور وہ بھی اس حد تک کہ ملزمین کے نزدیک اس کی موت یقینی ہو چکی ہو خالق کائنات کا یہ فیصلہ دینا کہ وہ تمہارے مارنے سے نہیں مرے بلکہ ہمارے مارنے سے مرے ہیں ان کے مقابلہ میں کیا اثر انداز ہو سکتا ہے بالخصوص جبکہ اس بعید از قیاس دعویٰ کے لئے کوئی قرینہ بھی یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہی نکلے گا کہ اپنے دشمن کی ہلاکت جو ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے یہاں اس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے پورا کر دیا تھا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اب یہ بحث کھڑی کرنی کہ ان کی یہ موت بڑی عزت کی موت تھی ہمارے نزدیک زخموں پر نمک پاشی سے کم نہیں۔

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حسب بیان قرآن کریم یہود کے جرم کی جو نوعیت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں تھی وہی نوعیت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی تھی یعنی قتل دونوں مقامات پر قرآن کریم نے ایک ہی لفظ قتل کو استعمال فرمایا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل ہونے کو اس نے تسلیم نہیں کیا اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے حق میں تسلیم کر لیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ جب یہاں مدعیین بھی ایک ہی قوم تھی اور دعویٰ بھی ایک تھا تو پھر صرف ایک عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کیا تھی کہ ان کے حق میں ان کے رفع روحانی یا عزت کی موت کی تصریح ضروری سمجھی گئی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے حق میں ان کی موت کے متعلق ایک کلمہ تک نہیں فرمایا گیا حالانکہ یہود کا مقصد ان کے قتل کرنے سے بھی اس کے سواء اور کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ سب مقدس گروہ بھی لعنتی تھا۔ والعیاذ باللہ۔ کیا اس سکوت کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ ان کے معاملہ میں رفع روحانی یا رفع درجات تسلیم نہیں کیا گیا۔ والعیاذ باللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ روح کے رفع یا عدم رفع کا مسئلہ نہ یہاں زیر بحث تھا اور نہ یہ مسئلہ کسی کے حق میں خواہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا دیگر انبیاء علیہم السلام زیر بحث آنے کے قابل ہے۔

پھر اگر یہاں رفع سے رفع روحانی مراد ہوتا تو کیا اس کے لئے صرف بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ کا لفظ کافی نہ تھا۔ یہاں لفظ اِلَیْهِ کا بے ضرورت کیوں اضافہ کیا گیا ہے۔

صلیبی موت کا لعنتی ہونا اور اسکے مقابلہ میں عزت کی موت کا افسانہ اسلام میں بالکل بے اصل بلکہ غیر معقول ہے

رفع روحانی اور عزت کی موت کا یہ سارا افسانہ اس پر مبنی ہے کہ صلیبی موت کے لعنتی موت ہونے کی شریعت کی نظر میں کوئی اصلیت بھی ہو لیکن اگر تخیل ہی بے بنیاد ہے تو پھر نہ قرآن کریم کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے اور نہ کسی غلط بنیاد پر وہ اپنے صحیح فیصلہ کو مبنی کر سکتا ہے۔ جب اس پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لعنتی موت کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں ہے یہاں کفار جتنے ہیں وہ سب کے سب ملعون ہیں خواہ زندہ ہوں یا مردہ سولی پا کر مریں یا گولی کھا کر آخر جب ملعون قرار دیئے گئے تو کیا یہ لعنت ان کے دم کے ساتھ ساتھ نہ رہی یقیناً حیات سے لے کر موت اور موت سے لے کر قیامت اور قیامت سے جہنم تک ان کے دم کے ساتھ لگی رہے گی۔ جملہ ادیانِ سماویہ میں موت کے اچھے اور برے ہونے کا تعلق انسانوں کے اعمال پر رکھا گیا ہے نہ کہ کسی خاص آلۂ قتل کی وجہ سے لعنتی بن جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دیگر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہود کے جرم قتل کا اعتراف کر لینے کے باوجود

ان کی عزت کی موت ہونے کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور نہ اس بدیہی بات کی طرف توجہ کی ضرورت تھی بلکہ جس بات کی اہمیت محسوس فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وہ مقدس جماعت ہے جس کے قتل کا وبال یہ ہے کہ جو جماعت کل تک نعمت کا گہوارہ بنی ہوئی تھی اب وہ مورد لعنت بن گئی ہے تعجب ہے کہ یہاں سیاق کلام تو یہود کے ملعون ہونے کے اسباب بیان کرنے کا تھا اور اس میں بے بنیاد اور الٹا عیسیٰ علیہ السلام کے ملعون ہونے نہ ہونے کی بحث کھڑی کر دی گئی۔

رفع کا لفظ قرآن کریم میں ایک جگہ بھی لعنتی موت کی تردید کے لئے مستعمل نہیں ❊ بحث کا پہلو یہ ہے کہ لفظ رفع کے معنی پر بھی غور کر لینا چاہیے کیا یہ لفظ عرف قرآنی میں کہیں عزت کی موت کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جہاں تک ہم نے قرآن کریم اور کتب لغت پر نظر کی ہے ہم کو اس لفظ کے معنی کہیں لعنتی موت کے بالمقابل عزت کی موت دینے کے ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس لفظ کا استعمال غیر ذی روح میں بھی ہوتا ہے جہاں موت کا احتمال ہی نہیں ارشاد ہوتا ہے رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔

رفع کے معنی قرآن ولغت میں ❊ یہاں لفظ ''رفع'' آسمانوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اسی طرح اس کا استعمال زندوں اور مردوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب آیات ذیل پر نظر فرمایئے:

(۱) ﴿وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (الزخرف:۳۲)

(۲) ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (مجادلہ:۱۱)

(۳) ﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۱۷۶)

(۴) ﴿وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ (مریم:۵۷)

(۵) ﴿وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (الشرح:۴)

(۶) ﴿وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ (یوسف:۱۰۰)

ان تمام آیتوں میں رفع کا لفظ انسانوں ہی میں استعمال ہوا ہے مگر کسی ایک جگہ بھی اس کے معنی عزت کی موت کے مراد نہیں ہیں بلکہ مردوں میں اس کا استعمال ہی نہیں ہوا۔ یہاں ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کا مسئلہ گویا صرف لفظ رفع سے پیدا ہو گیا ہے اور اس لئے ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ رفع کا لفظ رفع جسمانی کے لئے کہیں آیا ہے یا نہیں۔ درحقیقت یہ بحث کا رخ پلٹنے کے لئے صرف ایک چال ہے اصل سوال یہ تھا کہ یہ لفظ عزت کی موت کے لئے کہیں استعمال ہوا ہے یا نہیں اور چونکہ یہ معنی کہیں ثابت نہیں اس لئے بحث کا رخ بدلنے کے لئے ذہنوں کو ایک دوسرے سوال کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے تاکہ اصل سوال کی طرف کسی کا ذہن متوجہ ہی نہ ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ رفع کا لفظ صرف بلند کرنے اور اٹھانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اس میں نہ جسم کی خصوصیت ہے نہ روح کی بلکہ وہ غیر ذی روح میں بھی مستعمل ہوتا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جسم کا رفع اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ یہاں زیر بحث جسم ہی کا معاملہ تھا یہود اس کے قتل کے مدعی تھے اور نصاریٰ اس کے رفع کے پس جب یہاں روح زیر بحث ہی نہ تھی تو رفع سے روح کا رفع مراد ہو کیسے سکتا تھا۔ اس مقام کے علاوہ قرآن کریم میں کسی جگہ اور کسی شخص کے متعلق یہ بحث نہیں ملتی کہ وہ قتل کیا

گیا ہے یا اپنے جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اس لئے کسی اور جگہ خاص جسم کے رفع کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے پس انسانوں میں جن کے جسم مشاہدہ میں ہوتے ہیں جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو چونکہ وہاں ان کے جسم کے رفع کا احتمال ہی نہیں ہوتا اس لئے وہاں معنوی رفع یعنی درجات کی بلندی مراد ہوتی ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ اس لفظ کا استعمال ہر قسم کی بلندی کے لئے ہوتا ہے جسم کی ہو یا معنوی جیسا موقع اور محل ہوگا اس کے مطابق اس کے معنی مراد لئے جائیں گے یہی حال لفظ توفّی کا ہے وہ بھی زندوں اور مردوں دونوں میں یکساں مستعمل ہے عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں لفظ توفی - رفع نزول اور اس کی پوری تفصیلات موجود ہیں اس کے ساتھ یہاں قومی تاریخیں بھی موجود ہیں پس یہ مسئلہ قومی تاریخ اور آیات واحادیث کی روشنی سے ثابت ہوا ہے یہ سمجھنا بڑی نافہمی ہے کہ یہ مسئلہ صرف لفظ رفع کی پیداوار ہے جیسا کہ آیت نمبر ۶ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین کے جسمانی رفع کا معاملہ صرف لفظ رفع سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے لئے دوسرے خارجی قرائن بھی تھے اور یہاں تو قرائن نہیں بلکہ دلائل موجود ہیں اور وہ بھی واضح سے واضح اور مستحکم سے مستحکم - خلاصہ یہ کہ جب ایک طرف لعنتی موت کا افسانہ بے بنیاد ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف رفع کا استعمال بھی عزت کی موت یعنی لعنتی موت کی تردید کے لئے نہیں ملتا تو پھر آیت بالا کی یہ تفسیر کیسے قبول کی جاسکتی ہے-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا قرآن کریم سے اور اس کی تردید ❋ اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالتے چلئے کہ خاص عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان کا سولی دیا جانا ان کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھنا' ان کے منہ پر تھوکا جانا اور طرح طرح سے ان کی توہین وتذلیل کرنا کیا یہ تاریخ قرآن کریم کو مسلم ہے؟

یہاں سب پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے جب یہود کے ملعون ہونے کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے تو خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ میں کسی سبب کا ذکر کیا ہے آیت ﴿وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ' الخ﴾(النساء:۱۵۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں صرف ان کا یہ کہنا کہ ہم نے ان کو قتل کرڈالا ہے ان کے لعنت در لعنت کا سبب بن گیا تھا اب سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں ان کی جانب سے وہ تمام بدترین اور توہین وتذلیل کی حرکات ناشائستہ سرزد ہو چکی تھیں جوابھی ذکر ہو چکیں تو ان تمام مکروہ افعال کا ذکر نہ کرنا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو نقل کرنا کیا یہ معقول ہوسکتا ہے-عقل ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کرسکتی کہ اگر اس سلسلہ میں ان مکروہ افعال کا ان سے صدور ہوا تھا اور ان تمام مظالم اور جرائم پر پردہ ڈال دیا جاتا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو ان کے اسباب لعنت میں ذکر کیا جاتا اور اس سے کہیں بڑھ کر اسبابِ لعنت کے ذکر سے سکوت کرلیا جاتا ہمارے نزدیک دشمنوں اور مجرموں کے حق میں اس سے بڑھ کر فیاضی کی مثال ملنا ناممکن ہے-

اس کے علاوہ سورۂ مائدہ میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے تو ان میں ایک بڑا انعام یہ بھی شمار کیا ہے وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ اور یہ انعام بھی قابل یاد ہے جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تم سے دور روکے رکھا اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا تھا اور سب ناروا سلوک ان کے ساتھ کر لئے تھے تو کیا بنی اسرائیل کی اس دسترس کے بعد عربی ادب ولغت کے لحاظ سے مذکورہ بالا جملہ استعمال کرنا صحیح ہے دوم پھر کیا یہ دردناک مظالم اور تذلیل وتوہین کا سلوک اس قابل ہے کہ ان کے عجیب درعجیب معجزات اور نزول مائدہ جیسے انعامات

کے پہلو بہ پہلو ایک انعام بنا کر اس کو ذکر کیا جائے - تیسرے سورۂ آل عمران میں یہ ارشاد ہے-

﴿ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران : ٥٤)

''یہود نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے ان کے مقابلہ میں خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر و برتر ہے''-

آیت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ جب یہود بے بہبود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیریں کیں تو ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر فرمائی اور یہ ظاہر ہے کہ جب قدرت خود ضعیف انسان کی تدبیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو پھر کسی کی ضعیف یا قوی تدبیر کیا چل سکتی ہے یہ بات الگ ہے کہ جب قدرت تدریج و امہال کے قانون کے ماتحت کسی گرفت کا ارادہ ہی نہ فرمائے تو کچھ مدت کے لئے انسان اپنی سب تدبیروں میں کامیاب نظر آئے لیکن اگر قدرتِ الٰہیہ ان تدابیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو کیا پھر اس رسوائی و ذلت کی کوئی مثال مل سکتی ہے جو یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں نافہموں نے اپنی جانب سے تراش لی ہے اور کیا اب دشمنوں کے مقابلہ میں قرآن کریم کا یہ دعویٰ کرنا کہ ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بڑھ کر تدبیر کرنے والا ہے - قابل مضحکہ نہیں ہے-

لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں ✲ یہ خواب واضح رہنا چاہیے کہ یہاں یہ قرآن کریم نے یہود کے مقابلہ میں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ مکر ہے جس کے معنی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں پس اس لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہیے جس کا دشمنوں کو علم بھی نہ ہو سکے اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ اس درجہ ناکام بھی رہیں کہ پھر ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو جائے-

آنحضرت ﷺ کے ہجرت کے واقعہ میں لفظ مکر کا استعمال بھی ہوا ہے ہر دو مقامات پر تدبیر الٰہی اور اس کا موازنہ اور آنحضرت ﷺ کی شانِ برتری کا اس میں ظہور ✲ اس قسم کا ایک جملہ قرآن کریم میں ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے متعلق بھی ملتا ہے - ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ﴾ (الانفال : ٣٠)

''ادھر تو وہ خفیہ سازش کر رہے تھے اور ادھر خدا خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے''-

یہاں بھی قریش کی سازش کا ذکر ہے پھر اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے خفیہ تدبیر فرمانے کا تذکرہ ہے اور آخر میں پھر وہی کلمہ دہرایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کہا گیا تھا یعنی وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ-

عجیب بات ہے کہ ہجرت کے لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے تو یہاں بھی کفار محاصرہ کر چکے تھے اور یہاں بھی آپ حضرت علیؓ کو اپنی بجائے چھوڑ گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمانوں پر ہجرت کرنے لگے تو یہاں بھی دشمن گھیرا ڈال چکے تھے اور یہاں بھی ایک شخص ان کی بجائے دشمنوں کے ہاتھوں میں موجود تھا قرآن کریم نے دونوں مقامات پر اپنی تدبیر اور کفار کی غلط فہمی کو اسی لفظ مکر سے ادا فرمایا ہے - ان دونوں ہجرتوں میں جب خدائی تدبیر کا موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو تدبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر ہوئی وہ دشمنوں پر ایک بڑی کاری ضرب تھی - ان دونوں مقامات پر

خدا تعالیٰ کے یہ دونوں رسول گو دشمنوں کے نرغے میں سے صاف نکل گئے اور کسی کا بال بیکا نہ ہو سکا مگر غور فرمائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دشمنوں کے علم میں اسی سرزمین پر صحیح وسالم موجود رہنا اور ہر معرکہ میں ان کو شکست دیتے رہنا آخر ۸ھ میں اپنے آبائی وطن کو فتح کر لینا جتنا قریش کے لئے سوہان روح ہوسکتا تھا آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پر چلے جانا یہود پر شاق نہیں ہوسکتا - ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں ایک مقتول لاش بھی موجود تھی مگر اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہونے نہ ہونے میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے تھے - اس لئے یہ مسئلہ زیر بحث آ گیا تھا کہ مقتول وہی حضرت مسیح علیہ السلام ہیں یا کوئی دوسرا شخص - مگر یہاں حضرت علیؓ سب کے جانے پہچانے شخص تھے - یہاں قریش کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی شبہ کے بغیر ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ ان سے ذرا فاصلہ پر ان کا سر کچلنے کے لئے موجود بھی ہیں - پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام با ایں ہمہ رأفت ورحمت جب دوبارہ اپنے وطن لوٹ کر تشریف لائیں تو یہاں ان کے دشمنوں کے حق میں قتل مقدر ہوا حتیٰ کہ یہودی ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر اپنے وطن مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ کے دشمنوں کے حق میں یہ مقدر ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں اور پھر وہی آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہو ہو کر آپ پر اپنی جانیں قربان کریں - ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی فتح ونصرت کے لئے ایک بار آپ کی ہجرت اور ہجرت کے بعد پھر اسی مقام پر فاتحانہ واپسی مقدر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بھی اگر پہلے ان کی ہجرت پھر اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی مقدر ہو تو اس میں تعجب کیا ہے - یہاں اگر فرق ہے تو صرف دار الہجرت ہی کا تو ہے یعنی وہاں دار الہجرت آسمان مقرر ہوا اور یہاں مدینہ طیبہ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ دونوں مقامات برابر تھے ہاں اگر فرق تھا تو خود روح اللہ اور عبداللہ کی جانب سے تھا' روح اللہ اور کلمۃ اللہ کی طبعی کشش آسمانوں کی طرف تھی آخر جو نفخۂ جبرئیلی سے ظاہر ہوئے وہ جاتے تو اور کہاں جاتے - عبداللہ کی طبعی کشش زمین کی جانب تھی اس لئے اگر وہ کسی خطۂ ارض کی طرف نہ جاتے تو اور کہاں جاتے بے شک خدا تعالیٰ قادر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آسمانوں پر اٹھا لیتا لیکن کیا یہ اس آخری رسول کی شان کے مناسب ہوتا - حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر آسمانوں پر تشریف لے گئے تو ان کے بعد دوسرا رسول اعظم دنیا کو نصیب ہو گیا لیکن اگر آپ تشریف لے جاتے تو امت کا نگہبان کون ہوتا - پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کو اس امت میں شامل ہونے کا دوسرا وہ شرف حاصل ہوگا جس کی اولو العزم انبیاء علیہم السلام تمنائیں رکھتے تھے - لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لاتے تو آپ کو کونسا دوسرا شرف حاصل ہوتا پھر روح اللہ اگر آسمانوں پر گئے تو دشمنوں سے حفاظت کے لئے بلائے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آسمانوں پر بلائے گئے تو صرف تشریف وتکریم کے لئے بلائے گئے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر گئے تو چوتھے آسمان تک گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو ساتوں آسمان طے کر کے وہاں تک پہنچ گئے جہاں جاتے جبرئیل علیہ السلام کے بھی پر جلتے تھے - ان دونوں ہجرتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر امام رازی کے قلم سے کیا اچھا جملہ نکل گیا - وہ لکھتے ہیں جو شرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر ہوا وہ عروج تھا اور جس شرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوازے گئے اس کا نام معراج ہے - میں کہتا ہوں جی ہاں وہ روح اللہ تھے اور یہ عبداللہ ہیں -

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِکْ عَلٰی عَبْدِکَ وَ رَسُوْلِکَ سیدنا محمد صاحب المعراج والبراق والقلم و علی اٰلہ و اصحابہ تسلیما کثیرا کثیرا۔

گو ان دونوں ہجرتوں میں اللہ تعالیٰ کی شان خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ دونوں جگہ عیاں تھی اور دونوں مقامات میں اس کا جو ظہور ہوا وہ کامل ہی تھا مگر کیا جو تدبیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جلوہ گر ہوئی وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مناسب تھی۔

ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ اگر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا اور آخر کار کشمیر وغیرہ میں جا کر کہیں اپنی طبعی موت سے مرجانا تسلیم کرلیں تو اس کے لئے نہ قرآنی الفاظ میں کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دنیا کی تاریخ اس کی شہادت دے سکتی ہے اور نہ اس میں خدائی تدبیر کا کچھ ظہور ہوتا ہے اور نہ اس تقدیر پر یہود کے دعویٰ کی کوئی معقول تردید ہوسکتی ہے کیونکہ جب سولی کے ساتھ جملہ موت کے مقدمات تسلیم کر لئے جائیں اور گفتگو صرف اتنی رہ جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تم نے مارا یا کہیں گمنام مقام میں لے جا کر خود ہم نے مارا تو اب یہ گفتگو ایک عبث گفتگو ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ جو بات دشمن چاہتے تھے وہ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے خود پوری فرمادی۔ والعیاذ باللہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب و رفع کی تحقیق قرآنی روشنی میں

✻ اسی طرح صلیب کے تسلیم کر لینے کے بعد یہاں نصاریٰ کی بھی کوئی تردید نہیں نکلتی کیونکہ جب اصولی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کا سولی چڑھنا تسلیم کرلیا جائے اور رفع جسمانی کا قرآن کریم خود اعلان فرمادے تو اب اُن کے ساتھ بھی جو اختلاف رہے گا وہ صرف نظریات ہی کا رہے گا اور صلیب پرستی کی یہ ایک بنیاد قائم ہو جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ آیت کے اصل مفہوم پر غور کیا جائے اور جو مطلب کسی تاویل کے بغیر اس سے ظاہر ہوتا ہوا اس کا اعتقاد رکھا جائے۔ پہلے ایک بار پوری آیت پڑھ لیجئے۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. (النساء:۱۵۷-۱۵۸)

اور (ہم نے ان کو سزا میں مبتلا کیا) اُن کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ ہی ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔ بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

آیت بالا کے مطالعہ کے بعد جو بات پہلی بار سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مدعی تھے اور اس بارے میں وہ اپنے پورے جزم و یقین کا اظہار کرتے تھے لیکن نصاریٰ چونکہ باہم خود مختلف تھے اس لئے مثلث باتیں کہتے تھے ان ہر دو فریق کے مقابلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ دونوں کے دونوں غلطی پر ہیں یہود کا دعویٰ قتل تو سرتاپا غلط ہے اس لئے اس کو دو بار رد کیا گیا ہے تاکہ جتنا زور انہوں نے اپنے قتل کرنے پر صرف کیا تھا اتنا ہی اس کے انکار پر صرف کیا جائے رہ

گئے نصاریٰ تو وہ قدرے مشترک طور پر ان کے مصلوب ہونے کے آج تک قائل ہیں اس لئے ضروری تھا کہ گو وہ کسی بات کے مدعی نہ ہوں مگر ان کے اس غلط خیال کی تردید بھی کر دی جائے اس لئے یہود کے دعویٰ قتل کے ساتھ ساتھ صلیب کی بھی نفی کر دی گئی اور اُس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا کہ ان کو خود کچھ علم نہیں ہے وہ صرف اٹکل کے تیر چلاتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے یقین کا دعویٰ رکھتی ہو صرف اس کی تردید کر دینا اس کے لئے کچھ تشفی بخش نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی غلط فہمی کے اسباب بھی بیان نہ کر دیئے جائیں۔ اس کو وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے بیان کیا گیا ہے یعنی یہاں قدرت کی طرف سے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے جس کی رو سے حقیقت حال ان پر مشتبہ ہوگئی تھی۔ ایک طرف چونکہ سبت کا دن آ رہا تھا اس لئے اس ارادہ بد کی تکمیل میں ان کو خود عجلت تھی دوسری طرف اس قسم کے ہنگاموں میں جو ایک طبعی وحشت ہوا کرتی ہے وہ بھی ان پر سوار تھی اس لئے اپنی دانست میں گو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے قتل کا قصد کیا تھا مگر ان مشتبہ کن حالات کی وجہ سے وہ اس ارادہ بد میں ناکام رہے اور ان کی توجہ اس طرف قائم نہ رہ سکتی کہ وہ کس کو قتل کر رہے ہیں اور اس کی کھلی شہادت یہود و نصاریٰ کا باہم اختلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حالات ضرور کچھ ایسی پیچیدہ بن گئی تھی کہ حس و مشاہدہ کا یہ صاف واقعہ بھی مبہم ہو کر رہ گیا تھا اور پیچیدگی کی وجہ سے قرآن کریم نے واقعہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل دوسرے انبیاء علیہم السلام کے متعلق بھی یہود اسی جرم کے ارتکاب کا دعویٰ کرتے تھے لیکن چونکہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں وہ اپنے دعوے میں صادق تھے اس لئے قرآن کریم نے نہ ان کی کوئی تردید کی ہے اور نہ ان کے معاملہ میں کسی شبہ و اشتباہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیلات میں پڑنا قرآن کریم نے پسند نہیں فرمایا اور نہ یہ احکم الحاکمین کی شان کے مناسب تھا اور غالباً لفظ **مکر اللہ** کا تقاضا بھی یہی تھا کہ خفیہ تدبیر کو کچھ خفیہ ہی رہنے دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر درحقیقت مقتول کی لاش ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے بلکہ کوئی دوسرا ان کا شبیہ شخص تھا جو عجلت میں غلطی سے قتل کر دیا گیا تھا تو یہ بتانا چاہیے کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام جو یقیناً ان کی زیرحراست آ چکے تھے آخر وہ کدھر نکل گئے اگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو ماننا پڑتا ہے کہ پھر مقتول کی جو لاش موجود تھی وہ عیسیٰ علیہ السلام ہی تھے اس لئے قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں قتل کی نفی کے بعد یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا تھا اس لئے زمین پر ان کی تلاش کرنا عبث ہے لیکن ایک ضعیف انسان چونکہ نہ اس قدرت کا تصور کر سکتا ہے اور نہ اس عظیم حکمت کو پا سکتا ہے اس لئے یہاں خاص طور پر اپنی ایسی دو صفتوں کا تذکرہ فرما کر بحث کو ختم کر دیا ہے جن کے اقرار کے بعد کوئی استبعاد باقی نہیں رہتا۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی توانا اور بڑی حکمت والی ہے اس کے سامنے یہ سب باتیں آسان ہیں۔ اس واضح فیصلہ سے جس طرح یہود کی کھلی ہوئی تردید ہوگئی اسی طرح نصاریٰ کے مذہب کی تمام بنیاد بھی منہدم ہو جاتی ہے کیونکہ جب صلیب کا سارا افسانہ ہی بے سر و پا ثابت ہوا تو اب کفارہ کا اصولی عقیدہ بھی خود بخود باطل ہوگیا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ اسی حد پر ختم ہو چکا تھا اور مستقبل زمانہ کے ساتھ اس کا کچھ تعلق باقی نہ رہا تھا تو آئندہ آیت میں اس کی دوسری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہاں ایک اور مشکل تر سوال سامنے آ گیا تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں تو پھر کیا

وہ آسمانوں ہی پر وفات پائیں گے اس لئے اس کی بھی وضاحت کردی گئی اور پوری قوت کے ساتھ اس کا اعلان کر دیا گیا کہ ابھی ان کو طبعی موت نہیں آئی بلکہ موت سے قبل اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا مقدر ہو چکا ہے اس لئے یقیناً وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور اب خدا تعالیٰ کی وہ خفیہ تدبیر بھی عالم آشکارا ہو جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنے جسم کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو یقیناً جسم کے ساتھ ہی اٹھائے گئے تھے۔

و اِنۡ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا. (النساء:۱۵۹)	اور کوئی اہل کتاب نہیں ہوگا مگر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا اور قیامت کے دن وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ہوں گے ان پر گواہ۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث بیان فرماتے تو یہ بھی فرماتے کہ یہ پیشگوئی صرف حدیثی نہیں قرآنی ہے اور یہی آیات بالا پڑھ کر سنا دیتے۔ اب یہ مسئلہ بالکل سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حدیثوں میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بار بار بیان فرمانے کی اہمیت کیوں محسوس کی گئی ہے یہ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی چونکہ عام انسانوں کی سنت نہیں تھا اس لئے اس کی تفہیم کے لئے اس حقیقت کے ذہن نشین کرنے کی بڑی اہمیت تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ابھی وفات نہیں ہوئی اور ابھی ان کو آسمان سے اترنا ہے اور بہت سی خدمات مفوضہ ادا کرنی ہیں اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے اور دجال جیسے ایمان کے غارت گر کو قتل کرنا ہے اور بالآخر خدا تعالیٰ کی زمین کو شر و فساد سے پاک کر کے عام انسانوں کی سنت کے مطابق وفات پانا ہے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونا ہے یہ ہے قرآنی بیان اور قرآنی بے لاگ فیصلہ اب یہاں ان کی موت کا دعویٰ کرنا ٹھیک ٹھیک یہودیوں کی اتباع ہے اور ان کو مصلوب مان لینا یہ نصاریٰ کی کھلی موافقت ہے۔ کیونکہ اگر ہم عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر کسی غیر معلوم مقام پر جا کر ان کی موت مان لیتے ہیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ یہود و نصاریٰ کی وہ غلط باتیں جن کی قرآن کریم نے پوری تردید فرمائی تھی ہم نے دونوں کو مان لیا ہے اور اس کے بعد ان کے ساتھ ہمارا اختلاف صرف نظریات کا اختلاف رہ جاتا ہے یہود کے ساتھ تو اس لئے کہ ان کی موت کے وہ بھی قائل تھے فرق صرف یہ رہے گا کہ یہ موت لعنتی تھی یا عزت کی اور نصاریٰ کے ساتھ اس لئے کہ جب وہ سولی دے دیئے گئے تو اب اس کی حقیقت امت کی تطہیر اور کفارہ تھی یا کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ ان امور کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد یہ نظریاتی اختلافات بالکل بے نتیجہ ہیں۔ ہماری مذکورہ بالا تفسیر کی بناء پر دونوں قوموں کے عقائد کی بیخ و بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اور قرآن کریم پر اپنی جانب سے کسی حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لانے کے بعد جملہ اہل اسلام کے نزدیک بھی وفات پائیں گے زیر اختلاف اُن کی گذشتہ موت ہے ❊ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اہل اسلام جہاں ان کے رفع کے قائل ہیں اسی کے ساتھ نزول کے بعد ان کی موت کے بھی قائل ہیں اس بارے میں ہمارے علم میں ایک متنفس کا اختلاف بھی نہیں یوں تو ان کی ولادت بلکہ ان کی زندگی کا ہر ہر گوشہ ان کی تردید الوہیت پر برہان قاطع ہے لیکن صرف ان کی موت کا عقیدہ مستقل اس کی ایک ایسی واضح دلیل ہے جس کے بعد ان کی الوہیت کی تردید کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ لہٰذا ان کی

ولادت اور موت تسلیم کرنے کے بعد اگر ایک ہزار بار بھی ان کے رفع الی السماء کا اقرار کر لیا جائے تو اس میں عیسائیوں کے مسئلہ الوہیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی اس لئے اگر بالفرض یہاں ابن عباسؓ یا کسی اور شخص سے ان کی موت منقول ہوتی ہے تو اس کو اجماع امت کے خلاف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تحقیق ٭ پس اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباسؓ سے انی متوفیک کی تفسیر انی ممیتک مروی ہے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہی ثابت ہوگا کہ عیسٰی علیہ السلام کو بھی موت آنی ہے مگر اس کا انکار کس کو ہے۔ زیر بحث تو یہ ہے کہ وہ موت ان کو آچکی اور کیا وہ فی الحال مردوں میں شامل ہیں۔ اور اب دوبارہ نہیں آئیں گے دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ نہ یہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اور نہ امت مسلمہ میں کسی اور معتمد عالم سے بلکہ ابن عباسؓ سے باسناد قوی یہ ثابت ہے کہ عیسٰی علیہ السلام اٹھائے گئے اور نزول کے بعد پھر وفات پائیں گے اور ٹھیک یہی تمام امت کا عقیدہ ہے۔

امام بخاری کی کتاب التفسیر میں حل بغات کا حصہ خود ان کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ امام ابوعبید کا ترتیب دادہ ہے ٭ یہاں بے علموں کو ایک مغالطہ یہ بھی لگ گیا ہے کہ ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا تفسیر چونکہ امام بخاری کی کتاب میں موجود ہے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ امام بخاری کا مختار بھی یہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب امام بخاری ہی کی کتاب میں عیسٰی علیہ السلام کے نزول کی حدیث موجود ہے تو پھر کس دلیل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اس موت سے گذشتہ موت مراد ہے بلکہ جب خود حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ ثابت ہے کہ یہ موت نزول کے بعد والی موت ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک بھی اس موت سے وہی مراد ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان ہی کی کتاب میں عیسٰی علیہ السلام کے نزول کا اقرار بھی موجود ہے۔

پھر ان مسکینوں کو اتنا علم بھی نہیں کہ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں جو لغات اور تراکیب نحو یہ نقل فرمائی ہیں یہ خود ان کی جانب سے نہیں ہیں بلکہ ان کی جانب سے صرف وہی حصہ ہے جو انہوں نے اپنی اسناد کے ساتھ روایت فرمایا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس ابوعبیدہ کی کتاب التفسیر موجود تھی۔ امام موصوف نے اس پوری کتاب التفسیر کو کسی تنقید و انتخاب کے بغیر بجنسہ اٹھا کر اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ لہٰذا جتنے اقوال مرجوحہ اصل کتاب میں موجود تھے وہ بھی سب کے سب یہاں نقل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا بالکل بے اصل ہے کہ امام بخاری نے خاص طور پر ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابوعبیدہ کی کتاب التفسیر میں چونکہ ابن عباس کا یہ قول مروی تھا اور جب امام بخاری نے ان کو پوری کتاب التفسیر ہی کو اپنی کتاب میں کسی انتخاب کے بغیر نقل کر دیا تھا تو یہ جزء بھی چونکہ ابوعبیدہ کی کتاب التفسیر میں بہت سے مقامات پر حل لغات میں تسامح بھی ہوا ہے اقوال مرجوحہ بھی نقل ہو گئے ہیں اور ان کی ترتیب میں بھی اچھا خاصہ اختلال واقع ہو گیا ہے۔ لیکن امام بخاری خود ان جملہ نقائص سے بری ہیں اس کی ذمہ داری اگر عائد ہوتی ہے تو ابوعبید پر عائد ہوتی ہے۔ امام بخاری کی کتاب کی علوصحت کے متعلق جو دعویٰ ہے وہ ان احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے جو اس میں اسناد کے ساتھ امام نے از خود روایت فرمائی ہیں نہ کہ ان اقوال کے متعلق جو اسناد کے بغیر کسی جانب سے کتاب میں نقل ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا تفسیر میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی موت سے وہ موت مراد ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لانے کے بعد ہوگی اور اس موت میں کسی کا بھی

اختلاف نہیں ہے اسی طرح ابن حزم کی طرف بھی موت کی نسبت کی گئی ہے اگر چہ کسی شاذ فرد کے اختلاف سے جمہور امت کی رائے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے وہ ابن حزم جیسے شخص کے اختلاف سے جس کے تفردات امت میں ضرب المثل ہیں لیکن وہ بھی متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخری دور میں تشریف لائیں گے لہٰذا زیر اختلاف مسئلہ پر ان شاذ نقول کا بھی کوئی اثر نہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی ص ۳۹۱ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو امت کا عقیدہ شمار کیا ہے دیکھو ص ۲۴۹ ج ۳ کتاب الفصل میں بھی اس کی تصریح کی ہے اس کے علاوہ اور متعدد مقامات میں بھی اسی عقیدہ کو امت کا عقیدہ لکھا ہے۔

وقد صح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم بنقل الكواف التی نقلت نبوة و اعلامه و كتابه انه اخبره انه لا نبی بعده الاماجاء ت الاخبار الصحاح من نزول عیسیٰ علیه السلام الذی بعث الی بنی اسرائیل و ادعی الیهود قتله و صلبه فوجبت الاقرار بهذه علیه السلام لا یکون البته.

(ج ۱ ص ۷۷ الفصل و ج ۲ ص ۲۳ و ج ۲ ص ۵۵ و ج ۲ ص ۷۳ و ج ۲ ص ۸۷ کتاب مذکور)

جس جمہور امت نے آپ کی نبوت اور اس کی علامات اور قرآن شریف کو نقل کیا ہے اسی امت نے صحیح طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا سوائے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے کہ ان کے نزول کی خبر صحیح حدیثوں سے ثابت ہے یہ وہی ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور جن کے قتل و صلب کا یہود نے دعویٰ کیا تھا۔ لہٰذا ان باتوں کا اقرار کرنا ہم پر لازم ہے۔ اور یہ بطریق صحیح ثابت ہے کہ نبوۃ کا وجود آپ کے بعد ہرگز نہیں ہوگا۔

قرآن کریم میں مشرکانہ عقائد کی تردید کا جتنا اہتمام کیا گیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ نصاریٰ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے لیکن جب اس نسبت کا نامعقولیت ان کے سامنے ظاہر کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ولدیت اور ابنیت سے ان کی مراد حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ اتحاد کی وہ خاص نسبت ہے جو مابین خالق اور عیسیٰ علیہ السلام موجود ہے اور اسی کو مجازاً اس لفظ سے ادا کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کے استعمال سے چونکہ عیسائیت کی لفظی تائید ہوتی تھی اس لئے قرآن کریم نے یہاں مجاز و استعارہ کی بھی اجازت نہیں دی بلکہ اس عنوان ہی کو خواہ وہ کسی معنی سے ہو اپنے سخت غیظ و غضب کا باعث قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا. (مریم: ۹۰-۹۱)

ابھی اس افترا سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں اس پر کہ پکارتے ہیں رحمان کے نام پر اولاد۔

پس اگر قرآن کریم لفظ ابن اور ولد کا مجازی استعمال بھی حرام قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں عیسائیت کی تقویت اور اس کی ترویج ہوتی ہے تو اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع یعنی آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ بھی صرف عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور اس میں مشرکانہ عقیدہ کی ذرا بھی غلط تائید ہوتی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ٹھیک اسی لفظ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں خود استعمال

فرماتا جو عیسائی استعمال کرتے تھے - یہ کیسی عجیب درعجیب منطق ہے کہ یہود نے جب اِنَّا قَتَلْنَا کہا تو ان کی تردید میں تو قرآن کریم نے دوبار ﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ﴾ فرمایا مگر جب عیسائیوں نے ''رفع'' کہا تو قرآن کریم نے ایک بار بھی ''و ما رفع'' نہیں فرمایا بلکہ ''رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' میں لفظ ''الیہ'' کا اور اضافہ فرما کر رفع کے عقیدہ کو اور مضبوط بنادیا - کیا اس سے یہی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ بالکل درست تھا البتہ ان کے مصلوب ہونے کا خیال چونکہ بالکل بے اصل تھا اس لئے جس طرح کہ یہود کی تردید میں ﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ﴾ فرمایا گیا تھا اسی طرح عیسائیوں کی تردید میں ﴿وَ مَا صَلَبُوْهُ﴾ کا لفظ فرمادیا گیا اور اس طرح اہل کتاب کی ہر دو جماعتوں کی تردید علیحدہ علیحدہ دو لفظوں سے صراحۃً کردی گئی اور اسی کے ساتھ عیسائیوں کے بنیادی عقیدہ کا بطلان بھی واضح ہو گیا کیونکہ ان کے مذہب میں کفارہ کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور کفارہ کا عقیدہ تمام تر صلیب پر مبنی ہے لہٰذا جب قرآن کریم نے صراحۃً ﴿وَ مَا صَلَبُوْهُ﴾ فرما کر صلیب کی صاف تردید فرمادی تو پھر اس پر جتنی بے اصل تعمیر قائم کی گئی وہ خود بخود سب منہدم ہو گئی -

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں صلیب شکنی کا نکتہ ❋ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صلیب چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے نام سے پوجی گئی تھی اس لئے ضروری ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی دوبارہ تشریف لا کر خود اس کے توڑنے کا حکم دیں تاکہ جن کے نام پر یہ شرک ایجاد ہوا تھا ان ہی کے حکم سے اس کا استیصال بھی ہو جیسا کہ عرب نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے سر بت پرستی کی جھوٹی تہمت لگائی تو خود آپ کے سب سے عظیم اور جلیل القدر فرزند یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر اس کی تردید فرمائی اور فتح مکہ میں اپنے دست مبارک سے ان تمام بتوں کی تصاویر محو کردیں جو ملت ابراہیمی کے نام پر خانہ کعبہ کے اندر بنائی گئی تھیں یہ خیال کتنا احمقانہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر صلیب توڑ دیں گے تو عیسائی اور بہت سی صلیبیں بنا لیں گے - اگر یہی اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی پر کیا جائے تو کیا یہ قابل مضحکہ نہ ہوگا اصل بات یہ ہے کہ فاتح کی بت شکنی اور صلیب شکنی کا اندازہ غلامانہ ذہنیت کا محکوم ہو کر ہو ہی نہیں سکتا جو صلیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے توڑی جائے گی وہ پھر کبھی بنائی نہیں جا سکتی جیسا کہ جو بت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے توڑے گئے وہ جزیرۂ عرب میں آج تیرہ سو سال کے بعد بھی دوبارہ معبود نہیں بن سکے -

قرآن کریم کی شان اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام کے خوف سے حقائق کے بیان کرنے میں ادنیٰ پس و پیش بھی اختیار کرے ❋ قرآن کریم کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے سیاق تردید میں صرف دشمنوں کے خوف سے کسی حقیقت پر بھی پانی پھیر دے - حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اگر ''رَفَعَ'' کے لفظ سے ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی بے سبب اشتباہ پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے کئی درجہ زیادہ اشتباہ لفظ ''رُوْحُ اللّٰهِ'' اور ''كَلِمَةُ اللّٰهِ'' سے پیدا ہوتا تھا - چنانچہ آج تک عیسائی ان ہی الفاظ کو لے کر اہل اسلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں اسی طرح ان کے معجزات کا حال بھی ہے مگر کیا ایک ایسے بشر پر جس میں جملہ بشری خواص کھلے ہوئے نظر آرہے ہوں بے دلیل الوہیت کی تہمت رکھ دینے والوں کی قرآن کریم نے کوئی رعایت کی ہے کیا اس نے ''رُوْحُ اللّٰهُ'' اور ''كَلِمَةُ اللّٰهُ'' کا لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود ہی نہیں دیا

کیا بے عقلوں کے خوف سے ان سے احیاء موتی کا معجزہ عطا کرنے میں کوئی پس وپیش کیا گیا ہے اگر نامعقول جماعت نے دلائل بشریت ہی کو برعکس دلائل ربوبیت بناڈالا ہو تو اس میں سرتا سر جرم ان ہی کا ہے۔لہٰذا یہاں قرآن کریم پر یہ زور ڈالنا کہ اس نے ''رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' کا لفظ کیوں استعمال فرمایا ہے ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ اس نے كَلِمَةُ اللّٰهِ اور رُوْحُ اللّٰهِ کا لفظ کیوں استعمال فرمایا۔

خوب یاد رکھو اگر ہم اپنی مزعوم خیر خواہی میں قرآن کریم کے صریح الفاظ کی تاویل کریں گے تو اس کا نتیجہ صرف قرآن کریم کے الفاظ کی تحریف نہیں ہوگا بلکہ بہت سے حقائق کا انکار بھی ہوگا اگر رب العزت کے ان کے بن باپ پیدا فرمانے میں نامعقولوں کی رعایت کا حق کسی کو نہیں ہے تو اس سے ان کے زندہ آسمانوں پر اٹھانے میں نامعقولوں کی رعایت کے مطالبہ کا حق کس کو ہے قدرت وحکمت والا ہمیشہ اپنی قدرت وحکمت کے مظاہر کرتا رہے گا۔ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔

شبہات اور وساوس کا اثر عقائد کی تخریب ہے کسی صحیح حقیقت کی تعمیر نہیں پس صرف شبہات سے عقائد کی ترمیم کرنا غلط ہے خود ان کا جواب دینا چاہیے

٭ یہ بات قاعدہ کلیہ کی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ دین کا کوئی مسئلہ جب اپنے دلائل کے ساتھ روشنی میں آجائے تو اس پر بے تامل جزم ویقین کر لینا چاہیے اب اگر اس میں کچھ شبہات اور اعتراضات دل میں گذرتے ہوں تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ان شبہات ہی کا جواب تلاش کرنا چاہئے اور ان کو حل کر لینا چاہئے نہ یہ کہ اس ثابت شدہ حقیقت ہی کا انکار کر دیا جائے کیونکہ شبہات زیادہ سے زیادہ دلائل کی روشنی مدھم تو کر سکتے ہیں مگر کوئی دوسری روشنی پیدا نہیں کر سکتے اس لئے جب کبھی آپ اپنا رخ خود ان شبہات ہی کی طرف پھیر دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ اور تاریکی در تاریکی میں جا گرے ہیں۔مثلاً اگر کسی شبہ کی بنیاد پر ختم نبوت کا اجماعی عقیدہ بدل دیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جتنے اشکالات اس عقیدہ میں پیدا ہو سکتے تھے اس سے کہیں بڑھ کر شبہات دوسری صورت میں پیدا ہونے لگے درحقیقت یہ شیطان کا ایک بڑا علمی فریب ہے کہ جب وہ کسی گمراہی کی دعوت دیتا ہے تو پہلے ایک حق بات میں شبہات ڈالنا شروع کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ ان شبہات کو بڑھا کر ان کو ایک حقیقت کی صورت پہنا دیتا ہے پھر اس کے دلائل کی تلاش لگاتا ہے اور اس تمام تدریجی سلسلہ میں ایک بار بھی انسان کا ذہن اصل عقیدہ کے دلائل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا حتیٰ کہ وہ عقیدہ جو پہلے ان شبہات کے وجود سے مجروح ہو چکا تھا اب ان وہمی دلائل سے باطل نظر آنے لگتا ہے اور ان دلائل پر دماغ میں کسی ادنیٰ شبہ کا گذر ہونے نہیں دیتا اس کے بعد پھر انسان کو ایسا دلیر بنا دیتا ہے کہ اس کے نو ساختہ عقیدہ کے خلاف انسان واضح سے واضح دلائل کی تاویل بلکہ تحریف میں ذرا نہیں شرماتا اور اس طرح وہ انسان کو دین سے منحرف کر دیتا ہے اور اس کے ایمان بالغیب کی ساری دنیا برباد کر ڈالتا ہے۔ اسی کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ ہے یہاں بھی صرف شبہات پیدا کر کے پہلے وہ اس یقین کو متزلزل کرنے کی سعی کرتا ہے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو بیسیوں حدیثوں کی تاویل بلکہ انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ دجال کو قتل کرنے کے لئے خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے تشریف لانے کی ضرورت کیا پڑی ہے پھر اتنے دن ان کا زندہ رہنا کیوں تسلیم کیا جائے اور اس کے لئے جتنے مقدمات ہو سکتے ہیں ان کو خوب مبرہن کرتا چلا جاتا ہے لیکن ایک مومن ان شبہات کی بناء پر قرآن وحدیث کی تاویل کرنے کی بجائے خود ان شبہات ہی کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور صرف وساوس واوہام سے اپنے قیمتی

ایمان کو زخمی نہیں کرتا - اگر یہاں کتب سابقہ اور اہل کتاب کی تاریخ پر ذرا نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ کتب سابقہ میں دو مسیح کے آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک مسیح ہدایت اور دوسرا مسیح ضلالت چونکہ یہود نے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کا مصداق قرار دے دیا تھا اور مسیح ضلالت کو اس کے برعکس مسیح ہدایت ٹھہرایا گیا اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ مسیح ضلالت کے ظہور کے وقت خود مسیح ہدایت ہی تشریف لاکر اس کے مقابلہ پر یہ ثابت کر دیں کہ مسیح ہدایت کون ہے اور مسیح ضلالت کون تاکہ ایک طرف جو پہلے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت ٹھہرانے والے تھے وہ جھوٹے ثابت ہوں اور دوسری طرف مسیح ضلالت کی اتباع کرنے والے بھی نامراد ہو جائیں اور اس طرح جو مغالطے پہلے لگ چکے تھے اب وہ خود ان ہی زبان سے دور ہو جائیں صلیب ان کے نام سے پوجی گئی تھی وہی آ کر اس کو توڑیں اور سور بھی ان ہی کے نام سے حلال کیا گیا تھا اب وہی آ کر اس کے قتل کا حکم دیں اور اس طرح قریب قیامت میں یہود و نصاریٰ پر خدا کی حجت پوری ہو اور اتحاد ملل کے سلسلہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں وہ ایک ایک کر کے سب اٹھ جائیں اور آخر میں پھر دین اسی طرح ایک ہی باقی رہ جائے جیسا کہ آغاز عالم میں ایک ہی دین تھا - وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا -

نیز چونکہ دجال آخر میں مدعی الوہیت ہوگا اور احیاء موتی کا مدعی ہوگا اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے قتل کے لئے ایک ایسا ہی رسول آتا جس پر دعویٰ الوہیت کی تہمت لگائی گئی ہوتا کہ ایک طرف تو قتل ہو کر جھوٹے مدعی الوہیت کا جھوٹ ثابت ہو جائے دوسری طرف اس قوم کا جھوٹ بھی ثابت ہو جائے جنھوں نے خدا کے مقدس رسول پر دعویٰ الوہیت کی بے بنیاد تہمت لگائی تھی اور روز روشن کی طرح یہ واضح ہو جائے کہ جو مدعی الوہیت کا قاتل ہو وہ خود مدعی الوہیت کیسے ہو سکتا ہے - ان امور کے علاوہ جب یہود کے دعوے کو دیکھا جاتا ہے تو وہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے بھی قتل کا دعویٰ رکھتے تھے مگر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ قتل نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور اس میں خدا تعالیٰ توانا و حکیم کی بڑی حکمت مضمر تھی کیا اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کچھ اور تھا کہ جس کو مقتول ٹھہرایا گیا تھا وہی آ کر پہلے خود ان کے سرغنہ کو قتل کرے یعنی دجال کو پھر ان کے قتل کا حکم دے اور گویا اس طرح خود ایک نبی پہلے اپنی قوم انبیاء علیہم السلام کے قاتلین سے ان کا قصاص لے اور دوسری طرف اپنے متعلق دعویٰ قتل کا مزہ بھی چکھا دے -

پھر جب ختم نبوت پر زیادہ گہرائی سے نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ضرورت کے وقت امت میں کسی نبی کی پیدائش کی بجائے کوئی گذشتہ نبی آئے کیونکہ دجال اکبر کے آمد کی پیشگوئی نوح علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کرتے چلے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ اتنی بڑی گمراہی دنیا کی پیدائش سے لے کر آج تک کبھی ظاہر نہیں ہوئی اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ دجال ایک مرکزی طاقت ہے اور ایک مرکزی طاقت کے مقابلہ کے لئے ضرور کوئی مرکزی طاقت ہی آنی مناسب ہے - اب اگر اس کے مقابلہ میں کسی امتی کو کھڑا کر دیا جاتا تو وہ اس کا صحیح مقابل ہی نہیں ہو سکتا تھا دنیا میں بھی کشتی میں پہلوانوں کا جوڑ دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح حکومتوں کے مقابلہ کے وقت بھی ان کی طاقتوں کا توازن ضروری ہوتا ہے جس کو آج کل (Ballance Of Power) کہا جاتا ہے - غالباً یہی وجہ تھی کہ ابن صیاد کے متعلق جب حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ حکم دیجئے تو میں اس کی گردن اڑا دوں تو اس کے

جواب میں آپ نے فرمایا ''ان یکن ھو فلن تسلط علیہ'' اگر یہ وہی دجال اکبر ہے تو تم اس کے قتل پر مسلط نہیں ہو سکتے پس جب امت میں حضرت عمرؓ جیسا بھی اس کو قتل نہ کر سکے تو اب دوسرا کون اس کا قاتل ہو سکتا ہے اس لئے ضروری ٹھہرا کہ اس کا قاتل کوئی نبی ہو پس جب نبی کی ضرورت کے وقت بھی اس امت میں سے کسی کو نبی نہیں بنایا گیا بلکہ ان ہی گذشتہ انبیاء علیہم السلام ہی میں سے ایک نبی کو لاکر کھڑا کیا گیا تو فرمائیے کہ ختم نبوت کا مسئلہ اب کتنا واضح ہو گیا گویا آج تک ختم نبوت کا ثبوت صرف علمی تھا اور اس وقت تاریخ اور مشاہدہ سے بھی اس کا ثبوت ہو گیا کیونکہ جب ضرورت کے وقت پھر انبیاء سابقین ہی میں کا ایک رسول آیا تو یہ اس کا بدیہی ثبوت ہے کہ درحقیقت رسولوں میں سے کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا تھا اس لئے یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے آخری رسول تھے لہٰذا یہ شبہ نہیں رہا کہ جب آپ خاتم النبیین ہیں تو آپ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کیسے آئیں گے بلکہ ان کا نزول ہی ختم نبوت کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اگر وہ دوبارہ تشریف نہ لائیں تو مشاہدہ میں یہ کیسے ثابت ہوتا کہ سب رسول آچکے ہیں اور آپ ہی سب سے آخری رسول ہیں۔

جلد اول میں ختم نبوت کی پہلی حدیث میں ہم یہ بھی بہ تفصیل لکھ چکے ہیں کہ حسب تصریح قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جملہ انبیاء علیہم السلام سے ایمان اور بوقت ضرورت نصرت کا عہد بھی لیا جا چکا ہے اس لئے یوں مقدر ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام تشریف لاکر اپنی طرف سے اصالۃً اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف سے وکالۃً اس عہد کو پورا فرمائیں۔ کیا ان چند وجوہات سے جو فوری طور پر زیر قلم آگئے ہیں گذشتہ شبہات کا جواب نہیں ہو جاتا۔

کتاب اللہ میں اور حدیثوں میں دیگر موجودہ کتب سماویہ کے مقابلہ میں مجازات اور استعارہ کا استعمال بہت کم ہے اور یہ اسلام کا ایک طغریٰ امتیاز بھی ہے ⁕ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہم کو یہی ثابت ہوا ہے کہ دیگر کتب سماویہ کی نسبت ہماری شریعت میں استعارات و مجازات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ کتب سابقہ کی موجودہ صورت پر گو کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تاہم ہمارے موازنہ کے لئے ان کے موجودہ نسخوں کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی اور سامان بھی نہیں ہے۔ جب ہم حدیث و قرآن کریم کی پیشگوئیوں اور اس کے دیگر بیانات کی کتب سابقہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہم کو آفتاب درخشاں کی طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ ہماری شریعت نے اس بارے میں استعارات و مجازات کا دائرہ بجز ان مجازات کے جو حقیقت سے زیادہ متعارف ہوں بہت تنگ رکھا ہے اور عقائد کے باب سے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہ رکھا۔ اس کے برخلاف موجودہ انجیل کا حال یہ ہے کہ اس میں الوہیت و رسالت کے بنیادی مسائل بھی مجازات و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کئے گئے ہیں حتیٰ کہ منصف عیسائی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کے مذہب میں توحید کا مسئلہ بھی تقدیر کے مسئلہ کی طرح مذہب کا ایک راز اور ناقابل فہم مسئلہ ہے اس کے برعکس قرآن کریم کا بیان ہے یہاں عقائد و احکام کا تو ذکر ہی کیا ہے پیشگوئیوں کا عام باب بھی اس طرح کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی صحیح فہم والے شخص کے لئے ان میں کوئی تردد نہیں رہتا۔ فارس و روم کی جنگ میں فتح کی پیشگوئی، فتح مکہ کی پیشگوئی، اعضاء انسانی کا کلام کرنا، دجال کی پیدائش، اس کا اور اس کے والدین کا نقشہ، سر کے بل انسانوں کا محشر میں چلنا، برہنہ قبور سے نکلنا اور مردوں اور عورتوں کا ایک میدان میں اسی طرح جمع ہونا، غرض حشر و نشر اور جنت و دوزخ کی تفصیلات جو مادی عقلوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کے نزول سے کہیں بعید تر ہیں ان سب کے متعلق صاحب شریعت کی طرف سے ہم پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ سب کی سب حقیقت ہی حقیقت ہیں اور کسی تاویل کے بغیر ہمیں ان کو حقیقت ہی پر محمول کرنا چاہیے چنانچہ اگر جنت کے تذکرہ میں حسب الاتفاق اس کا ذکر آ گیا ہے کہ وہاں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی تو سامعین نے کبھی اس کو مبالغہ پر حمل نہیں کیا بلکہ اپنے ذوق کے مطابق وہی سوالات کئے ہیں جو ان الفاظ کے حقیقی معنی میں پیدا ہو سکتے تھے۔ مثلاً کسی نے یہ سوال کیا کہ کیا جنت میں کاشت اور کھیتی بھی ہوگی اور جب کبھی جنت میں صنفی تعلقات کا ذکر آ گیا ہے تو سامعین میں سے اس پر کسی نے ولادت کے مسئلہ کا حل بھی دریافت کیا ہے۔ اسی طرح بقیہ مسائل کے متعلق بھی ایسے سوالات کئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مخاطب صحابہ ہمیشہ آپ کے کلام کو حقیقت ہی پر محمول کرنے کے عادی تھے پھر ان کے جو جوابات آپ سے منقول ہیں وہ بھی اسی کی دلیل ہیں کہ خود آپ نے بھی ان الفاظ سے حقیقی معنوں ہی کا ارادہ فرمایا ہے مثلاً پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اگر کسی زراعت منش آدمی کے دل میں وہاں بھی یہ جذبہ پیدا ہوگا تو زراعت' اس کی بالیدگی و پختگی سب آن کی آن میں ہو جائے گی اور ذرا سی دیر نہ ہوگی کہ کھیتی کٹ کٹا کر اس کے گھر میں آ جائے گی اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہوگا - ابن آدم لے تو یہ بھی لے تیری ہوس آخر کسی طرح پوری بھی ہوگی اگر یہاں مجازی معنی استعمال ہوتے تو جواب صاف تھا کہ جنت میں کھیتی کہاں اس کا مطلب تو صرف ایک معنی مجازی اور مبالغہ تھا اسی طرح دوسرے سوال کے جواب میں بھی آپ یہی فرما سکتے تھے کہ اگر کوئی شخص ولادت کی تمنا کرے تو فوراً حمل و ولادت اور وضع حمل کا سلسلہ آناً فاناً پورا ہو کر کھیلتا ہوا بچہ اس کو مل جائے گا مگر جو دنیا میں میزان تولنے لانے کے لئے نہیں آئے بلکہ حقیقت ہی حقیقت بتانے آئے تھے انہوں نے یہاں بھی وہی جواب نہیں دیا جو صرف قیاس سے دیا جا سکتا تھا بلکہ وہ جواب عنایت فرمایا جو حقیقت میں اس کا جواب تھا - ارشاد ہے کہ اگر جنت میں کسی کے دل میں یہ تمنا ہوتی تو ایسا ہی ہوتا مگر وہاں کسی کے دل میں یہ تمنا ہی نہ ہوگی -

غرض شریعت اسلام کی تاریخ میں متکلم و مخاطب دونوں کے حالات سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جانبوں سے شرعی الفاظ کے ہمیشہ حقیقی معنی ہی مراد لئے گئے ہیں بجز اس کے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے وہاں استعارہ و مجاز اتنا واضح ہو کہ حقیقی معنی کی طرف عام طور پر ذہن کا انتقال ہی مشکل ہو- مثلاً صبح کے لئے اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ کا لفظ اور شب کی تاریکی کے لئے اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدُ کا لفظ فصیح لغت میں ایک ایسا مجاز ہے کہ اس مجاز کو چھوڑ کر یہاں حقیقت کا استعمال کرنا گویا انداز بلاغت ہی کو چھوڑ دینا ہے اس کے باوجود جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۷) تو کسی دماغ نے اس کھلے ہوئے مجاز کو بھی حقیقت ہی پر محمول کیا اور سیاہ و سفید رنگ کے دو دھاگے لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور رات کو اس وقت تک کھاتا پیتا رہا جب تک کہ یہ دو دھاگے علیحدہ علیحدہ صاف صاف نظر نہ آنے لگے جب صبح کو اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے بلیغانہ انداز میں فرمایا تمہارا تکیہ بھی کتنا لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں سما گئیں یعنی ان الفاظ سے مراد معنی مجازی تھے اور یہاں مجاز ایسا متعین ہے کہ حقیقت کی طرف ذہن جانا ہی مشکل ہے تم نے اس کو حقیقت پر کیسے محمول کر لیا- لیکن اس انفرادی غلطی کے باوجود اس کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ کلمہ ''مِنَ الْفَجْرِ'' اور نازل ہو گیا تاکہ پھر یہ مجاز متعارف بھی حقیقت کے اتنا قریب آ جائے کہ یہاں کسی ایک فرد کو بھی احکام کے باب میں اس غلط فہمی کا امکان

نہ رہے۔ [1]

خلاصہ یہ کہ دیگر کتب سماویہ کے مقابلہ میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کا یہ بھی ایک طغریٰ امتیاز ہے کہ یہاں جملہ بیانات اتنے واضح ہیں جتنا کہ وہ ہو سکتے ہیں پھر اگر ان میں کوئی ابہام رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی حد تک ہے جو ناگزیر ہے بلکہ وہاں یہ ابہام ہی مناسب ہے۔ بعض مرتبہ مصداق کے ظہور سے قبل وہ ابہام اس لئے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کی تشریح کے لئے عقل انسانی متحمل نہیں ہو سکتی جیسے برزخی کیفیات ظاہر ہے کہ عالم برزخ جب عالم مادیات سے جدا عالم ہے تو جب تک ایک انسان سے عام مادہ میں موجود ہے وہ علم برزخ کے دوسرے عالم کی پوری تفصیلات کا پورا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔

اور درحقیقت آخری شریعت کی یہی صفت ہونی بھی چاہیے کیونکہ پہلی کتب میں اگر کوئی ابہام رہ گیا تو آئندہ نبی نے آکر اس کو واضح کر دیا ہے لیکن اگر ضروری امور میں اس شریعت میں بھی ابہام رہ جائے تو اب یہاں کون ہے جو آئندہ آکر اس کی ذمہ دارانہ تشریح کر سکے مجتہدین کا بیان اس جگہ ناکافی ہے ان کو یہاں دو طرف عمل کے لئے وسعت ہوتی ہے اس کے باوجود ان کے بیان کی وہ حیثیت نہیں جو رسول کے سرکاری بیان کی ہو سکتی ہے۔

صریح حدیثوں میں تاویل کا خطرناک نتیجہ ٭ صریح الفاظ اور صریح بیانات کو پیچیدہ بنانے اور اُن کی تاویلات کرنے کا نتیجہ کبھی اچھا برآمد نہیں ہوا یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی پیشگوئی میں تاویل کی آخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے دجال کا مصداق سمجھا اور جب دجال ظاہر ہوگا تو اُس کو مسیح ہدایت سمجھ کر اس کی اتباع کریں گے اسی طرح نصاریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف صاف پیشگویوں کی تاویلات کیں آخر اس کا بھی جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ہوا اور انہوں نے بھی اسی غلطی کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ لہٰذا صاف اور واضح بیانات میں تاویلات کرنا نہایت خطرناک قدم ہے اور اس کا ثمرہ بھی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ غلط مسیح، مسیح حق مان لئے جائیں اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں تو یہودیوں کی طرح ان کا انکار کر دیا جائے۔ اگر نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اتنے واضح اور صریح الفاظ میں بھی تاویلات یا مجازات و استعارات جاری کر دینا صحیح ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کو بھی قصور وار ٹھہرانا غلط ہوگا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئیوں میں تاویلیں کر کے اپنا ایمان برباد کیا۔

والعیاذ باللّٰہ من الزیغ والالحاد

---

[1] اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ یہاں ایسے مجازات کا تو بھلا کیا امکان ہوگا جن کی طرف کسی اہل زبان کا ذہن ہی منتقل نہ ہو سکے حتی کہ ان کے زبردستی منوانے کے لئے جدید وحی کی ضرورت محسوس ہو اور کسی نبی مزعوم کو آکر پہلے خود بھی سالوں کا مغالطہ لگا ہے اور وہ بھی ان کو حقیقی معنی پر ہی حمل کرتا رہے پھر جب وہ مدعی مسیحیت بنے تو ان کے مجازی معنی مراد لے اور اس کے سمجھانے میں اس کو امت کے ساتھ مدتوں جنگ کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی عیسیٰ ابن مریم سے مجازاً فلاں شخص (جس کا باپ بھی موجود ہے اور ماں کا نام بھی مریم نہیں ہے) مراد ہے اور نزول سے مجازاً ولادت اور حاکم سے مجازاً محکومت اور دمشق سے فلاں شہر اور دو زرد چادروں سے مجازاً دو مرض مراد ہیں غرض کہ اس پیشگوئی کے جملہ الفاظ میں مجازی معنی مراد لے لئے بجز ایک منارہ کے کہ اس کے معنی حقیقی مراد لے اور حقیقی معنی بھی وہ خود اپنے نزول یعنی ولادت بلکہ دعویٰ مسیحیت کے بعد اپنے چندہ سے منارہ بنا کر پیدا کرے بیشک مجاز و استعارہ فصاحت و بلاغت کا ایک اہم باب ہے اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے مگر کیا ایسے استعارہ و مجاز کی مثال بھی کسی زبان میں ملتی ہے اگر اس قسم کے استعارہ و مجاز کے لئے بھی کوئی وجہ جواز نکل سکتی ہے تو پھر دنیا میں جھوٹ اور کذب کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہر جھوٹ استعارہ و مجاز کے پردے میں چل سکتا ہے۔

سيدنا روح الله عيسٰى بن مريم و قطعة مهمة من حياته الطيبة عليه الصلٰوة و السلام

سیدنا روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی حیاتِ طیبہ کی ایک اہم سرگذشت

نزول عيسٰى بن مريم عليه السلام حق جزم به النبی ﷺ حتٰى حلف عليه

(۱۲۵۳) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَ يَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَ يَضَعُ الْحَرْبَ وَ يَفِيْضَ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ ؓ وَ اقْرَءُ وْا اِنْ شِئْتُمْ (وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا)

(رواه البخاری و مسلم ص ۸۷ ج ۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی مسئلہ ہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قسم کھا کر ذکر فرمایا ہے

(۱۲۵۳) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یقیناً وہ زمانہ قریب ہے جبکہ ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے وہ ایک منصف فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے آئیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور سور کو قتل کریں گے اور جنگ ختم کردیں گے اور ان کے دور میں مال اس طرح بہا پڑے گا کہ کوئی شخص اس کو قبول کرنے والا نہ ملے گا اور لوگوں کی نظروں میں ایک سجدہ کی قدر و قیمت دنیا و مافیہا سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی یہ مضمون روایت فرما کر ابو ہریرہؓ کہتے تھے کہ اگر تم اس مضمون کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہو تو سورۃ النساء کی یہ آیت پڑھ لو ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ (آیت: ۱۵۹)

(بخاری ومسلم ج ا ص ۸۷)

(۱۲۵۳) ٭ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں اگر عام عادت کے خلاف کوئی بات نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قسم کھا کھا کر کیوں بیان فرماتے ہیں معلوم ہوا کہ یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے کسی انسان کی ولادت مراد نہیں کیونکہ اس میں کوئی ایسی جدید بات نہیں جس پر قسم کھانے کی ضرورت ہو پھر اس پیشین گوئی کی اہمیت راوی حدیث کی نظر میں اتنی ہے کہ وہ اس کو قرآنی پیشین گوئی کہتا ہے اب اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ جو پیشین گوئی قسم کے ساتھ حدیثوں میں بیان کی گئی ہو بلکہ قرآن کریم میں موجود ہو وہ جزم و یقین کے کس درجہ میں ہوگی - حدیث مذکور میں ان کے زمانہ کی چند ایسی برکات کا تذکرہ بھی آ گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہوگی وہ کوئی معمولی محکوم انسان نہیں ہوں گے بلکہ حاکم بھی وہ حاکم ہوں گے جو وقت کی بڑی طاقت یعنی نصرانیت کا صرف روحانی طور پر ہی نہیں بلکہ مادی طور پر بھی استیصال فرمائیں گے اور شعائر نصرانیت میں سب سے بڑا شعار یعنی ''صلیب'' اس کو نیست و نابود کردیں گے اخروی برکات کے ساتھ ساتھ دنیوی برکات بھی ان کے قدموں سے لگی ہوئی ہوں گی اور یہ سب ﷺ ...

و فی لفظ مَنْ روایۃ عطاءٍ و لَتَذْھَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَ التَّبَاغُض وَ التَّحَاسُد. (رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ و احمد فی مسندہ ص ٤٩٣ ج ٢ و ص ٤٩٤ ج ٢ و لطریق اخر فی ص ٤١١ ج ٢.

مسلم شریف میں عطاء کی روایت میں یہ الفاظ اور ہیں کہ ان کے زمانہ کی برکات میں سے یہ بھی ہوگا کہ لوگوں میں کینہ، بغض اور حسد کا نشان باقی نہ رہے گا-

و لفظہ یوشک من عاش منکم ان یلقی عیسی بن مریم و عزاہ السیوطی فی الدر المنثور ص ٢٤٢ ج ٢ لابن ابی شیبۃ و عبد بن حمید و اخرجہ ابن مردویہ و فی لفظہ و تکون السجدۃ واحدۃ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ اقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ و اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ موت عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ ثُمَّ یُعِیْدُھَا اَبُوْھُرَیْرَۃ ثلٰث مَرَّاتٍ.

(١٢٥٤) وَ اَخْرَجَ اَبُوْیَعْلٰی مَرْفُوْعًا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَیَنْزِلَنَّ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ ثُمَّ لَئِنْ قَامَ عَلٰی قَبْرِیْ وَ قَالَ یَا مُحَمَّدُ لَاُجِیْبَنَّہٗ. (کذا فی روح المعانی من الاحزاب ص ٦)

(١٢٥٤) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذات کی قسم کھا کر فرمایا جس کے قبضہ میں آپ کی جان ہے کہ عیسیٰ بن مریم ضرور اتر کر رہیں گے اور اگر وہ میری قبر پر آ کر کھڑے ہوں گے اور مجھ کو یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر آواز دیں گے تو میں ان کو ضرور جواب دوں گا- (روح المعانی)

(١٢٥٥) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَکَ مِنْکُمْ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَلْیُقْرِئْہُ مِنِّی السَّلَامَ. (کذا فی الدر منثور ج ٢ ص ٢٤٥ و قد رواہ احمد فی مسندہ عن ابی ھریرۃ مرفوعًا ایضًا بسند رجالہ رجال البخاری)

(١٢٥٥) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں سے جس شخص کی بھی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے ملاقات ہو وہ ان کو میری جانب سے ضرور سلام کہہ دے- (احمد)

(١٢٥٦) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَوْقُوْفًا عَلَیْہِ اِنِّیْ

(١٢٥٦) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میری زندگی

ﷺ .... برکات اتنی ظاہر و باہر ہوں گی کہ اس وقت کے انسانوں کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہی ''اسرائیلی'' رسول ہونے کا بدیہی ثبوت دیں گے- یہ بھی واضح رہے کہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''حَکَم'' فرمایا گیا ہے اور حَکَم وہی ہوسکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہو اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ نازل ہونے والے وہی اسرائیلی عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کی شخصیت ہی اہل کتاب اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے نزدیک مسلّم ہوسکتی ہے اگر بالفرض اس پیشین گوئی کا مصداق کسی ایسے شخص کو قرار دیا جائے جو خود اسی امت میں پیدا ہو تو اس کو حَکَم نہیں کہا جا سکتا- کیونکہ اہل کتاب کے نزدیک وہ مسلّم نہیں ہوگا- یہاں حَکَم یعنی ثالث کی ضرورت اس لئے ہے کہ دنیا کے خاتمہ پر جملہ ادیان کا پھر ملت واحدہ بن جانا ضروری ہے اور اس کے لئے اہل کتاب اور اہل قرآن کا باہم اختلاف ختم ہو جانا لازم ہے- چونکہ اللہ تعالیٰ کے سب فیصلے دلائل و براہین کی روشنی میں ہوتے ہیں اس لئے اس کی مصلحت نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک ایسی شخصیت آئے جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہو تاکہ خدائے تعالیٰ کی حجت دونوں فریق پر پوری ہو جائے اس لئے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا تشریف لانا مقدر ہوا- وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا-

(١٢٥٦) ✽ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی امر ہے اور ایسا یقینی ہے کہ اس پیشین گوئی کے ﷺ ....

لَا رُجُوْا اِنْ طَالَتْ بِیْ حَیٰوۃٌ اَنْ اُدْرِکَ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَاِنْ عَجَّلَ بِیْ مَوْتٌ فَمَنْ اَدْرَکَہُ فَلْیُقْرِئْہُ مِنِّی السَّلَامَ. (مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۸) و رجالہ رجال البخاری و قد اخرج البخاری بھذا لاسناد احادیث فراجع ج ۲ ص ۱۰۰۷ و ج ۲ ص ۹۹۹.

دراز ہوگئی تو مجھ کو امید ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) سے خود میری ملاقات ہو جائے گی اور اگر اس سے پہلے میری موت آ جائے تو جو شخص ان کا زمانہ پائے وہ میری جانب سے ان کی خدمت میں سلام عرض کر دے۔ (مسند احمد)

ان عیسٰی علیہ الصلوٰۃ و السلام لم یمیت الی الان و انہ راجع الینا ثمریاتی علیہ الفناء

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اب تک وفات نہیں ہوئی ان کو تشریف لانا ہے اسکے بعد ان کی وفات ہونی ہے

(۱۲۵۷) عَنِ الْحَسَنِ مَرْفُوْعًا وَ مَوْقُوْفًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْیَھُوْدِ اِنَّ عِیْسٰی لَمْ یَمُتْ وَ اِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَیْکُمْ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ. اخرجہ ابن جریر مرفوعا عنہ و اخرج ابن کثیر من ال عمران و ذکرہ فی النساء من طریق اخر موقوفا علیہ و اخرجہ ابن ابی حاتم مرفوعًا.

(۱۲۵۷) حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ارشاد فرمایا۔ عیسیٰ علیہ السلام ابھی مرے نہیں ہیں اور قیامت سے پہلے ان کو لوٹ کر تمہارے پاس آنا ہے۔ (ابن کثیر)

(۱۲۵۸) عَنِ الرَّبِیْعِ مُرْسَلًا قَالَ اِنَّ نَصَارٰی اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

(۱۲۵۸) ربیع مرسلاً بیان کرتے ہیں نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریمؑ کے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ

ﷺ.....راویوں کی نظروں میں اس کا انتظار لگ رہا تھا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت غیر معمولی شخصیت ہے۔ امت کا فرض ہے کہ پیشینگوئی کو یاد رکھے اور جس خوش نصیب کو وہ زمانہ ہاتھ آ جائے اس پر لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچا کر آپ کی وصیت کو پورا کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

(۱۲۵۷) * عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کو علیحدہ علیحدہ خطاب فرمایا ہے چونکہ یہود عیسیٰ علیہ السلام کو مردہ تصور کرتے ہیں اور ان کی دوبارہ آمد کے منکر ہیں اس لئے جب آپ نے خاص یہود کو خطاب فرمایا تو ان کے مقابلہ میں خاص طور پر ان کی دوبارہ تشریف آوری پر زور دیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی موت کی نفی فرما دی ہے جس سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہی نہیں ہوئی تو پھر ان کا دوبارہ تشریف لانا خود بخود ضروری ہے اور اس حقیقت کی مزید تاکید کے لئے جو شخص آسمانوں پر گیا ہے وہی شخص دوبارہ آئے گا لفظ ''رجوع'' یعنی لوٹنے کا استعمال فرمایا ہے۔ اس کے برعکس نصاریٰ ہیں وہ ان کو خدا مانتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک وہ فناء کے تحت آ ہی نہیں سکتے لہٰذا آپ نے جب خاص ان سے خطاب فرمایا تو ان کو یہ کہہ کر قائل کیا ہے کہ خدا وہ ہے جس کو کبھی فناء نہ ہو اور عیسیٰ علیہ السلام کو اترنے کے بعد موت آنی ہے پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔

(۱۲۵۸) * اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت آ چکی تھی تو کیا اس حقیقت کے انکشاف کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر ﷺ.....

فخاصمُوْهُ فِیْ عِیْسٰی بْنِ مَرْیَمَ وَ قَالُوْا لَهٗ مَنْ اَبُوْهُ وَ قَالُوْا عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ الْبُهْتَانَ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ لَا یَكُوْنُ وَلَدٌ اِلَّا وَ هُوَ یُشْبِهُ اَبَاهُ قَالُوْا بَلٰی قَالَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَبَّنَا حَیٌّ لَا یَمُوْتُ وَ اَنَّ عِیْسٰی یَاْتِیْ عَلَیْهِ الْفَنَاءُ قَالُوْا بَلٰی. (الحدیث كذا فی الدر المنثور من اول سورة ج۲ ص ۲۰۳)

وسلم سے جھگڑنے لگے اور کہنے لگے (کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے نہ تھے) تو بتایئے ان کا والد کون تھا؟ اور حق تعالیٰ شانہٗ پر طرح طرح کے جھوٹ اور بہتان لگانے لگے آپ نے ان سے فرمایا کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے مشابہ ہوا کرتا ہے انہوں نے کہا کیوں نہیں پھر آپ نے فرمایا کیا تم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اس کو موت کبھی نہ آئے گی اور عیسیٰ علیہ (علیہ السلام) کو موت آنی ہے انہوں نے اس کا اقرار کیا اور کہا بے شک ان کو موت آنی ہے (تو پھر وہ حق تعالیٰ کے مشابہ کہاں رہے) (درمنثور)

(۱۲۵۹) عَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ عَنْ حُذَیْفَةَ بْنِ اُسَیْدِ الْغِفَارِیِّ قَالَ اِطَّلَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ نَتَذَاكَرُ فَقَالَ مَا تَذَّكَرُوْنَ قَالُوْا نَذْكُرُ السَّاعَةَ قَالَ اِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰی تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ اٰیَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَ طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَ نُزُوْلَ عِیْسَی بْنِ

(۱۲۵۹) ابو الطفیل حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر سے تشریف لائے اس وقت ہم قیامت کے متعلق گفتگو میں مشغول تھے آپؐ نے فرمایا کیا گفتگو کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کی قیامت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں آپؐ نے فرمایا قیامت اس وقت تک ہرگز نہیں آسکتی جب تک کہ اس سے پہلے تم دس نشانیاں دیکھ نہ لو۔ دھواں' دجال' دابۃ الارض' مغرب کی جانب سے آفتاب کا طلوع'

ﷺ.....کوئی اور موقعہ تھا آپ یہاں صاف فرما دیتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو کبھی کے مر چکے ہیں مگر قرآن و حدیث میں عیسائیوں کے سامنے ایک جگہ بھی ہم کو اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

(۱۲۵۹) * حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے مگر اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول چند اور علامات کے ساتھ بھی اتنا ہی یقینی ہے حتیٰ کہ ان کی تشریف آوری سے قبل قیامت کا تصور کرنا گویا بے حقیقت بات ہے۔ نیز مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول جن اور دیگر علامات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر علامت اپنی اپنی نوعیت میں عجیب ہی ہے اور بظاہر ہے کہ انقلاب عالم کے عجیب تر حادثہ کی علامات ایسے ہی عجیب در عجیب ہونی چاہئیں اس کو تاویلیں کر کر کے دنیا کے عام حوادث کی صف میں کھینچنا قیامت کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے بلکہ ایک طرح پر قیامت ہی کا انکار ہے کیونکہ قیامت کا وجود ان علامات کے وجود سے کہیں عجیب تر ہے پس اگر یہ علامات مادی عقول کے نزدیک خلافِ عقل ہونے کی بناء پر قابل تاویل ہیں تو پھر قیامت کا وجود بدرجہ اولیٰ قابل تاویل ہونا چاہئے والعیاذ باللہ۔ اہل عقل و انصاف کو ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حدیثوں میں قیامت کے قریب تر متعلقات میں شمار کیا گیا ہے پھر اگر اس کو قیاس کرنا ہی ہے تو قیامت پر قیاس کرنا چاہئے۔ عالم کے عام نظم و نسق میں اس کو شامل کر لینا کتنی بڑی نادانی ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں قیامت کی علامات کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ صغریٰ (چھوٹی) اور کبریٰ (بڑی) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول علامات کبریٰ میں شامل فرمایا ہے جس کا حاصل ﷺ.....

مَرْيَمَ وَ يَأْجُوْجَ وَ مَأْجُوْجَ وَ ثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَ خَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَ اٰخِرُ ذٰلِکَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰى مَحْشَرِهِمْ.

عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا اترنا' یاجوج و ماجوج کا ظہور' تین خسف' ایک مشرق میں' ایک مغرب میں اور تیسرا جزیرہ عرب میں اور سب سے آخر میں وہ آگ جو یمن سے ظاہر ہوگی اور سب کو دھکا دے کر محشر تک لے جائے گی۔ (مسلم شریف)

اخرجه مسلم ص ۳۹۳ و عن واثلة نحوه اخرجه الطبرانی و الحاکم و وافقه الذهبی علی تصحیحه.

(۱۲۶۰) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى وَ يَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ. (مسند احمد ج ٤ ص ٤٢٩ ورجاله كلهم ثقات)

(۱۲۶۰) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو اپنے دشمنوں کے مقابلہ پر غالب رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو اور حضرت عیسیٰ بن مریم اتریں۔ (مسند احمد)

(۱۲۶۱) عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ مَرْفُوْعًا قَالَ اِنَّ الْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ خَارِجٌ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ يَسْتَغْنِ بِهِ النَّاسُ عَمَّنْ سِوَاهُ. (كنز العمال ج ٧ ص ٢٦٨)

(۱۲۶۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) یقیناً تشریف لا کر رہیں گے اور ان کی آمد کے بعد لوگ ان کے سوا سب سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ (کنز العمال)

(۱۲۶۲) عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا كَيْفَ تَهْلِكُ اُمَّةٌ اَنَا فِيْ اَوَّلِهَا وَ عِيْسٰى فِيْ آخِرِهَا. (كنز ج٧ ص٢٠٣ و صححه فى الدر المنثور فى)

(۱۲۶۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں بھلا وہ اُمت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کے اوّل میں تو میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں۔

ضمن اثر كعب و حسنه فى الفتح من فضائل اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم و ذكره فى المشكوة فى ثواب هذه الامة عن رزين سلسلة الذهب قال فى التيسير ص ٣٠٢ رواه النسائى وغيره۔

(۱۲۶۳) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرِ الْحَضْرَمِيِّ

(۱۲۶۳) جبیر بن نفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

ﷺ ...حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس کے بعد قیامت کا اس طرح انتظار کرنا چاہیے جیسے جانور کے حمل کی مدت پوری ہو جانے کے بعد اس کا مالک بچہ کی پیدائش کا انتظار کیا کرتا ہے جیسا کہ اس باب کے آخری حدیثوں میں عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا۔

(۱۲۶۰) * حدیث مذکور اگرچہ ایک دوسرے مضمون کی حدیث ہے مگر چونکہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری قیامت کی طرح یقینی مسئلہ ہے اس لئے جب کہیں قیامت کا تذکرہ آتا ہے تو اگر وہاں سیاق کلام میں ذرا کوئی مناسبت نکل آتی ہے تو مسلمات کی طرح فوراً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے۔

(۱۲۶۳) * حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی ہے اور اس نزول میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ﷺ....

مَرْفُوْعًا سَلا لَنْ یُخْزِیَ اللّٰہُ اُمَّۃً اَنَا فِیْ اَوَّلِھَا وَ عِیْسٰی فِیْ اٰخِرِھَا. (کذا فی الدرالمنثور ج ۲ ص ۲۴۵) اللہ تعالیٰ اس امت کو ہرگز ناکام نہیں کرے گا جس کے اوّل میں تو میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں۔ (درمنثور)

و قال الذهبی فی التلخیص هو خبر منكرولم يذكر له وجها وجيها بل الصحيح انه ان لم يكن صحيحا فلا ينحط عن درجة الحسن كما صرح به الحافظ فی الفتح ج ۷ ص ۵ و عن عروة بن رويم مثله كما فی الكنز ج ۷ ص ۲۰۲ و عن كعب مثله مرفوعا فی ضمن اثره الموقوف عليه كذا فی الدرالمنثور و عن جعفرؒ الصادق عن ابيه عن جده مرفوعًا فی حديث نحوه رواه رزين كما فی المشكوة من باب ثواب هذه الامة

اِنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ یُنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَلَا یُوْلَدُ فِی الْاَرْضِ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان سے اتریں گے اور زمین کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوں گے

(۱۲۶۴) عَنِ الْحَاطِبِ بْنِ اَبِیْ بَلْتَعَۃَ قَالَ بَعَثَنِیْ (۱۲۶۴) حاطب بن ابی بلتعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

ﷺ.... امت کے لئے ایک بڑی رحمت بھی پنہاں ہے۔یوں تو ہر گذشتہ امت دو رسولوں کے درمیان ہی ہوتی چلی آئی ہے مگر چونکہ پہلے ہر رسول کی امت مستقل ہوتی تھی اس لئے اس کو پہلی امت کے آخر میں شمار کرنا بے معنی بات تھی وہاں ہر رسول کا اصل مقام اپنی امت کے اول ہی میں تھا جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاریٰ کے بعد تشریف لائے مگر چونکہ آپ مستقل رسول تھے اور آپ کی امت علیحدہ امت تھی اس لئے آپ کو امت عیسیٰ علیہ السلام کے آخر میں شمار کرنا اور یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت بھی دو رسولوں کے درمیان ہے اس کے اوّل میں عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بے معنی بات ہے۔لیکن اس امت کا معاملہ بالکل مختلف ہے یہاں اس امت کے رسول تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اس امت میں بہ حیثیت رسالت نہ ہوگی اس لئے ان کی امت بھی کوئی جدید امت نہ ہوگی اس لئے ان کو اس امت کے آخر میں شمار کرنا بالکل درست ہے اور اس امت کے حق میں بڑی رحمت کا باعث ہے۔

حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آخر میں آنے والے رسول وہی اسرائیلی رسول ہوں گے اور خود اس امت میں پیدا نہیں ہوں گے کیونکہ اگر وہ خود اس امت میں پیدا ہوں تو پھر ان کو امت کے آخر میں کہنا مناسب نہیں پس یہاں جس طرح امت کے اوّل میں آنے والے رسول کو اس امت میں شمار کرنا صحیح نہیں اسی طرح اس کے آخر میں آنے والے رسول کو اس امت میں پیدا شدہ کہنا صحیح نہیں بلکہ وہ ایسا رسول ہونا چاہئے جو خود رسول ہو مگر آئندہ اس کی کوئی علیحدہ امت نہ ہوتا کہ اس کو اس امت کے آخر میں کہنا صحیح اور بامعنی بات ہو یہ بات دوسری ہے کہ چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں آئے گا اس لئے دورۂ نبوت کے لحاظ سے اس کو آپ کی امت میں بھی شمار کرنا درست رہے تو پھر اس میں ایک عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں تمام انبیاء علیہم السلام بھی آپ کی نبوت کے تحت ہیں اور اس لئے صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ محشر میں آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔مگر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ شان ایک بار دنیا میں بھی ظاہر ہوگی اس لئے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے خاص ان کے اندر یہ رشتہ زیادہ نمایاں رہے گا اس لئے علماء حقائق نے لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں اس خصوصیت کا ظہور قیامت کے دن بھی سب میں ممتاز رہے گا عجب نہیں کہ انا اولی الناس بابن مریم کی صحیح حدیث میں اس طرف بھی کچھ اشارہ ہو۔

(۱۲۶۳) ✱ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حاطبؓ اور شاہ مقوقس کے درمیان ایک مربوط گفتگو کا تذکرہ ﷺ....

رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمُقَوْقِسِ مَلِكِ الاسْكَنْدَرِيَّةِ قَالَ فَجِئْتُهٗ بِكِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَانْزَلَنِىْ فِىْ مَنْزِلِهٖ وَ اَقَمْتَ عِنْدَهٗ ثُمَّ بَعَثَ اِلَىَّ وَ قَدْ جَمَعَ بطارقةً وَ قَالَ اِنِّىْ سَاُكَلِّمُكَ بِكَلَامٍ وَ اُحِبُّ اَنْ تَفْهَمَهٗ مِنِّىْ قَالَ قُلْتُ هَلُمَّ قَالَ اَخْبِرْنِىْ عَنْ صَاحِبِكَ اَلَيْسَ هُمْ نَبِيًّا قُلْتُ بَلٰى هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ فَمَالَهٗ حَيْثُ كَانَ هٰكَذَا لَمْ يَدْعُ عَلٰى قَوْمِهٖ حَيْثُ اَخْرَجُوْهُ مِنْ بَلَدِهٖ اِلٰى غَيْرِهَا قَالَ فَقُلْتُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ اَلَيْسَ تَشْهَدُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَمَا لَهٗ حَيْثُ اَخَذَهٗ قَوْمُهٗ فَاَرَادُوْا اَنْ يَصْلِبُوْهُ اَنْ لَا يَكُوْنَ دَعَا عَلَيْهِمْ بِاَنْ يُّهْلِكَهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ حَتّٰى رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ فِى السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ اَنْتَ الْحَكِيْمُ الَّذِىْ جَاءَ مِنْ عِنْدِ الْحَكِيْمِ. (اخرجه البيهقى فى الخصائص ج ۱ ص ۱۲) قلت و لم يذكره الشيخ قدس سره فى رسالته فى نزول المسيح عليه السلام

وسلم نے مجھ کو مقوقس شاہ اسکندریہ کے پاس بھیجا یہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھ کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور میں ان کے ہاں مقیم رہا پھر کسی فرصت میں انہوں نے مجھ کو یاد فرمایا اور اپنے مذہبی بزرگوں کو بھی دعوت دی اور کہا مجھ کو تم سے ایک بات کہنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کو خوب سمجھ لو یہ کہتے ہیں میں نے عرض کی فرمایئے' فرمایئے! انہوں نے فرمایا اچھا اپنے پیشوا کے متعلق بتاؤ کیا وہ نبی ہیں؟ میں نے عرض کی یقیناً وہ اللہ کے رسول ہیں اس پر انہوں نے کہا تو پھر ان کی قوم نے ان کو اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا تو انہوں نے کیوں اُن پر بددعا نہ کی؟ یہ کہتے ہی میں نے اس کے جواب میں شاہ مقوقس سے کہا کیا آپ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ گواہی نہیں دیتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو پھر جب ان کی قوم نے ان کو پکڑ کر سولی دینے کا ارادہ کیا تھا تو انہوں نے اس وقت ان کے حق میں بددعا کیوں نہ کی کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اس آسمان پر اُن کو اُٹھا لیا - یہ سن کر شاہ مقوقس نے کہا تو خود بھی دانا شخص ہے اور جس ہستی کا فیض یافتہ ہے وہ بھی بڑی صاحب حکمت ہے-

(بیہقی)

ﷺ .... ہے جس کو پڑھ کر بے ساختہ دل اس کی تصدیق پر مجبور ہو جاتا ہے اس گفتگو میں صحابی کو مقوقس کے جواب میں گو صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ "پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں پر بددعا کیوں نہیں کی" مگر انہوں نے شاہ مقوقس پر اور زیادہ زور ڈالنے کے لئے یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہجرت فرمائی تھی وہ تو صرف ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف تھی مگر عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت تو ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف تھی ظاہر ہے کہ آپ نے وطن چھوڑا مگر پھر بھی رہے وطن ہی کے قریب و بعید میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو ایسی جگہ ہجرت فرمائی جہاں نہ وطن کی خبر رہی نہ اہل وطن کی پس بددعاء کا سوال وہاں زیادہ چسپاں ہوتا ہے جہاں مظلومیت زیادہ ہو اس پر شاہ مقوقس نے یہ نہیں کہا کہ تم یہ کیا نامعقول بات کہتے ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کہاں گئے ان کی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے بلکہ وہ لاجواب ہو کر چپ رہ گیا اور اس کو خود ان کی بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی غائبانہ داد دینی پڑی - معلوم ہوا کہ شاہ مقوقس کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ زندہ آسمان پر تشریف لے گئے ہیں اس لئے آسمان ہی سے اتریں گے ان کے علاوہ کسی دوسرے انسان کا دنیا میں پیدا ہونے کا خیال یہ صرف جدید تراشیدہ افسانہ ہے جس کے اہل کتاب ہی قائل تھے نہ علماء اسلام-

(۱۲۶۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْیَمَ مِنَ السَّمَاءِ فِیْکُمْ وَ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ. (ذکرہ البیهقی فی کتاب الاسماء والصفات ص ۳۰۱ و عزاہ للبخاری و مسلم علی عادۃ المحدثین فی کون مرادهم به اصل الحدیث)

(۱۲۶۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - بھلا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان آسمان سے اتریں گے اور تمہارا امام خود تم میں کا ہوگا - (الاسماء والصفات)

و عن ابن عباس فی تفسیر قوله تعالٰی ان تعذبهم فانهم عبادک و ان تغفرلهم ای من ترکت منهم و مدفی عمره حتی اهبط من السماء الی الارض یقتل الدجال فنزلوا عن مقالتهم و وحدوک و افروا انا عبید. و عنه قال لما اراد الله ان یرفع عیسی الی السماء خرج الی اصحابه و فی البیت اثنا عشر رجلاً من الحواریین فخرج علیهم من غیر البیت و راسه یقطر ماء. (درمنثور ج۲ ص ۲۳۸)

ابن عباسؓ آیت ﴿و ان تعذبهم. الخ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے یعنی ان لوگوں کو جن کو تو باقی رکھے - کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمر دراز کردی گئی ہے یہاں تک کہ جب وہ آسمان سے زمین پر اتریں اور دجال کو قتل کردیں تو جو باقی ماندہ اپنے مشرکانہ عقیدے سے باز آکر تیری واحدانیت کے قائل ہوجائیں اور یہ اقرار بھی کریں کہ میں تیرا ایک بندہ ہی ہوں تو تو قادر اور حکمت والا ہے - نیز ابن عباسؓ ﴿بل رفعه اللّٰه الیه﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے صحابہ کے پاس تشریف لائے اس وقت گھر میں صرف بارہ شخص موجود تھے اور وہ گھر کے دروازہ کی بجائے روشندان سے تشریف لے گئے اور اس وقت ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے -

(۱۲۶۶) عَنْ اِبْنِ عباسٍ مَرْفُوْعًا قَالَ الدَّجَال

(۱۲۶۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ

(۱۲۶۵) * حدیث مذکور میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے ہرچند کہ آسمان کے لفظ کی ان تفصیلات کے بعد جو عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بیان میں آچکی تھیں کوئی ضرورت نہ تھی مگر اس کے باوجود چونکہ وہ ایک حقیقت تھی اس لئے اگر بضرورت نہ سہی تو ایک حقیقت کے اظہار کے طور پر ہی سہی اس کا جابجا تذکرہ ملتا ہے حتیٰ کہ حضرت ابن عباسؓ بھی جن کے متعلق یہ داستان گائی جاتی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل تھے مختلف مقامات میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تصریح فرماتے ہیں پھر اس میں شبہ کیا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مرنا ہے کلام صرف اس میں ہے کہ یہ مقدر موت واقع ہوچکی ہے یا آئندہ واقع ہونے والی ہے کتنی نافہمی ہے کہ بالفرض اگر ان کے بارے میں کسی سے موت کا لفظ منقول بھی ہے تو اس کو فوراً بے تحقیق گذشتہ موت پر حمل کرلیا جائے حالانکہ وہ اس کا صاف اقرار بھی کررہا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے جاچکے ہیں اور آئندہ تشریف لاکر عام انسانوں کی طرح وفات پائیں گے -

(۱۲۶۶) * اس حدیث میں بھی صراحت کے ساتھ آسمان کا لفظ موجود ہے اور اُن کے دور کے امن و امان اور اصلاح و امان عام کا ایسا نقشہ موجود ہے جس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی غیر معمولی انسان ہوں گے اب اگر کسی کے دل میں ہر حقیقت کو مجاز بنانا للہ ....

اَوَّلُ مَنْ يَّتْبَعُهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْيَهُوْدِ عَلَيْهِمُ السِّيْجَانُ (الى قوله) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَاءِ عَلٰى جَبَلِ افِيْقِ اِمَامًا هَادِيًا وَّ حَكَمًا عَادِلًا عَلَيْهِ بُرْنُسٌ لَهٗ مَرْبُوْعُ الْخَلْقِ اَمْلَتَ سَبْطُ الشَّعْرِ بِيَدِهٖ حَرْبَةٌ يَقْتُلُ الدَّجَّالَ فَاِذَا قَتَلَ الدَّجَّالُ تَضَعُ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَكَانَ السَّلْمُ فَيَلْقَى الرَّجُلُ الْاَسَدَ فَلَا يَهِيْجُهٗ وَ يَاْخُذُ الْحَيَّةَ فَلَا تَضُرُّهٗ وَ تَنْبُتُ الْاَرْضُ كَنَبَاتِهَا عَلٰى عَهْدِ اٰدَمَ وَ يُؤْمِنُ بِهٖ اَهْلُ الْاَرْضِ وَ يَكُوْنُ النَّاسُ اَهْلَ مِلَّةٍ وَّاحِدَةٍ. (اسحق ابن بشير كنز ج ٧ ص ٦٨٠)

جَزْمُ النَّبِيِّ ﷺ بِاَنَّ النَّازِلَ هُوَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ الَّذِىْ ولد من غَيْرِ اَبٍ و شَيَّدَهٗ لَا بِمَا لَا مَزِيْدَ عَلَيْهِ مِنْ ذِكْرِ اسْمِهٖ وَ نَسَبِهٖ وَ حُلْيَتِهٖ وَالاعمال المهمه التى يَنْزِلُهَا وَ مَنْصبه الَّذِىْ يَنْزِل بِهٖ وَ كَيْفِيَّةَ الامن الشَّامِلِ وُسْعَة الرزق و فيضان المال و غيرها فِىْ عَهْده عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

(١٢٦٧) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سب سے پہلے جو لوگ دجال کی اتباع کریں گے وہ ستر ہزار یہود ہوں گے ان کے سروں پر طیلسان ہوں گے اس سلسلہ میں ابن عباسؓ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام کوہ افیق پر آسمان سے اتریں گے اور وہ امام ہادی اور منصف حاکم ہوں گے برنس (باران کوٹ کی طرح ہوتا ہے) پہنے ہوئے ہوں گے وہ میانہ جسم کے ستے ہوئے رخسار اور سیدھے بالوں والے ہیں ان کے ہاتھ میں نیزہ ہوگا دجال کو قتل کریں گے اور جب اس کے قتل سے فارغ ہو جائیں گے تو جنگ ختم ہو جائے گی اور امن و سلامتی کا یہ عالم ہوگا کہ آدمی اور شیر کا آمنا سامنا ہوگا مگر اس پر حملہ کرنے کا اس کے دل میں ذرا خیال نہ آئے گا آدمی سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے گا اور وہ اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچائے گا اور زمین کی پیداوار میں وہ برکت ہوگی جو کبھی آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تھی اور زمین کے بسنے والے ان پر ایمان لے آئیں گے اور سب مخلوق ایک ہی ملت و مذہب کی ہو جائے گی۔ (کنز)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ آئندہ تشریف لانے والے وہی عیسیٰ ہوں گے جن کی پیدائش بغیر والد کے ہوئی ہے چنانچہ اسی کی وضاحت کے لئے آپؐ نے ان کے نام ان کے نسب اور ان کی شکل وصورت بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے اسی کے ساتھ آپ کی خدماتِ مفوضہ ان کا منصب ان کے زمانہ امن عام کی کیفیت رزق کی فراوانی اور دیگر امور کی تفصیلات بھی بیان فرمائی ہیں

(١٢٦٧) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ﷺ .....کر اس پیشین گوئی کو اپنے نفس پر صادق کرنے کا جذبہ ہو تو اس کا علاج کس کے پاس ہے ہاں جو شخص کسی کی ہوائے نفسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان بصیرت افروز ارشادات کی بے جا تاویلات پر یقین لانے کو ترجیح دے وہ اپنا ٹھکانا خود سوچ لے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

(١٢٦٧) ٭ اس حدیث پر پہلی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں اسی مسیح (اسرائیلی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ ہے جو ایک ﷺ .....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةُ الْعَلَّاتِ اَبُوْهُمْ وَاحِدٌ وَ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ لِاَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُ نَبِيٌّ وَ اَنَّهُ نَازِلٌ فَاِذَا رَاَيْتُمُوْهُ فَاعْرِفُوْهُ فَاِنَّهُ رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ اِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطٌ كَاَنَّ رَاْسَهٗ يَقْطُرُ وَ اِنْ لَّمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَ يَضَعُ الْجِزْيَةَ وَ يُعَطِّلُ الْمِلَلَ حَتّٰى يُهْلِكَ اللّٰهُ فِيْ زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا غَيْرَ الْاِسْلَامِ وَ يُهْلِكُ اللّٰهُ فِيْ زَمَانِهِ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ الْكَذَّابَ وَ تَقَعُ الْاَمَنَةُ فِي الْاَرْضِ حَتّٰى تَرْتَعَ الْاِبِلُ مَعَ الْاَسَدِ جَمِيْعًا وَالنُّمُوْرُ مَعَ الْبَقَرِ وَالذِّئَابُ مَعَ الْغَنَمِ وَ يَلْعَبُ الصِّبْيَانُ وَالْغِلْمَانُ بِالْحَيَّاتِ لَا يَضُرُّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَيَمْكُثُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَمْكُثَ ثُمَّ يَتَوَفّٰى فَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ وَ يَدْفِنُوْنَهٗ.

(مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۷)

سے روایت کرتے ہیں کہ جتنے انبیاء ہیں سب باپ شریک بھائیوں کی طرح ہیں والد ایک اور مائیں علیحدہ علیحدہ ہوں عیسٰی علیہ السلام سے سب سے زیادہ نزدیک میں ہوں میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں دیکھو وہ ضرور اتریں گے اور جب تم ان کو دیکھو تو فوراً پہچان لینا کیونکہ ان کا قد میانہ ہوگا رنگ سرخ وسفید، کنگھی کئے ہوئے سیدھے سیدھے بال یوں معلوم ہوگا کہ سر سے پانی ٹپکنے والا ہے اگرچہ اس پر کہیں تری کا نام نہ ہوگا، وہ گیرو کے رنگ کی چادریں اوڑھے ہوں گے وہ اُتر کر صلیب کو توڑ ڈالیں گے سور کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے، اور تمام مذاہب ان کے زمانہ میں ختم ہو کر صرف ایک مذہب اسلام باقی رہ جائے گا اور ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ جھوٹے مسیح دجال کو ہلاک کرے گا، اور زمین پر امن وامان کا وہ نقشہ قائم ہو گا کہ اونٹ شیروں کے ساتھ اور چیتے بیلوں کے ساتھ اور بھیڑیئے بکریوں کے ساتھ چریں گے اور لڑکے بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور ایک دوسرے کو ذرا کوئی تکلیف نہ دے گا اسی حالت پر جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا وہ رہیں گے پھر ان کی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نمازِ جنازہ ادا کریں گے اور ان کو دفن کر دیں گے۔

(مسند احمد)

٭...بار یہ حیثیت نبوت کے پہلے آ چکے ہیں اور وہی اس امت پر ایک بڑی مصیبت کے وقت دوبارہ پھر تشریف لانے والے ہیں کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے آپ سے وہی اتنے قریب ہیں کہ ان کے اور آپ کے درمیان کوئی نبی نہیں اس لئے بھی اس مصیبت کے وقت آپ کی امت کی ہمدردی کا فرض سب سے پہلے ان ہی پر عائد ہوتا ہے نیز آپ نے اس کی مزید توضیح کے لئے ان کا وہی نام ونسب ان کی اسی ملکی نظافت وطہارت اور ان کے اسی حلیہ مبارک کا تذکرہ فرمایا ہے جس کے بعد کسی مجنون کے لئے بھی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی پھر آپ نے صرف ان کے ماضی سوانح کے بیان پر ہی کفایت نہیں فرمائی بلکہ ان کے مستقبل کے ایسے کارنامے اور ایسی روشن برکات کا بھی تذکرہ فرما دیا ہے جن کے بعد ان کی شناخت میں کوئی ادنیٰ تردد نہیں ہوسکتا اب اگر آپ کے فرمودہ پر ایمان لانا ہے تو وہ واضح سے واضح انداز میں یہ آپ کے سامنے موجود ہے اور اگر اپنے خیالات پر ایمان لانا ہے تو یہود اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں یہی راستہ اختیار کر چکے ہیں۔ کتب سماویہ صاف سے صاف انداز میں آپ کے نام ونسب، آپ کی شکل وشمائل اور آپ کے کارناموں کو کھول کھول کر بیان کرتی رہیں اور یہ بدنصیب ان سب کی تاویلیں کر کر کے آپ کا انکار کرتے رہے۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾

اَلْبَلَدُ الَّذِیْ یَنْزِلُ فِیْهِ عِیْسٰی عَلَیْهِ الصَّلٰوۃ وَالسَّلَامِ و موضع النُّزول منه بعَیْنِه وَ هیانه عِنْدَ نَزُوْلِه وَالْبَرکة العامة فِی الاَشْیَاءِ فِیْ عَهْده عَلَیه الصلٰوۃ وَالسَّلَامُ

(۱۲۶۸) عن النواس بْنِ سَمْعَانَ قَالَ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الدَّجَّال ذَاتَ غَدَاةٍ فَخَفَّضَ فِیْهِ وَ رَفَعَ حَتّٰی ظَنَنَّاهُ فِیْ طَائِفَةِ النَّخْلِ فَلَمَّا رُحْنَا اِلَیْهِ عَرَفَ ذٰلِکَ فِیْنَا فَقَالَ مَا شَانُکُمْ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهُ ذکَرت الدَّجَّال غَدَاةً فَخَفَّضْت فِیْهِ وَ رَفَّعتَ حَتّٰی ظَنَنَّاهُ فِیْ طَائفَةِ النَّخل فَقَالَ غَیْرُ الدَّجَّال اَخْوَفُنِیْ عَلَیْکُمْ اِنْ یَّخْرُجَ وَ اَنَا فِیْکُمْ فَاَنَا حَجِیْجَهٗ دُوْنَکُمْ وَ اِنْ یَّخْرُجْ وَ لَسْتُ فِیْکُمْ فَاَمْرٌ حَجِیْجُ نَفْسِهٖ وَاللّٰهُ خَلِیْفَتِیْ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ. اِنَّهٗ شَابٌّ قَطط عَیْنُهٗ طَافة کَاَنْ اُشَبِّهُهٗ بِعَبْدِ العزیٰ بن قَطَنٍ فَمَنْ اَدْرَکَ مِنْکُمْ فَلْیَقْرَءْ عَلَیْهِ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ الْکَهْفِ. اِنَّهٗ خَارِجٌ خَلَّةً بَیْنَ الشَّامِ وَ الْعِرَاقِ فَعَاثَ یَمِیْنًا وَ عَاثَ شِمَالًا یَا عِبَادَاللّٰهِ فَاثْبُتُوْا قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا لَبْثهٗ

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شہر کا نام اور اُس شہر میں خاص محل نزول کا نام اور نزول کے وقت اُن کا مکمل نقشہ اور ان کے زمانہ کی برکات

(۱۲۶۸) نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں کہ ایک دن صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی اہمیت سے دجال کا تذکرہ فرمایا کہ مارے دہشت کے ہم کو یوں معلوم ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں موجود ہے جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے اس دہشت وخوف کو محسوس کرلیا اور پوچھا تم ایسے پریشان کیوں نظر آتے ہو؟ ہم نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے صبح دجال کا ذکر اتنی اہمیت کے ساتھ فرمایا کہ ہم کو یوں معلوم ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں ہے آپ نے فرمایا مجھ کو تم پر دجال سے بڑھ کر دوسری باتوں کا زیادہ اندیشہ ہے دجال کا کیا ہے اگر وہ میری موجودگی میں نکلا تو میں تمہارے بجائے خود اس سے نمٹ لوں گا ورنہ تو ہر شخص خود اس کا مقابلہ کرے اور میں نے تم سب کو خدا کے سپرد کیا۔ دیکھو وہ جوان ہوگا اس کے بال سخت گھونگر والے اور اس کی آنکھ انگور کی طرح باہر کو ابھری ہوئی ہوگی بالکل اس شباہت کا شخص سمجھو جیسا یہ عبدالعزیٰ بن قطن ہے تو تم میں جو شخص بھی اس کا زمانہ پائے اس کو چاہئے کہ وہ سورۂ کہف کی اوّل کی آیتیں پڑھ لے۔ وہ شام اور عراق کی درمیانی گھاٹیوں سے ظاہر ہوگا اور اپنے دائیں بائیں ہر سمت بڑا ادھم مچائے گا تو اے اللہ کے بندو! دیکھو اس وقت ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنے عرصہ تک زمین پر رہے گا؟ فرمایا چالیس دن

(۱۲۶۸) * اس حدیث میں دجال کا تذکرہ قدرے محل غور ہے اس کے مباحث اپنے محل میں آئیں گے ان میں سے صرف ایک بات کی تشریح یہاں کرنی مناسب ہے، حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے زمانہ میں ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا حتیٰ کہ اس ایک دن میں ایک سال کی نمازیں ادا کرنی ہوں گی۔ دن کی اس طوالت کی صورت کیا ہوگی؟ اس کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جب دنیا میں ان عجائبات کے ظہور کا زمانہ شروع ہو جائے گا تو عالم کے موجودہ نظم ونسق کے تحت ان وقعات کے حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی بھی مفت کی دردسری ہے تاہم حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں شیخ محی الدین ابن ﷲ....

فِی الْاَرْضِ قَالَ اَرْبَعُوْنَ یَوْمًا. یَوْمٌ کَسَنَةٍ. وَ
یَوْمٌ کَشَهْرٍ وَ یَوْمٌ لِجُمُعَةٍ وَ سَائِرُ اَیَّامِهٖ
کَاَیَّامِکُمْ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذَالِکَ الْیَوْمُ
الَّذِیْ کَسَنَةٍ اَتَکْفِیْنَا فِیْهِ صَلٰوةُ یَوْمٍ قَالَ لَا
اَقْدِرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا
اَسْرَعُهٗ فِی الْاَرْضِ قَالَ کَالْغَیْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ
الرِّیْحُ فَیَأْتِیْ عَلَی الْقَوْمِ فَیَدْعُوْهُمْ فَیُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ وَ یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهٗ فَیَامُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ
وَالْاَرْضَ فَتُنْبِتُ فَتَرُوْحُ عَلَیْهِمْ سَارِحَتُهُمْ
اَطْوَلَ مَا کَانَتْ ذُرًی وَ اَسْبَغَهٗ ضُرُوْعًا وَ
اَمَدَّهٗ خَوَاصِرَ ثُمَّ یَاْتِی الْقَوْمَ فَیَدْعُوْهُمْ
فَیَرُدُّوْنَ عَلَیْهِ قَوْلَهٗ فَیَنْصَرِفُ عَنْهُمْ
فَیُصْبِحُوْنَ مُمْحِلِیْنَ لَیْسَ بِاَیْدِیْهِمْ مِنْ شَیْءٍ
مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَ یَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَیَقُوْلُ لَهَا
اَخْرِجِیْ کُنُوْزَکِ فَتَتْبَعُهٗ کُنُوْزُهَا کَیَعَا
سِیْبِ النَّحْلِ ثُمَّ یَدْعُوْهُمْ رَجُلًا مُمْتَلِئًا شَبَابًا
فَیَضْرِبُهٗ بِالسَّیْفِ فَیَقْطَعُهٗ جَزْلَتَیْنِ رَمْیَةَ
الْغَرَضِ ثُمَّ یَدْعُوْهُ فَیُقْبِلُ وَ یَتَهَلَّلُ وَجْهُهٗ وَ
یَضْحَکُ فَبَیْنَمَا هُوَ کَذَالِکَ اِذَا بَعَثَ اللّٰهُ

لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا اور پھر دوسرا ایک ماہ اور تیسرا ایک جمعہ کے برابر ہوگا اس کے بعد بقیہ دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہوں گے ہم نے پوچھا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس دن ہم کو ایک ہی دن کی نمازیں ادا کرنی کافی ہوں گی؟ فرمایا نہیں بلکہ ایک دن کی برابر نمازوں کا اندازہ کرکر کے نمازیں ادا کرتے رہنا۔ ہم نے پوچھا وہ کس رفتار سے زمین پر گھومے گا؟ فرمایا اس تیز رفتار بادل کی طرح جس کو پیچھے سے ہوا اڑائے لا رہی ہو وہ کچھ لوگوں کے پاس آکر ان کو اپنی خدائی پر ایمان لانے کی دعوت دے گا وہ اس پر ایمان لے آئیں گے وہ خوش ہوکر آسمان کو بارش کا حکم دے گا فوراً بارش آجائے گی اور زمین کو حکم دے گا اسی وقت وہ سبزہ زار ہوجائے گی اور شام کو جب ان کے حیوانات چراگاہوں سے چر کر واپس ہوں گے تو ان کے اونٹوں کے کوہان پہلے سے زیادہ لمبے لمبے ان کے تھن پہلے سے زیادہ دودھ سے لبریز اور ان کی کوکھیں پہلے سے زیادہ تنی ہوئی ہوں گی اس کے بعد وہ کچھ اور لوگوں کے پاس جائے گا اور ان کو بھی اپنی خدائی کی دعوت دے گا مگر وہ اس کو نہ مانیں گے جب وہ ان کے پاس سے واپس ہوگا تو یہ بیچارے سب قحط میں مبتلا ہوجائیں گے اور ان کے قبضہ میں کوئی مال نہ رہے گا (سب دجال کے ساتھ چلا جائے گا) پھر وہ ایک شور زمین سے گذرے گا اور اس کو یہ حکم دے گا ''اپنے تمام خزانے باہر اگل دے'' وہ سب کے سب اس کے پیچھے پیچھے اس طرح ہولیں گے جیسے مکھیوں کے سردار کے پیچھے پیچھے سب مکھیاں ہوتی ہیں اس کے بعد ایک شخص کو بلائے گا جو اپنے پورے شباب پر ہوگا اور تلوار سے اس کے

؎ .... عربی سے نقل کیا ہے کہ مصائب وآلام کے ان ہنگاموں میں اگر عام گرد وغبار اور غلیظ ابر کی وجہ سے رات و دن متمیز نہ ہوں سکیں تو کچھ بعید نہیں ہے آج بھی معمولی بارشوں میں عصر ومغرب وعشاء کی نمازوں میں تقدیم وتاخیر ہوجانا' معمولی بات ہے ذرا زیادہ گرہن لگ جائے تو ظہر کا پتہ ملنا بھی مشکل ہے صبح کی نماز کا تو کہنا ہی کیا ہے پس بہت ممکن ہے کہ اس سب سے بڑے فتنے کا ظہور کے وقت جس طرح روحانیت کا عالم تاریک در تاریک ہوگا اسی طرح عام عنصریات بھی گرد وغبار اور ابر وباراں کی وجہ سے اتنا مکدر اور تاریک ہوجائے کہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہی ممکن نہ رہے کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب آیا اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قضاء، عالم یکساں نظر آنے لگے ان حالات میں اس کے سواء اور کیا صورت ہوگی کہ اوقاتِ نماز کا صرف ایک اندازہ رکھا جائے رہا گھڑیوں کا سوال تو گھڑیاں موجود ہیں مگر سب جانتے ہیں کہ خاص کر عرب میں نماز دن کا تعلق اب بھی آفتاب کے طلوع وغروب ہی کے ساتھ ہے یعنی غروب آفتاب پر یہاں سب گھڑیوں ؎ ....

الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ فَيَنْزِلَ عِبْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْرُوذَتَيْنِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلَى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ اِذَا طَاطَاءَ رَاسَهُ قَطَرَ وَ اِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيْحَ نَفَسِهِ اِلَّا مَاتَ وَ نَفَسُهُ يَنْتَهِي اِلَى حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ فَيَطْلُبُهُ حَتَّى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ ثُمَّ يَأْتِيْ عِيْسَى قَوْمًا قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوْهِهِمْ وَ يُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَالِكَ اِذْ اَوْحَى اللّٰهُ اِلَى عِيْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنِّيْ قَدْ اَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّيْ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِيْ اِلَى الطُّوْرِ وَ يَبْعَثُ اللّٰهُ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ فَيَمُرُّ اَوَائِلُهُم عَلَى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ

دو ٹکڑے کر کے اتنی دور پھینک دے گا جتنا تیرانداز اور اس کے نشانہ لگانے کی جگہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے پھر اس کو آواز دے کر بلائے گا وہ ہنستا کھلکھلاتا چلا جائے گا ادھر وہ یہ شعبدہ بازیاں دکھلا رہا ہوگا ادھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجے گا وہ دمشق کے مشرقی سفید منارہ پر اتریں گے اور دو زرد زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے سر جھکائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہوں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو بالوں میں چاندی کے سے موتی گرتے محسوس ہوں گے جس کافر کو ان کے سانس لگ جائیں گے وہ زندہ نہ رہ سکے گا اور ان کے سانس کا اثر اتنے فاصلہ تک پڑے گا جہاں تک کہ ان کی نظر جائے گی وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور باب لد (بیت مقدس میں ایک مقام ہے) پر اس کو پکڑ لیں گے اور یہاں اس کو قتل کر دیں گے اس کے قتل سے فارغ ہو کر عیسیٰ علیہ السلام پھر ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو اس کے فتنہ سے بچ رہے ہوں گے اور ان کو تسلی و تشفی دیں گے اور جنت میں ان کے مراتب کا حال بیان فرمائیں گے پھر عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئے گی کہ اب میری ایک ایسی مخلوق نکلنے والی ہے جس کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں لہٰذا میرے بندوں کو کوہ طور کی طرف لے جا کر

ﷺ..... میں ۱۲ بجا دیئے جاتے ہیں اس وجہ سے تمام سالمین یہاں مغرب وعشاء کا وقت کبھی نہیں بدلتا یعنی مغرب ہمیشہ بارہ بجے اور اس کے بعد عشاء ہمیشہ ڈیڑھ بجے کے قریب ہوتی ہے اور اس لئے روزمرہ غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ گھڑی کو بھی موسموں کے لحاظ سے آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے- دوسرے شہروں میں تاریخ کی تبدیلی نصف شب کے بعد ہوتی ہے- یہاں ہمیں اس پر گفتگو کرنی نہیں ہے کہ ان دونوں نظاموں میں کونسا نظام معقول اور بہتر ہے کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ موجودہ عقول کے سامنے مادی ہر مشکل مشکل ہے لیکن اس کے مقابلہ میں صحیح حدیثوں کا انکار یا تاویل کوئی مشکل نہیں اس لئے دماغوں میں یہ سوال گذر سکتا ہے کہ گھڑیوں کے بعد نمازوں کے اوقات میں اب کوئی مشکل نہیں ہوسکتی [1]

[1] اس تفصیل میں اس وقت ہم جانا پسند نہیں کرتے کہ جس زمانے میں ان مصنوعات کا تصور بھی دماغوں میں موجود نہ ہو اس میں ایک امی قوم کے سامنے ان جدید آلات کا تذکرہ کرنا ایک سیدھی بات کے سمجھنے میں کتنی مشکلات کا باعث بن سکتا تھا غالباً اسی مصلحت سے یاجوج و ماجوج کے خاص آلاتِ حرب کے نام بھی تذکرہ میں نہ آئے ہوں پھر یہ کس کو خبر ہے کہ ایٹمی طاقتوں کے استعمال کے نتیجہ میں آئندہ قوانین جنگ میں آلاتِ حرب کی اجازت کس حد تک رہ جائے گی- بہرحال جب تک مستقبل حوادث کے متعلق یہ تفصیلات حدیث میں نہیں آئیں تو صرف اپنے دماغی سوال و جواب سے ان ثابت شدہ تفصیلات کا انکار کرنا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا جو صحیح طریقوں سے معرض بیان میں آ چکی ہیں-

فَيَشْرَبُوْنَ مَا فِيْهَا وَ يَمُرُّ اٰخِرُهُمْ فَيَقُوْلُوْنَ لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهٖ مَرَّةً وَ يُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَام وَ اَصْحَابُهٗ حَتّٰى يَكُوْنَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِاَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مِّائَةِ دِيْنًا لاحدكم الْيَوْمَ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَام وَ اَصْحَابُهٗ فَيُرْسِلُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِيْ رِقَابِهِمْ فَيُصْبِحُوْنَ فَرْسٰى كَمُوْتِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اَصْحَابُهٗ اِلَى الْاَرْضِ فَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ مِثْلِي الْاَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ الاملائهٗ زَهَمُهُمْ وَ نَتْنُهُمْ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اَصْحَابُهٗ اِلَى اللّٰهِ فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَاَعْنَاقِ الْبُخْتِ فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَا يَكُنُ

جمع کردو- پھر یاجوج و ماجوج ہر پست زمین سے نکل پڑیں گے پہلے ان کا گذر طبریہ کے (مقام کا نام ہے) پانی پر ہوگا وہ اس کو پی کر اس طرح ختم کر دیں گے کہ جب ان کا آخری گروہ ادھر سے گذرے گا تو یوں کہے گا ''کبھی یہاں پانی تھا'' پھر بیت مقدس کے خمر پہاڑ پر پہنچیں گے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں کہیں گے ہم زمین والوں کو تو ختم کر چکے لوآؤ اب آسمان والوں کا بھی کام تمام کر دیں اور اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے قدرت اُن کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کردے گی ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی جماعت کوہ طور میں محصور ہوگی یہاں تک کہ بیل کا ایک سرا اتنا قیمتی ہو جائے گا جیسا آج تمہارے نزدیک سو دینار ہیں اس تنگی کی حالت میں عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت مل کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگی ان کی دعاء سے ان کی گردنوں میں پھوڑے نکل آئیں گے اور وہ سب کے سب ایک دم میں اس طرح پھول پھٹ کر مر جائیں گے جیسا ایک آدمی مرتا ہے- جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے اتر کر آئیں گے تو زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ نہ ہوگی جہاں ان کے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو اور چربی کا اثر نہ ہو- عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت پھر اللہ

؎.... اس کے علاوہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی بھی کچھ تفصیلات مذکور ہیں ان کو آپ خالی الذہن ہو کر بار بار پڑھیں پھر یہ سوچیں کہ عربی زبان کے مطابق کیا ان تفصیلات میں کسی مجاز و استعارہ کا ارادہ کیا گیا ہے- ہم کو مجاز و استعارہ سے انکار نہیں مگر آپ کو بھی حقیقت سے انکار نہ ہونا چاہئے اگر سیاق کلام سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہاں متکلم نے یقیناً استعارہ و مجاز سے کام نہیں لیا تو پھر بے وجہ کھینچ کھینچ کر ایک حقیقت کو استعارہ و مجاز کا لباس پہنانا لا حاصل ہے-

ابھی آپ حضرات ابن عباسؓ سے یہ روایت پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان پر اٹھائے گئے تھے تو اس وقت ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے یہ کرشمہ قدرت ہے کہ جب وہ نازل ہوں گے تو اس وقت بھی یونہی نظر آئے گا کہ ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں گویا وہ غسل کر کے ایک دروازہ سے نکلے تھے اور پانی خشک ہونے سے پہلے اب دوسرے دروازہ سے داخل ہو رہے ہیں- جس عالم میں نہ دن ہو نہ رات نہ سردی ہو نہ گرمی اور نہ صحت ہو نہ مرض پھر اس عالم میں اگر پانی کے یہ قطرے بھی کسی تغیر سے محفوظ رہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے-

پھر جس خدا تعالیٰ میں یہ قدرت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کو پرندوں کی زندگی کا سبب بنا دے اس میں یہ طاقت کیوں نہیں کہ اسی سانس کو وہ دجال کے حق میں سم قاتل قرار دے دے- اسی طرح یہ بھی اس کی حکمت ہے کہ دجال جیسی قوت کو وہ ان کے صرف ایک اشارہ سے ہلاک کر دے اور دوسری طرف یاجوج و ماجوج کے مقابلہ سے عاجز بنا کر طور یک گوشہ نشینی پر مجبور کر دے تا کہ ؎....

مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَ لَا وَ بَرٍ فغسل الأرْض حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ ثُمَّ يُقَالُ لِلْاَرْضِ اَنْبِتِىْ ثَمَرَتَكِ وَ رُدِّىْ بَرَكَتَكِ فَيَوْمَئِذٍ تَاكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَانَةِ وَ يَسْتَظِلُّوْنَ بِقِحْفِهَا وَ يُبَارَكُ فِى الرَّسْلِ حَتّٰى اَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِىْ الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَبَيْنَمَا هُمْ كَذَالِكَ اِذَا بَعَثَ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتَاخُذُهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ فَتَقْبَضُ رُوْحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَ كُلِّ مُسْلِمٍ وَ يَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَا رَجُوْنَ فِيْهَا تَهَارُجَ الحمر فَعَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ.

(رواه مسلم صفحه ۴۰۲ ج ۲. و ابوداؤد ص ۱۳۵۰ ج ۲ و عزاه فى الكنز ص ۳۶۸ ج ۱ لا بن عساكر و فى لفظه انهبط عيسىٰ ابن مريم و احمد فى مسنده ص ۱۸۱ و ص ۱۸۲ ج ۱)

تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری کرے گی اس پر اللہ تعالیٰ ایک قسم کا پرندہ بھیجے گا جن کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح لمبی لمبی ہوں گی وہ ان کو اٹھا کر جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا ڈال دیں گے اور ایک روایت میں ہے کہ مقام نہبل میں پھینک دیں گے پھر مسلمان ان کے تیر و کمان اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلاتے رہیں گے اور آسمان سے اس زور کی بارش برسے گی کہ کوئی بستی نہ رہے گی اور جنگل میں کوئی خیمہ نہ بچے گا جس میں بارش نہ ہو یہاں تک کہ تمام زمین میں پانی کی نالیوں کی طرح پانی ہی پانی ہوگا پھر زمین کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ اپنے پھل اور اپنی سب برکت ظاہر کردے تو وہ برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار سے ایک جماعت کا پیٹ بھر جائے گا اور اس کا چھلکا ان کے سایہ کے لئے کافی ہوگا اور اونٹنی کے ایک مرتبہ کے دودھ میں اتنی برکت ہوگی کہ ایک دودھ والی اونٹنی کئی کئی جماعتوں کے لئے کافی ہوگی اور ایک دودھ کی گائے ایک قبیلہ کو اور ایک دودھ کی بکری ایک چھوٹے خاندان کو کافی ہوگی مخلوق خدا اسی فراغت وعیش کی حالت میں ہوگی کہ ایک اچھی ہوا چلے گی اور اس سے مسلمانوں کی بغلوں میں پھوڑے نکل آئیں گے اور ان سب کو موت آجائے گی اور صرف بدترین قسم کے کافر بچ رہیں گے جو گدھوں کی طرح منظر عام پر رتا کرتے پھریں گے ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ (مسلم)

لله.... طرف دنیا کو یہ واضح ہو جائے جس پر دعویٰ الوہیت کی تہمت لگائی گئی تھی وہ تو مدعی الوہیت کا قاتل ہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے کہ جس نے ایک مدعی الوہیت کو قتل کیا ہے وہ خود خدا نہیں بلکہ وہ تو ایک بے چارہ بشر ہے اور اس طرح طاقت وضعف کے ان دونوں مظاہروں میں اصل خدائے قہار ہی کی طاقت کا جلوہ نظر آئے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر وطغیان کی طاقتوں کو قدرت نے پہلے ہی قدم پر سزا نہیں دے دی بلکہ استدراج و امہال کا قانون برابر ان کے ساتھ جاری رہا ہے فرعون ونمرود شداد و ہامان کی داستانیں پڑھ لو تم کو ثابت ہوگا کہ جب کفر وطغیان اپنی پوری طاقت کو پہنچ چکا ہے تو اس کے بعد پاداش عمل کے قانون نے ان کو پکڑا ہے پھر وہی سنت یہاں یا جوج و ماجوج کے ساتھ بھی جاری ہوگی جب وہ آسمان والوں کے قتل سے مطمئن ہو جائیں گے تو پھر ایسے ہی طریقے سے ان کو ہلاک کیا جائے گا جو آسمان والے کی طرف سے ہوگا تا کہ عالم علوی کی شکست کا جواب سب غلط ہو کر رہ جائے۔

پھر دنیا کے خاتمہ پر وہی ایک دین رہ جائے گا جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے شروع ہوا تھا اور آسمان وزمین کی وہی برکتیں ظاہر ہو چکی ہیں اور اس طرح سے اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ کا دوسرا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے کن حکمتوں سے عالم کو بچھایا' کن حکمتوں سے اس کو پھیلایا' پھر کن حکمتوں سے اس کو سمیٹے گا یہ خود وہی جانتا ہے۔ ہم بے وجہ ہر جگہ ان کے سمجھنے کے لئے اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔

دریا محیط خویش موجے دارد ۔۔۔ خس پندارد کہ ایں کشاکش با دلیست

ذِكرَ عِيسٰى عَلَيهِ الصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ فِيْ محاورته مَعَ النَّبى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ المعْرا ج انَّهُ نَازل قَبْل قيامِ الساعة و انَّهُ قاتل الدجال و لم يذكر فيه انه ينزل لاصلاح هٰذه الامة خاصة و انما يكُوْنُ هٰذا مِنْ وظائِف اِمَامها

شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت ؐ سے یہ تذکرہ کرنا کہ قیامت کی آمد کا صحیح وقت ان کو بھی معلوم نہیں مگر صرف یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے ان کو دجال کو قتل کرنا ہے اس ضمن میں انہوں نے امت محمدیہؐ کی اصلاح کا ایک حرف بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ خدمت دراصل خود اس امت ہی کے ایک شخص کے متعلق ہوگی اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

(۱۲۶۹) عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقِيْتُ لَيْلَة اسرى بِىْ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى قَالَ فَتَذَاكَرُوْا اَمْرَ السَّاعَةِ فَرَدُّوْا اَمْرَهُمْ اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ فَقَالَ لَاعِلْمَ لِىْ بِهَا فَرَدُّوْا الْاَمْرَ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ لَاعِلْمَ لِىْ بِهَا فَرَدُّوْا الْاَمْرَ اِلٰى عِيْسٰى. فَقَالَ اَمَّا وَجْبَتُهَا فَلَا يَعْلَمُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ تَعَالٰى. ذَالِكَ وَ فِيْمَا عَهِدَ اِلٰى رَبِّىْ عَزَّوَجَلَّ اَنَّ الدَّجَّالَ خَارِجٌ قَالَ وَ مَعِىْ قَضِيْبَانِ فَاِذَا رَاٰنِىْ ذَابَ كَمَا يَذُوْبُ الرَّصَاصُ قَالَ فَيُهْلِكُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَتّٰى اَنَّ الْحَجَرَ وَالشَّجَرَ لَيَقُوْلُ يَامُسْلِمُ ان تَحْتِىْ كَافِرًا فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ قَالَ فَيُهْلِكُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ يَرْجِعُ النَّاسُ اِلٰى بِلَادِهِمْ وَ اَوْطَافِهِمْ قَالَ فَعِنْدَ ذَالِكَ

(۱۲۶۹) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے شب معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ (علیہم السلام) سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی انہوں نے باہم قیامت کا ذکر چھیڑا آخر فیصلہ کے لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے معاملہ پیش کیا انہوں نے فرمایا مجھ کو تو صحیح وقت کی کچھ معلومات نہیں پھر معاملہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آیا انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے معاملہ آیا تو انہوں نے فرمایا قیامت کے آنے کا ٹھیک وقت تو بجز ایک ذات اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو بھی نہیں ہے ہاں صرف اتنی بات میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ دجال نکلے گا اور میرے ساتھ دو شاخیں ہوں گی اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑے گی تو وہ اس طرح پگھل جائے گا جیسا سیسہ (آگ میں) پگھل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کر دے گا پھر یہ نوبت آ جائے گی کہ درخت اور پتھر آوازیں دے دے کر کہیں گے او مسلمان! دیکھ میرے پیچھے کافر چھپا ہوا ہے لپک کر آ اور

(۱۲۶۹) * دیکھئے یہاں جب قیامت کا تذکرہ آیا اور جواب کی نوبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آئی تو انھوں نے اپنی لاعلمی کے ساتھ ساتھ فوراً اسی بات کا تذکرہ فرمایا جو قیامت کے ساتھ یقین کے اسی درجہ میں ہے۔ یعنی ان کا پھر تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا۔ احادیث میں کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے تشریف لانے کا اصل مقصد اس امت کی اصلاح ہوگی تاکہ یہ سوال پیدا ہو کہ اس امت کے اصلاح کے لئے اسرائیلی رسول کی آمد میں اس امت کی کسر شان ہے۔ حالانکہ یہ سوال ہی جاہلانہ سوال ہے ہم آج بھی خدا تعالیٰ کے سب رسولوں پر بقیہ .....

یَخْرجِ یَاجُوْجُ وَ مَاجُوْجُ وَ ھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ فَیطئُوْنَ بِلادھُمْ لا یَاْتُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ اِلَّا اَھْلَکُوْہُ وَ لا یَمُرُّوْنَ عَلٰی مَاءٍ اِلَّا شَرِبُوْہُ ثُمَّ یَرْجِعُ النَّاسُ اِلَیَّ فَیَشْکُوْنَھُمْ فَادْعُوْا عَلَیْھِمْ فَیُھْلِکُھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ یُمِیْتُھُمْ حَتّٰی تَجْوَی الْاَرْضُ مِنْ نتن رِیْحِھِمْ قَالَ فَیُنْزِلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ الْمَطَرَ فتجرف اَجْسَادَھُمْ حَتّٰی یَقْذِفَھُمْ فِی الْبَحْرِ قَالَ اَبِیْ ذَھَبَ عَلَیَّ ھٰھُنَا شَیْءٌ لَّمْ اَفْھَمْہُ کَادِیْمِ وَ قَالَ یَزِیْدُ یَعْنِی ابن ھَارُوْنَ ثُمَّ تُنْسَفُ الْجِبَالُ وَ تُمَدُّ الْاَرْضُ مَدَّالْاَدِیْمِ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰی حَدِیْثِ ھُشَیْمٍ. قَالَ فَفِیْمَا عَھِدَ اِلَیَّ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ ذَالِکَ اِذَا کَانَ کَذَالِکَ فَاِنَّ السَّاعَۃَ کَالْحَامِلِ الْمُتِمِّ الَّتِیْ لَا یَدْرِیْ اَھْلُھَا مَتٰی تَفْجَؤُھُمْ بِوِلادِھَا لَیْلًا اَوْنَھَارًا. (رواہ احمد فی مسندہ ص ۳۷۵ ج ۱ والحاکم فی المستدرك و قال صحیح علی شرط الشیخین و لم یخرجاہ و وافقہ الذھبی علی ذالك فی التلخیص و اقر الحافظ فی الفتح من نزول عیسٰی علیہ السلام. و اخرجہ ابن ماجہ و ابن ابی شیبہ و ابن جریر و ابن المنذر و ابن مردویہ والبیھقی کذا فی الدرالمنثور ج ٤ ص ٣٣٦)

اس کو بھی قتل کر آخر کار فرسب ہلاک ہو جائیں پھر لوگ اپنے اپنے شہر اور وطن کو واپس ہوں گے تو اس وقت یاجوج و ماجوج کی قوم کا حملہ ہوگا اور وہ ہر پست زمین سے نکل نکل کر بکھر پڑیں گے۔ بستیوں میں گھس پڑیں گے جس جس چیز پر بھی ان کا گذر ہوگا اس کو برباد کر ڈالیں گے اور جس پانی پر سے گذریں گے وہ سب پی کر ختم کر دیں گے آخر لوگ شکایت لے کر میرے پاس آئیں گے میں ان پر بددعا کروں گا اللہ تعالیٰ میری بددعا سے ان سب کو ہلاک کر دے گا اور وہ سب مرجائیں گے تمام زمین ان کی بدبو سے سڑ جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا جو ان کی نعشوں کو بہا کر سمندر میں ڈال دے گی راوی کہتا ہے کہ اس مقام پر میرے والد نے کچھ فرمایا تھا وہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا صرف ''کادیم'' کا لفظ سننے میں آیا۔ یزید بن ہارون راوی کہتا ہے پوری بات یہ تھی کہ پھر پہاڑ دھن دیئے جائیں گے اور زمین جانور کے چمڑے کی طرح پھیلا کر سیدھی کر دی جائے گی اس کے بعد پھر اصل حدیث بیان فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اور منجملہ ان باتوں کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمائی ہیں یہ ہے کہ جب ایسا ہو تو پھر قیامت اتنی نزدیک سمجھنا چاہئے جیسا وہ گابھن جانور جس کے بچے کی پیدائش کی مدت پوری ہو چکی ہو اور اس کے مالک ہر وقت اس انتظار میں ہوں کہ دن رات میں نہ معلوم کب بچہ پیدا ہو جائے۔

مِنْ اَھَمِّ وَظَائِفِ عِیْسٰی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃ والسلام قَتْلُ الدَّجَّال

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمات میں سب سے نمایاں تر خدمت دجال کو قتل کرنا ہے

(۱۲۷۰) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاھِلِیْ فِیْ حَدِیْثٍ

(۱۲۷۰) حضرت ابوامامہ باہلی دجال کی ایک طویل حدیث میں نقل کرتے

﴿....ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے لئے نہ صرف یہ کہ یہ موجب شرف ہے بلکہ مدار نجات ہے تو پھر اگر کوئی رسول آ کر ہماری اصلاح کرتا ہے تو ہمارے لئے اس میں کسر شان کی بات کیا ہے ہاں اگر کسی رسول کی آمد سے ہمارے رشتہ امت پر زد پڑتی ہے اور وہ ہم کو دوسری امت بنانا چاہتا ہے تو اس میں صرف ہماری کسر شان نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر شان بھی ہے۔ و العیاذ باللّٰہ.

(۱۲۷۰) ٭ سبحان اللہ جس شخصیت عظمیٰ کی برکات یہ ہوں وہ یقیناً کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا ضرور وہ کوئی خدا تعالیٰ کا قدوس ﴿....

طَوِیْلٍ مِنْ ذِکْرِ الدَّجَّالِ فَقَالَتْ اُمِّ شَرِیْک بِنْت اَبِی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَاَیْنَ الْعَرَبُ یَوْمَئِذٍ قَالَ الْعَرَبُ یَوْمَئِذٍ قَلِیْلٌ وَ جُلُّھُمْ بِبَیْتِ الْمُقَدَّسِ وَ اِمَامُھُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ فَبَیْنَمَا اِمَامُھُمْ قَدْ تَقَدَّمَ یُصَلِّی بِھِمُ الصُّبْحَ اِذَا نَزَلَ عَلَیْھِمْ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ الصُّبْحَ فَرَجَعَ ذَالِکَ الْاِمَامُ یَنْکُصُ یَمْشِی قَھْقَرِیْ لِیَقْدَمَ عِیْسٰی لِیُصَلِّیْ فَیَضَعُ عِیْسٰی یَدَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ ثُمَّ یَقُوْلُ لَہٗ تَقَدَّمْ فَصَلِّ فَاِنَّھَا لَکَ اُقِیْمَتْ فَیُصَلِّیْ بِھِمْ اِمَامُھُمْ فَاِذَا انْصَرَفَ قَالَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ اِفْتَحُوْا الْبَابَ فَیُفْتَحُ وَ رَاءَہُ الدَّجَّالُ وَ مَعَہٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ یَھُوْدِیٍ کُلُّہٗ ذُوْسَیْفٍ مَحَلًّی وَ تَاجٍ فَاِذَا نَظَرَ اِلَیْہِ الدَّجَّالُ ذَابَ کَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ وَ یَنْطَلِقُ ھَارِبًا وَ یَقُوْلُ عِیْسٰی اِنَّ لِیْ فِیْکَ ضَرْبَۃً لَنْ تَسْبِقَنِیْ بِھَا فَیُدْرِکُہٗ عِنْدَ بَابِ اللُّدِّ الشَّرْقِیْ فَیَقْتُلُہٗ فَیَھْزِمُ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ (الی قولہ) و یترک الصَّدقہ فَلَا یُسْعٰی عَلٰی شَاۃٍ وَ لَا عَلٰی بَعِیْرٍ وَ تُرْفَعُ الشَّحْنَاء وَ التَّبَاغُضُ وَ تَنزع حِمَۃُ کُل ذَاتِ حمۃ حتی یدخل الولیدۃ یدہ فی الحیۃ فلا تضرہ و تفر الولیدۃ الاسد فلا یضرھا و یکون

ہیں کہ ام شریک نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دن (یعنی دجال کے زمانہ میں) عرب کہاں چلے جائیں گے (کہ مسلمانوں کا یہ ابتر حال ہو جائے گا) فرمایا اس وقت عرب بہت کم رہ جائیں گے اور اکثر وہ بیت مقدس میں ہوں گے اور اس وقت ان کا امام ایک نیک شخص ہوگا۔ اس اثنا میں کہ یہ امام صبح کی نماز پڑھانے آگے بڑھ چکا ہوگا کہ دفعۃً عیسیٰ علیہ السلام اتر آئیں گے۔ یہ ان کو دیکھ کر مصلی سے پچھلے پیروں اُلٹے ہٹ آئیں گے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھائیں تو عیسیٰ علیہ السلام (شفقت کے انداز میں) اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے آگے بڑھو اور تم ہی نماز پڑھا کیونکہ اس نماز کی اقامت تو تمہارے ہی نام سے کہی گئی ہے۔ چنانچہ یہ نماز تو یہی امام پڑھائیں گے۔ نماز سے فراغت کے بعد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام فرمائیں گے دروازہ کھولو دروازہ کھولا جائے گا ادھر دجال نکل چکا ہوگا اس کے ہمراہ ستر ہزار یہودی ہوں گے ہر ایک کے پاس مزین تلوار اور سر پر طیلسان ہوگا جب دجال کی نظر عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام پر پڑھے گی تو وہ نمک کی طرح پگھل جائے گا اور بھاگنے لگے گا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام فرمائیں گے میرے لئے تیرے نام کی ایک ضرب مقدر ہو چکی ہے اس سے بچ کر تو مجھ سے کہاں نکل سکتا ہے آخر اس کو باب لد پر پکڑ لیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سب یہودیوں کو شکست دے گا۔ اس وقت مال کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ صدقہ دینے کے لئے کوئی فقیر نہ ملے گا لہٰذا بیت المال کی طرف سے کوئی شخص بکری وصول کرنے والا رہے اور نہ اونٹ وصول کرنے والا اور بغض و کینہ سب دلوں سے نکل جائے گا اور تمام

لہ...... نبی ہونا چاہئے اور یقیناً وہ کوئی ایسا ہی رسول ہونا چاہئے جس کے سب سے بڑے دشمن یہود ٹھہر چکے ہوں اور جس کے جھوٹے قتل کے کھنڈر میں ایک بار وہ ملعون ٹھہر چکے ہوں دوسری بار اسی کے ہاتھ سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں۔ انبیاء علیہم السلام سے عداوت اور بغاوت کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا اس بدخصلت کی بدولت پہلے وہ نبوت سے محروم کر دیئے گئے تھے اور آخر میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔ بے شک جو قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رافت و رحمت والے رسول کے ساتھ بھی اپنا طریق کار نہ بدلے ان کی وجہ سے دنیا کو پاک کرنے ہیں میں انسانیت کی فلاح ہے۔ رب انک ان تذرھم یضلو عبادک لہ...

الذئب فِی الْغَنَمِ كَاَنَّهُ كَلْبُهَا وَ تُمْلَأُ الْاَرْضُ مِنَ الْمُسْلِمِ كَمَا يُمْلَاءُ الْاَنَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَ تَكُوْنَ الْكَلِمَةُ وَاحِدَةً فَلَا يَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهُ تَعَالٰى. (الحديث اخرجه ابوداؤد و ابن ماجه ص ۳۰۸ واللفظه له و رواه ابن حبان و ابن خزيمة فى صحيحهما و الضياء فى المختارة نقله كذالك فى شرح المواهب للزرقانى ص ۵۳ من ذكر المعراج)

زہریلے جانوروں کے ڈنگ بے کار ہو جائیں گے یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی لڑکی سانپ کے سوراخ میں ہاتھ ڈال لے گی تو وہ اس کو نہ کاٹے گا اور شیر کو دوڑائیں گے تو وہ اس کو کچھ نہ کہے گا اور بکریوں کے ریوڑ میں بھیڑیا اس طرح ساتھ ساتھ پھرے گا جیسے ریوڑ کا کتا اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے اور صرف ایک خدا کی توحید باقی رہ جائے گی اور ایک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

نُزُوْلُ عِيْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ و ظهور كَرَامَةِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ شرفها فِى ذَالِكَ

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی ظہور برتری

(۱۲۷۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِىْ يُقَاتِلُوْنَ

(۱۲۷۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق کے مقابلہ پر جنگ کرتی رہے گی اور وہ تا قیامت

لله .... وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا شاید موجود زمانہ میں اطراف عالم سے ہٹ کر ان کا ایک جگہ جمع ہونا اسی قومی استیصال کے لئے پیش خیمہ ہو۔ حدیث مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا اہم مقصد دجال کا قتل کرنا ہے اور چونکہ اس کا مقابلہ براہ راست انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے اسی لئے ہر نبی نے اس کی آمد سے اپنی امت کو ڈرایا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے قتل کے لئے خدا تعالیٰ کے ہاتھوں ہلاک ہوتے رہے لیکن جو دجال کے خاتم الدجاجلہ یعنی سب دجالوں کے آخر میں آئے گا اور خدائی افعال کے شعبدہ بازیاں ظاہر کرے گا اس کے قتل کے لئے ایک نبی ہی کی تشریف آوری ضروری تھی اس صورت میں اس امت کے لئے یہ کتنی بڑی کرامت اور شرافت ہوگی کہ جب اس پر کوئی خارجی حملہ ہو تو ان کی ہمدردی کے لئے خدا تعالیٰ کے رسول پیش قدمی فرمائیں۔ اور وہ بھی بڑی تمناؤں اور بڑے فخر کے ساتھ کیسے تعجب کی بات ہے کہ جس بات میں اس امت کی شرافت تھی اسی کو برعکس اہانت سمجھا جائے۔ ومن لم يجعل الله نُوْرًا فماله من نور۔

(۱۲۷۱) * اس امت کی شرافت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کے رسول کی وفات پر اتنی طویل مدت گذر جانے پر بھی اس میں ایسے افراد موجود ہیں کہ اسرائیلی سلسلہ کا ایک مقدس رسول آکر بھی اس کی امانت کو برقرار رکھے اور اس کے پیچھے آکر نماز میں اس کی اقتداء کر لے اور اس کا اعلان بھی کرے کہ جس کرامت و شرافت کے تم پہلے مستحق تھے اتنی مدت دراز کے بعد آج بھی اسی شرافت و کرامت کے مستحق ہو۔ سوچئے اور ذرا انصاف فرمائیے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر اس طرح اس امت کے پیچھے اقتداء نہ فرماتے تو نبیوں کے دور میں بھی اتم کے افراد لائق تر گذرے ہیں مگر آخر کچھ مدت کے بعد ہی ان کا حشر کیا کچھ نہیں ہوگیا جو نبوتوں کے مستحق تھے وہ لعنت کے تحت آ گئے یا نہیں لیکن ایک یہ امت بھی ہے جس کی شرافت میں اتنی طویل مدت گذرنے پر بھی ذرا فرق نہیں آیا۔

یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس طرف بھی نظر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت کے وقت بھی ایک نماز کا نقشہ یہی تھا کہ مرض الموت میں آپ نے منصب امامت کو سب سے بزرگ صدیق اکبرؓ کے سپرد کر دیا تھا اس درمیان لله ..

عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ تَعَالَ فَصَلِّ فَيَقُوْلُ لَا اِنَّ

اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی اس کے بعد آپؐ نے فرمایا آخر عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) اتریں گے (نماز کا وقت ہوگا) مسلمانوں کا امیر ان سے عرض کرے گا تشریف لائیے اور نماز پڑھا دیجئے وہ فرمائیں گے یہ نہیں ہوسکتا-

---

لله .... میں ایک ایسا وقت آیا کہ ان کی امامت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ان کے پیچھے نماز ادا فرمائی اور درحقیقت یہ اس کا اعلان تھا کہ یہ امت اب اس کمال کو پہنچ چکی ہے کہ ایک رسول کی نماز اس کے پیچھے ادا ہوسکتی ہے لہٰذا اب سمجھ لینا چاہئے کہ رسول کی آمد کا جو مقصد اعظم ہوتا ہے وہ پورا ہو چکا ہے اس لئے رسولوں کے دستور کے مطابق اس کی وفات کا وقت بھی آ جائے تو تعجب کی بات نہیں- ایک طرف امامت واقتداء کا یہ نقشہ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھئے اس کے ہزار سال سے کہیں زیادہ مدتوں کے بعد امامت واقتداء کا یہ دوسرا نقشہ بھی سامنے رکھئے جو یہاں حدیث میں آپ کے سامنے موجود ہے تو آپ کو بداہۃً ثابت ہو جائے گا کہ جس مدت میں پہلی امتیں ہلاک ہو کر دنیا سے نیست و نابود ہو چکی ہیں یہ امت اس سے زیادہ مدت گذرنے پر بھی اپنی اس شرافت وکرامت پر باقی ہے جو کبھی اس کو اپنے عہد کمال میں حاصل تھی- اس سے جہاں ایک طرف اس امت کی بزرگی کا ثبوت ملتا ہے اس سے بڑھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت عظمیٰ اور آپ کے کمالات کی ثبوت ملتا ہے اور یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ حقیقی معنی میں خاتم النبیین ہیں- آپ کے بعد کوئی نبی نہیں بن سکتا کیونکہ جب قیامت تک آپ کی امت میں صفت کے لوگ موجود رہیں کہ اگر کوئی قدیم رسول آئے تو بے تکلف وہ ان کے پیچھے آ کر نماز ادا کرلے تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ آخری رسول ہیں اور آپ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں ہے- یہ اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اصل وظائف رسالت ونبوت خدائی دین کی تاسیس واشاعت ہے کسی خاص شخص کا قتل کرنا اصل وظائف رسالت میں داخل نہیں ہے خدا تعالیٰ کے بہت سے رسول وہ ہیں جو قتل کرنے کی بجائے خود دشمنوں کے ہاتھوں مقتول ہو گئے ہیں مگر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے وظیفہ نبوت کے ادائیگی میں ذرا سا بھی قصور کیا تھا والعیاذ باللہ- پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دجال کو قتل کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جدید رسالت کی حیثیت سے تشریف لائیں گے بلکہ یہ خدمت کسی حکمت سے ان کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ بہت سے امور حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد ہوئے مگر ان عجائبات سے ان کی رسالت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا چنانچہ آج تک امت میں اختلاف ہے کہ وہ رسول تھے یا نہیں- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے لئے صاحب شریعت رسول ہونا' قرآن کریم سے ثابت ہے اور ان پر ہر امت کو ایمان لانا یہ ان کی رسات کا حق ہے جو پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ شریعت صرف آق کی شریعت ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام بھی آ کر اسی کی اتباع فرمائیں گے بلکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب تورات بھی آ جائیں تو ان کے لئے بھی شریعت یہی شریعت ہوگی اگر کوئی کامل سے کامل رسول آ کر اس کی اتباع کرتا ہے تو اس سے اس کی نبوت ورسالت میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا بہت سے انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں جن کی اپنی کوئی شریعت ہی نہ تھی لیکن پھر وہ خدا تعالیٰ کے نبی کہلائے پھر جو شریعت کہ سب شرائع کی جامع ہو اگر کوئی رسول آ کر اس کی اتباع کرتا ہے تو اس میں اس کی رسالت کے خلاف بات کیا ہے لہٰذا یہ سوال کتنا نامعقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو کیا رسالت کی صفت ان سے سلب کرلی جائے گی جی نہیں وہ رسول ہی ہوں گے اور جس طرح اس وقت ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح اس وقت بھی ایمان رکھیں گے صرف اتباع شریعت کا مسئلہ ہے تو جب ہر رسول کی اپنی شریعت میں ناسخ ومنسوخ ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا اسی طرح اگر ایک شریعت منسوخ ہو کر دوسری شریعت آ جائے تو اس سے بھی اس میں کوئی فرق نہیں آتا' اس کے کمالات وہی ہیں اس پر ایمان رکھنا اسی طرح ضروری ہے اور جس شریعت کی وہ دعوت دے اس کی اتباع ہر وقت لازم ہے پس پہلے زمانہ میں ان کی شریعت قرآن انجیل تھی اور نزول کے بعد اب ان کے لئے قرآن کریم شریعت ہوگا لله .....

بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ عَلٰى هٰذِهِ الاُمَّةِ. (رواه مسلم ج ١ ص ٨٧ و احمد فى مسنده ج ٣ ص ٣٤٥ و ج ٣ ص ٣٨٤)

اس امت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اکرام و اعزاز ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کے امام و امیر ہو۔

(مسلم شریف)

(۱۲۷۲) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِى الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ (فذكر الحديث و فيه) وَ يَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَمِيْرُهُمْ يَا رُوْحَ اللّٰهِ تَقَدَّمْ صَلِّ فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ الْاُمَرَاءُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ فَيَقْدَمُ اَمِيْرُهُمْ فَيُصَلِّىْ فَاِذَا قَضٰى صَلٰوةَ اَخَذَ عِيْسٰى حَرْبَتَهٗ فَيَذْهَبُ نَحْوَ الدَّجَّالِ فَاِذَا يَرَاهُ الدَّجَّالُ ذَابَ كَمَا يَذُوْبُ الرَّصَاصُ فَيَضَعُ حَرْبَتَهٗ بَيْنَ ثَنْدُوَتِهٖ فَيَقْتُلُهٗ وَ يَنْهَزِمُ اَصْحَابُهٗ لَيْسَ يَوْمَئِذٍ شَىْءٌ يُوَارِىْ مِنْهُمْ اَحَدًا حَتّٰى اَنَّ الشَّجَرَةَ لَتَقُوْلُ يَا مُؤْمِنُ هٰذَا كَافِرٌ وَ يَقُوْلُ الْحَجَرُ يَا مُؤْمِنُ هٰذَا كَافِرٌ. (اخرجه احمد فى مسنده ص ٢١٦ و ص ٢١٧ ج ٤ بطريقين و اخرجه ابن ابى شيبه و الطبرانى و الحاكم و صححه كذا فى الدرالمنثور ج ٢ ص ٢٤٣.

(۱۲۷۲) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فجر کی نماز میں اتریں گے تو اس وقت مسلمانوں کا جو امیر ہوگا وہ ان سے عرض کرے گا اے روح اللہ آگے تشریف لا کر نماز پڑھائیں۔ وہ فرمائیں گے یہ امت اپنی فضیلت کی وجہ سے خود ہی ایک دوسرے کی امیر ہے اس پر وہ امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائیں گے جب نماز ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اپنا نیزہ لے کر دجال کی طرف جائیں گے وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جیسا آگ پر سیسہ پگھل جاتا ہے وہ اپنا نیزہ اس کے سینہ کے درمیان لگائیں گے اور اس کو ختم کر دیں گے اور اس کا سب گروہ منتشر ہو جائے گا اور کوئی چیز ان کو پناہ نہ دے گی یہاں تک کہ درخت اور پتھر بھی کہے گا اے مؤمن (میری آڑ میں) یہ کافر موجود ہے (اس کو بھی قتل کر دے)

دوسری روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب اس طرح منقول ہے کہ اس نماز کی اقامت آپ ہی کے نام کی ہوئی ہے یہ کہہ کر وہ ان ہی کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔

و عن جابر نحوه. و هكذا عند ابى يعلى عنه و فيه انت احق بعضكم امراء على بعض اكرم الله به هذه الامة كذا فى الحاوى للسيوطى ج ٢ ص ١٢٧ و ليست هذه الرواية فى رسالة الشيخ قدس سره. و فى رواية فيقول له عيسى انما اقيمت الصلوة لك فيصلى خلفه كذا فى البداية والنهاية ج ٢ ص ٩٦)

لہ .... پہلے جب وہ شریعت انجیل کے داعی تھے اس وقت قرآن کریم نہ تھا اور جب وہ تشریف لائیں گے تو ان سے پہلے انجیل منسوخ ہو چکی ہوگی اور ان کے سامنے قرآنی شریعت ہوگی لہٰذا اب وہ خود بھی اسی کا اتباع فرمائیں گے۔ کسی شریعت کے خاص خاص احکام یا شریعت کے منسوخ ہو جانے سے رسالت کے مسلوب ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال نہ یہاں پیدا ہوتا ہے اور نہ اس حدیث میں پیدا ہوتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ اگر بالفرض وہ آ کر آپ کی شریعت کی اتباع کریں تو کیا اپنی رسالت سے معزول ہو جائیں گے۔ و العياذ بالله.

اِنَّمَا یَنْزِل عِیْسٰی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ من بَیْن سائر الاَنْبیاءِ عَلَیْھم الصلوٰۃُ وَالسَّلَامُ خَاصۃ لانہ اولی النَّاسِ بِالنَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

(۱۲۷۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَہٗ نَبِیٌّ یَعْنِی عِیْسٰی. وَ اِنَّہٗ نَازِلٌ فَاِذَا رَاَیْتُمُوْہُ فَاعْرِفُوْہُ رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ اِلَی الْحُمْرَۃِ وَالْبیاض بَیْنَ مُمَصَّرَتَیْن کَانَ رَاْسَہٗ یَقْطُرُ وَ ان لَمْ یُصِبْہُ بَلَلٌ فَیُقَاتِلُ النَّاسَ عَلَی الْاِسْلَامِ فَیَدُقُّ الصَّلِیْبَ وَ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ وَ یَضَعُ الْجِزْیَۃَ وَ یُھْلِکَ اللّٰہُ فِیْ زَمَانِہٖ الْمِلَلَ کُلَّھَا اِلَّا الْاِسْلَامَ وَ یُھْلِکُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَتَوَفّٰی فَیُصَلِّیْ عَلَیْہِ الْمُسْلِمُوْنَ. (رواہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۵ و اخرجہ ابن ابی شیبۃ و احمد فی مسندہ ج ٦ ص ۴۳۷ و ابن حبان فی صحیحہ و ابن جریر کذا فی الدرالمنثور ج ۲ ص ۲۴۲ و صححہ الحافظ فی الفتح من نزول عیسٰی علیہ السلام)

(۱۲۷۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے وہ ضرور اتریں گے جب تم ان کو دیکھنا تو پہچان لینا کہ وہ میانہ قد سرخ وسفید رنگ کے اور دو زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں گے ان پر وہ شگفتگی وتازگی ہوگی یوں معلوم ہوگا کہ ان کے سر مبارک سے پانی کے قطرے اب ٹپکے اگرچہ ان پر پانی کی نمی بھی نہ ہوگی۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے صلیب کو چورا چورا کر ڈالیں گے سؤر کو قتل کریں گے جزیہ کی رسم اٹھا دیں گے۔ ان کے دور میں اللہ تعالیٰ تمام مذہب ختم کر دے گا اور صرف ایک مذہب اسلام باقی رہ جائے گا اور ان کے دست مبارک پر اللہ تعالیٰ دجال کو قتل کرے گا چالیس سال تک زمین پر زندہ رہیں گے اس کے بعد ان کی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نماز جنازہ ادا کریں گے۔ (ابوداؤد)

حجہ و اتیانہ علی قبر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم و سلامہ و ردہ علیہ علیھما الصلوٰۃ والسلام

(۱۲۷۴) وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیُھِلَّنَّ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ بِفَجِّ الرَّوْحَاءِ بِالْحَجِّ اَوْ بِالْعُمْرَۃِ اَوْ یُثَنِّیَھِمَا جَمِیْعًا. (رواہ مسلم فی الحج) و اخرجہ احمد فی مسندہ و لفظہ ینزل عیسی بن مریم فَیَقْتُل الْخِنْزِیْرَ وَ یمحوا الصَّلِیْبَ وَ تُجْمَعُ لَہُ الصَّلٰوۃ وَ یُعْطِی الْمَالَ حَتّٰی لَا یُقْبَلَ وَ یَضع الخراجَ وَ یَنْزِلُ الرَّوْحَاءَ فَیَحُجُّ مِنْھَا اَوْ یَعْتَمِرُ اَوْ یَجْمَعُھُمَا وَ تَلَا اَبُوْھُرَیْرَۃَ وَ اِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ

(۱۲۷۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور مقام فج روحاء پر حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھیں گے مسلم شریف مسند احمد میں حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اتریں گے سؤر کو قتل کریں گے، صلیب کا نام ونشان باقی نہ چھوڑیں گے اور مال اتنا تقسیم کریں گے کہ اس کو قبول کرنے والا نہ ملے گا اور جزیہ وخراج اٹھائیں گے اور مقام فج روحاء میں حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھیں گے اس کی شہادت میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت

بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا فَزَعَمَ حَنْظَلَۃُ اَنَّ اَبَاھُرَیْرَۃَ وَ قَالَ یُؤْمِنَ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِ عِیْسٰی فَلَا اَدْرِیْ ھٰذَا کُلُّہٗ حَدِیْثُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْ شَیْءٌ قَالَہٗ اَبُوْھُرَیْرَۃَ.

مسند احمد ص ۲۹ ج ۲ و اخرجه ابن جرير مثله والحاكم و صححه و لفظه ليهبطن ابن مريم حكما عدلا و اماما مقسطا و ليسلكن فجاجا حاجا اَوْ معتمرا وَ لَیَاْتِیَنَّ قَبْرِیْ حَتّٰی یُسَلِّمَ عَلَیَّ ولاردّنّ عَلَیْہِ یَقُوْلُ اَبُوْھُرَیْرَۃَ اَیْ بَنِیْ اَخِیْ ان رَاَیْتُمُوْہُ فَقُوْلُوْا اَبُوْھُرَیْرَۃ یُقْرِئُکَ السَّلَامَ.

(درمنثور ج ۲ ص ۲۴۵)

فرمائی وَ اِنْ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا یعنی اہل کتاب میں کوئی شخص ایسا نہ رہے گا جو ان کی وفات سے پہلے یقیناً ان پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام ان پر گواہ ہوں گے حنظلہ (راویٔ حدیث) کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''قبل موتہ'' سے مراد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت سے پیشتر ہے اب یہ مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ تفسیر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے یا خود ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے۔

(درمنثور ج ۲ ص ۲۴۵)

یَتزوَّج عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَ یُوْلَد لَہٗ ثُمَّ یَتوفی وَ یدفن بیانُ موضع دَفْنِہٖ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کے بعد شادی کرنا پھر ولادت ہونی اس کے بعد آپ کی وفات اور مقام دفن کا ذکر

(۱۲۷۵) عَنْ عبداللہ بن عمرؓ مرفوعا ینزل عیسی بن مریم الی الارض فیتزوج و یولد له الحدیث. و عزاه الكتاب الوفاء و اخرجه ابن المراغی فی المدینة و ابن الجوزی فی المنتظم كذا فی الكنز. و هكذا فی المشكوة.

(۱۲۷۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) زمین پر اتریں گے اور نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی۔

(۱۲۷۶) عن ابی ھریرۃؓ مرفوعا طوبیٰ لعیش بعد المسیح یؤذن للسماء فی القطر و یوذن الارض فی النبات حتی لو تذر حبک فی الصفا لنت و حتی یمر الرجل علی الاسد فلا یضره و یطاء علی الحیة فلا تضره و لا تشاحن و لا تباغض.

(۱۲۷۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد زندگی اور فارغ البالی کے کیا کہنے آسمان کو بارش کا حکم مل جائے گا اور زمین کو پیدائش کا حتیٰ کہ اگر تم پتھر پر دانہ ڈال دو گے تو بھی وہ جم جائے گا اور اتنا امن ہوگا کہ آدمی شیر کے قریب سے گزرے گا اور وہ اس کو ذرا نقصان نہ پہنچائے گا اور بغض و کینہ کا کہیں نام و نشان نہ رہے گا۔

(اخرجه ابو سعيد النقاش فی فوائد العراقين كذا فی الكنز ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۷ ابو سعيد عنه)

(۱۲۷۷) عن محمد بن یوسف بن عبدالله بن سلام عن ابیه عن جده قال مکتوب فی التوراة صفة محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم و عیسی بن مریم یدفن معه.

(۱۲۷۷) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی لکھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ کے پاس دفن ہوں گے۔

اخرجه الترمذی و حسنه (کذا فی الدرالمنثور ص ۲٤٥ ج ۲) قلت و قد تکلم فی اسناده الحافظ ابن کثیر فی البدایة والنهایة ج ۲ ص ۹۹. و قال فی اسناد روایة الترمذی هذه عثمان بن الضحاک و الصواب الضحاک بن عثمان المدنی.

(۱۲۷۸) عن عبدالله بن سلام قال یدفن عیسٰی مع رسول الله صلی الله علیه وسلم و صاحبیه فیکون قبره رابعا اخرجه البخاری فی تاریخه والطبرانی. (درالمنثور ص ۲٤٥ ج ۲)

(۱۲۷۸) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دو جاں نثار یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دفن ہوں گے اور اس لحاظ سے ان کی قبر چوتھی ہوگی۔

(۱۲۷۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُرٰی انی اعیش من بَعْدِکَ فَتَأْذَن لی اَنْ ادفن اِلٰی جَنْبِکَ فقالَ وَ اَنّٰی لی بِذٰلِکَ مِنْ مَوْضَعٍ مَا فِیْهِ اِلَّا مَوْضع قَبْرِیْ وَ قَبْرالی بکر و عُمَر و عِیْسٰی بْنُ مَرْیَم. (اخرجه ابن عساکر کذا فی الکنزل ج ۷ ص ۲٦۸ و فی فصل الخطاب باسناد المستغفری فی دلائل نبوة اله)

(۱۲۷۹) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتیں تھیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا خیال ہوتا ہے شاید میں آپ کے بعد تک زندہ رہوں گی تو آپ مجھ کو اس کی اجازت دیں کہ میں آپ کے پہلو میں دفن ہوں؟ آپ نے فرمایا میں اس کی بھلا کیسے اجازت دے سکتا ہوں یہاں تو صرف میری قبر اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی قبریں اور عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر مقدر ہے۔

(ابن عساکر)

(۱۲۷۷) * عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ''اولی الناس'' کا لفظ فرمایا تھا اس کا ظہور یوں ہوا کہ اول تو آپ کے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں گذرا گویا دونوں کے زمانے متصل رہے پھر اسی مناسبت کی وجہ سے وہی آپ کی امت میں تشریف لائیں گے اور دیں بھی ہوا کہ وفت بھی آپ کے پاس ہی آ کر ہوں گے۔ زمانی اور مکانی اور موت کی یہ خصوصیات ان کے سوا کسی اور نبی کو میسر نہیں آئیں۔

اَلرُّسُوْلُ الاَعْظَمُ النَّبِیُّ الْاُمِّیُّ الهَاشِمِیُ المُطَّلِبِیُّ سَیِّدِنَا مُحَمَّدُ بْنِ عَبداللّٰه آخرُ هُمْ بَعثًا وَ اَوَّلَهُمْ خَلْقًا صَلوات اللّٰه وَسلَامه عَلَیْهِ

نبی امی ومطلبی الہاشمی سیدنا محمد بن عبداللہ جوسب سے برتر رسول ہیں بلحاظِ بعثت سب سے آخراور بلحاظِ پیدائش سب سے اوّل' اُن پرخدا کے بے شمار درود وسلام

دل میں آرزوئیں تھیں اور نہ معلوم کتنی آرزوئیں تھیں کہ رسالت کے ابواب ترتیب دینے میں اپنی پوری ہمت صرف کی جاتی اگرچہ ایک بے بضاعت کی ہمت ہی کیا تھی لیکن جهد المقل و موعها ایک آرزو یہ بھی تھی کہ ہر نبی ورسول کے تذکرہ سے قبل اس کے ایسے جامع اور مختصر حالات آجاتے جس کے مطالعہ سے اس کی زندگی کی چیدہ چیدہ خصوصیات کچھ نہ کچھ بیک نظر سامنے آجائیں مگر جب اپنی محرومی اور بدنصیبی سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے تذکروں ہی میں یہ تمنا پوری نہ ہوسکی تو آج جب کہ میں اس رسول الاعظم کے متعلق حدیثیں جمع کرنے کا فخر حاصل کررہا ہوں جن کے تذکروں سے عالم تکوین وتشریع گونج رہا ہے' کتب سماویہ ان کے ذکر سے لبریز ہیں انبیاء علیہم السلام ان کی مدح وتصیف میں رطب اللسان ہیں حتیٰ کہ عرشِ عظیم پران کی عظمت وبرتری کا چرچا ہے تو پھر قلم میں کیا طاقت ہے کہ اس موضوع میں کچھ جنبش کر سکے سبحان اللہ میدان تو کتنا وسیع ہے کہ اس کا قصد کرنا بھی مشکل مگر عقل وفہم یہاں اتنی درماندہ ہے کہ ایک قدم اس کو حرکت کرنا بھی مشکل اس لئے آپ کی صرف ایک مجمل سی سیرت پر کفایت کرتا ہوں جس کو صاحب حیوۃ الحیون نے لفظ براق کے تحت عجیب اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے-

اس رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ تذکرہ تو ایک بار آپ انبیاء علیہم السلام کے تذکروں کے شروع میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور لیجئے ایک بار پھر آخر میں بھی ملاحظہ فرما لیجئے وہ تذکرہ آپ کی خلقت کی اولیت کے اعتبار سے تھا اور یہ آپ کی بعثت کی آخریت کے لحاظ سے ہے-الهم صلی علی سیدنا محمد عبدک و نبیک و رسولک النبی الامی-

اہل تاریخ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی تھی جس سال کہ واقعہ فیل پیش آیا تھا ولادت بعد ۵ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ ماجدہ کی مقام ابواء میں وفات ہوئی پھر آپ اپنے دادا عبدالمطلب کی پرورش میں رہے اور ابھی آپؐ کی عمر مبارک ۸ سال کی ہوگی کہ آپ کے دادا کا بھی انتقال ہوگیا اس کے بعد آپ اپنے شفیق چچا جناب ابوطالبؓ کی پرورش میں رہے اور ان کے ہمراہ بارہ سال کی عمر میں شام جانے والے قافلہ میں تشریف لے گئے پھر ۲۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تجارتی کاروبار کے لئے باہر تشریف لے جاتے رہے اور اسی سال ان کے ساتھ آپ کا عقد بھی ہوا-قریش نے بناء کعبہ کا ارادہ کیا تو اس وقت آپ کا سن مبارک ۲۵ سال کا تھا اس سلسلہ میں جب باہم ان میں اختلاف ہونے لگا تو انہوں نے آپ کو اپنا حکم بنایا- چالیس (۴۰) سال کی عمر میں آپؐ نبوت سے سرفراز ہوئے اور جس وقت ابوطالب کی وفات ہوئی تو اس وقت آپ کا سن مبارک ۴۹ سال ۸ ماہ اور گیارہ دن تھا ابوطالب کے ۳ دن بعد حضرت خدیجہؓ کا بھی وصال ہوگیا اس کے تین ماہ کے بعد آپؐ زید بن حارثہؓ کو ساتھ لے کر بغرضِ تبلیغ طائف تشریف لے گئے اور ایک ماہ قیام فرمایا اس کے بعد معطم بن عدی کی پناہ میں آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے آئے جب آپ کا سن مبارک ۵۰ سال کا ہوا تو نصیبین کے جن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے جب آپ کا سن مبارک ۵۱ سال اور ۹ ماہ کا ہوا تو آپ کو معراج نصیب ہوئی

اور ۵۳ سال کی عمر میں آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی آپ کی بعثت کو اب یہ تیرھواں سال تھا اور کوئی چودھواں کہتا ہے' اس سفر میں صدیق اکبرؓ آپ کے رفیق سفر رہے ان کا غلام عامر بن فہیرہ بھی ہمراہ تھا اور عبداللہ بن اریقط راستہ بتاتے جاتے تھے۔ اسلامی تاریخ کی ابتداء اسی سال سے ہوتی ہے اور تاریخ اسلامی میں یہ پہلا سال شمار ہوتا ہے اسی سال آپ نے صحابہؓ کے درمیان عقد مواخاۃ فرمایا تھا اور حضرت علیؓ کی اخوت کا اعلان بھی اسی سال ہوا تھا مقیم کو چار رکعتیں اور مسافر کے لئے دو رکعتیں پڑھنا یعنی اتمام وقصر کی سنت اسی سال شروع ہوئی تھی اور اسی سال حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا عقد نکاح بھی ہوا ہے۔ دوسرے سال غزوۂ ودان ہوا ہے' ودان ایک مقام کا نام ہے۔ غزوہ بواط' غزوہ عشیرہ اور بدر اولیٰ کے غزوات سب اسی سال کے واقعات ہیں بواط مقام رضوی کا جانب واقع ہے غزوہ بدر اولیٰ ماہ جمادی الاخرۃ میں ہوا ہے اور غزوہ بدر کبریٰ ۱۳ ا رمضان المبارک جمعہ کے دن ہوا ہے کفار کے بڑے بڑے سردار اسی غزوہ میں قتل ہوئے اور غزوہ بنی سلیم ذی الحجہ میں ہوا ہے۔ صورت یہ ہوئی کہ آپ ابوسفیان کی خبر سن کر نکلے تھے مگر اس سے ملاقات نہ ہوسکی تھی ہجرت کے تیسرے سال غزوہ بنونضیر' غزوہ ذات الرقاع ہوئے ہیں۔ پانچویں سال غزوہ دومۃ الجندل' غزوہ خندق غزوہ بنی قریظہ ہوئے ہیں۔ چھٹے سال غزوہ بنی لحیان' غزوہ مصطلق ہوئے ہیں ساتویں سال آپؐ نے اپنا منبر بنوایا اور غزوہ خیبر اور قصہ فدک سب اسی سال ہوئے ہیں۔ باغ فدک صرف آپ کے تصرف میں تھا۔ آٹھویں سال غزوہ موتہ' فتح مکہ' غزوہ حنین' غزوہ طائف اور قبیلہ ہوازن سے اس حاصل کردہ مال تقسیم فرمایا ہے۔ نویں سال غزوہ تبوک ہوا ہے اور دسویں سال حجۃ الوداع ہوا ہے اس حج میں آپ نے اپنے دست مبارک سے ۶۳ قربانیاں ذبح کی اور ۶۳ غلام آزاد فرمائے اور آپ کی عمر مبارک بھی یہی ہوئی ہے گیارہویں سال آپ کا وصال ہوگیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ شروع ربیع الاول میں آپ کی علالت کی ابتداء ہوئی اور بارہویں ربیع الاول کو وفات ہوگئی آپ کی کل عمر ۶۳ سال کی تھی جس میں مدینہ میں آپ دس سال رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ آپ کی سب اولاد حضرت خدیجہؓ سے تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ماریہ قبطیہ سے تھے ان کے اسماء مبارک یہ ہیں طیبؓ، طاہرؓ، قاسمؓ، فاطمہؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی سب پسری اولاد عہد طفولیت ہی میں انتقال کرچکی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کی حیات میں آپؐ نے کسی اور سے عقد نہیں فرمایا' پھر ان کے بعد حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور حضرت عائشہؓ آپ کی زوجیت میں آئیں۔ حضرت عائشہؓ کے علاوہ آپؐ کی ازواج میں اور کوئی کنواری نہ تھیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد ۵۸ھ میں ۶۷ کے سن میں ان کا وصال ہوا۔ ۳ھ میں حضرت حفصہؓ کے ساتھ آپ کا عقد ہوا اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ان کا وصال ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ تھیں صرف ان کا انتقال آپ کی حیات طیبہ ہی میں ہوا ہے۔ ان کے بعد حضرت خدیجہؓ کے علاوہ سب کا انتقال آپؐ کے بعد ہوا ہے ۴ھ میں حضرت ام سلمہ سے آپ کا عقد ہوا ان کی والدہ عاتکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صاحبہ تھیں ان کا انتقال ۹ھ حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ۶۱ھ میں عاشورہ کے دن انتقال ہوا اور اسی دن حضرت امام حسینؓ کی شہادت ہوئی تھی ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش سے آپ کا عقد ہوا اور ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا آپ کی ازواج میں آپ کے بعد سب سے پہلے ان ہی کی وفات ہوئی ہے حضرت ام حبیبہؓ بھی اسی سال آپ آپ کی زوجیت میں آئیں ان کا نام رملہ بنت ابی سفیان تھا ۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات ہوئی حضرت جریریہ بنت حارث سے بھی اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں اور ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا اور ۷ھ میں حضرت میمونہؓ آپ کے نکاح میں آئیں ان کا وصال ۴۰ھ میں ہوا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس وقت آپ کے عقد میں ۹ بیبیاں تھیں۔

(۱۲۸۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ مِنْ خَیْرِ قُرُوْنِ بَنِیْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰی كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِیْ كُنْتُ مِنْهُ .(رواه البخاری)

(۱۲۸۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شروع سے لے کر ہمیشہ انسانوں کے بہتر سے بہتر طبقوں میں گذرتا رہا ہوں یہاں تک کہ جس طریقہ میں پیدا ہوا ہوں وہ سب سے بہتر طبقہ ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۲۸۱) عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی كِنَانَةَ مِنْ وُلْدِ اِسْمَاعِیْلَ وَاصْطَفٰی قُرَیْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی مِنْ قُرَیْشٍ بَنِیْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِیْ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ.(رواه مسلم و فی روایة للترمذی ان الله اصطفی من ولد ابراهیم اسماعیل واصطفی من ولد اسماعیل بنی کنانة)

(۱۲۸۱) حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے میں نے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے قبیلہ کنانہ کو انتخاب فرمایا پھر کنانہ میں سے قریش کو انتخاب فرمایا اور قریش میں سے قبیلہ بنو ہاشم کو پھر بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمالیا۔ (مسلم)

(۱۲۸۲) عَنِ الْعَبَّاسِ اَنَّهٗ جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَكَاَنَّهٗ سَمِعَ شَیْئًا فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَنْ اَنَا فَقَالُوْا اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَیْنِ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ قَبِیْلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُیُوْتًا فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ بَیْتًا فَاَنَا خَیْرُهُمْ نَفْسًا وَ خَیْرُهُمْ بَیْتًا (فَاَنَا خَیْرُهُمْ نَفْسًا وَ خَیْرُهُمْ بَیْتًا) (رواه الترمذی)

(۱۲۸۲) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے گویا انہوں نے اس وقت مشرکین عرب کی جانب سے کچھ طعن کا کلمہ سنا تھا اس پر آپ ؐ نے ممبر پر تشریف لاکر خطبہ دیا اور فرمایا بتاؤ میں کون ہوں؟ لوگوں نے کہا آپ ؐ رسول اللہ ہیں فرمایا میں (بلحاظ نسب) محمد ؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق بنائی تو مجھ کو اپنی سب سے بہتر مخلوق میں پیدا فرمایا اس کے بعد ان کے دو فرقے بنائے تو جو ان میں بہتر تھا مجھ کو ان میں پیدا فرمایا اسی طرح پھر ان کے خاندان بنائے اور ان کے خاندانوں میں جو بہتر تھا اس میں مجھ کو پیدا فرمایا حتیٰ کہ پھر ان میں مختلف گھرانے بنائے اور ان گھرانوں میں جو سب سے بہتر تھا مجھ کو اس میں پیدا فرمایا تو میں تم سب میں اپنے نسب اور اپنے گھرانے کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۸۳) عَنْ قَیْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ وُلِدْتُ اَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفِیْلِ

(۱۲۸۳) حضرت قیس بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال میں

(۱۲۸۳) * حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک آپ کی ولادت باسعادت اصحاب الفیل ہی کے سال میں ہوئی ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس واقعہ کے کتنی مدت بعد ہوئی' ابوجعفر باقر کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کی آمد نصف محرم میں ہوئی تھی اور اس کے پچپن دن بعد....

كُنَّا لِدَيْنِ قَالَ وَ سَأَلَ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَبَاثَ بْنَ اَشْيَمَ اَخَاَبَنِيْ يَعْمُرَ بْنِ لَيْثٍ اَنْتَ اَكْبَرُ اَمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْبَرُ مِنِّيْ وَ اَنَا اَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيْلَادِ وَ رَأَيْتُ خَزْقَ الْفِيْلِ اَخْضَرَ مُحِيْلًا. (رواه الترمذی)

کہ اصحاب الفیل کا قصہ پیش آیا تھا ہم دونوں ہم عمر تھے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قباث بن اشیم سے پوچھا جو یعمر کے بھائی تھے کہ تم بڑے ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بولے کہ بڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ہاں پیدائش میں میں آپ سے پہلے ہوں (سبحان اللہ کیا ادب کا جواب ہے) اور میں نے ہاتھیوں کا گوبر دیکھا جو سبز رنگ کا تھا اور متغیر ہو چکا تھا (یعنی میری پیدائش اصحاب الفیل کے قصہ سے بہت ہی قریب تھی) (ترمذی)

(۱۲۸۴) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِي الْعَاصِ حَدَّثَتْنِيْ اُمِّيْ اَنَّهَا شَهِدَتْ وِلَادَةَ اٰمِنَةَ بِنْتِ وَهْبٍ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ وَلَدَتْهُ قَالَتْ فَمَا شَيْءٌ اَنْظُرُ فِيْ بَيْتٍ اِلَّا نُوْرٌ وَ اِنِّيْ اَنْظُرُ اِلَى النُّجُوْمِ تَدْنُوْ حَتّٰى اِنِّيْ لَاَ قُوْلُ لَيَقَعُنَّ عَلَى الْاَرْضِ. (رواه البیهقی)

(۱۲۸۴) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میری والدہ بیان فرماتی تھیں کہ جس شب میں حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی تو اس وقت وہ وہاں خود موجود تھیں وہ بیان کرتی تھیں کہ گھر میں جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی تھی میں دیکھتی تھی کہ وہ منور ہے اور میں دیکھتی تھی کہ ستارے اس طرح جھکے پڑتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین پر آگریں گے۔ (بیہقی)

(۱۲۸۵) هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ بْنِ هَاشِمِ بْنِ عَبْدِ مُنَافِ بْنِ قُصَيِّ بْنِ كِلَابِ بْنِ مُرَّةَ بْنِ كَعْبِ ابْنِ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبِ بْنِ فِهْرِ بْنِ مَالِكِ بْنِ نَضْرِ بْنِ كِنَانَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ مُدْرِكَةَ بْنِ اِلْيَاسِ بْنِ مُضَرَ بْنِ نِزَارِ بْنِ مَعَدِّ بْنِ عَدْنَانَ.

(۱۲۸۵) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ بن عبدالمطلب (آپ کا نام شیبۃ الحمد تھا) بن ہاشم (عمرو) بن عبد مناف (المغیرۃ) بن قصی (زید) بن کلاب (المہذب یا حکیم) بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر (قریش) بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمۃ (عمرو یا عامر) بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

(رواه البخاری فی ترجمة الباب فی باب مبعث النبی صلی اللّٰه علیه وسلم)

ﷺ .... کے بعد آپ کی ولادت ہوئی ہے اس کے علاوہ اور بھی متعدد اقوال ہیں۔

(۱۲۸۵) * عرب میں نسب کی حفاظت کا بڑا اہتمام تھا اور شریعت نے بھی ایک حد تک اس کا اہتمام فرمایا ہے آج بھی عدالت مدعی اور مدعا علیہ کے کم از کم باپ کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے حافظ عینی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب بھی ایک دو پشت تک یاد رکھنا فرض ہے دیکھو عینی ج ۷ ص ۴۸۱۔ اگر کاش آپ کی امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت و محبت میں آپ کا پورا مذکورہ بالا نسب نامہ یاد کر لے تو یہ اس کے جذبہ محبت کا تقاضہ ہونا چاہئے راقم الحروف بھی قارئین کرام کی خدمت میں امید کے ساتھ یہ درخواست پیش کرتا ہے۔ علماء انساب اس پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک بلا اختلاف صحیح ہے اس کے بعد اس میں اختلاف ہے قاضی سید سلیمان صاحبؒ نے اپنی سیرت رحمۃ اللعالمینؐ میں اس پر بہت مفصل اور بہت محقق بحث فرمائی ہے اور چونکہ حضرت ہاجر کے نسب پر اہل کتاب نے اعتراض کیا ہے اس لئے اس کا ﷺ ....

(۱۲۸۶) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ اِسْتَأْذَنَ حَسَّانُ بْنُ ثَابِتٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هِجَاءِ الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ كَيْفَ بِنَسَبِيْ فِيْهِمْ فَقَالَ حَسَّانُ لَاَسُلَّنَّكَ مِنْهُمْ كَمَا تُسَلُّ الشَّعْرَةُ مِنَ الْعَجِيْنِ.

(رواہ البخاری فی باب من احب ان لا یسب نسبہ)

(۱۲۸۶) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حسان بن ثابت نے مشرکین کی ہجو کرنے کی آپ سے اجازت طلب کی آپ نے فرمایا کہ قریش کے ساتھ میرا نسب بھی جا ملتا ہے پھر اس کا کیا کرو گے (کیونکہ اس وقت ان کی ہجو کرنے سے خود میری بھی ہجو ہو جائے گی) اس پر حسان نے عرض کی میں آپ کو ان میں سے اس طرح صاف نکال لوں گا جیسے بال آٹے میں سے صاف نکال لیا جاتا ہے (یعنی ان کے افعال و اعمال پر ان کی ہجو کروں گا)۔ (بخاری شریف)

(۱۲۸۷) عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ قَالَ وُلِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مختونًا

(۱۲۸۷) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پیدا ہوئے تو آپ ختنہ شدہ تھے اور

لله ....بھی بہت دندان شکن جواب دیا ہے جو قابل مراجعت ہے قاضی صاحب نے محنت اٹھا کر اس آبائی سلسلہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امہاتِ مکرمات کا بھی ذکر فرمایا ہے جس کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین۔

نمبر شمار	آباءکرام	امہاۃ عظام	نمبر شمار	آباءکرام	امہاۃ عظام
۱	عبداللہ	آمنہ	۱۲	مالک	جندلہ
۲	عبدالمطلب	فاطمہ	۱۳	نضر	عکرشہ
۳	ہاشم	سلمٰی	۱۴	کنانہ	برہ
۴	عبدمناف	عاتکہ	۱۵	خزیمۃ	عوانہ (ہند)
۵	قصی	جئی	۱۶	مدرکۃ	سلمٰی
۶	کلاب	فاطمہ	۱۷	الیاس	لیلیٰ (خندف)
۷	مرہ	ہند	۱۸	مضر	رباب
۸	کعب	مخشیہ	۱۹	نزار	سودہ
۹	لوی	ماویہ	۲۰	معد	معانہ
۱۰	غالب	عاتکہ	۲۱	عدنان	مہدد
۱۱	فہر ملقب بقریش	لیلیٰ			

(۱۲۸۶) * عرب میں ہجو و مدح کا عام دستور تھا اور اپنے دشمن کے ہجو کرنی ان کے نزدیک اس کے قتل کرنے سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتی تھی کیونکہ قتل سے تو اس کو صرف ایک بار ہی تکلیف پہنچتی تھی اور ہجو کے اشعار چونکہ گلی کوچوں میں بچے پڑھتے پھرتے تھے اس لئے اس کی تکلیف ان کو تلوار اور برچھے سے بھی زیادہ ہوتی تھی اس لئے آپ نے فرمایا لھی اشد علیھم من رشق النبل او کما قال یہ ان کے نزدیک تیروں کی بوچھاڑ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اسلام میں جہاد کی ایک قسم جہاد باللسان بھی ہے۔

مَسْرُوْرًا قَالَ فَاعْجَبَ جَدَّهٗ وَ حَظِيَ عِنْدَهٗ وَ قَالَ لَيَكُوْنَنَّ لِابْنِيْ هٰذَا شَأْنٌ فَكَانَ لَهٗ شَأْنٌ.

(رواہ البیھقی قال الحافظ ابن کثیر و ھذا الحدیث فی صحتہ نظر)

آپ کا اونال بھی علیحدہ تھا۔

(بخاری شریف)

(۱۲۸۸) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ كَانَ اَحْبَارُ يَهُوْدَ بَنِيْ قُرَيْظَةَ وَالنَّضِيْرِ يَذْكُرُوْنَ صِفَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا طَلَعَ الْكَوْكَبُ الْاَحْمَرُ اَخْبَرُوْا اَنَّهٗ نَبِيٌّ وَ اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ وَ مُهَاجَرُهٗ اِلٰى يَثْرِبَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ اَنْكَرُوْا وَ حَسَدُوْا وَ كَفَرُوْا.

(رواہ ابونعیم من طرق متعددہ)

(۱۲۸۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل آپ کا حلیہ مبارکہ اور آپ کے سب علامات بیان کرتے تھے حتیٰ کہ جب سرخ رنگ کا ستارہ طلوع ہوا تو انہوں نے خبر دی کہ یہ (اسی رسول کے ظہور کی علامت ہے) یقیناً آپ نبیؐ ہیں اور آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آپ کا اسم مبارک احمد اور آپ کی ہجرت کے شہر کا نام یثرب ہے مگر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو ان ہی یہود نے پھر آپ پر حسد کیا اور آپ کا انکار کیا اور کافر بن گئے۔ ابونعیم

(۱۲۸۹) عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُمْ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا عَنْ نَفْسِكَ قَالَ دَعْوَةُ اِبْرَاهِيْمَ وَ بُشْرٰى عِيْسٰى وَ رَاَتْ اُمِّيْ حِيْنَ حَمَلَتْ بِيْ كَاَنَّهٗ خَرَجَ مِنْهَا نُوْرٌ اَضَاءَتْ لَهٗ بُصْرٰى مِنْ اَرْضِ الشَّامِ.

(رواہ الامام احمد قال ابن کثیر اسناد جید)

(۱۲۸۹) حضرت خالد بن معدان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا آپ اپنے متعلق کچھ ہم سے ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا کہ میرے لئے حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا فرمائی اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بشارت دی اور حالت حمل میں میری والدہ نے دیکھا گویا ان سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے کہ بصریٰ جو ملک شام کا ایک شہر ہے سب روشن ہوگیا۔ (مسند احمد)

(۱۲۸۹) * حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس مختصر تذکرہ سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ میری بعثت اور ظہور کا تذکرہ سب انبیاء علیہم السلام میں رہا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن کی طرف عرب اپنی نسبت کرتے ہیں سب سے پہلے بڑی ایضاح والحاح کے ساتھ میرے لئے دعا فرمائی اس کے بعد بنی اسرائیل کے سب سے آخری نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے میری بشارت دی جس سے ظاہر یہ ہے کہ درمیانی سب انبیاء علیہم السلام نے بھی میری بشارت دی تھی پس جس کی آمد آمد کی خبریں اس طرح انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعتوں میں مسلسل جاری آرہی ہوں اس کی شرافت و نبوت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے اس کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں و فیہ بشارۃ لاھل محلنا ارض بصری الخ کہ اس میں ہمارے شہر بصریٰ کے لئے ایک بڑی بشارت ثابت ہوتی ہے کیونکہ شام کی زمین میں سب سے پہلا شہر یہی ہے جس میں نور نبوت پہنچا چنانچہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں کسی جنگ کے بغیر یہ شہر صلحاً فتح ہوا اور اس شہر میں نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو بار تشریف بھی لاچکے ہیں ایک بار بارہ سال کی عمر میں جس میں کہ بحیراء راہب کا قصہ پیش آیا تھا دوسری بار میسرہ غلام کے ساتھ اور اس شہر میں آپ کے ناقہ کے بیٹھنے کی جگہ بھی موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں آپ کی ناقہ بیٹھی تھی اور اوس کا نشان پڑگیا تھا اور یہ وہی ٹھہرے کہ جہاں کے اونٹوں کی گردنیں اس آگ کی وجہ سے جو ایک بار ۶۵ھ میں حجاز میں لگی تھی چمکتی نظر آتی تھیں اور جس کے متعلق آپ پہلے پیش گوئی فرما چکے ہیں۔

(۱۲۹۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اعْتَرَفَ اٰدَمُ الْخَطِيْئَةَ قَالَ يَا رَبِّ اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا غَفَرْتَ لِيْ فَقَالَ اللّٰهُ يَا اٰدَمُ كَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا وَ لَمْ اَخْلُقْه بَعْدُ فَقَالَ يَا رَبِّ لِاَنَّكَ لَمَّا خَلَقْتَنِيْ بِيَدِكَ وَ نَفَخْتَ فِيْ مِنْ رُوْحِكَ رَفَعْتُ رَأْسِيْ فَرَأَيْتُ عَلٰى قَوَائِمِ الْعَرْشِ مَكْتُوْبًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَعَلِمْتُ اَنَّكَ لَمْ تُضِفْ اِسْمَكَ اِلَّا اَحَبَّ الْخَلْقِ اِلَيْكَ فَقَالَ اللّٰهُ صَدَقْتَ يَا اٰدَمُ اِنَّهُ لَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَيَّ وَ اِذْ قَدْ سَأَلْتَنِيْ بِحَقِّهِ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ وَ لَوْ لَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ. (رواه الحاكم)

قال البيهقي تفرد به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم و هو ضعيف و الله اعلم.

(۱۲۹۰) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آدم علیہ السلام سے خطاء سرزد ہوگئی تو انہوں نے یوں دعا کی اے رب اس حق کے طفیل میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تو نے رکھا ہے مجھ کو بخش دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا آدم! تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسے پہچانا میں نے تو ان کو اب تک پیدا بھی نہیں کیا انہوں نے عرض کی اے رب! جب تو نے مجھ کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور اپنی جانب سے اس میں روح ڈالی تو میں نے جب سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عرش کے پایوں پر یہ کلمہ لکھا ہوا تھا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ میں سمجھ گیا کہ جس کے نام کو تو نے اپنے اسم مبارک کے ساتھ رکھا ہے وہی شخص ہوسکتا ہے جو تجھ کو اپنی مخلوق بھر میں سب سے پیارا ہو- اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے آدم تم نے درست کہا بے شک وہ مجھ کو تمام مخلوق میں سب سے پیارے ہیں اور جب تم نے ان کے حق کے وسیلہ سے مجھ سے سوال کیا ہے تو جاؤ میں نے تم کو بخش دیا اگر یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا- (حاکم) بیہقی کہتے ہیں کہ اس میں ایک راوی عبدالرحمان بن زید بن اسلم ہیں اور وہ ضعیف ہیں-

(۱۲۹۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ بَنُوْ اَبِيْ طَالِبٍ يُصْبِحُوْنَ رُمْصًا غُمْصًا وَ يُصْبِحُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَقِيْلًا دَهِيْنًا وَ كَانَ اَبُوْطَالِبٍ يُقَرِّبُ اِلَى الصِّبْيَانِ مَصْحَتَهُمْ اَوَّلَ الْبُكْرَةِ فَيَجْلِسُوْنَ وَ يَنْتَهِبُوْنَ وَيُلُفُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ

(۱۲۹۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ابوطالب کی اولاد جب صبح کو اٹھتی تو عام دستور کے مطابق ان کی آنکھوں میں میل ہوتا اور پراگندہ بال ہوتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف ستھرے اٹھتے یوں معلوم ہوتا کہ جیسے آپ کے بالوں میں تیل لگا ہوا ہے ابوطالب کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے بچوں کو سویرے ناشتہ دے دیتے بچے بیٹھ جاتے اور بچوں کی عادت کی طرح چھینا جھپٹی شروع کردیتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ

(۱۲۹۱) * حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ کے نسب شریف کا تذکرہ کیا ہے اور تاریخ و احادیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ آپ عرب میں سب کے نزدیک مسلم شریف النسب تھے جیسا کہ ہرقل کی حدیث میں ابوسفیان کی شہادت پہلے گذر چکی ہے اس کے بعد آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخ پر بحث کی ہے پھر آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کی پیشانی پر آپ کا اور چمکنا اور حضرت آمنہ کے حاملہ ہو جانے کے بعد اس نور کا محسوس نہ ہونا اور اس سلسلہ میں عرب کی عورتوں کے اشتیاق کے سب واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں اس کے بعد جس شب آپ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اس کے عجائبات کا مفصل تذکرہ لکھا ہے اور اس کے بعد ایوان کسریٰ کے کنگروں کا گرنا اور آتش کدہ فارس کی آگ گل ہو....

فلا ینتھب معھم فلما رأی ذلک عمہ عزل لہ طعامہ علی حدۃ . (کذا فی البدایۃ والنھایۃ ج ۲ ص ۲۸۳)

وسلم اپنا ہاتھ کھینچے رکھتے اور دوسرے بچوں کے ساتھ اس چھینا جھپٹی میں شریک نہ ہوتے جب ابوطالب نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی تو پھر آپ کو علیحدہ ناشتہ دینے لگے تاکہ آپ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

نبذة من حلية الشريفة تنباک عن نبوته و نباهة شانه صلوات الله و سلامه عليه

آنحضرت ﷺ کا مختصر حلیہ شریفہ جس کو پڑھ کر آپ کی نبوت اور آپ کی شان کی بزرگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے

شمائل نبویہ ﷺ کے پڑھنے والوں سے ایک ضروری خطاب ٭ واضح رہے کہ آج یہ عام دستور ہے کہ ہر کتاب کے شروع میں اس کے مؤلف کا فوٹو بھی لگایا جاتا ہے جس کی بڑی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ علم قیافہ کی رو سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس کتاب کا مؤلف کس خلوص نیت' کس علو ہمت' کس علم وفراست اور کن اخلاق وملکات کا مالک ہے تاکہ اس کے کلام کے مطالعہ سے قبل اس کے طالع انور کا مطالعہ کر لینا کتاب کے دیباچہ کا کام دے۔ گذشتہ اوراق میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل اور آپ کی پاکیزہ وہ بلند تعلیمات اور آپ کی محیر العقول تربیت کا کچھ نقشہ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب آپ کا مختصر حلیہ شریفہ بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ آپ کے کمالات علمیہ کو دیکھ کر آپ کے مقدس حلیہ کی کچھ تصویر آپ کے سامنے آ سکے اور آپ کی مبارک صورت کو پڑھ کر آپ کے علمی کمالات کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ ہر چند کہ حسن لامحدود الفاظ وحروف سے کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے تاہم اس بارے میں آپ کے مقدس صحابہؓ آپ کے حلیہ شریفہ کے متعلق جو کچھ بیان میں لا سکتے تھے وہ لے آئے ہیں یہ ان کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس غائب امت کے لئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم رہی کم از کم یہی سامان تسلی چھوڑ دیا ہے۔ ع بالا بودے اگر ایں ہم نبودے

لہٰذا اب آپ اس کو پورے ذوق وشوق اور پورے ایمان وایقان کے ساتھ پڑھیں اور بار بار پڑھیں شاید کہ اسی راستہ سے آپ کے قلب میں حسن نبوت کا عشق سما جائے اور اس طرح پروردگار کے حسن حقیقی کا کوئی جلوہ نصیب ہونے کی راہ کھل جائے۔

گر ما نرسیدیم تو شاید برسی! داد یم ترا ز گنج مقصود نشاں!

بقیہ ..... ہو جانے وغیرہ پر بھی مستقل ایک باب باندھا اسی طرح آپ کی عہد طفولیت اور شباب کے ایک ایک واقعہ کو علیحدہ علیحدہ لکھ کر آپ کی بعثت کا ذکر شروع کیا ہے اور اس سلسلہ میں تورات وانجیل کی بشارات اور علماء یہود ونصاریٰ کی بشارتیں اور شہادتیں بھی پوری تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہیں حتیٰ کہ سیف بن ذی یزن کی بشارت پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے۔ اور آخر میں جنات کے مختلف آوازوں' کاہنوں کی خبروں اور بتوں سے آپ کے ظہور کی جو شہادتیں سنی گئی تھیں ان کو بھی ایک مستقل باب میں ذکر فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں احادیث وتاریخ کے علاوہ شعراء عرب کے اشعار کا بھی ایک اچھا خاصہ حصہ نقل فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں تو اس وقت عالم میں انقلاب کا عالم کیا ہوتا ہے ان کے سچائی نشانات ان سے پہلے اور ان کے ساتھ کس درجہ کثرت اور صفائی کے ساتھ عالم کے ذرہ ذرہ اور اس کے گوشہ گوشہ سے ہویدا ہوتے ہیں۔ پھر جب نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کس طرح یہ سارے نشانات آسمان وزمین پر چمک رہے تھے کتب سماویہ اور اہل کتاب کے علماء ہی نہیں بلکہ جن وانس کا سارا عالم کس طرح آپ کے لئے چشم براہ تھے اور اس سے گذر کر عالم جمادات بھی آپ کی آمد آمد کی خبریں دے رہا تھا لیکن اس مادی دنیا میں کون ہے جو ان حقائق کی دنیا کا اقرار کر کے اپنی مادی دنیا کو ٹھیس لگانا برداشت کرے اس لئے ہزار حیلہ کر کے اس کے انکار کے درپے ہے۔

(۱۲۹۲) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شَمِطَ مُقَدَّمَ رَاْسِهٖ وَ لِحْيَتِهٖ وَ كَانَ اِذَا دَهَنَ لَمْ يَتَبَيَّنْ وَ اِذْ شَعِثَ رَاْسُهٗ تَبَيَّنَ وَ كَانَ كَثِيْرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ فَقَالَ رَجُلٌ وَجْهُهٗ مِثْلُ السَّيْفِ قَالَ لَا بَلْ كَانَ مِثْلَ الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ وَ كَانَ مُسْتَدِيْرًا وَ رَاَيْتُ الْخَاتَمَ عِنْدَ كَتِفِهٖ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ يُشْبِهُ جَسَدَهٗ.

(رواه المسلم)

(۱۲۹۲) حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں میں اور داڑھی میں کچھ سفیدی آ گئی تھی مگر وہ اتنی قلیل تھی کہ جب تیل لگاتے تو تیل کی چمک کی وجہ سے وہ سفیدی ظاہر نہ ہوتی اور جب سر میں تیل نہ ہوتا تو چمکتی آپ کی ریش مبارک گنجان تھی۔ ایک شخص نے پوچھا کیا آپ کا روئے انور تلوار کی طرح روشن تھا؟ تو دوسروں نے کہا نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکدار اور گولائی لئے ہوئے تھا (تلوار لمبی ہوتی ہے) میں نے مہر نبوت کو دیکھا ہے وہ چینی ہڈی کے پاس تھی جیسے کبوتر کا انڈا اور اس کا رنگ وہی تھا جو آپ کے جسم مبارک کا رنگ تھا۔ (مسلم)

(۱۲۹۳) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَ لَا بِالْقَصِيْرِ وَ لَيْسَ بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَ لَا بِالْاٰدَمِ وَ لَيْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَ لَا بِالسَّبِطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَاَقَامَ بِمَكَّةَ عَشَرَ سِنِيْنَ وَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشَرَ سِنِيْنَ وَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَ لَيْسَ فِيْ رَاْسِهٖ وَ لِحْيَتِهٖ عِشْرُوْنَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ (وفی روایۃ) يَصِفُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَ لَا بِالْقَصِيْرِ اَزْهَرَ اللَّوْنِ وَ قَالَ كَانَ شَعْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَنْصَافِ اُذُنَيْهِ وَ عَاتِقِهٖ. (متفق علیہ)

وَ فِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ قَالَ كَانَ ضَخْمَ الرَّاْسِ وَ الْقَدَمَيْنِ لَمْ اَرَ بَعْدَهٗ وَ لَا قَبْلَهٗ مِثْلَهٗ وَ كَانَ سَبْطَ الْكَفَّيْنِ وَ فِيْ اُخْرٰى لَهٗ قَالَ كَانَ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ وَ الْكَفَّيْنِ.

(۱۲۹۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے اور نہ پست قد اور نہ بالکل چونے کی طرح سفید اور نہ گندم گوں (بلکہ سرخی مائل گورے) آپ کے بال کچھ خمیدہ نہ بہت زیادہ گھونگروالے اور نہ بالکل سیدھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس سال کی عمر منصب نبوت سے نوازا اس کے بعد دس سال آپ مکہ مکرمہ میں رہے پھر دس سال مدینہ طیبہ میں اس طرح جب آپ کی وفات ہوئی تو اس وقت آپ کی عمر مبارک ساٹھ برس کی تھی (راوی نے کسر شمار نہیں کی ہے) اس وقت تک کہ ریش مبارک اور سر میں بیس بال سفید نہ ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ وہ آپ کا حلیہ مبارک یوں بیان فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے نہ بہت لانبے نہ ٹھگنے آپ کا رنگ روشن اور چمکدار تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ بعض اوقات وہ نصف کانوں تک بھی ہوتے تھے۔ بخاری کی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک بڑا تھا اور پیر بھی کسی قدر بڑے تھے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا حسین و خوبصورت نہ آپ سے پہلے کوئی دیکھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیاں کشادہ تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر اور ہتھیلیاں پر گوشت اور گداز تھیں۔

(۱۲۹۴) عَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلرُّبَیعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ صِفِیْ لَنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ یَا بُنَیَّ لَوْرَاَیْتَهٗ رَاَیْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً. (رواه الدارمی)

(۱۲۹۵) وَ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَأَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ لَیْلَةٍ اِضْحِیَانٍ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ اِلَی الْقَمَرِ وَ عَلَیْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَاِذَا هُوَاَحْسَنُ عِنْدِیْ مِنَ الْقَمَرِ. (رواه الترمذی و الدارمی)

(۱۲۹۶) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَرْبُوْعًا بَعِیْدَ مَا بَیْنَ الْمُتکمین لَهٗ شعر بَلَغَ شَحْمَةَ اُذُنَیْهِ رَاَیْتُهٗ فِیْ حُلَّةٍ حَمْرَاءَ لَمْ اَرَشَیْئًا قَطُّ اَحْسَنَ مِنْهُ متفق علیه و فی روایة لمسلم قَالَ مَارَاَیْتُ مِنْ ذِیْ لِمَّةٍ اَحْسَنَ فِیْ حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَعْرُهٗ یَضْرِبُ مَنْکِبَیْهِ بَعِیْدَ مَا بَیْنَ الْمَنْکِبَیْنِ لَیْسَ بِالطَّوِیْلِ وَ لَا بِالْقَصِیْرِ.

(۱۲۹۷) عَنْ سِمَاکِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ضَلِیْعَ الْفَمِ اَشْکَلَ الْعَیْنِ مَنْهُوْشَ الْعَقِبَیْنِ قِیْلَ لِسِمَاکٍ مَا ضَلِیْعُ الْفَمِ قَالَ عَظِیْمُ الْفَمِ قِیْلَ مَا اَشْکَلُ الْعَیْنِ قَالَ طَوِیْلُ شِقِّ الْعَیْنِ قِیْلَ مَامَنْهُوْشُ الْعَقِبِ قَالَ قَلِیْلُ لَحْمِ الْعَقِبِ. (رواه مسلم)

(۱۲۹۴) ابوعبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ربیع بنت معوذ سے عرض کی آپ ہم سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بیان فرمائیں انھوں نے فرمایا عزیز من! اگر تم آپ کو دیکھتے تو یہ دیکھتے کہ آفتاب نکل آیا ہیں-

(دارمی شریف)

(۱۲۹۵) جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار چاندنی رات میں دیکھا تو میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور کبھی چاند کو دیکھنے لگا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سرخ حلہ پہنے ہوئے تھے مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے زیادہ حسین نظر آتے تھے-

(ترمذی شریف. دارمی)

(۱۲۹۶) براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان ذرا فاصلہ تھا آپ کے بال تھے جو کبھی کانوں کی لو تک ہوتے تھے- میں نے ایک مرتبہ آپ کو سرخ لباس میں دیکھا تو آپ سے بڑھ کر میں نے کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں اس طرح ہے کہ میں نے سرخ لباس میں کسی گیسو والے شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خوبصورت نہیں دیکھا- آپ کے بال کبھی شانوں تک بھی آجاتے تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیاں کچھ فاصلہ تھا آپ نہ بہت دراز قامت نہ زیادہ پست قد تھے-

(۱۲۹۷) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشادہ دہن والے تھے آپ کی آنکھیں لمبی آپ کی ایڑیاں باریک تھیں- سماک راوی سے سوال کیا گیا کہ ضلیع الفم کا مطلب کیا ہے انہوں نے کہا کہ منہ کا دہانہ بڑا ہونا پھر ان سے پوچھا گیا کہ اشکل العین کے معنی کیا ہیں انہوں نے کہا کہ آنکھوں کا خانہ لمبا ہونا پھر پوچھا گیا کہ منھوش العقبین کے معنی کیا ہیں انہوں نے کہا کہ ایڑیوں کا پر گوشت نہ ہونا- (مسلم شریف)

(۱۲۹۸) عَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ کَانَ اَبْیَضَ مَلِیْحًا مُقْصَدًا. (رواہ مسلم)

(۱۲۹۸) ابوالطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا گورے رنگ اور میانہ قد کے تھے۔ (مسلم شریف)

(۱۲۹۹) عَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهٗ لَمْ یَبْلُغْ ملیخضب لَوْشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتِهٖ فِیْ لِحْیَتِهٖ وَ فِیْ روایة لوشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ کُنَّ فِیْ رَاْسِهٖ فَعَلْتُ متفق علیه وَ فِیْ روایة لمسلم قَالَ اِنَّمَا کَانَ الْبَیَاضُ فِیْ عَنْفَقَتِهٖ وَ فِی الصُّدْغَیْنِ وَ فِی الرَّأْسِ نَبْذٌ.

(۱۲۹۹) ثابت روایت کرتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کے بال اتنے سفید ہی کہاں تھے کہ ان کے خضاب لگانے کی نوبت آتی آپ کی ریش مبارک میں کل اتنے بال سفید تھے کہ اگر میں ان کو شمار کرنے کا ارادہ کرتا تو شمار کر لیتا۔ مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ صرف چند بال آپ کے ریش بچہ کے سفید ہوئے تھے اور کچھ کنپٹیوں میں اور کچھ آپ کے سر میں۔

(۱۳۰۰) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ مَارَأَیْتُ شَیْئًا اَحْسَنَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِیْ فِیْ وَجْهِهٖ وَ مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَسْرَعَ فِیْ مَشْیِهٖ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ کَاَنَّمَا الْاَرْضُ تُطْوٰی لَهٗ اِنَّا لَنُجْهِدُ اَنْفُسَنَا وَ اِنَّهٗ لَغَیْرُ مُکْتَرِثٍ. (رواہ الترمذی)

(۱۳۰۰) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو نہ دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا کہ اس میں آفتاب چمک رہا ہے اور آپ سے زیادہ تیز رفتار بھی میں نے کسی کو نہیں دیکھا جب آپ چلتے تو یوں معلوم ہوتا گویا زمین آپ کے لئے لپیٹی جارہی ہے آپ اپنی معمولی رفتار سے چلتے تھے اور ہم مشکل سے آپ کے ساتھ چل سکتے تھیں۔ (ترمذی شریف)

(۱۳۰۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ کَانَ فِیْ سَاقَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حُمُوْشَةٌ وَ کَانَ لَا یَضْحَکُ اِلَّا تَبَسُّمًا وَ کُنْتُ اِذَا نَظَرْتُ اِلَیْهِ قُلْتُ اَکْحَلُ الْعَیْنَیْنِ وَ لَیْسَ بِاَکْحَلَ. (رواہ الترمذی)

(۱۳۰۱) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیاں پر گوشت نہ تھیں ہلکی ہلکی سی ہوئی تھیں اور آپ کھل کھلا کر نہ ہنستے صرف مسکراتے تھے جب میں آپؐ پر نظر کرتا تو اپنے دل میں کہتا کہ آپؐ سرمہ لگائے ہوئے ہیں مگر آپ سرمہ لگائے ہوئے نہ ہوتے تھے۔ (قدرتی سرگیں چشم تھے) (ترمذی شریف)

(۱۳۰۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَجَ الثَّنِیَّتَیْنِ اِذَا تَکَلَّمَ رُئِیَ کَالنُّوْرِ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ ثَنَایَاهُ. (رواہ الدارمی)

(۱۳۰۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دانتوں کے درمیان کشادگی تھی جب آپ گفتگو فرماتے تو یوں معلوم ہوتا کہ آپ کے دانتوں کے درمیان سے نور پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ (دارمی)

(۱۳۰۳) عَنْ کَعْبِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ

(۱۳۰۳) کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انور ایسا چمکنے لگتا جیسا

علیہ وسلّم اذا سُرّ استنار وجهُهُ حتّٰى كانّ وجهَهُ قطعةُ قمرٍ و كُنّا نعرفُ ذٰلك.

(متفق عليه)

چودھویں رات کے چاند کا ٹکڑا ہے اور اس سے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کو پہچان لیتے -

(متفق علیہ)

(۱۳۰۴) عنْ علي ابنِ ابي طالبٍ قال كان رسُولُ اللّٰه صلّى اللّٰهُ عليْهِ وسلّم ليْس بالطّوِيلِ و لا بالقصيرِ ضخم الرّأسِ و اللّحيةِ شثن الكفّيْنِ و القدميْنِ مُشْربًا حُمْرةً ضخم الكراديس طويل المسْرُبةِ اذا مشى تكفّأ تكفُّؤًا كانّما ينحطُّ منْ صببٍ لمْ ارَ قبْلهُ و لا بعْدهُ مثْلهُ ﷺ

(رواه الترمذي و قال هذا حديث حسن صحيح)

(۱۳۰۴) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے نہ پست قد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر بڑا ریش مبارک گنجان ہتھیلیاں اور پیر گداز اور پر گوشت رنگ میں سرخی جسم کے جوڑ بڑے پیٹ پر بالوں کی دھاری لمبی جب چلتے تو سامنے کو جھک کر یوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا حسین نہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دیکھا نہ بعد میں-

(ترمذی شریف)

(۱۳۰۵) عنْ عليّ ابْن ابيْ طالبٍ رضي اللّٰهُ تعالى عنْهُ كان اذا وصف النّبيّ صلّى اللّٰهُ عليْهِ وسلّم قال لمْ يكُنْ بالطّويْلِ الْمُمّغِطِ و لا با قصيْرِ الْمتردّدِ و كان ربْعةً مِن الْقوْمِ و لمْ يكُنْ بالْجعْدِ القططِ و لا بالسّبطِ كان جعْدًا رجِلًا ولمْ يكُنْ بالْمُطهّمِ و لا بالْمُكلْثمِ و كان في الْوجْهِ تدْويْرًا ابْيضُ مُشْربٌ ادْعجُ الْعيْنيْنِ اهْدبُ الاشْفارِ جليْلُ الْمُشاشِ و الْكتدِ اجْردُ ذُوْ مسْرُبةٍ شثْنُ الْكفّيْنِ و الْقدميْنِ اذا مشى يتقلّعُ كانّما يمْشِيْ فِيْ صببٍ و اِذا الْتفت الْتفت معًا بيْن كتفيْهِ خاتمُ النُّبُوّةِ و هُو خاتمُ النّبيّيْن اجْودُ النّاسِ صدْرًا و اصْدقُ النّاسِ لهْجةً و اليْنُهُم عريكةً و اكْرمُهُمْ عشِيْرةً منْ رآهُ بديْهةً هابهُ و منْ خالطهُ معْرفةً احبّهُ يقُوْلُ ناعتُهُ لمْ ارْ قبْلهُ ولا بعْدهُ

(۱۳۰۵) حضرت علیؓ جب حضور کا حلیہ بیان فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ نہ لانبے تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال نہ بالکل خمیدہ تھے نہ بالکل سیدھے بلکہ کچھ خمیدگی لئے ہوئے تھے نہ آپ موٹے بدن والے تھے نہ گول چہرہ کے البتہ تھوڑی سی گولائی آپ کے چہرہ میں تھی (یعنی چہرۂ انور بالکل گول تھا نہ بالکل لانبا بلکہ دونوں کے درمیان تھا) حضور کا رنگ سفید سرخی مائل تھا آپ کی آنکھیں نہایت سیاہ تھیں اور مژگاں دراز بدن کے جوڑ موٹے تھے (مثلاً کہنیاں اور گھٹنے) ایسے ہی دونوں شانوں کے درمیان کی جگہ بھی موٹی اور پر گوشت تھی آپ کے بدن مبارک پر (معمولی لور سے زائد) بال نہیں تھے (یعنی بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بدن پر بال ہی بال ہو جاتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن پر خاص خاص حصوں کے علاوہ جیسے بازو پنڈلیں وغیرہ ان کے علاوہ اور کہیں بال نہیں تھے) آپؐ کے سینہ سے ناف تک بالوں کی لکیر تھی آپؐ کے ہاتھ اور قدم مبارک پر گوشت تھے جب آپ تشریف لے چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا کہ پستی میں اتر رہے ہیں ہلکے سے رکھتے - جب آپ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے (یعنی صرف گردن پھیر کر متکبرانہ متوجہ نہ ہوتے تھے) آپؐ

مثلهٗ صلّى اللّٰه عليه وسلّم. (رواه الترمذی)

کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور تھے بھی آپ خاتم النبیین (یعنی یہ اس کی علامت تھی کہ آپ سب نبیوں کے آخر میں تھے آپ سب سے زیادہ سخی دل والے تھے اور سب سے زیادہ سچی زبان والے سب سے زیادہ نرم طبیعت والے تھے اور سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے) غرض آپؐ کے دل زبان طبیعت خاندان اوصاف ذاتی اور نسبی ہر چیز سب سے زیادہ افضل تھے) آپ کو یکایک جو شخص دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا (یعنی آپ کا وقار وہلہ میں دیکھنے والا رعب کی وجہ سے ہیبت میں آ جاتا تھا) البتہ جو شخص پہچان کر آپ کے ساتھ رہنے لگتا وہ دل وجان سے آپ کا فریفتہ ہو جاتا تھا آپ کا حلیہ مبارک بیان کرنے والا صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا باجمال و باکمال نہ حضورؐ سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھا۔ (ترمذی)

(۱۳۰۶) عن الحسن بن علیّ رضى اللّٰه تعالى عنهما قال سألتُ خالىْ هند بن ابى هالة رضى اللّٰه تعالى عنهُ و كان وصّافاعنْ حلْية رسُوْلِ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم و انا اشتهى انْ يصف لىْ منها شيْئا اتعلّقُ به فقال كان رسُوْلُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم فخماً مُفخّماً يتلألأ لا تلألُؤَ القمر ليلة البدر اطْول من المرْبُوع و اقصر من المُشذّب عظيْم الهامة رجل الشّعْر انْ انفرقتْ عقيْقة فرق و الّا فلا يُحاوِزُ شعْرُهٗ شحْمة اُذُنيه اذا هُو وفّرهٗ. ازْهر اللّوْن. واسع الْجبيْن. ازج الحواجب سوابغ منْ غيْر قرْن بيْنهما عرْقٌ يُدِرُّهُ الغضبُ. اقْنى العرْنيْن لهٗ نُوْرٌ يعْلُوْهُ يحْسبُهٗ منْ لمْ يتأمّلْهُ اشمّ كثّ اللّحية. سهْل الخدّيْن. ضليْع الفم. مُفلّج الاسنان. دقيْق المسْرُبة كانّ عُنقهٗ جيْدُ دُمْيةٍ فىْ صفاءِ الفضّة معْتدل الخلْق بادنٌ مُتماسكٌ. سواءُ البطْن و الصّدْر بعيْدُ مابيْن منْكبيْن. ضخْمُ الكراديس انْورُ

(۱۳۰۶) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک دریافت کیا اور وہ آپ کا حلیہ بیان کرنے کا بڑا شغف رکھتے تھے میں نے چاہا کہ وہ آپ کے اوصاف جمیلہ کا میرے سامنے بھی کچھ ذکر فرمائیں تاکہ میں ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں (حضرت امام حسنؓ آپ کے وصال کے وقت بہت کم سن تھے اس لئے اس وقت تک ان امور پر غور کرنے کا ان کو موقعہ نہ مل سکا تھا) چنانچہ ان کی فرمائش پر انھوں نے آپ کا حلیہ اس طرح بیان فرمایا کہ آپ خود بڑے بھاری بھرکم تھے اور لوگوں کی نظروں میں بھی بزرگ و برتر تھے آپ کا روئے انور اس طرح چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند پورے میانہ قد والے سے ذرا دراز قامت اور بالکل بے ڈول سے پست قامت۔ سر مبارک بڑا۔ بال اتنے خمیدہ جیسے گھونگروالے بالوں میں کنگھی کی ہو اگر سہولت سے مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ زیادہ تکلف نہ فرماتے تھے۔ جب آپ کے گیسو ذرا دراز ہو جاتے تو کانوں کی لو سے ذرا نیچے آ جاتے۔ رنگ بڑا رونق دار اور روشن' پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار باریک اور گنجان اور دونوں ابرو جدا جدا درمیان میں ایک رگ جو غصہ میں ابھر جاتی۔ بلند بینی اس پر چمکتا ہوا نور سرسری طور پر دیکھنے والا یوں سمجھے کہ شاید آپ کی ناک ہی بلند ہے (حالانکہ وہ نور کی چمک ہوتی) ریش مبارک گنجا۔ ستے ہوئے رخسار (لٹکے ہوئے پر گوشت نہیں) فراخ دھن۔ دندان مبارک کے درمیان ذرا ذرا سا فاصلہ۔ سینہ سے لے کر ناف تک بالوں کی ایک باریک سی دھاری۔ گردن مورتی کی سی تراشی ہوئی اور چاندی کی طرح سفید چمکدار۔ نہایت معتدل پر گوشت جسم گھٹے ہوئے سینہ شکم

الْمُتَجَرِّدِ. مَوْصُوْلُ مَا بَيْنَ اللَّبَّةِ وَ السُّرَّةِ بِشَعْرٍ يَجْرِيْ كَالْخَطِّ. عَارِي الثَّدْيَيْنِ وَ الْبَطْنِ مِمَّا سِوٰى ذٰلِكَ اَشْعَرُ الذِّرَاعَيْنِ وَ الْمَنْكِبَيْنِ وَ اَعَالِي الصَّدْرِ. طَوِيْلُ الزَّنْدَيْنِ رَحْبُ الرَّاحَةِ. شَثْنُ الْكَفَّيْنِ وَ الْقَدَمَيْنِ سَائِلُ الْاَطْرَافِ اَوْ قَالَ شَائِلُ الْاَطْرَافِ خُمْصَانُ الْاَخْمَصَيْنِ. ذَرِيْعُ الْمِشْيَةِ اِذَا مَشٰى كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ. وَ اِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ جَمِيْعًا خَافِضُ الطَّرْفِ نَظْرُهٗ اِلَى الْاَرْضِ اَكْثَرُ مِنْ نَظْرِهٖ اِلَى السَّمَاءِ جُلُّ نَظْرِهِ الْمُلَاحَظَةُ يَسُوْقُ اَصْحَابَهٗ يَبْدَأُ مَنْ لَقِيَ بِالسَّلَامِ.

(رواہ الترمذی)

ہموار (یعنی پیٹ بڑا نہ تھا) دونوں مونڈوں کے درمیان ذرا فاصلہ اور کشادگی مضبوط جوڑ و بند کپڑوں سے باہر جسم کا حصہ گورا (تو ڈھکے ہوئے کا کیا کہنا) حلق اور ناف کے درمیان بالوں کی ایک لکیر اس کے علاوہ چھاتیاں اور پیٹ بالوں سے خالی البتہ دونوں بازو اور کندھوں اور سینہ کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ آپ کی کلائیاں دراز ہتھیلیاں فراخ دونوں ہاتھ اور پیر پر گوشت اور گداز اور انگلیاں درازی مائل پیروں کے تلوے ذرا گہرے۔ قدم ایسے چکنے کہ پانی اس پر نہ ٹھہر سکے۔ جب قدم اٹھاتے تو زمین سے اٹھا کر (یعنی گھسیٹ کر نہ چلتے) اور آگے کو جھک کر جب زمین پر قدم رکھتے تو آہستہ (متکبرانہ نہیں) تیز رفتار یوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے جسم کے ساتھ (متکبروں کی طرف نہیں) نظریں نیچی بہ نسبت آسمان کے آپ نظر اکثر زمین کی طرف رہتی ہاں اگر وحی کا انتظار ہوتا تو آسمان کی طرف دیکھتے) اکثر گوشۂ چشم سے دیکھتے (حیاء کی وجہ سے) چلتے میں اپنے صحابہ کو آگے رکھتے اور جس شخص سے ملتے پہلے اس کو خود سلام کرتے۔ (سبحان اللہ کیا حسن سیرت اور کیسا جمال صورت تھا) (ترمذی شریف)

(۱۳۰۷) عَنِ الْحَسَنِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فِيْ حَدِيْثِهٖ عَنْ خَالِهٖ كَمَا مَرَّ قَالَ الْحَسَنُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَكَتَمْتُهَا الْحُسَيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ زَمَانًا ثُمَّ حَدَّثْتُهٗ فَوَجَدْتُهٗ قَدْ سَبَقَنِيْ اِلَيْهِ فَسَاَلْتُهٗ عَمَّا سَاَلْتُهٗ عَنْهُ وَ وَجَدْتُهٗ قَدْ سَاَلَ اَبَاهُ عَنْ مَدْخَلِهٖ وَ عَنْ مَخْرَجِهٖ وَ شَكْلِهٖ فَلَمْ يَدَعْ مِنْهُ شَيْئًا قَالَ الْحُسَيْنُ فَسَاَلْتُ اَبِيْ عَنْ دُخُوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَ اِذَا اَوٰى اِلٰى مَنْزِلِهٖ جَزَّاَ دُخُوْلَهٗ ثَلَاثَةَ اَجْزَاءٍ جُزْءً لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَ جُزْءً لِاَهْلِهٖ وَ جُزْءً لِنَفْسِهٖ ثُمَّ جَزَّاَ جُزْءَهٗ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ النَّاسِ فَيَرُدُّ ذٰلِكَ بِالْخَاصَّةِ عَلَى الْعَامَّةِ وَ

(۱۳۰۷) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ گذشتہ روایت فرما کر کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تک اس حدیث کو میں نے اپنے بھائی حسن رضی اللہ عنہ سے ذکر نہیں کیا تھا پھر کے ذکر کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ تو مجھ سے پہلے وہ حدیث پوچھ کر سن چکے تھے بلکہ جو میں نے پوچھا تھا وہ بھی میرے ماموں سے پوچھ چکے تھے اور اس کے علاوہ اپنے والد ماجد سے آپؐ کے اندر تشریف لانے اور باہر آنے اور صحابہؓ کے درمیان آپ کے طور وطریق کا حال بھی پوچھ چکے تھے حتیٰ کہ کوئی بات انہوں نے نہ چھوڑی تھی (اب سنو) امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے کہ میں نے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تشریف لانے کے حالات دریافت کئے تو انہوں نے بیان کیا جب آپ اپنے گھر میں تشریف تو اس وقت کے تین حصے کرتے ایک حصہ اپنے رب کے لئے ایک اپنے گھر والوں کے لئے اور ایک اپنی راحت کے لئے پھر جو حصہ اپنے لئے رکھتے اس کو بھی خاص لوگوں کے ذریعہ سے عام لوگوں تک پہنچا دیتے اور ان سے کسی بات کا اخفاء نہ فرماتے تھے آپ کی

لا يدخر عنهم شيئا و كان من سيرته في
جزء الامة ايثار اهل الفضل باذنه و
قسمه على قدر فضلهم في الدين فمنهم
ذو الحاجة و منهم ذو الحاجتين و منهم
ذو الحوائج فيتشاغل بهم و يشغلهم
فيما يصلحهم و الامة من مسئلتهم عنه
و اخبارهم بالذي ينبغي لهم و يقول
ليبلغ الشاهد منكم الغائب و ابلغوني
حاجة من لا يستطيع ابلاغها فانه من
ابلغ سلطانا حاجة من لا يستطيع ابلاغها
ثبت الله قدميه يوم القيامة و لا يذكر
عنده الا ذلك و لا يقبل من احد غيره
يدخلون روادا و لا يفترقون الا عن
ذواق و يخرجون ادلة يعني على الخير
قال فسألته عن مخرجه كيف كان يصنع
فيه قال كان رسول الله صلى الله عليه
وسلم يخزن لسانه الا فيما يعنيه و
يؤلفهم و لا ينفرهم و يكرم كريم كل
قوم و يوليه عليهم و يحذر الناس و
يحترس منهم من غير ان يطوي على
احد منهم بشره و لا خلقه و يتفقد
اصحابه و يسئل الناس عما في الناس و
يحسن الحسن و يقويه و يقبح القبيح و
يوهيه. معتدل الامر غير مختلف و لا
يغفل مخافة ان يغفلوا و يملوا. لكل
حال عنده عتاد لا يقصر عن الحق و لا

عادتِ مبارکہ اس جزء میں جو آپ کی امت کے لئے ہوتا یہ تھی کہ صاحب فضیلت لوگ ہوتے ان کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کے درمیان بھی دینداری کا لحاظ مقدم رکھتے پس لوگوں میں کوئی شخص ایک ضرورت والا کوئی دوضرورت والا ہوتا اور کسی کی ضرورتیں اور زیادہ ہوتیں تو آپ ان کی ضروریات پورا فرمانے میں مشغول ہو جاتے اور ان کو ایسی باتوں میں مشغول کردیتے جو ان کے بعد تمام امت کی اصلاح اور کارآمد کا سبب ہوں اطرح پر کہ وہ اپنی ضرورت کی باتیں آپ سے پوچھتے رہتے اور آپ ان کو جو ان کے مناسب ہوتا بتاتے جاتے اور فرماتے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان مضامین کو ان لوگوں کو بھی پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں نیز دیکھو یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اپنی ضرورت کی خبر مجھ کو نہیں دے سکتا تم اس کی خبر مجھ کو دے دیا کرو کیونکہ جو شخص کسی اہل ضرورت کی ضرورت کسی بااختیار شخص کو پہنچادے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قدم ڈگمگانے سے محفوظ رکھے گا۔ بس آپ کے پاس ان ہی باتوں کا ذکر ہوتا تھا اور ان باتوں کے علاوہ آپ کسی سے اور کوئی بات نہ سنتے تھے آپ کی محفل میں جب لوگ آتے تو سائل اور محتاج کی حیثیت میں آتے اور جب واپس جاتے تو دین کے ہادی بن کر واپس ہوتے اور جب اٹھتے تو ضرور کچھ نہ کچھ کھا پی کر اٹھتے (اگر اس وقت آپ کے گھر کچھ ہوتا) اور یہ بھی بیان فرمایا کہ میں نے آپ باہر تشریف لانے کے حالات بھی پوچھے کہ آپ اس میں کیا کیا کرتے تھے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان سوائے مفید اور ضروری باتوں کے ہر قسم کی باتوں سے محفوظ رکھتے تھے اور لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے کہ ان کو اور محبت پیدا اور نفرت نہ پیدا ہو ہر قبیلہ کے شریف شخص کی عزت کرتے اور اس کو ان پر والی اور افسر بناتے اور لوگوں کو بھی غیر ضروری باتوں سے بچنے کی ہدایت فرماتے اور خود بھی غیر ضروری اختلاط سے بچتے لیکن اس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی میں ذرا فرق نہ آ سکے اور اپنے رفقاء کا حال دریافت کرتے رہتے اور لوگوں سے عام لوگوں کے حالات بھی پوچھتے اور اچھی بات کو اچھا کہتے اور اس کی تائید فرماتے اور بری بات کو برا کہتے اور اس کی تردید فرماتے ہر معاملہ میں اعتدال

يُجاوِزُهُ. الَّذِينَ يَلُونَهُ خِيارُهُمْ أفضلُهُمْ
عندهُ أعمُّهُمْ نصيحةً و أعظمُهُمْ عندهُ
منزلةً أحسنُهُمْ مُواساةً و مُوازرةً قال
فسألتُهُ عن مجلسه فقال كان رسولُ
اللّٰه صلّى اللّٰهُ عليه وسلّم لا يقومُ و لا
يجلسُ الّا على ذكرٍ و اذا انتهى الى
قومٍ جلس حيثُ يُنتهي به المجلسُ و
يأمرُ بذٰلك يُعطي كُلَّ جلسائه بنصيبه
و لا يحسبُ جليسُهُ أنّ احدًا اكرمُ عليه
منهُ. من جالسهُ او فاوضهُ في حاجةٍ
صابرهُ حتّى يكونَ هو المنصرفُ و من
سألهُ حاجةً لم يردُّهُ الّا بها او بميسورٍ
من القولِ قد وسع الناسَ بسطُهُ و خُلقُهُ
و من سألهُ حاجةً لم يردُّه الّا بها او
بميسورٍ من القولِ قد وسع الناسَ
بسطُهُ و خُلقُهُ فصار لهم ابًا وصاروا
عندهُ في الحقّ سواءً مجلسُهُ مجلسُ
علمٍ و حياءٍ وصبرٍ و امانةٍ لا ترفعُ فيه
الاصواتُ و لاتؤبنُ فيه الحُرَمُ و لا تُنثى
فلتاتهُ مُتعادلين يتفاضلون فيه بالتقوى
مُتواضعين يوقّرون فيه الكبيرَ و
يرحمون فيه الصغيرَ و يؤثرون
ذاالحاجة و يحفظون الغريبَ.

(رواه الترمذی)

ہوتا افراط وتفریط کچھ نہیں لوگوں سے غافل نہ ہو جاتے اس خطرہ سے کہ کہیں وہ غافل نہ ہو جائیں یا اکتا جائیں - آپ کے یہاں ہر بات کا ایک انتظام تھا حق بات میں نہ ذرا سی کوتاہی کرتے اور نہ ذرا اس سے آگے تجاوز فرماتے - جو لوگ آپ کے خاص ہم نشیں ہوتے وہ وہی ہوتے جو ان میں بہتر سمجھے جاتے کہ آپ کے نزدیک افضل وہ ہوتا جو سب میں زیادہ مسلمانوں کا خیرخواہ ہوتا اور سب سے بڑا مرتبہ والا وہ ہوتا جو سب میں بڑھ کر لوگوں کا خیرخواہ اور ان کا مددگار رہتا وہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے آپ کی محفل کا حال پوچھا تو میرے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست و برخاست سب خدا تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتی تھی - جب آپ خود کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی وہیں بیٹھ جاتے (اور آگے جانے کی سعی نہ کرتے) اور اسی بات کا دوسروں کو بھی حکم دیتے - اہل مجلس میں ہر ہر شخص کی طرف التفات فرماتے حتیٰ کہ مجلس میں ہر شخص کو یہی خیال ہوتا تھا کہ آپ کے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص قابل التفات نہیں ہے جو آپ کے ساتھ بیٹھتا یا کسی معاملہ میں بات چیت شروع کر دیتا تو آپ کو روکے رکھتا یہاں تک وہی خود واپس ہوتا اور جو شخص بھی آپ سے کچھ مانگتا آپ اس کو واپس نہیں کرتے مگر یا تو اس کی حاجت پوری فرما کر ورنہ کوئی مناسب بات فرما دیتے - آپ کی خندہ پیشانی اور آپ کے اخلاق اس طرح عام تھے کہ آپ ان کے والد کی جگہ تھے اور حق کے معاملہ میں تمام لوگ آپ کے نزدیک بالکل برابر اور ایک حیثیت رکھتے تھے آپ کی مجلس علم کی مجلس تھی شرم وصبر کی مجلس تھی اس میں کسی کی آواز اونچی نہ ہوتی اور کسی کی آبروریزی نہ کی جاتی اور اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تو اس کو شہرت نہ دی جاتی - آپس میں سب برابر شمار ہوتے - ایک دوسرے پر فضیلت کا معیار تھا تو صرف تقویٰ تھا وہ سب باہم ایک دوسرے کے ساتھ تواضع سے پیش آتے - بڑے کی تعظیم کرتے اور چھوٹے سے محبت کرتے اور حاجت والے کو آگے کر دیتے اور مسافر شخص کی پوری نگرانی کرتے - (بخاری شریف)

(۱۳۰۸) عَنِ الْحَسَنِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ الْحُسَیْنُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ بْنُ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ سَأَلْتُ اَبِیْ عَنْ سِیْرَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ جُلَسَائِهِ فَقَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبِشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَیِّنَ الْجَانِبِ لَیْسَ بِفَظٍّ وَ لَا غَلِیْظٍ وَ لَا صَخَّابٍ وَ لَا فَحَّاشٍ وَ لَا عَتَّابٍ وَ لَا مَشَّاحٍ یَتَغَافَلُ عَمَّا لَا یَشْتَهِیْ وَ لَا یُؤْیِسُ مِنْهُ وَ لَا یُخَیِّبُ فِیْهِ قَدْ تَرَکَ نَفْسَهٗ مِنْ ثَلَاثٍ اَلْمِرَاءِ وَ الْاِکْبَارِ وَ مَا لَا یَعْنِیْهِ وَ تَرَکَ النَّاسَ مِنْ ثَلَاثٍ کَانَ لَا یَذُمُّ اَحَدًا وَ لَا یَعِیْبُهٗ وَ لَا یَطْلُبُ عَوْرَتَهٗ وَ لَا یَتَکَلَّمُ اِلَّا فِیْمَا رَجَا ثَوَابَهٗ وَ اِذَا تَکَلَّمَ اَطْرَقَ جُلَسَائُهٗ کَاَنَّمَا عَلٰی رُؤُسِهِمُ الطَّیْرُ فَاِذَا سَکَتَ تَکَلَّمُوْا لَا یَتَنَازَعُوْنَ عِنْدَهُ الْحَدِیْثَ وَ مَنْ تَکَلَّمَ عِنْدَهٗ اَنْصَتُوْا لَهٗ حَتّٰی یَفْرُغَ حَدِیْثُهُمْ عِنْدَهٗ حَدِیْثُ اَوَّلِهِمْ یَضْحَکُ مِمَّا یَضْحَکُوْنَ مِنْهُ وَ یَتَعَجَّبُ مِمَّا یَتَعَجَّبُوْنَ وَ یَصْبِرُ لِلْغَرِیْبِ عَلَی الْجَفْوَةِ فِیْ مَنْطِقِهٖ وَ مَسْاَلَتِهٖ حَتّٰی اِنْ کَانَ اَصْحَابُهٗ یَسْتَجْلِبُوْنَهُمْ وَ یَقُوْلُ اِذَا رَاَیْتُمْ طَالِبَ حَاجَةٍ

(۱۳۰۸) امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام حسینؓ نے کہا کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور کا اپنے اہل مجلس کے ساتھ طرز پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپؐ ہمیشہ خندہ پیشانی خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے کسی بات میں آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو سہولت سے موافق ہوجاتے تھے نہ آپؐ بدخو تھے نہ سخت گو اور نہ سخت دل نہ آپ چلا کر بولتے تھے نہ بدکلامی فرماتے تھے نہ عیب گیر تھے۔ناپسند بات سے اعراض فرماتے، دوسرے کی کوئی خواہش آپ کو پسند نہ آتی تو اس کو مایوس بھی نہ فرماتے اور صاف جواب بھی نہ دیتے تھے۔آپؐ نے تین باتوں سے اپنے آپؐ کو مبرا فرما رکھا تھا جھگڑے سے اور تکبر سے اور بیکار بات سے اور تین باتوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا کسی کی مذمت فرماتے نہ کسی کو عیب لگاتے نہ کسی کے عیوب تلاش فرماتے آپؐ صرف وہی کلام فرماتے جو باعث اجر ہوتا جب آپؐ گفتگو فرماتے تو آپؐ صحابہؓ اس طرح گردن جھکا کر بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں جب آپ چپ ہوجاتے تب وہ حضرات کلام کرتے آپؐ کے سامنے کسی بات میں نزاع نہ کرتے آپؐ سے جب کوئی شخص بات کرتا تو اس کے خاموش ہونے تک سب ساکت رہتے ہر شخص کی بات (توجہ سے سننے میں) ایسی ہوتی جیسے پہلے شخص کی گفتگو (یعنی بےقدری سے کسی کی بات نہ سنی جاتی) جس بات سے سب ہنستے آپؐ بھی تبسم فرماتے اور جس سے سب لوگ تعجب کرتے تو آپ بھی تعجب میں شریک رہتے یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں مسافر آدمی کی سخت گفتگو اور بےتمیزی کے ہر سوال پر صبر فرماتے اسی لئے بعض صحابہ آپ کی مجلس اقدس تک مسافروں کو کر آیا کرتے تھے (تاکہ ان کے جابےجا ہر قسم کے سوالات سے خود بھی منتفع ہوں اور وہ امور جو ادب کی وجہ سے یہ حضرات خود نہ پوچھ سکتے تھے وہ بھی معلوم ہوجائیں) آپ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی طالب

(۱۳۰۸) * حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی ان دو حدیثوں میں حیات انسانی کے کتنے اہم اسباق آپ کو عملاً سکھا دیئے گئے ہیں اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات صرف علمی اور درسی رنگ میں نہیں ہوتیں بلکہ عملی طور پر بھی ہوتی ہیں اسی لئے شروع میں ہم نے تنبیہ کی تھی کہ شمائل کی حدیثوں کو صرف سرسری طور پر پڑھنا نہیں چاہئے بلکہ اس کو تکمیل انسانیت کا ایک اہم جز سمجھ کر پڑھنا چاہئے افسوس ہے کہ اس وقت اس کی تفصیل کے لئے وقت میں گنجائش نہیں ہے۔ ......

يَطْلُبُها فارْفِدُوْهُ وَ لا يَقْبَلُ الثَّنَاءَ اِلَّا مِنْ مُكَافيءٍ وَ لا يَقْطَعُ عَلٰى اَحَدٍ حَدِيْثَهُ حَتّٰى يَجُوْزَ فَيَقْطَعُهُ بِنَهْيٍ اَوْ قِيَامٍ.

(رواه الترمذی)

حاجب کو دیکھو تو اس کی امداد کیا کرو (اگر آپ کی کوئی تعریف کرتا تو آپ اس کو گوارا نہ فرماتے) البتہ بطور شکریہ اور اداء احسان کے ذیل میں کوئی آپ کی تعریف کرتا تو آپ اس پر سکوت فرما لیتے کسی کی گفتگو کو قطع نہ فرماتے البتہ اگر کوئی حد سے تجاوز کرنے لگتا تو اس کی کو روک دیتے یا کھڑے ہو جاتے تا کہ وہ خود رک جائے۔

تمّت

❁ ❁ ❁

.... اللّٰهُمَّ صَلِّ على مُحمَّدٍ وَ سيّدنا آدمَ و سيّدنا ابْرهيْم و سيّدنا مُوْسى و سيّدنا عيْسٰى و ما بيْنهُمْ مِنَ النَّبيّيْنَ و الْمُرْسليْنَ صلوات و سلامه عليْهِمْ اجْمعيْن.

يا رحمة الله انی خائف و جل	يا نعمة الله انی مفلس عافی
و ليس لی عمل القی العليم به	سوی محبتک العظمی و ايمانی
فكن امانی من شر الحيوة و من	شر الممات و من احراق جُثمانی
تحية الصمد المولی و رحمته	ما غنت الورق فی اوراق اغصانی

اللهم صل علیٰ سيدنا محمد و علی آل سيدنا محمد صلوة تكون لک رضا وله جزاء و لحقه اداء و اعطه الوسيلة و الفضيلة و الماقام المحمود الذی و عدته و اجزه عنا ما هوا هله و اجزه افضل ما جازيت نبيا عن قومه و رسولا عن امته و صل علیٰ جميع اخوانه من النبيين و الصالحين يا ارحم الراحمين. (آمين)

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں انشاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔

(ادارہ)